جنوری ۹۰ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعت خصوصی

نقضِ غزل

یعنی تاریخ جماعت اسلامی کا ایک تاریک باب

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۹
شمارہ: ۱
جمادی الثانی ۱۴۱۰ھ
جنوری ۱۹۹۰ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرِ تعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/-
c/o Dr Khursid A Malik
SSQ 81[illegible]d street
Downer[illegible]e IL 60516
Tel : 312[illegible]6755

c/o Mr. Rashid A. Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel . 313 977 8081

CANADA [illegible] $ 12/-
c/o Mr Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel : 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/-
c/o Mr Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel 01 805 8732

MID-EAST DR 25/-
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 182

INDIA US $ 6/-
c/o Mr. Hyder M D. Ghauri
AKQI 4 1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel 42127

K S A SR 25/-
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/-
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khuddam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ ۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۲۰۰۴
سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی ۔ فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس

مشمولات

قارئین کرام!

نوٹ فرما لیجیے کہ لفافے پر چسپاں سلپ پر آپ کا نام و پتہ اور زر تعاون ختم ہونے کی تاریخ درج ہے۔ اگر آپ ان میں کوئی غلطی پائیں تو مذکورہ سلپ پر ہی درستی کر کے ہمیں ارسال فرما دیجئے

نیز آئندہ خط و کتابت کرتے وقت حوالہ کے لیے سلپ پر درج کمپیوٹر کا حوالہ دینا نہ بھولیے گا

شکریہ: سرکولیشن مینیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرار احمد

تذکرہ و تبصرہ

حسب اعلان 'میثاق' کی اشاعت خصوصی پیش خدمت ہے، جس میں "لتقضِ غزل" کی چار اقساط یکجا شائع ہو گئی ہیں- پانچویں قسط کے لئے صفحات کی کمی کے باعث جگہ بھی نہیں نکل سکی، اور ویسے بھی اس میں اجتماع ماچھی گوٹھ کا ذکر نا مکمل ہے- انشاء اللہ اسے مکمل کر کے آئندہ اشاعت میں پیش کر دیا جائے گا-

'لتقضِ غزل' کا عنوان سورۂ نحل کی آیت نمبر ۹۲ سے ماخوذ ہے جس میں ایک ایسی حواس باختہ بڑھیا کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو محنت و مشقت جھیل کر سوت کاتتی ہے، اور پھر خود ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گویا اپنے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے- جماعت اسلامی پاکستان کی تاریخ میں بھی ۵۷-۱۹۵۶ء میں ایک ایسا ہی موقع آیا تھا، جب مولانا مودودی مرحوم نے اپنے بعض غلط اقدامات سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ مولانا عبد الجبار غازی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبد الغفار حسن، مولانا عبد الرحیم اشرف، مولانا اختار احمد بلخی، شیخ سلطان احمد، میاں فضل احمد، چودھری عبد الحمید اور جناب سعید ملک سمیت جماعت کی قیادت کی پوری صف دوم، اور راقم الحروف ایسے بہت سے نوجوان کارکن جماعت سے علیحدہ ہو گئے- راقم نے جب ۱۹۶۶ء میں مولانا مودودی مرحوم کے ان اقدامات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات کی 'روداد' قلمبند کرنے کا ارادہ کیا تو دفعتہً ذہن سورۂ نحل کی متذکرہ بالا آیت کی جانب منتقل ہوا، چنانچہ 'لتقضِ غزل' ہی کو اس تلخ داستان کا عنوان بنا لیا-

---

اس تحریر کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ: "راقم الحروف نے جو بیان جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا وہ کمیٹی کو پیش کئے جانے والے تحریری بیانوں میں سب سے زیادہ طویل تھا"- لہٰذا ضروری ہے کہ سب سے پہلے 'جائزہ کمیٹی' کا اجمالی تعارف کرا

دیا جائے - اور اس کے لئے بجائے اس کے کہ اب کچھ لکھا جائے مناسب ہے کہ انہی الفاظ کو درج کر دیا جائے جو راقم نے ۱۹۶۶ء میں اپنے دس سال قبل کے تحریر شدہ 'بیان' کو "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کرتے وقت اس کے دیباچے میں تحریر کئے تھے - یعنی:

"پیش نظر تحریر دراصل ایک بیان ہے جو بحیثیت رکنِ جماعت اسلامی راقم الحروف نے اکتوبر ۵۶ء میں جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے اس کل پاکستان اجتماع کے موقع پر جو کراچی میں نومبر ۵۵ء میں منعقد ہوا تھا ایک اجلاس مرکزی مجلسِ شوریٰ کا منعقد ہوا جس کے سامنے وہ بہت سے اعتراضات اور متبادل تجاویز و مشورے پیش کئے گئے جو جماعت کی پالیسی اور نظام سے متعلق جماعت کے اراکین کی جانب سے موصول ہوئے تھے اور جن پر معترضین اور مجوّزین حضرات اجتماعِ ارکان میں بحث کرنا چاہتے تھے۔ مرکزی مجلس شوریٰ نے اس اندیشے کی بنا پر کہ اگر طریق کار اور دستور سے متعلق ان دقیق بحثوں کو ارکان کے اجتماع میں چھیڑنے کی اجازت دے دی گئی تو ہنگامہ برپا ہو جائے گا یہ فیصلہ کیا کہ ان اعتراضات اور تجاویز پر غور کرنے کے لئے کہ جن میں نظم جماعت اور اس کے دستور سے بحث کی گئی تھی ایک مجلسِ تدوینِ دستور کا انتخاب عمل میں لایا جائے جس میں جماعت کے تمام تنظیمی حلقوں کو تعدادِ ارکان کے تناسب سے نمائندگی دی جائے تاکہ یہ مجلس جماعت کے لئے ایک نیا دستور مدوّن کرے (اس مجلس میں حلقۂ اوکاڑہ کے دو نمائندوں میں ایک راقم الحروف بھی منتخب ہوا تھا) اور ان اعتراضات اور تجاویز پر غور کرنے کے لئے جو جماعت کے طریق کار اور پالیسی سے متعلق ہیں ایک جائزہ کمیٹی کی تشکیل کی جائے جس کے سپرد یہ خدمت ہو کہ وہ تمام پاکستان کا دورہ کر کے جماعت کے عمومی حالات کا جائزہ لے، اور ارکانِ جماعت سے فرداً فرداً رابطہ قائم کر کے ان کی بے چینی کے اسباب معلوم کرے اور جو تجاویز ان کے ذہنوں میں ہوں ان کو مرتب کر کے ایک جامع رپورٹ مرکزی مجلسِ شوریٰ کے سامنے پیش کرے۔

یہ مجلس ابتداءً آٹھ ارکان پر مشتمل تھی، لیکن چند ماہ بعد بعض وجوہات کی بنا پر اس

کو مختصر کر دیا گیا اور حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب کی سر کردگی میں ان کے علاوہ مرکزی مجلس شوریٰ کے تین اور بزرگ اراکین یعنی مولانا عبد الجبار غازی، مولانا عبد الغفار حسن اور جناب شیخ سلطان احمدؒ[1] پر مشتمل اس "جائزہ کمیٹی" نے تقریباً آٹھ ماہ کے عرصے میں پورے پاکستان کا دورہ کر کے اپنے فرائض مفوضہ[2] کو ادا کیا اور نومبر ۵۶ء میں ایک رپورٹ مرکزی مجلس شوریٰ کی خدمت میں پیش کر دی۔

یہی وہ جائزہ کمیٹی تھی جس کی خدمت میں پیش نظر بیان پیش کیا گیا"۔

اس کے ساتھ ہی جائزہ کمیٹی کے تینوں "بزرگ ارکان" اور کمیٹی کے "فرائض مفوضہ" کے بارے میں بطور وضاحت یہ حاشیے درج کئے گئے تھے:

[1] یہ خیال رہے کہ یہی وہ تین حضرات ہیں جن پر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی غیر موجودگی میں وقتاً فوقتاً جماعت اسلامی پاکستان کی امارت کی ذمہ داری ڈالی گئی۔

[2] مرکزی مجلس شوری منعقدہ ۱۵ تا ۱۸ مارچ ۵۶ء نے جائزہ کمیٹی کے متعلق حسب ذیل قرار داد منظور کی تھی۔

۱۔ جماعت کی پالیسی، نظم اور حالات کے متعلق جو اعتراضات، شکایات اور تجاویز سالانہ اجتماع کے موقع پر موصول ہوئی تھیں ان کے بھیجنے والوں سے گفتگو کر کے یہ تحقیق کریں کہ ان شکایات کی بنیاد کیا ہے اور وہ اصلاح کے لئے ایجابی صورت میں کیا تجاویز پیش کرتے ہیں۔

۲۔ جماعت کے ارکان میں اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی پالیسی، طریق کار اور حالات کے بارے میں کچھ تبدیلی چاہتے ہیں تو ان سے تحقیق کریں کہ وہ کیا تبدیلی چاہتے ہیں۔

جائزہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ تقریباً ایک سال کی محنت و مشقت کے بعد وسط نومبر ۱۹۵۶ء میں پیش کی اور اس پر غور کرنے کے لئے مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس ۲۵ نومبر کو شروع ہوا۔ اور اس روز سے لے کر اواخر فروری ۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان کے اختتام تک جماعت ایک شدید بحران سے گزری جس نے ۱۹۴۱ء میں قائم

ہونے والی جماعت کو 'ختم' اور ایک نئی جماعت اسلامی کو 'جنم' دیا۔ چنانچہ اسی بحران کی داستان ہے جو 'نقضِ غزل' کے عنوان سے پیش خدمت ہے۔ اس بحرانی دور کے بعض "ناخوشگوار اور کریہہ واقعات" کی جانب راقم الحروف نے رکنیتِ جماعت سے مستعفی ہوتے ہوئے اپنے استعفے کے خط میں اشارہ کیا تھا جس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے' اس لئے کہ یہی گویا اس 'نقضِ غزل' کا اشاریہ یا انڈکس ہے۔ (واضح رہے کہ میری یہ تحریر اجتماعِ ماچھی گوٹھ کے کل دو ماہ بعد کی ہے' جو ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ مطابق اپریل ۱۹۵۷ء بحالتِ اعتکاف لکھی گئی تھی!)

"جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے لے کر اجتماعِ ماچھی گوٹھ تک جماعت اسلامی پاکستان کے حلقوں میں جن ناخوشگوار اور کریہہ واقعات کا چکر چلا ہے ان کو محض یاد کرنے ہی سے انسان کو سخت اذیت اور کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پندرہ روزہ شوریٰ کے دوران جس میں رپورٹ پر غور ہوا۔ شوریٰ کے فعّال عناصر کا دو متقابل اور متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جانا' ردّ و قدح کے بعد اور بالآخر خوفِ انتشار کی بنا پر بالاکراہ کسر و انکسار کے ذریعے ایک لایعنی اور مہمل قرار داد کا پاس ہونا پھر اس کی مختلف توجیہیں اور جماعت کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف ردِّ عمل' اس کے نتیجے کے طور پر سازشوں کی برملا تہمتیں' اکابرینِ جماعت کا ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی گری ہوئی رایوں کا اظہار' سعید ملک صاحب کا سنسنی خیز استعفاء اور اس کا اسی انداز میں قیّم جماعت کی طرف سے تعاقب' امیرِ جماعت کا جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان پر نجوٰی ' گروہ بندی اور "غیر شعوری" سازش کا الزام' مولانا امین احسن صاحب کا استعفاء از رکنیتِ جماعت' امیر جماعت کا جذباتی انداز میں استعفا از امارتِ جماعت' جماعت کے اندر ایک مہم کے انداز میں امیر جماعت پر قرار داد ہائے اعتماد' دو اراکینِ مرکزی شوریٰ کی رکنیتِ جماعت کا تعطّل' مولانا عبد الجبار غازی صاحب کا استعفا از رکنیت جماعت' مولانا عبد الغفار حسن صاحب کا استعفاء از مناصبِ جماعت' سلطان احمد صاحب کا استعفاء از رکنیتِ شوریٰ...... یہ سارے معاملات میرے لئے اس اعتبار سے تو غیر متوقع نہ تھے کہ میری تو رائے ہی یہ تھی کہ اب جماعت ایک خالص سیاسی جماعت بن گئی ہے اور یہ اس کے ناگزیر ثمرات ہیں لیکن اس لحاظ سے کمر توڑ دینے والے تھے

کہ جماعت میں اخلاقی تنزل اور گراوٹ کے بارے میں اتنی پست رائے میں نے ابھی قائم نہیں کی تھی......"۔

۱۹۶۶ء میں جب راقم نے اپنی کتاب "تحریک جماعت اسلامی" شائع کی 'لنقض غزل' کا اکثر و بیشتر حصہ تسوید و تبیض کے مراحل سے گزر چکا تھا۔ لہٰذا راقم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ اسے بھی کتاب میں شامل کر دے۔ لیکن بوجوہ اس خیال کو ترک کر دیا گیا۔ ان 'وجوہ' میں سے ایک تو وہ ہے جس کی جانب اسی تحریر میں اشارہ ہے جو 'میثاق' ستمبر ۱۹۶۶ء میں جب 'لنقض غزل' کی سلسلہ وار اشاعت کا آغاز ہوا تو اس کے تعارفی نوٹ کی حیثیت سے درج کی گئی تھی، اور جسے اب بھی من و عن شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ (دیکھیے 'لنقض غزل' کے ٹائٹل کا اندرونی صفحہ!)

'لنقض غزل' کو "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" میں شامل نہ کرنے کا ایک دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے ذہن میں اس کتاب کے حصہ دوم کا خاکہ مکمل ہو گیا تھا، جس کا باب اول اسے بننا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب 'میثاق' میں اس کی سلسلہ وار اشاعت ہوئی تو پانچوں پرچوں کی 'فہرست مضامین' اور ہر قسط کے عنوان میں اس کی صراحت موجود تھی کہ یہ "تحریک جماعت اسلامی حصۂ دوم" کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔

"تحریک جماعت اسلامی" کے اس مجوزہ حصۂ دوم کو تین ابواب پر مشتمل ہونا تھا:
ایک تو یہی 'لنقض غزل' جس کا حصۂ اول اس وقت پیش نظر ہے، اور حصۂ دوم انشاء اللہ آئندہ شمارے میں پیش کر دیا جائے گا!

دوسرا باب 'تعبیر جدید' کے عنوان سے مولانا مودودی کے ان تین نہایت اہم لیکن اسی قدر 'خطرناک' نظریات پر بحث و تنقید پر مشتمل ہوتا جن پر اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد ایک 'نئی جماعت اسلامی' کی تعبیرِ جدید ہوئی۔ یعنی:

ایک یہ کہ کسی بھی تحریک کے اصول جب آغاز میں بیان ہوتے ہیں تو کچھ اور ہوتے ہیں، لیکن جب عمل کی دنیا میں حقائق و واقعات کا سامنا ہوتا ہے تو ان میں 'حکمتِ عملی' کے تقاضوں کے مطابق لازماً تغیر و تبدل ہو جاتا ہے اور یہ "قاعدۂ کلیہ" اتنا اٹل ہے

کہ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا' خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہ سکی تھی[1]! اعاذنا اللہ من ذالک

دوسرے[2] یہ کہ مشہور اور ممدوح لوگوں کی شخصیتیں جو کچھ کتابوں میں نظر آتی ہیں حقیقۃً ویسی نہیں ہوتیں بلکہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان ان کاغذی تصویروں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔اور یہ اصول بھی اتنا قطعی ہے کہ خود صحابہؓ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی جیسے کچھ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں نظر آتے ہیں واقعۃً ویسے نہیں تھے' یہاں تک کہ اگر ان کے دور میں بھی کوئی جائزہ کمیٹی تشکیل دی جاتی تو وہ اس سے بھی کہیں زیادہ گھناؤنا گند جمع کر کے لا سکتی تھی جتنا جماعت اسلامی کی جائزہ کمیٹی نے پیش کیا ہے۔(معاذ اللہ !!)

تیسرے[3] یہ کہ تحریکیں صرف اصولوں کی بنیاد پر نہیں چل سکتیں بلکہ ان کے لئے

ع "نگہ بلند' سخن دلنواز' جاں پرسوز"

کی حامل شخصیتیں ناگزیر ضرورت کے طور پر درکار ہوتی ہیں' لہٰذا اگر عالم واقعہ میں ایسی کوئی شخصیت دستیاب نہ ہو تو "پیراں نمے پرند' مریداں مے پرانند!" کے مطابق ایسی کسی شخصیت کا مصنوعی طور پر تیار کرنا نہ صرف درست بلکہ لازمی ہے!

اور تیسرا[3] اور آخری باب "نوبت باایں جا رسید" کے عنوان سے تحریر کیا جانا مقصود تھا جس میں "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ" (الکہف:۶) کے مصداق متذکرہ بالا تینوں نظریات کے ان آثار و ثمرات اور نتائج و عواقب کا اجمالی جائزہ پیش ہوتا' جنہوں نے جماعت اسلامی کی مجموعی پالیسی اور اس کے وابستگان کے مزاج کو اس درجہ تبدیل کر کے رکھ دیا ع

---

[1] مولانا امین احسن اصلاحی نے مولانا مودودی مرحوم کے اس نظریۂ حکمت عملی پر بڑی بھرپور تنقید کی تھی' لیکن اول تو اس کا جو جواب مولانا مودودی نے دیا' اور پھر جواب الجواب کا جو سلسلہ چلا وہ اتنا طویل ہو گیا کہ جماعت کے اکثر لوگ اس کی علمی و استدلالی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے ------ دوسرے خود مولانا نے اس پر صرف علمی تنقید پر اکتفا کی اور اس کے جو نتائج تحریکی و تنظیمی سطح پر ظاہر ہو سکتے تھے' اور بالفعل ہو رہے تھے' ان کی جانب توجہ نہ کی۔ لہٰذا اس کی شناعت سے جماعت کے عام ارکان اور کارکنوں کو متنبہ کرنے کا حق ادا نہ ہو سکا!

"کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!"

راقم کے ذہن میں ابھی یہ مواد پک ہی رہا تھا کہ ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اور وہ یہ کہ جیسے ہی "تحریک جماعت اسلامی" شائع ہوئی ایک طرف جانب اخبارات رسائل اور دوسری جانب انفرادی خطوط میں تبصرے شروع ہو گئے جن میں جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والوں پر ایک 'الزام' تقریباً بالاتفاق عائد کیا گیا۔ مثلاً روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور نے لکھا:

"تدارک کی مؤثر ترین بلکہ اظہر من الشمس صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان جس بات کو سچ اور درست سمجھے اس کے صرف انفرادی اظہار پر اکتفانہ کرے بلکہ اپنے ہم رائے و ہم خیال اصحاب سے مل کر اپنے نزدیک سچ اور درست کو بروئے کار بھی لائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والوں نے اپنے اس اقدام کے بارے میں لکھا تو بہت کچھ ہے لیکن اب تک کوئی مثبت اقدام نہیں کیا"۔

اسی طرح روزنامہ 'کوہستان' کے تبصرہ نگار نے تحریر کیا:

"اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک سوال قاری کے ذہن میں بڑی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ جماعت اسلامی کے بارے میں جن لوگوں کو شکایت تھی کہ وہ صحیح نہج پر کام نہیں کر رہی ہے اور اسی بنا پر وہ اس سے الگ ہوئے، کیا انہوں نے علیحدگی کے بعد سے آج تک نو دس سال کے طویل مرحلہ میں اپنے انداز فکر کے مطابق کوئی کام بھی کیا۔ کیونکہ جہاں تک تحریک اسلامی کے نصب العین کا تعلق ہے ان حضرات کو پہلے بھی اس سے اتفاق تھا اور اسی بنا پر یہ اس میں شامل ہوئے تھے اور آج بھی جب یہ کتاب طبع ہو کر سامنے آئی ہے انہوں نے اس نصب العین سے اختلاف نہیں کیا۔ ایسی صورت میں علیحدگی کے بعد بھی اس نصب العین کے لئے اپنے انداز فکر اور طریق کار کے مطابق کام کرنے کی ذمّہ داری سے بری الذّمّہ نہیں ہو جاتے......"

اس الزام کے جواب میں 'الحمد للہ کہ' راقم الحروف نے کسی سخن سازی سے کام نہیں لیا بلکہ صاف 'اعتراف تقصیر' کرتے ہوئے جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کی خدمت میں گزارش کی کہ وہ اس پر برافروختہ ہونے کی بجائے سنجیدگی سے غور کریں:

"ہمیں اس کوتاہی اور تقصیر کا صاف اعتراف ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علیحدہ ہونے والوں پر جماعت اسلامی اور اس کے ہم خیال حضرات کا یہ الزام بالکل درست ہے کہ انہیں مجتمع ہو کر اس نہج پر عملی جدوجہد کا آغاز کر دینا چاہئے تھا جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے .... آخر میں ہم جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کی خدمت میں بھی یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا الزام پر مشتعل ہونے کے بجائے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور واقعی جائزہ لیں کہ یہ الزام کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے۔ .... ہماری دیانت دارانہ رائے یہی ہے کہ اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، بہر حال اس معاملے میں ہم سب سے مجموعی طور پر کوتاہی ہوئی ہے اور اس 'الزام' کا اصل 'جواب' ہماری جانب سے یہی ہونا چاہئے کہ جماعت اسلامی کے طریق کار میں جن غلطیوں کی نشاندہی کر کے ہم علیحدہ ہوئے تھے، ان سے پہلو بچا کر اس مقصد کے لئے اجتماعی جدّوجہد شروع کی جائے جس کے لئے جماعت اسلامی قائم ہوئی تھی ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ـــــ" (تذکرہ و تبصرہ 'میثاق' لاہور بابت اگست ۱۹۶۶ء)

اس کے نتیجے میں بحمد اللہ "معتزلینِ جماعت اسلامی" کے حلقے میں واقعی ہلچل پیدا ہو گئی جس کے باعث پہلے "قرار دادِ رحیم آباد" منصۂ شہود پر آئی اور پھر "اجتماعِ رحیم یار خان" منعقد ہوا ـــ اور ساتھ ہی احباب اور بزرگوں کی جانب سے ایک زوردار تقاضا ہوا کہ اب جبکہ ہم ایک مثبت تعمیر کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں پرانی تلخیوں کی یاد تازہ نہ کی جائے - تو اگرچہ میرا ذہن اسے تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن میں نے بزرگوں کی بات تسلیم کرتے ہوئے قلم روک دیا!

وہ دن اور آج کا دن، یہ داستان جو پہلے ہی دس سال پرانی ہو چکی تھی دنوں، مہینوں اور سالوں کے بوجھ تلے مزید دبتی چلی گئی - یہاں تک کہ اب اس پر پورے تینتیس۳۳ سال بیت چکے ہیں، اور حقائق و واقعات پر ثلث صدی کا دبیز پردہ پڑ چکا ہے -

ان حالات میں اگر اب اس دور کے واقعات کو محض حافظے اور یادداشت کی بنیاد پر تحریر کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں یقیناً ذہول اور نسیان کی بنا پر بہت سی غلطیوں کا احتمال ہے - غنیمت ہے کہ 'لطفِ غزل' کی پانچ قسطیں ۶۷-۱۹۶۶ء میں شائع

ہو گئی تھیں جب اس المیے کے سارے کردار بقید حیات تھے - خصوصاً مولانا مودودی نہ صرف یہ کہ زندہ تھے بلکہ پوری طرح چاق وچوبند تھے - اور جماعت اسلامی کی قیادت کی ذمہ داری بھر پور طور پر ادا کر رہے تھے - لہٰذا اگر 'نقشِ غزل' کی کسی بات کی تردید نہ انہوں نے کی نہ کسی اور نے 'جیسے کہ واقعہ ہے' تو یہ اس کے مشمولات کے مستند (Authentic) ہونے کی دلیل قاطع ہے - ویسے بھی اس میں اصل اہمیت کی حامل تو چند دستاویزات ہیں جن میں کسی کمی بیشی کا کوئی احتمال سرے سے موجود ہی نہیں ہے -

---

اس دوران میں کئی بار خیال آیا کہ تاریخ کی یہ امانت ادا کر ہی دی جائے 'اور تاریخ جماعت اسلامی کے اس 'تاریک باب' کو منظر عام پر لے ہی آیا جائے خصوصاً جب ان واقعات وحوادث کو گزرے پورے تیس برس ہو گئے اور اتفاق سے یہ وہی دن تھے جب اخبارات میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی کتاب کے اُن 'منجمد' (Sealed) اوراق کی 'رہائی' (Release) کا چرچا ہو رہا تھا جن کی اشاعت تیس سال کے لئے مؤخر کر دی گئی تھی تب تو یہ داعیہ شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ اب ان دستاویزات کو بھی 'رہا' کر ہی دیا جائے - چنانچہ تقریباً دو سال قبل اس کا حتمی فیصلہ کر بھی لیا گیا تھا' مگر بعض اسباب کی بنا پر معاملہ پھر التوا میں پڑ گیا - اسی طرح لگ بھگ ایک سال قبل تو نہ صرف یہ کہ دوبارہ فیصلہ ہو گیا بلکہ اس کا اعلان بھی کر دیا گیا لیکن اللہ کی مشیت پھر آڑے آ گئی - یہ اعلان اور اس کا پس منظر 'میثاق' بابت فروری ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا' جو من و عن درج ذیل ہے:

"جدہ میں ایک مفصل ملاقات برنی برادران سے بھی ہوئی جس کا ذکر ایک خاص اعتبار سے ضروری ہے - یہ دونوں بھائی 'ڈاکٹر شجاعت حسین برنی اور ڈاکٹر فرحت حسین برنی' جدید فنی تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں رکھنے کے ساتھ ساتھ (ڈاکٹر شجاعت معالجۂ امراضِ نفسیاتی میں ڈاکٹریٹ کے حامل ہیں اور ڈاکٹر فرحت انجنیئرنگ میں) نہایت نیک طبیعت اور گہرے مذہبی مزاج کے حامل ہیں ' ———— اور دونوں ہی نے نہایت قلیل مدت میں قرآن مجید کے ساتھ گہرے شغف کے علاوہ درس قرآن کی عمدہ صلاحیت حاصل کر لی ہے!

ان میں سے فرحت صاحب کی جماعت اسلامی کی تحریک کے ساتھ وابستگی نہایت گہری اور

جذباتی ہے'__________ اور وہ غالباً اس وقت جماعت کے جدہ کے حلقے کے سربراہ ہیں!

انہوں نے اثناءِ گفتگو میں نہایت حسرت کے ساتھ کہا کہ آپ کو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہرگز نہیں ہونا چاہئے تھا! اور جب میں نے عرض کیا کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ خود علیحدہ نہیں ہوئے تھے'__________ بلکہ ہمیں جبراً علیحدہ کیا گیا تھا اور حالات ایسے پیدا کر دیئے گئے تھے کہ اگر ہم جماعت سے علیحدہ نہ ہوتے تو ہماری معنوی موت واقع ہو جاتی' اس لئے کہ اجتماعِ ماچھی گوٹھ (فروری ۱۹۵۷ء) میں طے یہ پایا تھا کہ جو لوگ جماعت کی موجودہ پالیسی سے اختلاف رکھتے ہوں وہ اپنی رائے کا اظہار نہ تحریری طور پر کر سکتے ہیں__________ نہ زبانی طور پر __________ انہیں صرف جماعت کے کُل پاکستان اجتماعِ ارکان میں اظہارِ رائے کا حق حاصل ہوگا__________ اس کے علاوہ نہ وہ جماعت کے مقامی یا حلقہ وار اجتماعات میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے نہ ارکان جماعت سے نجی گفتگوؤں میں!__________ اور ارکان کے کُل پاکستان اجتماع کے بارے میں نہ یہ یقینی ہوتا ہے کہ وہ کتنے وقفے کے بعد ہو سکے گا' نہ ہی اس میں کسی اختلافی نقطۂ نظر کو تفصیلاً پیش کرنے کا موقع یا محل ہوتا ہے!__________ گویا جماعت اسلامی میں اظہارِ رائے کی آزادی ہاتھی کے اُن دانتوں کے مانند ہے جو دیکھنے میں تو بہت بڑے بڑے نظر آتے ہیں لیکن کھانے کے کام نہیں آسکتے!!

اس پر جس حیرت اور تعجب کا اظہار برنی صاحب نے کیا اس پر خیال آیا کہ جماعت اسلامی کی تاریخ کے اس گمشدہ باب کو اب منظرِ عام پر لے ہی آنا چاہئے جو ۵۶ء تا ۵۸ء کے واقعات پر مشتمل ہے اور جس کا ایک اہم حصہ راقم نے بائیس سال قبل ۶۷-۶۶ء میں 'تقضِ غزل' کے عنوان سے تحریر بھی کر دیا تھا اس لئے کہ اس کے بغیر جماعت کے بہی خواہوں پر ہمارا موقف صحیح طور پر واضح نہیں ہو سکتا__________ اور ویسے بھی ان حوادث پر اب تیس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے__________ اور اتنے عرصے کے بعد تو دنیا میں حساس ترین دستاویزات کو بھی شائع کر دیا جاتا ہے__________ تاکہ حقائق و واقعات کا علم صفحۂ ہستی سے بالکل گم ہی نہ ہو جائے اور بعد میں آنے والے لوگ ماضی کے حوادث کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکیں اور مستقبل کے بارے میں صحیح فیصلے کر سکیں__________ اس پر یہ بھی یاد آیا کہ یہ فیصلہ ہم نے تقریباً ایک سال قبل کر بھی لیا تھا لیکن پھر دوسری مصروفیات مانع ہوتی رہیں۔

بہرحال اب قارئین 'میثاق' نوٹ فرمالیں کہ 'میثاق' کی آئندہ اشاعت بابت مارچ

۸۹ء میں 'نقض غزل' کی وہ پانچ قسطیں یکجا شائع کر دی جائیں گی جو ۶۷-۶۶ء میں شائع ہوئی تھیں اور انشاء اللہ اپریل کے پرچے میں اس کی تکمیل کر دی جائے گی۔ واللہ الموفق والمستعان!"۔

اتنے حتمی وعدے کی تعمیل جس سبب سے نہ ہو سکی وہ یہ تھا کہ قریبی رفقاء کا اصرار تھا کہ اس مضمون کو قسط وار شائع کرنے کی بجائے یکمشت کتابی صورت میں شائع کیا جائے' اور اس کے لئے جو فرصت اور یکسوئی درکار تھی وہ کسی صورت میسر نہیں آ رہی تھی- چنانچہ معاملہ لیت و لعل ہی میں تھا کہ اچانک ہفت روزہ 'آئین' نے مشکل حل کر دی- کہ ایک جانب تو مولانا مودودی مرحوم کی وہ مبینہ تقریر شائع کر دی جس سے مولانا کا پورا فلسفۂ قیادت و امارت ان کے اپنے الفاظ میں سامنے آ گیا اور اس طرح راقم کو وہ گوہرِ مقصود حاصل ہو گیا جس کی وہ ایک عرصے سے تلاش میں تھا (یہ تقریر یا تحریر گزشتہ "میثاق" میں اس وعدے کے ساتھ شائع کی جا چکی ہے کہ اس پر 'محاکمہ' ہم بعد میں کریں گے چنانچہ انشاء اللہ اسی 'نقض غزل' کے ضمن میں یہ وعدہ بھی جلد پورا کر دیا جائے گا)------ اور دوسری جانب جماعت سے علیحدہ ہونے والوں' بالخصوص راقم کی ذات پر نہایت رکیک حملہ کر کے شدید تقاضا پیدا کر دیا کہ صحیح حقائق کو بلا تاخیر سامنے لایا جائے- بصورت دیگر لوگ یہ باور کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہم نے ان کے عائد کردہ الزامات کو درست تسلیم کر لیا ہے- بنابریں قریبی رفقاء کی رائے بھی مان لی گئی جس کے نتیجے میں 'نقض غزل' کا حصہ اول پیش خدمت ہے' (حصہ دوم بھی انشاءاللہ اگلے ہی ماہ سامنے آ جائے گا)۔

ان مضامین میں' جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اصل اہمیت تو بعض 'دستاویزات' کی ہے' تاہم انہیں ایک مسلسل اور مربوط تحریر کی صورت دینے کے لئے گاہ بگاہ راقم کے ذاتی تجزیے اور تبصرے بھی آ گئے ہیں جن کا لہجہ بالعموم تلخ اور درشت ہے- اس لئے کہ یہ میری اُس دور کی تحریریں ہیں جب مجھ پر مولانا مودودی کے بارے میں تلخی کا رنگ غالب تھا- اپنی اُس دور کی بعض دوسری تحریروں کو جب راقم نے ۱۹۸۲ء میں کتابی صورت میں شائع کیا تھا تو بعض وضاحتیں دیباچہ میں درج کی تھیں- ان کا ضروری

نعمہ یہاں نقل کیا جارہا ہے:

"پیش نظر مجموعے کی اشاعت سے قبل جب میں نے اپنی آج سے پندرہ سولہ سال قبل کی ان تحریروں کا جائزہ تنقیدی نگاہ سے لیا تو الحمد للہ کہ اس امر کا تو پورا اطمینان ہوا کہ ان میں حالات و واقعات کا جو تجزیہ سامنے آیا ہے وہ صد فی صد درست ہے۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ ان میں بعض مقامات پر طرزِ تعبیر اور اندازِ تحریر میں تلخی شامل ہو گئی ہے، جو نہ ہوتی تو بہتر تھا ـــ گویا اگر میں ان موضوعات پر آج قلم اٹھاؤں تو تجزیہ تو بنیادی طور پر وہی ہو گا لیکن انداز اتنا تلخ نہ ہو گا۔

لیکن اب ان تحریروں سے اس تلخی کو نکالنا نہ ممکن ہے نہ مناسب ـــ ممکن اس لئے نہیں کہ وہ ان کے پورے تانے بانے میں بُنی ہوئی ہے، اور مناسب یا درست اس لئے نہیں کہ پرانی تحریروں کو اگر پرانی تحریروں ہی کی حیثیت سے شائع کیا جائے تو ان میں ردّو بدل تصنیف و تالیف کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اگر صاحبِ تحریر کی رائے میں بعد میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو تو اسے اضافی حواشی کی صورت میں درج ہونا چاہئے یا علیحدہ وضاحت کی شکل میں!

اس ضمن میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ میرے ذہنی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدّت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبت و عقیدت کے ساتھ ہوا، جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدّت کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن پھر جب اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی انتہائی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں طویل عرصے تک مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی، لیکن آخر کار اس پر افسوس، ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آ گیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بتمام و کمال عود کر آئے۔

میری پیش نظر تحریریں چونکہ ان تین ادوار میں سے درمیانی دور سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا ان میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے جس کے لئے میں مولانا مرحوم کے تمام محبین و معتقدین سے بھی معذرت خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ۷۹ء میں امریکہ میں مولانا سے میری وہ ملاقات ہو جاتی جس کی ایک شدید خواہش لئے ہوئے

میں وہاں گیا تھا تو میں ان سے بھی معافی حاصل کر لیتا ــــ اس لئے کہ اسی زمانے کے لگ بھگ مجھے ایک اطلاع ایسی ملی تھی جس سے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ مولانا کے دل میں میری جانب سے کوئی تکدّر یا رنج نہیں ہے"۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی تالیف: "اسلام اور پاکستان")

اس سلسلۂ مضامین میں بہت سے ایسے حضرات کا ذکر بھی آرہا ہے جو اس عرصے کے دوران اس عالمِ فانی سے رحلت فرما چکے ہیں ' اللہ تعالےٰ ان کی ' اور ہماری ' اور جملہ مسلمانوں کی خطاؤں سے در گذر فرمائے اور سب کو اپنی رحمت و مغفرت کے سائے میں جگہ مرحمت فرمائے!

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَ شَاھِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا وَ ذَکَرِنَا وَاُنْثٰـنَا ـــــ اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ ، اٰمین!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کردے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد — بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی لاہور

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا

نقضِ غزل

حصّہ اوّل

یعنی

جائزہ کمیٹی سے ماچھی گوٹھ تک

النّحل:۹۲

اور اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے مضبوطی سے کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ــــ!

"یہ مضمون دراصل راقم الحروف کی تالیف "تحریک جماعت اسلامی" کے ایک باب کے طور پر لکھا گیا تھا اور اس کی کتابت بھی ہو گئی تھی لیکن بعد میں اس خیال سے اسے روک لیا گیا کہ اس طرح ایک تو کتاب کی ضخامت بہت بڑھ جائے گی اور دوسرے قاری کا ذہن خالص اصولی اور نظریاتی بحث سے ہٹ کر ان افسوسناک اور پیچ در پیچ واقعات میں الجھ کر رہ جائے گا جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے پیش ہونے کے بعد جماعت اسلامی کے حلقے میں رونما ہوئے۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں صرف اس پر اکتفا کیا گیا کہ وہ قرارداد بھی ضمیمے میں شامل کر دی گئی جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پر جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ نے پاس کی تھی اور وہ قرارداد بھی درج کر دی گئی جو شوریٰ کی اس قرارداد کو منسوخ کر کے جماعت کے کل پاکستان اجتماعِ ارکان منعقدہ ماچھی گوٹھ فروری ۱۹۵۷ء نے پاس کی۔

ان دونوں قراردادوں کے مابین جو واقعات و حوادث جماعت اسلامی پاکستان کے حلقے میں پیش آئے وہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہیں کہ ان ہی کی وجہ سے جماعت ایک خطرناک انتشار سے دوچار ہوئی اور اس کے رہنماؤں اور کارکنوں کی ایک بڑی تعداد جماعت سے مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئی، جس سے پاکستان کی تحریکِ اسلامی کا وقار بری طرح مجروح ہوا۔ چونکہ جماعت کا یہ انتشار تاحال جماعت کے اکثر و بیشتر ارکان و متفقین کیلئے بھی ایک معمہ ہی ہے اور ملک اور بیرونِ ملک کے ان لوگوں کیلئے بھی ایک ناقابلِ فہم مسئلہ بنا ہوا ہے جو اس ملک میں اسلام کے مستقبل سے دلچسپی رکھتے ہیں لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس اصولی اور نظریاتی بحث کے ساتھ ساتھ جو وضاحت کے ساتھ پیش کی جا چکی ہے ان واقعات کو بھی سلسلہ وار ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا جائے جن کی وجہ سے جماعت کے بہت سے رہنما اور کارکن جماعت کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ذیل کا مضمون اس سلسلے کی پہلی قسط ہے۔"

باب اوّل

جائزہ کمیٹی کی رپورٹ

اور اس کے خلاف

مولانا مودودی کی چارج شیٹ

راقم الحروف نے جو بیان جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا، وہ کمیٹی کو پیش کئے جانے والے تحریری بیانوں میں سب سے زیادہ طویل تھا اور اس کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ جبکہ دوسرے اکثر زبانی و تحریری بیان زیادہ تر جماعت اسلامی کے ارکان و متفقین اور خصوصاً اس کے ہمہ وقتی کارکنوں کی دینی و اخلاقی حالت اور دیانت و تقویٰ کے منافی واقعات و معاملات سے بحث کرتے تھے، وہاں اس بیان میں جماعت کی پالیسی پر اصولی تنقید اور اس کے موقف کے بارے میں اصولی بحث کی گئی تھی ــــ اس طرح اس بیان نے اس دینی و اخلاقی گراوٹ و انحطاط کی منطقی توجیہہ پیش کر دی جس کی تفصیل دوسرے تحریری بیانوں میں درج تھی اور جس کا تذکرہ جماعت اسلامی کے بے شمار ارکان نے جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر زبانی گفتگوؤں میں انتہائی دردمندی اور پریشانی کے ساتھ کیا تھا ــــ گویا کہ جبکہ دوسرے زبانی و تحریری بیان جماعت کے امراض کی علامات سے بحث کرتے تھے وہاں اس بیان نے ان امراض کی تشخیص پیش کر دی اور ان اسباب و عوامل کی نشاندہی کر دی جن سے ان امراض نے جنم لیا تھا اور تقویت پائی تھی۔

جائزہ کمیٹی کے بزرگ رکن مولانا عبد الجبار غازی صاحب[1] نے بعد میں ایک موقع پر مجھے

---

[1] اب عرصہ ہوا کہ اللہ کے جوارِ رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔

بتایا کہ "تمہارا بیان پڑھ کر میں نے اپنی نوٹ بک میں یہ الفاظ درج کئے تھے کہ ———
"حیرت ہوتی ہے کہ یہ نوجوان جو ہمارے مقابلے میں جماعت اسلامی میں ایک بالکل نووارد کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے حالات وواقعات کا علم بہت کم ہے محض لٹریچر کے منطقی تجزیئے سے ان نتائج تک پہنچ گیا ہے جن تک ہم بوڑھوں کی رسائی تمام حالات وواقعات کے بچشم سر مشاہدے سے ہوئی ہے۔"

کمیٹی کے ایک دوسرے رکن شیخ سلطان احمد صاحب نے اس بیان کے طریقِ استدلال کا ایک خلاصہ تیار کیا، تاکہ فوری حوالے کے کام آسکے۔ شیخ صاحب موصوف ہی نے مجھے ان بعض مقامات کی اصلاح کی جانب بھی متوجہ کیا جہاں شدّتِ جذبات میں سخت الفاظ استعمال ہو گئے تھے، چنانچہ میں نے ایسے سخت الفاظ اور جملوں کو قلم زد کر دیا جن سے دلآزاری ہو سکتی تھی اور اصلاح کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی کے پیدا ہو جانے کا امکان تھا۔ کمیٹی کے کنوینر حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور اس کے چوتھے رکن مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے بھی منجملہ اس بیان کو پسند فرمایا اور اس محنت پر مجھے داد دی جو میں نے دو ہفتے کے مختصر وقفے میں اس بیان کے تحریر کرنے پر صرف کی تھی۔

رپورٹ جائزہ کمیٹی...... جائزہ کمیٹی نے پورے ملک کا دورہ کرنے اور ان ارکان سے ملاقات کے بعد جو جماعت کی پالیسی اور طریق کار یا اس کے نظم ونسق اور دستور سے متعلق اپنا نقطہ نظر کمیٹی کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے، کچھ عرصہ اس پورے مواد کو مرتّب کرنے میں صرف کیا اور بالآخر ایک جامع رپورٹ وسط نومبر ۱۹۵۶ء میں امیر جماعت کی خدمت میں پیش کر دی۔

یہ رپورٹ تاحال جماعت اسلامی پاکستان کا ایک اعلیٰ سطح کا راز (TOP LEVEL SECRET) ہے۔ ایک رکن شوریٰ کے ان الفاظ سے کہ "دراصل جائزہ کمیٹی نے پوری جماعت میں جھاڑو پھیر کر اس کا سارا گند جمع کیا ہے اور اس غلاظت کے ڈھیر کو اس رپورٹ کی شکل میں پیش کر دیا ہے"۔ کسی حد تک اس رپورٹ کے مواد کے بارے میں اندازہ ہو سکتا ہے اور اگرچہ ان ہی رکن شوریٰ نے یہ کہہ کر "میں دعوے سے کہتا ہوں کہ دورِ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں بھی کوئی ایسی جائزہ کمیٹی مقرر کی جاتی تو اس سے بھی زیادہ گندا مواد جمع کر کے پیش کر سکتی تھی" اپنے آپ کو اور اپنی طرز پر سو...

والے دوسرے لوگوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ لیکن اس مواد سے جس طرح کال
جماعت کے اربابِ حل وعقد پر طاری ہو گیا تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ج
مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس کے موقع پر اس رپورٹ کی نقول ارکانِ شوریٰ کو دی گئیں تو
کو انتہائی تاکید کے ساتھ ہدایت کی گئی کہ اس کی یا اس کے کسی حصے کی نقل شوریٰ سے با
جانے پائے اور جب ایک موقع پر ایک رکنِ شوریٰ نے انتہائی سراسیمگی کے عالم میں اعلان
کہ ان کا نسخہ غائب ہو گیا ہے تو پوری شوریٰ پر سنسنی طاری ہو گئی اور ایک کھلبلی سی مچ گئی
اطمینان کا سانس اس وقت تک نہ لیا جا سکا جب تک یہ معلوم نہ ہو گیا کہ ان صاحب کا نسخہ
نہیں ہوا بلکہ وہیں کہیں کاغذوں میں اِدھر اُدھر ہو گیا تھا اور محض گھبراہٹ کی وجہ سے مل نہیں
تھا۔

اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ........... جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا
اجلاس جو ۲۵ر نومبر سے ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۶ء تک تقریباً دو ہفتے جاری رہا، جماعت کی تاریخ
ایک اہم واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اجلاس میں مجلس شوریٰ کے تمام فعال اور با
اراکین واضح طور پر دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ جماعت
اسلامی غلط رخ پر بڑھ آئی ہے۔ ۴۷ء میں طریق کار میں جو تبدیلی کی گئی تھی وہ اصولاً اور مص
دونوں ہی اعتبار سے غلط تھی اور اب خیریت اسی میں ہے کہ فوراً اس سے رجوع کیا جائے ا
"اوپر سے نیچے" انقلاب لانے کے خواب دیکھنا چھوڑ کر پھر وہی "نیچے سے اوپر" کی طرف
تبدیلی لانے کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اور دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ یہ فیصلہ جماعت
اسلامی کے حق میں مہلک ثابت ہو گا۔ جماعت کو اسی موجودہ طریقِ کار پر کاربند ر
چاہئے۔ خرابیاں اول تو اتنی نہیں ہیں جتنی کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے معلوم ہوتی ہیں ا
جتنی ہیں وہ فطری ہیں اور انسانی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں یہ خرابیاں نہ پائی جا
ہوں۔ حتیٰ کہ عین دورِ صحابہؓ میں بھی اگر کوئی جائزہ کمیٹی اس طرز سے "جائزہ" لیتی تو ایسا
نہیں اس سے بھی کہیں زیادہ غلیظ مواد جمع کر سکتی تھی۔ پہلے خیال کے پیش کرنے والوں م
سب سے زیادہ نمایاں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب تھے اور ان کے علاوہ عبدالغفار حس
صاحب اور شیخ سلطان احمد صاحب نے اس خیال کی تائید میں بڑی مؤثر اور دردانگیز تقریر
کیں۔ دوسری جانب کے خطیب اعظم جناب نعیم صدیقی تھے۔

مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے بظاہر اپنے آپ کو "بزرگا

جماعت" کی حیثیت سے اس بحث سے بالاتر رکھا لیکن مولانا امین احسن صاحب کے بارے میں یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ وہ پہلے گروہ سے اتفاق رکھتے ہیں حتیٰ کہ انہوں نے راقم الحروف کے بیان کو پڑھا تو اس کو بہت سراہا اور تمام ارا کین شوریٰ کو بشمول امیر جماعت یہ مشورہ دیا کہ وہ اس بیان کو ضرور پڑھیں۔ مولانا کے الفاظ کچھ اس طرح کے تھے۔

"اگرچہ اس شخص (راقم الحروف) نے خود مجھ پر بہت سخت تنقید کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس سے خوشی ہی ہوئی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمام ارا کین شوریٰ اس بیان کو پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص نے ہماری ہی تحریروں سے مرتب کر کے ایک آئینہ ہماری نگاہوں کے سامنے لا رکھا ہے جس میں ہم اپنی موجودہ صورت دیکھ سکتے ہیں"۔

مولانا مودودی صاحب نے اگرچہ براہِ راست بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا اور چند باتیں کہیں تو بھی اس انداز سے کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ پہلو بھی نگاہوں کے سامنے آ جائیں ورنہ یہ میری پختہ اور طے شدہ آرا نہیں ہیں۔ لیکن جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے ان کی ناگواری اور اس پوری بحث سے جو انقباض ان کو ہو رہا تھا، وہ ان کے بشرے سے بالکل ظاہر تھا اور اس کا ہلکا سا اظہار انہوں نے اس طرح کر بھی دیا کہ امارتِ جماعت سے استعفاء اس بنا پر پیش کر دیا کہ چونکہ اس رپورٹ میں مجھ پر ذاتی طور پر بہت تنقید ہوئی ہے اور الزامات لگائے گئے ہیں، لہٰذا میں امارت سے مستعفی ہوتا ہوں تاکہ اس رپورٹ پر غور و خوض میری زیرِ صدارت نہ ہو۔ لیکن ان کے اس خیال کی پوری شوریٰ نے متفقہ طور پر تردید کر دی اور کہا کہ یہاں غالباً کوئی ایک شخص بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اس رپورٹ یا اس سے ملحقہ بیانات میں ہدفِ تنقید و ملامت نہ بنا ہو لہٰذا اس کی کوئی حاجت نہیں کہ کوئی ایک شخص اپنے منصب سے مستعفی ہو۔

جماعت کے تیسرے بزرگ رکن مولانا عبدالجبار غازی صاحب نے بحث میں تفصیلاً حصہ لینے کے بجائے انتہائی جذباتی انداز میں مولانا مودودی صاحب کو وہ کیفیات یاد دلائیں جو جماعت کے قیام کے وقت دلوں میں پائی جاتی تھیں اور مولانا سے درخواست کی کہ اب بھی وقت ہے کہ اصلاح کر لی جائے اور اسی اعتماد اور اتحاد کی فضا کو پیدا کر کے از سرِ نو اسی جذبے اور ولولے کے ساتھ تحریک اسلامی کی تجدید کی جائے۔ غازی صاحب پر شوریٰ کی اس صورتِ حال نے کہ وہ دو متحارب گروہوں میں بٹ گئی تھی، بہت برا جذباتی اثر ڈالا۔ چنانچہ دورا

اجلاس ان پر قلب کا دورہ پڑا اور وہ صاحب فراش ہو گئے اور بقیہ اجلاس میں شرکت نہ کر سکے۔

شوریٰ کے دونوں متضاد اور متحارب گروہوں کا اختلاف انتہا (CLIMAX) پر پہنچا پھر ایک ردِ عمل پیدا ہوا' اور اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ دونوں انتہاؤں کو چھوڑ کر اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔ چنانچہ "مصالحت" کی کوششیں شروع ہو گئیں اور بہت کچھ ردّ و کد اور کسر و انکسار کے بعد ایک قرار داد پر "اتفاق" ہو گیا جس کے الفاظ درجِ ذیل ہیں۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس شوریٰ جماعتِ اسلامی پاکستان دو ہفتوں کے مسلسل غور و خوض کے بعد ان تمام مسائل و معاملات کے متعلق جو جماعت کے پچھلے کام' آئندہ لائحہ عمل اور عام حالات کے بارے میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے ذریعہ سے زیر بحث آئے تھے، حسب ذیل نتائج پر پہنچی ہے۔

(۱)...... جماعت نے تقسیم ملک سے پہلے اور بعد اب تک جو کام کیا ہے اس کے متعلق مجلس شوریٰ اس بات پر مطمئن ہے کہ جماعت اپنے اصول' مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے۔ البتہ تدابیر کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں اور صحیح قرار دینے کی صورت میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفید نتائج کے ساتھ بعض مضر نتائج بھی بر آمد ہوئے ہیں۔ جنہیں رفع کرنے کی ہم سب کو کوشش کرنی چاہئے۔

(۲)...... مجلس شوریٰ کی رائے میں جو لائحہ عمل ۱۹۵۱ء کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں پیش کیا گیا تھا اور جو اب تک جماعت اسلامی کا لائحہ عمل ہے' وہ اصولاً بالکل درست ہے اس کو برقرار رہنا چاہئے۔ لیکن مجلس شوریٰ یہ محسوس کرتی ہے کہ دستورِ اسلامی کی پیہم جدوجہد کی وجہ سے لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کے لئے خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا ہے اور اس کے باعث ہمارے بنیادی کام میں بہت بڑی کسر رہ گئی ہے اس لئے مجلس کی متفقہ رائے یہ ہے کہ جماعت کی بنیادی دعوت اور لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کی طرف اب پوری توجہ اور کوشش صرف کرنے کی ضرورت ہے اور اس بنا پر سر دست کسی انتخابی مہم کے لئے کام کرنا قبل

ازوقت ہو گا۔ البتہ اسلامی اقدار کے قیام و بقاء اور دستور اسلامی کے تحفظ، اصلاح اور نفاذ کے لئے ناگزیر اقدامات سے دریغ نہ ہونا چاہیئے۔

(۳) ...... مجلس کی رائے میں نظام جماعت کے اندر اصل حجت کتاب و سنت ہے اور اس کے بعد آئینی سند ہونے کی حیثیت جماعتی لٹریچر کی عبارات کو نہیں بلکہ دستور جماعت اور ان جماعتی فیصلوں کو حاصل ہے جو دستور کے مطابق جماعت کے مجاز اداروں (امارت، مجلسِ شوریٰ اور ارکان کے اجتماع عام) نے کیئے ہوں۔ البتہ لٹریچر ایک مستقل ذریعۂ دعوت ہے اور رہے گا۔ اگر جماعتی فیصلوں میں کوئی چیز لٹریچر کے کسی مضمون سے مختلف پائی جائے تو وہ یا تو اس مضمون کی ناسخ ہو گی یا اس مضمون کے وہی معنی معتبر ہوں گے جو جماعتی فیصلوں کے مطابق ہوں۔

(۴) ... جائزہ کمیٹی کے ذریعہ سے جماعت کے جو اصلاح طلب حالات و معاملات مجلس کے سامنے آئے ہیں ان کے حقیقی اسباب مشخص کرنے اور ان کی اصلاح کے لئے مناسب تدابیر تجویز کرنے کا کام ایک مجلس کے سپرد کر دیا گیا ہے جو امیر جماعت، مولانا امین احسن صاحب، چودھری غلام محمد صاحب اور نعیم صدیقی صاحب پر مشتمل ہو گی۔ علاوہ بریں جائزہ کے دوران میں جن متعین واقعات کی نشان دہی مختلف مقامات پر جائزہ کمیٹی کے سامنے کی گئی ہے، ان کی تحقیقات اور اصلاح کے لئے مجلس شوریٰ نے مناسب طریقہ تجویز کر دیا ہے جس کے مطابق حتی الامکان جلدی کارروائی کی جائے گی"۔

یہ قرارداد ایک مصالحتی فارمولا تھی جو محض اس خوف کے منفی محرک سے معرض وجود میں آئی تھی کہ اگر کچھ لے اور دے یعنی (GIVE AND TAKE) کے اصول کے تحت "صلح" نہ کی گئی تو جماعتِ اسلامی کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ اس میں ایک طرف اس خطرے کا سدباب کیا گیا کہ اگر یہ اعتراف کر لیا گیا کہ ہم نو دس سال ایک غلط راستے پر چلتے رہے ہیں تو نہ صرف یہ کہ جماعت کے کارکنوں کی ہمت شکنی ہو گی اور ان میں کام کرنے کا جذبہ باقی نہ رہے گا، بلکہ جماعت کی قیادت پر سے ان کا اعتماد بالکل اٹھ جائے گا اور اس کا وہ وقار باقی نہیں رہے گا جو نظمِ جماعت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ "تدابیر کے

یح اور غلط ہونے کے بارے میں دو رایوں" کے امکان کو تسلیم کرنے اور "بعض مضر نتائج" کے بر آمد ہونے کے اقرار کے ساتھ ساتھ کارکنانِ جماعت کو اطمینان دلایا گیا کہ ' جماعت اپنے اصول' مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے" ۔

دوسری طرف جماعت کی بعد از تقسیم کی پالیسی میں نہ صرف یہ کہ "عدم توازن" کا فرار کیا گیا جس کی بنا پر جماعت کے "بنیادی کام میں بڑی کسر رہ گئی ہے"۔۔۔۔ بلکہ عملاً اس ریق کار کے ایک ستون یعنی "انقلابِ قیادت بذریعہ انتخابات" کو بالکل ہی منہدم کر دیا گیا ر دوسرے ستون یعنی "دستور اسلامی کے تحفظ' اصلاح اور نفاذ" کے لئے بھی بس 'ناگزیر" اقدامات کی اجازت بر قرار رکھی گئی۔

اس طرح یہ قرار داد ایک پیچیدہ مصالحتی فارمولا بن گئی جو اپنے الفاظ اور ان کی ترتیب کے اعتبار سے کسی ذہین مصنف کا شاہکار تو قرار دی جا سکتی تھی لیکن اس سے اس کا کوئی امکان یں تھا کہ جماعت کے کارکنوں کو ذہنی اطمینان حاصل ہوتا اور ان کے سامنے اپنے سفر کا خ اور آئندہ کے طریق کار کا واضح نقشہ آسکتا۔

اس قرارداد پر دستخط ثبت کر کے شوریٰ نے اطمینان کا سانس لیا اور اس طرح بزعم یش جماعت اسلامی کو انتشار سے بچا کر شوریٰ کے معزز اراکین اپنے اپنے گھروں کو روانہ گئے۔

دِ عمل............!

لیکن جلد ہی شوریٰ کے اس اجلاس کی کارروائی اور اس کی پاس کردہ اس قرارداد کے لاف ردِّ عمل شروع ہوا۔

ایک طرف اراکینِ شوریٰ اپنے اپنے حلقوں کو لوٹے اور وہاں ارکانِ جماعت نے ان سے قرارداد کی وضاحت طلب کی تو مختلف طرزِ خیال کے لوگوں نے اپنے نقطۂ نظر سے وضاحت ا اور شوریٰ میں جو واقعی ذہنی انتشار موجود تھا وہ جنگل کی آگ کی طرح جماعت کے بعض لقوں کے ارکان میں پھیلنا شروع ہو گیا۔

دوسری طرف مولانا مودودی صاحب پر ایک شدید ذہنی اور نفسیاتی ردِّ عمل کے اثرات نما ہوئے۔ ظاہر بات ہے کہ مولانا موصوف ہی جماعت اسلامی کے مؤسس تھے اور وہی یوم تاسیس تا امروز اس کے امیر رہے تھے۔ جماعت کی بعد از تقسیم پالیسی کے معمار

(ARCHITECT) بھی خود وہی تھے۔ لہٰذا اس پالیسی کے بارے میں اس فیصلے سے کہ یہ غلط تھی، ایک طرح سے ان کے فہم و فراست پر حرف آتا تھا اور اس کو برداشت کرنے کے لئے بہت زیادہ ہمت کی ضرورت تھی۔ (وَمَا یُلَقّٰھَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ) شوریٰ کے اجلاس کے دوران کچھ تو مولانا ہمت قائم کئے رہے اور کچھ شوریٰ کی اکثریت چونکہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے شدید متاثر تھی لہٰذا بے بس سے بھی رہے۔۔۔ لیکن اجلاس کے بعد ان کی طبیعت میں ردِّ عمل شروع ہوا جس کو ان کے آس پاس جماعت کے مرکزی عملے کے لوگوں نے تقویت پہنچائی۔ درحقیقت یہ مولانا مودودی کے لئے آزمائش کا ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ ان کے سامنے دو راستے کھلے تھے:۔

ایک اصلاح کی سواء السبیل، کہ غلطی کا اعتراف کر کے تلافیٔ مافات کی سعی کی جاتی۔۔۔ اور جلدی میں جو اقدام ۴۷ء میں کر دیا گیا تھا، اس کو غلط تسلیم کر کے ازسرِنو سفر شروع کیا جاتا۔۔۔ اس میں اس تحریک کی خیر بھی تھی اور اسی کا تقاضا وہ "شورائیت" اور "جمہوریت" بھی کرتی تھی جس پر جماعت کے دستور کی بنیاد رکھی گئی تھی کہ اب جبکہ مرکزی مجلس شوریٰ کی ایک واضح اکثریت نے ایک واضح DIRECTIVE دے دیا تھا، مولانا شوریٰ کی رائے کا احترام کرتے اور جماعت کا رخ تبدیل کر دیتے۔۔۔ اگر مولانا ایسا کرتے تو شوریٰ کے وہ اراکین جنہوں نے انہیں اس رخ پر مڑنے پر مجبور کیا تھا، بہرحال ان کے دیرینہ نیازمند اور رفیق کار اور ان ہی کی دعوت پر جمع ہونے والے لوگ تھے۔ اور اس کا کوئی سوال نہ تھا کہ مولانا کے ان سے "شکست" کھانے کا تصور پیدا ہوتا۔

دوسری اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ کی قدیم راہ کہ طریق کار کی تبدیلی کو اپنی ذاتی شکست تصور کر کے "عزت نفس" کے تحفظ کے لئے مرنے مارنے پر تُل جایا جائے۔

بدقسمتی سے مولانا مودودی نے اس دوسری راہ کو اختیار کیا اور آیۂ قرآنی وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا کا مصداق بن گئے اور پوری بے رحمی کے ساتھ اس سارے تانے بانے کو تار تار کرنے پر تُل گئے جسے بہت محنت مشقت سے بیس پچیس سال کی محنت سے خود بُنا تھا۔

ارکان جائزہ کمیٹی پر الزامِ سازش.......... چنانچہ شوریٰ کے اجلاس کے خاتمے کے بارہ تیرہ دن بعد ہی مولانا مودودی صاحب نے جائزہ کمیٹی کے ارکان کے بارے میں ایک چارج شیٹ مرتب کی اور قیم جماعت کو ہدایت کی کہ وہ اس کو ارکانِ جائزہ کمیٹی کو بھیج دیں۔

یہ مہلک دستاویز جس نے جماعت اسلامی کو سر سے پیر تک ہلا کر رکھ دیا یہ تھی۔

"مورخہ ۲۳؍ دسمبر ۵۶ء

جائزہ کمیٹی کی کارگزاری اور اس کے بعد اس کمیٹی کے اس رویہ پر جو اس نے مجلس شوریٰ میں اختیار کیا خوب غور کرنے کے بعد میں حسب ذیل نتائج پر پہنچا ہوں:۔

۱۔ یہ کمیٹی جسے غیر مطمئن ارکان کے خیالات معلوم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا، دراصل خود غیر مطمئن بلکہ انتہائی غیر مطمئن ارکان پر مشتمل تھی۔ مجلس شوریٰ میں کمیٹی کے ارکان کی تقریروں سے اب یہ بات قطعی طور سے ظاہر ہو چکی ہے کہ ان کے خیالات اور دلائل اور اخذ کردہ نتائج بالکل وہی ہیں یا قریب قریب وہی ہیں جو اس کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والے لوگوں میں سب سے زیادہ غیر مطمئن اصحاب کے ہیں۔

۲۔ درحقیقت یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ایک ایسی کمیٹی جس کے سپرد اس قدر اہم کام کیا گیا تھا، ایک ہی عنصر اور وہ بھی انتہائی غیر مطمئن عنصر پر مشتمل ہو۔ لیکن چونکہ کمیٹی مقرر کرتے وقت اس کے ارکان کے خیالات کی اس انتہاپسندی اور شدت کا نہ صرف مجھے بلکہ اکثر ارکان شوریٰ کو کوئی اندازہ نہ تھا اس لئے کسی کو اس کی ترکیب کے غلط ہونے کا احساس نہ ہوا۔

۳۔ میں اس کی کوئی وجہ نہیں سمجھ سکا کہ خود اس کمیٹی کے ارکان نے کسی مرحلہ پر بھی آخر یہ کیوں محسوس نہ کیا کہ اس نازک کام کا کلیتہً ان ہی کے سپرد کرنا اور رہنا کس قدر نامناسب ہے۔ یہ تصور کرنا میرے لئے مشکل ہے کہ اس پورے کام کے دوران میں کسی وقت بھی، وہ یہ محسوس نہ کر سکے تھے کہ وہ معاملات کو تقریباً ایک ہی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور وہ اس بات سے بھی ناواقف تھے کہ مجلس شوریٰ میں تمام لوگوں کا نقطۂ نظر وہ نہیں ہے جو ان کا اپنا ہے۔ میرے نزدیک ان کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ مجھے اور مجلس شوریٰ کو معاملہ کی اس نوعیت سے آگاہ کر کے خود اس امر کی ضرورت ظاہر کرتے کہ کمیٹی میں دوسرے نقطۂ نظر کے لوگوں کو بھی شامل ہونا چاہئے۔ مجھے افسوس ہے کہ انہوں نے اس فرض کا نہ احساس کیا نہ اس کو ادا کیا، اور نہ مجلس شوریٰ میں اس امر کا اعتراف کیا کہ کمیٹی کی

تشکیل میں یہ بنیادی خامی موجود تھی بلکہ شوریٰ کے اجلاس میں جب کبھی اس خامی کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی گئی توان کی طرف سے بڑی تلخی کے ساتھ اس کی مزاحمت ہوئی۔

۴۔ میں یہ قطعی رائے رکھتا ہوں کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان نے مجلس شوریٰ کے تجویز کردہ حدودِ کار سے تجاوز کیا' خود اپنے حدود کار کو وسیع کیا اور ان امور کی تحقیقات اپنے ذمہ لے لی' جن کی وہ خود تحقیقات کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ اگر مجلس شوریٰ کو فی الواقع ان امور کی تحقیقات کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ کوئی دوسری کمیٹی دوسرے حدودِ کار کے ساتھ اور دوسری ہدایت کے ساتھ مقرر کرتی اور اس کے لئے وہ طریق کار ہرگز اختیار نہ کرتی جو اس کمیٹی نے اختیار کیا۔ میں امیر جماعت ہونے کی حیثیت سے یہ بات بالکل غیر مبہم انداز میں کہتا ہوں کہ کمیٹی کے تقرر کے وقت میرے ذہن میں ہرگز یہ تصور نہ تھا کہ اس نوعیت کی تحقیقات اس کمیٹی کے سپرد کی جارہی ہیں، ورنہ میں یہ کام اس طریقہ سے کرنے کے لئے اس کمیٹی کے تقرر پر راضی نہ ہوتا۔ لیکن مجلس شوریٰ کے اجلاس میں جب میں نے کمیٹی کے کام کی اس دوسری بنیادی خرابی کو بیان کرنے کی کوشش کی تو نہایت تلخ انداز میں اس کی بھی مزاحمت کی گئی بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں میرا منہ بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ یہ حضرات اب مجلس شوریٰ میں ایسے حالات پیدا کر رہے ہیں جن میں کوئی دوسرا رکنِ شوریٰ تو درکنار خود امیر جماعت بھی اپنی رائے آزادی کے ساتھ ظاہر نہیں کرسکتا۔

۵۔ اس کمیٹی نے ساری تحقیقات بالکل ایک مخصوص نقطۂ نظر سے کی اور اپنی رپورٹ میں جماعت کی صرف ایک رخی تصویر پیش کرنے ہی پر اکتفانہ کیا بلکہ سارے مواد کو اس طرز پر مرتب کیا کہ جن انتہائی نتائج پر وہ مجلس شوریٰ کو پہنچانا چاہتی تھی ان کی تائید اس پورے مواد سے حاصل ہو۔ میں نے اس خامی کی طرف بھی مجلس شوریٰ کی توجہ دلانے کی کوشش کی ——————

—————— کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ رپورٹ کی اس مخصوص ہیئت سے بحیثیت مجموعی مجلس شوریٰ کے ذہنی توازن پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ اور وہ اس کے تحت غلط فیصلے کرسکتی ہے۔ لیکن اس خدمت کی انجام دہی سے بھی جو دیانۃً امیرِ

جماعت ہونے کی حیثیت سے میرا فرض تھا' مجھے اس تلخی کے ساتھ روکا گیا اور میں نے محسوس کیا کہ جتھہ بندی کر کے میرے لئے وہ حالات پیدا کئے گئے ہیں' جن میں' میں امیر جماعت کے فرائض انجام دینے کے بجائے بعض مخصوص لوگوں کا آلۂ کار اور ان کے اشاروں پر چلنے والا بن کر رہوں۔

۶۔ اس صورت حال کو دیکھ کر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ یا تو امارت سے مستعفی ہو جاؤں یا جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا خطرہ مول لے کر اپنے فرائض اس سختی کے ساتھ انجام دوں جو ایسے حالات میں ایک فرض شناس امیر جماعت کو اختیار کرنی چاہئے۔ میں نے جماعت کی بہتری اسی میں سمجھی تھی کہ پہلی صورت اختیار کروں چنانچہ میں نے استعفاء پیش بھی کر دیا۔ مگر افسوس ہے کہ اسے قبول نہ کیا گیا اور مجھے مجبور کر دیا گیا کہ یا تو میں دوسری صورت اختیار کروں یا پھر مجلس شوریٰ کو ان غلط نتائج پر پہنچ جانے دوں جن پر یہ حضرات اسے اپنی جتھہ بندی کے ذریعہ پہنچانا چاہتے تھے۔ اور مزید بر آں ان نتائج کو جماعت میں نافذ کرنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لوں۔

۷۔ مجلس شوریٰ میں ان لوگوں کے غلط رویہ کی وجہ سے جس میں ضد' بے جا اصرار' شدت اور جتھہ بندی کے سارے عناصر پائے جاتے تھے' آپ سے آپ ان ارکان شوریٰ کے اندر بھی ایک مخالف پارٹی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی جو ان کے ہم خیال نہ تھے۔ اس طرح جماعت اسلامی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جماعت کے اندر جماعتیں بننے کا عملاً آغاز ہو گیا' جسے اگر اسی وقت نہ روکا گیا تو میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ تحریک اور جماعت بہت برے انجام سے دوچار ہو گی۔

۸۔ یہ بھی جماعت کی تاریخ میں پہلا ہی موقعہ ہے کہ مجلس شوریٰ کے اندر ایک جتھہ نے اپنی شدت' ہٹ اور مشترک کوشش بلکہ جماعت میں تفریق برپا ہو جانے کے خطرے کا دباؤ ڈال کر امیر جماعت اور بقیہ ارکان شوریٰ سے اپنی بات منوانے اور پھر بالآخر ایک مصالحتی فارمولا طے کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور اس طرح "مصالحتی فارمولا" میں کچھ چیزیں اس طرح داخل کرانے کی کوشش کی کہ گویا یہ ان کی طرف سے جماعت کے اندر رہنے یا جماعتی تفریق کی سعی سے باز رہنے کی شرائط ہیں' جن سے ہٹنے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ میں اسے جماعت

اسلامی کی بدقسمتی کا آغاز سمجھتا ہوں اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس رجحان کی ہمت افزائی کی گئی تو یہ جماعت خراب ہو کر رہے گی۔

۹۔ میں یہ رائے تو قطعاً نہیں رکھتا بلکہ مجھے اس کا شبہ بھی نہیں ہے کہ جائزہ کا یہ پورا کام اور مجلس شوریٰ میں جائزہ کمیٹی کے ارکان کا کردار ایک دانستہ سازش کا نتیجہ تھا۔ لیکن میرا احساس یہ ہے کہ اس سے عملاً نتائج وہی بر آمد ہوئے ہیں جو ایک دانستہ سازش سے بر آمد ہو سکتے تھے اور اب نہیں تو آئندہ اس سے جماعت اسلامی میں نجویٰ اور سازشی طریق کار اور جتھہ بندی اور جتھوں کی کشمکش کا دروازہ کھل جائے گا۔ جو طریق کار کمیٹی کے ارکان نے اختیار کیا اس سے عملاً معاملہ کی جو صورت بنی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی بات منوانے کے لئے مجلس شوریٰ میں آنے سے پہلے انہوں نے جماعت کے فراہم کئے ہوئے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر پوری جماعت میں اپنے ہم خیال لوگ ڈھونڈے۔ ان کا ایک جتھہ مجلس شوریٰ کے باہر تیار کیا۔ ان کے انفرادی خیالات و نظریات کو جمع کر کے ان کا ایک اجتماعی مقدمہ بنایا۔ اس مقدمہ کی پشت پر جماعت کے ان سارے لوگوں کی شکایات و اعتراضات کو جمع کیا جن کے وہم و گمان میں بھی اس خاص مقدمہ کو مضبوط کرنے کا تخیل نہ تھا۔ پھر اس سروسامان سے لیس ہو کر یہ حضرات یکایک مجلس شوریٰ کے سامنے ایک پارٹی کی صورت میں نمودار ہوئے اور پوزیشن یہ اختیار کی کہ ان کے نظریات صرف ان ہی کے نظریات نہیں ہیں بلکہ باہر غیر مطمئن لوگوں کی ایک کثیر تعداد ان کی پشت پر موجود ہے لہٰذا یا مجلس شوریٰ اس راستہ پر چلے جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہیں ورنہ جماعت میں ایک بڑی پھوٹ پڑ کر رہے گی۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ چال چلنے کا ارادہ کیا گیا تھا یا نہیں مگر مجلس شوریٰ کو اور خود مجھے جس صورت واقعی سے دوچار ہونا پڑا وہ یہی تھی اور اس کا اثر ایک دانستہ سازش سے کچھ بھی مختلف نہ تھا۔

ان امور پر غور کرنے کے بعد میں اس قطعی رائے پر پہنچ چکا ہوں کہ میرے لئے مجلس شوریٰ میں ان ارکان کے ساتھ کام کرنا بالکل ناممکن ہے جن پر جائزہ کمیٹی مشتمل تھی۔ بعض اور حضرات کا رویہ بھی میرے لئے ناقابل برداشت ہو چکا ہے مگر ان کا نوٹس میں بعد میں لوں گا۔ سردست جائزہ کمیٹی کے ارکان کے

معاملہ میں دو صورتیں تجویز کرتا ہوں۔

اوّل یہ کہ وہ خود مجلس شوریٰ کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔

دوم یہ کہ میرے اس نوٹ کو ان کے حلقہ انتخاب میں ارکان تک پہنچا دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ اگر وہ مجھ سے امارت کی خدمت لینا چاہتے ہیں تو اپنے ان نمائندوں کو واپس لے کر دوسرے نمائندے منتخب کریں۔

قیّم جماعت کو میں ہدایت کرتا ہوں کہ اس نوٹ کی نقلیں ان چاروں حضرات کو بھیج دیں اور ان سے درخواست کریں کہ آئندہ حلقہ وار اجتماعات سے پہلے مرکز کو اطلاع دیں کہ وہ ان دونوں صورتوں میں سے کس کو پسند کرتے ہیں۔

اگرچہ غازی صاحب آخر تک مجلس شوریٰ کی کارروائیوں میں شریک نہیں رہے ہیں اور اس بنا پر وہ ان تمام باتوں کے ذمہ دار قرار نہیں دیئے جاسکتے جن کا ذکر پیراگراف نمبر چھ سے نمبر ۹ تک کیا گیا ہے لیکن باقی امور کی ذمہ داری میں وہ بھی برابر کے شریک ہیں۔

میری طرف سے ان چاروں حضرات کو پورا اطمینان دلا دیا جائے کہ آنے والے حلقہ وار اجتماعات میں ان کو ارکان جماعت کے سامنے اپنے خیالات کو پیش کرنے کا کھلا اور آزادانہ موقعہ دیا جائے گا۔ اگر وہ ارکان جماعت کو یا ان کی اکثریت کو ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو انشاء اللہ جماعت کی قیادت ان کی طرف منتقل ہونے میں ذرہ برابر بھی رکاوٹ پیش نہ آئے گی لیکن اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکیں تو یہ فیصلہ کرنا ان کا اپنا کام ہو گا کہ آیا وہ مطمئن ہو کر اس جماعت کے ساتھ چل سکتے ہیں یا نہیں۔ مطمئن نہ ہونے کی صورت میں ان کے لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ جماعت سے الگ ہو کر جس طریقہ پر خود کام کرنا صحیح سمجھتے ہوں اس پر عمل کریں۔ اس جماعت کے اندر نظریات کی کشمکش برپا کرنے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ نہ وہ خود دین کی کوئی خدمت کر سکیں گے اور نہ جماعت کے دوسرے لوگ ہی کسی خدمت کے قابل رہ جائیں گے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اس جماعت کو خراب کرنا کسی غیر مطمئن رکنِ جماعت کی نگاہ میں بھی کوئی خدمتِ دین تو نہ ہو گا"۔

(دستخط) ابوالاعلیٰ

۲۳ر دسمبر ۵۶ء

باب دوم

مولانا اصلاحی کا جوابی حملہ

اور جائزہ کمیٹی کا دفاع

ارکان جائزہ کمیٹی کے نام مولانا مودودی صاحب کا یہ "الزام نامہ" نہ صرف "جمہوریت" اور "شورائیت" اور عدل و انصاف بلکہ ـــــ راست معاملگی (FAIR DEALING) تک کی نفیٔ کامل تھا۔ اس کے بین السطور سے مولانا موصوف جو ذہنی کیفیت سامنے آتی ہے اور ان کا جو طرز عمل ظاہر ہوتا ہے وہ شاید اس بدنام زمانہ ماہر سیاسیات کی روح کے لئے تو موجب مسرت و شادمانی ہوا ہو جسے دنیا میسکیا ویلی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ باقی جس کے علم میں بھی یہ "حکم نامہ" آیا وہ حیران و پریشان اور ششدر و مبہوت ہو کر رہ گیا ـــ! ارکانِ جائزہ کمیٹی کے لئے تو یہ اتنی شدید ذہنی و روحانی کرب و اذیت کا موجب تھا ہی جس سے وہ ایک صدمے کی سی حالت سے دوچار ہو گئے ـــــــــــــ

ـــ خود مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علم میں جب یہ آیا تو ان پر سکتہ طاری ہو گیا خود ان ہی کی اس زمانے کی بیان کی ہوئی تفصیل کے مطابق 'ان کا یہ حال ہو گیا کہ جیسے ایک ہاتھ پیر جواب دے گئے ہوں۔ تقریباً سولہ سترہ سال جس جماعت کے لئے اپنی صلاحیتوں اور اوقاتِ عزیز کا اکثر و بیشتر حصہ صرف کیا تھا اچانک اس کا یہ انجام نگاہوں کے سامنے آیا کہ! یہ اب منتشر ہوا چاہتی ہے اور ایک شخص کی زخم خوردہ انا' طیش میں 'اس کے شیرازے کو منتشر کرنے پر تُل گئی ہے۔ مولانا اُن دنوں فرمایا کرتے تھے کہ بار بار خیال آتا تھا کہ جاؤں اور مولانا مودودی کو سمجھاؤں کہ وہ اس اقدام سے باز آ جائیں' پھر سوچتا تھا کہ ان کی اس تحریر کے بعد اصلاح کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ مولانا کے اپنے الفاظ میں:

"میں وہ ہوں کہ میری آنکھیں انتہائی تاریکی میں بھی روشنی ڈھونڈھ نکالتی ہیں' لیکن اس وقت مجھے بھی روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی"۔

بارہا ایسا ہوا کہ مولانا اصلاحی صاحب نے مولانا مودودی سے ملنے کو جانے کے لئے کپڑے تبدیل کر لئے پھر مایوسی کا غلبہ ہوا اور جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ آخر کار کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے مولانا اصلاحی صاحب نے دو ایک ملاقاتوں میں 'مولانا مودودی کو اس اقدام کی غلطی او ہلاکت آفرینی کی جانب متوجہ کیا۔ مولانا مودودی ہر بار مزید غور کرنے کا وعدہ کر کے ٹالتے رہے۔ چند دن بعد جب مولانا اصلاحی صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ جائزہ کمیٹی کے ایک رکن جن کو کسی وجہ سے اب تک "الزام نامہ" نہیں پہنچایا جاسکا تھا' ان کو بھی پہنچا دیا گیا' تو پھر مجبور مولانا اصلاحی صاحب نے اپنا وہی قلم جو ایک طویل عرصے سے مولانا مودودی کی حمایت اور ان کی جانب سے مدافعت میں استعمال ہو تا رہا تھا' اٹھایا اور ایک ماہرِ دستور و قانون کی حیثیت سے مولانا مودودی کے اس الزام نامے کا "محاکمہ" تحریر کیا ـــــ یہ طویل تحریر اس قابل ہے کہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ رہے اس لئے من و عن درج ہے :-

"محترم امیر جماعت اسلامی 'السلام علیکم و رحمۃ اللہ

قیمّ جماعت اسلامی نے آپ کا جو نوٹس آپ کے دستخط کے ساتھ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے نام ۲۵ ر دسمبر ۵۶ء کو بھجوایا ہے اس کے متعلق میں آپ سے ملاقات کر کے اپنے خیالات زبانی آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔ آپ نے مجھ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ آپ غور کر کے اپنے جوابات سے مجھے آگاہ فرمائیں گے۔ چونکہ آپ کا یہ اقدام نہایت اہم او دوررس نتائج کا حامل ہے اس وجہ سے میں نے گذارش کی تھی کہ آپ جس قدر جلدی ممکن ہو سکے ' مجھے اپنے جواب سے آگاہ فرمائیں گے لیکن ایک ہفتہ سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد بھی نہ تو مجھے آپ کا جواب ہی معلوم ہو سکا نہ بظاہر آپ نے اپنے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس ہی لیا اور نہ وہ افسوسناک پروپیگنڈہ ہی بند ہوا جو شوریٰ کے فیصلے کے خلاف آپ کے مرکزی اسٹاف 'بعض ارکانِ شوریٰ اور بعض امرائے حلقہ کی طرف سے جماعتی حلقوں میں جاری ہے اور جس سے نہ صرف شوریٰ کے فیصلہ کے خلاف بلکہ شوریٰ کے بہت سے ایسے ارکان کے خلاف ایک مخالفانہ فضا تیار کی جا رہی ہے جن کی ثقاہت ' جن کی اصابت رائے اور جن کے اخلاص و تقویٰ پر جماعتی حلقوں میں کبھی کسی کو شبہ نہیں ہوا۔ میں آپ کی اس خاموشی کو اس بات پر محمول کرتا ہوں کہ میری معروضات آپ کا ذہن تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور آپ نہ صرف یہ کہ اپنا فیصلہ بدلنے پر راضی نہیں ہیں بلکہ مجھے کسی جواب کا مستحق بھی خیال نہیں فرماتے ہیں۔

اگرچہ اپنے اور جماعت کے ایک دیرینہ خادم کے ساتھ آپ کی یہ بے اعتنائی یک افسوسناک بات ہے اور دل نہیں چاہتا کہ اس بارے میں کچھ مزید عرض کروں لیکن جماعت اور امیر کے ساتھ خیر خواہی کا جو عہد میں نے اپنے رب کے ساتھ کیا ہے وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ جو کچھ میں جماعت کے لئے اور خود آپ کے لئے حق اور بہتر سمجھتا ہوں اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اب تک جو کچھ میں عرض کرتا رہا ہوں وہ زبانی عرض کرتا رہا ہوں لیکن اب کے میں نے تحریر کا راستہ اختیار کیا ہے کہ شاید اس طرح میں اپنی بات زیادہ بہتر طریقہ پر پیش کر سکوں۔

میں نے آپ کے مذکورہ نوٹس (جس کو اس کے مزاج اور انداز کے لحاظ سے ایک فرمان کہنا شاید بے جا نہ ہو) کو گھر پر آکر دوبارہ پڑھا اور اس کے تمام پہلوؤں پر بار بار غور کیا۔ اس بار بار کے غور و فکر کے بعد بھی میری رائے وہی ہے جو میں آپ سے زبانی عرض کر چکا ہوں۔ میرے نزدیک آپ کا یہ پورا نوٹس استدلال و استنتاج کے لحاظ سے بالکل غلط' مصالح کے اعتبار سے جماعت کے لئے نہایت مہلک' عدل و انصاف کے لحاظ سے یہ ان کے ابتدائی تقاضوں کے احترام سے بھی خالی ہے اور دستوری و آئینی نقطہ نظر سے تو جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ ہم جو اسلامی جمہوریت و شورائیت کی ایک مثال قائم کرنے کا حوصلہ لے کر اٹھے تھے' ابھی اس کی پہلی جھلک بھی ہم کو دیکھنی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ شاید ہمارے جی اس سے بھر چکے اور ہم اس کی جگہ پر ایک ایسی فسطائیت کا تجربہ کرنے کا شوق رکھتے ہیں جس کی نظیر کم از کم ماضی و حاضر میں تو کوئی اور نہ مل سکے۔ جب میں آپ کے نوٹس کے اس پہلو پر غور کرتا ہوں تو دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید اسلامی جمہوریت اور شورائیت کی شان میں اپنی تحریروں میں ہم اب تک جو قصیدہ خوانیاں کرتے رہے ہیں وہ محض مشق سخن کے طور پر تھیں یا محض اپنے ملک کے ارباب اقتدار کو ہدف ملامت بنانے کے لئے۔ ورنہ اس اقدام سے پہلے آپ اس سوال پر ضرور غور کرتے کہ آپ کے اس اقدام کے بعد اس شوریٰ اور دستور کا کیا حشر ہو گا جس پر ہم نے جماعت کی عمارت کھڑی کی تھی۔

اب میں آپ کے اس نوٹس کے ایک ایک جزو پر اختصار کے ساتھ وہ باتیں عرض کرتا ہوں جو کم و بیش زبانی آپ کے سامنے عرض کر چکا ہوں اور مقصود اس گذارش سے' جیسا کہ عرض کر چکا ہوں' محض یہ ہے کہ ایک شدید ترین غلطی پر جو جماعت کے لئے بالکل تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے' آپ کو متنبّہ کروں۔

۱۔ آپ نے اس نوٹس کے نمبر ا اور ۲ کے تحت جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی، جو غیر مطمئن ارکان کے خیالات معلوم کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی دراصل خود غیر مطمئن بلکہ انتہائی غیر مطمئن ارکان پر مشتمل تھی ' اس اہم کام کے لئے اس طرح کی کمیٹی کا مقرر کیا جانا کسی طرح مناسب نہ تھا لیکن چونکہ کمیٹی مقرر کرتے وقت ان ارکان کی اس بے اطمینانی اور ان کی انتہاپسندی کا نہ ارکان شوریٰ کو اندازہ تھا اور نہ آپ کو ' اس لئے کسی کو اس ترکیب کے غلط ہونے کا اندازہ نہیں ہوا۔

مجھے جائزہ کمیٹی کے ارکان پر آپ کا یہ تبصرہ مختلف پہلوؤں سے عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ارکان ' جماعت میں کوئی نووارد ارکان نہیں تھے بلکہ ان میں سے تین تو وہ ہیں جو غالباً ابتدا سے یا کم از کم تقسیم کے پہلے سے نہ صرف جماعت کے رکن ہیں بلکہ ہر مرحلہ میں مجلس شوریٰ میں آپ کے ساتھی اور رفیق رہ چکے ہیں۔ ایک صاحب اگر ابتدا سے نہیں تو کم از کم آٹھ نو سال سے تو جماعت میں ضرور ہیں اور اس دوران میں ان کی زندگی کا بڑا حصہ ایسا گزرا ہے جس میں شوریٰ میں ہم ان کے نظریات وخیالات کا برابر تجربہ کرتے رہے ہیں۔ پھر ان میں سے دو وہ ہیں جو نہ صرف جماعت کی تمام اہم ذمہ داریوں کے اٹھانے میں آپ کے دست وبازو رہے ہیں بلکہ انہوں نے نہایت نازک ادوار میں جماعت کی امارت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور ایسی خوبی سے نبھائی ہیں کہ پوری جماعت نے ان کے استقلال ' ان کی اصابتِ رائے اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ان میں سے مولانا عبدالغفار حسن صاحب ابھی چند ماہ ہوئے ہیں آپ کے سفر حج کے موقع پر ' خود آپ ہی کے انتخاب سے ' جماعت کے قائم مقام امیر رہ چکے ہیں نیز آپ کے شعبۂ تربیت کے ناظم اور شوریٰ کی مقرر کردہ ایک اہم عدالت کے صدر ہیں۔ اگر اتنی گوناگوں آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بھی آپ اور ارکان شوریٰ اپنے ان دیرینہ رفیقوں کی "شدت"، "انتہاپسندی" اور ان کی "انتہائی بے اطمینانی" کا کوئی اندازہ نہ کر سکے تو میں نہایت ادب سے یہ عرض کروں گا کہ ہمیں ان ارکان کی بے اطمینانی پر افسوس کرنے کی بجائے خود اپنے کودن ہونے پر سر پیٹنا چاہیے۔ اطمینان وبے اطمینانی اور شدت وانتہاپسندی ایسے اوصاف نہیں ہیں جو صبح وشام کے اندر پیدا ہوتے اور ختم ہوتے ہوں۔ بالخصوص ان لوگوں کے اندر جو اپنی زندگی کے تلوّن کے زمانے گزار چکے ہوں اور جماعت کی خدمت میں جن کے سیاہ بال اب یا تو سفید ہو چکے ہیں یا سفید ہو رہے ہیں

ہوں۔ ایسے آزمودہ لوگوں کے بارے میں آپ کا یہ کہنا کہ نہ صرف آپ کو بلکہ شوریٰ کے دوسرے ساتھیوں کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ انتہائی غیر مطمئن اور انتہاپسند ہیں' جب ان لوگوں نے جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش کی ہے تب یہ انکشاف ہوا کہ یہ لوگ سخت غیر مطمئن اور انتہاپسند تھے۔ آخر کس معقول آدمی کے ذہن میں یہ بات اتر سکتی ہے؟۔

دوسری بات یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی کوئی ایسی کمیٹی نہیں تھی جو دفعتہً بنی ہو اور آناًفاناً اس نے اپنا کام ختم کیا ہو اور پھر رپورٹ پیش کر کے فارغ ہو بیٹھی ہو کہ اس کے ارکان کے متعلق رواروی میں کوئی صحیح رائے قائم نہ کی جا سکی ہو اور اس سبب سے اس کی ترکیب بالکل غلط ہو گئی ہو۔ اس قطرہ کے گہر ہونے پر تو ایک مدت گزری ہے اور اس کے پیچھے ایک پوری تاریخ بن چکی ہے۔ اس کمیٹی کا تقرر کراچی کے اجتماع سالانہ (۱۹۵۵ء) کے موقع پر ہوا تھا لیکن اس کے کام شروع کرنے سے پہلے ہی راولپنڈی اور لائل پور کے حلقوں کے بعض مخصوص لوگوں نے اس کمیٹی کے بعض ارکان کے خلاف اعتراضات اٹھائے کہ وہ چنیں ہیں اور چناں ہیں اور افسوس ہے کہ ان کی اس مہم میں بعض ذمہ دارانِ مرکز بھی شریک ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارچ ۵۶ء کی شوریٰ میں یہ کمیٹی توڑ دی گئی اور اس کی جگہ پر آپ نے اور پوری شوریٰ نے بسلامتیٔ ہوش و حواس ایک دوسری جائزہ کمیٹی مقرر کی جو تمام غیر مطلوب عناصر سے پاک تھی۔ اس کے ارکان پورے اتفاق رائے سے منتخب کیے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ غازی صاحب اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کسی طرح بھی اس کمیٹی میں شریک ہونے پر راضی نہیں تھے لیکن ان کو شوریٰ اور آپ کی طرف سے راضی کیا گیا اور سلطان صاحب تو شوریٰ میں موجود بھی نہیں تھے' ان کا انتخاب ان کی عدم موجودگی ہی میں ہوا۔ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ اس کمیٹی کے حدودِ کار بھی آپ نے خود قلمبند کرائے۔ لیکن ان تمام ترمیمات و اصلاحات کے بعد بھی جو اصحاب پہلی کمیٹی سے مطمئن نہیں تھے وہ اس دوسری کمیٹی پر بھی مطمئن نہیں ہوئے اور اس کے خلاف مہم چلاتے رہے اور افسوس ہے کہ نہ معلوم کن مصالح کے تحت خود مرکز کے بعض ذمہ دار حضرات اس مرتبہ بھی اس مہم کو تقویت پہنچانے میں شریک ہو گئے جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کمیٹی کو مختلف حلقوں میں طرح طرح کی بدگمانیوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور اس کے کام میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ ایک ایسی کمیٹی جو اتنے مراحل سے گزری ہو' جو اتنے پرانے ارکانِ جماعت پر مشتمل ہو' اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے ارکان کا کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا میرے نزدیک کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ آخر سلطان احمد صاحب' غازی محمد

عبدالجبار صاحب، مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے جماعت کا کون شخص بے خبر ہو سکتا ہے۔ نہ عام ارکان ان سے بے خبر ہیں اور نہ ارکانِ شوریٰ ــــ اس وجہ سے یہ کہنا تو میرے نزدیک بالکل ہی غلط ہے کہ ان کا کوئی اندازہ نہیں تھا البتہ اگر آپ کہہ سکتے ہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ ایک متفقہ رپورٹ پیش کریں گے اور یہ رپورٹ اس طرح کا مواد پیش کرے گی جو اس نے پیش کیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کمیٹی کے ارکان کا غیر مطمئن ارکانِ جماعت کی رائے سے متفق ہونا اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ لازماً وہ سب کے سب پہلے ہی سے غیر مطمئن ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض جماعت کے حالات کے بارے میں پوری طرح مطمئن رہے ہوں یا کم از کم یہ کہ کچھ زیادہ غیر مطمئن نہ رہے ہوں لیکن پوری تحقیقات کے بعد ان کے سامنے جو مواد آیا ہو اس نے ان کو غیر مطمئن بنا دیا ہو۔ کم از کم دو کے بارے میں تو میرا تاثر یہی ہے کہ وہ کچھ زیادہ غیر مطمئن نہ تھے۔ بلکہ دوسرے بہت سے محتاط ارکان کی طرح وہ صرف یہ سمجھ رہے تھے کہ جماعت کے اندر کچھ غلط رجحان پرورش پا رہے ہیں جو متعین شکل میں ان کے سامنے نہیں تھے، لیکن جائزہ کے بعد جو حالات ان کے سامنے آئے وہ ان کو دیکھ کر واضح طور پر یہ سمجھ سکے کہ درحقیقت صورتحال کیا ہے؟۔ یہ بے اطمینانی ایک بالکل قدرتی چیز ہے جو اس رپورٹ کے پیش کردہ مواد سے ہر اس رکن شوریٰ کے دل میں پیدا ہوئی جس نے اس کا مطالعہ بغیر کسی بدگمانی کے کیا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اپنی رپورٹ کو پیش کرتے وقت جائزہ کمیٹی کے ارکان کا ایک ہی نقطۂ نظر کے ساتھ مجلس شوریٰ کے سامنے نمایاں ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر ان کو مطعون کیا جائے اور اس بنیاد پر ان کو سازشی قرار دے کر ان کو سزا دی جائے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہم اس بات کے خواہشمند تھے کہ وہ آپس میں اختلاف کریں لیکن جب انہوں نے اختلاف نہیں کیا تو ہم ان سے بدگمان ہو بیٹھے کہ انہوں نے کوئی سازش کر ڈالی ہے۔ حالانکہ ان کا اتفاق جس چیز پر ہے وہ صرف اس مواد کے پیش کر دینے پر ہے جو جائزہ کے بعد ان کے سامنے آیا ہے یا اس بات پر ہے کہ جماعت کی موجودہ حالت کسی طرح بھی قابل اطمینان نہیں ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس پر ایک دو ارکان شوریٰ کے سوا سب ہی ان کی رائے سے متفق ہیں جہاں تک موجودہ خرابیوں کے اسباب کا تعلق ہے اس سے سرے سے انہوں نے کوئی بحث ہی نہیں کی کہ اس بارے میں انکا اتفاق یا اختلاف ہمارے سامنے آسکتا۔ جماعت

کی پالیسی سے متعلق انہوں نے جو تقریریں کیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس بارے میں وہ باہم متفق نہیں ہیں۔ غازی صاحب کی رائے تو ان کی علالت کے باعث ہمارے سامنے آ ہی نہ سکی، رہے سلطان احمد صاحب، مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب تو انہوں نے جو تقریریں کیں اس سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ تینوں الگ الگ نقطہ ہائے نظر رکھتے ہیں۔ عبدالرحیم اشرف صاحب کا نقطۂ نظریہ تھا کہ تقسیم ملک کے بعد ہم اپنے اصلی نصب العین سے منحرف ہو گئے ہیں لیکن بقیہ دونوں ارکان نے کسی انحراف کو تسلیم نہیں کیا، صرف بعض تدابیر کو غلط قرار دیا اور شوریٰ نے اسی نقطۂ نظر سے اتفاق کیا۔ شوریٰ کے اتفاق کے بعد حکیم صاحب بھی اس سے متفق ہو گئے اس وجہ سے یہ کہنا کہ وہ ایک جتھہ بندی کر کے سامنے آئے میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ بالفرض ایک رائے پر وہ متفق بھی ہوتے جب بھی اس کو جتھہ بندی نہیں کہہ سکتے۔ اس اتفاق کو جتھہ بندی وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ان کے اختلاف کا متمنی رہا ہو، لیکن جب اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو اس نے ان پر جتھہ بندی کا الزام جڑ دیا۔

۲۔ آپ کا یہ کہنا بھی مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے کہ خود جائزہ کمیٹی کے ارکان کا یہ فرض تھا کہ وہ آپ کو اس امر سے آگاہ کرتے کہ وہ ایک ہی طرز فکر رکھنے والے لوگ ہیں اس وجہ سے اس کمیٹی میں دوسرے طرز فکر کی نمائندگی بھی ہونی چاہئے۔ جب بار بار کے توڑ پھوڑ کے باوجود خود آپ کو اور مجلس شوریٰ کو بھی آپ کے بقول یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ ایک ہی طرز فکر کے لوگ ہیں تو خود جائزہ کمیٹی کے ارکان کو بھی اگر یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ ہم ایک ہی طرز فکر کے لوگ ہیں تو کیا عجیب بات ہے۔ ممکن ہے جس طرح آپ کو ان کی رپورٹ ہی سے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ سب ایک ہی سانچہ کے ڈھلے ہوئے نکلے اسی طرح انہیں بھی اپنی رپورٹ مرتب کرتے ہی وقت یہ علم ہوا ہو کہ الحمدللہ ہم میں اس رپورٹ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایسی حالت میں وہ پہلے سے آپ کو کس طرح بتا دیتے کہ ہم ایک ہی طرز فکر کے لوگ ہیں، مبادا ہم کوئی سازش یا جتھہ بندی کر ڈالیں اس وجہ سے ہمارے ساتھ کچھ دوسرے طرز کے لوگوں کو بھی شامل کیجئے۔ علاوہ ازیں میں اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ جائزہ کمیٹی کی تشکیل کرتے ہوئے نہ شوریٰ نے پہلی مرتبہ اس حقیقت کو نظر انداز کیا تھا کہ اس کمیٹی میں شوریٰ کے ہر طرز فکر کی نمائندگی ہونی چاہئے اور نہ دوسری مرتبہ اس کو نظر انداز کیا۔ اس توازن کو قائم رکھنے کی خواہش اور کوشش دونوں مرتبہ ملحوظ رہی بلکہ پہلی کمیٹی توڑی ہی اس وجہ

سے گئی تھی کہ بعض لوگ اس کو غیر متوازن سمجھتے تھے۔ اب یہ اور بات ہے کہ جائزہ کمیٹی کے کام کو اپنے منشاء کے خلاف پا کر ہم یہ کہنے لگیں کہ اس کی تشکیل ہی غلط تھی اور اس تشکیل پر اس کے خاموش رہنے کو بھی اس کی ایک سازش قرار دیں کہ آخر اس نے اپنی تعمیر کی اس مضمر خرابی سے آپ کو آگاہ کیوں نہ کیا؟۔

مجھے آپ کی یہ شکایت بھی بالکل بے جا معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے جب کمیٹی کی اس خامی کی طرف توجہ دلائی تو کمیٹی کی طرف سے بڑی تلخی کے ساتھ اس کی مزاحمت ہوئی۔ اول مجھے اس بارے میں ان کی طرف سے کسی تلخ جواب کا علم نہیں ہے لیکن اگر انہوں نے آپ کی اس طرح کی کسی نشاندہی پر تلخ جواب دیا تو آپ کو یہ برداشت کرنا چاہئے تھا کیونکہ یہ غلطی اگر تھی تو آپ کی اور مجلس شوریٰ کی تھی، نہ کہ ان کی۔ آپ نے اور شوریٰ نے ان کو منتخب کیا اور آپ ہی ان پر یہ الزام دھرتے ہیں کہ تم ایک ہی طرز کے لوگ کیوں منتخب ہو گئے؟ اور تم ایک ہی طرز پر کیوں سوچا؟ لیکن مجھے تعجب ہوتا ہے کہ آپ ان کی اس تلخی کو برداشت کرنے کے بجائے ان کو سزا دینے پر تل گئے اور اس غصہ میں آپ نے دستور و آئین اور حق و انصاف سب کو لپیٹ کر بالائے طاق رکھ دیا۔

۳۔ آپ کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ جائزہ کمیٹی نے اپنے حدودِ کار سے کوئی تجاوز کیا۔ میں یہاں مقرر کردہ حدودِ کار اور جائزہ کمیٹی کے کام کے موازنہ کی بحث میں پڑے بغیر اس صورتحال کی یاد دہانی کافی سمجھتا ہوں جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے پر شوریٰ کے بالکل ابتدائی مرحلہ ہی میں پیش آئی۔ جوں ہی بحث کا آغاز ہوا آپ نے سب سے پہلے اسی سوال کو اٹھایا کہ کمیٹی نے اپنے مقررہ حدودِ کار سے تجاوز کیا ہے اور اپنے خیال کے مطابق اس کے دلائل پیش کئے۔ آپ اُس وقت اتنے غصہ میں تھے کہ آپ کانپ رہے تھے اور لب و لہجہ نہایت تیز تھا۔ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا کہ اب جائزہ کمیٹی کی خیر نہیں ہے، لیکن جب سلطان احمد صاحب اور عبدالرحیم اشرف صاحب نے حدودِ کار اور جائزہ کمیٹی کے کام کا موازنہ کرتے ہوئے آپ کے اعتراضات کا جواب دیا تو مجلس شوریٰ کے ارکان کی اکثریت (شاید ایک دو ارکان کے سوا جو خاموش رہے) ان کے جواب سے پوری طرح مطمئن ہو گئی کہ جائزہ کمیٹی نے مقررہ حدودِ کار سے کوئی تجاوز نہیں کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ قیّم جماعت جو آپ کی رائے سے کسی اختلاف کو مشکل ہی سے جائز سمجھتے ہیں، آپ کے بجائے کمیٹی کی رائے سے متفق ہو گئے۔ آپ نے خود بھی اس کے بعد اپنا اعتراض واپس لیتے ہوئے یہ فرمایا کہ میں نے یہ سوال

اس لئے اٹھایا تھا کہ یہ پیدا ہو سکتا تھا' میں نے چاہا کہ اس کی وضاحت ہو جائے۔ کچھ وقفہ کے بعد ایک رکن شوریٰ نے جب پہلے ہی مرحلہ میں آپ کے لب ولہجہ کی اس شدت کی شکایت کی جو آپ نے یہ سوال اٹھاتے وقت ظاہر کی تھی تو آپ نے ان کے جواب میں اپنے سابق جواب ہی کا اعادہ کیا کہ آپ نے وہ سوال محض وضاحت طلبی کے لئے اٹھایا تھا۔ میں نے اور غالباً دوسرے ارکان شوریٰ نے بھی آپ کے اس جواب کو یہی سمجھا تھا' کہ یہ آزادیٔ رائے کے ساتھ اور بغیر کسی تحفظ کے دیا گیا ہے' لیکن اب آپ کے فرمانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ جواب اس وجہ سے دیا تھا کہ آپ کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ اگر منہ بند کرنے سے آپ کا یہ مطلب ہے کہ شوریٰ کی بڑی اکثریت نے آپ کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا اور جو آپ کے ہم خیال تھے وہ خاموش رہے تو یہ بات تو ضرور ہوئی لیکن اس چیز کو منہ بند کرنے کی کوشش سے تعبیر کرنا تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ منہ بند کرنا ہے تو یہ حادثہ ہر جمہوری نظام میں ہر صدر اور ہر امیر کو پیش آسکتا ہے اور پیش آتا ہے۔ اگر آپ کو بھی پیش آیا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی۔ اگر منہ بند کرنے سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ جوابوں کا انداز تیز تھا تو میں ادب سے یہ گزارش کروں گا کہ اس وقت تھوڑی سی تیزی محض اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ خود آپ کا اندازِ گفتگو بھی خاصا تیز تھا۔ بہرحال شوریٰ کی اکثریت کا آپ کے کسی نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کرنا یا اس سے شدت کے ساتھ اختلاف کرنا آپ کا منہ بند کرنا نہیں ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے اس اختلاف کو منہ بند کرنے سے کیوں تعبیر فرمایا!

۴۔ اپنے نوٹس کے نمبر ۵ کے تحت آپ نے جائزہ کمیٹی اور شوریٰ کے بعض دوسرے ارکان کے اوپر اکٹھے کئی ایک الزامات لگائے ہیں جن میں سے کسی ایک کو بھی میں صحیح خیال نہیں کرتا۔ مثلاً:۔

☆ ---یہ کہ کمیٹی نے ساری تحقیقات ایک مخصوص نقطۂ نظر سے کی اور اپنی رپورٹ میں جماعت کی یک رخی تصویر پیش کی۔

☆ ....یہ کہ اس نے سارے مواد کو اس طرح پیش کیا کہ جن انتہائی نتائج تک وہ شوریٰ کو پہنچانا چاہتی تھی ان کی تائید اس مواد سے حاصل ہو۔

☆ .....یہ کہ آپ محسوس کر رہے تھے کہ رپورٹ کی اس مخصوص ہیئت سے مجلسِ شوریٰ کے ذہنی توازن پر برا اثر پڑ سکتا ہے اور آپ اس اثر سے شوریٰ کو بچانا چاہتے تھے لیکن آپ کو اس فرض کی انجام دہی سے سختی اور تلخی سے روکا گیا۔

☆ .... یہ کہ جتھہ بندی کر کے آپ کے گئے وہ حالات پیدا کیے گئے کہ آپ مخ
لوگوں کے آلۂ کار اور ان کے اشاروں پر چلنے والے بن کر رہیں۔

یہ سارے الزامات میرے نزدیک غلط ہیں اور میں ان کے بارے میں اصل حقیقت ع
کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

رپورٹ میں جماعت کی یک رخی تصویر سے آپ کا مطلب اگر یہ ہے کہ اس جماعت کے اندر پیدا ہو جانے والی خرابیوں ہی کی فہرست پیش کی گئی ہے، اس کی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی در حقیقت بنی ہی اس لئے تھی کہ وہ ار سے مل کر ان کی بے اطمینانیاں اور ان بے اطمینانیوں کے اسباب معلوم کرے اور اس و جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان کی تحقیقات کرے۔ اس کے ذمہ یہ کام سپرد ہی نہیں کیا گ کہ وہ جماعت کی خوبیاں اور اس کے اچھے پہلو بھی پیش کرے۔ اپنا یہ کام اس نے دو سو زیادہ ارکان کے خیالات معلوم کر کے انجام دیا۔ ان ارکان سے ملنے میں اس نے کوئی ا نہیں برتا، بلکہ ہر رکن کو اجازت دی کہ جو چاہے اس کے سامنے اپنا بیان دے۔ ان والوں میں سے جن لوگوں نے جماعت کے موجودہ حالات پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا، ک نے ان کے اوسط کو بھی واضح کر دیا۔ پھر یہ الزام کس طرح صحیح ہے کہ یہ جماعت کی یک ر تصویر ہے، ان کے سامنے آئے ہوئے مواد سے اطمینان اور بے اطمینانی کی جو تصویر بنتی تھ انہوں نے ہمارے سامنے رکھ دی۔ اب یہ بات الگ ہے کہ اس مسالہ سے جو تصویر بن ہمارے منشا کے خلاف بنی۔ لیکن میرے نزدیک اس بدگمانی کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ا اس سے مختلف مواد بھی ان کے سامنے آتا جب بھی وہ جماعت کی تصویر بگاڑنے ہی کی کوش کرتے۔

مواد کے پیش کرنے کے اسلوب کے بارے میں اختلافِ رائے ہو سکتا ہے کہ انہو نے اس طرح کیوں پیش کیا، دوسری طرح کیوں پیش نہیں کیا۔ لیکن جب شوریٰ کی طرف۔ اس کے پیش کرنے کی کوئی شکل معین نہیں کی گئی تھی تو جس طرح بھی انہوں نے پیش کیا، ا کے متعلق یہ بدگمانی کرنا کہ انہوں نے یہ اسلوب شوریٰ کو گمراہ کرنے اور اپنے پیش نظر نتا تک پہنچانے کے لئے کیا، میرے نزدیک ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ اگر وہ کسی خاص نتیجہ تک شوریٰ کو پہنچانا ہی چاہتے تو آخر انہوں نے صرف ارکان کی رائیں پیش کرنے ہی کیوں اکتفا کیا۔ ان خرابیوں کے اسباب خود اپنی طرف سے کیوں معین نہ کیے اور ان کی اصلا

ی تدابیر کے بارے میں سفارشات کیوں نہ پیش کیں، حالانکہ یہ دونوں چیزیں ان کے حدود کار کے اندر داخل تھیں اور ہمیں یہ شکایت رہی کہ انہوں نے اس پہلو سے رپورٹ کو تشنہ چھوڑا۔ اگر فی الواقع آپ کا یہ گمان صحیح ہے کہ یہ ایک ہی طرح کے ذہن کے لوگ تھے تو ان کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ اسباب کی بھی ایک فہرست پیش کر دیتے اور اپنی اصلاحی سفارشات بھی ہمارے سامنے رکھ دیتے۔ اس طرح وہ شوریٰ کو اس سے زیادہ خوبی سے گمراہ کر سکتے تھے جتنا گمراہ انہوں نے محض یہ مواد ہمارے سامنے رکھ کر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے تو جو کچھ کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ارکان نے جو بیانات دیئے ہیں وہ بیشتر انہی کے الفاظ میں مختلف عنوانات کے تحت نقل کر دیئے ہیں۔ آخر اس میں سازش کا کون سا پہلو ہے؟

جہاں تک تیسرے الزام کا تعلق ہے، وہ بھی میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ مشکلات میں شوریٰ کی رہنمائی کرنا آپ کا ایک فریضۂ منصبی ہے لیکن ارکان شوریٰ کی رایوں پر اثر انداز ہونا غالباً آپ کے فرائض کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ آپ نے جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے بارے میں جو روش اختیار کی وہ ابتداء ہی سے ارکان شوریٰ کے سامنے اس نوعیت سے آئی کہ یہ جماعت کی بالکل یک رخی تصویر ہے، اس میں حدود کار سے تجاوز کیا گیا ہے، اس میں جماعت میں پھیلی ہوئی گندگیوں کو اکٹھا کر دیا گیا ہے جس کے سبب سے یہ غلاظت کے ایک ٹوکرے کی شکل میں نظر آتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور مزید برآں یہ کہ آپ نے اس کو اپنے خلاف ایک چارج شیٹ قرار دے کر امارت سے استعفے کی دھمکی بھی دے دی۔ آپ کے اس نقطۂ نظر سے ان چند لوگوں کے سوا جو آپ کی رایوں ہی سے اپنی رائے بناتے ہیں، شوریٰ کے تمام صاحبِ فکر ارکان نے اختلاف کیا، انہوں نے آپ کے نقطۂ نظر کے برعکس جائزہ کمیٹی کی خدمات کو سراہا، رپورٹ کی اہمیت کا اظہار کیا اور اس کے ذریعہ سے جماعت کی جو تشویش انگیز تصویر سامنے آئی تھی اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی دعوت دی۔ سلطان صاحب کو تقریر کرتے وقت میں نے پہلی بار جماعت کی حالت پر پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا اور ان کے رونے نے بہتوں کو رُلایا۔ غازی صاحب اس قدر روئے کہ اسی حالت میں ان پر دل کا دورہ پڑا اور ان پر تشنج کے ایسے سخت حملے ہوئے کہ ہم ان کی زندگی ہی سے مایوس ہو گئے۔ شب کے بارہ بجے ڈاکٹر بلانا پڑا۔ میں نے یہ ماجرا شوریٰ کی پوری تاریخ میں پہلی بار دیکھا۔ میری اور میری ہی طرح شوریٰ کے اکثر ارکان کی رائے یہی تھی کہ یہ تأثر صورتحال کا پیدا کردہ ہے جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے سامنے آئی تھی، لیکن آپ کے فرمانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ کا منہ

بند کرنے کیلئے ایک ڈراما کھیلا گیا تھا۔ اب اس کا فیصلہ کون کرے کہ یہ سب کچھ ایک ڈراما تھ حقیقت! جتھہ بندی کا الزام بھی میرے نزدیک کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ جائزہ کمیٹی ـ ارکان کا جماعت کے حالات سے متعلق ایک متفقہ تأثر دینا کوئی جتھہ بندی نہیں ہے اور اپنے اوپر آپ کے عائد کردہ الزامات کی متفقہ طور پر مدافعت کرنا کوئی جتھہ بندی ہے۔ بھی کوئی جتھہ بندی نہیں ہے کہ رپورٹ کو پڑھنے کے بعد شوریٰ کے بہت سے دوسر ارکان بھی جماعت کی حالت کے بارے میں ان کے ہم خیال بن گئے۔ انہوں نے رپورٹ مرتب کی اور آپ کے حوالہ کی۔ آپ نے اپنے اہتمام میں اس کو سائیکلو اسٹائل کرایا او شوریٰ کے اجلاس سے چند گھنٹے پہلے وہ ارکان شوریٰ میں تقسیم ہوئی۔ ان میں سے کون سی بات ایسی ہے جس کو ان کی طرف سے جتھہ بندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ اگر شوریٰ کے دوسرے ارکان نے ان کی پیش کردہ رپورٹ کو اہمیت دی اور آپ کے ہم خیال ہو کر اس ک غلاظت کا ایک ٹوکرا قرار دینے پر راضی نہیں ہوئے' تو کیا یہ جتھہ بندی ہے؟ او جتھہ بندی بھی وہ جتھہ بندی جس کی سزا ان کو شوریٰ سے بیک بینی و دو گوش اخراج کی صورت میں بھگتنی چاہئے۔ کیا رپورٹ پیش کر دینے کے بعد ان کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ شوریٰ کے ارکان سے کہتے کہ آپ رپورٹ کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر سے متفق نہ ہوں ورنہ یہ جتھہ بندی ہو جائے گی اور ہمارے امیرِ جماعت کی طرف سے اس کی کم سے کم سزا شوریٰ سے اخراج ہے۔ اچھا میں نے تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا کہ یہ جتھہ بندی تھی تو کیا یہ جتھہ بندی نہیں تھی کہ آپ نے شروع ہی میں شوریٰ کو رپورٹ سے متعلق ایک مخالفانہ تأثر دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شوریٰ کے کچھ ارکان شروع ہی سے اس بات کیلئے کمربستہ ہو گئے کہ وہ بہر حال اس کی مخالفت کریں گے اور اس کے لئے انہوں نے دلائل کے بجائے طنز و استہزا بلکہ ناگوار خاطر نہ ہو تو میں یہ کہوں گا کہ پھکڑ بازی سے کام لیا اور شوریٰ کے ماحول کو بہت خراب کیا۔

اس جتھہ بندی کا مقصد' آپ کا منہ بند کرنے کے سوا آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کو بعض مخصوص لوگوں کا آلۂ کار بنانا تھا۔ اگر یہ مخصوص لوگ شوریٰ سے باہر کے ہیں تب تو یہ فی الواقع ایک زیادتی ہے اور اگر آپ اسے ثابت کر سکیں تو بلاشبہ یہ ایک جرم بنتا ہے' لیکن آپ نے زبانی گفتگو کے وقت مجھ سے یہ فرمایا ہے کہ اس سے آپ کی مراد شوریٰ ہی کے اندر کے لوگ ہیں۔ اگر شوریٰ ہی کے اندر کے لوگ ہیں تو اس دستور کے تحت جس کی وفاداری

پ نے حلف اٹھایا ہے' ان کی اکثریت کا آلۂ کار بننے میں آپ کو عار نہیں ہونا چاہیئے۔
اگر شوریٰ کے اندر کی کوئی اقلیت آپ سے یہ چاہتی تھی کہ آپ اس کے اشاروں پر چلیں تو
پ کا یہ فرض تھا کہ آپ انکار کر دیتے۔ یہ بات دستور کے بالکل مطابق ہے اور کوئی
ں اس پر آپ کو ملامت نہیں کر سکتا۔ معاملہ کی آئینی اور دستوری حیثیت تو یہ ہے لیکن
اں تک میں جانتا ہوں جماعت اسلامی کی شوریٰ کی یہ ایک مستقل روایت ہے کہ اس میں
ی مؤثر اختلاف کو نظر انداز کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا بلکہ ایسی حالت میں بیچ کی کوئی
ی راہ اختیار کی جاتی رہی ہے جس سے اتفاق کی صورت پیدا ہو جائے۔ شوریٰ کی تاریخ میں
بشہ ایسا ہی ہوا ہے اور اس کو کبھی یہ رنگ نہیں دیا گیا کہ یہ کسی کا آلۂ کار بن جانا ہے۔
ما اوقات ایک نقطۂ نظر کی تائید میں عددی اکثریت اگرچہ نہیں ہوتی لیکن معنوی اکثریت ہوتی
ہے۔ اس کا اگر لحاظ نہ رکھا جائے تو اگرچہ جماعت میں کوئی تشتت نہ بھی پیدا ہو جب بھی کسی
پروگرام پر دلجمعی اور سرگرمی سے عمل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس طرح کی کسی مصلحت کے تحت
آپ نے کسی فارمولے سے اتفاق کیا تو یہ بہت اچھا کام کیا۔ جماعت کو اختلاف یا جمود سے
بچانے کیلئے ایک دانشمند امیر کی حیثیت سے آپ کو یہی کرنا چاہئے تھا۔ لیکن میں حیران ہوں
کہ جس مصلحت کو آپ نے شوریٰ کے اندر اہمیت دی وہ مصلحت شوریٰ کے ختم ہو جانے کے
بعد آپ کی نگاہوں سے کیوں اوجھل ہو گئی؟ کیا آپ کا اندازہ یہ ہے کہ شوریٰ کے متفقہ
فیصلہ کے خلاف آپ کا یہ اقدام اس سے بڑے تشتت کا موجب نہ ہو گا جتنا اس صورت میں
متصور تھا جب کہ آپ شوریٰ کے اندر ہی مخصوص لوگوں کے اشاروں کے پابند ہونے سے
انکار کر دیتے؟

۵۔ صورتحال کا یہ نقشہ پیش کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ آپ کیلئے دو ہی
صورتیں باقی رہ گئی تھیں' یا تو آپ استعفا پیش کر دیتے یا جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے
کا خطرہ مول لے کر اس صورتحال کو سختی سے دبا دیتے۔ آپ نے پہلی صورت اختیار کرنی
چاہی لیکن شوریٰ نے آپ کو یہ صورت اختیار کرنے نہیں دی۔ دوسری صورت آپ نے
اختیار نہ کی کہ اس سے جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ تھا۔ چار و ناچار آپ نے
شوریٰ کو ان غلط نتائج پر پہنچ جانے کے لئے چھوڑ دیا' جن پر آپ کے خیال کے مطابق جائزہ
کمیٹی کے ارکان اور ان کے ہمنوا شرکاء شوریٰ کو پہنچانا چاہتے تھے۔
آپ نے اپنے استعفاء میں جو وجہ بیان کی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ سے سہو ہو

رہا ہے۔ میری موجودگی میں آپ کے استعفے کی جو وجہ آپ کی جانب سے پیش کی گئی تھی وہ یہ نہیں تھی کہ کوئی جتھہ بندی ہو گئی ہے یا آپ کا منہ بند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے بلکہ یہ بیان کی گئی تھی کہ چونکہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ میں آپ پر بہت سے الزامات ہیں' اس لئے آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان امور پر ارکان شوریٰ کسی دوسرے شخص کی رہنمائی میں غور کریں تاکہ ان کی رائے پر آپ کے اثر انداز ہونے کا کوئی سوال پیدا نہ ہو۔ ارکان شوریٰ میں سے طفیل صاحب کے سوا شاید کسی نے بھی آپ کی علیحدگی کی یہ وجہ معقول تسلیم نہیں کی' کیونکہ رپورٹ میں صرف آپ پر ہی الزامات نہیں تھے بلکہ اکثر ارکانِ شوریٰ پر بھی تھے۔ یہاں تک کہ خود جائزہ کمیٹی کے ارکان پر بھی تھے' اس وجہ سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہ تھا کہ امارت کا عہدہ سنبھال لیتا تو وہ سوال نہ پیدا ہوتا جو آپ کی امارت کی صورت میں پیدا ہوتا۔ اس وجہ سے شوریٰ کی اکثریت اور بھاری اکثریت نے بہتری اسی میں سمجھی کہ اب صورتحال جیسی کچھ بھی ہے اس کا سب مل کر مواجہہ کریں اور یہ کام آپ کی رہنمائی ہی میں ہو۔ خوش قسمتی سے آپ نے شوریٰ کا یہ نقطۂ نظر تسلیم کر لیا اور تعطل دور ہو گیا۔

شوریٰ کو ایک غلط نتیجہ پر پہنچ جانے دینے کے لئے آپ نے جو عذر پیش کیا ہے اس کا ایک حصہ تو صحیح ہے کہ جماعت میں تفریق کا اندیشہ تھا اور یہ چیز فی الواقع ایسی تھی جس سے جماعت کو بچانا ضروری تھا' لیکن میں یہ سوال ضرور کروں گا کہ جن نتائج پر شوریٰ پہنچی کیا وہ آپ کے نزدیک اتنے مہلک اور غلط ہیں کہ شوریٰ کے ختم ہوتے ہی آپ نے نہ صرف شوریٰ کے فیصلہ کو الٹ دیا بلکہ ایک سازش کا مفروضہ کھڑا کر کے سارے آئین و قانون کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی اور جس تفریق کے اندیشہ سے آپ نے اس فیصلہ کو قبول کیا تھا' اسی تفریق کا دروازہ اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر کھول دیا؟

ذرا سوچئے تو کہ شوریٰ کی قرارداد میں ایسی کون سی ہلاکت چھپی ہوئی ہے جس کے خطرہ نے آپ کو اتنے بڑے اقدام پر آمادہ کر دیا؟ کیا یہ خطرہ کہ انتخابی سرگرمیوں میں سرِدست آپ حصہ نہ لیں گے بلکہ زیادہ زور تعمیری کاموں پر صرف کریں گے؟ اگر اس وقت انتخابی سرگرمیوں سے صرفِ نظر کر کے تعمیری پروگرام پر زور لگائیں گے تو آخر جماعت تباہ کیوں ہو جائے گی؟ کیا انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لینا اور وہ بھی اس مرحلہ میں کوئی دین کے واجبات میں سے ہے؟ کیا تعمیری جدوجہد آپ کے نزدیک انتخابات کے لئے میدان ہموار نہیں کرے گی؟ کیا لوگ موجودہ قیادت کو آپ کی قیادت سے بدلنے کیلئے اتنے بے تاب و بے قرار ہیں کہ اگر

آپ نے میدان میں اترنے میں دیر لگائی تو کفر بازی لے جائے گا اور اسلام ہار جائے گا؟ موجودہ حالات میں اگر آپ انتخابات لڑیں گے اور اپنے اصولوں پر قائم رہ کر لڑیں گے تو میرا خیال ہے اور آپ کے تمام اہل الرائے رفقاء اس خیال سے متفق ہیں کہ شاید اس سے بھی برا حشر ہو جو پنجاب کے انتخاب میں ہو چکا ہے اور اگر آپ دو ایک سیٹوں پر کہیں کامیاب بھی ہوں گے تو شاید اپنے شائع کردہ اصولوں کی اس سے بھی زیادہ قربانی دینی پڑے گی جتنی دو سیٹوں کیلئے بہاولپور میں دینی پڑی۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ آخر شوریٰ کی اس تجویز میں وہ کیا خطرناکی ہے جس کے اندیشہ سے آپ نے یہ اقدام کر ڈالا؟ اس قرارداد کا بڑا حصہ آپ کا اپنا مرتب کردہ ہے۔ صرف انتخابی سرگرمیوں سے متعلق حصہ ایسا ہے جس کے الفاظ اس کمیٹی کے تجویز کردہ ہیں، جو غالباً آپ ہی کے ایماء پر شوریٰ کے دونوں نقطہ ہائے نظر کے وکیلوں پر مشتمل بنی تھی اور ردّ وقدح کے بعد آپ نے بھی ان الفاظ کو قبول کیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اور ساتھ ہی اس پورے گروپ نے اس کو قبول کیا جو انتخابی سرگرمیوں ہی کو اب کُل دین بنائے بیٹھا ہے۔

شوریٰ کی اس قرارداد میں لٹریچر کے حجت ہونے اور نہ ہونے سے متعلق جو شق ہے وہ محض آپ کی خواہش پر رکھی گئی اور اس سے آپ کا مقصود در حقیقت ان لوگوں سے جان چھڑانا تھا جو ہمارے ہی لٹریچر کا آئینہ ہمارے سامنے پیش کر رہے تھے اور ہم اس میں اپنے چہرے دیکھنے سے گھبراتے تھے۔ اس چیز کا مطالبہ نہ جائزہ کمیٹی نے کیا تھا نہ ان کے ہم نواؤں نے لیکن یہ عجیب ستم ہے کہ اب اس شق کو بھی آپ کی مظلومیت کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کیا جارہا ہے کہ دیکھو جائزہ کمیٹی والوں نے مولانا مودودی کے لٹریچر کو بھی مردود قرار دے دیا۔

بہرحال میں بالکل نہیں سمجھ سکا کہ آخر اس تجویز نے وہ کیا خطرہ پیدا کر دیا تھا جس سے بچاؤ کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ جماعت اسلامی کا امیر ایک آمرِ مطلق کی تلوار سنبھال لے؟ میں انتخابات کے معاملہ میں کبھی یہ نہیں سمجھا تھا کہ اب آپ کے نزدیک بھی جماعت اسلامی کا مرنا اور جینا اسی کیلئے ہے۔ رہی نظریات کی کشمکش تو کم از کم اس قرارداد کے اندر تو اس کا کوئی جرثومہ موجود نہیں ہے۔ یہ تو جماعت کی تمام سابقہ پالیسی کی واضح الفاظ میں تصدیق کرتی ہے۔ صرف تدابیر کی بعض غلطیوں کو تسلیم کرتی ہے اور وہ بھی تردّد کے ساتھ۔

۶۔ شوریٰ کے اس اجلاس میں جن لوگوں نے آپ کی حمایت میں ایک سرکاری پارٹی کا پارٹ ادا کیا، ان کی صفائی میں آپ نے فرمایا ہے کہ یہ جائزہ کمیٹی اور اس کے حامیوں کی جتھہ بندی کا ردِ عمل تھا۔ میں اس کو بھی واقعہ کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ جائزہ

کمیٹی کے خلاف ایک پارٹی شوریٰ کے اندر اور باہر پہلے ہی سے موجود تھی اور اس کی قیادت کی زمام خود مرکز کے ہاتھ میں تھی۔ میرے لئے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس کو خود آپ کی آشیرباد حاصل تھی لیکن جائزہ کمیٹی کے ساتھ آپ کا رویّہ چونکہ شروع ہی سے غیر ہمدردانہ رہا' اس لئے یہ پارٹی جرأت کے ساتھ جائزہ کمیٹی کے خلاف بدگمانیاں پھیلاتی رہی۔ بدقسمتی سے جب رپورٹ سامنے آئی تو معلوم نہیں کیوں آپ نے اس کو اپنے خلاف ایک چارج شیٹ سمجھ لیا۔ آپ کے اس تأثر کا سامنے آنا تھا کہ وہ سارے لوگ جو آپ کی خواہش کے خلاف کسی چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے' ایک پارٹی کی شکل میں رپورٹ کی مخالفت کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ میرے نزدیک اس طرح جماعت اسلامی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جماعت کے اندر جماعتیں بننے کا آغاز ہوا اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس چیز کو اسی وقت نہ روکا گیا تو جماعت اور تحریک بڑے برے انجام سے دوچار ہو گی لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس امر میں بھی اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس چیز کو روکنے کیلئے آپ نے جو الٹا قدم اٹھایا ہے اس نے جماعت اور تحریک کو اس برے انجام سے دوچار کر دیا ہے اور اب خدا ہی ہے کہ جو جماعت کو اس انجامِ بد سے بچا سکتا ہے۔

۷۔ اس میں شبہ نہیں کہ شوریٰ کی قرارداد جہاں تک اس کے اس حصہ کا تعلق ہے جو جماعت کی پالیسی کے بارے میں رہنمائی دیتی ہے' ایک مصالحتی فارمولے پر مبنی ہے۔ اس فارمولے کے متعلق آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ ایک جتھے نے اپنی شدت' ہٹ اور مشترک کوشش بلکہ جماعت میں تفریق پیدا ہو جانے کے خطرہ کا دباؤ ڈال کر آپ کو اور شوریٰ کے بقیہ ارکان کو اس کے ماننے پر مجبور کیا اور اس طرح گویا جماعت کی تاریخ میں مصالحتی فارمولے کی بدعت شروع ہوئی۔ اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ضد اور ہٹ اور جتھہ بندی سے آپ کی مراد شوریٰ کے دونوں گروپوں کا اپنے اپنے نقطۂ نظر پر اصرار ہے تو یہ چیز بلاشبہ موجود تھی اور اگر یہ چیز کوئی جرم ہے تو میں یہ کہوں گا کہ اس جرم میں دونوں گروپ برابر کے شریک ہیں۔ اب ایسی صورت میں کیا ہوتا اور کیا کرنا ممکن تھا۔ فرض کر لیجئے کہ اسی گروپ کی بات مان لی جاتی جو یہ کہہ رہا تھا کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ نے حالات اور خرابیوں کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ قابلِ اعتنا نہیں ہے' اگر صحابہؓ کے زمانہ میں بھی کوئی جائزہ کمیٹی بیٹھتی تو وہ بھی اسی طرح کی رپورٹ پیش کر دیتی جس طرح کی رپورٹ جائزہ کمیٹی نے پیش کی ہے' اس وجہ سے جو کچھ ہو رہا ہے وہی کرتے رہنا چاہئے' اس وقت اصل کام انتخابات کا ہے نہ کہ تعمیرِ سیرت و تطہیرِ اخلاق کا' تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا؟ باہر اس کا جو نتیجہ نکلتا وہ نکلتا' خود شوریٰ کے اندر اس کا نتیجہ یہ

نکلتا کہ آپ کی شوریٰ کے اہل الرائے کی اکثریت یاتو اس نقطۂ نظر کو قبول نہ کرتی یا قبول کرتی تو سخت بددلی کے ساتھ۔ اس پالیسی کو قبول کرنے کیلئے صرف جائزہ کمیٹی کے ارکان ہی تیار نہیں تھے بلکہ باقر خان صاحب' صادق صاحب' وصی مظہر صاحب' مولانا عبدالحق صاحب اور چودھری عبدالحمید صاحب میں سے کوئی صاحب بھی تیار نہیں تھے۔ حد یہ ہے کہ چودھری غلام محمد صاحب بھی اپنی تقریر میں انتخابات اور انقلاب قیادت کے بارے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر چکے تھے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اگر ان لوگوں کی بات نہ مانی جاتی تو یہ سب جماعت کو چھوڑ جاتے' لیکن جس پالیسی پر شوریٰ کے ایسے ارکان غیر مطمئن تھے، آخر یہ پالیسی کن لوگوں کے بل پر چلتی اور اگر چلتی تو بتایئے کہ وہ کس انجام تک پہنچتی؟ ایسی صورت میں جن لوگوں نے مصالحتی فارمولے کی سوچی' میرے نزدیک تو وہ جماعت کے بڑے ہی خیر خواہ تھے اور انہوں نے ایک مصالحتی فارمولا تلاش کر کے جماعت کو ایک بڑے خطرہ سے نکال لیا' اور آپ نے بھی بڑی ہی دانشمندی کا کام کیا تھا کہ ان کو مان لیا تھا' لیکن افسوس ہے کہ اس کو مان لینے اور منوا لینے اور شوریٰ کے اختتام پر اس کی کامیابی کی دعا کر چکنے کے بعد اب آپ اس کو جماعت اسلامی کی بدقسمتی کا آغاز سمجھتے ہیں اور جماعت کو اس کی ہلاکتوں سے بچانے کیلئے آپ نے اور بعض ان حضرات نے جہاد کا اعلان کر دیا ہے جو نہ صرف اس فارمولے کو ماننے والے رہے ہیں بلکہ اس کی تصنیف میں بھی انہوں نے بسلامتیٔ ہوش و حواس حصہ لیا تھا۔ مصالحتی فارمولے کا ذکر آپ نے کچھ ایسے انداز سے فرمایا ہے گویا جماعت کی تاریخ میں یہ کوئی بہت بڑی بدعت ہوئی ہے جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ہے' حالانکہ مصالحتی فارمو خصوصاً تدابیر کے معاملہ میں' نہ کوئی کفر و بدعت ہے نہ ہماری شوریٰ کی تاریخ میں کوئی ؟ بات ہے۔ ہم ہمیشہ سے جس طریق پر گامزن رہے ہیں وہ یہی ہے کہ شوریٰ میں متفقہ فیصلہ کے اٹھتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی تھی کہ ہمارے یہاں کوئی اختلافِ رائے نہیں ہوتا بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ جب کبھی شوریٰ میں کسی مسئلہ پر مؤثر اختلافِ رائے محسوس کیا تھا تو کسر و انکسار کے اصول پر اس اختلاف کو تجاویز میں سمونے کی کوشش کی جاتی رہی ہے مصالحتی فارمولے کی اصل روح یہی ہوتی ہے اور یہی اس مرتبہ بھی ہوا۔ اگر اس چیز۔ جماعت اس سے پہلے نہیں تباہ ہوئی تو اب کیوں اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی؟

یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ شوریٰ کا یہ اجلاس کوئی دن دو دن نہیں رہا

پورے پندرہ روز اس کے اجلاس ہوتے رہے۔ اس فارمولے کے تمام امکانات و مضمرات آپ کے سامنے تھے۔ میں اس دوران میں بار بار آپ سے یہ عرض کرتا رہا کہ اگر انتخابات کے بارے میں اس وقت صرفِ نظر کی پالیسی اختیار کر لی جائے تو اختلاف رفع ہو جائے گا اور آپ نے مجھ سے ہر بار یہی فرمایا کہ انتخابات کا معاملہ ایسا کیا معاملہ ہے کہ جس سے صرفِ نظر نہ کیا جا سکے۔ اس فارمولے کے بنانے والے چودھری غلام محمد صاحب، نعیم صدیقی صاحب سلطان احمد صاحب، باقر خان صاحب اور غالباً وصی مظہر صاحب ہیں۔ جب اس کمیٹی نے شوریٰ کے سامنے یہ فارمولا پیش کیا تو تھوڑی سی بحث کے بعد آپ نے اور دوسرے سب لوگوں نے اس کو مان لیا۔ اگر یہ فارمولا جماعت اسلامی کی بدقسمتی کا آغاز تھا تو اسی وقت آپ نے فرمایا ہوتا کہ میں ایک فرض شناس امیر کی حیثیت سے اس بدقسمتی کا آغاز کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ لیکن اس وقت تو آپ نے اس کا آغاز فرمانا منظور کر لیا اور اپنی فرض شناسی آپ کو یاد نہ آئی، لیکن جب ارکان کو اتحاد و اتفاق کی تلقین، اور دعا و درود کے بعد مجلس برخاست ہو گئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکے تو آپ کو اپنی فرض شناسی یاد آئی۔ جماعت کی تاریخ میں مصالحتی فارمولوں کی مثالیں تو مجھے ملتی ہیں، لیکن امیر کی فرض شناسی کی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی فرض شناسی کی مثال شاید ہی کوئی امیر یا وزیر پیش کر سکے۔ آپ کے اصحاب میں سے جو لوگ جماعتی زندگی کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے، جن کے نزدیک جماعت اسلامی نام ہی آپ کی ذات کا ہے ان کو تو میں کچھ کہنا بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ لیکن آپ کی اس قلابازی نے معاف کیجئے میرے اس حسنِ ظن کو بڑا ہی نقصان پہنچایا ہے جو میں آپ سے رکھتا تھا۔

۸۔ یہ ساری تمہید استوار کرنے کے بعد آپ جائزہ کمیٹی پر وہ فردِ جرم عائد کرتے ہیں جس کے تحت آپ کو امیرِ جماعت ہونے کی حیثیت سے، اس کے ارکان کو، سخت سے سخت سزا دینے کا حق حاصل ہو سکے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں یہ رائے قطعاً نہیں رکھتا بلکہ مجھے اس کا شبہ بھی نہیں ہے کہ جائزہ کا یہ پورا کام اور مجلس شوریٰ میں جائزہ کمیٹی کے ارکان کا کردار ایک دانستہ سازش کا نتیجہ تھا۔ لیکن میرا احساس یہ ہے کہ اس سے عملاً وہی نتائج برآمد ہوئے ہیں جو ایک دانستہ سازش سے برآمد ہو سکتے تھے۔ میں جب آپ کی لکھی ہوئی ان سطروں کو پڑھتا ہوں تو سب سے پہلا اثر اس کا جو مجھ پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے ان جباروں اور ڈکٹیٹروں کے خلاف میرا غصہ بہت کم ہو جاتا ہے جنھوں نے اپنے نہایت وفادار ساتھیوں پر

سازشوں کے الزام لگائے اور ان کو دار پر کھینچا۔ اگر آپ محض اختلافِ رائے کی بناء پر سلطان احمد صاحب' مولانا عبدالغفار حسن صاحب' غازی عبدالجبار صاحب اور عبدالرحیم اشرف صاحب جیسے لوگوں پر سازش کا الزام لگا سکتے ہیں تو دنیا کے دوسرے ڈکٹیٹروں نے اگر اپنے اقتدار کو بچانے کیلئے اخلاق اور سیرت کے لحاظ سے ہمارے مذکورہ رفیقوں سے کہیں کم تر درجے کے لوگوں پر سازشوں کے الزام لگائے تو میرے نزدیک کوئی بڑا گناہ نہیں کیا۔

آپ کہیں گے کہ میں نے ان پر دانستہ سازش کا الزام تو نہیں لگایا بلکہ یہ کہا ہے کہ انہوں نے جو کام کیا ہے اس سے نتائج وہ بر آمد ہوئے ہیں جو ایک دانستہ سازش کے ہوتے ہیں لیکن یہ کہنے سے نہ صرف یہ کہ ان پر لگائے ہوئے الزام میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ اس سے سازشوں کا ایک نیا فلسفہ ہمارے سامنے آتا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہیں سوجھا تھا! اب تک تو ہم یہی سمجھتے رہے ہیں کہ سازش وہی ہوتی ہے جو سازش کے ارادہ سے کی جاتی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ نہیں سازش صرف وہی نہیں ہے جو سازش کے ارادہ کے ساتھ کی جائے بلکہ ہر وہ کام سازش ہے جو خواہ کتنے ہی نیک ارادہ کے ساتھ کیا جائے لیکن اس کا نتیجہ ہماری خواہش کے خلاف نکلے۔ اگر ایسا ہو تو ہم اس کو سازش قرار دے کر اس کے مرتکب کو وہی سزا دے سکتے ہیں جو ایک سازشی کو دی جا سکتی ہے اگر یہ فلسفہ آپ سے پہلے دوسروں کو بھی معلوم ہوتا تو اپنے سے مختلف نقطۂ نظر رکھنے والوں کو سزا دینے کے معاملہ میں وہ بہت سی قانونی موشگافیوں سے بچ جاتے۔ وہ بھی آسانی سے یہ کہہ سکتے کہ فلاں نے اگرچہ فلاں کام سازش کے ارادے سے نہیں کیا ہے' لیکن چونکہ اس کے فعل کا نتیجہ وہی نکلا ہے جو ایک سازش سے بھی نکل سکتا ہے' اس لئے یہ سازش ہے اور اس لئے یہ سازش کی سزا کا مستحق ہے۔ معلوم نہیں سازش کے اس فلسفہ کا ماخذ اسلام میں کیا ہے؟

لیکن محض آپ کے اتنے کرم سے ان بے چاروں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ آپ ان کو دانستہ سازش کرنے والا نہیں قرار دیتے۔ جبکہ بہت سے ایسے کام انہوں نے آپ کے خیال میں دانستہ کئے ہیں جو بالآخر اس سازش پر منتج ہوئے ہیں مثلاً آپ کے ارشاد کے مطابق انہوں نے مندرجہ ذیل جرائم دانستہ کئے ہیں:۔

☆ ...... ایک یہ کہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ وہ ایک ہی طرح کے غیر مطمئن لوگ ہیں' لیکن انہوں نے اس کو راز رکھا' نہ آپ کو اس سے آگاہ کیا اور نہ شوریٰ کے ارکان کو۔

☆ ..... دوسرا یہ کہ انہوں نے مجلس شوریٰ کے تجویز کردہ حدودِ کار سے تجاوز کیا۔ خود اپنے

حدودِ کار کو وسیع کر لیا اور ان امور کی تحقیقات اپنے ذمہ لے لی جن کی وہ خود تحقیقات کرنا چاہتے تھے۔

☆..... تیسرا یہ کہ انہوں نے مجلسِ شوریٰ میں ایسے حالات پیدا کیے جن میں دوسرا رکنِ شوریٰ تو درکنار، امیرِ جماعت بھی خود اپنی رائے آزادی کے ساتھ ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔

☆..... چوتھا یہ کہ انہوں نے ساری تحقیقات ایک مخصوص نقطۂ نظر سے کی اور اپنی رپورٹ میں جماعت کی صرف یک رخی تصویر پیش کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سارے مواد کو اس طرز پر مرتب کیا کہ جن انتہائی نتائج تک وہ مجلسِ شوریٰ کو پہنچانا چاہتے تھے ان کی تائید اس پورے مواد سے حاصل ہو۔

☆..... پانچواں یہ کہ انہوں نے جتھہ بندی کر کے آپ کے لئے ایسے حالات پیدا کئے کہ امیر جماعت کے فرائض انجام دینے کے بجائے آپ بعض مخصوص لوگوں کے آلہ کار اور ان کے اشاروں پر چلنے والے بن کر رہیں۔

☆..... چھٹا یہ کہ ان لوگوں نے آپ کو مجبور کر دیا کہ آپ مجلس شوریٰ کو ان غلط نتائج پر پہنچ جانے دیں جن پر یہ حضرات اپنی جتھہ بندی کے ذریعے سے مجلس شوریٰ کو پہنچانا چاہتے تھے۔

☆..... ساتواں یہ کہ ان لوگوں نے اپنی ضد، بے جا اصرار، شدّت اور جتھہ بندی کے زور سے مجلس شوریٰ کے اندر آپ کے حامیوں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ ایک مخالف پارٹی کی حیثیت سے نمایاں ہوں۔

☆..... آٹھواں یہ کہ اپنی بات منوانے کیلئے مجلس شوریٰ میں آنے سے پہلے انہوں نے جماعت کے فراہم کئے ہوئے موقع سے فائدہ اٹھا کر پوری جماعت میں اپنے ہم خیال لوگ ڈھونڈے، ان کا ایک جتھہ بھی شوریٰ کے باہر تیار کیا، ان کے انفرادی خیالات و نظریات کو جمع کر کے ان کا ایک مقدمہ بنایا، اس مقدمہ کی پشت پر جماعت کے ان سارے لوگوں کی شکایات و اعتراضات کو جمع کیا جن کے وہم و گمان میں بھی اس خاص مقدمہ کو مضبوط کرنے کا تخیل نہ تھا۔ پھر اس سارے سرو سامان سے لیس ہو کر یہ حضرات یکایک مجلس شوریٰ کے سامنے ایک پارٹی کی صورت میں نمودار ہوئے اور پوزیشن یہ اختیار کی کہ ان کے نظریات صرف انہی کے نظریات نہیں ہیں بلکہ باہر، غیر مطمئن لوگوں کی ایک کثیر تعداد، ان کی پشت پر ہے، لہٰذا یہ مجلس شوریٰ اسی راستہ پر چلے جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہیں ورنہ جماعت میں ایک بڑی پھوٹ پڑ کر رہے گی۔

یہ آٹھ جرائم تو انہوں نے آپ کے ارشاد کے مطابق دیدہ و دانستہ اور بسلامتیٔ ہوش وحواس کئے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس کے بعد یہ فیصلہ دینے میں کیوں ہچکچائے کہ جائزہ کمیٹی کا یہ سارا کام اور مجلس شوریٰ میں جائزہ کمیٹی کے ارکان کا کردار ایک دانستہ سازش کا نتیجہ تھا۔ غالباً آپ نے یہ خیال فرمایا ہو گا کہ آپ کے ان واضح مقدمات کے بعد جب ایک غبی سے غبی آدمی بھی اس نتیجہ تک خود بخود پہنچ جائے گا تو آخر اس نتیجہ کو ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ صاف صاف بات کہنے کے بجائے کیوں نہ لگے ہاتھوں احتیاط اور تقویٰ کا بھی کچھ مظاہرہ کر دیا جائے۔

بہرحال میرے نزدیک یہ ایک غیر مبہم حقیقت ہے کہ آپ نے جائزہ کمیٹی کے ارکان پر ایک منظم سازش کا الزام لگایا ہے اور یہ سازش ایسی منظم تھی کہ اس کے جال میں نہ صرف شوریٰ کے بعض ارکان پھنس گئے بلکہ پوری شوریٰ امیر سمیت ایک ایسے فیصلہ پر اپنے انگوٹھے ثبت کرنے پر مجبور ہو گئی جو آپ کے نزدیک جماعت کو تباہ کرنے والا ہے۔

میں جب آپ کی دی ہوئی روشنی میں اس سارے معاملے پر غور کرتا ہوں تو آپ کا کیس یہ بنتا ہے کہ درحقیقت اس گمراہی کے فیصلہ کے لئے کچھ لوگوں نے تو سازش اور جتھہ بندی کی اور کچھ اس سازش اور جتھہ بندی سے مجبور ہو گئے۔ خود آپ اپنے آپ کو اس دوسرے گروہ میں شامل سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کے لئے میرے نزدیک صحیح صورت' دستور کے بموجب یہ تھی کہ آپ پھر شوریٰ کا اجلاس بلاتے اور اس کے سامنے اپنا یہ نقطۂ نظر رکھتے اور اس ساری سازش کا پردہ چاک کرتے' تاکہ ارکان شوریٰ صحیح روشنی میں سارے معاملہ پر نظر ثانی کرتے اور ان لوگوں کو سزا دیتے جو ان کو گمراہ کرنے کیلئے اس سازش کے مرتکب ہوئے تھے۔

اگر خدانخواستہ شوریٰ اسی طرح پھر گمراہ ہو جاتی جس طرح پہلی مرتبہ ہو گئی تھی تو پھر آپ کے لئے دوسرا راستہ ' دستور کی رو سے' یہ تھا کہ آپ ارکان کا اجتماع عام بلاتے اور وہاں شوریٰ کے خلاف اپنا مقدمہ پیش کرتے اور شوریٰ کو اس کا موقعہ دیتے کہ وہ اپنی صفائی پیش کرے۔ اس کے بعد اگر ارکان جماعت شوریٰ کے حق میں فیصلہ دیتے تو آپ مستعفی ہو جاتے اور اگر آپ کے حق میں فیصلہ دیتے تو شوریٰ مستعفی ہو جاتی اور آپ دوسری شوریٰ کا انتخاب کرا لیتے۔ میرے نزدیک معاملہ کے طے کرنے کا آئینی اور باعزت طریقہ یہ تھا۔ شوریٰ کے جس فیصلہ کے خلاف آپ نے یہ اقدام کیا ہے' وہ جن حالات میں بھی ہوا ہے، بہرحال بالاتفاق ہوا

ہے۔ اس کے متعلق یہ معلوم کرنا بھی باقی ہے کہ اپنی مجبوری اور بے بسی کا جو شکوہ اس فیصلہ کو مان چکنے کے بعد آپ کر رہے ہیں اور اس کا جو پس منظر آپ بنا رہے ہیں اس سے دوسرے ارکانِ شوریٰ بھی متفق ہیں یا نہیں؟

لیکن یہ معقول اور آئینی طریقہ اختیار کرنے کے بجائے آپ نے یہ راستہ اختیار کیا کہ جائزہ کمیٹی کے چار ارکان کو یہ حکم دے دیا کہ وہ اپنے استعفے لکھ کر بھیج دیں ورنہ آپ ان سے متعلق حلقوں کو یہ لکھ دیں گے کہ اگر وہ آپ سے امارت کی خدمت لینا چاہتے ہیں تو وہ اپنے ان نمائندوں کو واپس لے کر دوسرے نمائندے منتخب کریں اور ان کے بقیہ ہم خیالوں کو دھمکی دے دی کہ آپ ان سے بعد میں نمٹیں گے۔

میں حیران ہوں کہ آپ کسی رکنِ شوریٰ سے کس حق کی بناء پر یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ شوریٰ کی رکنیت سے استعفاء دے دے۔ اگر آپ یہ فرماتے ہیں کہ اس نے کوئی سازش کی ہے یا کسی سازش کا شکار ہوا ہے تو یہ ایک الزام ہوا جو آپ کی طرف سے اس پر لگایا جا رہا ہے یہ الزام کسی موزوں جماعتی عدالت میں ثابت کئے بغیر کس طرح آپ کو، یہ حق حاصل ہے کہ آپ اس کو نہ صرف یہ کہ مجرم بنا ڈالیں بلکہ اس کو سزا بھی دے دیں اور پھر اس سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ آپ کے حکم سے خود پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں ڈال لے۔

آپ کسی حلقہ کے لوگوں کے سامنے ان کے نمائندے کا معاملہ اگر پیش کر سکتے ہیں تو اس حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں کہ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت ہو چکا ہے اس لئے وہ اس کو واپس بلا لیں یا اس حیثیت سے پیش کر سکتے ہیں کہ اس کے خلاف آپ کو کوئی شکایت ہے جس کی حلقہ والوں کو تحقیق کرنی ہے اور پھر اس پر فیصلہ دینا ہے۔ پہلی صورت یہاں موجود نہ تھی اور دوسری صورت میں یہ ضروری تھا کہ آپ تحقیق اور فیصلہ دونوں ان پر چھوڑتے، لیکن آپ نے یہ کیا ہے کہ ایک فیصلہ بھی پہلے ہی سے کر کے ان پر لاد دیا ہے جس کو اگر وہ نافذ نہ کریں تو آپ استعفاء دے دیں گے۔ آخر کس حلقہ کے لوگوں کی شامت آئی ہوئی ہے کہ وہ ایک رکن شوریٰ کی خاطر امیر جماعت کو مستعفی ہونے پر مجبور کرنے کا خطرہ مول لیں۔ آپ کا یہ کہنا بھی ایک بالکل ہی بے معنی بات ہے کہ لوگوں کو اپنے حلقہ والوں کے سامنے صفائی پیش کرنے کا پورا حق ہو گا۔ جب حلقہ والے اپنے فیصلہ میں آزاد نہیں ہیں تو ان کے سامنے صفائی پیش کرنے سے کیا حاصل؟ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کسی حلقہ والوں کو اپنا منتخب کردہ نمائندہ اس کی کسی کوتاہی یا نا اہلی کی بناء پر واپس بلا لینے کا حق ایک معقول حق ہے، لیکن یہ ایک با

ثلف بات ہے اس بات سے کہ آپ کسی حلقہ کے نمائندے کو واپس کر دیں کہ یہ سازشی ہے' در آن حالیکہ آپ نے اس کی سازش کسی جماعتی عدالت میں ثابت نہیں کی ہے۔

آپ کے قیم جماعت نے اپنی معروف سادگی کے ساتھ فرمایا تھا کہ اگر کسی شخص سے یہ لہا جائے کہ بھئی آپ کو شوریٰ کی رکنیت سے استعفٰے دے دینا چاہئے تو جماعتی مزاج کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ استعفاء دے دیں۔ میں نے ان سے کہا کہ عام حالات میں تو یہ ہو سکتا ہے لیکن اگر آپ کسی رکن سے یہ کہیں کہ تم سازشی ہو اس لئے شوریٰ کی رکنیت سے استعفا دے دو ورنہ ہم تمہارے حلقہ والوں سے مطالبہ کریں گے کہ تم کو واپس بلا لیا جائے' تو وہ آپ سے ضرور پوچھے گا کہ حضرت میرے سازشی ہونے کا ثبوت کیا ہے؟

پھر جائزہ کمیٹی کے ارکان کا معاملہ الگ الگ چار انفرادی ارکان کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک کمیٹی کا معاملہ ہے جس نے اگر کوئی جرم کیا ہے تو ایک کمیٹی کی حیثیت میں کیا ہے۔ ایک جرم جو مشترک نوعیت سے کیا گیا ہے اس کے مجرموں کو الگ الگ عدالتوں میں بھیج کر ان کے مقدمہ کی سماعت کرانے کا طریقہ ایک نرالا طریقہ ہے اور غالباً سب سے پہلے اس کا تجربہ جماعت اسلامی ہی کرے گی۔

جائزہ کمیٹی کے ارکان میں سے دو غیر علاقائی ارکان ہیں۔ آخر ان غیر علاقائی ارکان کے معاملہ کو حلقہ وار اجتماعات میں رکھنے کا کیا تک ہے؟ اگر ان کا معاملہ پیش ہو سکتا ہے تو ارکان کے اجتماع عام میں' اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے سامنے جائزہ کمیٹی کی رپورٹ بھی پیش ہو۔

بہر حال میں اس معاملے پر جس پہلو سے بھی غور کرتا ہوں' کم از کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ اب تو صورت گویا یہ بنی کہ جو شخص شوریٰ کا رکن بنے وہ اگر چاہے تو ادب سے آپ کی خدمت میں کوئی گذارش کر دیا کرے' لیکن اگر اس نے اپنی رائے پر اصرار کیا یا آپ پر کوئی اعتراض اٹھایا یا اپنے زورِ استدلال سے کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا تو آپ اس سے خود استعفاء وصول کر لیں گے ورنہ اس کے حلقہ والوں کو لکھ دیں گے کہ اگر میری امارت چاہتے ہو تو اس سازشی کو واپس بلا لو۔ اگر یہی جمہوریت و شورائیت ہے تو اس کا درس بہت اچھی طرح مسولینی' ہٹلر اور اسٹالین دے گئے ہیں اور مذہبی روپ میں مرزا بشیرالدین محمود دے رہے ہیں۔ اس کے لئے قوم ہماری خدمات کی محتاج نہیں ہے۔

آپ نے از راہ عنایت' ملزم ارکان کو یہ موقع عنایت فرمایا ہے کہ آپ ان کو حلقہ وار

اجتماعات میں اظہار خیال کی آزادی دیں گے اور اگر وہ ' ارکان جماعت کی اکثریت کو ہم خیا
بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو آپ قیادت ان کی طرف منتقل کر دیں گے۔ مجھے اس
کوئی شبہ نہیں ہے کہ حلقہ وار اجتماعات میں آپ استعفے کی دھمکی کے ساتھ کھڑے ہو جائیں
تو جماعت کی اکثریت آپ ہی کا ساتھ دے گی۔ بدقسمتی سے ——— جماعت کا مز
شروع ہی سے کچھ ایسا بنایا گیا ہے کہ ہمارے بہت سے ارکان دلائل کے بجائے ' اشخاص
روشنی میں مسائل کو دیکھتے ہیں۔ یہ صورتحال ایک افسوسناک صورتحال رہی ہے اور اس
اصلاح ہونی چاہئے تھی ' لیکن میں صفائی کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں نے ا
صورتحال کی اصلاح کی جرأت کی ان کا منہ برابر بند کرنے کی کوشش کی گئی اور اب تو کچھ عر
سے یہ حال ہے کہ مرکز میں باقاعدہ یہ نظریہ بنالیا گیا ہے کہ تحریکیں اپنے اصولوں کے بل
نہیں چلا کرتی ہیں بلکہ شخصیت کے بل پر چلا کرتی ہیں۔ چنانچہ اب جماعت کے سارے
ونسق کو اسی نظریہ کے تحت چلایا جارہا ہے اور جو چیز بھی اس کے خلاف نظر آتی ہے ' شدت
ساتھ اس کو روکا جاتا ہے۔ میں غیر مبہم الفاظ میں یہ بات بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جائزہ
اور شوریٰ کا فیصلہ نیز جائزہ کمیٹی کے ہم خیال ارکان شوریٰ کے خلاف آپ کا یہ تازہ اقدام
اسی نظریہ کا ایک مظہر ہے۔ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ سے غالباً پہلی مرتبہ آپ کو یہ احساس ہو
جماعت میں اب بہت سے لوگ ان خرابیوں کو محسوس کرنے لگے ہیں جو مرکز کے غلط ر
کے سبب سے پیدا ہو چکی ہیں اور شوریٰ میں غالباً پہلی مرتبہ آپ کو یہ تجربہ ہوا کہ شوریٰ
اہل الرائے ان خرابیوں کی اصلاح کی ضرورت کو اس شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگے
کہ آپ کے استعفے کی دھمکی کے باوجود بھی وہ اصلاح کی ضرورت کے قائل ہیں۔ اس چیز
آپ کو گھبرا دیا ' لیکن شوریٰ میں آپ نے دیکھ لیا کہ استعفے کی دھمکی سے بھی لوگوں کو دبایا
جاسکتا۔ اس وجہ سے اس وقت تو آپ شوریٰ کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو گئے لیکن شوریٰ کے خ
جانے کے بعد آپ نے یہ محسوس کیا کہ گربہ کشتن روزِ اول باید ' اگر یہ رجحان ترقی کر
پھر اس کا روکنا ناممکن ہو گا۔ چنانچہ اس کو روکنے کیلئے ایک قدم تو خاص مرکز کی قیادت
یہ اٹھایا گیا کہ جماعتوں کے مقامی اجتماعات میں ایک مفروضہ سازش کا فسانہ اور آپ
مظلومی اور بے کسی کا دکھڑا سنا کر ارکانِ جماعت کو شوریٰ کی قرارداد کے خلاف خوب اُ
گیا تاکہ حلقہ وار اجتماعات سے پہلے جائزہ کمیٹی ' شوریٰ کی قرارداد اور جائزہ کمیٹی کی رپور
تائید کرنے والے ارکان شوریٰ کے خلاف فضا خوب گرم ہو جائے ' اور دوسرا قدم آپ

اپنے فرمان کی صورت میں اٹھایا تاکہ ان تمام ارکان شوریٰ کی سرکوبی کی جائے' جنھوں نے آپ کے حضور میں جرأت کے ساتھ اظہار رائے کی گستاخی اور شدت کے ساتھ اصلاحِ حال کا مطالبہ کیا۔ میرے نزدیک آپ کے اقدام کا اصلی محرک یہ ہے کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ نے ایک طرف تو ہماری تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے اور دوسری طرف اس کے ارکان نے ہمارے ہاتھ میں ہمارے ہی لکھے ہوئے لٹریچر کا آئینہ بھی پکڑا دیا ہے۔ اب جب اس آئینہ میں ہم اپنی صورت دیکھتے ہیں تو وہ بڑی ہی بھیانک نظر آتی ہے۔ ہم یہ ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ فی الواقع ہماری صورت ہی مسخ ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یہ آئینہ ہی توڑ کر پھینک دیا جائے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے سر بھی توڑے جائیں جو یہ تصویر اور یہ آئینہ ہمارے سامنے لائے ہیں۔

(دستخط) امین احسن اصلاحی

باب سوم

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی رفاقت کا

تاریخی پس منظر

اور جماعتِ اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ

ارکانِ جائزہ کمیٹی پر الزام نامے کے جواب میں مولانا مودودی کے نام مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا یہ خط ___ جسے بعد میں ایک موقع پر پاکستان میں شام کے سابق سفیر جناب عمر بہاء الامیری نے اس شکوے کے باوجود کہ "فیه بعض الخشونة" (اس میں قدرے درشتی پائی جاتی ہے) ایک قاضی کا فیصلہ قرار دیا اور مولانا اصلاحی کو مخاطب کر کے اعتراف کیا کہ "قد کتبت هذا الکتاب کما یکتب القاضی قضائه" (آپ نے یہ خط بالکل ایسے لکھا ہے جیسے ایک قاضی اپنا فیصلہ لکھتا ہے!) جماعت اسلامی کے ان دو چوٹی کے قائدین کے آپس کے تعلقات اور سترہ سالہ رفاقت کے اختتام کی تمہید بن گیا' اور اس خط کے ذریعے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے گویا مولانا مودودی پر عدم اعتماد کا تحریری اظہار کر دیا!

یہ چونکہ جماعت کی تاریخ کا ایک انتہائی اہم واقعہ ہے ___ لہٰذا ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور اس کے لئے ان دونوں حضرات کے تعلقات کے تاریخی پس منظر پر ایک سرسری نظر ڈالنا بہت مفید ہے۔

اصحاب ثلاثہ

۴۱ء میں جب جماعت اسلامی قائم ہوئی تو اس وقت جو لوگ مولانا مودودی کی دعوت پر جمع ہوئے ان میں اخلاص' تقویٰ اور للّٰہیت کے اعتبار سے تو ہو سکتا ہے کہ کچھ دوسرے لوگ

بہت آگے ہوں لیکن مشہور عالم دین اور معروف اہل قلم ہونے کے اعتبار سے متحدہ ہندوستان کی جانی پہچانی شخصیتوں میں سے مولانا محمد منظور نعمانی مدیر 'الفرقان' لکھنؤ اور مولانا امین احسن اصلاحی مدیر 'الاصلاح' سرائے میر اعظم گڑھ کے نام صفِ اول میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے دو مشہور و معروف تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم صفِ ثانی میں سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا مودودی مولانا نعمانی اور مولانا اصلاحی نہ صرف یہ کہ عمر کے اعتبار سے تقریباً برابر تھے بلکہ علمی و صحافتی زندگی کے اعتبار سے بھی تقریباً ہم سن تھے۔ مولانا مودودی کا 'ترجمان القرآن' مولانا نعمانی کا 'الفرقان' اور مولانا اصلاحی کا 'الاصلاح' ـــــ ان تینوں پرچوں کی اشاعت تقریباً ایک ہی وقت شروع ہوئی ـــ ان 'اصحابِ ثلاثہ' میں سے مولانا محمد منظور نعمانی پر دینی تعلیم کے قدیم سلسلے سے گہرے تعلق اور اصحابِ تقویٰ واحسان سے قریبی روابط کی بنا پر علم دین کے ساتھ تقویٰ کا رنگ غالب تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مولانا حمید الدین فراہیؒ کے تلمیذ رشید ہونے کی بنا پر فہم قرآن میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے ـــــ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جدید نظریات وافکار کے وسیع مطالعے اور نظام دین پر ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے خصوصی نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک عام فہم، دل نشین اور شگفتہ طرزِ تحریر کے مالک ہونے کی وجہ سے جدید علمِ کلام میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔

جس زمانے میں مولانا مودودی متحدہ قومیت کے نظریئے اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے موقف پر شدید تنقید کے ضمن میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے 'مسلم قوم پرستی' کے انتہائی مقام تک پہنچ گئے تھے، ایک بار 'الاصلاح' اور 'ترجمان القرآن' میں شدید ٹکراؤ بھی پیدا ہوا اور مولانا مودودی کے موقف پر مولانا اصلاحی نے اس اعتبار سے شدید تنقید کی کہ مسلم قوم پرستی فی نفسہٖ اسلام کے موقف کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ لیکن جب مولانا مودودی نے اپنے نقطۂ نظر کو تبدیل کر لیا اور خالص اسلامی نقطۂ نظر کے تحت وہ مضامین لکھے جو ان کی کتاب "سیاسی کشمکش" کے حصہ سوم میں شامل ہیں تو مولانا اصلاحی نے ان کے نقطۂ نظر کی صحت کو تسلیم کر لیا اور اس طرح ان حضرات کے مابین تعاون اور اتحاد کی راہ ہموار ہوئی[1]

---

[1] اس موقع پر "تحریکِ جماعتِ اسلامی" کے حصہ اول کے دیباچے کے یہ الفاظ ذہن میں تازہ کر لیئے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علمی و صحافتی تعارف سے قطع نظر مولانا مودودی سے ملاقات اور براہ راست ربط و تعلق کا موقع مولانا نعمانی کو مولانا اصلاحی سے پہلے ملا ــــ اور جب مولانا مودودی نے خالص اسلامی نصب العین پیش کر کے " جماعت اسلامی " کے قیام کی دعوت دی تو مولانا نعمانی ہی نے مولانا اصلاحی کو مولانا مودودی کے بارے میں یہ اطمینان دلایا کہ اگرچہ ان کی شخصیت اس معیار پر تو پوری نہیں اترتی جو اقامتِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جھنڈا اٹھانے والوں کے لئے لازمی ہے ــــ تاہم مولانا مودودی ایک " کام چلاؤ " آدمی بہرحال ہیں اور ان کے ساتھ تعاون و اشتراک کیا جانا چاہئے۔ مولانا نعمانی کی اس رائے کے پس منظر میں جو جذبہ کارفرما تھا اس کی نشاندہی خود انہوں نے اپنے ایک حالیہ مکتوب میں ان الفاظ میں کی ہے :-

"اسلام کی سربلندی کا نصب العین زیادہ ان چھٹک اور کھود کرید کرنے نہیں دیتا تھا......"

مولانا اصلاحی صاحب کی مودودی صاحب سے پہلی ملاقات جماعت میں شمولیت کے اعلان کے بعد ہوئی اور مولانا نعمانی صاحب کی رائے کے برعکس مولانا اصلاحی صاحب کی جو رائے مولانا مودودی کے بارے میں قائم ہوئی اس کا اظہار انہوں نے انہی دنوں مولانا نعمانی سے ایک نجی گفتگو میں بایں الفاظ کیا کہ :- "لا فرق بینہٗ و بین پرویز" (ان کے اور پرویز صاحب کے مابین کوئی فرق نہیں ہے!)

اس کے باوجود مولانا اصلاحی صاحب کا جماعت میں شامل رہنا اس بنا پر تھا کہ ان کے

(گزشتہ سے پیوستہ)

جائیں: "لیکن یہ بہرحال ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی کا قیام ان نظریات کی اساس پر نہیں ہوا جو مولانا مودودی نے 'سیاسی کشمکش' کے پہلے اور دوسرے حصوں میں بیان فرمائے ہیں بلکہ ان پر ہوا ہے کہ جو اس کے تیسرے حصے میں مفصل و مدلل بیان ہوئے ــــ! ان نظریات کو اساس بنا کر مولانا نے ۱۹۴۰ء میں ایک اسلامی جماعت کی تشکیل کی دعوت دی جس کو قبول کرنے والوں میں وہ بھی تھے جو مولانا مودودی کے پہلے سیاسی موقف سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور اس پر شدید تنقیدیں کر چکے تھے۔

للہذا 'تحریک جماعت اسلامی' کی ابتداء زیادہ سے زیادہ ۳۹-۱۹۳۸ء سے شمار کی جا سکتی ہے۔ اس تحریک کے داعی یقیناً مولانا مودودی ہی ہیں لیکن ان کی جس دعوت پر جماعتِ اسلامی قائم ہوئی وہ سیاسی کشمکش حصص اول و دوم کی نہیں بلکہ صرف حصہ سوم کی ہے۔" (صفحہ ۱۳)

نزدیک وہ مقصد اور نصب العین جس کے لئے کام کرنے کی دعوت مولانا مودودی صاحب نے دی تھی بہر حال بالکل صحیح تھا' اور دین کے اصل تقاضے اسی طریقے پر کام کرنے سے ادا ہو سکتے تھے جس طریقے پر کام کرنے کی دعوت مولانا مودودی نے دی تھی!

متذکرہ بالا پس منظر میں جو اجتماعیت قائم ہوئی ــــ اس کا ایک پہلو تو یہ ظاہر ہے کہ اس میں داعی کی قوتِ جذب و کشش سے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کے برابر دخل جمع ہونے والوں کے ذوقِ انجذاب کو حاصل تھا ــــ اور دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ دوسری قدیم یا ہم عصر دینی جماعتوں اور تحریکوں کے برعکس "جماعت اسلامی" کی اجتماعیت کی اساس و بنیاد کوئی "شخصیت" نہ تھی' بلکہ نصب العین اور مقاصد تھے ــــ یہی وجہ ہے کہ اول روز ہی سے اس میں دستور اور قواعد و ضوابط کو بنیادی اہمیت حاصل رہی![1]

جماعت کا پہلا تنظیمی بحران

جماعت کے قیام کے بعد جب 'دارالاسلام' میں قرب میسر آیا اور ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے تو جلد ہی مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اور دوسرے بہت سے حضرات نے یہ محسوس کیا کہ مولانا مودودی کی شخصیت کے بارے میں ان کے پہلے اندازے بھی

---

[1] یہاں مذکورۃ الصدر دیباچے کے یہ الفاظ لائق توجہ ہیں:۔

"مولانا مودودی صاحب کو یقیناً اس کا حق ہے کہ اپنے ذہنی ارتقاء کے مختلف منازل اور اس سفر کے دوران لئے گئے موڑوں (Turns) کی تاریخ بیان فرماتے ہوئے ابتداء جہاں سے چاہیں کریں لیکن جماعت اسلامی کی تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کی ابتداء اس طرز پر کرنا صرف اس صورت میں درست ہو سکتا تھا کہ "جماعتِ اسلامی" کچھ لوگوں کے مولانا مودودی صاحب کے ہاتھ پر "بیعت" کرنے سے معرض وجود میں آئی ہوتی۔ اس صورت میں کسی دستور کا مرتب ہونا اور امیرِ جماعت کا منتخب کیا جانا بے معنی ہوتا" (صفحہ ۱۲)

"چنانچہ جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے یہ جماعت اس طرح وجود میں نہیں آئی کہ کچھ لوگوں نے مولانا مودودی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ہو بلکہ اس کی تشکیل اس طرح ہوئی کہ کچھ لوگوں نے ایک نصب العین کے بعد' اس کی ایک مخصوص تشریح اور ایک مکمل دستور کے ساتھ وفاداری کا رشتہ استوار کیا اور پھر انہوں نے اپنے میں سے ایک امیر اور اس کی ایک مجلسِ شوریٰ منتخب کی اور ان کے مابین اختیارات کی حدود کو متعین کر دیا" (صفحہ ۱۴)

بہت مبالغے پر مبنی تھے اور یہ کہ ان کی شخصیت کو اس کام سے سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے جسے لے کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' چنانچہ اپنے قیام کے ایک ڈیڑھ سال کے اندر جماعت اسلامی اپنے پہلے بحران سے دوچار ہو گئی ــــ اور مولانا محمد منظور نعمانی' مولانا ابوالحسن علی ندوی' مولانا جعفر پھلواروی اور دیگر بہت سی اہم اور معروف شخصیتوں سمیت جماعت اسلامی کے کل ارکان کی تقریباً ایک تہائی تعداد جماعت سے علیحدہ ہو گئی۔

مولانا اصلاحی کا موقف

اس موقع پر جو دو باتیں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ان حضرات سے کہیں وہ بعد کے پیش آمدہ واقعات کے اعتبار سے انتہائی اہم ہیں:۔

ایک یہ کہ آپ حضرات چونکہ خود تدین و تقویٰ کے اعتبار سے بلند مقامات پر فائز ہیں لہٰذا آپ کے لئے جائز ہے کہ آپ مودودی صاحب کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر تنقید کریں' جو تقویٰ کے منافی ہیں ــــ لیکن میں چونکہ اس اعتبار سے خود تقریباً مولانا مودودی ہی کی سطح کا آدمی ہوں لہٰذا اس معاملے میں زبانِ طعن نہیں کھول سکتا!

دوسرے یہ کہ میں اگر جماعت میں شامل نہ ہوا ہوتا تو دوسری بات تھی' لیکن اب جبکہ میں جماعت اسلامی میں شامل ہو چکا ہوں تو اس سے علیحدگی کو معمولی بات نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک اب صحیح صورت یہ ہے کہ اصلاحِ احوال کی مقدور بھر کوشش کی جائے لہٰذا میں جماعت میں شامل رہ کر اس بات کی سعی کرتا رہوں گا کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی اصلاح کرتے اور ایک دوسرے کی خامیوں کی تلافی کرتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں اور دین کی خدمت کی کوشش کریں۔

متذکرہ بالا بحران اور علیحدگیوں کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی جماعت کی صفِ اول میں مولانا مودودی کے ساتھ تنہا رہ جانے کی بنا پر جماعت کی تنظیم میں واضح طور پر شخص نمبر دو بن گئے ــــ اول تو یہی بات کہ ایک شخص کسی جماعت میں واضح طور پر شخصِ دوم بن جائے اس کی پوزیشن کو نازک بنا دینے کے لئے کافی ہے ــــ پھر جب صورت حال یہ ہو کہ مزاج اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے اس کے اور امیر کے مابین نمایاں فرق موجود ہو اور وہ اپنے ذمے یہ کٹھن خدمت بھی لے لے کہ اسے مقاصد اور نصب العین سے تعلقِ خاطر کی بنا پر نہ صرف اس کے

ساتھ نباہ کرنا ہے بلکہ اس کی خامیوں اور کمیوں کی تلافی بھی کرنی ہے تو صورت حال اور بھی نازک ہو جاتی ہے ـــ لیکن یہ حقیقت ہے اور اس سے شاید ہی کوئی شخص انکار کی جرأت کر سکے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے اس نازک اور کٹھن ذمہ داری کو کمالِ ہمت و تحمل کے ساتھ مسلسل سولہ سترہ سال نبھایا۔

مولانا اصلاحی کی خدمات

اس پورے عرصے میں مولانا امین احسن اصلاحی مولانا مودودی کے دستِ راست رہے، اور پوری تن دہی اور انہماک کے ساتھ نہ صرف اس نصب العین کی خدمت میں لگے رہے جس کی خاطر جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی تھی، بلکہ جماعت کے اندر یا اس کے باہر کے حلقوں سے جب بھی کوئی حملہ مولانا مودودی کی ذات پر ہوا تو اس کی مدافعت میں بھی ہمیشہ مولانا امین احسن اصلاحی ہی سینہ سپر ہوئے حتیٰ کہ اس سلسلے میں انہیں اپنے دیرینہ دوستوں اور رفیقوں ہی کی نہیں بلکہ اپنے بزرگوں اور ممدوحوں و مخدوموں تک کی کبیدگیٔ خاطر برداشت کرنی پڑی۔

تقسیم ہند سے قبل یعنی جماعت اسلامی کے دورِ اوّل میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے تحریک اسلامی کی جو سب سے بڑی خدمت سرانجام دی وہ یہ تھی کہ اس تحریک کے اصول و مبادی اور اس کے طریق کار کے بعض انتہائی اہم پہلوؤں اور اس کی جدّوجہد کے نمایاں مراحل کو براہِ راست قرآن حکیم کی روشنی میں واضح اور مستحکم اساس پر مرتّب و مدوّن کیا ـــ جس کے نتیجے میں "دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار" جیسی بلند پایہ اور مایۂ ناز کتاب منصۂ شہود پر آئی۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اسی کتاب کے اثر سے جماعت اسلامی کے لٹریچر میں مولانا مودودی صاحب کی بعض اہم اور بنیادی مگر سطحی اصطلاحات جیسے حکومتِ الٰہیہ کا قیام وغیرہ کا استعمال متروک ہوا، اور ان کی جگہ شہادتِ حق، اور اقامتِ دین کی قرآنی اصطلاحات رائج ہوئیں اور فی الجملہ جماعت کی تحریک پر دینی رنگ زیادہ گہرا ہوا ـــ جماعت کی تقسیم ہند سے پہلے تک کی 'رودادوں' کے مطالعے سے دوسری حقیقت جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جماعتی زندگی کے مقتضیات اور اسلامی نظم جماعت کے اصول و فروع اور خدوخال کی وضاحت کے معاملے میں بھی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

نے اہم کردار ادا کیا۔ [1]

تنظیمِ جماعت کے ضمن میں ایک اصولی اختلاف

اس تعاضد و تناصر کے ساتھ ساتھ اندر ہی اندر ایک معاملے میں مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کے مابین اختلاف بھی رہا ـــ یہ معاملہ اسلامی نظامِ جماعت میں امیر کے اختیارات سے متعلق تھا۔ مولانا مودودی بحیثیتِ امیرِ جماعتِ اسلامی اپنے لئے غیر محدود اختیارات کے طلب گار تھے۔ ان کے نزدیک شوریٰ کا مقام صرف یہ تھا کہ امیر کو اپنے مشورے سے مطلع کردے۔ اس کے مشورے کو قبول یا ردّ کر دینے کا مکمل اختیار امیر کو حاصل تھا گویا جدید اصطلاح میں مولانا مودودی کے نزدیک جماعت اسلامی کے امیر کو شوریٰ پر 'ویٹو' کا حق حاصل تھا ـــ اس کے برعکس مولانا اصلاحی شدت کے ساتھ اس رائے کے حامل تھے کہ اسلامی نظم جماعت میں امیر کو شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہونا چاہیئے یہ ہوسکتا ہے کہ اس معاملے میں مولانا اصلاحی صاحب کے پیشِ نظر اس مسئلے کے خالص علمی (ACADEMIC) پہلوؤں کے علاوہ خاص طور پر جماعت اسلامی کے مخصوص حالات بھی ہوں' بہرحال مولانا اصلاحی صاحب ابتداء ہی سے اس معاملے میں اپنے نقطۂ نظر کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرتے رہے ـــ حتیٰ کہ تقسیم ہند سے متصلاً قبل الہٰ آباد کے کل ہند اجتماع کے موقع پر منعقدہ مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں اس مسئلے پر خاصی تلخی بھی ہوئی ـــ تاہم تقسیمِ ہند سے قبل تک چونکہ جماعت کا فعال دور شروع ہی نہیں ہوا تھا لہٰذا اس معاملے کی اہمیت بھی زیادہ تر علمی (ACADEMIC) ہی رہی!

---

[1] یہی بات ہے جو " تحریکِ جماعتِ اسلامی" کے دیباچے میں اس طرح بیان ہوئی کہ:۔
" رہے ان کے (مولانا مودودی) کے مخصوص " کلامی نظریات " اور ان کا خاص تصورِ دین و تحریکِ اسلامی تو جہاں یہ واقعہ ہے کہ وہ اولاً بھی جماعت کی اساس میں موجود تھے اور بعد میں بھی بہیم اس کی رگ و پے میں سرایت کرتے رہے وہاں یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کچھ اور اہل قلم کی تحریروں نے بھی جماعت اسلامی کے تصور دین اور تحریک اسلامی کے خطوط اور نقوش مرتب کرنے میں اہم حصہ ادا کیا اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصانیف تو اس معاملے میں انتہائی مؤثر ثابت ہوئیں۔ حتیٰ کہ یہ حقیقت ہے کہ جماعت کی تشکیل کے بعد اسکے تحریکی لٹریچر میں مولانا اصلاحی صاحب کی تحریروں کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے۔ " (صفحہ ۱۳)

یک جان دو قالب

تقسیم ہند کے بعد بھی مسلسل نو دس برس تک مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی مزاج کے شدید اختلاف کے باوجود یک جان دو قالب ہو کر ساتھ کام کرتے رہے ـــــ اور پاکستان کے عوام اور جماعت اسلامی کے ارکان تو کجا خود مرکزی مجلس شوریٰ کے زیادہ سے زیادہ ایک دو آدمیوں کے سوا کسی کو بھی اس کا احساس تک نہیں ہوا کہ ان دونوں حضرات کے مابین کسی معاملے میں کوئی قابل ذکر اختلاف موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا انتہائی ایثار تھا کہ انہوں نے اپنی شخصیت کو بالکلیہ مولانا مودودی کی شخصیت میں ضم ہی نہیں، گم کر دیا اور اس معاملے میں انہوں نے صرف اپنے دیرینہ رفقاء اور بزرگوں کے طعنے ہی برداشت نہیں کئے بلکہ اغیار کی پھبتیاں تک سہیں۔ کسی نے انہیں مولانا مودودی کا انجلز قرار دیا ـــــ اور کسی نے حکیم نور الدین! بہر صورت انہوں نے کبھی مولانا مودودی کے 'رجلِ ثانی' (SECOND MAN) قرار دیئے جانے میں عار محسوس نہ کیا۔

ایک اہم دستوری نکتہ

اوپر امیر اور شوریٰ کے مابین اختیارات کی تقسیم کے سلسلے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نقطۂ نظر کے جس اختلاف کا ذکر کیا گیا ہے وہ بالآخر اس طرح طے ہوا کہ جماعت اسلامی پاکستان کے دستور میں امیر اور شوریٰ کے اختلاف کی صورت میں جماعت کے عام ارکان سے استصواب کی راہ حتمی طور پر متعین کر دی گئی اور طے کر دیا گیا کہ اگر جماعت کے ارکان کی اکثریت امیر کی رائے پر صاد کر دے تو شوریٰ خود بخود معزول ہو جائے گی اور نئی شوریٰ منتخب ہوگی۔ بصورت دیگر امیر معزول ہو جائے گا اور نئے امیر کا انتخاب ہو گا! ـــــ

عملی صورتِ حال

اس سے یہ تو ضرور ہو گیا کہ نظری اعتبار سے جماعت اسلامی کے دستور میں امیر کے ساتھ شوریٰ کو بھی اہم اور مستقل بالذات حیثیت حاصل ہو گئی اور ان کے مابین نزاع کی صورت میں تصفیے کی ایک راہ متعین ہو گئی لیکن عملاً جماعت اسلامی پاکستان میں شورائیت بطور ایک نظام (INSTITUTION) کبھی رائج نہ ہو سکی۔

آزادی کے فوراً بعد جماعت اپنے فعّال دور میں داخل ہوگئی اور اس میں کچھ تو حالات اور واقعات کی رفتار اس قدر تیز رہی کہ ایک قسم کی ہنگامی صورت حال ہر وقت طاری رہی جس میں مشاورت کے امکانات خود بخود ہی کم ہو جاتے ہیں ـــــ اور کچھ مولانا مودودی نے مسلسل یہ طرز عمل اختیار کئے رکھا کہ ہر اہم فیصلہ خود کر لیتے اور اس کے تحت آئندہ کے لئے عملی اقدام کی ابتدا بھی ـــــ کسی جلسۂ عام کی تقریر یا اخباری بیان میں کر ڈالتے ـــــ اس کے بعد جب شوریٰ کا اجلاس ہوتا تو وہ غریب اس صورت حال سے دوچار ہو جاتی کہ ایک اقدام کیا جا چکا ہے اور اب جماعت کا وقار اور اس کے امیر کی عزت (PRESTIGE) صرف اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ جماعت اس لائحہ عمل (LINE OF ACTION) کو اختیار کرلے!

جماعت کی سِول سروس

پاکستان میں جماعت اسلامی نے جو طریق کار اختیار کیا ـــــ اور اس کے جو نتائج بر آمد ہوئے ان سب پر ایک سیر حاصل بحث "تحریک جماعت اسلامی" کے حصہ اوّل میں کی جاچکی ہے لیکن موضوع زیر بحث کا تقاضا ہے کہ اس کے چند مزید گوشوں کو روشنی میں لایا جائے!

پاکستان میں جماعت کے کام کی تیز رفتاری اور اس کے تیزی کے ساتھ وسعت پذیر ہونے کے یہ نتائج تو ظاہر ہی ہیں کہ نہ نئی بھرتی کے لئے سابقہ معیار قائم رکھا جا سکا اور نہ نئے آنے والوں کے لئے تربیت کا خاطر خواہ اہتمام ہو سکا ـــــ لیکن عواقب کے اعتبار سے اس کا سب سے زیادہ خطرناک نتیجہ جو بر آمد ہوا وہ یہ تھا کہ نووارد اور ہر اعتبار سے خام مگر 'تیز' کارکنوں کو 'تیزی' کے ساتھ جماعت میں آگے بڑھنے کے مواقع مل گئے۔ اوّل تو جو لوگ جماعت کے اس 'سیاسی دور' میں جماعت میں شامل ہوئے ان کے ذہن کی ساخت اور مزاج کی افتاد میں فطری طور پر شروع ہی سے 'سیاست' کا رنگ غالب تھا' ـــــ پھر تیزی سے بڑھتی ہوئی ضروریات کے تحت جب جماعت کی CIVIL SERVICE توسیع پذیر ہوئی تو اس میں ایک فطری ضرورت کے تحت وہ لوگ کھپائے گئے جو جماعت سے تعلق کی بنا پر سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ کئے گئے ـــــ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ بلا استثناء علم دین سے بالکل کورے تھے اور بقول شخصے صرف تفہیمات اور تنقیحات کے 'فارغ التحصیل' تھے۔ حد یہ ہے کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد نے جماعت کے تمام لٹریچر کو بھی بالاستیعاب نہ پڑھا تھا ـــــ اور ان کے بڑے بڑوں کے لئے بھی مولانا اصلاحی صاحب کی تحریریں تو بہت 'مشکل' اور

'روحی' تھیں ہی! ـــــ جماعت کے حالیہ طریق کار کے پیش نظر جو سب سے بڑا وصف ان لوگوں میں تلاش کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ وہ تقریر کر سکیں، اچھے منتظم ہوں اور دفتری و تنظیمی ذمہ داریوں کو باقاعدگی اور نفاست کے ساتھ ادا کر سکیں یعنی یہ کہ فی الجملہ "تیز کارکن" ہوں چنانچہ ان میں سے جو جتنا 'تیز' ثابت ہوا، اسی قدر تیزی کے ساتھ مقامی اور ضلعی جماعتوں کی قیمیت سے ہوتا ہوا قیم حلقہ کے مقام تک جا پہنچا ـــ اور دیکھتے ہی دیکھتے جماعت کی پوری مشینری پر ان حضرات کا مکمل تسلط ہو گیا۔

اہل علم، جماعت میں اول تو پہلے ہی کم تھے ـــ پھر ان کی بھی ایک بڑی تعداد ہندوستان میں رہ گئی ـــ اور پاکستان کی جماعت کے حصے میں جو آئے وہ رفتہ رفتہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے چلے گئے۔ رہے دینی مزاج رکھنے والے متدیّن اور سنجیدہ و متین لوگ تو ان کا کچھ عرصے تک تو احترام کیا جاتا رہا اور بعض ذیلی امارتوں پر ایسے حضرات فائز رہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ منصب بھی ان 'نکمے اور سست' لوگوں سے چھین کر 'مستعد کارکنوں' کے حوالے کر دیئے گئے ـــ حتیٰ کہ حلقوں کی امارت پر بھی یہی 'کارکن' لوگ قابض ہو گئے! ـــ اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ یہی لوگ مولانا مودودی کے اصل دست و بازو اور جماعت اسلامی کی اصل قوت و طاقت بن گئے ـــ اور اہل علم اور متدیّن مزاج لوگ پیچھے ہٹتے اور گوشوں میں سمٹتے چلے گئے ـــ لے دے کے صرف ایک خیریت رہی اور وہ یہ کہ جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ میں خصوصاً غیر علاقائی نشستوں پر بالعموم اہل علم اور متدیّن لوگ ہی منتخب ہوتے رہے اور اس میں آخر وقت تک ایسے حضرات کو ایک مؤثر حیثیت حاصل رہی اور اگرچہ ان وجوہات کی بنا پر جو اوپر بیان ہو چکی ہیں، یہ لوگ جماعت کی مجموعی پالیسی پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکے تاہم اتنا ضرور ہوا کہ مرکزی مجلس شوریٰ میں 'کارکن' حضرات کو زیادہ سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا اور علم اور اہل علم کا ایک وقار اور دبدبہ اس طرح قائم رہا کہ نئے نئے فلسفے اور نظریات اور تازہ رجحانات جو جماعت کے اس فعّال عنصر میں پیدا ہوئے وہ اگرچہ عملاً جماعت کی رگ و پے میں سرایت کرتے رہے تاہم شوریٰ میں کبھی بار نہ پا سکے بلکہ شوریٰ میں بالعموم ان پر نکیر ہی ہوتی رہی

شخصیت گری[1]

ان نئے نظریات میں سب سے زیادہ خطرناک نظریہ یہ تھا کہ تحریکیں مجرد اصولوں کے

---

[1] PERSONALITY CULT

بل پر نہیں چلا کرتیں بلکہ شخصیتوں کے بل پر چلا کرتی ہیں لہٰذا جماعت اسلامی کی کامیابی کے لئے لازمی ہے کہ مولانا مودودی کی شخصیت کو ابھار کر سامنے لایا جائے۔ اس خیال نے خاص طور پر اس وقت بہت زور پکڑا جب ۱۹۵۱ء میں سابق صوبہ پنجاب میں جماعت کو انتخابات میں بری طرح شکست ہوئی اور 'کارکن' حضرات کے حوصلوں اور امنگوں کو زبردست دھچکا لگا۔ اس وقت جہاں ایک طرف یہ سوچا گیا کہ ٹھیٹھ اصول پرستی کو ترک کر کے عوام میں مقبولیت کے لئے کچھ نعرے (SLOGANS) اختیار کئے جائیں، وہاں ایک دوسری راہ یہ تجویز ہوئی کہ مولانا مودودی کو جلد از جلد پاکستان کا "قائداعظم" بنا دیا جائے ـــ بدقسمتی سے پاکستان کے ابتدائی چند سالوں میں جماعت اسلامی کی "مطالبے" کی مہموں اور ان کی خصوصی تکنیک نے ملک کی فضا میں ایک وقتی اور عارضی سا تہلکہ واقعۃً مچا دیا تھا اور اسی ضمن میں خاص طور پر کراچی کے چند جلسوں میں مولانا مودودی کو بڑی بھاری تعداد میں سامعین نے سنا تھا۔ اس بنا پر اس کا امکان محسوس کیا گیا کہ 'پیراں نمی پرند مریداں می پرانند' کے اصول پر کام کیا جائے تو بہت جلد مولانا مودودی کو پاکستان کا قومی رہنما اور ہیرو بنایا جا سکتا ہے ـــ چنانچہ ایک طرف جماعت کے ادیبوں اور انشاپردازوں نے مولانا مودودی کی ذات کے مختلف پہلوؤں کو عظمت اور تقدّس کے خوش نما فریموں میں سجا کر عوام کے سامنے پیش کرنا شروع کیا اور دوسری طرف استقبالوں، جلوسوں، استقبالیہ دعوتوں، سپاسناموں اور نذرانے کی تھیلیوں کے ذریعے کم سے کم ایک بار تو انہیں ایک مکمل قومی لیڈر کے روپ میں پیش کر ہی دیا گیا۔

جماعت میں اس نئے رجحان نے پرانے سنجیدہ اور متدیّن لوگوں کو سخت پریشان کر دیا اور ان کی جانب سے اس قسم کی سرگرمیوں پر ناپسندیدگی کا اظہار ہونا شروع ہوا، لیکن اول تو اس مہم کی سرکردگی مرکز کے فعّال عناصر کر رہے تھے اور دوسرے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں ان حضرات کو مولانا مودودی کی مکمل تائید نہیں تو کم از کم اشیرواد ضروری حاصل تھی۔ مولانا مسعود عالم مرحوم نے خود مولانا مودودی کی ذات میں اس رجحان کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور یہ بات انہیں جس قدر ناپسند تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے شعبے (دارالعروبہ) کو جماعت کے مرکز سے دور ہی رکھا۔ مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے ایک بار ان سے اس معاملے میں استفسار کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ مرکز سے دور ہی رہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا:۔

"مولانا مودودی چاہتے ہیں کہ میں دارالعروبہ کے ذریعے عرب ممالک میں

ان کی ذات کا پروپیگنڈہ کروں لیکن جب تک میں دارالعروبہ میں موجود ہوں انشاء اللہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوگی!"

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس رجحان کی مزاحمت ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے سوا جماعت میں اور کسی شخص کو یہ مقام حاصل نہیں تھا کہ وہ اس فتنے کی سرکوبی کر سکے۔ چنانچہ یہ ناخوشگوار فرض انہی کو انجام دینا پڑا اور وقتاً فوقتاً جب بھی اس نظریئے نے جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ میں سر اٹھایا انہوں نے اس کی سختی سے مذمت کی اور بارہا ایسا ہوا کہ انہیں اس نظریئے کے علمبرداروں کو درشتی سے ڈانٹ دینا پڑا ــــ! اور یہ بات مولانا مودودی کے معتقدین کے نزدیک اس امر کا کافی ثبوت بن گئی کہ مولانا اصلاحی مولانا مودودی کی بڑھتی ہوئی شہرت اور روز افزوں مقبولیت کی بنا پر ان سے حسد کرنے لگے ہیں!

دوسرا بحران اور مولانا اصلاحی

ان حقائق کو پس منظر میں رکھ کر ان واقعات پر غور کیا جائے جو جائزہ کمیٹی اور اس کی رپورٹ کے بعد پیش آئے تب صورتِ حال کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ ۵۵ء میں جبکہ جماعت کو پاکستان میں ایک خاص نہج پر کام کرتے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے' جماعت کے عام ارکان کی جانب سے جماعت کی پالیسی اور طریق کار اور خصوصاً اس کے دینی و اخلاقی انحطاط کے بارے میں تشویش کا ایک عام اور پرزور اظہار ہوا' اس وقت تو مولانا مودودی نے غالباً بربنائے 'حکمت' اس عام بے چینی اور بے اطمینانی کا مواجہہ کرنے کی بجائے جائزہ کمیٹی کے تقرر کو غنیمت سمجھا لیکن بعد میں یہی جائزہ کمیٹی ان کے گلے کا ہار بن کر رہ گئی!
جماعت کے مرکز کے 'فعال' اور 'کارکن' عنصر نے جائزہ کمیٹی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں بھی ڈالیں لیکن مرکزی مجلس شوریٰ میں ان کی پیش نہ گئی اور پہلی جائزہ کمیٹی پر اعتراض کئے گئے تو شوریٰ نے اسے توڑ کر ایک دوسری جائزہ کمیٹی مقرر کر دی ــــ ایک سال کے بعد جب یہ جائزہ کمیٹی اپنی رپورٹ لے کر شوریٰ کے سامنے پیش ہوئی تو اس کے جمع کردہ مواد نے شوریٰ کی ایک فیصلہ کن اکثریت کو اس قطعی نتیجے پر پہنچا دیا کہ جماعت ایک بالکل غلط رخ پر بڑھ آئی ہے۔ اور اب خیریت اسی میں ہے کہ اس کے رخ کو تبدیل کر دیا جائے ! مولانا مودودی اور ان کے ہم خیال لوگوں نے پہلے خود جائزہ کمیٹی پر جرح کرنے کی کوشش کی

لیکن جائزہ کمیٹی کے اراکین کی وضاحتوں نے اس حملے کو پسپا کر دیا۔ بدرجۂ مجبوری مولانا مودودی نے اپنے استعفے کے ذریعے اظہارِ ناراضگی کیا لیکن شوریٰ کا تاثر اس قدر گہرا تھا کہ ان کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی ــــ اور جماعت اسلامی کی تاریخ میں غالباً پہلی اور آخری مرتبہ مجلس شوریٰ نے مولانا مودودی کے مقابلے میں اپنے موقف پر اصرار کیا ــــ اب جماعت کے دستور کی رو سے مولانا مودودی کے سامنے دو ہی راستے کھلے رہ گئے تھے۔ یا یہ کہ شوریٰ سے مفاہمت کرلیں ــــ اور یا پھر اپنے اور شوریٰ کے نزاع کو لے کر عام ارکان کے سامنے پیش ہوں۔ اس صورت میں مولانا مودودی بحیثیت امیر جماعت ایک فریق ہوتے اور پوری مرکزی شوریٰ فریقِ ثانی بنتی! ــــ مولانا مودودی نے پہلی راہ اختیار کی اور ایک مصالحتی فارمولے پر دستخط ثبت کر کے 'بقول مولانا اصلاحی' دعاو درود کے بعد شوریٰ برخاست ہو گئی۔

یہ تو سوائے عالم الغیب والشہادۃ کے کوئی نہیں جانتا کہ مولانا واقعۃً مصالحت پر آمادہ ہو گئے تھے ــــ یا ان کا یہ اقدام خالص "حکمتِ عملی" پر مبنی تھا لیکن جو کچھ عالم واقعہ میں ظہور پذیر ہوا وہ یہ تھا کہ ایک طرف ان کے فعال اور کارکن تائبین نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور لاہور 'لائل پور اور راولپنڈی کے مقامات پر شوریٰ اور خاص طور پر اس کے "قدامت پسند" ارکان کے خلاف شورش برپا کر دی 'اور دوسری طرف دس دن کے اندر اندر مولانا مودودی کا وہ "الزام نامہ" ارکانِ جائزہ کمیٹی کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ــــ!! جو ہر اعتبار سے صریح ناانصافی اور زیادتی اور سراسر ظلم اور دھاندلی تھا۔

ظاہر ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علاوہ جماعت میں کسی اور شخص کو یہ مقام حاصل نہ تھا کہ وہ اس موقع پر مولانا مودودی کے ہاتھ پکڑ سکتا اور انہیں اس ظلم اور زیادتی سے باز رکھ سکتا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کہ "اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا" پر عمل کرتے ہوئے مولانا امین احسن صاحب نے مولانا مودودی کو سمجھانے اور اس ظلم سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ــــ لیکن جب انہیں اس میں ناکامی ہوئی تو ان پر سخت مایوسی طاری ہوئی اور مولانا مودودی پر ان کا اعتماد متزلزل ہو کر رہ گیا...... اسی مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں مولانا اصلاحی صاحب نے مولانا مودودی کے نام وہ مفصل خط لکھا، جس نے مولانا مودودی کے "الزام نامے" کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور ان کی ناانصافی اور دھاندلی کو بالکل عریاں کر کے ان کے سامنے رکھ دیا۔

مولانا اصلاحی نے اپنے اس خط میں اگرچہ جائزہ کمیٹی کے تقرر سے لے کر شوریٰ کے اختتام تک کے تمام واقعات پر مفصل تبصرہ کیا اور مولانا مودودی کے الزام نامے کے ایک

باب چہارم

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے استعفے

مصالحت کی نئی کوشش

اور راقم الحروف کا موقف

مولانا مودودی کا استعفاء از امارتِ جماعت........... اپنے اس خط میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جائزہ کمیٹی اور اس کی رپورٹ پر مولانا مودودی کے الزامات کی قلعی کھولنے اور جائزہ کمیٹی کے تقرر سے لے کر شوریٰ کے اختتام تک مولانا کے طرزِ عمل کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ـــ اس امکان کے پیشِ نظر کہ عین ممکن ہے کہ مولانا نے شوریٰ میں واقعی صدقِ دل کے ساتھ 'مصالحت' کی ہو لیکن بعد میں ان پر اس کے نقصانات واضح ہوئے ہوں ـــ جماعت کے دستور کی رو سے یہ صاف اور سیدھی راہ کھول کر بیان کر دی کہ آپ مجلسِ شوریٰ کا اجلاس دوبارہ بلائیں اور اس میں اپنا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے رکھ دیں۔ پھر اگر شوریٰ آپ کے نقطۂ نظر کو قبول کر لے تو فبہا' ورنہ آپ شوریٰ کے خلاف اپنا مقدمہ ارکانِ جماعت کے سامنے پیش کر دیں۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالفرض اجلاسِ شوریٰ کے دوران مولانا مودودی کسی ذہنی کشمکش اور تذبذب میں مبتلا رہے بھی تھے تو اب بہرحال وہ ایک واضح اور متعیّن لائحہ عمل اختیار کر چکے تھے اور جائزہ کمیٹی کے نام "الزام نامہ" انہوں نے کسی غلطی یا چوک کی بنا پر نہیں بلکہ ایک مستقل فیصلہ کر کے تحریر کیا تھا ـــ چنانچہ مولانا اصلاحی صاحب کا خط ملنے پر انہوں نے فوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ منطق اور دلیل ـــ اور قاعدے اور قانون کو بالائے طاق رکھ کر سیدھی طرح اپنی 'شخصیت' کا زور آزما لیا جائے اور دلائل و براہین کے چھوٹے چھوٹے باٹ چھوڑ کر ایک بار اپنی 'شخصیت' کا پورا وزن ایک پلڑے میں ڈال کر فیصلہ کر لیا جائے۔

اور یہ کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہ تھی! ___ تحریکوں اور جماعتوں کی تاریخ میں بار ہا ایسا ہوا ہے کہ رفیقوں کے ایثار اور کارکنوں کی محنت و مشقت سے بنی ہوئی 'شخصیتیں' بالآخر اپنی 'شخصیت' ہی کو اپنے قریب ترین رفیقوں کے مقابلے میں "برہانِ قاطع" کے طور پر استعمال کرتی رہی ہیں۔

چنانچہ مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی صاحب کو ان کے خط کا جواب تو کوئی نہ دیا البتہ یہ کہلوا دیا کہ میں امارت سے مستعفی ہو رہا ہوں اور دوسرے ہی روز اخبارات میں مولانا مودودی کا استعفا از امارتِ جماعت اسلامی ان الفاظ میں شائع ہو گیا۔[1]

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جماعتِ اسلامی پاکستان کی امارت سے مستعفی ہو گئے

مولانا کے استعفاء پر غور کرنے کے لیے مرکزی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس طلب کر لیا گیا

لاہور۔ ۱۰ر جنوری' جماعت اسلامی پاکستان کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جماعت کے جنرل سیکرٹری کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں وہ جماعت کی امارت سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ جماعت کے جنرل سیکرٹری نے ۱۲ر جنوری کو مرکزی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس طلب کر لیا ہے جس میں مولانا کے استعفا پر غور کیا جائے گا۔

"میں جماعت اسلامی پاکستان کی امارت سے استعفا پیش کر رہا ہوں۔ براہ کرم اس کے متعلق ضابطہ کے مطابق کارروائی کریں۔

---

[1] اس کی اشاعت کے سلسلہ میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:۔
"امیر جماعت کے استعفے کے متعلق جماعت کی مجلس مشاورت نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ اس کو راز میں رکھا جائے اور شوریٰ کا ہنگامی اجلاس بلا کر صرف اس کے سامنے اس کو پیش کیا جائے لیکن مرکزی شاف نے ... مجلس مشاورت کے فیصلے کے خلاف اس کو بڑی دھوم دھام سے اخبارات میں شائع کرایا۔"

۱۹۵۵ء میں میری رہائی کے بعد جب مجلسِ شوریٰ نے مجھے جماعت اسلامی کا امیر منتخب کرنا چاہا تھا میں نے یہ گزارش کی تھی کہ میں اب صرف ایک معمولی رکنِ جماعت کی حیثیت سے خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ میں ذمہ داری کا منصب سنبھالنے کی اب طاقت نہیں ہے لیکن اُس وقت میری معذرت قبول نہ کی گئی اور مجھے امیر منتخب کر لیا گیا۔ پھر نومبر ۱۹۵۶ء میں جب مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہوا تو میں نے استعفا پیش کیا اور یہ بھی گزارش کی کہ وجوہ کو زیر بحث لائے بغیر مجھے سبکدوش کر دیا جائے لیکن افسوس ہے کہ میری یہ درخواست بھی رد کر دی گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا امیرِ جماعت رہنا جماعت کے لئے مفید ہونے کی بہ نسبت نقصان دہ زیادہ ہے۔ اس لئے میں اس منصب کو چھوڑنے میں ایک لمحہ کی دیر لگانا بھی گناہ سمجھتا ہوں اور یہ بات واضح کئے دیتا ہوں کہ یہ استعفا واپس لینے کے لئے پیش نہیں کیا جا رہا ہے۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اب جماعت میں کوئی منصب بھی حتیٰ کہ مجلسِ شوریٰ کی رکنیت بھی قبول نہ کروں گا۔ میں جماعت کے نصب العین اور نظام کی جو کچھ بھی خدمت کر سکتا ہوں اب صرف ایک رکنِ جماعت کی حیثیت سے کر سکتا ہوں۔

الحمدللہ کہ جماعت اسلامی کے ساتھ میرا تعلق نہ محض ضابطہ کا ہے اور نہ کسی منصب پر موقوف ہے یہ ایک گہرا قلبی و روحانی رشتہ ہے جو کسی حال میں ٹوٹ نہیں سکتا اور جماعت کا مقصد میرا اپنا مقصدِ زندگی ہے، جس کی خاطر ہی میرا مرنا اور جینا ہے۔ اس لئے میری خدمات جماعت کے لئے جس طرح آج تک وقف رہی ہیں اسی طرح انشاء اللہ ہمیشہ وقف رہیں گی اور جو بھی امیرِ جماعت ہو گا اس کا خیرخواہ اور اس کی اطاعت فی المعروف کا پابند رہوں گا۔ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جس چیز کی تعمیر کے لئے میں نے آج تک جان کھپائی ہے اب میں ہی اس میں کسی خرابی کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنوں۔

امارت کا منصب چھوڑتے ہوئے میں جماعت کو دو باتوں کی نصیحت کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میرے رفقاء میرے ان مشوروں کو جو خالص خیرخواہی کی بنا پر میں عرض کر رہا ہوں قبول فرمائیں گے۔ میری پہلی نصیحت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اس جماعت کی بھلائی چاہتا ہے میرے استعفیٰ کے وجوہ کو زیر بحث لانے سے قطعی

اجتناب کرے اور اخبارات میں یا محفلوں اور مجلسوں میں اس کے متعلق چا۔
کیسی ہی قیاس آرائیاں اور رائے زنیاں ہوں ان کو صبر و سکوت کے ساتھ ٹا
دے۔ اس بحث میں بھلائی اگر کچھ ہو بھی تو وہ برائی کی بہ نسبت بہت کم ہے۔
دوسری نصیحت میں یہ کرتا ہوں کہ امارت کا نیا انتظام بالکل اسی طرح کیا جا۔
جس طرح ایک امیرِ جماعت کے اچانک مرجانے پر کیا جانا چاہئے۔ کوئی بحث :
اس سے پہلے پیدا ہوئی ہو، نہ تازہ کی جائے اور نہ اس کا پس منظر ہی پیشِ نظر رکھ
جائے بالکل نئے سرے سے کام کا آغاز کرنے ہی میں جماعت کی بھلائی ہے۔

میں تمام رفقائے جماعت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے :
دورِ امارت میں نہایت اخلاص و محبت اور پورے اعتماد کے ساتھ میرا ہاتھ بٹا
ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر انہیں جزائے خیر دے۔ اس کے ساتھ میں ان تمام رفقاء
سے معافی بھی چاہتا ہوں جنہیں پچھلے پندرہ سال میں کبھی مجھ سے کوئی تکلیف پہنچی
ہو۔ خصوصیت کے ساتھ حال میں مجلسِ شوریٰ کے جن ارکان کے بارے میں
میں نے ایک کارروائی کی تھی، مجھے احساس ہے کہ انہیں اس سے ضرور اذیت پہنچی
ہوگی۔ ایک شخص جو کسی ذمہ داری کے منصب پر ہو اسے کبھی نہ کبھی اپنے ذاتی
تعلقات کو نظر انداز کرکے اپنے فرائض کی انجام دہی میں ایسے کام کرنے پڑ جاتے
ہیں جن سے اس کے دوستوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری امارت
کے ساتھ اس معاملہ کو بھی ختم کر دیا جائے اور اس کی یاد بھی ذہن میں نہ رکھی
جائے۔ میں اپنے ان رفقاء سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کے متعلق ہر
شکایت دل سے نکال دیں اور مجھے معاف کر دیں"۔ (ماخوذ از روزنامہ
کوہستان مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۹۵۷ء)

ہنگامے............ اس استعفا کی اشاعت سے ایک طرف تو یہ فطری ردِ
ظاہر ہوا کہ جماعت اسلامی کے ارکان، متفقین، ہمدردوں اور متاثرین کے حلقے میں اُ
انتہائی جذباتی اور ہنگامی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ قریب کے شہروں سے جماعت کے لوگ
کے وفود مرکزِ جماعت میں آنے شروع ہو گئے اور دور دراز کے علاقوں سے تاروں کا تانتا بند
لیا۔ اور پوری جماعت میں پریشانی اور فکر مندی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

اور اس طرح ایک ایسی فضا تیار ہو گئی جس میں صحیح کیا ہے اور غلط کیا کے فیصلے سے زیادہ توجہ اس امر پر مرکوز ہو گئی کہ کسی طرح مولانا مودودی کو استعفاء واپس لینے پر آمادہ کیا جائے!!

اور دوسری طرف مولانا کے فعال نائبین نے ارکانِ جائزہ کمیٹی اور ان کے ہم خیال اراکینِ شوریٰ کے خلاف ایک باقاعدہ مہم شروع کر دی۔ لاہور، لائل پور اور راولپنڈی اس مہم کے اہم مورچے تھے۔ لاہور میں اس مہم کے کمان دار جناب نعیم صدیقی تھے۔ لائل پور میں جناب اسعد گیلانی اور راولپنڈی میں جناب صدیق الحسن گیلانی۔ یہ مہم جس طور سے چلائی گئی اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے ہو سکتا ہے کہ لاہور میں ارکانِ جماعت کے ایک اجتماع میں جب نعیم صدیقی صاحب نے جائزہ کمیٹی اور شوریٰ کے "رجعت پسند" ارکان کے خلاف دھواں دھار تقریر کی اور ان پر شدید قسم کے ذاتی حملے کئے اور جماعت کے کچھ ارکان نے انہیں ٹوکا کہ ان لوگوں کی عدم موجودگی میں اس طرح کے الزامات لگانا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے تو ـــــ ملک نصراللہ خاں عزیز صاحب نے طنز اور تمسخر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ فرمایا کہ ـــ "جی ہاں! آپ جس تقویٰ کی تعلیم دینا چاہتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ کچھ غنڈے کسی شریف اور پردہ دار گھرانے میں گھس کر عورتوں کی عزت و ناموس پر حملہ کر رہے ہوں اور باہر کچھ متقی حضرات داخلے کے اِذن کے انتظار میں کھڑے رہ جائیں!" ـــــ یعنی عام ارکانِ جماعت کے سامنے ان حضرات نے صورت حال کا جو نقشہ پیش کیا وہ یہ تھا کہ مولانا مودودی جو اس تحریک کے مؤسس اور داعیٔ اوّل بھی ہیں اور از یوم تاسیس تا امروز اس کی قیادت بھی کرتے رہے ہیں، آج ایک انتہائی مظلومانہ صورت حال سے دوچار ہیں اور جائزہ کمیٹی کے ارکان اور شوریٰ کے کچھ لوگوں نے مل کر ان پر ایسا ستم توڑا ہے کہ وہ انتہائی بے چارگی کے عالم میں امارتِ جماعت کے منصب سے مستعفی ہونے پر مجبور ہوگئے

پروپیگنڈے کی اس انتہائی افسوسناک مہم کے ساتھ ساتھ ــــ بعض "امرائے حلقہ" نے اپنے اختیارات کا 'بھرپور' استعمال بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ جناب امیرِ حلقہ لائلپور نے مرکزی مجلس شوریٰ کے دو اراکین یعنی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور چودھری عبدالحمید صاحب کی رکنیتِ جماعت ہی کو معطل کر دیا ـــ اسی قسم کی کارروائی جناب سعید ملک صاحب کے ساتھ بھی ہونے والی تھی کہ انہیں خبر ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے پیشگی وار کر دیا اور ایک باقاعدہ پریس کانفرنس بلا کر اس میں جماعت سے اپنے استعفے کا اعلان کر دیا اور

ساتھ ہی جماعت کی قیادت پر بہت سنگین قسم کے الزامات عائد کیئے ـــــ مولانا عبدالجبار غازی صاحب نے اس موقع پر بھی اپنی روایتی شرافت کا ثبوت دیا اور وہ کچھ کہے سنے بغیر خاموشی کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے!۔

جناب قیمِ جماعت ' میاں طفیل محمد صاحب نے مولانا کے استعفا پر غور کرنے کے لئے مرکزی مجلسِ شوریٰ کا ہنگامی اجلاس طلب فرمایا تو اس میں ایک 'خصوصی احتیاط ' یہ برتی کہ چونکہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اُس وقت اتفاقاً کسی ٹیکنیکل رکاوٹ کی بنا پر شوریٰ کے باقاعدہ رکن نہ تھے ' لہٰذا انہیں شوریٰ میں شرکت کی دعوت نہ دی۔ (حالانکہ اس سے قبل شوریٰ کے پندرہ روزہ اجلاس میں مولانا شریک رہے تھے)ـــــ ادھر لائل پور سے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے فون پر دریافت کیا کہ "میرے پاس بیک وقت دو 'حکم نامے ' پہنچے ہیں۔ ایک آپ کا جس میں آپ نے شوریٰ میں شرکت کے لئے طلب فرمایا ہے اور دوسرا جناب امیرِ حلقہ کا جس میں میری رکنیتِ جماعت ہی معطل کر دی گئی ہے!ـــــ تو فرمائیں کہ میرے لئے کیا حکم ہے؟ـــــ تو جواباً ارشاد فرمایا کہ "آپ لاہور چلے آیئے ' شوریٰ کے پہلے اجلاس میں یہ مسئلہ طے کر لیا جائے گا کہ آپ شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں!"ـــــ اور جب حکیم صاحب نے مزید اصرار کیا کہ انہیں لاہور پہنچنے اور پھر شوریٰ میں شریک ہوئے بغیر لوٹنے کی ذلت سے بچالیا جائے تو ارشاد ہوا کہ "گھبرایئے نہیں! آپ کو آمدورفت کا کرایہ دے دیا جائے گاـــــ!" اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ!!

شوریٰ کی قرار دادِ اعتماد............ ان حالات میں مرکزی مجلسِ شوریٰ کا ہنگامی اجلاس منعقد ہوا تو ظاہر ہے کہ اس کے معزز اراکین اس کے سوا اور کیا سوچ سکتے تھے کہ جیسے بھی ہو پہلے روٹھے ہوئے امیر کو منایا جائے۔ باقی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔ چنانچہ شوریٰ نے مولانا مودودی صاحب پر اعتماد کی قرارداد پاس کی اور ان سے استعفا واپس لینے کی درخواست کی۔ روزنامہ 'کوہستان ' لاہور کی ۱۳ر جنوری کی اشاعت کی خبر ملاحظہ ہو۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے استعفاء واپس لینے کی درخواست!
جماعت اسلامی کی مجلسِ شوریٰ کی قرارداد

لاہور ۱۲ر جنوری۔ مجلسِ شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کا ایک خاص اجلاس آج صبح ۱۱ بجے جماعت کے مرکزی دفتر میں چوہدری غلام محمد امیرِ حلقہ کراچی کی

صدارت میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے جماعت کی امارت سے استعفاء پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا اور حسب ذیل قرار داد بالاتفاق رائے پاس کی۔

"اس وقت جماعت اسلامی جن غیر معمولی حالات سے دوچار ہے ان کے ہوتے ہوئے امیر جماعت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا منصبِ امارت سے اچانک مستعفی ہو جانا مجلسِ شوریٰ کی نگاہ میں ایک عظیم سانحہ ہے۔ درحقیقت 'جماعت' موصوف کی رہنمائی کی جتنی محتاج اس وقت ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے استعفاء نے جماعت کو ایک شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مجلسِ شوریٰ اس موقع پر پوری جماعت کی نمائندگی کرتے ہوئے بالاتفاق مولانا مودودی کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتی ہے۔ مولانا کی پندرہ برس کی خدمات اور قربانیوں کے پیشِ نظر ان کے ہوتے ہوئے امارت کے منصب کے لئے جماعتِ اسلامی کی نگاہ کسی اور طرف اٹھ ہی نہیں سکتی اور نہ کوئی دوسری شخصیت اس تحریک کو اتنی خوش اسلوبی سے چلا سکتی ہے جس کی مثال جماعت کے داعیٔ اول نے قائم کی ہے۔ عمر، صحت اور کسی ایسے غیر اختیاری تقاضے کے تحت خدانخواستہ اگر کبھی مولانا کو اس بارِ گراں سے سبکدوش ہونا پڑے تو وہ بالکل دوسری صورت ہوگی اور ایسے عالمِ معذوری میں جماعت ان کے اوپر ظلم کرنا کبھی پسند نہ کرے گی لیکن اس وقت خدا کے فضل سے مجلسِ شوریٰ کے نزدیک ایسی صورت نہیں ہے۔

بنا بریں مجلسِ شوریٰ متفقہ طور پر امیر محترم سے یہ درخواست کرتی ہے کہ جماعت سے ان کی جو والہانہ محبت ہے، اسے پوری طرح بروئے کار لا کر موصوف اپنا استعفا واپس لے لیں۔ مجلسِ شوریٰ یہ یقین دلاتی ہے کہ نہ صرف اس مجلس کے اعضاء بلکہ عام ارکانِ جماعت حسبِ سابق پوری طرح خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ اطاعت و تعاون کرتے رہیں گے۔

مجلسِ شوریٰ مولانا عبدالغفار حسن، شیخ سلطان احمد، چودھری غلام محمد، ملک نصراللہ خاں عزیز، مولانا عبدالحق، خان سردار علی خاں اور خان محمد باقر خاں پر مشتمل ایک وفد کو مامور کرتی ہے کہ وہ اس قرار داد کو مجلس کی طرف سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں پیش کرے اور ان پر زور ڈالے کہ وہ مجلس کی اس مخلصانہ اپیل کو کسی صورت میں بھی مسترد نہ فرمائیں۔"

اس کے ساتھ ہی اخبارِ مذکور نے جو یہ خبریں، بھی شائع کیں کہ :۔

" آج مرکزی مجلس شوریٰ اور اس کے معتمد کے نام متعدد مقامات سے اس مضمون کے تار موصول ہوئے کہ شوریٰ کو چاہئے کہ مولانا مودودی کا استعفا ہرگز ہرگز قبول نہ کرے اور اپنی پہلی ہی نشست میں اس کی نامنظوری کا اعلان کر دے۔

کل کی طرح آج بھی مرکز میں صبح سے شام تک لاہور اور باہر کے مختلف مقامات سے لوگ آتے رہے۔ اکثر حضرات جو باہر سے آئے ہوئے ہیں وہ کل سے یہیں پر مقیم ہیں۔ راولپنڈی اور اوکاڑہ سے مزید لوگ پہنچے۔ ان کے علاوہ سیالکوٹ، بہاولپور اور کراچی سے بھی لوگ یہاں آئے۔ آج کی ڈاک میں تار اور ٹیلیفون کے ذریعے مختلف مقامات پر پاس شدہ قرار دادیں بھی موصول ہوئیں "۔

تو صاف ظاہر ہے کہ یہ سارا مواد جماعت کے مرکزی شاف ہی کا فراہم کردہ تھا! اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جماعت نے قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند سالوں میں ' مطالبہ ' کی جو خصوصی تکنیک ایجاد کیا تھا اور جس کی اس کے کارکنوں کو خاصی مشق ہو چکی تھی کس طرح خود اس کے اندرونی معاملات میں وہ پورا تکنیک ہو بہو استعمال ہوا۔ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اس کے علاوہ ـــــ اسی شوریٰ نے یہ بھی طے کیا کہ جلد از جلد ارکان جماعت کا ایک کل پاکستان اجتماع عام منعقد کیا جائے، جس میں جماعت کی آئندہ پالیسی اور امیر جماعت کے استعفا کے وجوہ وغیرہ پر غور کیا جائے۔ شوریٰ کے اس اجلاس نے یہ بھی طے کیا کہ :

" چونکہ اس مجلسِ شوریٰ نے اجتماع ارکان کی اس ضرورت کو محسوس کر کے منعقد کرنا طے کیا ہے کہ ارکانِ جماعت آزادانہ بحث کر کے جماعت کی آئندہ پالیسی اور لائحۂ عمل طے کریں اور مجلسِ شوریٰ کی یہ خواہش ہے کہ پالیسی کی اس بحث میں کوئی سابق فیصلہ کسی حیثیت سے حائل نہ ہو۔ اس لئے مجلسِ شوریٰ یہ مناسب سمجھتی ہے کہ مجلس نے اپنے گزشتہ اجلاس میں جو قرار داد پالیسی کے متعلق پاس کی تھی وہ آئندہ کل پاکستان اجتماعِ ارکان کے وقتِ آغاز سے کالعدم قرار پائے۔ "

شوریٰ کے اس فیصلے پر شیخ سلطان احمد صاحب نے باصرار اپنا یہ اختلافی نوٹ ـــ

(NOTE OF DISSENT) ریکارڈ کرایا کہ:۔

"مجلس شوریٰ نے اپنے گزشتہ اجلاس منعقدہ ۲۵ ر نومبر تا ۹ ر دسمبر ۵۶ء کے اختتام پر خوب اچھی طرح بحث اور غور کر لینے کے بعد جماعت اسلامی کی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی وہ مجلس کی طرف سے ایک متفقہ فیصلہ کی حیثیت سے ارکانِ جماعت کے سامنے پیش کی گئی تھی اور اس پر شرکائے مجلس میں سے کسی نے بھی اپنے اختلاف کا اظہار آخر وقت تک بھی نہیں کیا تھا۔

اب اگر ارکانِ جماعت یا ارکانِ شوریٰ یا امیرِ جماعت کو اس فیصلہ پر اطمینان نہیں ہو سکا ہے یا شوریٰ کی قرارداد کی تشریح اور تعبیر میں اختلاف واقع ہو رہا ہے تو میری رائے میں اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسی مجلس کے سامنے تمام اعتراضات اور عدم اطمینان کے وجوہ پیش ہونے چاہئیں تاکہ پچھلی بحثوں کے تمام پہلوؤں اور گزشتہ اجلاس کی کارروائی کو از سرِ نو تازہ کئے بغیر پیش نظر رکھتے ہوئے مجلس اپنی قرارداد پر عائد شدہ اعتراضات پر کماحقہ غور کر سکے۔ اس کے بعد ہی شوریٰ اس فیصلہ کی ترمیم، تنسیخ یا توثیق کرنے میں پوری طرح حق بجانب ہو گی۔ اگر خدانخواستہ مجلسِ شوریٰ دوبارہ غور کر لینے کے بعد متفق الرائے نہ ہو سکے تو پھر اختلافی امور بغرضِ استصواب متعین طور پر ارکانِ جماعت کے اجتماعِ عام میں پیش کئے جا سکتے ہیں اور وہاں ایک ایک مسئلہ پر اظہار رائے کے بعد آخری اور قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے لیکن اعتراض یا بے اطمینانی کی وجہ سامنے رکھے اور اس پر کوئی رائے ظاہر کئے بغیر مجلس شوریٰ کی ایک متفقہ قرارداد کا خود بخود کالعدم قرار دیا جانا میرے نزدیک بالکل غلط، جماعت کے لئے ایک بری نظیر اور مجلس کے لئے سخت بدنامی کا باعث ہو گا اور اس طرح شوریٰ کا یہ تازہ فیصلہ اشخاص اور جماعت کے بارے میں عائد شدہ بعض نہایت سخت الزامات کی نادانستہ طور پر تصدیق کر دینے کا ہم معنی بن جائے گا۔

بنابریں میں اس فیصلہ سے اپنے اختلاف کا صاف صاف اظہار کر رہا ہوں"۔

سلطان احمد ۱۳ ر جنوری ۵۷ء

لیکن جب اس اجلاسِ شوریٰ کی کارروائی جماعت میں شائع (CIRCULATE) کی گئی

'فرطِ احتیاط' سے اس اختلافی نوٹ کا ذکر تک نہ کیا گیا۔ اس پر شیخ سلطان احمد صاحب نے حسب ذیل 'احتجاج' جناب قیم جماعت کی خدمت میں ارسال کیا۔

"آپ کا سرکلر نمبر ۲۷ - ۴ - ۱۱۸ مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۵۷ء موصول ہوا۔ اس مراسلہ میں آپ نے مرکزی مجلسِ شوریٰ منعقدہ ۱۲ تا ۱۵ جنوری ۵۷ء کی روداد اور فیصلے شائع کئے ہیں لیکن پیراگراف نمبر ۵ میں جماعت کی آئندہ پالیسی کے بارے میں شوریٰ کا فیصلہ درج کرتے ہوئے آپ نے نہ صرف اس کی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ یہ فیصلہ متفقہ طور پر ہوا ہے یا ارکانِ شوریٰ کی اکثریت کی رائے سے، بلکہ آپ نے میرے اختلافی نوٹ کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا ہے جو میری رائے میں قابل اعتراض بات ہے۔

کسی مجلس میں فیصلہ کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں، یا متفقہ طور پر اور یا کثرتِ رائے سے۔ پہلی صورت میں تو کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں لیکن دوسری صورت میں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ فیصلہ اکثریت کا ہے نہ کہ پوری مجلس کا ___ آراء کا شمار یا اختلاف کرنے والوں کے بارے میں تفصیل بیان کرنا بے شک ضروری نہیں مگر جہاں رائے شماری کی نوبت آنے سے پہلے ہی کسی رکن کی طرف سے تحریری طور پر اختلافی نوٹ پیش کر دیا گیا ہو، وہاں لازمی ہے کہ فیصلہ کے ساتھ ساتھ اختلاف کرنے والے کے وجوہ و دلائل بھی سامنے رکھے جائیں تاکہ اختلافی نقطۂ نظر پر بھی لوگ غور کر سکیں۔

اختلافی نوٹ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو محض کارروائی کے رجسٹر میں بند کر دیا جائے اور محض یک طرفہ رائے لوگوں کے علم میں لائی جائے۔ خصوصیت کے ساتھ اس نوٹ کی اشاعت اس لئے اور بھی ضروری تھی کہ اس میں اختلاف کرنے والے نے آنے والے اجتماعِ ارکان سے متعلق مجوزہ کارروائی ہی سے اختلاف کیا ہے اور اس بات پر متنبہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرز پر اجتماعِ ارکان کی کارروائی ہونے جا رہی ہے اس سے جماعت کو بڑے نقصان کا اندیشہ ہے۔ اب اگر ارکانِ جماعت اس خطرہ سے بروقت آگاہ نہیں کئے جاتے پھر اس تنبیہہ کا موقع کب باقی رہے گا ___ اگر آپ کا ارادہ میرے اختلافی نوٹ کو سرے سے شائع کرنے ہی کا نہیں ہے یا آپ اس کو اجتماعِ ارکان کے بعد یا عین اس وقت پر پیش کرنا چاہتے

ہیں تو مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میری رائے یہی ہے کہ میرا یہ اختلافی نوٹ اجتماع سے پہلے پہلے ارکان جماعت کے علم میں لایا جانا چاہئے، اس لئے میں اس مسئلہ پر آپ کی فوری توجہ مبذول کرا رہا ہوں۔ " والسلام

احقر سلطان احمد ۹۴

لیکن یہ احتجاج بھی صدا بصحرا ثابت ہوا ۔۔۔!

استعفٰے کی واپسی........... شوریٰ کی قرارداد کے جواب میں مولانا مودودی صاحب نے جو خط شوریٰ کو لکھا اس کا متن حسب ذیل ہے۔ (ماخوذ از روزنامہ "نوائے وقت" اشاعت ۱۴ر جنوری ۵۷ء)

"آپ کی قرارداد اور ارکان و متعقین جماعت کی عام خواہشات کا احترام کرتے ہوئے میں عارضی طور پر اپنا استعفاء کُل پاکستان اجتماعِ ارکان کے انعقاد تک کے لئے واپس لیتا ہوں۔ میں انشاء اللہ اجتماع کے موقع پر تمام رفقاء کے سامنے اپنی وہ مشکلات رکھ دوں گا جن کی بنا پر میں اپنے آپ کو فرائضِ امارت کی انجام دہی کے قابل نہیں پاتا ہوں اور وہ مصالح اور ضروریات بھی بیان کر دوں گا، جن کے لحاظ سے میرا اس منصب پر رہنا مناسب نہیں ہے۔ ان سارے پہلوؤں کی وضاحت ہو جانے کے بعد ارکانِ جماعت جو رائے بھی قائم کریں گے وہ انشاء اللہ میری انفرادی رائے سے بہتر ہوگی۔ چونکہ مجھے دستور جماعت کی رو سے ایسی حالت میں اپنا قائم مقام مقرر کرنے کا حق ہے جبکہ میں فرائضِ امارت انجام نہ دے سکوں اس لئے میں چودھری غلام محمد صاحب کو قائم مقام امیر مقرر کرتا ہوں"۔

اس طرح وہ استعفاء جو اس "وضاحت" کے ساتھ دیا گیا تھا کہ "یہ بات واضح کئے دیتا ہوں کہ یہ استعفاء واپس لینے کے لئے پیش نہیں کیا جا رہا.... " تین دن کے اندر اندر واپس ہو گیا ۔۔۔ اگرچہ واپسی اس احتیاط کے ساتھ ہوئی کہ استعفٰے کی سیفِ قاطع جس نے سرکش شوریٰ کو "اطاعت و تعاون" پر مجبور کیا تھا ارکانِ جماعت کے اجتماعِ عام کے سر پر بھی لٹکتی رہے!۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا استعفیٰ از رکنیتِ جماعت............ مرکزِ جماعت اسلامی میں پیش آنے والے ان تمام ڈرامائی واقعات کی خبریں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اپنی رہائش گاہ پر مقیم ایسی بے بسی کے ساتھ سنتے رہے جیسے وہ وہاں ' نظر بند ' ہوں۔ ؎

رودادِ چمن اس طرح سے سنتا ہوں قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا!

اور اسی بے چارگی اور دل شکستگی کے عالم میں انہوں نے جماعت اسلامی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ ؎

اس طرح ایک مرتبہ یہ معاملہ اپنی ' منطقی انتہا ' کو پہنچ گیا ـــ اور مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی سولہ سالہ رفاقت ختم ہو گئی ـــ اور اگرچہ کچھ مخلصین کی مصالحانہ مساعی اور ذمہ دار لوگوں کی یقین دہانیوں کی بنا پر مولانا اصلاحی صاحب نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ مولانا جماعت کے رکن رہے ـــ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل مسلم ہے کہ جہاں تک جماعت کے ان دو چوٹی کے قائدین کا تعلق ہے ان کے مابین اعتماد اور

؎ مولانا کے اپنے الفاظ میں:۔
"شوریٰ کا یہ اجلاس ایک بالکل ہنگامی اجلاس تھا۔ یہ شوریٰ صرف امیر جماعت کے استعفیٰ سے پیدائش صورت حال پر غور کرنے کے لئے فوری طور پر بلائی گئی تھی، اس کے لئے کوئی ایجنڈا نہ تھا۔ اس کے بعض ارکان کے ساتھ یہ معاملہ بھی پیش آیا کہ ادھر مرکز سے ان کو شوریٰ کی شرکت کے دعوت نامے ملے لیکن جب وہ گھروں سے روانہ ہونے لگے تو ادھر حلقہ سے ان کو یہ اطلاع ملی کہ وہ جماعت کی رکنیت سے معطل کر دیئے گئے۔ یہ شوریٰ جماعت کی پالیسی وغیرہ کے مسائل پر کوئی فیصلہ دینے کی مجاز نہ تھی۔ لیکن اس نے صرف امیرِ جماعت پر اظہارِ اعتماد ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ امیرِ جماعت کو خوش کرنے کے لئے اس نے پالیسی کے معاملہ میں بھی مداخلت کی۔ مجھے اس شوریٰ میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس وجہ سے میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اس کے اندر جا کر اس کی خلافِ دستور کارروائیوں پر ٹوک سکتا لیکن میں نے اس کے دورانِ انعقاد ہی میں اس کے سامنے جماعت کی رکنیت سے اپنا استعفاء پیش کر دیا، کیونکہ میں امیرِ جماعت پر اس کے غیر مشروط اظہارِ اعتماد کو ان تمام اقدامات کی تصدیق کے ہم معنی سمجھتا تھا جو امیرِ جماعت نے جائزہ کمیٹی کے ارکان اور شوریٰ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف کئے تھے!"

اتفاق کی کیفیت پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی۔

جن لوگوں کو مولانا اصلاحی صاحب کی شخصیت کے قریبی مطالعے کا موقع نہیں ملا ہے ان کے لئے یہ بات واقعۃً بالکل ناقابل فہم ہے کہ مولانا مودودی کے بارے میں وہ انتہائی رائے قائم کر چکنے کے بعد جو مولانا اصلاحی صاحب کے خط سے ظاہر ہوتی ہے ــــ اور اب مولانا کے اس رویّے کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد کہ وہ ہر فیصلہ اپنی 'شخصیت' کی 'برہانِ قاطع' کے بل پر کرنے پر تل گئے ہیں ــــ وہ آخر کس امید میں مصالحت کنندگان کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی طبیعت کی ظاہری سختی اور مزاج کی ظاہری درشتی کے پردوں میں ایک انتہائی صلح جو اور آخری حد تک آمادۂ مصالحت شخصیت چھپی ہوئی ہے اور وہ کسی کام کو شروع کر لینے کے بعد اس کو جاری رکھنے کے لئے آخری حد تک مصالحت (Compromise) کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ چاہے اس سے ان کی ذات کتنی ہی مجروح ہو اور ان کی پوزیشن کتنی ہی خراب ہو جائے ــــ!

یہی وجہ ہے کہ مولانا اس وقت تک مصالحانہ مساعی کے ساتھ تعاون کرتے رہے جب تک خود مصالحت کنندگان تھک ہار کر نہ بیٹھ رہے اور اسی بنا پر ان کے بعد کے رویّے میں 'عدمِ ربط' نظر نہیں آتا اور مستقبل کے مؤرخ کے لئے یہ حق باقی رہ جاتا ہے کہ چاہے تو ان کے طرزِ عمل کو انتہائی دردمندانہ اور مخلصانہ صلح جوئی کا نتیجہ قرار دے اور چاہے تو کمزوری پر محمول کرلے۔

مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے استعفے کی واپسی کی توجیہہ یہ بیان فرمائی ہے۔

"میرے استعفیٰ کے بعد چودھری غلام محمد صاحب (جو قائم مقام امیر جماعت بنائے گئے تھے محمد باقر خاں صاحب کے ساتھ مجھ سے ملے اور یہ اطمینان دلایا کہ امیرِ جماعت پر اظہارِ اعتماد ہرگز ان کے ان اقدامات کی توثیق کے ہم معنی نہیں ہے جو انہوں نے شوریٰ کے فیصلہ اور جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف کئے ہیں انہوں نے صاف الفاظ میں یہ بھی کہا کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف امیرِ جماعت نے جو اقدام کیا ہے وہ اس کو نہ صرف واپس لیں گے بلکہ ان سے معافی بھی مانگیں

گے انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ قائم ہے، دسمبر کی شوریٰ کی قرارداد بھی قائم ہے، البتہ اجتماعِ عام کے انعقاد تک لوگوں کو پالیسی کے معاملہ میں کوئی بحث ونزاع برپا کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ باتیں اس قدر گہرے تاثر اور اس قدر وثوق واعتماد کے ساتھ کہیں کہ مجھے اپنا استعفیٰ واپس لے لینا پڑا"۔

یہاں فوری طور پر جو سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ --- کیا مولانا اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ 'جماعت اسلامی' میں اصل مؤثر اور فیصلہ کن شخصیت مولانا مودودی کی تھی؟ --- ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جماعت کی مخصوص تنظیمی ہیئت میں جو مقام مولانا مودودی کو حاصل تھا اس سے سب سے زیادہ واقف خود مولانا امین احسن صاحب تھے --- ! توپھر سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ جس شخصیت نے اپنی مقبولیت کی دلیل کے آگے خود مولانا اصلاحی صاحب کو بےبس کر دیا تھا، اس کے سامنے اپنے پورے سوز اور سارے اخلاص کے باوجود یہ غریب یقین دلانے والے کیا حیثیت رکھتے تھے! --- چنانچہ مندرجہ بالا تصریحات کے معابعد جب مولانا اصلاحی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ

"ان وعدوں میں سے یہ حضرات کسی ایک وعدے میں بھی سچے ثابت نہیں ہوئے"[1]

تو محسوس ہوتا ہے کہ ایسا ہونا بالکل فطری تھا --- البتہ مولانا کا ان حضرات کی یقین دہانیوں کی بنیاد پر خیر کی امیدیں وابستہ کر لینا زیادہ سے زیادہ نیک خواہشات کی کارفرمائی قرار دیا جا سکتا ہے!!

حالات جو رخ اختیار کر چکے تھے --- اور نوبت جہاں تک پہنچ گئی تھی اس کے لحاظ سے اب مولانا اصلاحی صاحب اور ان کے ہم خیال ارکانِ شوریٰ اور دیگر اصحابِ رائے کے لئے دو ہی راہیں عقلاً صحیح تھیں۔

ایک[1] یہ کہ --- اگر ان کے نزدیک مولانا مودودی کی ذات سے قطع نظر --- اب بھی مجموعی اعتبار سے جماعت اسلامی میں شر پر خیر غالب تھا تو وہ خاموشی سے جماعت سے علیحدہ ہو

---

[1] یہ تمام اقتباسات مولانا اصلاحی صاحب کے اس سائیکلو سٹائل شدہ وضاحتی خط سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد لوگوں کے استفسارات کے جواب میں تحریر فرمایا تھا!

جاتے اور وہ طرز عمل اختیار کرتے جو اس سے قبل مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابو الحسن علی ندوی اور ان کے رفقاء نے اختیار کیا تھا ___ اور جو اس موقع پر بھی مولانا عبد الجبار غازی صاحب نے اختیار کیا۔ اس صورت میں آئندہ کے لئے صحیح لائحہ عمل یہ ہوتا کہ ' اقامتِ دین ' کی ہمہ گیر جدّوجہد کی طرف سے صبر کا گھونٹ پی کر دین کی کسی ' جزوی خدمت ' میں اپنے آپ کو کھپا دیا جاتا ___ اور جماعت کو فی الحال اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا۔ اس لئے کہ اس صورت میں جماعت سے علیٰحدہ ہو کر بھی اس پر تنقید کرنے کا حق انہیں نہ ہوتا اور جماعت کے عام ارکان کی یہ حجت ان پر قائم ہو جاتی کہ آپ حضرات نے جماعت کے اندر اپنے اختلافِ رائے کا اظہار کیوں نہ کیا ___! (الا یہ کہ بعد میں کسی مرحلے پر یہ محسوس کیا جاتا کہ جماعت کسی صریح دینی فتنے میں مبتلا ہو گئی ہے اور اس کا 'ابطال' ایک ' دینی فریضہ ' بن گیا ہے!)

دوسری یہ کہ ___ اگر ان کی رائے میں مولانا مودودی کی غلط رہنمائی اور ان کے غلط اقدامات کی بنا پر جماعت میں خیر پر شر غالب آچکا تھا یا آنا لازمی تھا ___ تو پھر ایک ہی طرز عمل صحیح تھا' اور وہ یہ کہ جماعت میں کھل کر اختلافِ رائے کا اظہار کیا جاتا اور ڈٹ کر مولانا مودودی کی مخالفت اور ان کے غلط اقدامات کی مذمت کی جاتی۔ متذکرہ بالا رائے قائم ہو جانے کے بعد نہ صرف یہ کہ عقلاً صرف یہی طرز عمل صحیح تھا بلکہ جماعت کا دستور اور وہ ' جمہوریت اور ' شورائیت ' بھی اسی کے متقاضی تھے جن کے پودوں کو خود مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا ___ اور جماعت کے عام ارکان کے 'حقِ نصح ' کی ادائیگی کا واحد صورت بھی یہی تھی ___ اس طرز عمل سے بدترین نتیجہ جو نکل سکتا تھا وہ یہ کہ جماعت بالکل منتشر ہو جاتی تو ایک ایسی جمعیت کا منتشر ہو جانا جس میں شر غالب آچکا ہو' بجائے خود ایک خیر ہے! ___ ایک بعید امکان اس کا تھا کہ مولانا مودودی متہم (DISCREDIT) ہو جاتے اور جماعت کی رہنمائی کی ذمہ داری کسی اور کو سنبھالنا پڑتی تو یہ جماعتی زندگی کے لوازم میں سے ہے اور اس سے پہلو بچانا کسی کے لئے جائز نہیں! ___ ایک امکان یہ تھا کہ جماعت تقسیم ہو جاتی تو اس میں بھی کوئی حرج نہ تھا۔ ہر حصہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق ' اقامت دین ' کی ہمہ گیر جدوجہد میں مشغول ہو جاتا ___ بدرجۂ آخر یہ کہ اہلِ اختلاف ذلیل کر کے نکال دیے جاتے تو اس صورت میں بھی کم از کم یہ تو ہو جاتا کہ ان کی جانب سے پوری جماعت پر اتمامِ حجت ہو جاتا ___ اور جماعت سے علیٰحدہ ہونے کے بعد بھی انہیں اس کی پالیسی پر تنقید کا حق بجا طور

حاصل رہتا۔

بدقسمتی سے عملاً جو کچھ ہوا وہ یہ کہ مولانا اصلاحی صاحب اور ان کے ہم خیال ارکانِ شوریٰ نے نہ پہلی راہ اختیار کی نہ دوسری! — بلکہ کچھ مخلص مصالحت کنندگان کے زیر اثر یہ حضرات ایک ایسی "نیمے دروں' نیمے بروں" پالیسی پر عمل پیرا ہو گئے جس سے عام ارکانِ جماعت پر 'اتمامِ حجت' تو کیا ہوتا ان کا 'حقِ نصح' بھی ادا نہ ہو سکا — بلکہ ان حضرات کی اپنی پوزیشن اکثر ارکانِ جماعت کے لئے ناقابلِ فہم — اور بعض حالات میں مضحکہ خیز تک ہوتی چلی گئی — !! رہے وہ 'مصالح' جن کے پیشِ نظر یہ 'درمیانی راہ' اختیار کی گئی تھی تو ان کی پوری فصل مولانا مودودی نے کاٹ لی — !!!

مصالحت...... اس مرتبہ مصالحت کنندگان میں سرِفہرست اگرچہ چودھری غلام محمد صاحب (قائم مقام امیرِ جماعت) اور جناب محمد باقر خاں صاحب مرحوم تھے اور ابتداءً شیخ سلطان احمد صاحب نے بھی مصالحانہ کوششوں میں حصہ لیا۔ لیکن اس سلسلے میں فیصلہ کن مساعی تحریک مسلم لیگ کے ایک پرانے سرگرم کارکن جناب ظفر احمد انصاری صاحب کی ثابت ہوئیں جنہوں نے گفت و شنید اور مذاکرات (NEGOTIATIONS) کے خداداد ملکہ سے کام لے کر مولانا اصلاحی صاحب کو چند ایسے وعدوں (COMMITMENTS) کا پابند کر لیا — جو مولانا کی ذاتی شرافت اور مروّت کی بنا پر آئندہ کے لئے ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئے!

مصالحت کے فلسفے کا بنیادی پتھر یہ تھا کہ — جماعت اسلامی کے عام ارکان کی تربیت اس طرز پر نہیں ہوئی ہے کہ وہ پالیسی اور طریق کار کی دقیق بحثوں میں سکون، اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ حصہ لے سکیں اور اپنے اکابر کے باہمی اختلافات (قطع نظر اس سے کہ وہ نجی نوعیت کے ہوں یا جماعت کی پالیسی سے متعلق) پر ٹھنڈے دل سے غور کر سکیں، لہٰذا اگر کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی متبادل پروگرام لے کر ایک دوسرے کے بالمقابل جماعت کے عام ارکان کے سامنے پیش ہوئے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ نکلے گا کہ جماعت بالکل منتشر ہو جائے گی اور اقامتِ دین کے لئے کی گئی ساری محنت اکارت ہو کر رہ جائے گی — ! مولانا مودودی کے انتہائی اقدامات (ارکانِ جائزہ کمیٹی پر الزامات اور پھر استعفیٰ از امارتِ جماعت وغیرہ) کے بارے میں غالباً یہ رائے قائم کی گئی کہ یہ سب کچھ محض جذبات میں ہو گیا ہے اور بالکل غلط ہے۔ تاہم جماعت کی مصلحت اسی میں ہے کہ مولانا مودودی کو زیادہ متہم (DISCREDIT) نہ کیا جائے — جماعت کے حالات کی اصلاح اور اس کے آئندہ رخ کی تبدیلی کے بارے میں غالباً یہ طے ہوا کہ مصلحت

اسی میں ہے کہ یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ اور رفتہ رفتہ ہو[1] اور سردست صرف اس پر اکتفا کیا جائے کہ ایک تو اس ہنگامی دور کے انتہائی اقدامات کو کالعدم قرار دیا جائے اور دوسرے جماعت کی آئندہ پالیسی کے بارے میں ارکانِ جماعت کے سامنے اس مرتبہ پھر شوریٰ کی جانب سے ایک متفقہ قرارداد پیش کی جائے۔

چنانچہ جن ارکان کی رکنیت معطل کی گئی تھی وہ بحال کر دی گئی (جناب عبدالجبار غازی صاحب اور سعید ملک صاحب چونکہ از خود مستعفی ہوئے تھے لہٰذا ان کا معاملہ جدا تھا) اور ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان سے متصلاً قبل اسی مقام پر مرکزی شوریٰ کا ایک اجلاس اس غرض سے طلب کر لیا گیا کہ اس میں جماعت کی آئندہ پالیسی سے متعلق کوئی ایسا مصالحتی فارمولا تیار (EVOLVE) کر لیا جائے جسے عام ارکانِ جماعت کے سامنے شوریٰ کی جانب سے ایک متفقہ قرارداد کی صورت میں پیش کر دیا جائے۔

راقم الحروف کا موقف.......... راقم الحروف تک جب یہ اطلاع پہنچی کہ جماعت کے 'اوپر کے حلقے' میں پھر 'مصالحت' کی کوششیں ہو رہی ہیں اور اس امر کا امکان ہے کہ ارکانِ جماعت' مال اور وقت کا صرفِ کثیر کر کے ماچھی گوٹھ کے مقام پر جمع تو اس خیال سے ہوں کہ پالیسی اور طریقِ کار کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے آئیں گے اور وہ اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے ــــ لیکن ہو یہ کہ پھر شوریٰ کی ایک "متفقہ مصالحتی قرارداد" ان کے سامنے پیش کر دی جائے ــــ اور وہ جیسے جائیں ویسے ہی لوٹ آئیں ــــ تو راقم الحروف نے جماعت اسلامی منٹگمری کے پانچ دوسرے ارکان کی معیت میں ایک متفقہ تحریر قائم مقام امیرِ جماعت کی خدمت میں ارسال کی ــــ جو درج ذیل ہے۔

---

[1] غالباً مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو ابھی اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ مولانا مودودی جماعت میں اپنی مقبولیت کے نشے میں "جمہوریت" اور "شورائیت" کی اس برائے نام بساط کو بھی بالکل لپیٹ دیں گے جو ابھی کم از کم جماعت کے دستور میں قائم تھی ــــ اور 'مجلسِ عاملہ' کا ایک نیا ادارہ (Institution) قائم کر کے مجلسِ شوریٰ کو ایک بالکل غیر مؤثر اور محض علامتی ادارہ بنا دیں گے ــــ جس سے جماعت میں "اربابِ حلّ و عقد" کا جو تصور اس وقت تک قائم تھا بالکل بدل جائے گا ــــ اور مولانا اصلاحی صاحب اور ان کے ہم خیال اراکینِ شوریٰ مع جمیع مصالحت کنندگان ایک انتہائی غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ جائیں گے ــــ!!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی و مکرمی ۔۔۔ قائم مقام امیر جماعت اسلامی پاکستان

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

"ہم ارا کینِ جماعت اسلامی منٹگمری آپ کی وساطت سے مندرجہ ذیل امور مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اس اجلاس میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو اجتماعِ ارکان سے قبل منعقد ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس تحریر کو اس اجلاس میں پڑھ کر سنا دیں گے۔

۱۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس امر کی کوشش کی جارہی ہے کہ بجائے اس کے کہ آئندہ اجتماعِ ارکان میں پالیسی کے متعلق تمام آراء من وعن پیش ہوں اور ایک کھلی بحث کے بعد پالیسی کا تعیّن کیا جائے اس سے قبل شوریٰ ہی میں پالیسی کے بارے میں اربابِ حل وعقد کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور ارکانِ جماعت کے سامنے اسی طرح کی کوئی متفقہ قرارداد پیش کی جائے جیسی کہ شوریٰ نومبر دسمبر ۵۶ء میں منظور ہوئی تھی' اور تمام ارا کینِ شوریٰ بجائے اپنی اپنی آراء کو پیش کرنے کے اجتماعِ ارکان میں اس قرارداد کی حمایت کریں۔ نیز یہ کہ اس سمجھوتہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اگر پالیسی کی بحثیں اور اکابرینِ جماعت کے آپس کے اختلافات اجتماعِ ارکان میں لے آئے گئے تو پھر اس جماعت کے باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۲۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایسی کوئی بھی کوشش خواہ وقتی طور پر کتنی ہی خوشنما اور مفید معلوم ہو' جماعت اسلامی کے وجود اور استحکام کے لئے بالآخر سخت مضر اور مہلک ثابت ہوگی۔ لہٰذا ہم شوریٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ ایسی کسی تجویز کو زیرِ عمل لانے سے قبل وہ اس کے بظاہر مفید پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان مضر نتائج پر بھی غور کر لے کہ جو ہماری ناچیز رائے میں جلد یا بدیر لازماً رونما ہوں گے۔

۳۔ یہ بات اب ایک ناقابلِ تردید حقیقت بن چکی ہے کہ جماعت اسلامی کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں میں پالیسی کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں اور ان کے حامل گروہ اپنے اپنے طرزِ فکر میں پختہ اور اپنی آراء میں شدید

ہیں۔ ایک گروہ (جس کے ہاتھ میں اس وقت جماعت کی قیادت ہے) موجودہ پالیسی کو اس کے اصولی موقف کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ تفصیلی و فروعی تدابیر کے لحاظ سے بھی بالکل صحیح سمجھتا ہے اور اس میں کسی اصولی تغیر کو صحیح نہیں سمجھتا جبکہ دوسرا گروہ بعد از تقسیم ملک کی پالیسی کو قبل از تقسیم کی پالیسی کے لحاظ سے اصولی انحراف سمجھتا ہے اور موجودہ پالیسی میں بنیادی تغیر چاہتا ہے۔ یہ دونوں گروہ پالیسی کے بارے میں اپنی اصولی آراء ہی کی حد تک نہیں بلکہ اپنے ذوق اور رجحان کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔

ان گروہوں کے درمیان جماعت میں ایک عرصہ سے کشمکش چلی آتی ہے۔ ابھی تک یہ کشمکش صرف اصحابِ شوریٰ تک محدود تھی اور عام اراکین کو اس کا علم تک نہ تھا لیکن اب اکثر باتیں اس محدود حلقہ سے نکل کر ایک وسیع دائرے میں پھیل گئی ہیں اور عام اراکین کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے باخبر ہو گئی ہے۔

۵۶ء میں ان دو گروہوں کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی جو کوشش کی گئی تھی اور اس کے نتیجہ میں جو مصالحتی فارمولا اراکینِ جماعت کے سامنے رکھا گیا تھا۔ اس کا جو حشر ہوا ہے' اس سے دو باتیں اخذ کی جانی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ان دو گروہوں کے درمیان مصالحت اور سمجھوتہ کی کوشش لاحاصل ہے۔ یہ اپنے نقطہ ہائے نظر' اپنے طرز ہائے فکر اور اپنے مذاق و رجحان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے دور ہو چکے ہیں کہ ان کو نزدیک لانے کی کوشش ایک مبارک خواہش تو کہی جا سکتی ہے لیکن عملاً بار آور نہیں ہو سکتی اور دوسرے یہ کہ آج سے قبل شوریٰ کی کلھیا میں جو گڑ پھوڑا جاتا رہا ہے وہ اب چوراہے میں بکھر گیا ہے۔ اور اب وہ کیفیت باقی نہیں رہی کہ باتیں صرف اراکینِ شوریٰ تک محدود تھیں' جماعت کے دست و بازو یعنی ارکان اس سے واقف نہ تھے۔ اب یہ باتیں پھیل چکی ہیں۔ اب اگر "بڑے آدمی" مل کر بیٹھ بھی جائیں تو "چھوٹوں" کا خلجان رفع ہونا مشکل ہے۔

۴۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک جماعت کی بقا اور اس کے استحکام اور اس کے عملاً کوئی کام کر سکنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آئندہ اجتماعِ

ارکان میں ہر شخص کھلے دل کے ساتھ جو کچھ دل و دماغ میں رکھتا ہے' ارکان کے سامنے رکھ دے اور ایک عام اور کھلی (OPEN HEARTED) بحث کے بعد طے ہو جائے کہ جماعت اسلامی کے ارکان اپنے مستقبل کے لئے کون سی پالیسی کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد جس کو اس پالیسی پر انشراح صدر ہو جائے وہ جماعت میں رہے اور جو انقباض محسوس کریں ان کی طرف سے جماعت کی خیر خواہی کا پہلو اسی میں ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ جماعت کو چھوڑ جائیں اور اپنے ذوق اور نظریات کے مطابق جو کام بھی کر سکتے ہوں علیحدہ ہو کر کرتے رہیں۔ اس صورت میں خواہ وقتی طور پر جماعت کو ایک نقصان برداشت کرنا پڑے اور ایسا محسوس کیا جائے کہ جماعت کو ایک بڑا دھکا لگا ہے لیکن بالآخر یہ محسوس کیا جائے گا کہ اسی میں جماعت کی بھلائی تھی۔ اس طرح جماعت کو ایک مرتبہ پھر یکسوئی' یکرنگی اور یکجہتی حاصل ہو جائے گی اور وہ سکون کے ساتھ ایک طرف جا سکے گی۔

۵۔ اس کے برعکس اگر اس وقت "انتشار کے خوف" سے ایک مصالحت کر بھی لی گئی تو اول تو اس بات ہی کا قوی اندیشہ ہے کہ پہلی مصالحت کی طرح یہ بھی زیادہ سے زیادہ پندرہ دن کی "طویل" عمر پا سکے لیکن اگر اس مرتبہ جماعت کے اکابرین نے ذرا زیادہ بڑے ظرف کا ثبوت دیا، تب بھی یہ تو یقینی ہے کہ جماعت زیادہ دور نہ چل پائے گی کہ یہ کشمکش پھر پیدا ہو کر رہے گی اور جماعت اپنی اندرونی کشمکش میں اس طرح الجھ کر رہ جائے گی کہ اور کوئی مفید کام اس کے لئے ممکن نہ رہے گا۔ یہ تو ممکن ہے کہ یہ کشمکش "خفی" رہے اور پہلے کی طرح "جلی" نہ ہو۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ ختم ہو جائے۔

۶۔ اس وقت کی "مصالحت" کے بارے میں تین باتیں بالکل واضح ہیں۔

(الف) ...... یہ کہ اس کی بنیاد کسی مثبت جذبے کی بجائے ایک "منفی خدشہ" پر ہے۔ اس وقت محض انتشار کے خطرے سے بچنے کی غرض سے یہ کوشش کی جا رہی ہے۔ بجائے اس کے کہ گفت و شنید اور بحث و مباحثہ کے بعد ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کے قریب آنے کی وجہ سے مفاہمت ہو رہی ہو اور اب فریقین اپنے اپنے مقام سے واقعتاً ہٹ کر ایک جگہ آ کھڑے ہوئے ہوں ــــ صورت حال یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ (بلکہ حالیہ واقعات نے تلخی میں

اضافہ کر دیا ہے) لیکن انتشار کے خوف سے دبک کر بیٹھ رہے ہیں۔ اس طرح "حبِ علیؓ" کی بجائے "بغضِ معاویہؓ" پر جو اتحاد قائم ہو، ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد بے حد کمزور ہوگی۔

(ب)...... مولانا مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کے ارادوں اور ان کی نیتوں کے بارے میں کوئی بات نہ کہی جاسکے تو بھی "اختلاف" رکھنے والے لوگوں کے بارے میں تو ہمیں یقین کے ساتھ یہ بات معلوم ہے کہ وہ اس موقع پر مصالحت اس لئے کر رہے ہیں کہ آئندہ کشمکش کا موقع باقی رہے۔ عین اس وقت جبکہ یہ حضرات مصالحت کی باتیں کر کے آئے ہوتے ہیں ان کی آراء دوسرے لوگوں کے بارے میں انتہائی سخت ہوتی ہیں اور اپنے طرزِ فکر کے لوگوں کے سامنے سخت ترین آراء کا اظہار کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے ___ اس لحاظ سے کم از کم ہم لوگوں کو تو یہ ایک "منافقانہ مصالحت" معلوم ہوتی ہے، جس کا چند روز سے زیادہ چل جانا مشکل اور کسی مفید نتیجہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔

(ج)...... مولانا مودودی صاحب اور ان کے رفقاء یہ محسوس کر رہے ہیں کہ خیریت اسی میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ اجتماع گزر جائے۔ اس وقت ان کے لئے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کر کے اور اپنی بات پر اصرار کر کے اجتماع میں کامیابی مشکل نظر آرہی ہے۔ کہاں تو وہ کیفیت تھی کہ اپنے وجوہ استعفاٰ انہوں نے اجلاسِ شوریٰ میں بیان کرنے کی بجائے اجتماعِ ارکان میں رکھنے مناسب سمجھے تھے اور ۴۲ء سے آج تک مختلف اوقات و ادوار میں اپنی اختیار کردہ پالیسی کو ایک طویل تقریر میں پیش کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ کہاں اب یہ باتیں سننے میں آرہی ہیں کہ وہ ایسی کوئی تقریر بھی نہیں کریں گے اور اپنے استعفاٰ کے وجوہ بھی سامنے نہیں لائیں گے۔

۷۔ ان حالات میں شوریٰ سے ہماری درخواست یہ ہے کہ اب مصالحت اور مفاہمت کی کسی نئی کوشش میں وقت ضائع نہ کیا جائے اور اس سے قبل کی ایسی ہی کوشش اور اس کے انجام سے عبرت حاصل کر کے آئندہ اجتماعِ ارکان کی نوعیت وہی رکھی جائے جو اس کا اعلان کرتے ہوئے پیشِ نظر تھی ___ یعنی یہ کہ مولانا مودودی صاحب جو اس تحریک کے داعی، مؤسس اور از یومِ تاسیس تا امروز

قائد اور امیر رہے ہیں، وہ تفصیل کے ساتھ اور بغیر کسی MENTAL RESERVATION کے اپنا ذہن جماعت کے ارکان کے سامنے رکھ دیں اور ماضی کی پالیسی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ صاف صاف بتادیں کہ آئندہ وہ جماعت کو کس رخ پر لے کر جانا چاہتے ہیں اس کے بعد تمام ارکانِ جماعت عام اس سے کہ وہ عام رکن ہو یا رکنِ شوریٰ اگر اس سے کوئی فروعی یا اصولی اختلاف رکھتے ہوں تو اسے واضح کرے ایک کھلی بحث کے بعد طے ہو جائے کہ آئندہ پالیسی کیا ہوگی اور اس کے بعد جو لوگ اس پالیسی سے مطمئن نہ ہوں وہ جماعت سے علیٰحدہ ہو جائیں اور اپنے نظریات کے مطابق جو کام کر سکتے ہوں کریں اور جماعت یکسوئی کے ساتھ اپنی طے کردہ پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے۔

ہماری ناچیز رائے میں اسی میں جماعت کی بھلائی مضمر ہے۔ !!!

خطرہ بیان کیا جارہا ہے کہ اس طرح جماعت منتشر ہو جائے گی۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر یہ جماعت ایسی ہی کچی بنیادوں کے بھروسے پر اسے آگے لئے جا رہے ہیں؟ جو جماعت اندرونی اختلاف کا ایک حادثہ برداشت نہ کر سکے وہ آخر آگے کیا کام کر سکے گی ــــ؟ دوسرے یہ کہ اگر واقعتہً گند اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے سامنے آتے ہی یہ جماعت نَسیاً منسیاً ہو جائے گی تو پھر آخر آپ اس کو چھپا کر کب تک رکھ سکیں گے؟

۸۔ اگر یہ چیز منظور نہ ہو اور یہ چیز متفق علیہ ہو کہ اس طرح جماعت ختم ہو جائے گی تو پھر ہماری گزارش شوریٰ کے اختلاف کرنے والے گروہ سے یہ ہے کہ وہ لوگ جماعت کے اتنے ہی خواہ ہیں تو پھر ان کو چاہیئے کہ وہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیٰحدہ ہو جائیں ایک ایسی جماعت کو کہ جو ابھی منزلِ مقصود سے بہت دور ہے اور جسے اپنا مقصود حاصل کرنے کے لئے ابھی ایک طویل اور SOLID جدوجہد کرنی ہے، آپس کی کشمکش میں مبتلا کئے رکھنے کو اس کی خیر خواہی سمجھنا حماقت نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ اگر وہ اس پر بضد ہیں کہ جماعت میں رہنا بھی ہے اور اسے اپنے نظریات پر موڑنا بھی ہے تو یہ موقع موجود ہے۔ دیانت داری کے ساتھ اپنی بات ارکان کے سامنے رکھ دیں اگر جماعت ان کی بات مان لے تو فبہا ورنہ پھر سیدھے سیدھے جماعت کو دوسری طرف جانے دیں اور مزید روڑے

نہ اٹکائیں۔ نہ اس جماعت کی چلتی گاڑی کو بریک لگا کر کھڑا رکھ چھوڑیں اور اگر وہ اس میں جماعت کی تباہی دیکھتے ہیں اور یہ انہیں ناپسند ہے تو پھر ایک ہی راہ ہے کہ خاموشی سے علیحدہ ہو جائیں۔

۹۔ اور اگر نہ شوریٰ ہماری بات مانے ـــــ نہ اختلاف کرنے والے حضرات کو ہماری بات سے اتفاق ہو تو پھر ہم اپنے بارے میں دو شکلیں تجویز کرتے ہیں۔

(ا) ...... یہ کہ کم از کم ہمیں اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ ہم اجتماعِ ارکان میں اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت سے رکھ دیں۔ اس کام کے لئے جتنا وقت ہمیں درکار ہو' دیا جائے اور ہم پر کوئی روک ٹوک نہ کی جائے کہ یہ کہا جا سکتا ہے اور یہ نہیں! ـــــ تاکہ ہم پورے طور پر مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے اپنی بات کہہ دی ہے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ ہم "منافقت" کے ساتھ جماعت کے ساتھ چلنے کو اپنے اوپر بھی ظلم سمجھتے ہیں اس لئے کہ اس طرح آخرت میں اجر تو دور رہا، عذاب کا خطرہ نظر آتا ہے۔ اور جماعت پر بھی ظلم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے مجموعی ذہن سے علیحدہ ایک ذہن رکھتے ہوں اور پھر بھی ساتھ چلیں اور عملاً اس کا حاصل یہ ہو کہ ـــــ نہ خود چلیں اور نہ دوسروں کو چلنے دیں۔

(ب) ...... اور اگر یہ بھی قابلِ قبول نہ ہو تو ہمیں اجتماع سے قبل ہی مطلع کر دیا جائے۔ ہم اس کے لئے پورے انشراحِ صدر کے ساتھ تیار ہیں کہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں اور نہ اپنی منزل کھوٹی کریں اور نہ جماعت کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوں۔ ہماری اس طرح کی علیحدگی بھی انشاءاللہ جماعت کے لئے نقصان کا موجب نہ ہو گی بلکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ہم شاید جماعت کی کوئی نہ کوئی خدمت ہی سرانجام دے سکیں گے۔

مزید تشریح مناسب ہے کہ بصورتِ اوّل ہمیں کم از کم اتنا وقت درکار ہے کہ ہم اپنے اس متفقہ بیان کو جو ہم نے جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا پڑھ کر اجتماعِ ارکان میں سنا دیں اور آئندہ کے بارے میں ایک قرارداد مرتب کر کے اسے وضاحت کے ساتھ پیش کر سکیں۔

ہم ۱۶ر تاریخ تک کسی اطلاع کے منتظر رہیں گے اور صرف پہلی شکل کی منظوری کی صورت میں اجتماع کے لئے حاضر ہوں گے۔ براہ کرم ہمیں ۱۶ر فروری کو

بارہ تا ۲ بجے دوپہر فون نمبر ۱۸۷ پر فیصلہ سے مطلع کر دیا جائے۔ تاکہ ہم اجتماع میں شریک ہونے' یا یہاں کے دوسرے ارکان کے ہاتھ اپنے استعفے بھجوانے کا فیصلہ کر سکیں ــــ فقط والسلام!

ہم ہیں اراکین جماعت اسلامی منٹگمری

(چھ اراکین کے دستخط)

اس تحریر کے جواب میں ہمیں بذریعہ تار مطلع کیا گیا کہ اجتماعِ ارکان میں سب کو اظہارِ رائے کا پورا موقع دیا جائے گا!۔

بقیہ: 'باب سوم'

ایک لفظ کا پوسٹ مارٹم کیا لیکن ان کا اصل زور دستور اور ضابطے کی پابندی ــــ اور جمہوریت اور شورائیت کے نظام کو برقرار رکھنے پر تھا! ــــ اور ان کے خط کے اسی مرکزی نقطے کی وضاحت کیلئے اس کے پس منظر کو اس قدر تفصیلاً بیان کرنا ضروری تھا ــــ!



Adarts-JOS-1/89

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد :	۳۹
شمارہ :	۲
رجب المرجب	۱۴۱۰ھ
فروری	۱۹۹۰
فی شمارہ	-/۵
سالانہ زرتعاون	-/۵۰

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/=
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove I L 60516
Tel : 312 969 6755

c/o Mr. Rashid A. Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel . 313 977 8081

CANADA US $ 12/=
c/o Mr. Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/=
c/o Mr Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlesex EN 34 RP
Tel 01 805 8732

MID-EAST DR 25/=
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/=
c/o Mr Hyder M D. Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel 42127

K S A SR 25/=
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/=
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702160

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore

ادارہ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

قارئین کرام

اگر آپ اپنا زر تعاون ارسال فرما چکے ہیں اور اس کا اندراج آپ کے نام و پتہ والے اُس لیبل پر نہیں جو لفافہ پر چسپاں ہے، تو آئندہ شمارے تک انتظار فرمایئے۔ اگر آئندہ بھی یہی صورت ہو تو ہمیں تحریر فرمائیں!

اگر زر تعاون ابھی آپ ادا نہیں کر پائے تو کم از کم پہلی فرصت میں ہمیں پرچہ جاری رکھنے کی ہدایت ضرور ارسال کر دیں۔ زر تعاون کی ادائیگی آپ اپنی سہولت سے ایک آدھ ماہ کی تاخیر سے بھی کر سکتے ہیں۔

اضافی ڈاک خرچ کی وجہ سے وی۔ پی۔ پی صرف آپ کی ہدایت پر ہی ارسال کی جائے گی۔

آپ کی توجہ اور تعاون ہمارے لیے آپ کی بہتر خدمت میں مدد دے گا۔ شکریہ

سرکولیشن مینجر

جملہ رفقاء و احباب مطلع رہیں کہ

ان شاء اللہ **تنظیمِ اسلامی پاکستان** کا ۱۵واں

سالانہ اجتماع

سوموار ۱۹ ؍ مارچ تا جمعہ ۲۳ ؍ مارچ سنہ ۹۰ء ،

قرآن آڈیٹوریم

اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہوگا

اجتماع کی باضابطہ کارروائی ۱۹ ؍ مارچ کو بعد نماز عصر شروع ہوگی۔ لہٰذا رفقاء و احباب کوشش کریں کہ ۱۹ ؍ کی سہ پہر تک لازماً اجتماع گاہ میں پہنچ جائیں۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر ۱۹ ؍ مارچ کو صبح ۹ بجے سے ۴ بجے شام تک استقبالیہ کیمپ قائم رہے گا۔ جملہ شرکاء موسم کے مطابق بستر کے علاوہ ایک ایک پلیٹ اور چائے کے لیے ایک ایک کپ یا چھوٹا مگ ضرور ساتھ لائیں۔

مزید برآں

سالانہ اجتماع سے متصلاً قبل جمعہ ۱۶ ؍ مارچ تا ۱۹ ؍ مارچ سنہ ۹۰ء

بیرونِ پاکستان کے رفقاء کے لیے ایک سہ روزہ تربیت گاہ ،

تنظیم کے مرکزی دفتر واقع ۶۷، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور میں منعقد ہوگی۔ اس میں شرکت کے خواہاں رفقاء ۱۶ کی صبح گڑھی شاہو پہنچ جائیں یا نماز جمعہ مسجد دارالسلام، باغِ جناح، میں پڑھ لیں جہاں ساڑھے گیارہ بجے امیر تنظیم کا خطاب شروع ہو جاتا ہے۔ تنظیم کے بیرونِ پاکستان رفقاء کو اس موقع سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں فائدہ اٹھانا چاہیے۔

المعلن، **ڈاکٹر عبدالخالق**، ناظمِ اعلیٰ، تنظیمِ اسلامی، پاکستان۔



ADARTS-SUA-1/85

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ احوال

'میثاق' کا پچھلا شمارہ حسبِ اعلان زیرِ تالیف کتاب 'نقضِ غزل' کے ابتدائی چار ابواب پر مشتمل تھا۔ خیال یہ تھا کہ جماعتِ اسلامی کی تاریخ کی اس ناخوشگوار داستان کی تکمیل اس تازہ شمارے یعنی فروری ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں ایک حد تک ہو جائے گی۔ لیکن 'وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ' کے مصداق اس ارادے کی عملی تکمیل ابھی مشیّت الٰہی میں نہیں تھی۔ قارئین کے علم میں ہے کہ اس بحث کا اکثر حصہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے سنہ ۶۷-۱۹۶۶ء میں مرتب کر لیا تھا جو اُنہی ایام میں ماہنامہ 'میثاق' میں بالاقساط شائع ہو گیا تھا لیکن کچھ حصے کی ترتیب و تسوید کا کام ابھی باقی تھا کہ اُس وقت کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر بعض خیر خواہوں اور بزرگوں کے مشورے پر محترم ڈاکٹر صاحب نے قلم روک لیا تھا۔ بعد میں متعدد مواقع پر محترم ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کے اس قرض کو ادا کرنے کا ارادہ کیا لیکن بوجوہ ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ (اس معاملے کی تفصیلات محترم ڈاکٹر صاحب نے سپردِ قلم کر دی تھیں جو پچھلے شمارے میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے زیرِ عنوان شائع کی جا چکی ہیں) اس بار امیرِ تنظیمِ اسلامی کی صحت کی خرابی آڑے آئی۔ جنوری کے دوسرے ہفتے میں اُنہیں اپنی پشت پر بائیں بازو کی طرف تکلیف کا احساس ہوا۔ چند دن کے اندر اندر یہ تکلیف شدّت اختیار کر گئی۔ یہاں تک کہ اُٹھنا بیٹھنا محال ہو گیا۔ یہ غالباً دسمبر کے آخری ہفتے کے دوران منعقد ہونے والے نظریاتی ریفریشر کورس میں کی گئی کمر توڑ مشقت ہی کا نتیجہ تھا جو قدرے تاخیر سے ظاہر ہوا۔ احباب و رفقاء جانتے ہیں کہ اس پروگرام کے دوران امیرِ محترم کے روزانہ اوسطاً ساڑھے سات گھنٹے لیکچر دیتے اور خطاب کرتے گزرتے تھے۔ کمر کی تکلیف کی شکایت انہیں پہلے سے تھی۔ اندازہ یہ ہے کہ اُسی تکلیف نے بڑھ کر یہ شکل اختیار کی ہے۔ قریباً دو ہفتے امیرِ محترم صاحبِ فراش رہے۔ تاہم اس دوران بھی انہوں نے خطابِ جمعہ کا ناغہ نہیں ہونے دیا اور طبیعت پر جبر کرتے اور تکلیف کو جھیلتے ہوئے اس ذمہ داری کو نبھایا۔ بہرکیف 'نقضِ غزل' کا جو حصہ انہیں ابھی مرتب کرنا تھا وہ بدستور شرمندۂ تکمیل ہی رہا۔ امیرِ محترم کی طبیعت الحمد للہ کہ اب بہت بہتر ہے اور وہ آج

ہی صبح یعنی ۲۲ جنوری کو "شام الہدی" پروگرام میں شرکت کی غرض سے کراچی روانہ ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے، اور خدمتِ دین کے کام میں تادیر مصروفِ عمل رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) اُمید واثق ہے کہ آئندہ شمارے میں مذکورہ بالا قرض ادا ہو جائے گا۔ وَمَا تَوْفِيقُنَا إِلَّا بِاللهِ

زیرِ نظر شمارے میں "مسلمانوں کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل" کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی کے ایک فکر انگیز خطاب پر مبنی ایک زیرِ طبع کتابچہ شامل ہے۔ آج سے پانچ سال قبل امیر تنظیم نے کراچی میں سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کی روشنی میں مذکورہ بالا موضوع پر مفصل خطاب ارشاد فرمایا تھا۔ جو اواخر ۱۹۸۵ء اور اوائل ۱۹۸۶ء میں چار اقساط کی شکل میں "حکمتِ قرآن" میں چھپ بھی گیا تھا۔ ماہِ رواں کے دوران چونکہ امیر تنظیم نے مسجد دارالسلام میں اپنے خطباتِ جمعہ میں بالعموم انہی آیات کو بنیاد بنا کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے موضوع پر تفصیلاً اظہارِ خیال فرمایا ہے اور بالخصوص "نہی عن المنکر" کی اہمیت کو دیگر آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کی مدد سے واضح کیا اور علماءِ کرام کے لیے کرنے کا اہم ترین کام بھی اسی فریضۂ "نہی عن المنکر" کو قرار دیا ہے۔ لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ "حکمتِ قرآن" میں شائع شدہ خطاب کو مرتب کر کے جلد از جلد کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ اس موضوع کے مختلف گوشے نکھر کر رفقاء و احباب کے سامنے آجائیں۔ اِس کتابچے کو مکمل صورت میں اِس شمارے کی زینت بنایا گیا ہے۔

ماہِ جنوری کے دوران شائع شدہ ہفت روزہ "ندا" کے ایک شمارے میں پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کا ایک انٹرویو شائع کیا گیا تھا جو فی الاصل آج سے قریباً ۸ ماہ قبل ایک غیر معروف جریدے "انکشاف" میں شائع ہوا تھا۔ اس انٹرویو چونکہ تنظیم اسلامی، اس کے امیر اور ہفت روزہ "ندا" کو بالخصوص ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا۔ لہٰذا مدیرِ ندا نے اِس خیال سے اُسے من وعن شائع کر دیا تھا کہ اس کا محاکمہ کیا جائے۔ (چنانچہ ۲۳ جنوری کے "ندا" سے انہوں نے اِس "محاکمہ" کا باقاعدہ آغاز بھی کر دیا ہے) لیکن ہوا یہ کہ معاصر "نوائے وقت" نے علامہ صاحب کے اس انٹرویو کی بنیاد پر ایک خبر بھی نمایاں انداز میں شائع کر دی جس میں علامہ صاحب کی ڈاکٹر صاحب پر تنقید

کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اس انٹرویو میں چونکہ طاہر القادری صاحب نے ایک نہایت مغالطہ آمیز بات محترم ڈاکٹر صاحب کی طرف منسوب کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا مودودی دونوں مسلکِ اہلِ سنت کو دل سے شرک سمجھتے ہیں، لہٰذا اس کی تردید ضروری خیال کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود کہ دو روز تک مسلسل تردیدی پریس ریلیز 'نوائے وقت' کو بھیجا جاتا رہا، وہ تردیدی بیان 'نوائے وقت' کے صفحات میں جگہ نہ پاسکا۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے! ـــ تاہم تیسرے روز خصوصی روابط کو بروئے کار لاکر انتظامیہ پر زور دیا گیا تو بالآخر اس تردیدی بیان کا ایک 'خلاصہ' غیر نمایاں انداز میں 'نوائے وقت' میں شائع ہو گیا۔ صورتِ حال کی وضاحت کے طور پر ہماری جانب سے بھیجے جانے والے پریس ریلیز کی نقل ذیل میں پیشِ خدمت ہے:

"امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے علامہ طاہر القادری صاحب کے اس بیان پر شدید احتجاج کرتے ہوئے اسے صریح بہتان قرار دیا ہے جس میں طاہر القادری صاحب نے ان پر اور مولانا مودودی مرحوم پر یہ الزام لگایا ہے کہ یہ دونوں اہل سنت والجماعت کے مسلک کو اپنے دل میں کفر سمجھتے اور اسے شرک قرار دیتے ہیں۔

مسجد دارالسلام میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ وہ اہل سنت والجماعت کے مسلک ہی کو حق سمجھتے ہیں اور مولانا مودودی مرحوم بھی اسی مسلک کو حق سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس امر پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں اہل سنت والجماعت میں پیدا کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ ہمارے چاروں عظیم ائمہ یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل کا تعلق اسی مسلک اہل سنت سے تھا۔ انہوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلک اہل سنت والجماعت کے پیرکاروں کی ایک عظیم اکثریت میں بھی اعتقادی اور عملی گمراہیاں در آئی ہیں۔ علماء اور مصلحین کا کام یہ ہے کہ وہ ان گمراہیوں کے سدباب کے لیے عوام میں صحیح دینی شعور کو اجاگر کریں، غلط کاموں پر تنقید کریں اور اہل سنت والجماعت کے اصل مسلک کی تعلیم و ترویج کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ علامہ طاہر القادری کے اس موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریکیں ناکام ہو چکی ہیں، ڈاکٹر

مسلمانوں کے لیے

۳ سہ نکاتی لائحہ عمل

سورۂ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ کی روشنی میں

تألیف

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴-۸۵۶۰۰

نام کتاب ——— مسلمانوں کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل

مؤلف ——— ڈاکٹر اسرار احمد

تعداد اشاعت (بار اوّل) — دس ہزار

تاریخ اشاعت ——— جنوری ۱۹۹۰ء

ناشر ——— لطف الرحمٰن خان، ناظم مکتبہ
مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور

مطبع ——— مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

قیمت ——— اشاعتِ اعلیٰ (سفید کاغذ) -/۱۰ روپے
اشاعتِ عام (اخباری کاغذ) -/۶ روپے

مقامِ اشاعت ——— ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون ۸۵۶۰۰۴
کراچی آفس، نمبر ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ
شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۶۵۸۶

انتساب

امّتِ مسلمہ کے ان باہمّت

افراد

کے نام جو

قرآن حکیم

کو واقعۃً اپنا امام اور رہنما بنانے

کا فیصلہ کرلیں!

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیشِ لفظ

اوائل ۱۹۸۵ء میں امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے دورۂ کراچی کے دوران ایک اجتماعِ عام میں 'اُمّتِ مسلمہ کے لیے لائحہ عمل' کے موضوع پر مفصل اظہارِ خیال فرمایا تھا محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ فکر انگیز خطاب درحقیقت سورۃ آلِ عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ ہی کی توضیح و تشریح پر مشتمل تھا موضوع چونکہ بہت اہم تھا اور خطاب بھی نہایت مؤثر اور جامع، لہٰذا ہمارے بزرگ رفیق محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے اِسے بڑی محنت اور دلچسپی سے ٹیپ کی ریل سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ پھر اسے قسط وار ماہنامہ 'حکمتِ قرآن' کے اواخر ۱۹۸۵ء کے دو شماروں یعنی نومبر اور دسمبر اور اوائل ۱۹۸۶ء کے دو شماروں یعنی جنوری اور مارچ میں کُل چار اقساط کی صورت میں شائع کر دیا گیا۔

مطالعۂ قرآن حکیم کے اُس منتخب نصاب میں جسے بجا طور پر امیر تنظیم اسلامی کی تحریک رجوع الی القرآن کی بنیاد اور اساس قرار دیا جا سکتا ہے' ابتداءً سورۃ آل عمران کی مذکورہ بالا تین آیات کا درس شامل نہ تھا لیکن بعد میں جب 'الہدیٰ' کے زیرِ عنوان 'منتخب نصاب' کے چند ابتدائی اسباق روزنامہ 'جنگ' میں بالاقساط شائع ہوئے تو اِس درس کو بھی منتخب نصاب کے حصّۂ اوّل یعنی جامع اسباق میں شامل کر لیا گیا۔ چنانچہ اِس ضمن میں 'حکمتِ قرآن' میں شائع شدہ اُسی خطاب کو بنیاد بنایا گیا جو ۸۶-۸۵ء میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے اُس موقع پر 'جنگ' میں اشاعت سے قبل اس خطاب پر محترم ڈاکٹر صاحب نے نظرِ ثانی فرما کر مناسب اصلاح و ترمیم بھی کر دی تھی۔ اور اس طرح تحریر کو مضمون کی شکل میں ڈھالنے کے عمل میں جو کمی بیشی رہ جاتی ہے اُس کے حتی الامکان ازالے کا سامان بھی ہو گیا۔ روزنامہ 'جنگ' میں اِس درس کی اشاعت پانچ اقساط میں مکمل ہو سکی تھی۔ صفحاتِ آئندہ میں اللہ کی تائید و توفیق سے انہی پانچ اقساط کو ترتیب دے کر یکجا شائع کیا جا رہا ہے۔ فللّٰہِ الحمد والمنّۃ

خاکسار لُطف الرحمٰن خان ناظمِ مکتبہ
۱۸ جنوری ۱۹۹۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کی سلسلہ وار تشریح ان کالموں میں جاری ہے، اس کا حصہ اول چند نہایت جامع اسباق پر مشتمل ہے جن میں انسان کی نجات اور فوز و فلاح کے جملہ لوازم کو نہایت جامعیت کے ساتھ یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسی جامعیت کبریٰ کی حامل ہے سورۃ العصر، پھر یہی شان ہے آیۂ بِر[1] کی اور اسی جامعیت کا مظہر اتم ہے سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع ——— قرآن حکیم کا ایک ایسا ہی جامع مقام سورۂ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ پر مشتمل ہے جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے بھی سورۃ العصر کی شان کا حامل ہے اور حسن اتفاق سے جس طرح سورۃ العصر تین آیات پر مشتمل ہے اسی طرح یہاں بھی تین ہی آیات میں ایک مکمل لائحہ عمل بیان کر دیا گیا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ سورۃ العصر میں بات ایک قاعدہ کلیہ اور حقیقت عمومی (UNIVERSAL TRUTH) کے انداز میں بیان ہوئی ہے اور سورۂ آل عمران کے اس مقام پر خطاب براہِ راست اُمتِ مسلمہ سے ہے، تو آیئے کہ پہلے ان آیات کی تلاوت کر لیں:

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

---

[1] البقرہ: ۱۷۷ "لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ ..... الآیہ"

اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے اور دیکھنا تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر اس حال میں کہ تم (اللہ کے) فرمانبردار ہو۔ اور چمٹ جاؤ اللہ کی رسّی کے ساتھ مجموعی طور پر اور باہم تفرقہ میں مت پڑو۔ اور یاد کرو اللہ کی اُس نعمت کو جو تم پر ہوئی۔ جبکہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ اور تم تو آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے تک جا پہنچے تھے لیکن اللہ نے تمہیں اس سے بچایا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو! اور چاہیے کہ تم سے ایک ایسی جماعت وجود میں آئے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے ——— اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

یہ آیاتِ مبارکہ اس سورت کے قریباً وسط میں واقع ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ سورۂ آلِ عمران دو سو آیات پر مشتمل ہے اور ان آیات کا نمبر ہے ۱۰۲، ۱۰۳، اور ۱۰۴۔ گویا قریباً وسط ہے۔ میرے نزدیک اِن آیات میں ہم مسلمانوں کے لیے ایک لائحہ عمل ہے، اگرچہ قرآن مجید کی ہر آیت میں علمی نکات بھی ہیں، حکمت و فلسفہ کے مسائل بھی ہیں اور عملی رہنمائی بھی ہے۔ چنانچہ ان میں بھی یقیناً علمی اعتبار سے بڑے وقیع نکات ہیں، لیکن آج میری گفتگو ان کے عملی پہلوؤں کے بیان تک محدود رہے گی۔ اس لیے کہ علمی نکات پر توجہ کا ارتکاز زیادہ ہو جاتے تو اکثر و بیشتر عملی رہنمائی کی طرف توجہ نہیں ہوتی، لہٰذا آج میری کوشش یہ ہوگی کہ اِن آیاتِ مبارکہ کے مطالعہ سے جو عملی لائحہ عمل ہمارے سامنے آتا ہے اُسے میں آپ کے سامنے رکھوں۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے قرآن مجید کی یہ تین آیات اس عملی رہنمائی اور ہدایت کے اعتبار سے جو وہ اہلِ ایمان کے سامنے رکھتا ہے قرآن حکیم کے جامع ترین مقامات میں سے ہیں۔ امّتِ مسلمہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ایک مسلمان کے کیا فرائض ہیں اور اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں! اُسے سب سے پہلے کن امور پر اپنی توجہات کو مرتکز کرنا ہوگا! اِن کو بڑی جامعیت کے ساتھ پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری آیت کا موضوع یہ ہے کہ اِن افراد کو باہم جوڑنے والی چیز، انہیں ایک امّت بنانے والی شے، انہیں "حزب اللہ" بنانے

والی چیز، ان کے مابین ذہنی و فکری ہم آہنگی اور عملی اتحاد پیدا کرنے والی چیز کون سی ہے!! ——
اور تیسری آیت میں یہ نشاندہی فرمائی گئی کہ اس امت یا حزب اللہ یا اس جماعت کا مقصد کیا ہے!!! کس کام کے لیے اس کو محنت اور جدّوجہد کرنی ہے!

اب آپ خود غور کر سکتے ہیں کہ ان تین آیات کے مابین بڑا منطقی ربط ہے۔ اس لیے کہ بڑی سے بڑی اجتماعیت بھی افراد ہی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اقبال نے خوب کہا ہے کہ ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

افراد کا رُخ درست نہ ہو تو اجتماعیت کا رُخ کیسے درست ہو جائے گا! اگر افراد وہ لائحہ عمل اختیار نہ کریں جو اُن کو دیا گیا ہے تو اجتماعی زندگی کے لیے جو صحیح لائحہ عمل ہے، اُسے کیسے اختیار کیا جا سکتا ہے! لہٰذا ترتیب یہی ہے کہ سب سے پہلے ہر فرد اپنے طور پر سوچے کہ مجھے کیا کرنا ہے! مجھ سے تقاضا کیا ہے! مجھ سے مطالبہ کیا ہے! میں اس بات کو سمجھانے کے لیے مسجد کے منبر کی مثال دیا کرتا ہوں، چونکہ عام طور پر اس کی تین سیڑھیاں ہوا کرتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص چھلانگ لگا کر تیسری سیڑھی پر چڑھنا چاہے گا تو اوندھے منہ گرے گا۔ صحیح طریقہ یہی ہے کہ اوّلاً پہلی سیڑھی پر، پھر دوسری سیڑھی پر اور پھر تیسری سیڑھی پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ ان آیات میں گویا عملی اعتبار سے یہ تین مراحل ہیں۔ یہ تین سیڑھیاں ہیں جو ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔

انفرادی لائحہ عمل

اب پہلی آیت پر توجہ مرکوز فرمائیے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ "اے اہلِ ایمان! یا اے ایمان کے دعوے دارو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے۔ اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار ہو" —— یہ بات سمجھنے کی ہے کہ قرآن مجید کا قریباً دو تہائی حصہ مکی سورتوں اور آیتوں پر مشتمل ہے، لیکن اس میں آپ کو کہیں "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا" کے الفاظ نہیں ملیں گے۔ زیادہ سے زیادہ سورۃ الحج کے آخری رکوع میں آتے ہیں، لیکن اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں

اختلاف ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔ میرا خیال یہ ہے کہ سورۃ الحج ’برزخی‘ سورت ہے۔ اس میں مکی آیات بھی شامل ہیں‘ مدنی بھی اور سفرِ ہجرت کے دوران نازل ہونے والی آیات بھی۔ واللہ اعلم!

”یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا“ سے خطاب مدنی دور میں شروع ہوا ہے جبکہ ایک امت کی تشکیل بالفعل ہو چکی تھی۔ لہٰذا امتِ مسلمہ سے خطاب کے لیے یہ عنوان اختیار کیا گیا، ورنہ اہلِ ایمان سے خطاب کے لیے سورۃ العنکبوت میں آپ کو یہ الفاظ ملیں گے: ”یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔“ ”اے میرے بندو جو ایمان لائے۔“ یا سورۃ الزمر میں یہ الفاظ مل جائیں گے: ”یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ۔“ ”اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اُوپر (گناہ کر کے) زیادتی کی ہے۔“ لیکن ”یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا“ کے الفاظ مدنی سورتوں میں کثرت کے ساتھ آتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجرات کُل اٹھارہ آیات پر مشتمل ہے۔ اس میں پانچ آیات کا آغاز ’یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا‘ سے ہوتا ہے اور دوسری طرف سورۃ الاعراف جو چوبیس رکوعوں پر مشتمل ہے اور وہ حجم کے اعتبار سے طویل ترین مکی سورت ہے‘ اس میں ۲۰۶ آیات ہیں۔ جبکہ آیات کے اعتبار سے سورۃ الشعراء سب سے بڑی مکی سورت ہے جس کی آیات کی تعداد ۲۲۷ ہے۔ لیکن ان طویل مکی سورتوں میں بھی کہیں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب نہیں ملے گا۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ سمجھیے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے خطاب امتِ مسلمہ سے ہے اور یہ اندازِ تخاطب مدنی سورتوں میں نظر آتا ہے۔

دوسری بات یہ سمجھیے کہ سورۂ آل عمران کا غالب حصہ ۳ھ میں نازل ہوا ہے یعنی غزوۂ احد کے متصلاً بعد۔ لہٰذا ۳ھ کے حالات کو اپنے ذہن میں لائیے! مدینہ میں جہاں ایک کثیر تعداد مومنین صادقین کی ہے‘ جس میں مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی‘ جن کے متعلق سورۂ توبہ میں فرمایا: ’وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُھٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ‘ وہاں ساتھ ہی کچھ ضعیف الایمان لوگ بھی ہیں بلکہ منافقین بھی ہیں۔ یہ گروہ وہاں عبداللہ بن اُبَی کی سرکردگی میں حضورؐ کی مدینہ تشریف آوری کے وقت ہی سے وجود میں آگیا تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد کے لیے مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تو ایک ہزار افراد آپؐ کے ساتھ تھے‘ لیکن پھر عبداللہ بن اُبَی کے ساتھ تین سو افراد راستہ ہی سے

واپس چلے گئے اور حضورؐ کے ساتھ صرف سات سو افراد رہ گئے تھے۔ اگر وہ تین سو افراد سب کے سب منافق نہیں تھے تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں منافق بھی تھے اور ضعیف الایمان لوگ بھی تھے اس لیے کہ جو لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس وقت ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں جبکہ یقین سے معلوم ہو کہ جنگ ہو کر رہے گی، ان کے لیے ہلکے سے ہلکے الفاظ ہم یہی کہہ سکتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ اس موقع پر معاملہ گڈمڈ تھا کہ صادق الایمان لوگ بھی حضورؐ کے ساتھ تھے، ایسے لوگ کہ جن کے ایمان و یقین کی وسعت و گہرائی کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایمان کی گہرائی اور گیرائی کا ہم کیا تصور کریں گے! وہاں کمزور ایمان اور کمزور قوتِ ارادی والے لوگ بلکہ منافقین بھی موجود تھے۔ لیکن قرآن ان سب سے جب خطاب کرتا ہے تو 'یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کے الفاظ سے کرتا ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ پورے قرآن مجید میں کہیں 'یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ نَافَقُوْا' نہیں آیا۔ یعنی 'اے منافقو!' کہہ کر کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔ جہاں منافقین سے بات ہوئی ہے وہاں بھی 'یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' ہی سے ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ایمان کے دعوے دار تو وہ (یعنی منافقین) بھی تھے۔ کلمۂ شہادت وہ بھی پڑھتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نمازیں وہ بھی ادا کرتے تھے، لیکن جب انہیں جنگ کے لیے پکارا جاتا تھا یا جب ان سے انفاق کا تقاضا ہوتا تھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو یا اللہ کی راہ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلو، تب ان کی جان نکلتی تھی۔ نمازیں وہ پابندی سے پڑھتے تھے۔ اگرچہ ان کی قلبی کیفیت کے اظہار کے لیے قرآن میں 'کُسَالٰی' کا لفظ آیا ہے کہ نماز کے لیے اٹھتے بھی ہیں تو بڑے کسل کے ساتھ۔ ایک کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ انسان پوری دل کی آمادگی کے ساتھ اٹھے، پورے ذوق و شوق کے ساتھ اٹھے، جس کا ایک درجہ وہ بھی ہے جسے ایک حدیث مبارک میں ان الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا کہ 'وَرَجُلٌ قَلْبُہٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ' ("اور وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے") اور دوسری صورت وہ ہوتی ہے جسے لفظ 'کُسَالٰی' سے تعبیر فرمایا گیا۔

بہرحال جن آیات کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں ان میں 'یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے خطاب ہے۔ چنانچہ اہلِ ایمان سے پہلا تقاضا کیا گیا: "اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ"

"اے ایمان والو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے"۔ تقویٰ کا مفہوم کیا ہے! بچ کر چلنا، پھونک پھونک کر قدم رکھنا، تقویٰ کا اصل مفہوم یہی ہے۔ حضرت اُبیؓ ابن کعب رضی اللہ عنہ ایک انصاری صحابی ہیں جن کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا: "اقرءهم ابی ابنُ کعب"۔ "صحابہ کرامؓ میں قراءتِ قرآن کے سب سے بڑے عالم یہ حضرت ابی ابن کعب ہیں"۔ ان سے ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ "تقویٰ" کیا ہے! آپ اسے کیسے DEFINE کریں گے؟ تو حضرت اُبی بن کعبؓ نے اس لفظ کی بڑی خوبصورت تشریح کی جسے صحابہ کرامؓ کی اس مجلس کے تمام شرکاء نے تسلیم کیا کہ بے شک یہ اس لفظ کی بہترین تعبیر ہے۔ ان کی توضیح کو میں اپنے الفاظ میں بیان کروں تو وہ یہ ہے:

> 'امیر المومنین! جب کسی شخص کو جنگل میں ایسی پگڈنڈی سے گزرنے کا اتفاق ہو، جس کے دونوں اطراف میں خاردار جھاڑیاں ہوں تو ایسی پگڈنڈی پر گزرتے وقت وہ شخص لامحالہ اپنے کپڑوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر اس راستہ کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے کپڑے جھاڑیوں اور ان کے کانٹوں سے اُلجھنے نہ پائیں تو اس احتیاطی رویّے کو تقویٰ کہا جائے گا۔'

اب اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اس آیت پر اپنی توجہات کو مرتکز کیجئے۔ ایمان کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ آپ نے توحید کے التزام کے ساتھ اللہ کو مانا، یومِ آخرت کا اقرار کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانا۔ اب ان ایمانیاتِ ثلاثہ کا تقاضا کیا ہے؟ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو مانیے! وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (التغابن: ۱۲) "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اگر تم روگردانی کر گئے تو جان لو کہ صاف صاف پہنچانے کے سوا ہمارے رسولؐ پر کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے۔" اور وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ

عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ (الحشر: ۷) "اور جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم دیں اُسے مضبوطی سے تھامو اور جس سے روکیں، اُس سے رُک جاؤ۔" آخرت پر ایمان لانے کا تقاضا کیا ہے؟ یہ کہ:
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (البقرة، ۱۲۳) "اور بچو اس دن (کی سزا) سے کہ جس دن کوئی شخص کسی کے ذرا بھی کام نہیں آئے گا اور نہ قبول کیا جائے گا اس کی طرف سے کوئی فدیہ اور نہ کام آئے گی اس کے حق میں کسی کی سفارش اور نہ کسی کی طرف سے ان کو مدد پہنچے گی۔"

پس پہلا تقاضا ہے تقویٰ ــــــ اگر واقعتاً ایمان دل میں ہے تو ہر لفظ زبان سے نکالنے سے پہلے انسان سوچے گا کہ میرے اس لفظ سے اللہ راضی ہو گا یا ناراض! میں اس کو قیامت کے دن JUSTIFY کر سکوں گا یا نہیں! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے کہنے کا مجھے حق حاصل ہے یا نہیں! ہر حرکت جو ہمارے اعضاء و جوارح سے ہو، وہ ہاتھ سے ہو، پاؤں سے ہو، یہاں تک کہ آنکھ کی حرکت کی بھی جوابدہی کرنی ہو گی۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے خطاب کر کے فرمایا تھا کہ اے علی! کسی نامحرم عورت پر پہلی مرتبہ اچانک نگاہ پڑ جائے تو وہ معاف ہو گی، لیکن دوسری مرتبہ اگر نگاہ اٹھی تو وہ معاف نہیں ہے اس لیے کہ یہ انسان کا ارادی عمل ہے معلوم ہوا کہ زبان، آنکھ، کان کا ہر ارادی عمل مسئول ہے: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۳۶) آپ نے سنا ہو گا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ طرزِ عمل تھا کہ جب کبھی کسی راستہ میں ان کے کانوں میں گانے بجانے کی آواز آتی تھی تو فوراً اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تھے اور ساتھ چلنے والے سے پوچھتے تھے کہ اب تو آواز نہیں آ رہی! جب ان کو بتا دیا جاتا تھا کہ آواز نہیں آ رہی تب وہ کانوں سے انگلیاں نکالتے تھے معلوم ہوا کہ ہمارا پورا وجود، ہماری آنکھیں، ہمارے کان، ہماری زبان، ان سب کے استعمال میں ہمیں محتاط رہنا ہو گا۔ زبان کے بارے میں تو حضورؐ نے یہ فرمایا کہ جہنم میں سب سے زیادہ لوگوں کو جھونکنے والی شے یہ زبان ہے! زبان کے غلط استعمال کو حضورؐ نے حصائد الالسنۃ قرار دیا ہے یعنی زبان کی وہ کھیتیاں جو آخرت میں کاٹنی ہوں گی۔ قرآن خبر دیتا ہے کہ انسان کوئی لفظ منہ سے نہیں نکال پاتا مگر یہ کہ اس کے پاس ہی ایک ہوشیار نگران تیار رہتا ہے

مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ (قٓ:۱۸) پھر یہ کہ ہمارے جو اعضاء و جوارح ہیں ان سے جو حرکت بھی سرزد ہو وہ اس احساس کے تحت ہو کہ مجھے اس کی جوابدہی کرنی ہوگی اور آخرت کے دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ ACCOUNT FOR کرنا ہوگا۔ یہ احساس اور یہ روش تقویٰ ہے۔ فرمایا کہ اتنا تقویٰ اختیار کرو جتنا اللہ کے تقویٰ کا حق ہے: اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ ــــــ معمولی تقویٰ مطلوب نہیں ہے بلکہ پوری حدود و قیود کے ساتھ مطلوب ہے۔ "حَقَّ تُقٰتِہٖ" کی شان والا تقویٰ درکار ہے۔ ہم اور آپ تلاوت کرتے وقت اس آیت پر سے سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ ہمیں خیال ہی نہیں آتا کہ قرآن کی یہ آیت ہم سے کیا مطالبہ کر رہی ہے! لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس پر گھبرا گئے، لرز اُٹھے کہ کس انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ اتنا تقویٰ اختیار کر سکے جتنا اللہ کا حق ہے۔ یہاں تو گویا یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ہمارے اعضاء و جوارح سے کسی لمحہ بھی کوئی جنبش اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو، جبکہ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے خطا ہو سکتی ہے۔ کہیں جذبات سے مغلوب ہو کر، کہیں غیر شعوری طور پر، کہیں بھول میں خطا کا صدور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ گھبرا گئے اور انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی کہ ہم میں سے کون ہوگا جو اللہ کا ایسا تقویٰ اختیار کر سکے جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا غفور، بڑا رحیم، بڑا رؤف ہے اس نے ان مؤمنین صادقین کی دل جوئی اور اطمینان کے لیے سورۃ التغابن میں یہ وضاحت فرمائی: فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ "اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے حدِ امکان میں ہے"۔ اب صحابہؓ کی جان میں جان آئی کہ انسان اپنی استطاعت کے مطابق تو کر سکتا ہے ــــــ لیکن یہاں مغالطہ نہ ہو جائے کہ تقویٰ کی روش اختیار کرنے کی شعوری کوشش یہ سمجھ کر چھوڑ دی جائے کہ ہم میں اس کی استطاعت ہی نہیں ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ کس کو اس نے کتنی استطاعت دی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہو گیا کہ مجھ میں فلاں فرائضِ دینی کی بجا آوری کی استعداد و استطاعت ہی نہیں ہے تو جان لیجئے کہ یہ خالص شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ والا معاملہ ہو جائے گا۔

اب اگلے ٹکڑے پر توجہ فرمایئے۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر:

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا "اور ہرگز مت مرنا مگر اسلام (فرماں برداری) کی حالت میں"۔ اسلام کسے کہتے ہیں؟ سرِ تسلیم خم کرنے کو ــــــ فارسی میں اس کی تعبیر ہوگی گردن نہادن'۔ انگریزی میں اسے TO SUBMIT اور TO SURRENDER کہا جائے گا۔ یعنی کوئی مقابلہ تھا اس میں اگر آپ نے ہتھیار رکھ دیئے اور سپر ڈال دی تو اس رویہ کا نام 'اسلام' ہے۔ تو یوں سمجھیے کہ ہمارا نفس اکثر و بیشتر اللہ سے سرکشی کرتا ہے۔ اللہ کا حکم کچھ ہے نفس کا تقاضا کچھ اور ہے۔ خیر و شر کی یہ کشمکش اور کشاکش انسان کے باطن میں چلتی رہتی ہے لیکن جب انسان ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیتا ہے کہ اب جو اللہ کا حکم ہوگا اور اس کے رسول ؐ کا حکم ہوگا بجالائیں گے جو ان کا فرمان ہوگا اس کے مطابق عمل کریں گے تو یہ اسلام ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ "تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر حالتِ اسلام میں"۔ اس کلام میں جو بلاغت ہے اس پر غور فرمائیے کسی انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں ہے کہ وہ کتنی مہلتِ زندگی لے کر آیا ہے اور اس کی موت کب واقع ہوگی۔ مجھے کوئی پتہ نہیں، ہوسکتا ہے کہ ابھی درس کے بعد مسجد سے نکلوں اور کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے اور یہ زندگی ختم ہو جائے۔ آپ کا مشاہدہ ہوگا کہ بسا اوقات صبح لوگ گھر سے اپنے کاروبار کے لیے نکلتے ہیں اور شام کو گھر پر لاش پہنچتی ہے یا موت کی اطلاع ملتی ہے۔ تو چونکہ موت کا کوئی وقت ہمیں معلوم نہیں لہٰذا اگر کوئی شخص یہ طے کرلے کہ "میں ہرگز نہیں مروں گا مگر فرمانبرداری کی حالت میں" تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اسے ہر لمحہ چوکس ہو کر بسر کرنا ہوگا کہ زندگی کا کوئی لمحہ معصیت میں بسر نہ ہو۔ کیا پتہ موت کا پنجہ کب آکر دبوچ لے! کسی کے پاس کوئی گارنٹی نہیں ہے، کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اسی معصیت والے لمحہ میں موت نہیں آجائے گی۔ اس بات کو سمجھانے کے لیے میں آپ کے سامنے ایک حدیث رکھتا ہوں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں اور یہ متفق علیہ روایت ہے:

لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ۔ "کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا، کوئی چور ایمان کی حالت میں چوری نہیں کرتا اور کوئی شرابی حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا۔"

گویا۔۔۔ جس وقت وہ یہ عمل کر رہا ہے اس وقت ایمان کی اصل حقیقت اس کے دل سے نکل چکی ہوتی ہے اگرچہ وہ اس معصیت سے کافر نہیں ہوتا، یہ بات ذہن میں رکھیے! امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف صد فی صد درست ہے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہو جاتا لیکن وہ قلبی یقین والا ایمان اس وقت موجود نہیں ہوتا۔ اگر ہو تو زنا کیسے کرے! اگر وہ قلبی ایمان ہو تو چوری کیسے ہو! شراب کیسے پیتے! اب آپ غور کیجئے کہ جس وقت کوئی شخص ان میں سے کوئی کام کر رہا ہے اور عین اس وقت اس کی رُوح قبض کر لی جائے تو یہ موت کس قدر حسرتناک موت ہو گی۔ یہ فرمانبرداری کی حالت کی موت تو نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس حالتِ نافرمانی کی موت ہوتی۔ اس سے بچنے کی صرف ایک ہی شکل ہے کہ انسان محتاط رہے کہ کوئی بھی لحہ نافرمانی میں بسر نہ ہو۔

میں یہ عرض کر دوں کہ تقویٰ کے موضوع پر میرے محدود علم کی حد تک قرآن مجید کا سب سے زیادہ تاکیدی مقام یہی ہے۔ تقویٰ کے ساتھ تو فرمایا: حَقَّ تُقٰتِهٖ یعنی تقویٰ اختیار کرو جتنا اللہ کا حق ہے اور آگے فرمایا: "دیکھنا ہرگز موت نہ آئے مگر حالتِ فرمانبرداری میں" وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ یہ ہے پہلا نکتہ اور یہ ہے پہلی سیڑھی جس پر ہر مسلمان کو مضبوطی سے قدم جمانے کی پُرزور تاکید اور حکم آیا ہے۔ اور اگر یہیں قدم نہیں جمے ہیں تو اگلی بات کرنا بیکار ہے، بلکہ اس صورت میں اگلی بات کرنا ذہنی عیاشی بن جاتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں یہودیوں کے علماء کے بارے میں کہا گیا: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط "کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو درانحالیکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو" (البقرہ: ۴۴) یعنی تمہارے پاس توریت موجود ہے۔ یہ طرزِ عمل جو یہود کے علماء کا تھا ہمیں اپنے معاشرہ میں بھی نظر آجاتا ہے کہ تلقین بھی ہے، وعظ و نصیحت بھی ہے، بڑے اعلیٰ مقالات بھی لکھے جا رہے ہیں، بڑی عمدہ تقاریر بھی ہو رہی ہیں لیکن قریب ہو کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عملی زندگی میں وہ تقویٰ، وہ اسلام، وہ فرمانبرداری کی روش اور وہ حلال و حرام کی پابندی مفقود ہے، حالانکہ ہمارے دین کا بنیادی تقاضا ہر فرد سے یہ ہے کہ وہ امکانی حد تک تقویٰ اختیار کرے اور اللہ اور رسول ﷺ کا فرمانبردار بنے۔

بہرحال قرآن کے عطا کردہ سہ نکاتی لائحہ عمل کا پہلا قدم یہ ہے۔ اس سیڑھی پر اپنے

قدموں کو جاننا ضروری ہے۔ اس موضوع پر مزید وقت صرف کیے بغیر بس اس ضمن میں صرف ایک اور بات عرض کروں گا اور وہ یہ کہ ہمارے یہاں بعض اوقات یہ تصور نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ خواہ تقویٰ ہو، خواہ اسلام ہو، خواہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرمانبرداری ہو یہ تمام باتیں مِن حیث الکل مطلوب ہیں یعنی پوری زندگی میں تقویٰ ہے تو حقیقی تقویٰ ہے لیکن اگر معاملہ یہ ہو جائے کہ زندگی کے ایک گوشے میں آپ اللہ کے احکام کی بڑی پابندی کر رہے ہیں مثلاً آپ نے متقیوں کی سی وضع قطع اختیار کر لی ہے لیکن کاروبار میں آپ اسلام کے خلاف طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ ناجائز اور حرام ذرائع اپناتے ہوتے ہیں تو جان لیجئے کہ یہ صورتِ حال تقویٰ کے منافی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اِتَّقُوا اللّٰهَ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ۔ "اللہ کا تقویٰ اختیار کرو چھپے اور کھلے ہر حال میں۔" ایک مرتبہ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے تین بار اپنے سینۂ مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: التقویٰ ھٰھُنا۔ التقویٰ ھٰھُنا۔ التقویٰ ھٰھُنا۔ "تقویٰ یہاں ہوتا ہے"۔ تقویٰ اگر دل میں ہوگا تو پورے وجود میں سرایت کر جائے گا۔ پھر وہ تقویٰ پوری شخصیت کو اس رنگ میں رنگ دے گا جسے قرآن مجید میں 'صِبْغَةَ اللّٰهِ' کہا گیا ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (البقرہ: ۱۳۸) لیکن اگر ایسا نہیں ہے، صرف ایک جزو میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پابندی ہے اور دیگر معاملات میں آزادی اختیار کی گئی ہے تو یہ دراصل یہود کا سا طرزِ عمل ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ میری امت میں بھی وہ ساری برائیاں پیدا ہوں گی جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوئیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اگر وہ یعنی بنی اسرائیل گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی گھسو گے۔ یہاں تک الفاظ ہیں، اگرچہ بیان کرتے ہوئے جھجک پیدا ہوتی ہے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں تو آپ کو سناتا ہوں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "اگر بنی اسرائیل میں کوئی ایسا بدبخت پیدا ہوا جس نے اپنی ماں سے زنا کیا ہو تو تم میں سے بھی کوئی بدبخت ایسا ضرور پیدا ہو گا۔"

مراد یہ ہے کہ وہ تمام دینی، اعتقادی، فکری، علمی اور عملی خرابیاں جو سابقہ امت (یعنی بنی اسرائیل) میں پیدا ہوئیں، وہ سب اس امت یعنی امتِ مسلمہ میں بھی پیدا ہوں گی۔ حدیث کا متن حسب ذیل ہے:

لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ۔

"میری امّت پر بھی وہ تمام حالات وارد ہوں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔ . . ."

نہایت فصیح و بلیغ تشبیہ ہے۔ جوتی کے ایک جوڑے کو دیکھیے تو چونکہ پنجے کا رُخ مختلف ہوتا ہے اس لیے آپ کو بظاہر ایک جوتی دوسری جوتی سے مختلف نظر آئے گی لیکن ان کے تلووں کو جوڑ دیجیے تو بالکل ایک ہوں گی۔ اسی طرح بنی اسرائیل اور امّتِ مسلمہ کے احوال میں ظاہراً تو فرق موجود ہے اس لیے کہ بہرحال چودہ سو برس کا فاصلہ ہے۔ چنانچہ ظاہری اعتبار سے کچھ نہ کچھ فرق ہے لیکن بین السطور دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ سرِ مُو کوئی فرق نہیں۔ تو وہ کیفیت جو قرآن مجید میں یہود کے بارے میں فرمائی گئی، ہم میں سے ہر شخص کو اپنے گریبان میں خود جھانکنا چاہیے کہ کہیں ہم تو اس میں مبتلا نہیں ہیں ؟ اور کہیں اس آئینہ میں ہمیں اپنی صورت تو نظر نہیں آرہی ہے!

قرآن مجید میں یہود کو مخاطب کر کے فرمایا: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ "کیا تم کتاب اور شریعت کے ایک حصّہ کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے ؟" فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا —— تو کان کھول کر سُن لو کہ "تم میں سے جو کوئی بھی یہ طرزِ عمل اختیار کرے گا اس کی کوئی سزا اس کے سوا نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کو ذلیل و خوار کر دیا جائے" اور وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ "اور قیامت کے دن ان کو شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔" (البقرہ : ۸۵) یہ ہے اللہ کی وعید ان لوگوں کے لیے جو دین کے حصّے بخرے کرلیں کہ زندگی کے ایک حصّے میں تو دین پر چلوں گا او جو دوسرے گوشے ہیں تو ان کے لیے عذرات کا پلندہ ہے کہ اجی کیا کروں ؟ یہ تو مجبوری ہے یہ تو زمانے کا چلن ہے۔ یہ تو برادری کا رواج ہے۔ شادی بیاہ کی رسومات کا مسئلہ تو عورتوں سے متعلق ہے اس میں ہمارا کوئی بس نہیں چلتا۔ کاروبار چل نہیں سکتا جب تک بینکوں سے سودی لین دین نہ کیا کریں! مہنگائی بہت ہے، گزارا مشکل ہے۔ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ ہے، رشوت نہ لیں تو کا

کیسے چلنے گا؟ اب پردے کا رواج کہاں رہا ہے! ہم اپنی خواتین کو پردہ کرائیں گے تو دقیانوسی اور رجعت پسند کہلائیں گے ـــــ یہ بہانے بنا کر ہم نے زندگی کو تقسیم کر لیا ہے کہ ایک حصّہ میں تو شریعت کی پابندی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ حصّہ بہت محدود ہے اور جو دوسرا وسیع تر حصّہ ہے وہ شریعت سے آزاد ہے۔ تو قرآن مجید کی رُو سے اس پر تبصرہ وہ ہے جو میں نے سورۃ البقرہ کی آیت کے حوالہ سے ابھی آپ کو سنایا ہے۔

نکتہ دوم: حیاتِ ملّی کا استحکام

اب آیئے دوسری آیت پر۔ وہ لوگ جو پہلی آیت کے تقاضوں ـــــ تقویٰ اور اسلام ـــ پر کسی نہ کسی درجے میں عمل کر رہے ہوں ـــــ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ کر چکے ہوں۔ اس لیے کہ انسان موت تک کبھی یہ طے نہیں کر سکے گا کہ میں یہ تقاضے پورے کر چکا ہوں۔ کون شخص یہ دعویٰ کر سکے گا کہ میں نے اللہ کا اتنا تقویٰ اختیار کر لیا جتنا کہ اس کا حق ہے۔ کوئی انسان اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جب صحابہ کرامؓ گھبرا گئے تو ہم میں سے کون ہو گا جو اس کی جرأت کر سکے۔ لہٰذا جو اس پر عمل کے لیے کوشاں ہوں، اس کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے ہوں، اب ان کو آپس میں جڑنا چاہیے، اس لیے کہ جب تک وہ آپس میں مربوط نہیں ہوں گے، بنیانِ مرصوص نہیں بنیں گے، اس وقت تک وہ دنیا میں کوئی مؤثر اور نتیجہ خیز کام نہیں کر سکتے۔ آپ کو کوئی بھی چھوٹا بڑا کام کرنا ہو، خواہ وہ بھلائی کا ہو یا برائی کا، اس کے لیے اجتماعیت ناگزیر ہے۔ اب بات سمجھانے کے لیے ایک مثال پیش کر رہا ہوں کہ جو لوگ جیب کاٹنے کا پیشہ اختیار کرتے ہیں ان کا بھی اگر اپنا ایک جتھہ نہ ہو، ایک گروہ نہ ہو، اُن کا کوئی گرو نہ ہو اور وہ شہر کے علاقے ان کے مابین تقسیم نہ کرتا ہو، روزانہ سارے جیب کترے اپنی کمائی لے جا کر اس کے قدموں میں نہ ڈال دیتے ہوں تو یہ پیشہ بھی "کامیابی" سے نہیں چل سکتا۔ ڈاکوؤں کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ان کا بڑا مضبوط جتھہ ہوتا ہے اور اس میں بڑا سخت نظم ہوتا ہے، ورنہ وہ کیسے بڑے بڑے ڈاکے ڈال سکیں گے! پس معلوم ہوا کہ کوئی کام چاہے خیر کا ہو خواہ شر کا، اس کے لیے اجتماعیت ناگزیر

ہے اور اس کے کارکنوں کا باہم مربوط ہونا لازم ہے۔ خیر کا سب سے عظیم کام وہ ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرانجام دیا۔ میں اس کا ذکر آگے کروں گا۔ اس کام کے لیے ظاہر بات ہے کہ اجتماعیت کی ضرورت ہے لیکن جس طرح کسی فصیل کے لیے پختہ اینٹ کی ضرورت ہے۔ آپ ناپختہ اینٹ کو لگا دیں تو دیوار کمزور رہے گی۔ لہٰذا پہلی چیز کیا ضروری ہے؟ یہ کہ ہر اینٹ پختہ ہو۔ اب انسانی اجتماعیت میں اینٹ کی جگہ فرد کو متصور کیجئے۔ مسلم اجتماعیت کی ہر اینٹ کی پختگی کا پروگرام تو پہلی آیت میں آچکا: ' يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ '۔ اب ان اینٹوں کو باہم جوڑنا ہے۔ خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو جوڑنے والا مسالہ کونسا ہے؟ اس کا جواب ہے اس دوسری آیت میں: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا '۔۔۔۔ "اور مضبوطی سے پکڑلو اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر اور جمع ہو کر" یا اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہے کہ "پوری کی پوری رسّی کو" اس لیے کہ یہاں "جَمِيعًا" حال ہے۔ کس کے لیے حال ہے؟ تو ایک صورت تو یہ ہے کہ جن کو حکم دیا جا رہا ہے وہ سب کے سب مل جل کر اس رسّی کو مضبوطی سے پکڑیں اور دوسری یہ کہ پوری رسّی کو تھامیں۔ اس کے کسی ایک جزو کو نہیں۔ اب یہ رسّی کون سی ہے؟ یہ ہے اصل سوال۔ یہاں قرآن مجید کے اصولوں میں سے ایک اصول کو جان لیجئے! اگر قرآن مجید میں کوئی ایسا لفظ یا حکم آگیا ہے جس کی وضاحت درکار ہے تو پہلا اصول یہ ہے کہ قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کرو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا ایک حصّہ دوسرے حصّے کی تشریح کر دیتا ہے۔ مفسّرین کے یہاں یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ: 'اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا' قرآن کا ایک حصّہ دوسرے حصّے کی تفسیر کر دیتا ہے لیکن فرض کیجئے کہ آپ کو قرآن مجید میں کہیں دوسری جگہ اس کی توضیح نہیں ملی۔ اب قرآن مجید کو سمجھنے کا دوسرا ذریعہ کیا ہے؟ وہ ہے سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں یہ فرمایا ہے کہ اے نبی! یہ آپ کا فرضِ منصبی ہے کہ جو کتاب ہم آپ پر نازل کر رہے ہیں آپ اس کی وضاحت فرمائیں: وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ [1] "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ الذکر، یہ کتاب، یہ قرآن، یہ نصیحت آپؐ پر نازل کی گئی ہے تاکہ آپؐ اس کی تبیین کریں، اس کی وضاحت کریں ان لوگوں کے لیے جن کی

---

[1] النحل : ۴۴

اسے ہم نے اتارا ہے: لہٰذا ہمارا دوسرا طریقہ کیا ہوگا! یہ کہ سنّت و حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کریں کہ یہاں جو 'حبل اللہ' فرمایا گیا ہے اس سے مراد کیا ہے! مجھے ان حضرات سے اختلاف ہے جنہوں نے اس کے معنی خود معیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ اگر حبل اللہ کا مفہوم احادیث میں نہ ہوتا اور وہ احادیث مرفوع نہ ہوتیں یا سند کے اعتبار سے مضبوط نہ ہوتیں تب تو معاملہ دوسرا ہو سکتا تھا لیکن جہاں ہمیں مرفوع حدیث مل جائے اور وہ ثقہ ہو، مضبوط ہو، مستند ہو، روایت کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہو تو پھر اس کے بعد اپنا 'قول' لگانے کی کوشش کرنا، اپنا فلسفہ بیان کرنا، میرے نزدیک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہو جائے گی۔ جہاں کوئی چیز نہیں ملی وہاں آپ غور کیجئے، اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا لیتے لیکن جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مل جائے وہاں اپنی عقل، اپنی سوچ اور محض لغوی معنوں پر بحث میرے نزدیک غلط ہے۔ اب میں اختصار کے ساتھ آپ کو حضورؐ کی تین احادیث سنا دیتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے 'حبل اللہ' کا کیا مفہوم و مطلب معیّن فرمایا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قرآن کی عظمت و فضیلت کے بارے میں ایک طویل حدیث مروی ہے۔ اس میں حضورؐ نے قرآن کے بارے میں فرمایا: هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ۔

"یہ قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے۔" (ترمذی و دارمی)

دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "القرآنُ حبلُ اللہِ الممدودُ من السّماءِ الی الارض" ——— "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن ہی اللہ کی وہ رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے۔"

تیسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جبیر ابن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور بڑی ہی پیاری حدیث ہے۔ اس کے اندر جو تفصیل آئی ہے وہ ایسی ہے کہ جس کو سن کر تھوڑی دیر کے لیے انسان اپنے آپ کو دورِ نبوی کے ماحول میں موجود محسوس کرنے لگتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے برآمد ہوئے۔ آپؐ نے دیکھا کہ مسجدِ نبوی کے ایک گوشے میں چند صحابہؓ بیٹھے ہوئے ہیں اور قرآن پڑھ رہے ہیں اور آپس میں سمجھ سمجھا رہے ہیں۔ گویا قرآن مجید

کا مذاکرہ ہو رہا ہے ۔ حضورؐ کے چہرۂ مبارک پر بشاشت کے آثار نمایاں ہوتے ۔ آپؐ ان کے پاس تشریف لاتے اور ان سے ایک عجیب سوال کیا ۔ آج آپ حضرات بھی یہ سوال اپنے آپ سے کیجئے اور پھر سوچیے کہ جو جواب صحابہ کرامؓ نے دیا تھا کیا وہ جواب ہم بھی اپنے قلب کی گہرائی سے دے سکتے ہیں ! سوال کیا تھا : " اَلَسْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؟ " "کیا تم اس بات کے گواہ نہیں ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں ، اور یہ کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے ؟" صحابہ کرامؓ کا جواب تھا : بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ۔ " یقیناً اے اللہ کے رسول" (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم بھی قلب کی گہرائی سے یہی گواہی دے سکیں ۔ اپنی زبان کی نوک سے تو ہم سب اس کی گواہی دیتے ہیں کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ، لیکن جب یہ گواہی ہمارے قلب کی گہرائی سے ابھرے تب ہے اصل گواہی جس کے لیے اقبال نے کہا ہے کہ ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں !

اور ع "دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی"

صلی اللہ علیہ وسلم ۔ بہر حال جب صحابہؓ نے یہ جواب دیا : " بلٰی یا رسول اللہ " تب حضورؐ نے فرمایا : " فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَهْلِكُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا " " تو اب خوشیاں مناؤ ۔ اس لیے کہ قرآن کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو ! اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہو گے اور نہ گمراہ " ـــــــ اب بتایئے کہ ان تین احادیث کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش ہے ! کیا حبل اللہ کا مفہوم قرآن مجید کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے ۔ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے بعد میرا یا کسی اور کا ، کُسے باشد ، یہ حق تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ حبل اللہ کا کوئی

دوسرا مفہوم بیان کر سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر معین فرمایا کہ حبل اللہ قرآن مجید ہے۔ علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں فارسی میں کہا ہے کہ ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کُن کہ حبل اللہ اوست

یعنی مسلمانوں کی حیاتِ ملی اور ہیئتِ اجتماعی کا کل دار و مدار قرآن پر ہے جس سے انہیں ایک قانون اور آئین میسر آتا ہے۔ ہم سب یعنی جملہ اعضائے جسدِ ملی تو خاک کے مانند ہیں، اس جسدِ خاکی میں قلب کی حیثیت قرآن کو حاصل ہے۔ پس اے مسلمان اسے مضبوطی سے تھام لے اس لیے کہ حبل اللہ یہی ہے!

پس ایک اور عملی نکتہ یہ ہوا کہ: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا! اللہ کی اس رسی یعنی قرآن مجید سے مضبوطی کے ساتھ چمٹ جاؤ ——— عربی میں عصمت کہتے ہیں حفاظت کو ——— اور اعتصام کے معنی ہوں گے اپنی حفاظت کے لیے کسی سے چمٹ جانا۔ کسی چھوٹے بچے کا تصور کیجئے۔ اگر کسی وقت اُسے کسی طرف سے کوئی اندیشہ ہو، خطرہ ہو، کوئی خوف ہو تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ بے اختیار اپنی ماں کی گود کی طرف لپکتا ہے اور اس کے سینہ سے چمٹ جاتا ہے۔ اس کے ذہن کی جو چھوٹی سی دنیا ہے اور اس کا جو چھوٹا سا پیمانہ ہے اس کے مطابق ماں کے سینہ سے چمٹ کر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں قلعہ میں آ گیا ہوں۔ اب مجھے پوری حفاظت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ کوئی شقی القلب انسان بچے کو ماں کی گود سے چھینے، اس کو اچھالے اور نیزے کی انی میں پرو دے، جیسا کہ قیامِ پاکستان کے فسادات کے وقت اور ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے سقوط کے سانحہ کے موقع پر عملاً ہو چکا ہے ——— بہرحال اعتصام کا مفہوم ہے حفاظت کے لیے کسی سے چمٹ جانا۔ چنانچہ فرمایا: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا۔ اس قرآن مجید کو، اللہ کی اس رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ اس کے ساتھ مل جل کر چمٹ جاؤ یا پورے کے پورے قرآن

کو تھامو، ادھورے کو نہیں۔ ادھورے کو تھامو گے تو وہی بات ہو جائے گی جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں یعنی "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" ــــ "کیا تم کتابِ الٰہی کے ایک حصّے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟" ــــ 'جمیعًا' کے لفظ میں یہ دونوں مفاہیم شامل ہیں کہ مل جل کر قرآن کو تھامو، اس سے چمٹ جاؤ اور یہ کہ پورے کے پورے قرآن کو تھامو، اس کے ایک حصّے اور جزو کو نہیں۔ اسی کو مؤکد کیا گیا یہ فرما کر کہ وَلَا تَفَرَّقُوْا۔ اور اس معاملہ میں تفرقہ میں نہ پڑ جانا۔

اس کے بعد اس دور سے جس میں قرآن مجید نازل ہو رہا تھا ایک تاریخی گواہی پیش کی گئی۔ ارشاد فرمایا: وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ "(اے مسلمانو) اور یاد کرو اللہ کا اپنے اُوپر احسان اور نعمت" ــــ خطاب کن لوگوں سے ہے اسے ذہن میں رکھیے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے مخاطب ہیں مہاجرین اور انصار ــــ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً "جب تم آپس میں دشمن تھے"۔ فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ "پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت پیدا کر دی"۔ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا۔ "پس اللہ کے انعام و اکرام سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے" ــــ مدینہ کے دو قبیلوں اوس اور خزرج میں بڑی پرانی دشمنی تھی جس کے نتیجے میں اسلام سے قبل ان میں بڑی خونی جنگیں ہوتی رہی تھیں۔ علاوہ ازیں عرب میں دوسرے قبائل میں بھی بات بات پر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ الغرض پورے عرب میں بدامنی تھی، صرف قریش کو امن حاصل تھا وہ بھی خانہ کعبہ کی بدولت، چونکہ وہ اس کے متولی تھے۔ ورنہ پورے عرب میں خانہ جنگی تھی۔ لوٹ مار، غارت گری اور بدامنی کا بازار گرم تھا۔ اوس اور خزرج کی جس دشمنی کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ایک سو سال سے چلی آ رہی تھی اور یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کی عداوت اور خانہ جنگی کی وجہ سے ختم ہو رہے تھے ــــ فرمایا کہ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں تشریف لائے۔ اس قرآن نے تمہیں آپس میں جوڑا، تمہیں بنیانِ مرصوص بنا دیا۔ ورنہ تمہاری کیفیت اور حالت تو یہ تھی: "وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ" "اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے تک جا پہنچے تھے"۔ اس میں گر کر تباہ ہو جانے والے تھے "فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا" "تو اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا"۔ بلکہ اس کی ترجمانی یہ ہو گی کہ گویا آگ کے اس گڑھے

سے نکال لیا۔ تم آدھے گر چکے تھے۔ اس نے تمہارا دامن پکڑ کر تمہیں کھینچ لیا۔ اس آیت کا اختتام ہوتا ہے اِن الفاظِ مبارکہ پر: "كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ" یعنی "اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو۔"

آگے بڑھنے سے پہلے اگر ہم اس آیۂ مبارکہ میں بیان شدہ تاریخی واقعہ کے حوالے سے ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لے لیں تو ایک جانب تو یہ حقیقت مزید مبرہن ہو گی کہ قرآن اللہ کا ابدی اور سرمدی کلام ہے جو اگرچہ نازل تو اب سے چودہ سو برس قبل ہوا تھا لیکن اس کی ہدایت و رہنمائی ہمیشہ کے لیے ہے۔ دوسری جانب ہمیں اس آئینۂ قرآنی میں اپنے موجودہ حالات کی سنگینی کا بھی کماحقہٗ اندازہ ہو سکے گا —— مزید برآں اس امید کی کرن بھی چمکے گی کہ جس طرح اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اُس وقت کی عرب قوم کی کایا پلٹ دی تھی اسی طرح ہمارے حالات میں بھی انقلاب آسکتا ہے بشرطیکہ ہم اس سہ نکاتی لائحہ عمل کو بالفعل اختیار کرلیں جو اِن آیاتِ مبارکہ میں سامنے آرہا ہے!

کون نہیں جانتا کہ پاکستان کا قیام دو قومی نظریئے کا مرہونِ منّت تھا، جس کی رُو سے پُورے برِعظیم ہند و پاک کے مسلمان ایک قوم تھے —— گزشتہ چالیس برس میں بجائے اس کے کہ اِس قوم میں اتحاد و یگانگت کا رنگ گہرا ہوتا اور پاکستان کے مسلمانوں کی یکجہتی پورے عالمِ اسلام کے مسلمانوں کے اتحاد کا پیش خیمہ بنتی، صورتِ واقعہ یہ ہے کہ خود پاکستان میں مسلمان قوم کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ بلکہ اس کی جگہ متعدد نسلی، لسانی اور صوبائی قومیتوں نے لے لی ہے اور صرف تشتت و انتشار ہی نہیں، باضابطہ قتل و خونریزی اور لوٹ مار اور آتش زنی کا بازار گرم ہے۔ اِن حالات میں کون سے تعجب کی بات ہے اگر ہمارے دشمن دائیں بائیں گِدھوں کی طرح منڈلا رہے ہیں۔ اِس لیے کہ خواہ ہم خود تو حال مست یا مال مست رہیں لیکن اغیار کو تو نظر آرہا ہے کہ ؏ "یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری!"

اِن حالات میں آدمی اپنے کاروبار میں اور اپنے ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ میں مطمئن اور بےفکر ہو کر اور پاؤں پھیلا کر مگن رہے اور حال اس شعر کے مصداق ہو جائے کہ "اب تو آرام سے گزرتی ہے ــــ عاقبت کی خبر خدا جانے" —— تو اس طرح وہ خطرات تو نہیں ٹل سکتے جو ہمارے

سروں پر منڈلا رہے ہیں اور ـــــ اگر ہم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلیں جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے اس سے خطرہ تو ٹل نہیں جاتا۔ اگر ہمارے یہی لچھن رہے کہ "اِنَّهٗ كَانَ فِىٓ اَهۡلِهٖ مَسۡرُوۡرًا" (الانشقاق: ۱۳) ہم اپنے اہل وعیال، اپنے کاروبار، اپنے عیش وآرام ہی میں مگن رہیں تو دوسری بات ہے لیکن اگر حالات کو چشم بصیرت سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس آیتِ مبارکہ کے یہ الفاظ، ہماری موجودہ کیفیات پر بالکل منطبق ہو رہے ہیں کہ "وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ"۔ اس لیے کہ جیسے کہ عرض کیا جاچکا ہے قرآن مجید ہمارے لیے ابدی رہنمائی لے کر آیا ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم میں تدبر کے نتیجہ میں ہر قسم کے حالات کیفیات اور واقعات کے لیے ہمارے سامنے عملی رہنمائی آجاتی ہے۔ جیسے ہم ختم قرآن کی دعا میں کہتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اجۡعَلۡهُ لَنَا اِمَامًا وَّ نُوۡرًا وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً "اے اللہ اس قرآن کو ہمارا امام بنادے، اسے ہمارے لیے نور بنادے، اسے ہمارے لیے رہنمائی بنادے، اسے ہمارے لیے رحمت بنادے" لیکن یہ صرف کہنے سے تو نہیں ہوگا۔ اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھامنا، اس قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر کرنا۔ یہ ہے اس لائحہ عمل کا دوسرا نکتہ جو ان آیاتِ مبارکہ کے مطالعہ کے حاصل کے طور پر ہمارے سامنے آیا ہے۔

گویا ـــ پہلا نکتہ ہے تقویٰ اور اسلام۔ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنا۔ طبعًا اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے بچنا بھی شامل ہے کیونکہ رسول کے احکام درحقیقت اللہ ہی کے احکام ہوتے ہیں اور رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے بمصداق ارشاداتِ ربانیہ: "مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ" (النساء: ۸۰) اور "وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ" (النساء: ۶۴) اور "اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ" (النساء: ۵۹) اور اسلام سے مراد ہے فرماں برداری۔ پوری زندگی میں اور ہر لمحہ، ہر لحظہ: وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ!

اور ـــــ دوسرا نکتہ ہے: اعتصام بالقرآن ـــــ "وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا" پورے قرآن کو مل جل کر مضبوطی سے تھامنا اور اس کے بارے میں تفرقہ میں نہ پڑنا۔ رہی یہ بات کہ "اعتصام بالقرآن" سے مراد کیا ہے تو الحمد للہ اس موضوع پر راقم کا

ایک کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" لاکھوں کی تعداد میں اردو، انگریزی، عربی، فارسی اور سندھی میں طبع ہو کر کم از کم عالمِ اسلام کے طول و عرض میں پھیل چکا ہے۔ جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد قرآن کے پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن پر اپنے ایمان اور یقین کو مزید گہرا اور پختہ کرے۔ دوسرے یہ کہ اس کی تلاوت کرے جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے، تیسرے یہ کہ اس کو سمجھے اور اس پر غور و فکر کرے جیسے کہ اس پر تدبر کا حق ہے۔ چوتھے یہ کہ اس پر عمل کرے، اپنی انفرادی زندگی میں فی الفور اور اس کے عطا کردہ قانون و آئین کے نفاذ اور نظامِ عدل و قسط کے قیام کی اجتماعی جدوجہد میں بھر پور حصہ لے کر، اور پانچویں یہ کہ اس کو دوسروں تک پہنچائے اور اس کے لیے بہترین مساعی کو بروئے کار لائے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمان اس طور پر قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کی تجدید کر لیں تو اس سے ان کے اندر ذہنی و جذباتی ہم آہنگی اور مقصد اور نصب العین کی یکجہتی پیدا ہو گی جس سے تشتت و انتشار کی موجودہ کیفیت کافور ہو جائے گی اور مسلمان از سرِ نو بنیانِ مرصوص بن جائیں گے — اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجائے گا کہ "اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ" (مسلمؒ عن عمرؓ)

یعنی "اللہ اس قرآن کا دامن تھامنے کے باعث قوموں کو سربلندی عطا فرمائے گا اور اس کو پسِ پشت ڈالنے والی قوموں کو ذلیل و خوار کرے گا" جس کی بہترین تعبیر علامہ اقبال نے اپنے الہامی اشعار میں کی ہے کہ ؎

خوار از مہجوریِ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

— یعنی اے امتِ مسلمہ درحقیقت تو قرآن سے دوری کے باعث ذلیل و خوار ہوتی ہے اس ضمن میں گردشِ دوراں کا شکوہ بے بنیاد ہے — اور اے وہ قوم جو زمین پر شبنم کے قطرہ

گری ہوئی ہے (جسے اغیار پامال کر رہے ہیں) تیری بغل میں اب بھی زندہ کتاب یعنی قرآن مجید موجود ہے۔

الغرض یہ ہیں وہ دو نکات جن پر عمل پیرا ہونے سے ایک انسان انفرادی طور پر ایک بندۂ مومن بنتا ہے اور پھر ان افراد کے مجموعے سے ایک مضبوط اجتماعیت وجود میں آتی ہے اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس اجتماعیت کے لیے لائحہ عمل کون سا ہے۔ تو اس کا بیان اگلی آیت میں آرہا ہے اور حسنِ اتفاق سے یہ اجتماعی لائحہ عمل بھی تین نکات ہی پر مشتمل ہے۔

نکتۂ سوم : اجتماعی لائحہ عمل

اب تیسری آیت پر اپنی توجہات کو پوری طرح مرکوز فرمایئے۔ آیتِ مبارکہ ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

اِس آیتِ مبارکہ پر غور و فکر کرنے سے قبل بطورِ مقدمہ ایک اہم بات ذہن نشین فرمالیں: ہم نے اب تک اِن دو آیات کا مطالعہ کیا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ..... الخ۔ اِن کے مطالعہ سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ یہاں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ ایک اجتماعیت کی متقاضی ہیں اور ان پر اگر خلوص و اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ واقعۃً عمل کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں لازماً ایک "اجتماعیت" وجود میں آتی ہے۔ اب آپ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اجتماعیت کس مقصد کے لیے درکار ہے؟ ظاہر بات ہے کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ آپ کوئی چھوٹی سی انجمن بناتے ہیں تو اس کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا غور طلب بات یہ ہے کہ "حبل اللہ" سے جڑ کر جو جمعیت وجود میں آئے گی اس کا مقصد کیا ہوگا؟

یہ ہے وہ بات جس کی اس آیت میں وضاحت فرمائی گئی کہ : وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

اس آیت کے دو ترجمے کیے گئے ہیں بعض کے نزدیک یہاں "مِنْ" بیانیہ ہے اور بعض کے نزدیک تبعیضیہ ہے۔ یہ دونوں لغوی اصطلاحات ہیں۔ ان پر فنی بحث کی بجائے ان سے ترجمہ میں جو فرق واقع ہوتا ہے اسے سمجھنا چاہیے۔ مقدم الذکر تاویل کے اعتبار سے ترجمہ یہ ہوگا: "تم سے ایک ایسی امت وجود میں آنی چاہیے"۔ اور اگر یہاں مِنْ کو تبعیضیہ سمجھا جائے تو ترجمہ ہوگا: "تم میں سے ایک ایسی امت بھی وجود میں آنی چاہیے"۔ میرے نزدیک یہ دونوں ترجمے صد فیصد درست ہیں۔ مسلمانوں میں اشتراک و اتحاد ہو اور وہ سب مل کر ایک امت بن جائیں جن کا کام کیا ہو — يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ یہ تو ہو جائے گی اس ترجمہ کی وضاحت کہ "تم سے ایک ایسی امت وجود میں آنی چاہیے جو یہ کام کرے" لیکن چونکہ اس مضمون کی آیت اسی سورۃ آل عمران میں آگے موجود ہے : كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط "تم سب امتوں میں سے بہتر ہو جو لوگوں کے لیے بھیجی گئیں۔ اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو"۔ لہٰذا اکثر مفسرین کی رائے میں یہاں 'مِنْ' بیانیہ نہیں بلکہ تبعیضیہ ہے۔ یعنی اگر صورتِ حال یہ ہو جائے کہ پوری امت سو گئی ہو، پوری امت کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ رہا ہو، پوری امت اپنے فرضِ منصبی کو فراموش کر چکی ہو تو اس صورت میں کیا ہونا چاہیے۔

آگے بڑھنے سے قبل بطور جملہ معترضہ ایک بات عرض کرنی ہے۔ بات اگرچہ تلخ ہے لیکن ہے امر واقعہ! اور وہ یہ کہ اگرچہ نظری طور پر ہم دنیا کے تمام مسلمانوں پر "امتِ مسلمہ" کے لفظ کا اطلاق کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت کوئی ایک "امتِ مسلمہ" اس وقت دنیا میں وجود نہیں رکھتی۔ فی الواقع یہاں بے شمار قومیں ہیں جن کو مسلم اقوام (MUSLIM NATIONS) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ علامہ اقبال کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ اس صدی میں وحدتِ ملی کا ان سے بڑا حدی خواں کوئی نہیں تھا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

اور

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

لیکن اِس صدی کے وحدتِ ملی کے سب سے بڑے حدی خواں یعنی علامہ اقبال کو بھی اپنے لیکچرز "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اِس وقت دنیا میں کوئی اُمتِ مسلمہ ایک اکائی اور اتحاد کے اعتبار سے موجود نہیں ہے —— بلکہ حقیقی یعنی DE-FACTO پوزیشن یہ ہے کہ "مسلمان اقوام" (MUSLIM NATIONS) موجود ہیں اور یہ بھی آج سے نصف صدی سے پہلے کی بات تھی۔ اغلباً علامہ کے لیکچرز ۱۹۳۰ء کے ہیں۔ اب تو صورتِ حال مزید خراب ہو کر نوبت بایں جا رسید کہ کسی مسلمان ملک میں ایک "قوم" (NATION) نہیں رہی بلکہ وہ بھی کئی قومیتوں کے اندر منقسم ہے۔ دنیا میں پاکستانی ایک قوم شمار کیے جاتے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ صوبوں کی بنیاد پر یہاں پانچ قومیتوں کے تصوّر کو شروع ہی سے اُبھارا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان بنگلہ قومیت کی بنیاد پر بنگلہ دیش بن گیا اور غیر بنگالی مسلمانوں کو وہاں تہ تیغ کیا گیا۔ پھر اس موجودہ پاکستان میں کوئی صوبہ بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس کے اندر صرف ایک قوم آباد ہے۔ کیا بلوچستان میں جہاں بلوچ ہیں وہاں بروہی نہیں ہیں! کیا وہاں پٹھان موجود نہیں ہیں، کم از کم تین بڑی قومیں اس ایک صوبے کے اندر بستی ہیں۔ یہی معاملہ پاکستان کے بقیہ صوبوں کا ہے —— !! اور تو اور ایک عربی زبان بولنے والے عرب نہ معلوم کتنی قومیتوں میں منقسم ہیں —— تو حقیقت یہی ہے اگرچہ بڑی تلخ ہے کہ آج "ایک اُمتِ مسلمہ" بالفعل موجود نہیں ہے۔ وہ تو ہمارا صرف ایک ذہنی تصور ہے کہ اُمتِ مسلمہ یا اُمتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام فی الواقع اپنا وجود رکھتی ہے اور اِس ذہنی تصور کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ جو بھی حضورؐ کا کلمہ پڑھتا ہے وہ حضورؐ کا اُمتی ہے! یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن غور کیجیے کہ کیا یہ اُمت مربوط ہے؟ کیا اس کی کوئی اجتماعیت ہے؟ کیا اِس میں کوئی ڈسپلن ہے؟ کیا اس میں کوئی کسی کا حکم سننے اور ماننے والا ہے؟ مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ایسی صورتِ حال موجود نہیں ہے۔ آج افغانستان میں روسی فوج افغانوں کا قتلِ عام کر رہی ہے لیکن کیا روسی فوج کے

ساتھ افغان فوج نہیں ہے؟ کیا وہ اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگ رہی اور اپنے ہاتھوں اپنے بھائیوں کے گلے نہیں کاٹ رہی؟ ایران اور عراق کی جو جنگ ہو رہی ہے کیا یہ مسلمان کہلانے والے دو ملکوں کی جنگ نہیں؟ ستم یہ ہے کہ عراق کی قریباً نصف آبادی اہلِ تشیع پر مشتمل ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ایران کی غالب اور عظیم ترین اکثریت اہلِ تشیع ہی کی ہے۔ لہٰذا مذہبی اعتبار سے عراق کی نصف کے قریب آبادی ایران کی ہم مذہب ہے لیکن سات سال ہونے کو آئے اور یہ جنگ تاحال جاری ہے اور دونوں اطراف سے شدید مالی و جانی نقصان ہو رہا ہے۔ دوسرے مسلم ممالک کی وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں جو اس جنگ کو بند کرانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ سُنیوں اور شیعوں کا جو مسلح خونیں تصادم لبنان میں ہوا وہ کسی اخبار بین شخص سے پوشیدہ نہیں ہے! وہ مظالم جو کبھی عیسائی ملیشیا نے مسلمانوں پر ڈھائے تھے، وہی مظالم شیعہ ملیشیا نے فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں پر ڈھائے ہیں۔

یہ تمام ہنگامے بتا رہے ہیں کہ ایک اُمّتِ مسلمہ بالفعل کہیں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ان حالات میں یہ آیت خوب سمجھ میں آتی ہے کہ جب پوری امت سوئی ہوئی ہو، یا مختلف قومیتوں میں بٹی ہوئی ہو یا اس نے مختلف سمتوں کی طرف اپنے اپنے قبلے بنا لیے ہوں تو ایسی صورت میں اس امت کے اندر کوئی چھوٹی امت لازماً ایسی وجود میں آنی چاہیے جو اس قرآنی ہدایت پر عمل پیرا ہو جو آیۂ زیرِ بحث میں بیان کی گئی ہے۔ وہ ہدایت کیا ہے؟ اس پر گفتگو ذرا آگے چل کر ہوگی۔ ہو سکتا ہے یہاں بعض لوگ چونکیں کہ یہ بڑی امت کے دائرے کے اندر "چھوٹی امت" کا کیا تصور ہے، آپ نے ریاست میں ریاست (STATE WITHIN STATE) یا PARTY WITHIN PARTY کی اصطلاح ضرور سنی ہوگی۔ جو لوگ میری عمر کے ہیں یا مجھ سے بڑے ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ کانگریس ایک بہت بڑی پارٹی تھی لیکن اس کا فارورڈ بلاک (FORWARD BLOCK) علیحدہ تھا، جو زیادہ انقلابی طرزِ فکر کے حامل لوگوں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے کانگریس میں شامل ہونے کے باوجود سبھاش چندر بوس کی قیادت میں اپنا جداگانہ بلاک بنا رکھا تھا۔ اسی طرح آج جو امّتِ مسلمہ ہے وہ محض ایک نظری حقیقت بن کر رہ گئی ہے، جس کی کوئی واقعاتی حقیقت نہیں ہے۔ تو اس بڑی امت میں ایک چھوٹی امت ایسے لوگوں پر مشتمل وجود میں آئے جنہوں نے کسی نہ کسی درجہ

میں اس سیڑھی پر قدم رکھا ہو جس کا حکم پہلی آیت میں آیا تھا۔ یعنی وہ لوگ دولتِ تقویٰ سے مالا مال ہوں ـــــ میں پھر عرض کر دوں کہ تکمیل کا کوئی دعویدار نہیں ہو سکتا۔ جو کمی ہو اسے پورا کرنے کی وہ مسلسل کوشش کر رہے ہوں ـــــ اور پھر یہ کہ انہوں نے دوسری آیت کا تقاضا بھی کسی قدر پورا کیا ہو یعنی انہوں نے اپنے آپ کو قرآن سے منسلک کر لیا ہو۔ اس طرح وہ باہم ایک دوسرے سے مل کر ایک اجتماعی طاقت وجود میں لائیں۔ اس اجتماعیت کا مقصد کیا ہو؟ اس کے لیے یہاں تین چیزوں کا تعین کیا گیا!

پہلا مقصد: "یَدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ" یعنی دعوت الی الخیر ـــــ نیکی اور بھلائی کی طرف لوگوں کو بلانا۔

دوسرا مقصد ـــــ نیکی اور بھلائی کا حکم: "وَیَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ" ـــــ

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خیر کی دعوت اور خیر کا حکم! کیا یہ ایک ہی چیز ہے جس کا اعادہ کیا جا رہا ہے؟ معاذ اللہ، قرآن مجید میں کسی ایک ہی مقام پر اس طرح کا اعادہ جو تکرارِ محض کے ضمن میں آئے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں ہمیں "دعوت الی الخیر" اور "امر بالمعروف" کے مصداق کا الگ الگ تعین کرنا ہوگا۔ غالب امکان یہ ہے کہ یہاں دعوت الی الخیر سے مراد قرآن کی طرف دعوت ہے۔ چونکہ قرآن کی رُو سے سب سے بڑا خیر خود قرآن مجید ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ یونس کی آیات ۵۷ اور ۵۸ میں قرآن مجید نے نہایت پرشکوہ اسلوب سے اپنی عظمت کو بیان کیا ہے۔ مؤخر الذکر آیت کے آخر میں قرآن اپنے متعلق کہتا ہے: "هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ" یعنی "یہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں وہ (قرآن) ان سب سے بہتر ہے"۔ قرآن مجید دنیوی دولت کو بھی خیر کہتا ہے مثلاً سورۃ العادیات میں فرمایا: "وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ" یعنی "انسان مال و دولت کی محبت میں بہت شدید ہے"۔ لیکن سورۂ یونس میں قرآن اپنے لیے کہتا ہے کہ جو کچھ بھی تم دنیوی مال و اسباب جمع کرتے ہو ان سب سے کہیں قیمتی شے خود قرآن ہے: "هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ"۔ یہاں دعوت الی الخیر سے مراد ہے قرآن مجید کی طرف دعوت! ـــــ اور امر بالمعروف اب عام ہو جائے گا۔ نیکی، بھلائی، خیر کی تلقین کرنا، اس کی وضاحت کرنا، اس کا مشورہ دینا، اس کا حکم دینا۔ "امر" کے لفظ میں یہ تمام مفاہیم موجود ہیں۔ پہلا امکان اور فرق تو یہ ہے۔

'دعوت الی الخیر' اور 'امر بالمعروف' کے مصداقات میں دوسرا فرق یہ ہے کہ دعوت میں تحکمانہ انداز بالکل نہیں ہوتا۔ دعوت میں صرف تلقین ہوتی ہے، نصیحت ہوتی ہے بلکہ خوشامد بھی ہوتی ہے کہ خدا کے لیے یہ کام بُرا ہے اسے چھوڑ دیجئے اور بھائی یہ کام اچھا ہے، آیئے اور اس کو کیجئے۔ اس انداز اور طریقہ سے آپ لوگوں کو بلاتے ہیں کہ اگر آپ یہ کام کریں گے تو آپ کو آخرت میں یہ اجر و ثواب ملے گا۔ دعوت کا درحقیقت یہی انداز ہوتا ہے۔ اس میں تحکمانہ انداز نہیں ہوا کرتا لہٰذا یہاں علیحدہ کر دیا گیا: "یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ" خیر کی طرف بلاؤ، بڑی نرمی سے بلاؤ، خیر خواہی کے جذبہ سے بلاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) سے فرمایا گیا تھا: "اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى" ۝ دونوں جلیل القدر پیغمبروں کو حکم دیا گیا کہ "فرعون کے پاس جاؤ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے" فرعون کون ہے! دشمن خدا اور خود خدائی کا مدعی۔ مگر حکم دیا جا رہا ہے کہ "لیکن اس سے نرم انداز سے بات کرنا (سختی کا انداز اختیار نہ کرنا) شاید کہ وہ نصیحت پکڑے اور اس کے دل میں بات اتر ہی جائے" (سورۃ طٰہٰ: ۴۳-۴۴) —— تو یہ ہے دعوت کا انداز لیکن اس سے آگے کا قدم ہے "امر بالمعروف" یعنی نیکی کا حکم دینا —— غور کیجئے کہ یہ اصطلاح سب سے پہلے کب وارد ہوئی! سورۃ الحج میں جب اہل ایمان کو تمکن فی الارض کی نوید سنائی گئی:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج: ۴۱)

یعنی "یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اگر ہم زمین میں تمکن عطا کر دیں (اقتدار بخش دیں) تو وہ نماز کا نظام قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے" —— یہاں حکم کا انداز ہے، نیکی کو قوت اور طاقت کے ساتھ رائج کرنا، نافذ کرنا —— یہ ہے در اصل دعوت سے اگلا قدم!

اب تیسری بات پر آیئے۔ جو بدقسمتی سے ہمارے بہت سے نیک لوگوں کے ذہن سے بھی آج بالکل خارج ہو چکی ہے۔ وہ بات ہے: "نہی عن المنکر" یعنی بدی سے روکنا —— ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس بھلائی کی تلقین سے کام چل جائے گا۔ صرف نیکی کا وعظ کہنے سے بات

بن جائے گی۔ حالانکہ میں قرآن مجید کے کم از کم نو ایسے مقامات کا حوالہ دے سکتا ہوں جہاں گاڑی کے دو پہیوں کی طرح یہ دونوں اصطلاحات بالکل ساتھ ساتھ اور جوڑے کی شکل میں آتی ہیں مثلاً: "وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ" یعنی نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو۔ (لقمان: ۱۷) بدی سے روکنا کتنا اہم ہے اس کو دو حدیثوں سے سمجھیے۔ میں وقت کی کمی کے باعث صرف مختصر تشریح پر اکتفا کروں گا ——— یہ دونوں مسلم شریف کی روایات ہیں، صحیح مسلم کا کتب احادیث میں کیا مقام ہے! اسے بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا مجھے یقین ہے کہ تمام ذی شعور مسلمان "صحیح مسلم" کے مقام و مرتبہ سے بخوبی واقف ہوں گے ———

پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مجھے توقع ہے کہ یہ حدیث آپ میں سے اکثر نے سنی ہو گی۔ لہٰذا اس کا تو صرف متن کے ساتھ ترجمہ کر دوں گا لیکن دوسری حدیث اس قدر زیادہ عام نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ اور فقہ حنفی دراصل فقہ عبداللہ بن مسعودؓ ہی ہے، اس لیے کہ امام ابو حنیفہؒ دو واسطوں سے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے شاگرد ہیں۔ لہٰذا درحقیقت انہی کی فقہی آراء ہیں کہ جنہوں نے فقہ حنفی کی شکل اختیار کی۔

پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت ابو سعید الخدریؓ۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ" "تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اُس پر لازم ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روکے یعنی طاقت سے بدل ڈالے"۔ "وان لم یستطع فبلسانہ" "لیکن اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو (اُس کے پاس قوت طاقت نہ ہو) تو اسے زبان سے روکے"، اس کی مذمت کرے، اس پر تنقید کرے گویا "زبان سے اُسے بدلنے کی کوشش کرے"۔ "وان لم یستطع فبقلبہ" "اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو" یعنی زبانوں پر بھی قدغنیں لگا دی گئی ہوں، زبانوں پر بھی پہرے ہوں تو "فبقلبہ" "پھر اپنے دل سے" یعنی کم سے کم دل میں ایک گھٹن تو محسوس کرے، قلب میں ایک کرب، صدمہ اور رنج کی کیفیت تو ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آخری کیفیت کے بارے میں فرمایا: "وذٰلک اضعف الایمان" "یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔

اب میں آپ سے اس حدیث پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔ دیکھیے! اس میں

پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ اس میں 'امر بالمعروف' کا ذکر موجود ہی نہیں ہے۔ سارا زور 'نہی عن المنکر' پر ہے۔ ایک اسلامی نظامِ حکومت کا فرض ہے کہ قوّت وطاقت کے ساتھ منکرات کو روک دے۔ لیکن اگر اسلامی نظامِ حکومت قائم نہیں ہے اور منکرات کو فروغ ہو رہا ہے تو بندۂ مومن پر واجب ہے کہ وہ ڈنکے کی چوٹ حق کی بات کہے، منکرات کے خلاف تنقید کرے، زبان وقلم سے اِن منکرات کو بدلنے کی سعی کرے۔ لیکن ایک شخص کمزور ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے منکرات کے خلاف آواز اٹھائی، زبان کھولی تو اوّل تو معاشرہ ہی میرا استہزا کرے گا، مذاق اُڑے گا پھر ہو سکتا ہے کہ حکومت وقت مجھے اس پر قید کر کے جیل میں ٹھونس دے۔ لہٰذا وہ زبان سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پاتا۔ لیکن وہ ان منکرات کے خلاف دل میں چبھن اور گھٹن محسوس کرتا ہے، اِن منکرات پر کڑھتا ہے تب بھی حضورؐ کے ارشاد کے بموجب اس کے دل میں ایمان ہے تو سہی لیکن ہے کمزور ترین ایمان۔ 'اضعف' افعل التفضیل کا صیغہ ہے یعنی ایمان کی کمزوری اپنی آخری حدوں کو چھو رہی ہے۔ چنانچہ اِسی مضمون کی دوسری روایت کے آخری حصّہ میں "وذلك اضعف الایمان" کے بجائے یہ الفاظ آئے ہیں کہ: "ولیس وراء ذٰلك من الایمان حبة خردل" یعنی اگر ان تین حالتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان موجود نہیں ہے ——— البتہ یہ تینوں کیفیتیں ایسی نہیں ہیں کہ جن کے لیے خارج میں آپ کوئی ضابطہ بنا سکیں بلکہ اس کا سارا معاملہ انسان کے اپنے ایمان ویقین پر ہے۔ اس کے اندر کتنا یقین (CONVICTION) ہے۔ اس کے اندر دین کے لیے کتنی غیرت او حمیت ہے! اس کا دار و مدار اس پر ہے۔ اس لیے کہ کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ماں کی گالی دی جائے اور وہ چُپ کھڑا رہے۔ اس کا یہ طرزِ عمل غمازی کرتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کے اندر جرأت وہمت نہیں ہے بلکہ غیرت وحمیت کا بھی فقدان ہے ——— لیکن کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ماں کی گالی دی جائے تو اگر اس میں ہمت نہیں ہے، مگر غیرت وحمیت موجود ہے تو کم از کم یہ لازماً ہو کر رہے گا کہ اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر آ جائے گا۔ وہ کچھ اور نہیں کر سکے گا تو اپنی جگہ کھڑا ہوا کانپنے لگے گا اور لرزے گا اور دل ہی دل میں انتہائی کرب، صدمہ اور رنج محسوس کرے گا۔ غیرت وحمیت کا کم سے کم تقاضا یہ تو ہم

ایک تسلیم کرے گا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو جائے، وہ تھرتھراتے اور دل میں کرب و اضطراب محسوس کرے اور اگر اس میں کوئی دَم بھی ہے، طاقت بھی ہے تو وہ اس شخص کو یونہی جانے نہیں دیگا جس نے اسے ماں کی گالی دی ہے۔

اس مثال سے آپ اس بات کو سمجھئے کہ جن میں اللہ کے دین کی زیادہ غیرت و حمیت ہوگی، وہ اپنی کمزوری کے باوجود ڈٹ جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیلوں میں ٹھونس دیئے جائیں گے یا پھر یہ کہ لاٹھیوں اور گولیوں کی بوچھاڑ سہنی پڑے گی۔ یا آخری درجہ میں جان کا نذرانہ دینا پڑے گا۔ اس زندگی کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں کھپا دیا جاتے سے ۱۰/۳/۹۵

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی! حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

حدیث کا آخری ٹکڑا "وذٰلك اضعف الایمان" یہ بتا رہا ہے کہ اصل مطلوب اور غیرت و حمیت دینی کا تقاضا یہ ہے کہ بدی کے خلاف طاقت فراہم کی جائے اور اس کا استیصال کیا جائے۔

اب دوسری حدیث کی طرف آیئے۔ یہاں اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور زیادہ نکھار کر بیان کیا ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ——— وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ما من نبیٍ بعثه اللہ فی امة قبلی" ——— یعنی "مجھ سے پہلے اللہ نے جس اُمّت میں کسی نبی کو مبعوث فرمایا" "اِلَّا کان له فی اُمّتهٖ حواریّون واَصحابٌ" "تو اس کی اُمّت میں اس کے حواری اور اصحاب ہوتے تھے" ——— حواری کا لفظ خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کے لیے آتا ہے جیسے: "قال الحواریون نحن انصار اللہ"۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لیے صحابہ یا اصحاب کا لفظ آتا ہے۔ حضورؐ نے یہاں دونوں الفاظ یعنی حواریوں اور اصحاب کو جمع کر لیا ——— وہ کیا کرتے تھے؟ "یأخذون بسنته ویقتدون بامره" "وہ اپنے نبی کی سنّت کو مضبوطی سے تھامے رکھتے تھے اور نبی علیہ السلام کا جو بھی حکم ہوتا تھا اس کی پیروی کرتے تھے" ——— "ثم انها تخلف من بعدهم خلوف" ——— "پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آتے تھے جو نالائق

اور ناخلف ہوتے تھے"۔ گویا ایک دو یا تین نسل تک تو معاملہ بڑی حد تک ٹھیک ٹھاک چلتا تھا۔ میں نے ایک دو نسل کیوں کہا! یہ بھی حضورؐ کی ایک حدیث میں آیا ہے۔"خیر اُمتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم"۔یعنی میری اُمت کا بہترین دَور میرا دَور ہے پھر ان لوگوں کا جو میرے اصحاب سے ملیں گے پھر ان لوگوں کا جو میرے اصحاب سے ملنے والوں سے ملیں گے۔ ان ادوار کو ہم" قرون مشھود لھا بالخیر" کہتے ہیں گویا حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کا زمانہ بہترین ہے۔ پھر دوسرے نمبر پر تابعین کا زمانہ ہے اور اس کے بعد درجہ ہے تبع تابعین کے عہد کا! ــــــ اب پھر حدیث زیر بحث کی طرف رجوع کیجئے، فرمایا:" ثم اِنَّھا تخلف من بعد ھم خلوفٌ "ایک ایک لفظ پر غور کیجئے ــــــ حضورؐ نے فرمایا" ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آجاتے تھے جو ناخلف اور نالائق ہوتے تھے" "یقولون مالا یفعلون" "وہ کہتے تھے جو کچھ کرتے نہیں تھے"۔ "ویفعلون مالا یؤمرون"۔" اور کرتے وہ کام تھے جن کا انہیں حکم نہیں ہوا تھا" ــــــ یہاں اشارہ بدعات کی طرف ہے گویا دین میں نئی نئی چیزیں ایجاد کرلی گئی ہیں، نئے نئے طریقے اختراع کرلیے گئے ہیں۔ یہ اصول پیش نظر رکھیے کہ جو بدعت بھی آئے گی وہ کسی نہ کسی سُنّت کو ہٹا کر اس کی جگہ لے گی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ بدعت آئے اور سُنّت رخصت نہ ہو ــــــ ان ناخلف اور نالائق جانشینوں کے متعلق حضورؐ نے بڑا خوبصورت اور جامع پیرایۂ بیان اختیار فرمایا۔ "یقولون مالا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون" ــــــ آگے بڑھنے سے قبل پہلے تو یہ غور کیجئے کہ ہم کس دَور میں ہیں! آیا ہم اُس دَور میں بس رہے ہیں جس کا ذکر پہلے کیا گیا یا اُس میں جس کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے۔ اب تو پندرہویں صدی ہجری شروع ہو چکی ہے۔ جبکہ دَور صحابہؓ کے بعد چوتھی ہی نسل سے بالکل ابتدائی درجے میں وہ بات شروع ہو چکی تھی ــــــ جس کے متعلق مشہور تبع تابعی، محدّث اور اپنے دَور کے عالم باعمل اور مجاہد فی سبیل اللہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنے اس شعر میں رہنمائی کی ہے:

وما افسد الدین الاّ الملوک ‌ ‌ ‌ ‌ واحبارُ سوءٍ ورھبا نُھا

یعنی دین میں جو خرابی بھی آتی ہے وہ تین اطراف سے آتی ہے ــــــ بادشاہوں کی طرف سے

علمائے سو یعنی بُرے علماء کی طرف سے اور بُرے صوفیوں کی طرف سے! ایک تو علماء حقانی ہیں جو واقعی اللہ کے دین کو عام کرتے ہیں۔ اس پر خود بھی چلتے ہیں اور لوگوں کو بھی چلاتے ہیں ۔ ایک وہ اللہ والے صوفیاء ہیں جو اللہ ہی کے راستے پر چلنے اور چلانے والے ہیں لیکن اس بازار میں تو ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ جہاں علماء حقانی ہیں وہاں علماء سوء بھی ہیں۔ جہاں دین و شریعت پر عامل صوفیاء ہیں وہاں دنیادار اور ظاہردار صوفی بھی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی تشخیص کے مطابق دین میں خرابی ان تین اطراف سے آتی ہے اور انہوں نے ان خرابیوں کا بنفسِ نفیس کسی قدر مشاہدہ کیا ہوگا جب ہی تو یہ تشخیص کی تھی۔ تو اندازہ کیجئے کہ ہم تو پندرہویں صدی میں بیٹھے ہیں تو خرابیوں کے اعتبار سے ہم کس مقام پر ہیں! ——— آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن" جو کوئی ایسے ناخلف لوگوں سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے پس وہ مؤمن ہے۔" ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن" اور جو ایسے لوگوں سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے پس وہ مؤمن ہے" ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن" اور جو ایسے نالائقوں کے خلاف اپنے دل سے جہاد کرے گا یعنی ان کے افعال پر اپنے دل میں کرب اور صدمہ محسوس کرے گا اور مضطرب اور بے چین رہے گا پس وہ ابھی مومن ہے ——— اور آخر میں حضورؐ نے فرمایا: "ولیس وراء ذٰلك من الایمان حبة خردل" اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد کے آخری حصے پر غور کیجئے! یہ لرزہ طاری کر دینے والی وعید ہے۔ اگر ان تین حالتوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے تو 'الصادق والمصدوق' شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم ایسے شخص کے ایمان کی نفی فرما رہے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہاں حقیقی ایمان کی نفی مراد ہے قانونی طور پر نفی نہیں ہے اور یہ دل کا معاملہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ دل اور نیت کے معاملات کے متعلق اس دنیا میں کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ فیصلہ تو آخری عدالت میں ہوگا، جس کے متعلق سورۃ التغابن میں فرمایا: "ذٰلك یوم التغابن" یعنی "آخرت کا دن ہے اصل ہار جیت کے فیصلے کا دن" ———

اس حدیث شریف کے ایک اہم نکتہ کی جانب توجہ کیجئے! ——— اس حدیث میں "ھم" کی ضمیر مفعولی انتہائی قابلِ غور ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان ناخلف جانشینوں کے خلاف

جہاد کی تاکید فرما رہے ہیں جو مسندِ اقتدار پر بیٹھ کر منکرات کو فروغ دے رہے ہوں، جن کے طور طریقے منکرات پر مشتمل ہوں، جو ذرائع ابلاغ کو منکرات کی تشہیر و اشاعت کے لیے استعمال کر رہے ہوں، جو ملک بھر میں ایسے تمام اداروں کی دامے، درمے، سخنے سرپرستی کر رہے ہوں، جو منکرات کے فروغ میں دن رات مصروف ہوں۔ جن کی مساعی کی بدولت معروفات معاشرہ میں سسک رہی ہوں اور وہ سنڈاس بن گیا ہو ـــــــ ساتھ ہی ان علماء سوء کے اور ان نام نہاد صوفیاء کے خلاف بھی جہاد کی تاکید اس حدیث میں تبعاً موجود ہے جو مسندِ افتاء وارشاد پر بیٹھے ان منکرات کو دیکھ رہے ہوں اور نہ صرف مہر بلب بلکہ اقتدار وقت کے اعوان وانصار بنے ہوئے ہوں

اُمّت کی وحدت اور نصبُ العین

سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۰ میں اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سند عطا فرمائی گئی ہے کہ "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہو!" ـــــــ گویا پوری اُمت مسلمہ کا مقصدِ وجود ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، اور اصلاً مطلوب یہ ہے کہ پوری اُمت ایک جسدِ واحد کے مانند ہو اور اس کا اجتماعی نصب العین ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بن جاتے، پھر یہ بھی جانی پہچانی حقیقت ہے کہ جہاں اجتماعیت میں زیادہ سے زیادہ اتحاد و یگانگت سے نصب العین کی جانب پیش قدمی میں مزید شدت و قوت پیدا ہوتی ہے، وہاں نصب العین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قلبی وجذباتی وابستگی بجائے خود اجتماعیت کو مزید تقویت و استحکام بخشنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اس طرح قدم آگے سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ مطلوبہ اور مثالی و معیاری کیفیت ہمیشہ برقرار نہیں رہتی۔ جیسا کہ خود اُمتِ مسلمہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ تین یا چار نسلوں تک تو یہ کیفیت برقرار رہی لیکن اس کے بعد نصب العین سے وابستگی میں ضعف پیدا ہونا شروع ہو گیا اور اس کے نتیجے میں اُمت کی وحدت اور یگانگت میں بھی دراڑیں پیدا ہونی شروع ہو گئیں۔ تا آنکہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُمتِ واحدہ

کا تصور تو صرف ذہنوں میں باقی رہ گیا ہے۔ بالفعل اس وقت دنیا میں ایک امّتِ مسلمہ کی بجائے بے شمار مسلمان اقوام اور قومیتیں موجود ہیں۔

قرآنِ حکیم چونکہ ایک ابدی ہدایت نامہ ہے، لہٰذا اس نے ایسی صورتِ حال کے لیے بھی پیشگی ہدایت عطا فرما دی تھی جو اسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۱۰۴ میں وارد ہوئی ہے، جس پر تفصیلی گفتگو صفحاتِ گزشتہ میں ہو چکی ہے اور جس کا خلاصہ اور لبِّ لباب یہ ہے کہ اس منتشر اور خوابیدہ اُمّت میں سے جو لوگ جاگ جائیں اور انہیں اپنے اجتماعی فرائض کا شعور و ادراک حاصل ہو جائے وہ باہم جمع ہوں اور مِل جُل کر اُس خیالی و تصوّراتی اور خوابیدہ و معطّل امّت کے دائرے کے اندر اندر ایک چھوٹی مگر فعّال اور منظّم اُمّت وجود میں لائیں جو اس اجتماعی نصب العین کی جانب پیش قدمی شروع کر دے۔ پھر جیسے جیسے نشانِ منزل نمایاں ہوتا جائے گا زیادہ سے زیادہ لوگ اس قافلے میں شامل ہوتے چلے جائیں گے اور وہ صورت عملاً پیدا ہو جائے گی کہ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر\
راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا!

تاآنکہ پُوری اُمّتِ مسلمہ کو اپنا بھولا ہوا سبق یاد آجائے گا اور وہ نقشہ بالفعل نگاہوں کے سامنے آجائیگا جس کا خواب نصف صدی پیشتر حکیم الاُمّت علّامہ اقبال مرحوم و مغفور نے دیکھا تھا یعنی:

آسماں ہوگا سحر کے نُور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی\
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی\
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجُود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے\
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

اب اصلاً تو ہمیں آگے بڑھ کر اس امر پر غور کرنا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نبوی طریقِ کار کیا ہے، اور اس کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکمتِ عملی اختیار فرمائی تھی۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک حکیمانہ قول کے مطابق جسے امام مالکؒ نے زندۂ جاوید

بنا دیا اس اُمّت کے آخری حصّے کی اصلاح اور تعمیر تو صرف اسی طریق پر ممکن ہے جس پر اس کے پہلے حصّے کی اصلاح ہوئی تھی —— لیکن اس سے قبل —— اُمّتِ مسلمہ کے اتحاد کی اہمیت اور اس کے اجتماعی نصب العین کی وضاحت کے ضمن میں امیرِ تبلیغ مولانا محمد یوسفؒ کی زندگی کی آخری تقریر سے نہایت اہم اور ایمان افروز اقتباس پیش کیا جاتا ہے تاکہ موضوع کی اہمیت مزید نکھر کر سامنے آجائے اور خاص طور پر یہ امر پوری طرح مبرہن ہو جائے کہ مسلمانوں کے اُمّت ہونے کی اہمیت کیا ہے جس کے لیے مولانا موصوفؒ نے دہلی اور اس کے گرد و نواح کے محاورے کے مطابق 'اُمّت پنا' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

واضح رہے کہ مولانا محمد یوسفؒ سلسلۂ تبلیغ کے بانی اور مؤسّس مولانا محمد الیاسؒ کے فرزند ارجمند اور ہر اعتبار سے خلف الرشید تھے اور انہوں نے اپنے والد بزرگوارؒ کے انتقال کے بعد جس طرح ان کے جاری کردہ مشن ہی کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اپنی قوتوں اور توانائیوں کی آخری رمق تک وقف کر دی تھی، وہ بہت سے دین کے خادموں اور اُن کی اولاد کے لیے قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ انہوں نے اپنے انتقال سے صرف تین دن قبل یعنی ۳۰ مارچ ۱۹۶۵ء کو بعد نماز فجر رائے ونڈ کے مرکزِ تبلیغ میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فرموداتِ شیخِ طریقت حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ

"دیکھو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی اس کے باوجود ضروری سمجھ کے بول رہا ہوں، جو سمجھ کے عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اُسے چمکائے گا، ورنہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے گا۔

یہ اُمّت بڑی مشقّت سے بنی ہے۔ اس کو اُمّت بنانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے بڑی مشقّتیں اٹھائی ہیں اور اُن کے دشمن یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اس کی کوششیں کی ہیں کہ مسلمان ایک اُمّت نہ رہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہوں، اب مسلمان اپنا اُمّت پنا (یعنی اُمّت ہونے کی صفت) کھو چکے ہیں۔ جب تک یہ اُمّت بنے ہوئے تھے، چند لاکھ ساری دنیا پر بھاری تھے۔ ایک پکّا مکان نہیں تھا، مسجد تک پکّی نہیں تھی۔ مسجد میں چراغ

تک نہیں جلتا تھا، مسجدِ نبویؐ میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلا ہے۔ سب سے پہلا چراغ جلانے والے تمیم داریؓ ہیں، وہ ۹ھ میں اسلام لائے ہیں اور ۹ھ تک قریب قریب سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ مختلف قومیں، مختلف زبانیں، مختلف قبیلے ایک اُمت بن چکے تھے۔ تو جب یہ سب کچھ ہو گیا اس وقت مسجدِ نبویؐ میں چراغ جلا، لیکن حضورؐ جو نورِ ہدایت لے کر تشریف لائے تھے وہ پورے عرب میں بلکہ اس کے باہر بھی پھیل چکا تھا اور اُمت بن چکی تھی۔ پھر یہ اُمت دنیا میں اُٹھی۔ جدھر کو نکلی ملک کے ملک پیروں میں گرے۔ یہ اُمت اس طرح بنی تھی کہ ان کا کوئی آدمی اپنے خاندان، اپنی برادری، اپنی پارٹی، اپنی قوم، اپنے وطن، اپنی زبان کا حامی نہ تھا۔ مال و جائیداد اور بیوی بچوں کی طرف دیکھنے والا بھی نہ تھا۔ بلکہ ہر آدمی صرف یہ دیکھتا تھا کہ اللہ اور رسولؐ کیا فرماتے ہیں۔ اُمت جب ہی بنتی ہے جب اللہ اور رسولؐ کے حکم کے مقابلے میں سارے رشتے اور تعلقات کٹ جائیں۔ جب مسلمان ایک اُمت تھے تو ایک مسلمان کے کہیں قتل ہو جانے سے ساری اُمت ہل جاتی تھی۔ اب ہزاروں لاکھوں گلے کٹتے ہیں اور کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اُمت کسی ایک قوم اور ایک علاقے کے رہنے والوں کا نام نہیں ہے بلکہ سینکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جُڑ کر اُمت بنتی ہے۔ جو کسی ایک قوم اور ایک علاقے کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے وہ اُمت کو ذبح کرتا ہے۔ اور اُس کے ٹکڑے کرتا ہے اور حضورؐ اور صحابہؓ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے۔ اُمت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہلے خود ہم نے ذبح کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی اُمت کو کاٹا ہے۔ اگر مسلمان اب پھر اُمت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں بھی مل کر اُن کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی۔ ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے، لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے باہم اُمت کے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم تمہارے ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی۔

مسلمان ساری دنیا میں اس لیے پِٹ رہا اور مر رہا ہے کہ اُس نے اُمت پنے کو ختم کر کے حضورؐ کی قربانی پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں یہ دل کے غم کی باتیں کہہ رہا ہوں۔ ساری تباہی

اس وجہ سے ہے کہ اُمت اُمت نہ رہی بلکہ یہ بھی بھول گئے کہ اُمت کیا ہے اور حضورؐ نے کس طرح اُمت بنائی تھی؟

اُمت ہونے کے لیے اور مسلمانوں کے ساتھ خدائی مدد ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں نماز ہو، ذکر ہو، مدرسہ ہو، مدرسہ کی تعلیم ہو۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قاتل ابنِ ملجم ایسا نمازی اور ذاکر تھا کہ جب اس کو قتل کرتے وقت غصہ میں بھرے لوگوں نے اس کی زبان کاٹنی چاہی تو اُس نے کہا سب کچھ کر لو، لیکن میری زبان مت کاٹو تاکہ زندگی کے آخری سانس تک میں اس سے اللہ کا ذکر کرتا رہوں۔ اس کے باوجود حضورؐ نے فرمایا کہ علیؓ کا قاتل میری اُمت کا سب سے زیادہ شقی اور بدبخت ترین آدمی ہوگا۔ اور مدرسہ کی تعلیم تو ابوالفضل اور فیضی نے بھی حاصل کی تھی اور ایسی حاصل کی تھی کہ قرآن پاک کی تفسیر بے نقط لکھ دی۔ حالانکہ انہوں نے ہی اکبر کو گمراہ کر کے دین کو برباد کیا تھا۔ تو جو باتیں ابن ملجم اور ابوالفضل اور فیضی میں تھیں وہ اُمت بننے کے لیے اور خدا کی غیبی نصرت کے لیے کیسے کافی ہو سکتی ہیں؟

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور اُن کے ساتھی دینداری کے لحاظ سے بہترین مجموعہ تھے۔ وہ جب سرحدی علاقے میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو اپنا بڑا بنا لیا تو وہاں کے کچھ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات آگئی کہ یہ دوسرے علاقے کے لوگ ان کی بات یہاں کیوں چلے۔ اُنہوں نے ان کے خلاف بغاوت کرائی۔ ان کے کتنے ہی ساتھی شہید کر دیئے گئے۔ اور اس طرح خود مسلمانوں نے علاقائی بنیاد پر اُمت پنے کو توڑ دیا۔ اللہ نے اس کی سزا میں انگریزوں کو مسلط کیا۔ یہ خدا کا عذاب تھا۔

یاد رکھو، میری قوم اور میرا علاقہ اور میری برادری یہ سب اُمت کو توڑنے والی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں اتنی ناپسند ہیں کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ جیسے بڑے صحابی سے اس بارے میں جو غلطی ہوئی (جو اگر دب نہ گئی ہوتی تو اس کے نتیجے میں انصار اور مہاجرین میں تفریق ہو جاتی) اس کا نتیجہ حضرت سعدؓ کو دنیا ہی میں بھگتنا پڑا۔ روایات میں یہ ہے کہ ان کو جنات نے قتل کر دیا اور مدینہ میں یہ آواز سنائی دی اور بولنے والا کوئی نظر نہ آیا۔

قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادہ
رمیناہ بسھم فلم یخط فوادہ

(ہم نے قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے اس کو تیر کا نشانہ بنایا جو ٹھیک اس کے دل پر لگا) اِس واقعہ نے ثابت کر دیا اور سبق دیا کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی اگر قومیت یا علاقے کی بنیاد پر امت پنے کو توڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کر رکھ دیگا۔

امت جب بنے گی جب امت کے سب طبقے بلاتفریق اُس کام میں لگ جائیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دے کے گئے ہیں اور یاد رکھو امت پنے کو توڑنے والی چیزیں معاشرت اور معاملات کی خرابیاں ہیں۔ ایک فرد یا طبقہ جب دوسرے کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرتا ہے اور اس کا پورا حق اس کو نہیں دیتا یا اس کو تکلیف دیتا ہے یا اس کی تحقیر اور بے عزتی کرتا ہے تو تفریق پیدا ہوتی ہے اور امت پنا ٹوٹتا ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ صرف کلمہ اور تسبیح سے امت نہیں بنے گی بلکہ جب بنے گی جب دوسروں کے لیے اپنا حق اور اپنا مفاد قربان کیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اور اپنے پر تکلیفیں جھیل کے اِس امت کو امت بنایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک دن لاکھوں کروڑوں روپے آئے۔ ان کی تقسیم کا مشورہ ہوا۔ اُس وقت امت بنی ہوئی تھی۔ یہ مشورہ کرنے والے کسی ایک ہی قبیلے یا ایک ہی طبقے کے نہ تھے بلکہ مختلف طبقوں اور قبیلوں کے وہ لوگ تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے اعتبار سے بڑے اور خواص سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے مشورے سے باہم طے کیا کہ تقسیم اس طرح پر ہو کہ سب سے زیادہ حضورؐ کے قبیلے والوں کو دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے قبیلے والوں کو، پھر حضرت عمرؓ کے قبیلے والوں کو۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اقارب تیسرے نمبر پر آئے۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ کے سامنے رکھی گئی تو آپ نے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ اس امت کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اور آپ کے صدقہ میں مل رہا ہے، اس لیے بس حضورؐ کے تعلق کو ہی معیار بنایا جائے۔ جو نسب میں آپ کے زیادہ قریب ہیں ان کو زیادہ دیا جائے۔

جو دوم، سوم، چہارم نمبر ہوں ان کو اسی نمبر پر رکھا جائے۔ اس طرح سب سے زیادہ بنی ہاشم کو دیا جائے، اس کے بعد بنی عبد مناف کو، پھر قصیٰ کی اولاد کو، پھر کلاب کو، پھر کعب کو، پھر مرّہ کی اولاد کو۔ اس حساب سے حضرت عمرؓ کا قبیلہ بہت پیچھے پڑ جاتا تھا اور اس کا حصہ بہت کم ہو جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے یہی فیصلہ کیا اور مال کی تقسیم میں اپنے قبیلے کو اتنے پیچھے ڈال دیا۔ اس طرح بنی تھی یہ اُمّت۔

اُمّت بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب کی یہ کوشش ہو کہ آپس میں جوڑ ہو، پھوٹ نہ پڑے۔ حضورؐ کی ایک حدیث کا مضمون ہے کہ قیامت میں ایک آدمی لایا جائے گا جس نے دنیا میں نماز، روزہ، حج، تبلیغ، سب کچھ کیا ہوگا، مگر وہ عذاب میں ڈالا جائے گا، کیونکہ اس کی کسی بات سے اُمّت میں تفریق ڈالی ہوگی۔ اُس سے کہا جائے گا کہ پہلے اپنے اس ایک لفظ کی سزا بھگت لے، جس کی وجہ سے اُمّت کو نقصان پہنچا۔ اور ایک دوسرا آدمی ہوگا جس کے پاس نماز، روزہ، حج وغیرہ کی بہت کمی ہوگی اور وہ خدا کے عذاب سے بہت ڈرتا ہوگا، مگر اس کو بہت ثواب سے نوازا جائے گا۔ وہ خود پوچھے گا کہ یہ کرم میرے کس عمل کی وجہ سے ہے۔ اس کو بتایا جائے گا کہ تُو نے فلاں موقع پر ایک بات کہی تھی جس سے اُمّت میں پیدا ہونے والا ایک فساد رُک گیا اور بجائے توڑ کے جوڑ پیدا ہو گیا۔ یہ سب تیرے اُسی لفظ کا صلہ اور ثواب ہے۔

اُمّت کے بنانے اور بگاڑنے، توڑنے اور جوڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے۔ یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور پھاڑتی بھی ہے۔ زبان سے ایک بات غلط اور فساد کی نکل جاتی ہے اور اس پر لاٹھی چل جاتی ہے اور پورا فساد کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک ہی بات جوڑ پیدا کر دیتی ہے اور پھٹے ہوئے دلوں کو ملا دیتی ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ زبان پر قابو ہو اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ بندہ ہر وقت اس کا خیال رکھے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ اس کے ساتھ ہے۔ اور اس کی ہر بات کو سُن رہا ہے۔

مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ ان میں پشتوں سے عداوت اور لڑائی چلی آ رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ پہنچے اور انصار کو اسلام کی

توفیق ملی تو حضورؐ کی، اسلام کی برکت سے ان کی پشتوں کی لڑائیاں ختم ہوگئیں اور اوس و خزرج شیر و شکر ہو گئے۔ یہ دیکھ کر یہودیوں نے اسکیم بنائی کہ کس طرح ان کو پھر سے لڑایا جائے۔ ایک مجلس میں جس میں قبیلوں کے آدمی موجود تھے، ایک سازشی آدمی نے اُن کی پرانی لڑائیوں سے متعلق کچھ شعر پڑھ کے اشتعال پیدا کر دیا۔ پہلے تو زبانیں ایک دوسرے کے خلاف چلیں، پھر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے۔ حضورؐ سے کسی نے جا کر کہا۔ آپؐ فوراً تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے ہوتے ہوئے تم آپس میں خون خرابہ کرو گے۔ آپ نے بہت مختصر مگر درد سے بھرا ہوا خطبہ دیا۔ دونوں فریقوں نے محسوس کر لیا کہ ہمیں شیطان نے ورغلایا، دونوں روئے اور گلے ملے اور یہ آیتیں نازل ہوئیں:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ "اے مسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنا چاہیے اور مرتے دم تک پورے پورے مسلم اور خدا کے فرماں بردار بندے بنے رہو۔" جب آدمی ہر وقت خدا کا خیال رکھے گا، اُس کے قہر و عذاب سے ڈرتا رہے گا اور ہر دم اُس کی تابعداری کرے گا تو شیطان بھی اُسے نہیں بہکا سکے گا اور اُمت پھوٹ سے اور ساری خرابیوں سے محفوظ رہے گی۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ــــــ

اور اللہ کی رسّی کو یعنی اس کی کتاب پاک اور اس کے دین کو سب مل کر مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو یعنی پوری اجتماعیت کے ساتھ اور اُمت ہونے کی صفت کے ساتھ سب مل جل کر دین کی رسّی کو تھامے رہو اور اُس میں لگے رہو اور قوم کی بنیاد پر یا علاقے کی بنیاد پر یا کسی اور بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو۔ اور اللہ کے اُس احسان کو نہ بھولو کہ اُس نے تمہارے دلوں کی وہ عداوت اور دشمنی ختم کر کے جو پشتوں سے تم میں چلی آرہی تھی تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی اور تمہیں باہم بھائی بھائی بنا دیا اور تم آپس میں لڑ لڑ کے دوزخ کے

کنارے پر کھڑے تھے بس گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو تھام لیا اور دوزخ سے بچالیا۔

شیطان تمہارے ساتھ ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جس کا موضوع ہی بھلائی اور نیکی کی طرف بلانا اور ہر برائی اور ہر فساد سے روکنا ہو ————

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

امت میں ایک گروہ وہ ہو، جس کا کام اور موضوع ہی یہ ہو کہ وہ دین کی طرف اور ہر قسم کے خیر کی طرف بلاتے۔ ایمان کے لیے اور خیر اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لیے محنت کرتا رہے۔ نمازوں پر محنت کرے، ذکر پر محنت کرے۔ برائیوں اور معصیتوں سے بچانے کے لیے محنت کرے اور ان محنتوں کی وجہ سے اُمت ایک اُمت بنی رہے "

(ماخوذ از "دو خطروں کا علاج" فرمودہ شیخ التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف ؒ ، شائع کردہ: افتخار احمد فریدی، سنبھلی گیٹ، مراد آباد۔ انڈیا)

ہر شخص محسوس کرسکتا ہے کہ اس تقریر کا ایک ایک لفظ دل سے نکلا ہے اور اس میں کسی تکلّف اور تصنّع یا آورد کا کوئی شائبہ موجود نہیں ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج ملّتِ اسلامیہ پاکستان کو سب سے زیادہ ضرورت اسی سبق کی نہیں ہے جو ان فرمودات میں سامنے آتا ہے! کاش کہ ملّت کے درد مند اصحابِ ثروت اس تقریر کو نہ صرف اُردو بلکہ پاکستان کی جملہ علاقائی زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں طبع کرا کے تقسیم کرائیں۔ 9/3/90

نہی عن المنکر کا نبوی ﷺ طریق کار

اب ذرا اپنی توجہ کو دوبارہ مرتکز فرما لیجیے صحیح مسلم ؒ کی اُن دو روایات کی جانب جن میں نہی عن المنکر یعنی منکرات اور سیّئات کے سدِّباب کا تاکیدی حکم بھی وارد ہوا ہے اور اس کے تین مراتب و مدارج کا بھی ذکر ہے۔ ان دونوں حدیثوں کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

(۱) "حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی کسی بُرائی کو دیکھے اُس کا فرض ہے کہ اسے ہاتھ سے (یعنی طاقت سے) روک دے، اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے (منع کرے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ پاتا ہو تو (کم ازکم) دل سے (نفرت کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے!"

(۲) "حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے کوئی ایسا نبی نہیں گزرا جسے اللہ نے کسی اُمّت میں مبعوث فرمایا ہو اور اس میں اس کے صحابی اور حواری پیدا نہ فرماتے ہوں جو اس کی سنّت کو مضبوطی سے تھامتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر (ہمیشہ ایسا ہوا کہ) اُن کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہو جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہ تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں ہوتا تھا۔ تو جس کسی نے ایسے لوگوں کے ساتھ ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے، اور جس نے زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے دل سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور اس کے بعد تو ایمان ایک رائی کے دانے کے برابر بھی موجود نہیں ہے!"

اب یہ امر تو ایسا ظاہر و باہر ہے کہ جس کے بارے میں کسی صاحبِ ایمان کو ذرّہ برابر شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اِن تینوں درجوں میں سے بلند ترین ہی کو اختیار فرمایا اور طاقت ہی کے ذریعے منکرات اور سیّئات کا فوری استیصال بھی کیا اور آئندہ کے لیے سدِباب بھی فرمایا لیکن سوال یہ ہے کہ آنحضورؐ نے طاقت کا یہ استعمال کس طریق پر کیا؟

اس سلسلے میں یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ حضورؐ نے طاقت کا استعمال اس طرح نہیں کیا کہ جب آپؐ نے دعوت شروع کی تو بیس پچیس سعید روحیں آپؐ پر ایمان لے آئی تھیں، ان کا ایک چھوٹا سا جتھہ بناتے اور انہیں حکم دیتے کہ رات کی تاریکی میں چھپ چھپا کر جاؤ اور کعبہ شریف میں رکھے ہوئے سارے بُت توڑ دو۔ ذرا غور فرمایئے کہ حضورؐ ایسا کر سکتے تھے یا نہیں؟ — یقیناً کر سکتے تھے اور عملاً یہ بالکل ممکن تھا اس لیے کہ وہاں کعبہ کی حفاظت کرنے کے لیے کوئی مسلح پہرہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جا کر صحابہ کرامؓ تمام بتوں کو توڑ سکتے تھے۔ یہ مکّہ میں سب سے بڑا منکر

تھا کہ نہیں ہے لیکن حضورؐ نے اسے برداشت کیا۔ کیوں کیا؟ اس لیے کہ صحیح طریق کار یہ ہے کہ پہلے ایک معتدبہ افراد کی ایک جمعیت فراہم کی جائے۔ فدائین اور تربیت یافتہ جاں نثاروں کی ایک جماعت تشکیل دی جائے۔ گویا ایک طاقت فراہم کی جائے۔ یہاں تربیت سے مراد عسکری تربیت نہ لے لیجئے گا۔ اس سے مراد ہے روحانی و اخلاقی تربیت جس کے لیے ہمارے دین کی اصطلاح ہے تزکیہ۔ ایک کام کرنے کے بعد اسے برقرار رکھنا اصل کام ہے۔ ایک مرتبہ کعبہ کے تمام بتوں کو توڑ دینا اصل کام نہیں ہے۔ توڑنے کے بعد توحید کا نظام برقرار رہے اور یہ کام سرانجام دینے والی طاقت قائم رہے۔ جب تک یہ شکل پیدا نہیں ہوگئی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ توحید کی بذریعہ قرآن زبانی دعوت و تبلیغ فرمائی۔ جو لوگ ایمان لائے انہیں منظم کیا۔ ان کی تربیت کی، ان کا تزکیہ فرمایا۔ ان میں قربانی اور ایثار کا مادّہ پیدا کیا۔ ان میں دین کے لیے تن من دھن لگا دینے کا ایک عزم مصمّم پیدا کیا۔ پھر ان کے اندر ایک ڈسپلن پیدا کیا کہ جو حکم دیا جائے مانیں۔ چنانچہ قریباً بارہ برس تک مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ تھا کہ مسلمانو! تمہارے ٹکڑے بھی کر دیئے جائیں تب بھی تمہیں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت خبّاب ابن ارت کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جارہا ہے لیکن مسلمانوں کو مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ کیا مسلمان بے غیرت تھے! معاذ اللہ۔ خاص طور پر جب میں یہ سوچتا ہوں تو مجھ پر جھرجھری طاری ہو جاتی ہے کہ حضرت سمیہؓ کو ابوجہل نے شہید کیا ہے اور کس طرح شہید کیا ہے! کس قدر کمینگی کے ساتھ انہیں ایذائیں پہنچائی ہیں ان کو جوان بیٹے کے سامنے ننگا کیا ہے۔ پھر مزید جو کچھ کیا ہے میرے قلم پر نہیں آسکتا۔ اور بالآخر جب شہید کیا ہے تو تاک کر انؓ کی شرم گاہ میں اس طرح برچھا مارا ہے کہ پشت سے آر پار ہوگیا تھا۔ یہ سب کچھ مجمع عام میں ہو رہا ہے اور اس وقت تک کم سے کم تیس چالیس مسلمان موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک ہزاروں بلکہ لاکھوں کے برابر تھا۔ سوچئے کہ کیا یہ تیس چالیس مسلمان معاذ اللہ بے غیرت تھے! ان لوگوں کو نظر نہیں آرہا تھا کہ ہماری ایک بہن جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والی ہے، اس کے ساتھ ابوجہل یہ بہیمانہ سلوک کر رہا ہے۔ اگر انہیں اجازت ہوتی تو کیا وہ ابوجہل کی تکا بوٹی نہ کر دیتے! لیکن اجازت نہیں تھی۔ کبھی سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آلِ یاسر جو تین افراد پر مشتمل گھرانہ تھا۔ حضرت یاسرؓ، ان کی اہلیہ حضرت سمیہؓ اور ان کے بیٹے عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہم،

ن پر ابوجہل نے جو مسلسل ستم ڈھا رکھا تھا تو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سامنے سے گزرتے تھے تو خود تلقین فرماتے تھے: اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِر فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ یعنی "اے یاسر کے گھر لنے والو! صبر کرو اس لیے کہ تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے" ------ حضورؐ نے قریباً بارہ برس تک یہ تربیت دی ہے۔ سوچیے کہ یہ تربیت کس بات کی تھی۔ اس بات کی کہ ایک طرف اپنے موقف پر ڈٹے رہو، قدم پیچھے نہ ہٹے لیکن دوسری طرف تمہارا ہاتھ نہ اُٹھے، بلکہ جھیلو اور برداشت کرو۔ اگر جان چلی جائے تو فہو المطلوب شہید ہو گئے تو فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ ادھر تمہاری آنکھ بند ہوتی اُدھر جنت میں داخلہ ہو گیا۔ سورۂ یٰسٓ تو آپ پڑھتے ہوں گے، وہاں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب رسولوں کی تصدیق کرنے والے شخص نے یہ کہا تھا: "اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ ۝" یعنی "سن لو کہ میں تو ایمان لاتا ہوں اس پر جو تم سب کا رب ہے!" تو فوراً انہیں شہید کر دیا گیا۔ قرآن مجید نے اس کا ذکر نہیں کیا، صرف جو نتیجہ نکلا اسے بیان کر دیا:

"قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّۃَ ؕ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ ۝" یعنی جیسے ہی شہید ہوئے جنت میں داخلہ کا پروانہ مل گیا اور انہوں نے کہا کہ کاش میری قوم کو میرے اس اعزاز کا علم ہوتا۔ کاش انہیں معلوم ہوتا کہ میں نے کتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ مجھے میرے رب نے حساب کتاب کے بغیر بخش دیا، میرے تمام گناہ معاف کر دیئے اور مجھے اعزاز و اکرام پانے والوں میں شامل فرمایا۔ تو جن لوگوں کو بھی شہادت نصیب ہو جاتے لاریب وہ اپنے مطلوب کو پا گئے۔

پس منکرات کا استیصال جو طاقت کے ساتھ ہے، قوت کے ساتھ ہے گویا "بیدہٖ" ہے، اس کا ایک PROCESS ہے، ایک طریقہ ہے۔ وہ طریقہ ہمیں سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے لینا ہو گا۔ وہ وقت بھی آیا کہ حضورؐ نے طاقت کو استعمال فرمایا اور آپؐ کے ہاتھ میں تلوار آئی۔ غزوۂ بدر میں سپہ سالار کون تھے! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! احد میں سپہ سالار کون تھا! میدانِ احد میں مورچہ بندی کون کر رہا تھا! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیکن طاقت کے استعمال کے مرحلے سے پہلے جو مراحل ہیں، انہیں ملحوظ رکھنا اور انہیں طے کرنا ضروری ہے۔ وہ مراحل ہیں کہ قرآن مجید کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے پہلے ایک جمعیت فراہم کی جائے۔ اس

ہیں وہ افراد شریک ہوں جو شعوری طور پر تقویٰ، اطاعت اور فرماں برداری کی روش اختیار کریں تکمیل کی بات نہیں ہے۔ تکمیل تو موت تک نہیں ہوگی۔ لیکن یہ تو ہو کہ فیصلہ کر کے ایک عزم مصمم کے ساتھ تقویٰ اور اسلام کی راہ پر چل پڑے ہوں: یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ ——— پھر وہ باہم جڑیں، باہم مربوط ہوں: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ——— پھر ان کی آپس کی محبت مثالی محبت ہو۔ وہ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ اور اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کا کامل پیکر ہوں اور ان کا حال یہ ہو: وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْکَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ۔ اور وہ اپنی جانوں سے اپنے مسلمان بھائیوں کی ضروریات کو مقدم رکھتے ہیں چاہے اپنے اوپر فاقے گزر رہے ہوں۔ ان کی محبتیں ایسی ہوں کہ ایک زخمی کراہ رہا ہے۔ جان نکلنے کے قریب ہے اور پکار رہا ہے العطش، العطش۔ پانی کا پیالہ ان کے پاس لایا جاتا ہے کہ دوسرے بھائی کی آواز آجاتی ہے العطش، العطش۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے میرے اس بھائی کو پانی پلاؤ ——۔ پیالہ وہاں پہنچتا ہے کہ تیسرے زخمی کی آواز آتی ہے العطش، العطش۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے میرے اس بھائی کو پانی پہنچاؤ۔ پیالہ تیسرے کے پاس پہنچتا ہے تو وہ اللہ کو پیارے ہو چکے۔ پیالہ دوسرے کے پاس واپس آتا ہے تو ان کا دم بھی نکل چکا ہوتا ہے۔ اب پیالہ پہلے زخمی کے پاس لایا جاتا ہے تو ان کی رُوح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی۔ ایک طرف یہ ایثار اور رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی یہ شان اور دوسری طرف یہ رویّہ اور کیفیت کہ: فَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا ——— سنو اور اطاعت کرو۔ (LISTEN AND OBEY) اگر یہ ڈسپلن نہیں تو یہ جماعت نہیں؛ MOB ہے۔ یہ حزب اللہ نہیں ہے، ایک ہجوم ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اقبال نے اسی فرق کو واضح کیا ہے ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں   عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں!

یہ ہجوم ہوتا ہے چاہے دو لاکھ کا مجمع ہو۔ کوئی نظم نہیں، کوئی ڈسپلن نہیں، کوئی کسی کا حکم سننے والا اور ماننے والا نہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ گویا سقراط و بقراط ہے۔ کوئی کسی کی بات سننے اور ماننے والا نہیں ہے۔ اس ہجوم سے کوئی مثبت اور نتیجہ خیز کام نہیں ہوتا۔ یہ کام اگر ہوگا تو صرف ایک منظم جماعت

کے ذریعے سے ہو گا۔

اسی بات کو نہایت تاکیدی اسلوب سے اس آیتِ مبارکہ میں فرمایا جا رہا ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ـــــــ تم میں سے لازماً ایک گروہ، ایک جماعت، ایک (چھوٹی) اُمّت ایسی ہونی چاہیے جس میں شامل لوگ خیر کی طرف دعوت دینے، پکارنے اور بلانے والے ہوں نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے ہوں ـــــــ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر زبان سے تو ہر وقت ہو سکتا ہے، صرف انسان کے اندر جرأت کی ضرورت ہے۔ جس بات کو حق اور صحیح سمجھے اسے بیان کرے۔ اسی لیے تو فرمایا گیا کہ: اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔ منکرات کے خلاف سلطانِ جائر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں افضل الجہاد کہا ہے اور اس دَور میں اصل سلطان عوام الناس ہیں جن کے ووٹوں سے اقتدار کسی پارٹی کے سپرد ہوتا ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال یہ "سلطانیٔ جمہور" کا زمانہ ہے۔ اس لیے جہاں نہی عن المنکر کا ایک رُخ اربابِ اقتدار کی طرف ہونا چاہیے وہاں اس سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ اس کا رُخ معاشرہ کی طرف ہونا چاہیے۔ اگر نہی عن المنکر سے پہلوتہی ہو گی، اعراض ہو گا تو اس کا دو کے سوا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا کہ یا بزدلی ہے یا بے حمیتی ہے باقی اور کوئی شکل نہیں ہو سکتی۔ مزید یہ بات بھی جان لیجئے کہ امر بالمعروف بہت آسان کام ہے۔ لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنا، نصیحت کرنا، اعمالِ صالحہ کے فضائل بیان کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اگرچہ ان کی بھی اہمیت ہے اور کون ہے جو اس سے انکار کرے گا، لیکن اس کے ذریعے سے کچھ لوگ صرف انفرادی طور پر نیکوکار بن جائیں گے۔ معاشرہ ہرگز تبدیل نہیں ہو گا جب تک منکرات کے خلاف اجتماعی سطح پر منظم محنت، سعی و کوشش، جدوجہد بلکہ خالص دینی اصطلاح میں جہاد نہ ہو، اور یہ واقعی مشکل اور جان جوکھوں کا کام ہے۔

لہٰذا اس جہاد کے لیے جس کے اعلیٰ مقام و مرتبہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد بالید یعنی طاقت کے ساتھ جہاد قرار دیا ہے: فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ۔ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ پہلے ایک جماعت تشکیل دی جائے جس میں شامل لوگوں میں ایک

طرف تقویٰ اور فرماں برداری کے اوصاف ہوں، دوسری طرف اعتصام وتمسک بالقرآن کا عمل ہو، اور تیسری طرف اس جماعت کے لوگ باہم نہایت محبت کرنے والے اور ایک دوسرے کے لیے ایثار کرنے والے ہوں۔ اور آخری بات یہ کہ سمع وطاعت کے نظم کے ساتھ ایک امیر کی اطاعت فی المعروف کو اپنے اُوپر لازم اور واجب بلکہ فرض سمجھنے والے ہوں ـــــ اس کام کے لیے جو جماعت درکار ہے اس کے اوصاف کی رہنمائی ہمیں اس حدیث سے ملتی ہے جو حضرت حارث الاشعریؓ سے مروی ہے اور جسے امام احمد ابن حنبل اور امام ترمذی رحمہما اللہ بالترتیب اپنی 'مُسند' اور اپنی 'جامع' میں لائے ہیں۔ حضرت حارث الاشعریؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ ـــــ "میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزام جماعت کا، سمع وطاعت کا، اور اللہ کی راہ میں ہجرت وجہاد کا۔" ایک دوسری روایت میں 'اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ' کے بعد الفاظ آئے ہیں: "اَللہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ" یعنی "اس کا حکم مجھے اللہ نے دیا ہے" یعنی میں تم کو یہ حکم اللہ کے حکم کی تعمیل میں دے رہا ہوں۔ اس حدیث میں 'ہجرت وجہاد' کی جو اصطلاحات آئی ہیں ان کے وسیع تر معانی ومفاہیم پر بعد میں گفتگو ہوگی۔ 9|3|90

موجودہ دور میں 'نہی عن المنکر بالید' کی عملی صورت

اب توجہ فرمایئے اس مسئلے کی جانب کہ اگر مطلوبہ اوصاف والی جماعت وجود میں آجاتے اور نہی عن المنکر باللسان یعنی زبان وقلم کے ذریعے منکرات کے خلاف جہاد کا حق ادا کیا جا چکا ہو تو اس کے بعد ہاتھ یا قوت سے نہی عن المنکر کے لیے کس طرح اقدام کیا جائے گا۔

اس کے جواب کے لیے پہلے مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرنا ہے ـــــ آج سے چند سال پہلے ۲۳ مارچ کا دن آنے والا تھا، جسے 'یوم پاکستان' کے نام سے ہر سال دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ میں ۲۳ مارچ سے چند دن پہلے عمرہ کے لیے جانے والا تھا کہ مجھے لاہور کے ایک گرلز کالج کی پرنسپل صاحبہ کا فون آیا کہ "آپ نے کبھی سوچا نہیں کہ ۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کو سڑکوں پر جوان لڑکیوں کی پریڈ ہوتی ہے اور اس کو دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ کے

مختلط لگے ہوتے ہیں۔ جوان لڑکیاں سینہ تان کر پریڈ کرتی ہیں۔ اس پر آپ نے کبھی کوئی نکیر نہیں کی؟ میں واقعی حیران ہوا کہ کیوں میری توجہ اس طرف نہیں ہوئی! میں نے اپنے آپ کو پہلے یہ "الاؤنس" دیا کہ میں نے آج تک کوئی پریڈ نہیں دیکھی۔ نہ میرے ہاں ٹی وی ہے کہ اس پر دیکھنے کا کسی طور موقع ملتا۔ لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اخبارات میں فوٹو تو چھپتے ہیں۔ وہ تو نظر سے گزرے ہیں۔ پھر مجھے افسوس ہوا کہ اتنے بڑے منکر کی طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا۔ میں دل ہی دل میں نادم ہوا۔ عمرہ کے لیے روانگی سے قبل حسب معمول مجھے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں جمعہ کی تقریر کرنی تھی۔ باغ جناح کے قریب ہی جی۔ او۔ آر (G.O.R) ہے۔ لہٰذا بہت سے اعلیٰ گورنمنٹ آفیسرز وہاں آتے ہیں۔ کنٹونمنٹ بھی زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ لہٰذا بہت سے اعلیٰ ملٹری آفیسرز بھی وہاں ہوتے ہیں ——— تو میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ خدا کے لیے جس کی بھی جناب صدر تک پہنچ اور رسائی ہے وہ یہ بات ان تک پہنچائے کہ یہ بہت بڑا منکر ہے۔ لڑکیوں کی پریڈ کرانی ہے تو قذافی اسٹیڈیم میں کرالیں۔ وہاں پریڈ دیکھنے صرف ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں جائیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ آپ بچیوں کو ملٹری ٹریننگ دیجیے، رائفل ٹریننگ دیجیے۔ جیسے گرلز کالجوں کے گرداگرد چہار دیواری ہوتی ہے اور عمارتیں باپردہ ہوتی ہیں تو ایسی چہار دیواری والے میدانوں میں بچیوں کو ٹریننگ دیجیے اور قذافی سٹیڈیم میں ان کی پریڈ کرائیے جس میں مردوں کا داخلہ بالکل ممنوع ہو۔ لیکن ہماری جوان بچیاں پریڈ میں سینہ تان کر چلتی ہیں، وہ جھک کر تو نہیں چلتیں، نہ وہ ادھیڑ عمر یا بوڑھی ہوتی ہیں۔ یہ بہت بڑا منکر ہے۔ میں اس تقریر کے بعد عمرے کے لیے چلا گیا۔ واپس آیا تو ۲۴ مارچ تھی۔ ۲۴ مارچ کو صبح کے روزنامے شائع نہیں ہوتے۔ مجھے ہوائی جہاز میں شام کے اخبار ملے۔ اکثر اخبارات میں اس خبر کا چرچا تھا اور انگریزی روزنامے کی تو پہلی سرخی یہ تھی

"WOMEN'S PARADE TOOK PLACE DESPITE THE LETTER OF MIAN TUFAIL"

اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میاں طفیل محمد صاحب نے بھی صدر ضیاء الحق صاحب کو اس بارے میں کوئی خط لکھا تھا لیکن میاں صاحب کے خط کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ پریڈ ہوئی اور ان لوگوں نے بغلیں بجائیں جو ہمارے ملک میں بے حجابی، بے پردگی اور فحاشی کے علمبردار ہیں۔ اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ اس بات کو چھاپا ——— گویا اس طرح ان سب دین دشمن افراد کا استہزا کیا

جو منکرات کو مٹانے اور معروفات کو فروغ دینے کے داعی اور علمبردار ہیں۔

اب یہ بات جان لیجئے کہ اگر ایک جماعت ایسی ہو کہ جو الیکشن کے لیے ووٹوں کی بھیک مانگتی نہ پھر رہی ہو اس لیے کہ اس طور پر تو معاملہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر ع مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج! ——— اوّلاً اگر اسلام کے نام پر الیکشن میں کامیاب ہونے والا ایک شخص بھی خراب نکل آئے تو پوری جماعت پر حرف آئے گا یا نہیں ہے ایک مچھلی پورے تالاب کو گندا کر سکتی ہے اور ایک کالی بھیڑ پورے گلے کو مشکوک بنا سکتی ہے۔ پھر یہ کہ جب آپ ووٹ مانگتے ہیں تو لوگوں کے غلط عقائد، غلط اعمال پر تنقید اور نکیر نہیں کر سکتے۔ لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم خلافِ اسلام کام کر رہے ہو، تم حرام خوریاں کر رہے ہو، تم خلافِ قانون کام کر رہے ہو چونکہ انہی سے تو آپ نے ووٹ لینے ہیں۔ لہٰذا آپ یہ باتیں نہیں کہہ سکتے۔ اب اس الیکشن کی اسلام کے حق میں آخری خرابی کی بات بھی سُن لیجئے۔ جب آپ بھی الیکشن میں اسلام کے نام پر ووٹ مانگیں گے اور کوئی دوسری جماعت بھی اسلام کے نام پر ووٹ مانگے گی تو دو اسلام ہو گئے یا نہیں ہے تین یا چار جماعتیں اسلام کے نام پر الیکشن میں حصّہ لے رہی ہوں تو تین یا چار اسلام ہو جائیں گے یا نہیں! ہمارے معاشرے میں فرقہ واریت جس شدّت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس کا سب سے بڑا سبب اسلام کے نام پر الیکشن لڑنا ہے۔ ہر گروہ اپنے مخصوص شعائر کا جن کا اسلام سے یا تو سرے سے کوئی تعلق نہ ہو یا اگر ہو تو محض فروعی ہو، اس طرح پروپیگنڈا کرے گا گویا یہی اصل اسلام ہے۔ عوام النّاس جن کی عظیم اکثریت اسلام کی تعلیمات سے ناواقف ہے وہ مزید انتشارِ ذہنی میں مبتلا ہوں گے یا نہیں ہے اور ہمارے خواص، بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ پہلے ہی سے دین کے معتقدات و اساسات کے بارے میں تشکیک و ریب میں مبتلا ہیں ان جماعتوں کا ساتھ دیں گے یا نہیں جو سیکولر (لادینی) ذہن کی حامل اور علمبردار ہیں۔ ۷۰ء کے الیکشن میں جس سے زیادہ FAIR الیکشن پاکستان میں تا حال کبھی نہیں ہوا یہ نتیجہ سامنے آچکا ہے یا نہیں ہے لہٰذا اس بات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ الیکشن کے راستے سے یہاں اسلام نہیں آئے گا۔ جو حضرات نیک نیتی سے سمجھتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اسلام آسکتا ہے اگر ان کی نیتوں میں واقعی خلوص و اخلاص ہے تو وہ لگے رہیں۔ خلوص و حسنِ نیّت کا وہ اللہ تعالیٰ کے

یہاں اجر ضرور پائیں گے۔ بشرطیکہ اخلاصِ نیت کے ساتھ وہ ان غلط کاموں سے اپنا دامن بچائیں جو الیکشن کا خاصہ بن گئی ہیں، جیسے جعلی ووٹنگ، ووٹوں کی خریداری، علاقائی، لسانی اور برادری کی عصبیتوں کو ابھارنا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی صورت میں ان کا اجر ضائع نہیں ہوگا لیکن ساتھ ہی اس کا بھی یقین ہے کہ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ قوتوں کا، صلاحیتوں کا، سرمایہ کا محض ضیاع ہوگا۔ اسلام اس راستہ سے آ ہی نہیں سکتا۔ اس الیکشن بازی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جماعتوں کے تحزب اور تخالف سے ملی اتحاد میں ایسے رخنے پیدا ہوتے ہیں کہ انتہائی کوشش کے باوجود ان کا بھرنا ممکن نہیں رہتا۔ یہ تحزّب و تخالف بسا اوقات دائمی نفرت اور عداوت کا رُخ اختیار کر لیتا ہے جس کی تباہ کاریوں سے کون ہے جو ناواقف ہوگا۔

پاکستان میں اسلام آئے گا تو اس طور پر کہ اگر کوئی ایسی جماعت ہے اور معتدبہ افراد پر مشتمل ہے کہ انفرادی طور پر اس کا ہر رکن تقویٰ اور اسلام کی روش پر کاربند ہونے کے لیے دل و جان سے کوشاں ہے۔ حبل اللہ یعنی قرآن مجید سے اس کا تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہر نوع کے فقہی اختلافات سے اس کا دامن محفوظ ہے۔ وہ ائمہ اربعہ اور محدّثین علیہم الرحمۃ کے فقہی اختلافات کو صرف تعبیر کا، استنباط کا اور راجح و مرجوح اور افضل و مفضول کا فرق سمجھتا ہے۔ وہ جماعت اقتدارِ وقت کو چیلنج کرے گی کہ منکرات کا کام ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے یہ ہماری لاشوں ہی پر ہوگا۔ منکرات وہ سامنے رکھے جائیں گے جن کے منکر ہونے پر کسی فقہی مکتبِ فکر کو اختلاف نہ ہو۔ سب اس کو منکر تسلیم کرتے ہوں۔ جیسے بے حیائی اور بے پردگی اور سودی نظامِ معیشت ——— یہ ہے اصل طریقِ کار۔ یہ ہے ایک مسلمان ملک میں "مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ" کے فرمانِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام پر تعمیل کی کوشش کیا آج لوگ اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کے لیے یہ سب کچھ نہیں کرتے ہیں یہ ایجی ٹیشن کیوں ہوتا ہے! یہ مظاہرے کیوں ہوتے ہیں! صرف سیاسی حقوق کے لیے یا صرف کسی دنیاوی سہولت کے لیے۔ لیبر یونینیں اپنی اُجرت بڑھوانے اور دوسری مراعات حاصل کرنے کے لیے مظاہرے کرتی ہیں یا نہیں ہے یہی ایجی ٹیشن اگر صرف دین کے لیے اور نہی عن المنکر کے لیے ہوں کہ یہ منکر کام ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے تو یہ طریقہ ان شاء اللہ پانسہ پلٹ کر رکھ دے گا۔

کامیابی کی لازمی شرط

بدامنی اور توڑ پھوڑ سے کُلّی اجتناب

البتہ اس کی شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ پُر امن ہو۔ یہ نہیں کہ آپ نے ٹریفک سگنل توڑ دیتے۔ ایک چلتی بس ٹھہرائی اور اس کے ٹائروں سے ہُوا نکال دی۔ اس سے کیا حاصل ہوا؟ ـــــ اس بس کے جو ساٹھ ستّر مسافر تھے ان کو آپ نے تکلیف پہنچائی۔ نہ معلوم کس کو کتنی دُور جانا تھا! یا سرکاری املاک اور خاص طور پر سرکار کے زیر انتظام چلنے والی بسوں کو آگ لگا دی۔ معاذ اللہ! وہ بس کسی غیر کی نہیں تھی۔ اس غریب قوم کی تھی جس کا ایک ایک بال بیرونی قرضوں میں بندھا ہوا ہے۔ آپ نے سرکاری املاک اور بسوں کو نقصان پہنچا کر اور جلا کر اس غریب قوم پر قرضوں کے بار میں مزید اضافہ کر دیا۔ حکومت یہ کرے گی کہ کوئی نیا غیر ملکی قرضہ لے گی اور اس نقصان کو پُورا کرے گی۔ نتیجہ! یہ کہ قوم قرضوں کے بوجھ تلے مزید دب جاتے گی۔ پھر پولیس کی کوئی لاری یا ٹرک آیا تو اس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ نتیجہ! یہ کہ پولیس والے جو آپ ہی کے بھائی بند ہیں، آپ کے خلاف مشتعل ہو گئے ـــــ اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو دیکھئے۔ بارہ برس تک مکّہ میں حضورؐ پر اور خاص طور پر آپؐ کے اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر تشدّد ہوا لیکن کسی نے ہاتھ تک نہیں اٹھایا۔ انہیں مارا گیا، ایک مومن خاوند و بیوی حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیّہؓ نہایت بہیمانہ طور پر شہید کر دیتے گئے۔ حضرت بلالؓ کو سفاکانہ طور پر مکّہ کی سنگلاخ اور تپتی زمین پر اس طرح گھسیٹا گیا جیسے کسی مردہ جانور کی لاش کو گھسیٹا جاتا ہے جس کو ایک سلیم الطبع شخص گوارا نہ کرے۔ حضرت خبابؓ کو دہکتے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا گیا۔ یہاں تک کہ ان کی کمر کی چربی اور خون سے انگارے ٹھنڈے ہوتے۔ لیکن کسی کو بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ الغرض ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جس کا مقصد یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ وہ جماعت منظّم ہو اور اس جماعت کے کارکن تقویٰ، اسلام اور اعتصام بالقرآن کی طریق پر کسی نہ کسی درجہ میں قدم رکھ چکے ہوں۔ اس کا عزم مصمّم کر چکے ہوں۔ وہ فقہی اختلافات میں الجھنے والے

نہ ہوں ـــــ وہ جماعت ایک امیر کے حکم پر حرکت کرتی ہو۔ رُکنے کو کہا جائے تو رُکیں اور بڑھنے کو کہا جائے تو بڑھیں۔ جب تک یہ شکل نہیں ہوگی اسلامی نظام آنے کا امکان پیدا ہوگا نہ منکرات کے خاتمے کی سبیل پیدا ہوگی۔

دو ممکن نتیجے: اس طریق پر عملی جدّوجہد کے دو ہی ممکن نتیجے نکل سکتے ہیں: پہلا یہ کہ حکومتِ وقت پسپائی اختیار کرے اور ہمارے مطالبات کو مان لے، منکرات ختم ہوں، ان کی جگہ معروفات لے لیں۔ اسی طرح درجہ بدرجہ منظّم مظاہروں کے ذریعہ سے پوری شریعت نافذ ہو جائے گی۔ چونکہ اربابِ اقتدار کو یہ اطمینان ہوگا کہ یہ جماعت اپنا اقتدار نہیں چاہتی بلکہ اس کا مقصود و مطلوب صرف اسلامی نظام ہے۔ چنانچہ انہی کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم و نافذ ہو جائے گا اور فہو المطلوب ـــــ یا دوسری شکل یہ ہوگی کہ حکومت مزاحمت کرے اسے اپنی انا اور وقار کا مسئلہ بنا لے اور مسندِ اقتدار یا ایوانِ اقتدار کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہو جو چاہے زبانی کلامی اسلام کے اور اس کے نظامِ عدل و قسط کے بڑے قصیدہ گو اور مدح سرا ہوں لیکن جن کے قلوب حقیقی نورِ ایمان سے خالی ہوں تو وہ مزاحمت کریں گے، تصادم ہوگا مظاہرین پر لاٹھی چارج ہوگا، گولیوں کی بوچھاڑ ہوگی، ان کو جیلوں میں ٹھونسا جائے گا، قید و بند کی تکالیف ہوں گی ـــــ ان سب کو اگر یہ جماعت پُرامن طریق پر جھیل جائے، وہ مشتعل نہ ہو یعنی وہ کوئی جوابی کارروائی نہ کرے، نہ جماعت کا کوئی رکن معافی نامہ اور توبہ نامہ لکھ کر جیل سے بچنے کی فکر کرے تو ان شاءاللہ پھر بھی دو نتیجے نکلیں گے۔ یا تو وہ جماعت اس راہ میں قربان ہو جائے گی، کچل دی جائے گی، تو آخرت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی کامیابی ہے بلکہ اصل کامیابی یہی ہے: ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ دوسرا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ اس جماعت کو اپنے ایثار و قربانی سے عوام النّاس کی عملی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں اور وہ پوری طرح اس کا ساتھ دیں۔ مزید برآں خود پولیس اور فوج بھی تو مسلمان بھائیوں ہی پر مشتمل ہے۔ ان کی عملی ہمدردیاں بھی اس جماعت کے ساتھ ہو جائیں گی۔ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پہلے تو شہنشاہ کے حکم پر پولیس اور فوج نے مظالم کی حد کر دی لیکن جب انقلابی جماعت کے ساتھ عوام النّاس کی اکثریت بھی شامل ہو گئی تو فوج نے گولیاں برسانے اور پولیس نے لاٹھی چارج اور اشک آور گولوں کی بوچھاڑ کرنے سے انکار کر دیا

جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تب ہی تو شہنشاہ ایران جیسے جابر شخص کو جس نے اپنے گرد اگرد ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے تقدس کا ہالہ بھی قائم کر رکھا تھا، اپنی جان بچا کر ملک سے فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ کم و بیش یہی صورتِ حال ۱۹۷۷ء کی نظامِ مصطفیٰ تحریک کے موقع پر پیش آئی بھٹو صاحب نے لاہور اور کراچی میں جزوی مارشل لاء نافذ کر دیا تھا۔ لیکن وہ وقت آیا کہ فوج نے مظاہرین پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ اِس صورتِ حال کی وجہ سے بھٹو صاحب کو جھکنا پڑا اور وہ قومی اتحاد کے اکابر سے مصالحت کی گفتگو پر آمادہ ہو گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور اس تصادم کا فائدہ کوئی دوسرا اٹھالے گیا۔

ایسی جماعت کے وجود اور مقاصد کے لیے جہاں ہمیں اِس آیتِ مبارکہ سے رہنمائی ملتی ہے کہ: "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" وہاں اس کے اصول و مبادی اور شرائط و اوصاف کے لیے رہنمائی اِس حدیث شریف سے ملتی ہے جو حضرت حارث الاشعریؓ سے مروی ہے۔ اس کا ترجمہ پھر سن لیجئے۔ حضرت حارث الاشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزامِ جماعت۱ کا، سمع۲ و طاعت۳ کا، اللہ کی راہ میں ہجرت۴ اور جہاد۵ کا ——— گویا اوّلاً جماعت درکار ہے، افراد نہیں، ہجوم نہیں، MOB نہیں۔ پھر جماعت بھی ڈھیلی ڈھالی نہیں، چار آنے کی ممبری والی نہیں، صدروں کی ٹانگیں گھسیٹنے والی نہیں بلکہ سمع و طاعت والی۔ پھر اس جماعت کے سامنے مقاصد کیا ہوں گے ؟ اللہ کی راہ میں "ہجرت" اور "جہاد" !

ہجرت اور جہاد کی ابتدا اور انتہا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اَيُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ "یارسول اللہ بہترین اور اعلیٰ ہجرت کون سی ہے"؟ آپ نے فرمایا: اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ "ہر اس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے رب کو پسند نہیں ہے"۔ گویا یہ ہے ہجرت کا نقطۂ آغاز۔ البتہ یہ نیت رکھنی ضروری ہے کہ اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے، اسے قائم کرنے کی جدوجہد کے لیے گھر بار، اہل و عیال، مال و منال یہاں تک کہ اپنے وطن کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دوں گا۔

یہ نیت ہر مسلمان رکھے۔ لیکن اگر آپ کی زندگی میں کوئی معصیت ہے اسے ترک کرنے کا فیصلہ کیجیے اسی لمحہ سے ہجرت کا عمل شروع ہو جائے گا۔ مزید برآں عوام تو عوام ہمارے اکثر اہلِ علم بھی اس مغالطہ میں ہیں کہ جہاد کے معنی جنگ کے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ہمارے دین کی ایک بڑی وسیع معانی اور مفاہیم رکھنے والی اصطلاح ہے۔ حضورؐ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ "یارسول اللہ بہترین جہاد کون سا ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا: اَنْ تُجَاھِدَ نَفْسَکَ فِی طَاعَۃِ اللّٰہِ "کہ تم اپنے نفس سے جہاد کرو اور اسے اللہ کا مطیع بناؤ۔" ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے: "اَلْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَہٗ": "حقیقی مجاہد تو وہ ہے جو اپنے نفس کی ناجائز خواہشات کے خلاف کشمکش کرے۔" تو جہاد یہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اسی جہاد کے اگلے مراحل ہیں غیر اسلامی نظریات، منکرات اور غیر اسلامی نظام کے خلاف کشمکش اور پنجہ آزمائی۔ اسی جہاد کی بلند ترین چوٹی ہے 'قتال فی سبیل اللہ'۔ لہٰذا دل میں یہ نیت رکھنی ضروری ہے کہ اے اللہ! وہ وقت آئے کہ صرف تیرے دین کے غلبہ کے لیے، تیرے کلمہ کی سربلندی کے لیے میری گردن کٹے۔ اس لیے کہ اگر یہ آرزو سینہ میں موجود نہیں ہے تو وہ ایک مومن کا سینہ نہیں ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے نہ تو اللہ کی راہ میں جنگ کی، نہ جنگ کی آرزو اپنے سینہ میں رکھی، نہ شہادت کی تمنا اپنے سینہ میں رکھی تو اگر اس حالت میں اسے موت آگئی تو "فَقَدْ مَاتَ عَلٰی شُعْبَۃٍ مِّنَ النِّفَاقِ" یعنی ایسا شخص یقیناً ایک نوع کے نفاق پر مرا ہے۔" یعنی حقیقی ایمان پر نہیں مرا۔ تو یہ ہے 'ہجرت و جہاد' ـــــ ہجرت شروع کہاں سے ہوئی؟ ترکِ معصیت سے اور کہاں تک جائے گی؟ ترکِ وطن تک۔ جہاد کہاں سے شروع ہوا؟ مجاہدہ مع النفس سے اور کہاں تک جائے گا؟ قتال فی سبیل اللہ تک ـــــ لیکن اس لائحہ عمل پر چلنے کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہے جو بیعتِ سمع وطاعت پر قائم ہو۔ البتہ اس کے ساتھ 'فی المعروف' کی شرط ہوگی یعنی یہ کہ یہ سمع وطاعت اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر ہوگی۔

خلاصۂ بحث

قصہ مختصر یہ کہ نہی عن المنکر کے اعلیٰ ترین درجے یعنی قوت و طاقت سے منکرات کے استیصال کا طریق کار وہ ہوگا جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا یعنی یہ کہ قرآن کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے ایک ایسی جماعت فراہم کی جائے اور تشکیل دی جائے جو اپنی استقامت سے، اپنے ثبات سے، اپنے صبر سے، اپنے ایثار سے، اپنی قربانی سے، اپنی باہمی محبت سے اور جماعتی طور پر ہجرت و جہاد سے اللہ کے دین کا بول بالا کرے، منکرات کا استیصال کرے۔ جو لوگ یہ کام کریں گے تو اس آیت کے آخر میں ان کو بشارت دی گئی: وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے" ـــــ ایسے موقع پر ہمیشہ دل سے دعا کیا کیجیے: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ـــــ اے اللہ ہمیں ان مفلحین میں شامل فرما جو تیرے بتائے ہوئے ان تمام راستوں پر عمل پیرا ہوں۔ ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اپنی انفرادی زندگیوں میں تقویٰ، اطاعت اور فرمانبرداری کی روش اختیار کریں۔ ہم قرآن سے نزدیک سے نزدیک تر ہوتے چلے جائیں۔ اس کے ساتھ ہمارا ذہنی و قلبی اور عملی تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔ اور اے اللہ! ہمیں ہمت دے کہ ہم ایک ایسی جماعت کی شکل اختیار کریں جو سمع و طاعت کی بنیاد پر قائم ہو اور جس کا مقصد صرف دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ آمین یا ارحم الراحمین!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تونے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا۔

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ٥

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد
بھگوان سٹریٹ
پرانی انارکلی لاھور

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

علماء و صلحاء کے کرنے کا اصل کام
اور عذاب الٰہی سے نجات کی واحد راہ

وَتَرٰى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٢﴾ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿٦٣﴾

المائدہ: آیات ۶۲-۶۳

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَاءِيلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٧٨﴾ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧٩﴾ تَرٰى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنفُسُهُمْ أَن سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُونَ ﴿٨٠﴾ وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلٰكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُونَ ﴿٨١﴾

المائدہ: آیات ۷۸ تا ۸۱

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿١١٦﴾

ہود: آیت ۱۱۶

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿١٦٥﴾

الاعراف: آیت ۱۶۵

عن أبي سعيد الخدريّ رضي الله عنه قال سمعتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «مَنْ رأى منكم منكرًا فليغيّره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان» رواه مسلم.

عن ابن مسعود رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «ما من نبيّ بعثه الله في أمّة قبلي إلّا كان له من أمّته حواريّون وأصحاب يأخذون بسنّته ويقتدون بأمره، ثمّ إنّها تخلف من بعدهم خلوف يقولون ما لا يفعلون ويفعلون ما لا يؤمرون، فمن جاهدهم بيده فهو مؤمن، ومن جاهدهم بقلبه فهو مؤمن، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن وليس وراء ذلك من الإيمان حبّة خردل» رواه مسلم.

عَن ابن مَسْعُودٍ رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «إنَّ أوَّلَ مَا دَخَلَ النَّقصُ عَلَى بَنِي إسْرَائيلَ أنَّهُ كَانَ الرَّجُلُ يَلْقَى الرَّجُلَ فَيَقُولُ: يَا هٰذَا اتَّقِ الله وَدَعْ مَا تَصْنَعُ فَإنَّهُ لَا يَحِلُّ لَكَ ثُمَّ يَلْقَاهُ مِنَ الْغَدِ وَهُوَ عَلَى حَالِهِ فَلَا يَمْنَعُهُ ذٰلِكَ أنْ يَكُونَ أكِيلَهُ وَشَرِيبَهُ وَقَعِيدَهُ فَلَمَّا فَعَلُوا ذٰلِكَ ضَرَبَ الله قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ، ثُمَّ قَالَ: ﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إسْرَائيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ تَرَى كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أنْفُسُهُمْ﴾ إلَى قوله ﴿فَاسِقُونَ﴾ ثُمَّ قَالَ: «كَلَّا وَالله لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَأْخُذُنَّ عَلَى يَدِ الظَّالِمِ وَلَتَأْطِرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أطْرًا وَلَتَقْصُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا أوْ لَيَضْرِبَنَّ الله بِقُلُوبِ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ» رواه أبو داود، والترمذى وقال: حديث حسن. هذا لفظ أبي داود. وَلفظ الترمذى قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لَمَّا وَقَعَتْ بَنُو إسْرَائيلَ فِى الْمَعَاصِي نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ فَلَمْ يَنْتَهُوا فَجَالَسُوهُمْ فِى مَجَالِسِهِمْ وَوَاكَلُوهُمْ وَشَارَبُوهُمْ فَضَرَبَ الله قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ وَلَعَنَهُمْ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ، فَجَلَسَ رسول الله صلى الله عليه وسلم وَكَانَ مُتَّكِئًا فَقَالَ: لَا وَالَّذِى نَفْسِى بِيَدِهِ حَتَّى تَأْطِرُوهُمْ عَلَى الْحَقِّ أطْرًا. قَوْلُهُ «تَأْطِرُوهم»: أىْ تَعْطِفُوهُمْ. «وَلَتَقْصُرُنَّهُ»: أىْ لَتَحْبِسُنَّهُ.»

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بنی اسرائیل میں جو اولین نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کسی دوسرے

سے ملاقات پر کہتا تھا: ”اے فلاں، اللہ سے ڈرو، اور جو کام تم کر رہے ہو اسے چھوڑ دو، اس لیے کہ وہ تمہارے لیے جائز نہیں ہے! لیکن پھر جب ان کی اگلے روز ملاقات ہوتی تھی تو اس کے باوجود کہ وہ شخص اپنی اُسی روش پر قائم ہوتا تھا یہ بات اس پہلے شخص کو اس کے ساتھ کھانے پینے میں شرکت اور مجالست سے نہیں روکتی تھی، تو جب انہوں نے یہ روش اختیار کی تو اللہ نے اُن کے دلوں کو بھی باہم مشابہ کر دیا۔“ اس کے بعد آپؐ نے آیاتِ قرآنی (سورۃ مائدہ ۷۸ تا ۸۱) ”لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ سے فَاسِقُوْنَ“ تک تلاوت فرمائیں اور پھر فرمایا: ”ہرگز نہیں! خدا کی قسم تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا اور بدی سے روکنا ہوگا اور ظالم کا ہاتھ پکڑ لینا ہوگا، اور اسے جبراً حق کی جانب موڑنا اور اس پر قائم رکھنا ہوگا ورنہ اللہ تمہارے دل بھی ایک دوسرے کے مانند کر دے گا اور پھر تم پر بھی اسی طرح لعنت فرمائے گا جیسے اُن پر کی تھی!“ اس حدیث کو روایت کیا امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے۔ متذکرہ بالا الفاظ روایتِ ابی داؤدؒ کے ہیں۔ روایتِ ترمذیؒ کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو (ابتدا میں) اُن کے علماء نے اُن کو اِن سے روکا لیکن جب وہ باز نہ آئے اور (اس کے باوجود) انہوں نے اُن کی ہم نشینی اور باہم کھانا پینا جاری رکھا تو اللہ نے ان کے دل بھی باہم مشابہ کر دیئے اور پھر ان پر داؤدؑ اور عیسٰی ابن مریم (علیہما السلام) کی زبانی لعنت فرمائی اور یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے تھے۔“ اس کے بعد آنحضورؐ اُٹھ کر بیٹھ گئے درآں حالیکہ اس سے قبل آپؐ ٹیک لگائے ہوئے تھے اور پھر آپؐ نے فرمایا: ”نہیں، اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب تک تم اُن کو حق کی جانب موڑ نہ دو گے (تمہاری ذمہ داری ادا نہ ہوگی)۔“ امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے! ■

عَنْ حُذَیْفَةَ رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: «وَالَّذِی نَفْسِی بِیَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَیُوشِكَنَّ اللهُ أَنْ یَبْعَثَ عَلَیْكُمْ عِقَاباً مِنْهُ ثُمَّ تَدْعُونَهُ فَلَا یُسْتَجَابُ لَكُمْ» رواه الترمذی وقال: حدیث حسن.

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

باہم لازم و ملزوم

ایک گاڑی کے دو پہیے یا ایک ہی تصویر کے دو رُخ

---

(۱) شانِ باری تعالیٰ —— النحل ۹۰

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

(۲) تقاضائے فطرت و حکمت —— لقمٰن ۱۷

يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝

(۳) شانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم —— الاعراف ۱۵۷

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ

(۴) شانِ صحابہ رضی اللہ عنہم —— التوبہ ۷۱

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ

(۵) کیفیتِ منافقین —— التوبہ ۶۷

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُم مِّن بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ

(۶) اُمت کا فرضِ منصبی —— آلِ عمران ۱۱۰

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(۷) اُمتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل کا نقطۂ عروج —— آلِ عمران ۱۰۲تا۱۰۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

(۸) اصحابِ اقتدار کا فرضِ عین —— الحج ۴۱

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ

(۹) سرفروش اور جانباز اہلِ ایمان کے اوصاف کا ذروۂ سنام —— التوبہ ۱۱۱،۱۱۲

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ

الرَّاكِعُونَ السَّاجِدُونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

سات دن، سات راتیں

کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

تربیت اور وہ بھی نظریاتی!

ہم نظریئے کی بات کرتے ہیں' وہ ہے کہاں؟
ذکر تنظیم اسلامی کی ایک تربیت گاہ کا

—— اقتدار احمد

مادہ پرستی کے اس دورِ پُرفتن میں مادیت کا دجّال ہمارے دماغ کی دنیا اور سوچ پر ہی حکمران نہیں' دل کی پہنائیوں میں بھی امنگوں آرزوؤں کی شکل میں گھر کر گیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا وہی معجزوں کی بارش برساتا اور دنیاوی آسائشوں کی چکا چوند سے نگاہوں کو خیرہ کرنے والا کانا دجّال' جس کی پیشانی پر اسباب و وسائل پر تکیہ کرنے سے عبارت صرف ایک آنکھ ہے کیونکہ روح کا خانہ تو خالی ہو چکا جو مسببُ الاسباب اللہ کے رہنے کی جگہ ہے۔ کیا آج ہم میں سے کسی کو یہ دماغ ہے' اتنی فرصت میسر ہے کہ تنہائی کا موقع نکالے اور اپنے من میں ڈوب کر اس بات کا سراغ پانے کی کوشش کرے کہ خالقِ کون و مکاں نے مجھے عمر کی مہلت دے کر اس دنیائے فانی میں کیوں بھیجا۔ چار دن کی جو عمرِ دراز میں مانگ کر لایا ہوں' اس کے دو دن آرزو میں اور دو دن انتظار میں ہی گزر جائیں گے یا اگلی منزل کے لئے زادِ راہ بہم پہنچانا بھی میرا دردِ سر ہے اور انہی چار دنوں میں اس کا بھی کچھ انتظام کرنا ہے۔

افراد ہی کے اس جنجال سے آزاد نہیں' ہماری اجتماعیت... جماعتیں' گروہ اور ادارے... بھی بے مقصدی کے مزے لوٹ رہے ہیں اور کیوں نہ ہو جب من حیثُ القوم ہم قلندرانہ بے نیازی کا رویہ اپنا چکے تو دُور کی بات سوچنے کی زحمت کیوں کی جائے۔ ہمارے رہنماؤں' دانشوروں' سیاسی لیڈروں اور صحافیوں میں سے جو اٹھتا ہے' نظریہ کی گردان اس کی نوکِ زبان اور موئے قلم پر ہوتی ہے اور نظریۂ پاکستان تو ہمارا تکیۂ کلام ہے۔ ملکِ خداداد کا ایک نظریاتی ریاست ہونا بھی گویا ایک امرِ مسلّمہ ہے لیکن نظریہ ہے کس چڑیا کا نام' ہم بھولی بھالی بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ عملاً ہمارا کسی نظریہ سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہم سے زیادہ غیر نظریاتی لوگوں کے ہجوم بھی دنیا میں ضرور موجود ہیں' بے غل و غش موج اُڑاتے ہیں لیکن وہ کسی نظریہ کا ڈھول بھی تو نہیں پیٹتے۔ آج چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھئے' کیا کہیں نظریۂ پاکستان کی شرح بھی کی جاتی ہے' کسی مجلس میں اس بات پر بھی غور ہوتا ہے کہ اسلام کے جن اعلیٰ و ارفع نظریات سے وابستگی کا دم ہم بھرتے ہیں' وہ کیا ہیں اور ان کے کچھ تقاضے بھی ہیں کہ نہیں۔

دستورِ زمانہ تو یہی ہے کہ نظریات کو زبانی جمع خرچ کے لئے چھوڑ کر مطلب کی بات کی جائے اور

بزعمِ خویش نظریاتی جماعتوں نے بھی اپنے
ں کی نظریاتی تعلیم و تربیت کو سیاسی مہمات
نت چڑھا دیا لیکن کسی بھی انقلابی تحریک کے
ں کا نظریہ ہی اس کا سرمایہ اور اصل پونجی ہے
مرے جھمیلوں میں پڑ کر اگر گم کر دی جائے
یک انقلابی نہیں رہتی، روحِ انقلاب پر ایک
ن جاتی ہے اور آخر کار کسی عصبیتِ جاہلیہ کا شکار
ایک نئے فرقہ کے انڈے بچے چھوڑ مرتی ہے
روں سے ہمیں کیا غرض، عالمِ اسلام میں اٹھنے
لثر تحریکیں اسی انجام سے دوچار ہوئیں اور ہم
سلامی تحریکوں کے مقدر میں بھی یہی لکھا
ہوتا ہے۔ تاہم یہ غارت گر بلا آسمان سے نازل
وا کرتی، جب نظریات کا شعور مدہم پڑنے لگے
، پاؤں آ کر کارکنوں بلکہ قیادت کو بھی دبوچ

٭٭٭

ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیمِ اسلامی اپنی مخصوص
نظیمی اور انقلابی دعوت کے باعث بہت سے
ں کے دلوں میں کھٹکتی تو بہت ہے لیکن خود
صاحب اور ان کے رفقا اپنی جماعت کی عددی
کے بارے میں کسی زعم کی ابتلا میں نہیں پڑے
ں پر اللہ تعالے کا شکر بھی بجالاتے ہیں۔ کیا یہ
یب سی، نئی نئی سی نہیں لگتی کہ تنظیمِ اسلامی
میر کی دعوت کو کسی بھی درجے میں پذیرائی
والوں کی اپنی جماعت میں "جوق در جوق"
ت کی خواہاں نہیں۔ انہیں سرپرست، رکن،
متفق اور کارکن کے خانوں میں بانٹ کر زیادہ
یادہ رعائتیں دیتے ہوئے ساتھ رکھنے کی بجائے
پنے وابستگان بلکہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر بیعتِ
طاعت تک کر لینے والوں کو بھی تعلیم و تربیت
ھلنی سے گزارتی ہے۔ دراصل لوگوں کے
کو گھیر گھار کر کوئی سیاسی فائدہ اٹھانا مقصود ہی

نہیں، پروگرام تو احیائے اسلام اور غلبۂ دین کے لئے ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈالنے کا ہے، جس کے نقوش نسلِ انسانی کے عظیم ترین اور منفرد و مثالی انقلاب کے قائد، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی تاریخ کے اوراق پر ثبت کر گئے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے دورِ مکی کے دس برس میں ایک سو سے کم کم انقلابی تیار کئے لیکن نظریئے سے وابستگی اور فکر کی پختگی میں ایک سے بڑھ کر ایک۔ یہی گنے چنے افراد اسلامی انقلاب کی وہ مضبوط بنیاد بنے جس پر اگلے تیرہ برسوں میں غلبہ و اظہارِ دینِ حق کی رفیع الشان اور عدیم المثال عمارت کھڑی ہو گئی۔ قدسیوں کی اس جماعت کو حضورؐ کی عملی و نظریاتی تربیت کا فیض ہی تو میسر تھا۔

الحمد للہ کہ اسی کی توفیق اور تائید کا ایک مظہر انہی دنوں سامنے آیا۔ تنظیمِ اسلامی نے قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک سات روزہ نظریاتی تعلیم و تربیت کے تجدیدی نصاب —— (Refresher Course) کی کامیاب تکمیل کی۔ اس میں دور و نزدیک سے لگ بھگ دو سو ایسے رفقائے تنظیم شریک تھے جو نظم کی پابندی کا ابتدائی امتحان پاس کر چکے ہیں اور تنظیم کی ریڑھ کی ہڈی (Hard Core) بنیں گے۔ انہی لوگوں میں سے جماعت کو چلانے کے لئے نظامت و قیادت کی صفیں (Cadres) تیار ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ اس تربیت گاہ میں شرکت کے اہل سب رفقا ان مقررہ دنوں میں علائقِ دنیوی سے اپنے آپ کو کاٹ کر آنے کے قابل نہ ہو سکے تاہم یہ چکی تو اب چلتی رہے گی۔ جو اِس بار نہیں آسکے، وہ اگلی دفعہ آئیں گے اور نصاب کی تکمیل کر کے جانے والوں کو بھی تو بار بار سبق دُہرانے اور پکانے کے لئے لوٹ کر آنا ہو گا۔ سات دنوں کے لئے معمولاتِ زندگی کو ترک کر کے،

گھر بار کی ذمہ داریوں اور سہولتوں سے دست کش ہو کر اور اپنی ملازمتوں یا کاروبار کی بساط کو تہہ کر کے ”نظریاتی کاروبار“ کے لئے نکل کھڑے ہونا آسان تو نہیں کہ وقت ہی آج کل سب سے بڑی سرمایہ کاری ہے۔ پھر جس بُلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آنے والے آئے ہیں، ان کے لئے یہاں کشش بھی کون سی تھی؟۔ نہ سرکار دربار تک رسائی کی کوئی امید، نہ کسی دنیاوی منفعت کا لالچ، نہ اقتدار پر جھپٹا مارنے کے کسی منصوبے میں شرکت کا موقع، نہ شان و شکوہ کا مظاہرہ، نہ سیاسی یا سماجی چودھراہٹ کا امکان اور نہ کوئی واہ وا۔ پھر پروگرام میں بھی ”دلچسپی“ کا کوئی سامان نہیں۔ مسجد کے ہال میں کلاس روم کا ماحول، دماغ کو چاٹ دینے والی اور اعصاب کو تھکا دینے والی تدریس، نیندیں اڑا دینے والی دعوتِ غور و فکر، طویل نشستیں اور آرام کے وقفے میں بھی اضافی مطالعے کے ”ہوم ورک“ کے ساتھ ساتھ ”ہم سبق“ دوستوں سے زیرِ بحث موضوع پر تبادلۂ خیال۔ یہ کوئی ہلکی پھلکی برائے نام تربیت گاہ نہیں، صحیح معنوں میں نچوڑ کر رکھ دینے والی کٹھالی... نچوڑی کھیر تھی۔

تربیت گاہ کے شرکا میں واجبی تعلیم رکھنے والوں سے لے کر برطانوی اور امریکی جامعات سے پوسٹ گریجویٹ اور پی ایچ ڈی تک کی ڈگریوں والے شامل تھے۔ تنظیم اسلامی کی انقلابی دعوت کسی دھوم دھڑکے اور شور شرابے کے بغیر خاموشی سے جس طرح اثر و نفوذ کر رہی ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو ایک نظر اس نظریاتی تجدیدی نصاب کے لئے سفر و حضر

یہ نظریاتی تجدیدی نصاب تنظیمِ اسلامی کے اُن رفقاء کے لئے تھا جو نظم کی پابندی کا ابتدائی امتحان پاس کر چکے ہیں

میں آٹھ نو دن کھپانے والوں کی تفصیل د[یکھئے]۔ پشاور اور گردونواح سے ۱۴، باجوڑ جیسے دور اف[تادہ علاقے] سے ۳، آزاد کشمیر سے ۳، راولپنڈی اور اسلام[آباد اور] قرب و جوار سے ۱۱، چکوال سے ایک، فیصل[آباد اور] سرگودھا کے اضلاع سے ۱۹، جھنگ سے ایک[،] پنجاب کے اضلاع گجرات، گوجرانوالہ، [سیالکوٹ] سے ۱۲، ملتان، شجاع آباد، وہاڑی، بورے والا[،] صادق آباد سے ایک، سکھر سے ایک، دادو سے [...] کراچی سے ۲۸، کوئٹہ سے ۹، بستی سے ۱، ابو ظ[بی سے] ایک، لاہور اور گردونواح سے ۵۱ اور قرآ[ن] اکیڈمی سے ۱۴ ساتھیوں نے سات شب و ر[وز] مکمل مل کر لیکن سمٹ سمٹا کے گزارے [کہ بود] باش کے لئے بستر بچھانے کی جگہ کے علاوہ [آمد و] رفت کے راستوں کی گنجائش تھی۔ قرآن اکیڈمی کے ۱۴ طلبہ میں نوجوانوں کے ساتھ وہ [...] بوڑھے طوطے“ بھی شمار میں آ گئے ہیں جنہ[وں نے] اعلیٰ ترین فنی تعلیم کے حامل اور سرکاری یا نج[ی اداروں] میں ارفع مناصب پر فائز ہونے کے باوجود سال [بھر] کے لئے ”ترکِ دنیا“ کر کے اکیڈمی میں [...] قرآن و حدیث، عربی زبان اور فلسفہ و حکمت [سے] رشتہ جوڑا ہے کہ دین کی دعوت دینے اور [اس کی] طرف بلانے میں زبان نہ لڑکھڑائے بلکہ دل [کے] خلوص کی رفیق ہو۔ فرائضِ دینی کے شعور [کی] دولت انہیں حاصل ہوتی ہے، اسے اپنے [...] لٹانے کا قرینہ بھی انہیں آ جائے۔ جس ا[...] عزم وہ لے کر اٹھے ہیں، اس کی اساس [...]

ذہنوں میں راسخ ہو جائے کہ اس منزل کو سر کرنے کے لئے شیر کا جگر ہی نہیں چیتے کا تجسّس بھی چاہیے۔

سیاست کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو نئے زمانے میں رواج پا گیا' ایک وہ بھی تھا جس مفہوم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع کے مطابق بنی اسرائیل کی سیاست انبیا کرام فرمایا کرتے تھے۔ ان معنوں میں اب سیاست بھی متروک ہو گئی اور سیاسی جماعت کے تنظیمی ڈھانچے کی وہ بنیاد یعنی بیعت' بھی منہدم ہو چکی ہے یا کم از کم ذہنوں سے بالکل اوجھل ضرور ہو گئی جو مسنون و ماثور ہے اور جس پر ماضیٔ قریب تک عالمِ اسلام میں جماعت سازی ہوتی رہی بلکہ برصغیر ہند و پاک میں بھی پچھلی صدی میں تحریکِ شہیدینؒ اسی اساس پر کھڑی ہوئی اور ستّر اسّی سال قبل ہی الہلال و البلاغ والے مولانا ابو الکلام آزاد نے "حزب اللہ" بنائی تو اس میں بھی شمولیت کا دروازہ ان سے بیعت سمع و طاعت ہی تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کو اللہ تعالٰی نے اس سنّت کو زندہ کرنے کی توفیق دی اور ان کی تنظیمِ اسلامی میں داخلہ تنظیم کے امیر یعنی خود ڈاکٹر صاحب موصوف سے شخصی بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ تو ایک الگ داستان ہے کہ اس پر انہیں کیا کچھ نہیں سننا پڑا تاہم موضوع کے اعتبار سے یہ بتانا دلچسپی کا باعث ہو گا کہ بیعت کر کے تنظیم میں شامل ہونے والوں کو آنکھیں اور کان بند کر لینے اور دماغ کی کھڑکیاں مقفل رکھنے کی ہدایت نہیں کی جاتی بلکہ اصرار کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا فکر قبول کریں تو علیٰ وجہِ البصیرت کریں کہ اس کے بغیر قوائے عمل کو تحریک نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کے فکر اور تنظیمِ اسلامی کے نظامِ بیعت پر اعتراضات کرنے والوں نے جس اہتمام سے ان کے اعوان و انصار کے دل و دماغ میں ذرائع ابلاغ کے سہارے اور فرداً فرداً بھی شبہات کے جراثیم داخل کئے وہ باخبر حلقوں سے پوشیدہ نہیں' خود امیرِ تنظیم نے اپنے تصورِ فرائضِ دینی اور اسلامی انقلابی جماعت کے لئے مسنون بیعت کو بنیاد بنانے کے اپنے طریقِ کار کو تنقید و تنقیص کا ہدف بنانے کے لئے علمائے کرام اور معروف رجالِ دین کو اپنے عام اجتماعات میں خطاب کی دعوت دی اور چند سو افراد پر مشتمل اپنی جمع پونجی ان کے سامنے رکھ دی کہ یہ لوگ اگر کسی گمراہی و ضلالت میں مبتلا ہو گئے ہیں تو اُلٹے پیروں انہیں واپس پھیر لے جائیں۔

اب جن ساتھیوں کا دل اس اجنبی سے نظامِ جماعت پر ٹھُک، گیا اور دماغ نے اپنے امیر کے فکر کو بقائمی ہوش و حواس قبول کر لیا ہے' انہیں تواتر سے فکری غذا پہنچانے کی ضرورت تھی۔ یہ کام ہوتا بھی آیا ہے اور رفقائے تنظیم کی نظریاتی تربیت پر ہی اب تک زیادہ زور رہا لیکن نظریاتی تجدید کا حالیہ ہفت روزہ نصاب اپنی نوع کے اعتبار سے منفرد تھا جس کے اکلوتے معلّم و مُربّی خود ڈاکٹر صاحب تھے۔ کتابوں کے مطالعے' ان کی تشریح اور تختۂ سیاہ کے ذریعے اہم نکات کی مزید توضیح کرتے ہوئے انہوں نے مختصر وقفوں کے ساتھ اوسطاً روزانہ آٹھ گھنٹوں پر محیط لیکچر دیئے۔ نصاب کی غرض و غایت ساتھیوں کی فکری اساس کو مستحکم کرنا تھی چنانچہ موضوعات کے انتخاب میں جامعیت کو ملحوظ رکھا گیا۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور کرنے کے اصل کام کے ساتھ فکرِ مغرب کی اساس کا تجزیہ کیا گیا۔ دعوتِ رجوع الی القرآن کی تاریخ کا تذکرہ اور علم و حکمت کے ان چار سر چشموں کی نشان دہی ہوئی جن سے امیرِ تنظیم کا فکرِ قرآنی سیراب ہوا ہے۔ ذہن نشین کرایا گیا کہ قرنِ اول میں اسلام قرآن اور جہاد سے عبارت تھا۔ امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی داستان سنائی گئی اور

مستقبل کے لئے مجوزہ لائحہ عمل کی تفصیل سامنے آئی۔ اپنے فکر میں قدیم و جدید کا حسین امتزاج رکھنے والے حکیم الامت و شاعرِ مشرق، علامہ اقبال کے ہاں حالاتِ حاضرہ کا جو تجزیہ ملتا ہے، اس سے روشناسی کرائی گئی۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد، اس کی توسیع و اشاعت اور اس عمل کے دوران پیدا ہونے والے رجحانات اور روا رکھی گئی فکری و عملی کوتاہیاں گفتگو کا موضوع بنیں۔ اسلام اور پاکستان کے باہمی تعلق کو اس کے سیاسی، تاریخی، علمی و ثقافتی پس منظر میں واضح کیا گیا اور دلائل سے قائل کیا گیا کہ اسلام ہی ملکِ خداداد کے بقا و استحکام کی واحد ضمانت ہے۔ فرائضِ دینی کے اس جامع تصور کی شرح ہوئی جو تنظیمِ اسلامی کی دعوت کا بنیادی عنصر ہے تو مختلف اسلامی تحریکوں اور دینی اداروں کے تصورات سے اس کا تقابل کر کے بھی دکھایا گیا۔ اسلامی انقلاب کے اصل مفہوم سے تعارف کرایا گیا، قرآن و سنت سے ماخوذ مترادف اصطلاحات پیش کی گئیں اور عہدِ حاضر میں انقلاب کے آخری مرحلے کی منہجِ انقلابِ نبوی سے مطابقت پیدا کرنے کے موزوں اسلوب کا بیان ہوا۔

یہ موضوعات بظاہر بڑے ہی وسیع اور نہایت اَدق محسوس ہوتے ہیں لیکن درست انداز میں صُغریٰ کُبریٰ جوڑ کر انہیں منطقی ربط اور فکری تسلسل کی لڑی میں پرو لیا جائے اور عقدہ کشائی کرنے والی شخصیت وہی ایک ہو جس نے ان سب کو فہمِ قرآنی اور سیرتِ مطہرہ کے نزولِ قرآن سے مربوط مطالعہ کے "کھل جا سم سم" سے کھولا ہو تو بات دل و دماغ میں اُترتی چلی جاتی ہے اور کوئی الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔ نظریاتی تربیت میں اہم ترین یاد دہانی اس قرار دادِ تاسیس کو لفظ بہ لفظ پڑھنا تھی جو تنظیم کے قائم ہونے سے پہلے مرتب کی گئی تھی۔ اب تو ایسی دستاویزات کو چھپا کر رکھنے کا زمانہ آ گیا ہے تاکہ قافلے والوں کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ جس ہدف کو منزل بنا کر سفر کا آغاز کیا گیا تھا، وہ کب طاقِ نسیان کی زینت بن گیا لیکن یہاں اس کا پہاڑا پڑھا جاتا ہے تاکہ کسی بھی وقت نشانِ منزل نظروں سے اوجھل ہو تا محسوس ہو تو ہر شخص ٹھٹھک کر کھڑا ہو جائے۔ نصاب کا آخری حصہ جماعتِ اسلامی میں رونما ہونے والا (لیکن مولانا مودودی کی بھاری بھر کم شخصیت کے ڈھکن تلے دبا دیا جانے والا) وہ اضطراب، اس کے ساتھ روا رکھی جانے والی دھینگا مشتی کے واقعات اور ان کے پس منظر پر مشتمل تھا جس کا سب سے بڑا سبب ایک اسلامی انقلابی تحریک میں جماعت سازی کے جدید طور طریقوں کی پیوند کاری بنا۔ اللہ رے جدّت پسندی کہ مشقت کے چرخے سے کاتے ہوئے سوت کو یوں رُواں رُواں کر ڈالا! تاریخ کا حصہ بن جانے والی اس کہانی کے اندوہناک واقعات کی روشنی میں یہ اطمینان حاصل کیا گیا کہ تنظیمِ اسلامی کے تنظیمی ڈھانچے کو ان شاء اللہ، مصلحت کوشی کی یہ دیمک نہ لگے گی کیونکہ یہاں اُس کی چال چل کے کوّا اپنی چال بھولا نہیں گیا۔ اس کا لائحہ عمل سیرتِ طیبہ کے مضبوط کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اور اسے کسی ایسی دلدل تحریک کے حال کو پہنچنے سے بھی اللہ تعالیٰ ضرور بچائیں گے جو سالہا سال سے ایک ہی دائرے میں حرکت کر رہی ہو اور سخت کد و کاوش، بھاگ دوڑ کے بعد بھی بار بار اسی مقام سے گزرنے اور یہ گنگنانے پر مجبور ہو کہ "یہ تو وہی جگہ ہے، گزرے تھے ہم جہاں سے"۔

یہ نظریاتی تربیت کلاس جمعرات (۲۸/ دسمبر ۱۹۸۹ء) کو رات گئے اختتام کو پہنچی جس کے بعد دو [illegible] شرکاء تنظیمِ اسلامی کے مقاصد اور لائحہ عمل کے شعور و آگہی کو ذہنوں میں تازہ کرنے کے بعد اپنے اپنے

یہ نصیحت پلّے باندھ کر اپنے گھروں' اپنی آبادیوں یعنی اپنے میدانِ کار کی طرف مراجعت کا قصد کر رہے تھے کہ ساتھیو! جس سبق کی آپ نے تجدید کی ہے' اُسے تنہائیوں کی فراغت میں دُہراتے رہنا ہوگا ۔ کہیں یہ پہاڑ جیسا مقصد غفلت کے ایک تل کی اوٹ میں اوجھل نہ ہو جائے اور یہاں سُنی' پڑھی اور سمجھی باتوں کو حافظے میں دلِ زندہ کی طرح دھڑکتے رکھنے کا بہترین عملی طریقہ' سب سے کارگر نسخہ یہ ہے کہ آپ خود داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوں۔ بادِ مخالف کی ہوا خیزی خود ہی آپ کے سبق کو پکارے گی اور اس پر آپ کا انشراحِ صدر از خود بڑھتا چلا جائے گا۔

اس سے پہلی مجلس میں ڈاکٹر اسرار احمد کی کہی ہوئی ایک بات ان سطور کے راقم کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ "ہم اپنی تعداد کی قلت پر ہراساں نہیں اور کئی برسوں کی محنت کا حاصل ان چند سو افراد کے میسر آجانے پر اپنے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ہمیں دعویٰ بھی نہیں کہ انقلاب برپا کر کے دکھائیں گے' یہ معجزہ تو انسانی تاریخ میں صرف ایک بار اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل و جامع ذات سے ظہور پذیر ہوا تھا اور حکمت اس میں یہ تھی کہ آپؐ پر نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہو رہا تھا۔ ان کے اتباع میں عزمِ انقلاب کرنے والے ہم ادنیٰ خادم تو اس نہج پر قائم رہ کر اپنی بنیاد ہی مضبوط کر لیں تو بہت بڑی سعادت ہے۔ جادۂ انقلاب پر گامزن رہنا ہی شرط ہے۔ ہم نہیں تو ہماری اگلی نسل اور وہ بھی نہیں تو اس کی اگلی نسل منزل پا کر رہے گی۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کا وعدہ ہے' سچا وعدہ..." __ OO

ماخوذ از ہفت روزہ 'ندا' لاہور

بقیہ: 'حرفِ اوّل'

اسرار احمد نے قرآنِ حکیم کی سورۃ تغابن کی ایک آیت کے حوالے سے کہا کہ ناکامی اور کامیابی کا اصل فیصلہ میدانِ حشر میں ہوگا۔ ہمارا کام تو اللہ کے دین کی خدمت اور اصلاح اور انقلاب کی جدوجہد میں اپنی توانائیاں صرف کرنا ہے۔ اگر کامیابی کا معیار لاکھوں اور کروڑوں روپے خرچ کر کے بڑے بڑے جلسے منعقد کرنا ہے تو بہت سے لوگ بلاشبہ کامیاب ہیں۔ علامہ طاہر القادری کے تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ کے ساتھ اشتراکِ عمل کے معاملے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اسلامی قانون کے نفاذ کی راہ میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے فقہی اختلافات ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ اگر علامہ صاحب اہلِ تشیع کے ساتھ فقہی اور قانونی امور پر اتفاق رائے حاصل کر سکیں تو یقیناً یہ ایک بڑی دینی خدمت ہوگی اور میں اس پر انہیں مبارکباد پیش کروں گا۔"

سات دن، سات راتیں

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

تربیت اور وہ بھی نظریاتی!

ہم نظریئے کی بات کرتے ہیں' وہ ہے کہاں؟
ذکر تنظیم اسلامی کی ایک تربیت گاہ کا

اقتدار احمد

مادہ پرستی کے اس دورِ پُرفتن میں مادیت کا دجّال ہمارے دماغ کی دنیا اور سوچ پر ہی حکمران نہیں' دل کی پہنائیوں میں بھی امنگوں آرزوؤں کی شکل میں گھر کر گیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا وہی معجزوں کی بارش برساتا اور دنیاوی آسائشوں کی چکا چوند سے نگاہوں کو خیرہ کرنے والا کانا دجّال' جس کی پیشانی پر اسباب و وسائل پر تکیہ کرنے سے عبارت صرف ایک آنکھ ہے کیونکہ روح کا خانہ تو خالی ہو چکا جو مسبّبُ الاسباب اللہ کے رہنے کی جگہ ہے۔ کیا آج ہم میں سے کسی کو یہ دماغ ہے' اتنی فرصت میسر ہے کہ تنہائی کا موقع نکالے اور اپنے من میں ڈوب کر اس بات کا سراغ پانے کی کوشش کرے کہ خالقِ کون و مکاں نے مجھے عمر کی مہلت دے کر اس دنیائے فانی میں کیوں بھیجا۔ چار دن کی جو عمرِ دراز میں مانگ کر لایا ہوں' اس کے دو دن آرزو میں اور دو دن انتظار میں ہی گزر جائیں گے یا اگلی منزل کے لئے زادِ راہ بھی پہنچانا بھی میسر اور دِسر ہے اور انہی چار دنوں میں اس کا بھی کچھ انتظام کرنا ہے۔

افرادی ہی کے اس چنجال سے آزاد نہیں' ہماری جماعت... جماعتیں' گروہ اور ادارے... بھی بے مقصدی کے مزے لوٹ رہے ہیں اور کیوں نہ ہو جب مِن حیثُ القوم ہم کھلنڈرانہ بے نیازی کا رویہ اپنا چکے تو دُور کی بات سوچنے کی زحمت کیوں کی جائے۔ ہمارے رہنماؤں' دانشوروں' سیاسی لیڈروں اور صحافیوں میں سے جو اٹھتا ہے' نظریہ کی گردان اس کی نوکِ زبان اور موئے قلم پر ہوتی ہے اور نظریۂ پاکستان تو ہمارا تکیۂ کلام ہے۔ ملکِ خداداد کا ایک نظریاتی ریاست ہونا بھی گویا ایک امرِ مسلّمہ ہے لیکن نظریہ ہے کس چڑیا کا نام' ہم بھو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ عملاً ہمارا کسی نظریہ سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہم سے زیادہ غیر نظریاتی لوگوں کے ہجوم بھی دنیا میں ضرور موجود ہیں' بے غل و غش موج اُڑاتے ہیں لیکن وہ کسی نظریہ کا ڈھول بھی تو نہیں پیٹتے۔ آج چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھئے' کیا کہیں نظریۂ پاکستان کی شرح بھی کی جاتی ہے' کسی مجلس میں اس بات پر بھی غور ہوتا ہے کہ اسلام کے جن اعلیٰ و ارفع نظریات سے وابستگی کا دم ہم بھرتے ہیں' وہ کیا ہیں اور ان کے کچھ تقاضے بھی ہیں کہ نہیں۔

دستورِ زمانہ تو یہی ہے کہ نظریات کو زبانی جمع خرچ کے لئے چھوڑ کر مطلب کی بات کی جائے اور

ماری بزعمِ خویش نظریاتی جماعتوں نے بھی اپنے ارکنوں کی نظریاتی تعلیم و تربیت کو سیاسی مہمات ی بھینٹ چڑھادیا لیکن کسی بھی انقلابی تحریک کے لئے اس کا نظریہ ہی اس کا سرمایہ اور اصل پونجی ہے و دوسرے جھمیلوں میں پڑ کر اگر گم کر دی جائے و تحریک انقلابی نہیں رہتی، روحِ انقلاب پر ایک لرام بن جاتی ہے اور آخر کار کسی عصبیتِ جاہلیہ کا شکار ہو کر ایک نئے فرقہ کے انڈے بچے چھوڑ مرتی ہے ۔ دوسروں سے ہمیں کیا غرض، عالمِ اسلام میں اٹھنے الی اکثر تحریکیں اسی انجام سے دوچار ہوئیں اور ہم عصر اسلامی تحریکوں کے مقدّر میں بھی یہی لکھا علوم ہوتا ہے۔ تاہم یہ غارت گر بلا آسمان سے نازل نہیں ہوا کرتی، جب نظریات کا شعور مدہم پڑنے لگے و دبے پاؤں آ کر کارکنوں بلکہ قیادت کو بھی دبوچ تی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیمِ اسلامی اپنی مخصوص یئتِ تنظیمی اور انقلابی دعوت کے باعث بہت سے مہربانوں کے دلوں میں کھٹکتی تو بہت ہے لیکن خود ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقا اپنی جماعت کی عددی قوت کے بارے میں کسی زعم کی ابتلا میں نہیں پڑے اور اس پر اللہ تعالےٰ کا شکر بھی بجالاتے ہیں۔ کیا یہ بات عجیب سی، نئی نئی سی نہیں لگتی کہ تنظیمِ اسلامی اپنے امیر کی دعوت کو کسی بھی درجے میں پذیرائی دینے والوں کی اپنی جماعت میں "جوق در جوق" شمولیت کی خواہاں نہیں۔ انہیں سرپرست، رکن، ہمدرد، متفق اور کارکن کے خانوں میں بانٹ کر زیادہ سے زیادہ رعایتیں دیتے ہوئے ساتھ رکھنے کی بجائے وہ اپنے وابستگان بلکہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر بیعتِ سمع و طاعت تک کر لینے والوں کو بھی تعلیم و تربیت کی چھلنی سے گزارتی ہے۔ دراصل لوگوں کے ہجوم کو گھیر گھار کر کوئی سیاسی فائدہ اٹھانا مقصود ہی نہیں، پروگرام تو احیائے اسلام اور غلبۂ دین کے لئے ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈالنے کا ہے جس کے نقوش نسلِ انسانی کے عظیم ترین اور منفرد و مثالی انقلاب کے قائد، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی تاریخ کے اوراق پر ثبت کر گئے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے دورِ مکّی کے دس برس میں ایک سو سے کم کم انقلابی تیار کئے لیکن نظریئے سے وابستگی اور فکر کی پختگی میں ایک سے بڑھ کر ایک۔ یہی گنے چنے افراد اسلامی انقلاب کی وہ مضبوط بنیاد بنے جس پر اگلے تیرہ برسوں میں غلبہ و اظہارِ دینِ حق کی رفیع الشان اور عدیم المثال عمارت کھڑی ہو گئی۔ قدسیوں کی اس جماعت کو حضورؐ کی عملی و نظریاتی تربیت کا فیض ہی تو میسر تھا۔

الحمد للہ کہ اسی کی توفیق اور تائید کا ایک مظہر انہی دنوں سامنے آیا۔ تنظیمِ اسلامی نے قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک سات روزہ نظریاتی تعلیم و تربیت کے تجدیدی نصاب ـــــــ (Refresher Course) کی کامیاب تکمیل کی ۔ اس میں دور و نزدیک سے لگ بھگ دو سو ایسے رفقائے تنظیم شریک تھے جو نظم کی پابندی کا ابتدائی امتحان پاس کر چکے ہیں اور تنظیم کی ریڑھ کی ہڈی (Hard Core) بنیں گے۔ انہی لوگوں میں سے جماعت کو چلانے کے لئے نظامت و قیادت کی صفیں (Cadres) تیار ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ اس تربیت گاہ میں شرکت کے اہل سب رفقا ان مقررہ دنوں میں علائقِ دنیوی سے اپنے آپ کو کاٹ کر آنے کے قابل نہ ہو سکے تاہم یہ چکی تو اب چلتی رہے گی۔ جو اس بار نہیں آ سکے، وہ اگلی دفعہ آئیں گے اور نصاب کی تکمیل کر کے جانے والوں کو بھی تو بار بار سبق دُہرانے اور پکانے کے لئے لوٹ کر آنا ہو گا۔ سات دنوں کے لئے معمولاتِ زندگی کو ترک کر کے،

یہ نظریاتی تجدیدی نصاب تنظیمِ اسلامی کے اُن رفقاء کے لیے تھا جو نظم کی پابندی کا ابتدائی امتحان پاس کر چکے ہیں!

گھر بار کی ذمہ داریوں اور سہولتوں سے دست کش ہو کر اور اپنی ملازمتوں یا کاروبار کی بساط کو تہہ کر کے "نظریاتی کاروبار" کے لئے نکل کھڑے ہونا آسان تو نہیں کہ وقت ہی آج کل سب سے بڑی سرمایہ کاری ہے۔ پھر جس بُلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آنے والے آئے ہیں، ان کے لئے یہاں کشش بھی کون سی تھی؟۔ نہ سرکار دربار تک رسائی کی کوئی امید، نہ کسی دنیاوی منفعت کا لالچ، نہ اقتدار پر جھپٹا مارنے کے کسی منصوبے میں شرکت کا موقع، نہ شان و شکوہ کا مظاہرہ، نہ سیاسی یا سماجی چودھراہٹ کا امکان اور نہ کوئی واہ واہ۔ پھر پروگرام میں بھی "دلچسپی" کا کوئی سامان نہیں۔ مسجد کے ہال میں کلاس روم کا ماحول، دماغ کو چاٹ دینے والی اور اعصاب کو تھکا دینے والی تدریس، نیندیں اڑا دینے والی دعوتِ غور و فکر، طویل نشستیں اور آرام کے وقفے میں بھی اضافی مطالعے کے "ہوم ورک" کے ساتھ ساتھ "ہم سبق" دوستوں سے زیرِ بحث موضوع پر تبادلۂ خیال۔ یہ کوئی ہلکی پھلکی برائے نام تربیت گاہ نہیں، صحیح معنوں میں ٹیڑھی کھیر تھی۔

تربیت گاہ کے شرکا میں واجبی تعلیم رکھنے والوں سے لے کر برطانوی اور امریکی جامعات سے پوسٹ گریجویٹ اور پی ایچ ڈی تک کی ڈگریوں والے شامل تھے۔ تنظیم اسلامی کی انقلابی دعوت کسی دھوم دھڑکے اور شور شرابے کے بغیر خاموشی سے جس طرح اثر و نفوذ کر رہی ہے، اس کا اندازہ لگانا ہو تو ایک نظر اس نظریاتی تجدیدی نصاب کے لئے سفر و حضر میں آٹھ نو دن کھپانے والوں کی تفصیل دیکھئے۔ پشاور اور گردونواح سے ۱۴، باجوڑ جیسے دور افتادہ مق... سے ۳، آزاد کشمیر سے ۳، راولپنڈی اور اسلام آباد... قرب و جوار سے ۱۱، چکوال سے ایک، فیصل آباد ا... سرگودھا کے اضلاع سے ۱۹، جھنگ سے ایک، و... پنجاب کے اضلاع گجرات، گوجرانوالہ، سیالکو... سے ۱۶، ملتان، شجاع آباد، وہاڑی، بورے والا سے... صادق آباد سے ایک، سکھر سے ایک، دادو سے ایک... کراچی سے ۲۸، کوئٹہ سے ۹، بمبئی سے ۱، ابوظبی سے... ایک، لاہور اور گردونواح سے ۵۱ اور قرآن کالج... اکیڈمی سے ۱۴ ساتھیوں نے سات شب و روز یو... مکمل مل کر لیکن سمٹ سمٹا کے گزارے کہ بود و باش کے لئے بستر بچھانے کی جگہ کے علاوہ محض آمد و رفت کے راستوں کی گنجائش تھی۔ قرآن کالج ا... اکیڈمی کے ۱۴ طلبہ میں نوجوانوں کے ساتھ وہ متعدد "بوڑھے طوطے" بھی شمار میں آگئے ہیں جنہوں... اعلیٰ ترین فنی تعلیم کے حامل اور سرکاری یا نجی ادارو... میں ارفع مناصب پر فائز ہونے کے باوجود سال دو سال کے لئے "ترکِ دنیا" کر کے اکیڈمی میں ذریعۂ الا... قرآن و حدیث، عربی زبان اور فلسفہ و حکمتِ دینی سے رشتہ جوڑا ہے کہ دین کی دعوت دینے اور قرآن کی طرف بلانے میں زبان نہ لڑکھڑائے بلکہ دل کے جذ... و خلوص کی رفیق ہو۔ فرائضِ دینی کے شعور کی دولت انہیں حاصل ہوئی ہے، اسے اپنے حلقہ اثر میں لٹانے کا قرینہ بھی انہیں آجائے۔ جس انقلاب... عزم وہ لے کر اٹھے ہیں، اس کی اساس ماہیت اور...

ذہنوں میں راسخ ہو جائے کہ اس منزل کو سر کرنے کے لئے شیر کا جگر ہی نہیں چیتے کا تجسس بھی چاہئے۔

سیاست کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو نئے زمانے میں رواج پا گیا' ایک وہ بھی تھا جس مفہوم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع کے مطابق بنی اسرائیل کی سیاست انبیا کرام فرمایا کرتے تھے۔ ان معنوں میں اب سیاست بھی متروک ہو گئی اور سیاسی جماعت کے تنظیمی ڈھانچے کی وہ بنیاد یعنی بیعت' بھی منہدم ہو چکی ہے یا کم از کم ذہنوں سے بالکل او جھل ضرور ہو گئی جو مسنون و ماثور ہے اور جس پر ماضی قریب تک عالمِ اسلام میں جماعت سازی ہوتی رہی بلکہ برصغیر ہند و پاک میں بھی پچھلی صدی میں تحریکِ شہیدینؒ اسی اساس پر کھڑی ہوئی اور ستّر اسّی سال قبل ہی الہلال و البلاغ والے مولانا ابو الکلام آزاد نے "حزب اللہ" بنائی تو اس میں بھی شمولیت کا دروازہ ان سے بیعت سمع و طاعت ہی تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کو اللہ تعالے نے اس سنّت کو زندہ کرنے کی توفیق دی اور ان کی تنظیمِ اسلامی میں داخلہ تنظیم کے امیر یعنی خود ڈاکٹر صاحب موصوف سے شخصی بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ تو ایک الگ داستان ہے کہ اس پر انہیں کیا کچھ نہیں سننا پڑا تاہم موضوع کے اعتبار سے یہ بتانا دلچسپی کا باعث ہو گا کہ بیعت کر کے تنظیم میں شامل ہونے والوں کو آنکھیں اور کان بند کر لینے اور دماغ کی کھڑکیاں مقفل رکھنے کی ہدایت نہیں کی جاتی بلکہ اصرار کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا فکر قبول کریں تو علیٰ وجہِ البصیرت کریں کہ اس کے بغیر قوائے عمل کو تحریک نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کے فکر اور تنظیمِ اسلامی کے نظامِ بیعت پر اعتراضات کرنے والوں نے جس اہتمام سے ان کے اعوان و انصار کے دل و دماغ میں ذرائع ابلاغ کے سہارے اور فرداً فرداً بھی شبہات کے جراثیم داخل کئے وہ باخبر حلقوں سے پوشیدہ نہیں' خود امیرِ تنظیم نے اپنے تصورِ فرائضِ دینی اور اسلامی انقلابی جماعت کے لئے مسنون بیعت کو بنیاد بنانے کے اپنے طریقِ کار کو تنقید و تنقیص کا ہدف بنانے کے لئے علمائے کرام اور معروف رجالِ دین کو اپنے عام اجتماعات میں خطاب کی دعوت دی اور چند سو افراد پر مشتمل اپنی جمع پونجی ان کے سامنے رکھ دی کہ یہ لوگ اگر کسی گمراہی و ضلالت میں مبتلا ہو گئے ہیں تو اُلٹے پیروں انہیں واپس پھیر لے جائیں۔

اب جن ساتھیوں کا دل اس اجنبی سے نظامِ جماعت پر ٹھک گیا اور دماغ نے اپنے امیر کے فکر کو بقائمی ہوش و حواس قبول کر لیا ہے' انہیں تواتر سے فکری غذا پہنچانے کی ضرورت تھی۔ یہ کام ہوتا بھی آیا ہے اور رفقائے تنظیم کی نظریاتی تربیت پر ہی اب تک زیادہ زور رہا لیکن نظریاتی تجدید کا حالیہ ہفت روزہ نصاب اپنی نوع کے اعتبار سے منفرد تھا جس کے اکلوتے معلّم و مُربّی خود ڈاکٹر صاحب تھے۔ کتابوں کے مطالعے' ان کی تشریح اور تختۂ سیاہ کے ذریعے اہم نکات کی مزید توضیح کرتے ہوئے انہوں نے مختصر وقفوں کے ساتھ اوسطاً روزانہ آٹھ گھنٹوں پر محیط لیکچر دئے۔ نصاب کی غرض و غایت ساتھیوں کی فکری اساس کو مستحکم کرنا تھی چنانچہ موضوعات کے انتخاب میں جامعیت کو ملحوظ رکھا گیا۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور کرنے کے اصل کام کے ساتھ فکرِ مغرب کی اساس کا تجزیہ کیا گیا۔ دعوتِ رجوع الی القرآن کی تاریخ کا تذکرہ اور علم و حکمت کے ان چار سر چشموں کی نشان دہی ہوئی جن سے امیرِ تنظیم کا فکرِ قرآنی سیراب ہوا ہے۔ ذہن نشین کرایا گیا کہ قرنِ اول میں اسلام قرآن اور جہاد سے عبارت تھا۔ امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی داستان سنائی گئی اور

مستقبل کے لئے مجوزہ لائحۂ عمل کی تفصیل سامنے آئی۔ اپنے فکر میں قدیم و جدید کا حسین امتزاج رکھنے والے حکیم الامت و شاعرِ مشرق، علامہ اقبال کے ہاں حالاتِ حاضرہ کا جو تجزیہ ملتا ہے، اس سے روشناسی کرائی گئی۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد، اس کی توسیع و اشاعت اور اس عمل کے دوران پیدا ہونے والے رجحانات اور روا رکھی گئی فکری و عملی کوتاہیاں گفتگو کا موضوع بنیں۔ اسلام اور پاکستان کے باہمی تعلق کو اس کے سیاسی، تاریخی، علمی و ثقافتی پس منظر میں واضح کیا گیا اور دلائل سے قائل کیا گیا کہ اسلام ہی ملکِ خداداد کے بقا و استحکام کی واحد ضمانت ہے۔ فرائضِ دینی کے اس جامع تصور کی شرح ہوئی جو تنظیم اسلامی کی دعوت کا بنیادی عنصر ہے تو مختلف اسلامی تحریکوں اور دینی اداروں کے تصورات سے اس کا تقابل کر کے بھی دکھایا گیا۔ اسلامی انقلاب کے اصل مفہوم سے تعارف کرایا گیا، قرآن و سنت سے ماخوذ مترادف اصطلاحات پیش کی گئیں اور عہدِ حاضر میں انقلاب کے آخری مرحلے کی منہجِ انقلابِ نبوی سے مطابقت پیدا کرنے کے موزوں اسلوب کا بیان ہوا۔

یہ موضوعات بظاہر بڑے ہی وسیع اور نہایت اَدق محسوس ہوتے ہیں لیکن درست انداز میں صُغریٰ کُبریٰ جوڑ کر انہیں منطقی ربط اور فکری تسلسل کی لڑی میں پرو لیا جائے اور عقدہ کشائی کرنے والی شخصیت وہی ایک ہو جس نے ان سب کو فہمِ قرآنی اور سیرتِ مطہرہ کے نزولِ قرآن سے مربوط مطالعہ کے "کھل جا سم سم" سے کھولا ہو تو بات دل و دماغ میں اُترتی چلی جاتی ہے اور کوئی الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔ نظریاتی تربیت میں اہم ترین یاد دہانی اس قراردادِ تاسیس کو لفظ بہ لفظ پڑھنا تھی جو تنظیم کے قائم ہونے سے پہلے مرتب کی گئی۔ اب تو ایسی دستاویزات کو چھپا کر رکھنے کا زمانہ آ گیا ہے تاکہ قافلے والوں کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ جس ہدف کو منزل بنا کر سفر کا آغاز کیا گیا تھا، وہ کب طاقِ نسیان کی زینت بن گیا لیکن یہاں اس کا پہاڑا پڑھا جاتا ہے تاکہ کسی بھی وقت نشانِ منزل نظروں سے اوجھل ہوتا محسوس ہو تو ہر شخص ٹھٹھک کر کھڑا ہو جائے۔ نصاب کا آخری حصہ جماعت اسلامی میں رونما ہونے والا (لیکن مولانا مودودی کی بھاری بھر کم شخصیت کے ڈھکن تلے دبا دیا جانے والا) وہ اضطراب، اس کے ساتھ روا رکھی جانے والی دھینگا مشتی کے واقعات اور ان کے پس منظر پر مشتمل تھا جس کا سب سے بڑا سبب ایک اسلامی انقلابی تحریک میں جماعت سازی کے جدید طور طریقوں کی پیوند کاری بنا۔ اللہ رے جدت پسندی کہ مشقت کے چرخے سے کاتے ہوئے سُوت کو پھر رُواں رُواں کرنا پڑا!۔ تاریخ کا حصہ بن جانے والی اس کہانی کے اندوہناک واقعات کی روشنی میں یہ اطمینان حاصل کیا گیا کہ تنظیمِ اسلامی کے تنظیمی ڈھانچے کو انشاء اللہ، مصلحت کوشی کی یہ دیمک نہ لگے گی کیونکہ یہاں ہنس کی چال چل کے کوا اپنی چال بھول نہیں گیا۔ اس کا لائحۂ عمل سیرتِ طیبہ کے مضبوط کھونٹے سے بندھا ہوا ہے اور اسے کسی ایسی دینی تحریک کے حال کو پہنچنے سے بھی اللہ تعالٰے ضرور بچائیں گے جو سالہا سال سے ایک ہی دائرے میں حرکت کر رہی ہو اور سخت کدو کاوش، بھاگ دوڑ کے بعد بھی بار بار اسی مقام سے گزرنے اور یہ گنگنانے پر مجبور ہو کہ "یہ تو وہی جگہ ہے، گزرے تھے ہم جہاں سے"۔

یہ نظریاتی تربیت گاہ اس جمعرات (۲۸/دسمبر ۱۹۸۹ء) کو رات گئے اختتام کو پہنچی جس کے بعد وہاں شرکاء تنظیمِ اسلامی کے مقاصد اور لائحۂ عمل کے شعور و آگہی کو ذہنوں میں تازہ کرنے کے بعد اپنے امیر کی

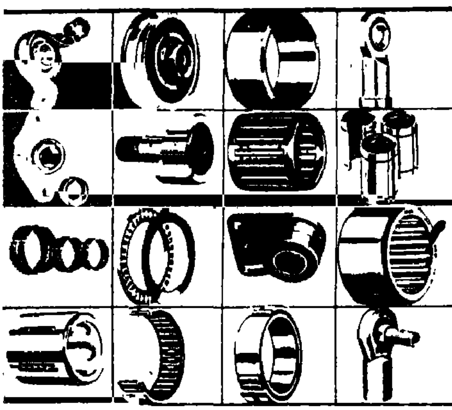
یہ نصیحت پلّے باندھ کر اپنے گھروں، اپنی آبادیوں یعنی اپنے میدانِ کار کی طرف مراجعت کا قصد کر رہے تھے کہ ساتھیو! جس سبق کی آپ نے تجدید کی ہے، اسے تنہائیوں کی فراغت میں دُہراتے رہنا ہو گا ــ کہیں یہ پہاڑ جیسا مقصد غفلت کے ایک تل کی اوٹ میں اوجھل نہ ہو جائے اور یہاں سُنی، پڑھی اور سمجھی باتوں کو حافظے میں دلِ زندہ کی طرح دھڑکتے رکھنے کا بہترین عملی طریقہ، سب سے کارگر نسخہ یہ ہے کہ آپ خود داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوں ــ بادِ مخالف کی ہوا خیزی خود ہی آپ کے سبق کو پکارے گی اور اس پر آپ کا انشراحِ صدر از خود بڑھتا چلا جائے گا ــ

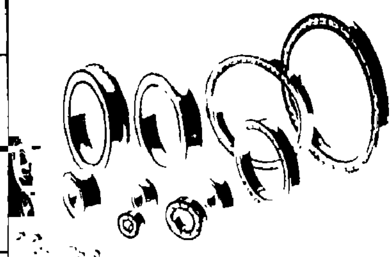
اس سے پہلی مجلس میں ڈاکٹر اسرار احمد کی کہی ہوئی ایک بات ان سطور کے راقم کے کانوں میں گونج رہی ہے ــ "ہم اپنی تعداد کی قلت پر ہراساں نہیں اور کئی برسوں کی محنت کا حاصل ان چند سو افراد کے میسر آ جانے پر اپنے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں ــ یہ دعویٰ بھی نہیں کہ انقلاب برپا کر کے دکھا ہی دیں گے، یہ معجزہ تو انسانی تاریخ میں صرف ایک بار اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل و جامع ذات سے ظہور پذیر ہوا تھا اور حکمت اس میں یہ تھی کہ آپؐ پر نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہو رہا تھا ــ انؐ کے اتباع میں عزمِ انقلاب کرنے والے ہم ادنیٰ خادم تو اس نہج پر قائم رہ کر اپنی بنیاد ہی مضبوط کر لیں تو بہت بڑی سعادت ہے ــ جادۂ انقلاب پر گامزن رہنا ہی شرط ہے، ہم نہیں تو ہماری اگلی نسل اور وہ بھی نہیں تو اس سے اگلی نسل منزل پا کر رہے گی ــ یہ اللہ اور اس کے رسول کا وعدہ ہے، سچا وعدہ..." ــ ○○

ماخوذ از ہفت روزہ 'ندا' لاہور

بقیہ : 'حرفِ اوّل'

اسرار احمد نے قرآن حکیم کی سورۃ تغابن کی ایک آیت کے حوالے سے کہا کہ ناکامی اور کامیابی کا اصل فیصلہ میدانِ حشر میں ہوگا۔ ہمارا کام تو اللہ کے دین کی خدمت اور اصلاح اور انقلاب کی جدوجہد میں اپنی توانائیاں صرف کرنا ہے۔ اگر کامیابی کا معیار لاکھوں اور کروڑوں روپے خرچ کر کے بڑے بڑے جلسے منعقد کرنا ہے تو بہت سے لوگ بلاشبہ کامیاب ہیں ۔ علامہ طاہر القادری کے تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ کے ساتھ اشتراکِ عمل کے معاملے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اسلامی قانون کے نفاذ کی راہ میں اہل سنت اور اہل تشیع کے فقہی اختلافات ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ اگر علامہ صاحب اہل تشیع کے ساتھ فقہی اور قانونی امور پر اتفاق رائے حاصل کر سکیں تو یقیناً یہ ایک بڑی دینی خدمت ہوگی اور میں اس پر انہیں مبارکباد پیش کروں گا۔"







وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۹

شمارہ: ۳

شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ

مارچ ۱۹۹۰ء

فی شمارہ -/۵

سالانہ زرِ تعاون -/۵۰

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/-
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove I L 60516
Tel : 312 969 6755

c/o Mr. Rashid A Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel · 313 977 8061

CANADA US $ 12/-
c/o Mr. Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel : 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/-
c/o Mr. Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlesex EN 34 RP
Tel : 01 805 8732

MID-EAST DR 25/-
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/-
c/o Mr. Hyder M. D Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel . 42127

K S A SR 25/-
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/-
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقامِ اشاعت: ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اسرار احمد

اِس بات کی اطلاع تو قارئینِ کرام کو گزشتہ شمارے کے 'عرضِ احوال' کے ذریعے ہو ہی چکی ہے کہ جنوری میں راقم شدید علیل ہو گیا تھا- عزیزم عاکف سعید نے علالت کا آغاز جنوری کے دوسرے ہفتے سے تحریر کیا' واقعہ یہ ہے کہ تکلیف کا آغاز تو پہلے ہی ہفتے سے ہو گیا تھا' شدت دوسرے ہفتے میں شروع ہوئی- اور مسلسل دو ہفتے جاری رہی' اواخر جنوری میں کراچی کا ایک سفر طے تھا' اُس کے پیش نظر راقم نے پوری پابندی کے ساتھ اِس طرح جم کر علاج کرایا کہ اِس سے قبل کبھی نہ کرایا تھا- اِس سے بحمد اللہ کسی قدر افاقہ ہو گیا- چنانچہ کراچی کا چار روزہ سفر اختیار کر لیا- لیکن اللہ کی شان کہ وہاں جاتے ہی تکلیف بڑھ گئی- چنانچہ جیسے تیسے دونوں عوامی پروگرام تو نبھائے' لیکن متعدد بزرگوں اور احباب سے ملنے کی خواہش دل ہی میں رہ گئی- جس کے لئے اس بار اضافی وقت لے کر گیا تھا' صرف شیخ سلطان احمد صاحب اور مولانا محمد طاسین صاحب سے ملاقات کے لئے حاضری دے سکا- کراچی سے واپسی کے بعد بھی دو ہفتے پھر شدید تکلیف میں گزرے- ہفتہ عشرہ قبل پھر کسی قدر افاقہ کی صورت نظر آئی تو قلم ہاتھ میں لیا ------ اور اوّلاً "اجتماعِ ماچھی گوٹھ کی بقیہ رُوداد" تحریر کر کے 'نقضِ غزل' کی تکمیل کر لی- اور اِس سے فارغ ہوتے ہی اِس پورے معاملے پر اپنا 'تبصرہ' اور 'تذکرہ' ------ یا بالفاظِ دیگر 'محاکمہ' سپرد قلم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں- ------ اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ ------ پر اعتماد اور توکّل کے علاوہ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے خصوصی فضل و کرم سے' اس معاملے کی خصوصی اہمیت

اور نزاکت کے پیشِ نظر، اپنے اِن احکام پر عمل کرنے کی خاص الخاص توفیق عطا فرمائے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ (النساء: ۱۳۵)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (المائدہ: ۸)

اِس سے قبل مناسب نظر آتا ہے کہ اپنی علالت کی نوعیت کے بارے میں کچھ عرض کر دوں اس لئے کہ خطوط یا فون کے ذریعے اس سلسلے میں استفسار ہوتا رہتا ہے اور ہر بار تفصیل ممکن نہیں ہوتی۔

مجھے اس بار جو تکلیف ہوئی اور اب سے چند سال قبل جو شدید عارضہ ہوا تھا، دونوں کا تعلق ریڑھ کی ہڈی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق و تیسیر سے میں نے لگ بھگ بیس سال تک مسلسل جس ذوق و شوق، جوش و خروش اور دُھن اور لگن کے ساتھ قرآن حکیم کا درس دیا، اس سے یقیناً جہاں دوسروں کو فائدہ پہنچا وہاں خود میرے ذہن و قلب کو بھی جلا حاصل ہوئی ------ اور بحمد اللہ رُوح کو بھی تقویت اور اطمینان حاصل ہوا، لیکن طبعی طور پر جسم و جان پر کچھ منفی اثرات بھی مرتّب ہوئے۔ چنانچہ ریڑھ کی ہڈی کے بالائی اور زیریں دونوں حصّے متأثر ہو گئے۔ اِس لئے کہ دو دو ڈھائی ڈھائی (بلکہ بعض اوقات تین تین) گھنٹے تک مسلسل فرش یا چوکی پر ایک ہی نشست پر قدرے آگے جُھک کر بیٹھنے سے ریڑھ کی ہڈی کے منکوں اور ان کے مابین Discs میں شکست و ریخت پیدا ہو گئی۔

اس سے قبل جو تکلیف ہوئی تھی اس کا تعلق ریڑھ کی ہڈی کے زیریں حصّے سے تھا، چنانچہ Lumbo - Sacral Region کی ہڈیوں کی خرابی کے باعث کمر کے نچلے حصّے میں کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب شدید درد ہو جانے کا

سلسلہ تو کئی سال سے جاری تھا' لگ بھگ تین سال قبل دائیں کولہے اور ٹانگ میں ایسا شدید درد اُٹھا کہ الامان والحفیظ! (چنانچہ کراچی سے لاہور کا ہوائی سفر بھی اسٹریچر پر کرنا پڑا تھا)- گزشتہ سال ڈٹرائٹ (امریکہ) میں جو مفصّل طبّی معائنہ و تفتیش برادرم ڈاکٹر غلام مرتضیٰ اعوان صاحب نے کروائی اس سے بھی معلوم ہوا کہ ہڈی کا نقص نہ صرف دو طرفہ ہے بلکہ دو مقامات پر ہے- (یہی وجہ ہے کہ راقم کے پاؤں کی چھوٹی انگلیاں بالکل سُنّ ہیں' دائیں جانب کی زیادہ' اور بائیں کی کسی قدر کم!)

اِس بار جو تکلیف ہوئی اس کا تعلق Cervical Region یعنی گردن اور شانوں کے اتّصال کے قریب کی ہڈیوں سے ہے- اور اِس کا ظاہری سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اواخر دسمبر میں ایک ہفتہ تقریباً سات گھنٹے روزانہ بولنا ہوا- اور اِس بار چونکہ بعض کتب کا مطالعہ کراتا تھا لہٰذا خاصا وقت قدرے جُھک کر عبارتوں کو پڑھنے میں لگا ------ چنانچہ اِس بار بائیں شانے اور بازُو میں شدید درد رہا ------ جو تاحال ادویات کے ذریعے ہی کنٹرول میں ہے ------ اور اِن میں ذرا سی کمی سے عود کر آتا ہے!! ------ جملہ رُفقاء و احباب ------ اور قارئینِ 'میثاق' سے استدعا ہے کہ وہ دعا کریں کہ اللہ تعالےٰ جب تک اس دنیا میں رکھے صحت اور عافیت نصیب فرمائے رکھے تاکہ جو حقیر سی خدمت اُس کے دین کی' اسی تعؔ کے فضل و کرم سے بن آ رہی ہے' جاری رہے ------ باقی اِس بات پر' بحمد اللہ' یقینِ واثق حاصل ہے کہ تکلیف بھی اُس کے اذن ہی سے آتی ہے[1]' اور وہ بھی بندۂ مومن کے حق میں خیر ہی کا ذریعہ ہوتی ہے ------ تاہم برنبائے طبع بشری عاجزانہ درخواست ہے کہ ؎

" در حسابم را تو بینی نا گزیر - از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر! "

کے مصداق اگر میری سابقہ و حالیہ کوتاہیوں کا کفارہ دنیا ہی میں مقصود ہے

---

[1] مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○ (التغابن: ۱۱)

------تو اللہ تعالےٰ صبر و تحمّل بھی ارزانی فرمائے !!----- ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!!

لاہور کے معروف آرتھوپیڈک سرجن ڈاکٹر عبدالرّزاق قاضی صاحب پہلے بھی ہمیشہ بہت محبّت اور احترام کے ساتھ پوری توجّہ سے علاج کرتے رہے ہیں لیکن اِس بار تو مجھے ان کا بہت ہی وقت لینا پڑا - اور کم و بیش تین ہفتے تو تقریباً بلاناغہ روزانہ ایک گھنٹہ بجلی کی ایک خاص نوعیت کی 'سِنکائی' (DiathermY) اور عضلات اور عصبات کے تشنّج کو دُور کرنے کے لئے 'کھنچائی' (Traction) کے خاصے ناخوشگوار عمل میں صرف ہوتا ہے' اور اُن کا کرم یہ کہ یہ سب کام کسی نائب یا معاون کو نہیں کرنے دیتے بلکہ خود کرتے ہیں' اور اِن دونوں اعمال کے دوران احتراماً مسلسل میرے پاس بیٹھے رہتے ہیں حالانکہ مؤخّر الذکر عمل کے دوران میں اِس طرح مقیّد ہوتا ہوں کہ گفتگو تک نہیں ہو سکتی!------ اپنی جیب سے ادویات پر جو خرچ انہوں نے کیا وہ اس پر مستزاد ہے ------ یہ ساری تفصیل اِس لئے لکھ دی ہے کہ احباب و مخلصین اُن کے' اور ان کے اہل و عیال کے حق میں دعاءِ خیر کریں!

'نقضِ غزل' کی بارِ دگر اشاعت' اور اِس کی تکمیل کے عزم پر ہمیں حسبِ توقّع بعض خطوط تہدید و تنبیہ بلکہ عتاب و عناد پر مشتمل بھی موصول ہوئے اور بعض محبّت آمیز گِلوں شکووں پر مبنی بھی' یہاں تک کہ دسمبر کی ریفریشر کورس والی تربیت گاہ کے موقع پر بعض رفقاء و احباب نے بھی شدید تنقید کی' اور ایک محترم بہن (ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کی صاحب زادی) نے تو محبّت بھرے انداز میں یہ تنبیہ بھی کی کہ "کیا عجب کہ آپ کی علالت کا اصل سبب یہی ہو!" ------ بنابریں سب سے پہلے ہم اِسی بات کی وضاحت کئے دیتے ہیں کہ اِس سے ہماری غرض کیا ہے ------ اور بعض حضرات کے بقول: "اِس سے ہمیں کتنے نفلوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے؟"

ہمارے نظریات و افکار سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے نزدیک :

(۱) اِسلام کے موعودہ عالمی غلبے کے ضمن میں مشیّتِ ایزدی میں ارضِ پاک و ہند کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ (ا) گزشتہ چار صدیوں کے دوران تجدید دین کا سارا سلسلہ اسی خطّے سے متعلّق رہا۔ چنانچہ سوائے محمد ابن عبد الوہابؒ کی قدرے یک رخی شخصیّت کے حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی عظیم شخصیّتیں، اور تحریک شہیدینؒ جیسی عظیم تحریکِ جہاد سب اِسی خطّے میں رُونما ہوئیں! (ب) بیسویں صدی عیسوی کے درمیانی حصّے میں آزادی کی جو تحریکیں مختلف مسلمان ملکوں میں چلیں، اُن میں سے بھی صرف تحریکِ پاکستان میں اسلامی جذبے کو اپیل کیا گیا۔ چنانچہ پورے کرّۂ ارضی پر صرف پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جو اسلام کے نام پر بنا، اور اِس کے سوا کوئی اور جڑ بنیاد نہیں رکھتا۔ (ج) اِسی طرح چودھویں صدی ہجری کے مابین جتنے اعاظم رجال اِس خطّے میں پیدا ہوئے کہیں اور نہیں ہوئے، چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، علّامہ محمد اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد الیاسؒ، اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (رحمہم اللہ) کے مقابلے میں بیرونِ ہند صرف ایک نام لیا جا سکتا ہے ------ یعنی شیخ حسن البنّا شہیدؒ کا!

(۲) جملہ دینی مدارس اور اداروں کی خدمات اپنی جگہ، حضرات علماء کرام اور اصحابِ عِلم و فضل کی انفرادی مساعی کی اہمیّت بھی مسلّم، علماء کی بے شمار جمعیتوں کی گھن گرج اور اثر و نفوذ بھی اپنے مقام پر، ------ لیکن ہمارے نزدیک برّعظیم پاک و ہند میں اصل احیائی تحریکیں دو ہی ہیں: ایک جماعتِ تبلیغی، جس میں سارا زور عوامی سطح پر تجدید ایمان اور انفرادی اصلاح پر ہے ------ اور "فَکَّ کُلِّ نِظَامٍ" (شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نعرۂ مستانہ) کا نام لینا بھی اس کے نزدیک خلافِ مصلحت ہے، ------ اور دوسری تحریک جماعتِ اسلامی کی ہے، جس کا آغاز عہدِ حاضر کی صحیح ترین اور جامع ترین تحریک اقامتِ دین کی حیثیت سے ٹھیٹھ انقلابی رنگ میں ہوا تھا ------ لیکن جو 'بدقسمتی' سے پاکستان میں ایک

خالص سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر گئی (اگرچہ اس 'صحرائے تیہ' کی چالیس سالہ بادیہ پیمائی سے نہ صرف یہ کہ تاحال اُس کے ہاتھ پلّے کچھ نہیں پڑا بلکہ روز بروز ع "پر شب کی منّتوں نے تو کھو دی رہی سہی!" کے مصداق عزّت و آبرو کا دھیلا ہوتا چلا جا رہا ہے ------ اور اِس طرح گویا "اسلاف کی عزّت کے کفن" بھی سرِ عام بک رہے ہیں![1])

(۳) متذکرہ بالا 'بدقسمتی' کے اسباب کی صحیح صحیح تعیین تحریکِ تجدید احیائے دین اور سعی و جہدِ اقامتِ دین کے مستقبل کے لئے لازمی و لابدی ہے ------ تاکہ واضح طور پر متعیّن کیا جا سکے کہ اِس عظیم قافلے کو کب' کہاں' کیسے اور کیا حادثہ پیش آیا ------ تاکہ جو غلطی ہو گئی ہو اُس کا تدارک کیا جا سکے' جو کمی رہ گئی ہو اُس کی تلافی کی جا سکے' اور جو زیادتی ہو گئی ہو اس سے رجوع کیا جا سکے! ------ ورنہ شدید اندیشہ ہے کہ ایک مبہم سی مایوسی اِس قافلے کے بچے کھچے رہ نوردوں پر مسلّط ہو جائے گی' جذبے اور ولولے بالکل سرد پڑ جائیں گے اور کیا عجب کہ اسلام کے مستقبل اور اِس کے احیاء کے امکان کے بارے میں ایسی شدید بد دلی اور گہری مایوسی پیدا ہو جائے کہ ایک طویل عرصے کے لئے ع "اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا!" کا سماں بندھ جائے! ------ جب کہ ہمارے نزدیک شخصیّتوں اور تنظیموں سے بالاتر سطح پر اِسی 'تحریک' کے تسلسل کو برقرار رکھنا ہر باشعور مسلمان کے دین و ایمان کا بنیادی تقاضا ہے! اور اِس سلسلہ میں 'بحمد اللہ' ہمیں بعض اہم اور اساسی حقائق کا شعور و ادراک بہت پہلے ہو گیا تھا۔ چنانچہ "امّتِ مسلمہ کا عروج و زوال اور موجودہ احیائی مساعی کا جائزہ" نامی تحریر میں جو ابتداءً "میثاق" بابت اکتوبر نومبر ۷۴ء میں (گویا تنظیم اسلامی کے باضابطہ قیام سے لگ بھگ چھ ماہ قبل) شائع ہوئی تھی حسبِ ذیل صراحت موجود ہے:-

"اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور ملّت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں

---

[1] عرشی بھوپالی کے دلدوز اشعار ہیں ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر - تم نے اسلاف کی عزّت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض - اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے!

مکمل ہونے والا نہیں ہے بلکہ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کے مصداق درجہ بدرجہ بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل سے گزر کر پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں - تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے - پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اُس وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے"-

---

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ ہماری یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ تحریکِ اسلامی کے مستقبل کے لئے سابقہ غلطیوں کی صحیح صحیح اور بلا کم و کاست نشاندہی ضروری اور ناگزیر ہے لہٰذا اس کی مزید وضاحت کے لئے ہم ایک مثال کا سہارا لے رہے ہیں-

آپ ذرا ایک ایسی بہت بڑی مشین کا تصوّر کیجئے جس کے صرف دو چھوٹے چھوٹے پرزے خراب ہو گئے ہوں، دو کا عدد ہم نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، ورنہ ہماری تمثیل کے لئے تو ایک پرزے کا ذکر بھی کفایت کرتا ہے - اِس لئے کہ صرف ایک چھوٹے سے پرزے ہی کی خرابی سے کروڑوں روپے کی پوری مشین کھڑی ہو جائے گی ------ اور اگر اِس پرزے کی صحیح صحیح نشاندہی کر کے اُسے درست یا تبدیل نہ کر دیا جائے تو یا تو پوری مشین کباڑ خانے میں جائے گی یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اُس کے مختلف اجزاء کسی دوسری جگہ اضافی پُرزوں — (Spare Parts) کی حیثیت سے استعمال ہوں گے! ------ بالکل یہی معاملہ ایک تحریک کا ہوتا ہے کہ اِس میں جہاں اور جو غلطی ہو گئی ہو اس کی صحیح صحیح تشخیص نہ ہو سکے تو ہو سکتا ہے کہ تحریک کی ناکامی کے باعث اس کے کارکن اور وابستگان اس کے جملہ تصوّرات و نظریات اور کُل صُغرٰی کُبرٰی ہی کو غلط سمجھ

بیٹھیں اور تحریک کا سارا کیا دھرا اکارت چلا جائے (ملاحظہ ہوں فیضؔ کے اشعار مشمولہ 'نقشِ غزل' صفحہ ۸۵) اور پھر کوئی نیا آغاز ؎ "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کے مصداق بالکل ہی نئے سرے سے کرنا پڑے - اور "لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کی ارتقائی صورت پیدا نہ ہو سکے!

کاش کہ ہمارے دوست احباب' اور سابقہ و حالیہ رفقاء اور بزرگ اِس بات کو سمجھ لیں کہ مولانا مودودی مرحوم یا جماعتِ اسلامی کے ماضی و حال کے بارے میں کچھ لکھنے کا سبب ؎ "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ" کے نوع کی تفریحِ طبع نہیں ہے' بلکہ ہمارے متذکرہ بالا احساس کی شدّت ہے!

غالبؔ کے اِس شعر کے مصداق کہ ؎ "عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں - کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اُٹھا!" یہ اِسی شدّتِ احساس کا کرشمہ تھا کہ مجھ ایسے تصنیف و تالیف سے نابلدِ محض شخص کے قلم سے کُل ساڑھے چوبیس برس کی عمر میں سوا دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل بیان صادر ہو گیا' جس پر جو دوسری سندیں مجھے ملیں اُن سے قطعِ نظر' سب سے بڑا خراجِ تحسین یکے از اکابرینِ جماعت' جناب سیّد اسعد گیلانی صاحب کے ان الفاظ کی صورت میں ملا جو موصوف نے اب سے سات آٹھ سال قبل رفیق محترم قاضی عبدالقادر صاحب (کراچی) سے کہے تھے کہ: "میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ یہ بیان ڈاکٹر صاحب کا اپنا تحریر کردہ تھا' یہ تو اصل میں مولانا اصلاحی کا لکھا ہوا تھا جسے اُس وقت مصلحتاً ڈاکٹر صاحب سے منسوب کیا گیا!" اس جملے سے موصوف کی اپنی جس ذہنی اور مزاجی کیفیت کا سراغ ملتا ہے' اُس سے قطعِ نظر گیلانی صاحب جیسے کہنہ مشق ادیب اور بیسیوں کتابوں کے مصنّف شخص کی جانب سے یہ بلاشبہ 'ہجوِ ملیح' کے برعکس 'مدحِ کریہہ' کی صورت میں ایک بہت بڑا Compliment ہے!

اِس بیان کے 'شانِ صدور' کے ضمن میں یہ واقعاتی حقائق بھی پیشِ نظر رہیں تو اچھا ہے ——— کہ راقم جب ۳۰ ستمبر ۵۶ء کو اوکاڑہ میں جائزہ کمیٹی سے ملاقات اس کے سامنے 'پیشی' کے لئے حاضر ہوا تو بالکل خالی ہاتھ تھا - اگرچہ ذہن میں خیالات

لاوا بُری طرح پک رہا تھا- مَیں نے اپنے دُوسرے ساتھیوں (سیّد شیر محمد شاہ اور نور محمد قریشی وغیرہما) کو پہلے اندر بھیج دیا اور خود جس کمرے میں ملاقات ہو رہی تھی اُس کے باہر بر آمدے میں بیٹھ کر اپنی گفتگو کے لئے خاکہ (SYnopsis) مرتّب کیا- حُسنِ اتّفاق سے آج ہی اپنے فائل کو دیکھا تو اس میں اُن Notes کو محفوظ دیکھ کر مَیں خود بھی متحیّر ہو گیا جو میں نے اُس وقت تیار کئے تھے-اِس کے بعد جب کمیٹی سے ملاقات ہوئی اور میں نے اپنے خیالات شرح و بسط سے پیش کئے تو اُن حضرات کی جانب سے یہ سر سری سی فرمائش ہوئی کہ: "کیا آپ اپنے ان خیالات کو قلمبند نہیں کر سکتے؟" جس پر میں نے جواب دیا: "کوشش کروں گا' لیکن ہے بہت مشکل!"
------ اس کے ٹھیک سترہ دن بعد ۱۷ اکتوبر کو جب راقم نے لاہور میں اپنے بیان کا مسوّدہ شیخ سلطان احمد صاحب کے ہاتھ میں تھمایا تو انہوں نے نہایت تحیّر کے عالم میں سوالیہ انداز میں خراجِ تحسین پیش فرمایا کہ: "کیا واقعتہً آپ نے یہ اِن ہی دنوں میں لکھا ہے؟"

پھر میرے ساتھ وہ معاملہ کرنے کی بجائے کہ ع "وز درونِ من نہ جُست اسرارِ من!" خدارا اِن حقائق پر بھی غور کیا جائے کہ:

(۱) جماعت سے علیٰحدہ ہو کر نہ مَیں نے کوئی بیان دیا' نہ پریس کانفرنس کی' نہ ہی اس بیان کو شائع کیا- حالانکہ ایک جانب میرے پاس پیسوں کی اتنی تنگی تو کبھی بھی نہ تھی کہ یہ کتاب نہ چھپوا سکتا' ------ ۶۲ء تا ۶۵ء بھائیوں کے ساتھ کاروباری شراکت کے دور میں تو مَیں بحمد اللہ گویا دولت میں کھیل رہا تھا! اور دوسری جانب اِس نو عمری میں 'صاحبِ تصنیف' بننے کا شوق بھی دل میں گد گدی پیدا کر سکتا تھا------ ان سب کے باوصف میں نے اُس کی اشاعت کو اُس وقت تک مؤخّر کئے رکھا جب تک یہ حتمی فیصلہ نہ کر لیا کہ اب اپنے بل بوتے ہی پر کام کا آغاز کر دینا ہے اور اِسی فیصلہ کے تحت لاہور نقلِ مکانی کی!' اِس لئے کہ میرے نزدیک کسی جدید تعمیر کے لئے تو ناگزیر 'تخریب' کا جواز رومی کے اس شعر کے مصداق موجود ہے کہ ؎ "گفت رومی ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند! می نہ

وانی اول آں بنیاد را ویراں کنند! " لیکن تخریب محض یا تخریب برائے تخریب کو میں ہر گز جائز نہیں سمجھتا! اِس ضمن میں مولانا محمد منظور نعمانی کے ایک خط کے اقتباس کا عکس دیا جا رہا ہے' جو 'میثاق' کی اشاعت بابت نومبر ۶۶ء کے کوَر کے اندرونی جانب ٹائپ میں شائع ہوا تھا' اس کا آخری فقرہ لائق توجہ ہے:

''........ ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں نے بھی پڑھی، میرا خیال یہ ہے کہ جو کچھ بعد میں سامنے آیا اس کی پوری بنیاد آغاز ہی میں موجود تھی لیکن ہم اس کو اپنے ذہن کے مطابق سمجھتے اور ڈھالتے تھے، اسلام کی سر بلندی کا نصب العین زیادہ چھان پھٹک اور کھود کرید کرنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے باوجود کتاب بہت خوب ہے اور ۸۔۱۰ سال تک اس کو روکے رکھنے کا ان کا عمل تو بہت ہی قابل داد اور لائق سبق آموزی ہے۔

(مولانا) محمد منظور نعمانی
مدیر مسئول ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ

(۲) ۷۲-۱۹۷۱ء میں رفیق مکرّم شیخ جمیل الرّحمٰن صاحب سے ربط ضبط قائم ہوا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے بڑی تحقیق و تفتیش اور عرق ریزی و جاں فشانی سے کام لے کر ایک پوری کتاب کا مواد اکٹھا کر لیا ہے جس سے جماعتِ اسلامی کے فکر و عمل اور قول و فعل کا تضاد واقعات کے آئینے میں نمایاں ہو کر سامنے آجائے ------ لیکن میں نے ہر گز اُس کی اشاعت کی حوصلہ افزائی نہیں کی- اِس لئے کہ میرا پختہ خیال ہے کہ بات اصولی طور پر سامنے آنی چاہئے' اگر لوگ اسے نہیں مانتے تو خواہ کتنا ہی واقعاتی استشہاد کر لیا جائے اسے بھی ہر گز نہیں مانیں گے! ------ چنانچہ شیخ صاحب کی ساری محنت اکارت گئی اور جب اِس کی اشاعت کا سوال ہی باقی نہ رہا تو عدم توجہی کے باعث پورا مسودہ ہی گم ہو گیا!

(۳) راقم کے مزاج اور افتاد کی سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ ۷۶-۱۹۷۵ء کے لگ بھگ جب مولانا سیّد وصی مظہر ندوی کا جماعت سے اخراج عمل میں آیا ------ تو انہوں نے بھی جماعت کے خلاف ایک پوری کتاب کا مسودہ تیار کر لیا جو اشاعت کے لئے پریس جانے ہی والا تھا کہ بات میرے علم میں آ گئی- اِس پر میں نے اُن سے عرض کیا کہ: " مولانا اگر تو آپ نے عزم فرمالیا ہے کہ اب خود داعی کی حیثیت سے سامنے آ کر اپنے طور پر تحریک کا آغاز کر دینا ہے تو بسم اللہ اس

کتاب کو ضرور شائع فرمائیں اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ مخالفتِ محض برائے مخالفت مقصود ہے تو میں اس کی اشاعت کو جائز نہیں سمجھتا!" (واضح رہے کہ اِس فقرے کے دوسرے الفاظ میں تو کمی بیشی یا تقدیم و تاخیر کا امکان موجود ہے 'لفظ جائز مجھے قطعی اور حتمی طور پر یاد ہے!)- یہ اللہ تعالےٰ کے فضل اور مولانا کی طبعیت کی سلامتی کا مظہر ہے کہ انہوں نے راقم کی بات مان لی' اور کتاب کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا!! ؏ "پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں؟"

الغرض' اپنی جملہ تحریروں اور کاوشوں سے راقم کا اصل مقصد تحریکِ تجدید و احیاء اسلام اور سعیٔ دعوت و اقامتِ دین کے تسلسل کا برقرار رکھنا ہے- ورنہ ہمیں نہ پہلے مولانا مودودی مرحوم سے کوئی ذاتی عداوت یا پرخاش تھی نہ اب جماعتِ اسلامی سے کوئی دشمنی یا عناد ہے!بلکہ جیسا کہ 'نقضِ غزل' میں بیان ہوا مولانا نے تو عین ماچھی گوٹھ میں اور وہ بھی اس وقت جب کہ میں تین گھنٹے تک جماعتِ اسلامی کی پالیسی پر جرح و تنقید کے بعد سٹیج سے اترا ہی تھا مجھ سے بالمشافہ فرمایا تھا: "آپ کو معلوم ہے کہ مجھے آپ سے کتنی محبت ہے؟" ------ پھر میرے جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد ایک بار جب مولانا منٹگمری آئے اور وہاں آزاد میڈیسن کمپنی کے مالک عبدالرحمٰن آزاد کے مکان پر مقیم تھے تو میرے بارے میں استفسار کرنے والے لوگوں سے مولانا نے فرمایا تھا: "مجھے تو وہ اپنے بیٹوں سے بھی بڑھ کر عزیز رہا ہے! " ------ یہاں تک کہ ۷۶-۷۵ء کے آس پاس بھی جب بعض اسباب سے ہمارے مابین کشید گی عروج پر تھی مولانا نے میرے بارے میں فرمایا: "اس شخص کے بارے میں مجھے یہ اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی رہے گا دین کا کام کرتا رہے گا! " (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میری تالیف "اسلام اور پاکستان" کا دیباچہ-)

رہی جماعتِ اسلامی' تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہم نے اگر اپنی نوجوانی کے دس قیمتی سال ؎ "یہ اور بات کہ تم پر نثار کر دی ہے- عزیز اپنی جوانی کسے نہیں ہوتی! " کے مصداق اس کے ساتھ براہ راست تنظیمی ربط کی صورت میں نذر کئے

----- تو اس سے علیحدگی کے بعد سے اس ساعت تک ثلث صدی کے طویل عرصے کے دوران بھی ہمیں کبھی ایک لمحے تک کے لئے بھی اس کے مقصد اور نصب العین سے اختلاف نہیں ہوا، اور ہم نے اپنی صوابدید کے مطابق اپنی عمرِ عزیز کا ایک ایک لمحہ، اور اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا ایک ایک شمّہ اسی کی نذر کیا ہے! اور اسی کی قبولیت پر اپنی نجات کا دارومدار سمجھتے ہیں!

ہاں دو فکری 'بے اعتدالیاں' ہمیں اس تحریک کے اساسی نظریات میں نظر آئیں ----- جن میں سے ایک پر ہم نے کسی قدر مفصّل کلام کیا، اور دوسری کی اجمالی نشاندہی کی، اور اسی طرح دو ہی[1] عملی غلطیوں کا انکشاف ہم پر ہوا، اگرچہ وہ دونوں اتنی اساسی اور گمبھیر اور دور رس نتائج کی حامل تھیں کہ ایک نے اس کے رُخ ہی کو یکسر تبدیل کر دیا، تو دوسری نے اس کی چوٹی کی قیادت میں باہمی عدم اعتماد اور سُوءِ ظن اور اس سے آگے بڑھ کر نفرت و حقارت کے بیج بو دئے ----- ان میں سے پہلی کی تشخیص و تعیین کے لئے ہم نے متذکرہ بالا طویل بیان تحریر کیا تھا جو اب "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے طبع شدہ موجود ہے، اور دوسری کی تعیین و تبیین کے لئے 'نقضِ غزل' لازمی ولابدی ہے۔

جہاں تک جماعت کے تاسیسی افکار و نظریات کی 'بے اعتدالیوں' کا تعلق ہے، اُن میں سے ایک وہ ہے جس کا تذکرہ ہم نے اجمالاً ۱۹۶۶ء میں 'تحریکِ جماعتِ اسلامی' کی اشاعت کے موقع پر اس کے دیباچے میں ان الفاظ میں کیا تھا: (صفحہ ۱۸)

> " مولانا مودودی صاحب بیک وقت داعئ دین بھی ہیں اور متکلمِ اسلام بھی اور ان کی دعوت کے رگ و پے میں فطری طور پر ان کے کلامی نظریات سرایت کئے ہوئے ہیں - اب ظاہر بات ہے کہ مولانا مودودی اس دور کے متکلم ہیں جب کہ دنیا مختلف 'نظام ہائے حیات' کے نظری و فکری ادوار سے گزر کر عملی زندگی کی نہج قرار پانے اور پھر ان کے باہمی تصادم کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے - اس تاریخی پس منظر میں مولانا مودودی

---

[1] اسی مناسبت سے ہم نے مشین والی مثال میں دو پرزوں کی خرابی کا ذکر کیا تھا!

صاحب نے اسلام کا مطالعہ کیا تو وہ انہیں ایک 'بہترین نظامِ حیات' اور انسانی زندگی کے "تمام مسائل کا بہترین حل" نظر آیا - چنانچہ یہی ان کی دینی فکر کا مرکزی نقطہ بن گیا جس کے یمین و یسار انہیں اسلام کے عقائد، اس کی عبادات اور اس کی شریعت کے تفصیلی احکام صف بستہ نظر آئے، اور اس طرح انہیں دین کا اصل مطالبہ یہ نظر آیا کہ اس نظامِ کلّی کو نظامِ زندگی پر عملاً نافذ کر دیا جائے ------- یہ تمام باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن مولانا مودودی صاحب کی تحریروں پر ان کا اس قدر غلبہ ہے کہ دین کے دوسرے پہلو مثلاً بندے کا اپنے رب کے ساتھ تعلق اور اس میں عبدیّت، انابت، اخبات، تضرّع اور اخلاص منجملہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ------- اور جماعت اسلامی کی تحریک میں فرد پر اجتماعیّت، باطن پر ظاہریت، اور حیات اخروی پر حیات دنیوی اس طرح چھا گئے کہ اس کے کارکنوں کی زبان پر اگرچہ 'نجات اخروی' بھی رہی لیکن ان کی عملی سعی و جہد کا اصل مرکز و محور دنیا میں 'اقامت دین' بن کر رہ گئی"-

تاہم اس وقت بھی ہم نے مولانا وحید الدین خان کی کتاب "تعبیر کی غلطی" کے مرکزی خیال سے اختلاف کرتے ہوئے اُسے دوسرا انتہائی رخ قرار دیا تھا ------- اور پھر جب ایک سال بعد جب محولہ بالا رائے کی شرح "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے لکھی تو اس میں بھی تعبیر کی غلطی کی بجائے "تعبیر کی کوتاہی" کا عنوان اختیار کیا-

اور دوسری 'بے اعتدالی' کا مظہر وہ 'انتہاپسندی' ہے جس کا اظہار مولانا مودودی نے اوّلاً وطنی قومیت اور ثانیاً مسلم قومیت کی نفی کے ضمن میں کیا- جس کے بارے میں ہم نے ۱۹۷۴ء میں تو اس اجمالی اشارے پر اکتفا کیا تھا(لا سرافگندیم، صفحہ ۴۴)-

"ہمارے نزدیک اس موقف میں انتہا پسندی کی شدّت تو موجود ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا ٹھیٹھ نظریاتی اور اصولی موقف یہی ہے!"

لیکن ۱۹۸۷ء میں "جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی" نامی کتاب کے مقدمے میں قدرے وضاحت کی کہ:

"اُن کی اس انتہاپسندی کا اوّلین مظہر یہ تھا کہ انہوں نے متحدہ قومیت کو نہایت شدّ و مدّ کے ساتھ 'کفر' قرار دیا ------- اور کانگریسی مسلمانوں اور جمعیت علماء ہند اور اس کی قیادت پر نہایت جارحانہ ہی نہیں حد درجہ دل آزار تنقیدیں کیں" اور پھر "اس کے کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے مسلم قومیت کو بھی 'کفر بواح' کا ہم پلہ قرار دے دیا" (صفحہ: ۲۲)

اور اس طرح مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک یعنی تحریک پاکستان سے کامل علیحدگی ہی نہیں مخالفت ومخاصمت کی روِش اختیار کر لی!

لیکن اِن دونوں "بے اعتدالیوں" کے باوصف ہماری جو رائے تحریکِ جماعتِ اسلامی کے دورِ اوّل کے بارے میں تھی وہ ۵۶ء میں تحریر شدہ 'بیان' میں تو "دَورِ اوّل اور اس کے بنیادی افکار و نظریات" کی بحث کے اختتام پر "خاتمۂ کلام" کے عنوان سے ان الفاظ میں سامنے آئی تھی کہ:

"ان نقوش پر کہ جو صفحاتِ گزشتہ میں ثبت کئے گئے ہیں سرسری طور پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک اصولی اسلامی تحریک کے نقوش ہیں - واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک کا یہ دورِ اوّل کم از کم ظاہری اعتبار سے بالکل وہی نقشہ پیش کرتا ہے جو ہمیشہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کی تحریکوں کا خاصّہ رہا ہے - بالکل وہی افکار و نظریات و عقائد ------- اور بعینہٖ وہی دعوت پیش کی گئی کہ جو انبیاء کرام پیش کرتے آئے ہیں - اور بہت حد تک وہی نصب العین اختیار کیا گیا اور اس کے لئے وہی طریق کار اختیار کیا گیا کہ جو ان کی تحریکوں میں اختیار کیا جاتا رہا ہے - ان دونوں کے نقوش میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے اور بنظرِ ظاہر ان میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا -

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریک میں کوئی خامی اور کمی نہ تھی اور یہ ہر اعتبار سے مکمل تھی اس لئے کہ اس میں خامیاں اور کوتاہیاں بہرحال موجود تھیں جن پر آئندہ کسی جگہ مجھے بھی اپنی محدود بصیرت کے مطابق

کلام کرتا ہے[1]۔ لیکن جو بات ایک گونہ اطمینان اور وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تحریک اپنی نوعیت' اپنے بنیادی افکار و خیالات' اپنی دعوت اور اپنے طریق کار اور اس میں ترتیب اور تقدیم و تاخیر کے اعتبار سے تھی بہرحال اسلام کے اصولوں کے مطابق اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تحریکوں کے نقش قدم پر۔" (تحریکِ جماعتِ اسلامی صفحہ ۱۰۳)

اور پھر لگ بھگ ۲۱ برس بعد ۱۹۸۷ء میں بھی ہم نے بحمد اللہ "جماعت شیخ الہندؒ" کے مقدّمے میں جماعتِ اسلامی کے دَورِ اوّل کو "ایک خالص اصولی' اسلامی' انقلابی تحریک" ہی قرار دیا جو ۱۹۴۷ء تک "خالص اصولی اور انقلابی طریق پر عمل پیرا اور گویا منہاجِ نبوّت و رسالت پر قائم اور گامزن رہی!" (صفحہ ۲۲)

لیکن دو عظیم عملی غلطیوں کا معاملہ اِس کے برعکس ہے!

ان میں سے پہلی یعنی ۱۹۴۷ء میں طریق کار کی تبدیلی نے اس تحریک کی نوعیت ہی کو از سر تاپا بدل کر رکھ دیا۔ تاہم اس کے ضمن میں اس موقع پر کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے' اس لئے کہ راقم کی پوری تالیف "تحریک جماعت اسلامی" اسی کے دلائل و شواہد پر مشتمل ہے۔ یہاں ایک تو اس کے دوسرے حصّے یعنی "دورِ ثانی اور اس کی خصوصیات" کے "نتیجۂ کلام" کا یہ مختصر اقتباس کفایت کرے گا:

"اس دورِ ثانی کے نقوش کا سرسری سا مطالعہ بھی یہ واضح کر دینے کے لئے کافی ہے کہ اس میں 'ایک اصولی اسلامی جماعت' کی خصوصیات کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں ------ یہ ایک خالص بے اصولی قومی جماعت کا نقشہ پیش کرتے ہیں جو یا تو واقعی اسلام پسند ہے یا اپنی قوم میں برسر اقتدار آنے کے لئے اسلام کو بطور نعرہ (Slogan) استعمال کر رہی ہے۔

---

[1] یہ اشارہ ہے اپنی اس رائے کی جانب جو ہم نے دس سال بعد "تحریکِ جماعتِ اسلامی" کے دیباچے میں ظاہر کی اور جو ابھی قارئین کی نگاہوں سے گزر چکی ہے۔

میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۴۷ء میں جب طریقِ کار تبدیل کیا گیا تو دانستہ طور پر ان لازمی نتائج کو جاننے کے باوجود اور اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا کہ جو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہو رہی تھی لیکن یہ بہر حال میں سمجھتا ہوں اور اسی کو وضاحت کے ساتھ میں نے اس قدر طویل تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ طریقِ کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اب اس جماعت کی بنیادی نوعیت تک میں فرق واقع ہو چکا ہے"

(تحریک جماعت اسلامی صفحات ۲۰۲ - ۲۰۳)

اور دوسرے اُن بے شمار خطوط میں سے صرف چار کے اقتباسات کفایت کریں گے جو کتاب کی اشاعت پر موصول ہوئے تھے ------- اُن میں سے دو جماعتِ اسلامی پاکستان کے ایسے سابق ارکان کے ہیں جن کا ذکر 'نقضِ غزل' میں موجود ہے ------- اور دو کا تعلق بھارت سے ہے۔ (یہ خطوط 'میثاق' کے اگست اور ستمبر ۶۶ء کے شماروں کے کوَر کے اندرونی صفحات پر شائع ہوئے تھے۔)

★

"...... آپ کی معرکۃالآرا، وقیع اور تحقیقی تصنیف "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" نظر سے گذری ...... کتاب وقت کی ایک متحرک، جامع اور تاریخی تحریک سے متعلق ہے لہذا ظاہر ہے کہ بہت دلچسپی اور شوق سے پڑھی جائے گی...... علماء کے علاوہ خواص نے بھی اسے بالاستیعاب از ابتدا تا انتہا بہت ہی شوق سے پڑھا اور پڑھنے کے بعد بہت اطمینان اور خوشی کا اظہار فرمایا خصوصاً اس بات پر کہ آپ نے با ضابطہ جماعت میں اتنی کم مدت رہنے کے باوجود اور اس نو عمری میں ان حقائق و کوائف کا ادراک کیا اور پھر ایسے سلیس و متین پیرائے میں اور اس قدر مرتب اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش بھی کر دیا ...... بہر کیف آپ امت کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں ......

دل سے دعا نکلتی ہے کہ کاش جماعت جن مقاصد کے لیے قائم ہوئی تھی اور جن کا اس نے اپنے دور اول میں کسی حد تک عملی مظاہرہ بھی کیا اپنی بنیادی خامیوں کی اصلاح کے بعد پھر اسی کا عملی نمونہ پیش کرے۔ نہیں معلوم کتنے مضطرب قلوب اس کے منتظر ہیں! .... محترمی! ہمارے قلوب پژ مردہ ہو چکے ہیں، ہماری مایوسی انتہا کو پہنچ چکی ہے، ہم بہت ٹھوکریں کھائے ہوئے، مخدوع اور زخم خوردہ ہیں ...... اے اللہ ہمارے زخموں کی مرہم پٹی کے لیے کسی کو بھیج جو ہمیں ہر لحاظ سے ایسا بنا دے کہ ہم اسلام کے عملی ترجمان بن کر اپنے فرائض کی

انجام دھی میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں!.........

مکرمی! آپ نے تحریک کے دور ثانی میں بتدریج رونما ہونے والے جن نقائص و عیوب کا تذکرہ فرمایا ہے میرے خیال ہی میں نہیں بلکہ ہر منصف مزاج شخص یہ کہنے پر مجبور ہے کہ یہ بالکل بدیہی امر ہے ۔اور خود جماعت کے ارباب حل و عقد اور اصحاب فکر و نظر کو بھی اس کا پورا احساس ہے لیکن اصلاح کے لیے جس ہمت مردان و جرأت رندان کی ضرورت ہے وہ مفقود ہے ...... وہاں تو لومۃ لائم سے بڑھ کر یہ احساس سد راہ ہے کہ ہم اپنے طویل سفر پر کس طرح پانی پھیر سکتے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان زخارف سے لا پرواہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ نہیں معلوم کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد آپ کن "مشکلات" اور "لوازمات" سے دو چار ہوں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ رکھے، آپ سے کوئی ٹھوس اور محکم خدمت لے اور اس راہ کے تمام موانع و عوارض کو دور فرمائے......."

'.......'

(Academy
Islamic Research & Publications.
Nadwatul Ulama,
LUCKNOW)

★

"........... جماعت کے ماضی و حال کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہو کر ثابت ہو گئی ہے کہ ؏

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

حکیم انتظارالحق تکمیلی
بیسل پور - پیلی بھیت (یو- پی) بھارت

★

"......اسی اثنا میں "تحریک جماعت اسلامی" کا مطالعہ کیا ۔ تقریباً وہ سب باتیں آپ نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جائزہ کمیٹی کو ہم لوگوں نے نوٹ کرائی تھیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باتیں ہماری ہیں قلم آپ کا ہے اور آپ نے ہم سب کی بھرپور نمائندگی کی ہے......یہ کتاب محض آپ کی نہیں ہے اور اس میں صرف آپ کے دل کی دھڑکنیں نہیں بلکہ ان سینکڑوں افراد کا درد دل بول رہا ہے جو کراچی سے پشاور تک پھیلے ہوئے ہیں......

......ماچھی گوٹھ کے بعد جماعت نے جس تیزی کے ساتھ اپنے مقصد سے انحراف کیا ہے ۔ آگرے ہوئے نوالوں کو جس طرح چبایا ہے اور تقیہ سے لیکر ہیر پھیر کے جتنے بھی پینترے اس نے بدلے ہیں ان کا تجزیہ ضروری تھا جس کی کمی کتاب میں محسوس ہوتی ہے......"

نجیب صدیقی ، شاہی بازار ، سکھر

★

"...... آپ کی کتاب...صاحب سے لیکر دیکھی ، جماعت اسلامی کے پرانے اور نئے موقف کا تضاد آپ نے خوب واضح کر دیا ہے ۔ افراد کے کردار میں گراوٹ کے جو اسباب آپ نے بیان کئے ہیں وہ صحیح ہیں ، اگر جماعت پرانے موقف پر چلتی رہتی تو زوال پذیر نہ ہوتی یا کم از کم اس قدر جلد نہ ہوتی......بہر حال آپ کا تجزیہ بنیادی طور پر صحیح ہے اور دس سال قبل کی تحریر ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ستائش کی مستحق ہے..."

ظفرالاحسن ، ناظم آباد ۔ کراچی

تاہم یہ واضح رہنا چاہئے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے رخ کی اس تبدیلی کو نہایت اساسی اور حد درجہ دور رس نتائج کی حامل سمجھنے کے باوجود' راقم نے اسے کبھی کسی بدنیتی پر مبنی قرار نہیں دیا- اِس سلسلے میں راقم نے اپنے بیان جائزہ کمیٹی کے آخری باب "تبدیلی کیوں؟" میں ان تمام دلائل کو ردّ کرنے کے بعد جو جماعت کی قیادت کی جانب سے اس تبدیلی کے جواز کے طور پر وقتاً فوقتاً پیش ہوئے "اصل وجہ" کے عنوان کے تحت لکھا تھا :

"سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر تمہارے خیال میں اس تبدیلی (بلکہ تمہاری رائے میں تحریکِ اسلامی کی "راہ راست سے اس انحراف") کی وجہ کیا ہے- اس سوال کا جواب میرے ذمے ہے اور اس کا وعدہ میں صفحہ ۱۳۰ پر بھی کر آیا ہوں-

میں اگر ایک لفظ میں اس اصل وجہ کو بیان کرنا چاہوں تو وہ ایک لفظ "عجلت پسندی" ہے- لیکن میں چاہتا ہوں کہ ذرا اس کی تفصیل بیان کر دوں- خصوصاً اس غرض سے کہ اس "دورِ فتن" میں جب کہ طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں کہیں میں بھی ان لوگوں کے زمرے میں شریک نہ سمجھا جاؤں جو محض بیانِ حال ہی پر اکتفا نہیں کر رہے ہیں بلکہ نیتوں تک کو زیرِ بحث لا کر فضا کو مکدّر کر رہے ہیں-

میری رائے میں عجلت پسندی کہنے کو تو ایسی چیز ہے کہ جس کے بارے میں معمولی استعداد اور تھوڑی سی صلاحیت رکھنے والا شخص بھی فوراً کہہ دے گا کہ یہ ایک نہایت غلط اور بڑی مہلک چیز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور انسان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے اس میں ایک جزو لاینفک کے طور پر موجود ہے- یہ مفہوم جو میں نے اپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے قرآن مجید کا بیان کردہ ہے "خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ" (الانبیاء : ۳۷ "بنا ہے انسان جلدی کا" ترجمہ شیخ الہندؒ) اور "وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا" (بنی اسرائیل: ۱۱ "اور ہے انسان جلد باز") کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں حقیقت کے اعتبار سے معانی اور مفہوم کے دریا بند ہیں"-

اور اس کے بعد 'عجلت پسندی' کے موضوع پر آٹھ دس صفحات پر پھیلی ہوئی ایک بحث[1] کے بعد ---- (جس کی علمی حیثیت کو مولانا اصلاحی نے ایک موقع پر بہت سراہا تھا) آخر میں راقم نے دوبارہ عرض کیا تھا کہ :

"میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اس کے سوا کسی اور بری نیّت یا 'Malafide' کو برسر کار نہیں پاتا۔ اسے غلطی میں ضرور سمجھتا ہوں لیکن اس غلطی کو میں جذبۂ عجلت پسندی پر محمول کرتا ہوں' کسی بری نیت یا ارادے پر مبنی نہیں سمجھتا!"

اور بحمد اللہ راقم اب بھی اسی رائے کا حامل ہے!

دوسری عظیم عملی غلطی جس نے ٹائم بم کے مانند 'نقضِ غزل' کی صورت میں مہیب دھماکہ کیا اور جماعت اسلامی کی بنیادوں تک کو ہلا ڈالا' جماعت کی ہیئتِ تنظیمی سے متعلق ہے۔ اور جہاں پہلی غلطی کی نوعیت ایسی تھی کہ جیسے کوئی انسان ایک خاص رخ پر چلتے چلتے دفعتہً اپنا رخ تبدیل کر لے اور اس کے بعد پھر سیدھی لائن پر چلنا شروع کر دے تو خواہ ابتداء میں رخ کی یہ تبدیلی معدودے چند ہی درجوں کے زاوئے کے مساوی ہو لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھے گا اُس کا فاصلہ سابق رخ سے بڑھتا چلا جائے گا ---- اور گو اسے خود بھی محسوس ہو گا کہ وہ کچھ صحیح رخ پر نہیں بڑھ رہا ہے لیکن جب تک وہ اُس خاص نقطے کا تعیّن نہ کر لے جہاں سے زاویہ بدلا تھا وہ کبھی اپنی غلطی کی صحیح تشخیص نہیں کر سکے گا۔ اس لئے کہ اُس خاص نقطے کے بعد سے تو وہ پھر خطِ مستقیم ہی پر چل رہا ہو گا' چنانچہ ہر پچھلا قدم اگلے قدم کے لئے جواز فراہم کر دے گا!! ---- وہاں اِس دوسری غلطی کی نوعیت اُس سرطان کی سی تھی جو بظاہر صحت مند اور ہر طرح سے چاق و چوبند شخص کے جسم میں خاموشی کے ساتھ اندر ہی اندر جڑیں پھیلاتا رہتا ہے یہاں تک کہ بالکل اچانک پورا جسم ع "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" کے مصداق متعفن

---

[1] ملاحظہ ہو 'تحریک جماعتِ اسلامی' صفحہ ۲۱۶ تا ۲۲۵

پھوڑوں سے پھل جاتا ہے ------ چنانچہ اوّل تو صرف 'نقشِ غزل' میں جو مواد شامل ہے اُسی سے اُس مسموم اور متعفّن فضا کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو ۵۷-۱۹۵۶ء میں جماعتِ اسلامی کے چوٹی کے قائدین کے باہمی تعلقات کے ضمن میں پیدا ہو گئی تھی ------ اور اگر اس کی شدت کا بھرپور اندازہ کرنا ہو تو اُس خط و کتابت پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہو گا جو مولانا اصلاحی کے رکنیتِ جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد ان کے اور مولانا مودودی کے مابین ہوئی۔

یہ عظیم اساسی غلطی جو جماعتِ اسلامی کی ہیئتِ تنظیمی میں ۔ "خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج - تاثریا می رود دیوار کج!" کے مانند پیوست ہو گئی تھی، یہ تھی کہ:

> حقیقت نفسُ الامری کے اعتبار سے تو جماعت اسلامی ایک داعی کی دعوت پر جمع ہونے والے لوگوں پر مشتمل تھی چنانچہ داعی کو از خود امیر و قائد کی حیثیت حاصل تھی اور جمع ہونے والے لوگوں کی حیثیت اصلًا اُس کے اعوان و انصار کی تھی ------ لیکن مختلف اسباب کی بنا پر ظاہری اعتبار سے اس کا ڈھانچہ ایک ایسی دستوری اور جمہوری تنظیم کے طرز پر اٹھایا گیا جو کچھ لوگوں کے باہمی اتفاق رائے سے وجود میں آتی ہے اور جس کا صدر یا امیر ان کے ووٹوں سے منتخب ہوتا ہے!!

اب ظاہر ہے کہ مقدم الذکر نوعیت کی جماعت میں قیادت کی اصل ذمہ داری 'داعی امیر' کی ہوتی ہے، وہی پالیسی معین کرتا ہے، اسی کی صوابدید ہر معاملے میں فیصلہ کن ہوتی ہے چنانچہ وہ صرف اپنی 'ضرورت' کے بقدر ساتھیوں سے مشورہ کرتا ہے، اور ساتھی اپنے امکانی 'اجتہاد' کو بروئے کار لا کر مشورہ دیتے ہیں، اور مشورہ پیش کرنے کے بعد اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے ہیں، اور آخری فیصلہ کا معاملہ اپنے داعی و قائد پر چھوڑ دیتے ہیں ------ اس نوع کی کسی تنظیم کے ساتھ اگر "اسلامی" کا سابقہ یا لاحقہ بھی لگا ہوا ہو تو حدیث نبویؐ:

"لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ"

کے مطابق' جس کا تقاضا ہے کہ داعی ہو یا قائد' صدر ہو یا امیر' حتیٰ کہ حاکم اور سلطان ہو یا خلیفہ' کسی کی بھی اطاعت کسی ایسے معاملے میں نہیں کی جا سکتی جو شریعت کے خلاف ہو' اس تنظیم یا جماعت میں بھی "سمع و طاعت" تو بھرپور انداز میں ہو گی لیکن "معروف" کے دائرے کے اندر اندر! ——— جب کہ مؤخر الذکر نوعیت کی تنظیم کے منتخب سربراہ کو نام خواہ صدر کا دیا جائے خواہ امیر کا' اسے اصلاً کوئی امتیازی حیثیت اپنے ساتھیوں پر حاصل نہیں ہوتی اور جو کچھ اختیار اس کے پاس ہوتا ہے ساتھیوں ہی کا تفویض کردہ ہوتا ہے' جسے وہ جب چاہیں واپس بھی لے سکتے ہیں' اس نوع کی تنظیم میں مشورہ کرنا صدر یا امیر کا "فرض" اور ساتھیوں کا "حق" ہوتا ہے اور سربراہ کے لئے لازم ہوتا ہے کہ اکثریت کی رائے کی پابندی کرے!!

'عکسِ غزل' کی تیسری قسط جس پر اب "مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی رفاقت کا تاریخی پس منظر' اور جماعت اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ" کا عنوان قائم ہوا ہے' جب نومبر ۱۹۷۶ء کے 'میثاق' میں شائع ہوئی تو مولانا اصلاحی کی جانب سے تو اس کی کامل اور صراحتہً تصویب ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کے تاثر اور تبصرہ کا ایک حصہ تو وہ ہے جو دسمبر ۷۶ء کی اشاعت کے کور پر شائع کر دیا گیا تھا ——— یعنی:

> ''عکس غزل' کی گزشتہ قسط راقم الحروف نے اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر تحریر کی تھی اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے علم میں وہ طباعت کے بعد ہی آئی' لیکن بحمد اللہ مولانا نے نہ صرف اس کی مجموعی اعتبار سے مکمل تصویب فرمائی بلکہ شدت تاثر میں بار بار یہ شعر مولانا کی زبان پر جاری ہوتا رہا کہ
>
> سر خدا کہ عارف وسالک بکس نہ گفت
> در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!
>
> اس مضمون کی حالیہ قسط میں راقم الحروف نے مولانا کے موقف سے اختلاف بھی کیا ہے اور اس پر تنقید بھی کی ہے۔ مولانا کی انصاف پسندی سے توقع ہے کہ وہ اس پر بھی 'ہمدردانہ' غور فرمائیں گے۔
>
> اسرار احمد'

مزید برآں مولانا کے یہ الفاظ بھی ہمیں واضح طور پر یاد ہیں کہ: "آپ نے تو جماعت کی ایسی تاریخ لکھ دی ہے کہ اگر خود میں بھی کوشش کروں تو اس خاکے میں

صرف واقعاتی رنگ مزید بھرنے کے سوا اور کوئی اضافہ نہیں کر سکتا!"
——— مولانا مودودی مرحوم کی جانب سے بھی 'سکوت' کو کامل توثیق نہ سہی 'نیم رضا' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت اس کے حوالے سے دو باتیں ذہن میں تازہ کر لی جائیں:

ایک یہ کہ مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی اور بعض دوسرے نمایاں علماء کے جماعت سے علیحدہ ہو جانے کے بعد مولانا اصلاحی کو جماعت اسلامی میں واضح اور مسلّم طور پر 'شخص دوم' کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ جماعت کی ہیئتِ تنظیمی کے ضمن میں مولانا مودودی کے نظریات اور تصورات اوپر بیان شدہ مقدم الذکر نوعیت کے تھے، جب کہ مولانا اصلاحی مؤخر الذکر نظریے اور تصور کے حامل تھے۔

چنانچہ ان 'دو بڑوں' کے مابین 'سترہ سالہ رفاقت کے دوران' دعوتی اور تحریکی سرگرمیوں میں "یک جان دو قالب" کی حد تک رفاقت اور مثالی تعاضد و تناصر کے باوصف اندر ہی اندر ایک کشمکش بھی جاری رہی، جو آغاز میں تو محض ایک علمی اختلاف کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن قیام پاکستان سے متصلاً قبل ۱۹۴۶ء میں الٰہ آباد کے سالانہ اجتماع میں اس کے ضمن میں تلخی کا ظہور ہو چکا تھا، چنانچہ قیامِ پاکستان کے بعد کے دس سالوں کے دوران یہ ایک 'سرد جنگ' کی صورت میں مرکزی مجلس شوریٰ کی سطح پر جاری رہی اور بالآخر اس نے 'مقطع غزل' کے تیز و تند حملے کی صورت میں ظہور کیا۔ جس کی ذمہ داری کا اگر پچھتر فی صد حصہ مولانا مودودی پر آتا ہے تو کم از کم پچیس فی صد بار مولانا اصلاحی پر بھی ہے!!

راقم الحروف کو اقامت دین کے مقصدِ عظیم کے لئے 'برپا' ہونے والی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی اور اس کے امیر اور دوسرے شرکاء کے مابین تعلقات کی نوعیت، اور بالخصوص قائد اور امیر کے حقوق و اختیارات کے ضمن میں مولانا مودودی کی رائے کا اندازہ تو اگرچہ حالات و واقعات کے بین السطور سے پوری طرح ہو گیا تھا (جیسے کہ 'مقطع غزل' کے متذکرہ بالا حصے سے ظاہر ہے) لیکن ا

کے سامنے اس موضوع پر مولانا مرحوم کی کوئی واضح تحریر موجود نہ تھی ------ مولانا نے اس سلسلے میں جو تقریر کوٹ شیر سنگھ کی شوریٰ میں کی تھی اس کی اڑتی اڑتی سی خبریں ملیں تو تجسّس تو بڑھ گیا لیکن تفصیلات کے حصول کی کوئی سبیل نظر نہ آئی اور متعدّد رابطوں کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا!

اسی اثناء میں ۸۳-۱۹۸۲ء کے لگ بھگ زمانے میں حیدر آباد (دکن) سے مولانا محمد یونس (مرحوم) کی تالیف "خطوط کے چراغ" موصول ہوئی تو مولانا مودودی کے ایک مکتوب میں، جو قیامِ جماعت سے چھ ماہ قبل مارچ ۱۹۴۱ء میں تحریر ہوا تھا، موضوع زیرِ بحث پر ان کی سوچ واضح طور پر سامنے آ گئی۔ اس لئے کہ اس خط میں مولانا مرحوم نے بیعت کی اقسام کے ضمن میں بیعتِ نظمِ جماعت کا ذکر نہایت صراحت و وضاحت اور عزم و جزم کے ساتھ کیا ہے ------ جو حسب ذیل ہے:

> "۳- تیسری بیعت وہ ہے جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطیع ہے، اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ "مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ" اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان سب سے مراد تیسری بیعت ہے کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے[۱]"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں مولانا مودودی مرحوم کے نظریات کمالِ شرح و بسط کے ساتھ اُن کی اُس تقریر میں سامنے آئے جو ہفت روزہ 'آئین' نے

---

[۱] مولانا مرحوم کے اس خط کے ضمن میں ہفت روزہ 'تکبیر' کراچی نے کچھ غلط بحث اور مغالطہ آمیزی کی سعی کی تھی جس پر ہماری جانب سے وضاحت ارسال کر دی گئی تھی لیکن افسوس کہ اسے پورا شائع نہیں کیا گیا۔ تاہم 'میثاق' میں یہ پوری بحث ۱۹۸۶ء میں شائع ہو گئی تھی اور دوبارہ مارچ ۸۹ء کی اشاعت میں بھی!

شائع کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے شکریہ کے ساتھ فوراً 'میثاق' میں من و عن شائع کر دیا۔ (اس لئے کہ ہم تو اس کے ایک عرصے سے متلاشی تھے!)

مولانا مرحوم کے جو افکار اور نظریات اس تقریر (یا تحریر) کے ذریعے سامنے آئے ہیں' اُن میں سے بعض سے ہمیں شدید اختلاف بھی ہے (جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے) لیکن جہاں تک تحریکِ اسلامی کے قائد اور امیر کے حقوق و اختیارات کا معاملہ ہے اس کے ضمن میں ہم اُن سے صد فی صد متفق ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر اُس تحریک کے پیشِ نظر محض اصلاحی یا تبلیغی کام نہ ہو' بلکہ حقیقی معنیٰ میں 'اقامتِ دین' یعنی دین کے کامل نظامِ عدل و قسط (SYstem of Social Justice) کا قیام یا بالفاظِ دیگر 'اسلامی انقلاب' ہو تو اس کے لئے قائم ہونے والی جماعت یا تنظیم کے امیر کے حقوق و اختیارات وہی ہونے چاہئیں جو مولانا نے بیان کئے ہیں۔ بالخصوص جبکہ اس کی حیثیت 'داعی امیر' کی ہو یعنی اسی کی دعوت اور اسی کے افکار و نظریات کی اساس پر وہ جماعت یا تنظیم وجود میں آئی ہو ------ تاہم ہماری پختہ رائے ہے کہ یہ تصورات صرف نظامِ بیعت سے مناسبت رکھتے ہیں اور کسی دستوری اور جمہوری تنظیم میں اِن کو بہ تمام و کمال سمونا تو ممکن ہی نہیں ہے' لیکن اگر کسی مجبوری کے باعث ایسا کرنا لازمی ہو تو اس میں امیر یا صدر کے حقِ استرداد (Veto) کا غیر مبہم انداز میں تسلیم کیا جانا ضروری اور لابدی ہے!

جہاں تک ہمارا تعلق ہے' بحمد اللہ' ہم پر یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد جلد ہی 'منکشف'[1] ہو گئی تھی ------ چنانچہ ہم نے اللہ کے فضل و کرم سے مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور قائم کی تو اُس میں بھی اپنا

---

[1] اس لفظ کا واقعاتی پس منظر بہت دلچسپ ہے۔ راقم جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک تو لاہور اور فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے اکابر (مولانا اصلاحی' مولانا عبد الغفار حسن اور حکیم عبد الرحیم اشرف وغیرہم) کے ساتھ کسی نئی تنظیم کی تشکیل کی مساعی میں مصروف رہا۔ لیکن اوائل ۵۹ء میں اُن سے مایوس ہو کر ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی مرحوم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے کراچی ہجرت کر گیا۔ وہاں بھی ایک خاصا بڑا گروپ "خوارج" کا موجود تھا اور

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

وبیعت تسلیم کرایا اور اس کے بعد تنظیم اسلامی قائم کی تو اُس کی اساس بھی 'بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف' پر رکھی۔ اور اگرچہ اس میں اصل دخل تو ـــــــــــ

"وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ"

کے مصداق اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و احسان ہی کا ہے' تاہم ایک حد تک یہ سہولت بھی ہمیں حاصل تھی کہ ہمارے سامنے جماعتِ اسلامی کا تکلیف دہ تجربہ اور 'نقضِ غزل' کی عبرت انگیز مثال موجود تھی۔

مولانا مودودی مرحوم کے ۱۹۴۱ء کے خط اور ۱۹۵۷ء کی تقریر سے یہ بات بلاشائبہ ریب و شک ثابت ہو جاتی ہے کہ اصلاً مولانا مرحوم کا ذہن بھی یہی تھا۔ اور ہمارے نزدیک وہ کوہ ہمالیہ جتنی بڑی غلطی جو مولانا سے قیامِ جماعت کے موقع پر سرزد ہوئی یہی تھی کہ انہوں نے جماعت کی اساس 'بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف' پر نہیں بلکہ ایک دستور پر قائم کی۔ جس کے نتیجے میں اُن کی جو حیثیت معیّن ہوئی وہ ایک دستوری تنظیم کے 'منتخب امیر' کی تھی۔ جبکہ نہ صرف یہ کہ حقیقتِ واقعی کے اعتبار سے وہ 'داعی امیر' تھے' بلکہ اُن کے ذہن اور مزاج کی ساخت بھی اُسی سے مناسبت رکھتی تھی ـــــــــ اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی کی ان دو حیثیتوں' یعنی حقیقی اور واقعی حیثیت اور دستوری و قانونی حیثیت' کے مابین فرق و تفاوت بلکہ

بقیہ حاشیہ صفحۂ سابقہ:

ان کے مابین اُن دنوں کیسی نئی جماعت کے ضمن میں ہیئتِ تنظیمی کا مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ چنانچہ راقم بھی اس مسئلے کے حل میں سرگرداں ہو گیا ـــــــــ اسی اثناء میں ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ راقم نمازِ عشاء کے بعد مطب سے فارغ ہو کر کیماڑی سے ناظم آباد واپس آنے کے لئے بس میں سوار ہوا تو ذہن اسی ادھیڑ بُن میں مصروف ہو گیا اور راقم اس میں اس درجہ مستغرق ہوا کہ اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ کب بس ٹاور سے گزری اور کب صدر پہنچی۔ لیکن جیسے ہی ڈرائیور نے ایمپریس مارکیٹ پر بریک لگایا میں ایک دم چونک سا گیا اور اسی لمحے میرا مسئلہ حل ہو گیا اس لئے کہ عین اسی وقت سورۃ الصف کی آخری آیت میرے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گئی اور یہ حقیقت 'منکشف' ہو گئی کہ یہ مسئلہ "مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ؟" کے الفاظ کے حوالے سے 'داعی اور اس کے اعوان و انصار' کے اساسی تصور کے ذریعے ہی حل ہو سکتا ہے!

کشاکش اور تصادم ہی کے بطن سے اُن جملہ پیچیدگیوں نے جنم لیا جن کے نتیجے میں و
متعدد مواقع پر موردِ الزام بنے' اور اُن کے بعض اقدامات اس درجہ قابلِ اعتراض
صورت میں سامنے آئے کہ ان کی بنا پر اُن کی نیت تک پر شک کی گنجائش پیدا ہو
——— اس لئے کہ اگرچہ جماعت کے پہلے اجتماع میں مولانا مرحوم نے یہ وضاحت
کر دی تھی کہ: "اسلامی جماعت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے صاحبِ ام
کے انتخاب میں تقویٰ اور دیانت ہی تلاش کرتی ہے اور اسی بنا پر وہ اپنے معاملات
پورے اعتماد کے ساتھ اُس کے سپرد کرتی ہے"۔ لیکن چونکہ دستور جماعت میں امیر
کے لئے ویٹو کا حق طے نہیں کرایا' لہٰذا بات گول مول رہ گئی!

اس سلسلے میں تأسیسِ جماعت کے عین موقع پر اگر موجود الوقت ظروف
احوال کے پیشِ نظر صورتِ معاملہ کے کسی قدر گول مول اور مبہم رہنے کے لئے
کوئی وجہ جواز تسلیم کر بھی لی جائے' تو جماعت کے پہلے تنظیمی بحران کے بعد تو اس کے
لئے قطعاً کوئی جواز باقی نہ رہا تھا جب بہت سے 'اکابر' (مولانا محمد منظور نعمانی' مولانا سید
ابوالحسن علی ندوی وغیرہم) امیر جماعت میں اسی 'تقویٰ' کی کمی کے (صحیح یا غلط
احساس کی بنا پر جماعت سے علیٰحدہ ہو گئے تھے اور باقی رہنے والے لوگوں میں سے اہم
نمایاں ترین شخص (مولانا اصلاحی) نے' جنہیں اب واضح طور پر 'شخصِ دوم' کی حیثیت
حاصل ہو گئی تھی' امیر کے حقِ استرداد کے خلاف نہ صرف یہ کہ علانیہ موقف اختیار
کر لیا تھا بلکہ ڈٹ کر مورچہ لگا لیا تھا——— اس موقع پر اگر مولانا مودودی اُن کے
دلائل سے قائل ہو جاتے تب تو معاملہ دوسرا ہوتا' بصورتِ دیگر راست معاملگی
(Straight Dealing)' بلکہ دور اندیشی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ مولانا بھی پوری
طرح ڈٹ جاتے اور نہ کسی شخصیت کا لحاظ کرتے نہ کسی فوری مصلحت کے تحت
کھاتے! لیکن افسوس کہ مولانا نے اس موقع پر وقتی مصلحت ہی کو پیشِ نظر رکھا
اور اُس 'عزیمت' کے عشرِ عشیر کا بھی مظاہرہ نہ کیا جس کا اظہار اُن کی جانب سے
دس گیارہ سال بعد ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان کے موقع پر' یا اس کے بعد ہو
——— لہٰذا معاملہ پھر گول مول ہی رہ گیا!

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیامِ پاکستان کے بعد جب جماعت کے سیاسی میدان میں

ملا تک لگا دینے کے باعث حالات و واقعات کی رفتار تیز ہوئی تو نو دس سال تک صورت یہ رہی کہ چونکہ مولانا مودودی کا ذہن اور مزاج تو وہی تھا جو اوپر بیان ہو چکا ہے' لہٰذا ن کا مستقل طرزِ عمل یہ رہا کہ ہر بڑا فیصلہ خود کر لیتے اور اس کا اعلان و اظہار بھی سی خطاب عام' یا اخباری بیان' یا ماہنامہ ترجمان القرآن کے 'اشارات' میں کر دیتے[1] ور پھر جب مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہوتا تو وہ غریب اس صورتِ حال پر سر پکڑ کر رہ باتی کہ اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ چنانچہ بعض مواقع پر شوریٰ کے ارکان اس لرز پر بھی سوچتے کہ میاں طفیل محمد صاحب کو قیّمِ جماعت کی بجائے صرف ناظمِ دفتر کی حیثیت دی جائے' اور مولانا مودودی کو پابند کیا جائے کہ وہ شوریٰ سے پیشگی مشورہ لئے بغیر کسی نئے اقدام کا اعلان نہ کریں۔ (یہ روایت حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب کی ہے جو انہوں نے حالیہ ملاقات میں بیان کی۔)

امیر جماعت اور مرکزی مجلسِ شوریٰ کے مابین اسی کشمکش کا نتیجہ تھا کہ بالآخر دستورِ جماعت میں یہ پیچ در پیچ فارمولا طے پایا کہ: اگر کسی معاملے میں امیرِ جماعت بھی اپنی رائے پر اصرار کرے' اور مجلس شوریٰ کی اکثریت بھی کسی مقابل رائے پر مُصِر ہو جائے تو اس معاملے میں جماعت کے عام ارکان سے استصواب کیا جائے گا۔ پھر اگر ارکانِ جماعت کی اکثریت امیر کی رائے کے حق میں فیصلہ دے دے گی تو امیر اپنے منصب پر برقرار رہے گا جبکہ شوریٰ معزول ہو جائے گی اور اس کا نیا انتخاب ہو گا' اور اگر برعکس صورت پیدا ہو جائے تو امیر معزول ہو جائے گا اور نیا امیر منتخب کر لیا جائے گا!

جماعتِ اسلامی کی پوری تاریخ میں دستورِ جماعت میں طے شدہ اس راستے کو عملاً اختیار کرنے کا پہلا اور آخری موقع نومبر دسمبر ۵۶ء کی اُس شوریٰ میں آیا تھا جس میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوئی۔ شوریٰ کے اس طویل ترین اجلاس کے

---

[1] اپنے اس طرزِ عمل کا صریح اعتراف مولانا مودودی نے نہایت اعتماد اور طمانیت کے ساتھ جنوری ۵۸ء میں مولانا اصلاحی کے نام خط میں کیا ہے کہ: "میں اسی رائے کو حق سمجھتا ہوں' ہمیشہ اسی کو ظاہر کیا ہے' اور تشکیلِ جماعت کے بعد سے آج تک اسی پر عملاً کام کر رہا ہوں!"

دوران ارکانِ شوریٰ کے مابین جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں جو ا
انتہائی متضاد نقطہ ہائے نظر سامنے آئے اُن پر جانبین کے اصرار کی شدّت تو اس ۔
ظاہر ہے کہ پندرہ دن کی طویل بحث کے بعد بمشکل ایک 'مصالحتی قرارداد' پر اتفا
ہو سکا --- اور اس معاملے میں خود مولانا مودودی کے جو احساسات تھے وہ انہوں نے ب
میں خود ہی ارکانِ جائزہ کمیٹی کے نام اپنے الزام نامے میں وضاحت سے بیان کر دے
------ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ دستورِ جماعت کا متذکرہ بالا پیچ در پیچ فارمولا آ
اور کس مرض کی دوا تھا؟ ------ دستور کی روح ہی نہیں الفاظ کے مطابق بھ
صاف اور سیدھا راستہ یہ تھا کہ جو کام مولانا مودودی نے 'بعد از خرابئ بسیار' ماچھ
گوٹھ میں کیا وہ وہاں کرتے، یعنی اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت سے بیان فرما دیتے اور ر
رائے شماری کرا لیتے، اس کے نتیجے میں اگر شوریٰ کے ارکان کی اکثریت مولانا ۔
موقف کی تائید کر دیتی تب تو کوئی بحران یا تعطّل پیدا ہی نہ ہوتا --- بصورتِ دیگر عا
ارکان سے استصواب کے لئے اجتماع طلب کر لیا جاتا - جہاں واضح طور پر امیر جماعت
اور شوریٰ کی اکثریت کی قراردادیں ایک دوسرے کے بالمقابل پیش ہوتیں او
ارکان جو فیصلہ کرتے اسے فریقین دستور کے مطابق قبول کر لیتے ------ اس ۔
برعکس جو روش مولانا نے اختیار کی وہ نہ صرف یہ کہ دستور کی روح اور الفاظ دونو
کے منافی تھی، بلکہ باہمی معاملات کے معروف اور معقول معیارات سے بھی اس در
بعید تھی کہ انسان کے لئے کم از کم اس معاملے کی حد تک مولانا کے ساتھ حُسنِ ظن
برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے! ----- چنانچہ اس کا بالکل صحیح پوسٹ مارٹم تھا جو مولا
اصلاحی نے اپنے اُس طویل خط میں کر دیا تھا، جسے سفیرِ شام جناب عمر بہاء الامیری نے
"قاضی کا فیصلہ" قرار دیا -

اس معاملے میں اگر اس امکان کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ مولانا مودودی ۔
دسمبر کی شوریٰ میں تو مصالحت کی کوشش پورے خلوص و اخلاص اور کامل صفا
قلب ہی سے کی تھی لیکن بعد میں جب اُس مصالحتی قرارداد کی مختلف اور متضا
تعبیریں کی گئیں اور اس کے نتیجے میں لاہور، راولپنڈی اور لائلپور میں جماعت ۔
حلقوں میں ہنگامہ ہو گیا تب مولانا کا ذہن تبدیل ہوا ------ تب بھی یہ الزام پوری

مدت سے برقرار رہتا ہے کہ اس صورت میں بھی متذکرہ بالا راستہ ہر گز بند نہیں وا تھا بلکہ پوری طرح کھلا تھا ــــــ اور مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہنگامی بنیادوں پر دوبارہ فوراً طلب کیا جا سکتا تھا!

مزید بر آں 'مولانا اصلاحی کے خط کے موصول ہوتے ہی مولانا مودودی کا انتہائی ذباتی انداز میں جماعت کی امارت سے استعفاء دینا اور پھر اُس کا سنسنی خیز انداز میں خبارات میں شائع کرایا جانا[1] وغیرہ مروّجہ سیاست کے تو یقیناً 'معروف' طور طریقے ہیں لیکن (ہلکے سے ہلکے انداز میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ) ؎ "ایں حال نیست 'داعیٔ' عالی مقام را!"۔

اس کے بعد کی مصالحتی مساعی کے ضمن میں بھی بہت سی کہانیاں عام ہوئیں ــــ یہاں تک کہ صریح کذب بیانی اور دروغ گوئی کے الزام بھی لگے ــــــ لیکن چونکہ ان کا حتمی علم سوائے علام الغیوب تبارک و تعالےٰ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا 'لہٰذا ہم اُن سب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آخر میں صرف اُس بات کی جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں جس پر تفصیلی گفتگو اجتماع ماچھی گوٹھ کی روداد کے سلسلے میں

---

[1] اس کی جو تفصیل حال ہی میں مولانا عبد الغفار حسن صاحب کی زبانی معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ: یہ جنوری ۵۷ء کی کوئی تاریخ تھی 'اور زور دار بارش ہو رہی تھی 'کہ مرکز کی گاڑی کا ڈرائیور میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "میاں طفیل محمد 'جناب نعیم صدیقی اور ملک نصر اللہ خاں عزیز گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں ــــــ فوراً اصلاحی صاحب کے پاس چلنا ہے"۔ وہاں پہنچے تو طفیل صاحب نے مولانا مودودی کا استعفاء پڑھ کر سنایا جس پر نعیم صاحب کمبل میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگے ــــــ لیکن مولانا اصلاحی نے فرمایا: "اس کی خبر نہ کسی رکنِ جماعت کو دیں 'نہ اخبارات کو 'بلکہ بذریعہ ٹیلی گرام شوریٰ کا اجلاس طلب کر لیا جائے!" ــــــ لیکن واپسی پر جب نعیم صاحب مرکز پہنچے تو انہوں نے یہ اعلان کیا کہ: "میں جماعت کی رکنیت سے استعفاء دیتا ہوں 'اور چونکہ اب میں نظم کا پابند نہیں رہا لہٰذا میرے لئے ارکانِ جماعت کو مولانا کے استعفے کی خبر پہنچانے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے!" اور پھر فون اٹھایا اور مختلف ارکانِ جماعت کو اطلاع دینی شروع کر دی ــــــ شام کو میاں طفیل محمد صاحب کا خط بھی آ گیا کہ "چونکہ ارکانِ جماعت کو سینہ بہ سینہ خبر پہنچ چکی ہے 'لہٰذا اب اخفاء کی کوشش عبث ہے 'لہٰذا میں استعفے کی خبر اخبارات کو بھی دے رہا ہوں!"۔

'نقشِ غزل' کے اُس حصّے میں ہو چکی ہے جو اِسی شمارے میں شائع ہو رہا ہے ——— یعنی یہ کہ اوّلاً مولانا مودودی کو اپنی قرارداد میں مولانا اصلاحی کا اضافہ ہرگز قبول نہیں کرنا چاہئے تھا' اور مولانا اصلاحی کو پورا موقع دینا چاہئے تھا کہ وہ اپنے قول کے مطابق مولانا کی قرارداد کے بالمقابل دسمبر کی شوریٰ والی قرارداد کو پیش کرتے اور اس طرح دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جُدا ہو جاتا ——— ثانیاً جب انہوں نے اپنی قرارداد میں مولانا اصلاحی کی ترمیم قبول کرلی تھی تو اب یہ اُن کی ذاتی قرارداد نہیں رہی تھی بلکہ اس نے دوبارہ ایک 'مصالحتی فارمولے' کی صورت اختیار کرلی تھی' لہٰذا اس میں ترمیم بھی فریقین کی رضامندی ہی سے ہونی چاہئے تھی' جس کے لئے شوریٰ کا اجلاس طلب کیا جانا چاہئے تھا تاکہ مولانا اصلاحی کو بھی دوبارہ پورا موقع مل جاتا کہ اپنا موقف اور لائحۂ عمل از سرِ نو معیّن کرلیں' ——— لیکن افسوس کہ اس مرحلے پر مولانا مودودی نے اچانک مبارزت طلبی کی وہ صورت اختیار کرلی' جو اس کے بعد سے اُن کے ہر اقدام اور ہر لفظ سے مترشح ہوتی رہی۔

الغرض' بات کو کھولا جائے تو قدم قدم پر۔ "ناطقہ سر بگریباں ہے' اسے کیا کہئے!" ——— اور "خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے!" والا معاملہ نظر آتا ہے اور لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے اس فلسفیانہ شعر کے مصداق کہ۔ "جہاں ہستی ہوئی محدود' لاکھوں پیچ پڑتے ہیں۔ عقیدے' عقل' منطق' سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں!" مولانا مودودی کی رائے' قول اور عمل سب ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ اور "ہاتھی کے پاؤں میں سب کے پاؤں" کے مطابق سو بات کی ایک بات درکار ہو تو یہ سب کچھ نتیجہ ہے اِس کا کہ تاسیسِ جماعت کے موقع پر مولانا مودودی نے اپنے اصل خیالات و نظریات کے برعکس ایک ایسی تنظیمی ہیئت اختیار کرلی جس کو وہ نہ ذہناً قبول کر سکے نہ عملاً ——— جس کے نتیجے میں خود اُن کی برسہا برس کی محنتِ شاقّہ کو جو نقصان پہنچا' اور انہیں خود اپنے ہی ہاتھوں محنت و مشقت سے کاتا ہوا سوت جس طرح تار تار کر دینا پڑا' اس سے قطع نظر تجدید و احیائے دین کی تحریک اور اقامتِ دین کی سعی و جہد کو شدید نقصان پہنچا ——— فاعتبروا یا اولی الابصار!

دوسری طرف اس 'لغزش' کی ذمہ داری کا کم از کم ۲۵ فی صد حصہ مولانا امین احسن اصلاحی پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اور وہ اس لئے کہ انہوں نے مولانا مودودی کے ساتھ مسلسل کئی سال کی کھینچ تان کے بعد جو پیچ در پیچ دستوری فارمولا طے کرایا تھا، وقت آنے پر اس کے منطقی تقاضوں کو پورا کرنے سے خود بھی کامل گریز کیا۔

اس سلسلے میں، الحمد للہ کہ 'ہم نے اپنی تیئس۲۳ برس قبل کی تحریر میں بھی جو 'میثاق' میں دسمبر ۶۶ء میں اُس وقت شائع ہوئی تھی جب 'میثاق' مولانا اصلاحی کے "زیرِ سرپرستی" شائع ہوا کرتا تھا، واضح کر دیا تھا کہ ہمارے نزدیک جائزہ کمیٹی کے ارکان پر مولانا مودودی کے الزام نامے' اس پر مولانا اصلاحی کے مدلّل تعاقب' اور اس کے جواب میں مولانا کے امارتِ جماعت سے استعفے کے اعلانِ عام کے بعد مولانا اصلاحی کی مصالحت پر آمادگی اور مصالحت کنندگان کی مساعی کے ساتھ تعاون ناقابلِ فہم ہے۔ "اور مستقبل کے مؤرخ کے لئے یہ حق باقی رہ جاتا ہے کہ وہ چاہے تو اُن کے طرزِ عمل کو انتہائی دردمندانہ اور مخلصانہ صلح جوئی کا نتیجہ قرار دے لے اور چاہے تو کمزوری پر محمول کر لے!" (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو 'میثاق' جنوری ۹۰ء صفحات ۸۲ تا ۸۶)

راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ اجتماعِ ماچھی گوٹھ کے لئے روانگی سے چند یوم قبل راقم نے لاہور میں مولانا اصلاحی سے ملاقات کی اور جب یہ معلوم ہوا کہ مولانا ظفر احمد انصاری نے اجتماعِ ارکان سے قبل اپنی ایک مصالحتی کوشش کے ضمن میں مولانا سے کچھ وعدے لے لئے ہیں تو راقم نے اُن سے صاف عرض کیا کہ: "مولانا! اب حالات جہاں تک پہنچ گئے ہیں ان کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں مولانا مودودی پر عدمِ اعتماد کی قرارداد لے کر کھڑے ہوں!"—— اس پر مولانا نے گہرے تأثر کے ساتھ فرمایا: "یہ ممکن نہیں ہے' اس لئے کہ یہ جماعت سوائے مولانا مودودی کے اور کسی شخص کی امارت میں چل ہی نہیں سکتی!" جس پر میری زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ: "پھر آپ نے جماعت کے دستور میں جمہوریت کے تقاضوں کو سمونے کی سعیِ لاحاصل کیوں کی تھی؟"—— اور اس پر مولانا خاموش ہو کر رہ گئے!

(باقی صفحہ ۱۰۱ پر)

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا

نقضِ غزل

حصۂ دوم

یعنی

اجتماعِ ماچھی گوٹھ اور اس کے بعد

النحل: ۹۲

اور اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے مضبوطی سے
کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا!

نوٹ:

ارادہ تھا کہ دو اہم تاریخی دستاویزات کو بھی یعنی (۱) امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا استعفیٰ از رکنیت جماعت اور (۲) مولانا امین احسن اصلاحی کا وہ وضاحتی خط جس میں مولانا نے رکنیتِ جماعت سے اپنے استعفے کے وجوہ و اسباب پر روشنی تھی، 'میثاق' کے اسی شمارے میں شامل کیا جاتا لیکن اس شمارے کی ضخامت معمول سے بڑھ جانے کے باعث ان کی اشاعت کو سرِدست کسی آئندہ اشاعت کے لیے مؤخر کر دیا گیا ہے

(ادارہ)

اجتماعِ ماچھی گوٹھ اور اس کے بعد

(۱)

'نقضِ غزل' کی پانچویں قسط جو 'میثاق' فروری ۶۷ء میں شائع ہوئی تھی

ماچھی گوٹھ

ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

۵۳ء میں لاہور کے ایک مشہور صحافی[1] نے جماعت اسلامی کے بارے میں لکھا تھا:-

"کیا عجب کہ یہ تحریک بھی جو پٹھان کوٹ سے شروع ہوئی ہے، بالاکوٹ پر ختم ہو جائے"۔

راقم الحروف کو جو اُس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن اور اس کے ایک پندرہ روزہ پرچے "عزم" کا مدیر تھا' اتفاق سے انہی دنوں بالاکوٹ کے سفر کا موقع ملا۔ شہدا کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے وقت ذہن اچانک مندرجہ بالا خیال کے جانب منتقل ہو گیا۔ اس کے جواب میں جو جذبات دل میں پیدا ہوئے وہ الفاظ کا جامہ پہن کر صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گئے۔

"اگر واقعی ایسا ہو جائے تو کیا یہ ناکامی ہوگی؟

کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ناکام ہوئی؟

بالاکوٹ کا ذرہ ذرہ شہادت دے رہا ہے کہ جنہوں نے یہاں نقدِ حیات ہاری ہے ان سے زیادہ نفع میں کوئی نہیں: جنہوں نے یہاں جانیں دی ہیں وہی ہیں کہ جو حیاتِ جاوداں پا گئے۔ بالاکوٹ کی پشت پر کھڑا ایک مہیب پہاڑ شہادت دے رہا ہے کہ اس نے جو معرکہ آج سے سوا سو سال قبل اپنے دامن میں ہوتا دیکھا تھا اس سے زیادہ کامیاب معرکہ ہندوستان میں اسلام نے کبھی نہ لڑا۔ کنہار کی اچھلتی کودتی موجیں گواہی دیتی ہیں کہ جس خون نے آج سے سوا سو سال قبل انہیں سرخی عطا کی تھی وہی ہے کہ جس نے ہند میں اسلام کے پودے کو سینچا ہے۔ بالاکوٹ کی فضا کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہے کہ اس کے سہمے سہمے سکوت میں درختوں کے

---

[1] شورش کاشمیری مرحوم

جھنڈ تلے جو چند نفوس آرام کر رہے ہیں وہی ہیں جو ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان بنے۔ وہی ہیں جو ہار کھا کر جیتے، جن کی شکست میں کامرانی پوشیدہ تھی، جن کی شہادت میں حیات جاوداں مسکرا رہی تھی............ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ یُرْزَقُوْنَ۝ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِہِمْ مِّنْ خَلْفِہِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۝ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ وَّ اَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ۝"

(ماخوذ از "عزم" ۱۰ر اگست ۵۳ء)

کاش واقعتہً جماعت اسلامی پاکستان کی تاریخ کسی بالاکوٹ کے مقام بلند تک پہنچ کر ختم ہوئی ہوتی ــــ تاکہ اس کی یاد سے آنے والی نسلوں کے دلوں میں ایمان تازہ ہوتا اور جذبۂ اعلاءِ کلمۃ اللہ کے چشمے ابلتے رہتے ــــ لیکن افسوس کہ اس کے برعکس یہ تحریک ریگ زارِ بہاولپور کے ایک دور افتادہ قریے ماچھی گوٹھ میں ایک ریگستانی ندی کی طرح جذب ہو کر رہ گئی۔ جہاں اس کے قائد نے اپنی بہترین صلاحیتیں اپنے ان دیرینہ ساتھیوں سے خیالی نبرد آزمائی میں صرف کیں جو کچھ اپنے خلوص کے باعث اور کچھ انتشار کے خوف کی بنا پر شکست کھانے کے لئے از خود تیار تھے ــــ اور اس نبرد آزمائی میں 'حکمت عملی' کی مہارتِ تامہ کے ساتھ پس پردہ مصالحت اور بر سرِعام دعوتِ مبارزت کا وہ کھیل کھیلا جس کی یاد بھی سخت نفرت انگیز اور کراہت آمیز ہے!

قائمقام امیرِ جماعت کی ہدایات............ 'مصالحت کنندگان' اجتماعِ ماچھی گوٹھ کو جس جذبے کے تحت منعقد کرنا چاہتے تھے اس کا اندازہ اس سرکلر سے کیا جا سکتا ہے جو قائمقام امیر جماعت کے دستخط سے ۱۶ر جنوری ۱۹۵۷ء کو جاری ہوا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رفقاء محترم ــــ! شوریٰ منعقدہ ماہ نومبر ۵۶ء کے بعد ہماری جماعتی زندگی میں بعض ایسے واقعات نمودار ہوئے ہیں جن کے واقع ہونے کی توقع نہ ہم کو تھی اور نہ جماعت کے باہر کے لوگوں کو تھی۔ ان واقعات سے بعض جگہ جماعت کا داخلی استحکام بھی متاثر ہوا ہے اور باہر کے لوگوں کی نگاہوں میں بھی ان سے جماعت کا وقار مجروح ہوا ہے۔ جو لوگ ہم سے حسنِ ظن

رکھتے تھے اور اس ملک کی اصلاح سے متعلق ہم سے امیدیں قائم کئے ہوئے تھے ان پر دل شکستگی اور مایوسی طاری ہوئی ہے اور جن کو ہم سے مخالفت تھی ان کو خوش ہونے اور ہمارے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کا کافی مواد ان چند ہفتوں میں ہاتھ آیا ہے۔

میں سارے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے اس کا بہت تھوڑا حصہ ہے جس کے پیش آنے کے لئے فی الواقع کوئی وجہ موجود تھی۔ اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جس کے پیش آنے کی کوئی ادنیٰ وجہ بھی موجود نہیں تھی بلکہ چند لوگوں کی محض ناسمجھی، بے احتیاطی اور بدگمانی نے اس کے اسباب فراہم کر دیئے ہیں۔ بعض لوگوں نے شوریٰ کی کارروائیوں سے متعلق بالکل غلط اور بے بنیاد تأثرات دیئے۔ بعض لوگوں نے قرارداد کے متن کی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی جو اس کے منشاء کے خلاف تھی۔ بعضوں نے شوریٰ کے ارکان کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بعض مقامات پر ذمہ داروں نے اپنے حقوق و اختیارات کے استعمال میں جلد بازی اور بے احتیاطی سے کام لیا۔ اسی طرح بعض نے شدّتِ تأثر میں اپنے جذبات پبلک پر ظاہر کر دیئے۔ ان ساری باتوں نے مل کر چند دنوں کے لئے جماعت کے مزاج کو اس طرح بگاڑ دیا کہ لوگوں کے ذہن ہر طرح کی باتیں قبول کرنے اور ہر طرح کی باتیں پھیلانے کے لئے بالکل بے قید ہو گئے اور شریعت اور اخلاق کے حدود کی بھی پرواہ بہت کم ہو گئی۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ یہ صورت ایک خاص رقبہ ہی کے اندر محدود رہی اور زیادہ متعدی نہ ہونے پائی تاہم ان چند ہفتوں کے اندر جو باتیں ہوئی ہیں وہ ہماری شفاف جماعتی زندگی کو داغدار کرنے والی ہیں اور اب ہم سب کا یہ فرض ہے کہ ہم ان داغوں کو مٹانے کی کوشش کریں اور آئندہ کے لئے اس طرح کی باتوں سے محفوظ رہنے کا عہد کریں۔

میں اس موقع پر ارکانِ جماعت کو چند ہدایات کرتا ہوں اور متوقع ہوں کہ وہ بلا تاخیر ان کا اہتمام کریں گے۔

۱...... ہر شخص جس سے اس موقع پر کوئی دانستہ یا نادانستہ بے احتیاطی صادر ہوئی ہے اپنے آپ کو کوئی الاؤنس دیئے بغیر توبہ و استغفار کرے اور اپنے رویہ کی اصلاح کا عزم کرے۔

۲...... جس نے اپنے کسی دوسرے رفیق کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالی ہو وہ از خود کھلے دل سے اس سے معافی مانگ لے اور دوسرا کھلے دل سے اس کو معاف کر دے۔

۳......اس سلسلہ کی ساری باتوں کو نسیاً منسیاً کر دیا جائے۔ نہ نجی مجلسوں میں ان کا کوئی چرچا کیا جائے نہ جماعتی اجتماعات میں ان کا کوئی ذکر ہو۔

۴......جہاں جہاں دلوں میں کدورتیں پیدا ہوئی ہوں' وہاں اجتماعی تقریبات کے مواقع پیدا کر کے دلوں کے ملانے اور خوشگوار تعلقات بڑھانے کی صورتیں نکالی جائیں اور اس کام میں وہ ارکان رہنمائی کا فرض انجام دیں جو خوش قسمتی سے اس موقع پر ان آلائشوں سے پاک رہے ہیں۔

۵...... جماعت کی پالیسی سے متعلق بحث و مباحثہ بند کر کے ساری توجہ تعمیری و اصلاحی کاموں پر مرکوز کی جائے اور پالیسی و طریق کار کی بحث کو ہونے والے اجتماع ارکان پر چھوڑ دیا جائے۔

۶......مقامی طور پر کارکنوں کی تربیت کے لئے انتظام کیا جائے۔

میں تمام رفقاء سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ ان ہدایات پر خلوص کے ساتھ عمل اور جماعت کو اس کی صحیح سمت میں موڑنے میں میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان کے فتنوں سے امان میں رکھے اور ہم اپنے دماغ' زبان اور قلم کی ساری طاقتیں اس کے دین کی خدمت میں صرف کرنے کی توفیق پائیں۔

جن مقامات پر ضرورت محسوس ہو' وہاں ان باتوں کو متفقین تک بھی پہنچا دیا جائے۔

(دستخط) غلام محمد

قائمقام امیر جماعت اسلامی پاکستان"

'حزبِ اقتدار' کی تیاریاں............اس کے برعکس مولانا مودودی اور ان کے سیکرٹریٹ نے اس 'معرکے' کو سر کرنے کے لئے جو تیاریاں کیں ان کا اندازہ مولانا امین حسن اصلاحی کے حسبِ ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

"پالیسی کے معاملہ میں ساری جماعت کو تو کوئی گفتگو کرنے سے روک دیا گیا' لیکن خود امیر جماعت پوری دھوم دھام کے ساتھ 'ترجمان' اور 'تسنیم' میں پالیسی سے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے رہے۔ اس مقصد کے لئے شوریٰ کی وہ کارروائیاں بھی شائع کی گئیں' جن کی اشاعت شوریٰ کی اجازت کے بغیر جائز نہیں تھی اور بعض اشخاص کے خلاف غلط تأثر دینے کے لئے ان کے دورانِ بحث کی نجی باتوں کی بھی تشہیر کی گئی۔ اس دوران میں امیر جماعت نے 'ترجمان' میں یہ اصول

بھی پیش فرمایا کہ نظریاتی حکمت اور ہوتی ہے اور عملی حکمت اور ہوتی ہے' جو لوگ ان کے قول و عمل کے تضاد پر اعتراض کرتے ہیں وہ اس رمز کو نہیں جانتے کہ نظریہ جب عمل کا جامہ پہنتا ہے تو اس کی شکل کیا بنتی ہے۔ اس فلسفہ کو مدلل کرنے کے لئے ایک مثال بھی پیش کی گئی کہ دیکھو نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر مساوات کا درس دیتے رہے لیکن وفات کے وقت الائمۃ من قریش کہہ کر خلافت اپنے خاندان والوں کے سپرد کر گئے"۔

حقیقی عزائم...... ان تیاریوں کے پیچھے جو عزائم کار فرما تھے ان کا کسی قدر اندازہ اس گفتگو سے کیا جا سکتا ہے جو ماچھی گوٹھ کے لئے روانگی کے موقع پر مولانا مودودی اور چودھری غلام محمد صاحب کے مابین ہوئی۔ یہ گفتگو راقم الحروف کو حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے سنائی اور ان سے اس کا تذکرہ خود چودھری صاحب نے ماچھی گوٹھ میں اس وقت کیا جب حکیم صاحب نے کسی بات پر مشتعل ہو کر اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ اجتماعِ ارکان میں اپنا اختلاف کھلم کھلا بیان کریں گے۔ حکیم صاحب راوی ہیں کہ چودھری صاحب نے مولانا مودودی سے سوال کیا کہ "مولانا! ماچھی گوٹھ میں کرنا کیا ہے؟" اس پر مودودی صاحب نے بے ساختہ فرمایا:۔۔۔ "میں ان لوگوں سے تنگ آ چکا ہوں اور اب مزید ان کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ انہیں ذلیل کر کے جماعت سے نکال دیا جائے!" چودھری صاحب کے لئے یہ بات بہت غیر متوقع تھی۔ چنانچہ پہلے تو وہ سکتے میں آ گئے اور پھر انہوں نے ریل کے ٹکٹ مولانا کے سامنے پھینک دیئے اور کہا:۔۔۔ "مولانا! یہ رہے ٹکٹ آپ لوگ ماچھی گوٹھ جائیں اور جو چاہیں کریں۔ میں سیدھا کراچی جا رہا ہوں!"۔۔۔ اپنے اس غالی معتقد اور انتہائی معتمد علیہ رفیق کو آمادۂ بغاوت دیکھ کر جس کے ہاتھ میں اُس وقت اتفاقاً بہت سے اختیارات بھی تھے مولانا مودودی نے کچھ توقف کیا اور پھر کہا:۔۔۔ "اچھا تو پھر ان لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کریں گے!"

یہ واضح رہے کہ کچھ ہی دنوں پہلے مولانا مودودی 'حکمت عملی' پر ایک مبسوط تحریر لکھ کر شائع کر چکے تھے۔۔۔!!

اجلاس مرکزی شوریٰ.......... اجتماع ارکان سے متصلاً قبل ماچھی گوٹھ ہی میں مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کا ایک اجلاس منعقد ہوا' جس میں مولانا امین احسن اصلاحی بھی بطور خاص مدعو تھے۔

اس اجلاس میں کارروائی کی پہلی ہی شق پر ہنگامہ برپا ہو گیا اور میاں محمد طفیل صاحب نے بحیثیت معتمد مجلسِ شوریٰ کے گزشتہ دو اجتماعات کی روداد پڑھ کر سنائی تو شوریٰ کی واضح اکثریت نے ان پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے شوریٰ کی کارروائی کو غلط طور پر پیش کیا ہے اور وہ جماعت کے سب سے زیادہ با اختیار ادارے کے ریکارڈ میں تحریف کر کے جماعت کے ساتھ بدترین خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں ـــــ اس پر میاں صاحب نے بقول شخصے "اپنے روایتی انداز میں" زار و قطار رونا شروع کر دیا ـــــ اور شوریٰ کی کارروائی میں تعطل پیدا ہو گیا۔ اس تعطل نے طول کھینچا اور اجتماع ارکان بالکل سر پر آ پہنچا تو 'مخلص مصالحت کنند گان' پھر برسرکار ہوئے اور ان کی کوششوں کے زیر اثر دوسری باتوں کو چھوڑ کر اس قرارداد پر غور شروع ہوا جو اجتماع ارکان میں پیش کرنے کے لئے مولانا مودودی نے مرتب فرمائی تھی! اس پر جو کچھ ہوا وہ مولانا امین احسن صاحب کے الفاظ میں سنئے :-

"اس اجلاس میں پہلی [1] مرتبہ وہ قرارداد میرے سامنے آئی جو امیرِ جماعت اجتماعِ عام میں جماعت کے سامنے لانے والے تھے۔ اس قرارداد پر میں نے

---

[1] اس "پہلی مرتبہ" کے اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ سے قبل لاہور میں 'مصالحت' کے سلسلے میں جو گفت و شنید ہوتی رہی تھی اس میں اولاً مولانا اصلاحی اس پر مصر رہے تھے کہ ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان میں دسمبر ۵۶ء والی شوریٰ کی متفقہ قرارداد ہی استصواب کے لئے پیش کی جائے۔ لیکن جب مصالحت کنند گان، خصوصاً مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے مولانا سے استدعا کی کہ وہ اس پر اصرار نہ کریں ـ اس قرارداد کے ساتھ بہت سی تلخ یادیں وابستہ ہو گئی ہیں اور یہ اب مولانا مودودی کے ذاتی وقار (Prestige) کا مسئلہ بن گیا ہے ـ آخر بعینہٖ اسی قرارداد پر کیا منحصر ہے۔ اگر وہی مفہوم دوسرے الفاظ میں ادا ہو جائے تو کیا حرج ہے! تو مولانا اصلاحی اس پر آمادہ ہو گئے کہ اسی مفہوم پر مشتمل کوئی دوسری قرارداد ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان میں پیش کر دی جائے۔ مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے مولانا کو یہ یقین دلایا کہ مولانا مودودی ماچھی گوٹھ میں پیش ہونے والی قرارداد پہلے ہی انہیں دکھا دیں گے اور ان دونوں کے اتفاق کے بعد ہی کوئی قرارداد اجتماع ارکان میں پیش ہو گی ـــــ ان پختہ یقین دہانیوں کے بعد مولانا انصاری تو اچانک غائب ہو گئے (اور پھر ان کی صورت ماچھی گوٹھ ہی میں نظر آئی) اور مولانا اصلاحی اس انتظار میں رہے کہ ماچھی گوٹھ میں پیش ہونے والی قرارداد انہیں دکھائی جائے گی ـــــ یہاں تک کہ اجتماع کا وقت آ پہنچا اور مولانا اصلاحی قرارداد کی زیارت کا اشتیاق ہی لئے ہوئے ماچھی گوٹھ پہنچ گئے ـــــ اور وہاں شوریٰ کے اجلاس میں "پہلی مرتبہ" انہیں اس کی زیارت نصیب ہوئی!

نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی۔ میں نے شوریٰ کو بتایا کہ اگر آپ لوگ اس قرارداد کو اجتماع عام میں لائیں گے تو میں دسمبر والی شوریٰ کی قرارداد جماعت کے سامنے پیش کروں گا اور امیر جماعت اور ان کے اصحاب نے اس قرارداد کو دفن کرنے کے لئے جو مہمّیں چلائی ہیں اور جو اقدامات کئے ہیں وہ سب اجتماع عام میں بیان کروں گا۔ میرے یہ مؤقف اختیار کر لینے کے بعد شوریٰ میں تعطل پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد اکثر ارکان شوریٰ مجھ سے ملے اور اس صورت حال کے پیدا ہو جانے پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ میں نے ان کو یہ بھی بتایا کہ میری تقریر کے وقت میرے ہاتھ میں قرآن ہو گا اور میں اپنے داہنے امیر جماعت کو بٹھاؤں گا اور بائیں قائمقام امیر جماعت چودھری غلام محمد صاحب کو' یہ دونوں حضرات میری جس بات کو کہہ دیں گے کہ یہ جھوٹ ہے، میں بغیر کسی حجت کے اس کو واپس لے لوں گا۔ مگر جماعت کے بزرگوں نے مجھے باصرار ایسا کرنے سے روکا کہ اس سے جماعت میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔

بالآخر چوبیس گھنٹوں کے بعد باقر خان صاحب میرے پاس قرارداد لے کر آئے اور یہ کہا کہ امیرِ جماعت فرماتے ہیں کہ اگر تم اس میں کوئی لفظی ترمیم کرنا چاہتے ہو تو وہ تجویز کرو' اس پر غور کر لیا جائے گا لیکن کسی بنیادی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ میری تقریر تیار ہو چکی ہے۔ کسی لفظی ترمیم سے میرا مدّعا حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وجہ سے اس پیشکش کو قبول کرنا میرے لئے ناممکن تھا' لیکن محض اس خیال سے میں نے ناممکن کو ممکن بنایا کہ امیرِ جماعت کی ضد کے باوجود میں کوئی ایسی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا جس سے جماعت میں انتشار پیدا ہو۔ چنانچہ میں نے قرارداد میں بعض لفظی ترمیمات کر کے اس کو جماعت کے اصل نصب العین کے قریب بنانے کی کوشش کی۔ امیر جماعت اور شوریٰ نے کچھ ردّوقدح کے بعد میری یہ ترمیم قبول کر لی" ۔[۱]

اس طرح خدا خدا کر کے تعطّل دور ہوا اور کچھ بھلے لوگوں کی سرتوڑ محنت سے بظاہر ایسی صورت بن گئی کہ اجتماع ارکان میں جماعت کی سابقہ اور آئندہ پالیسی کے بارے میں مرکزی مجلسِ شوریٰ کی جانب سے ایک متفقہ قرارداد مولانا مودودی پیش کریں گے ـــــ ساتھ ہی یہ بھی طے

---

[۱] حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھئے

کرلیا گیا کہ اجتماعِ ارکان میں مولانا مودودی پر اظہارِ اعتماد کی قرارداد پیش کی جائے گی جس کی سب تائید کریں گے۔ چنانچہ مولانا اپنا استعفیٰ واپس لے لیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلّا' رہے عام ارکانِ جماعت تو ان کے بارے میں غالباً یہ کافی خیال کیا گیا کہ انہیں کچھ رپورٹیں اور کچھ تقریریں سنوا کر رخصت کر دیا جائے' پالیسی سے متعلق اختلافی بحثوں میں انہیں الجھانے سے سوائے انتشار کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا......!

_____ اس طرح ایک مرتبہ پھر جماعت کے اربابِ حلّ وعقد میں جماعت کی پالیسی کے بارے میں 'اتفاق و اتحاد' پیدا ہو گیا___ رہی یہ بات کہ یہ اتحاد سطحی تھا یا گہرا___ اور حقیقی تھا یا مصنوعی تو ظاہر ہے کہ اس کا علم سوائے ارکانِ شوریٰ (یا جماعت سے بالکل باہر کے ایک شخص یعنی مولانا انصاری) کے اور کسی کو نہ تھا۔ جماعت کے عام ارکان تو دور رہے ان لوگوں کے سامنے بھی جو ان مسائل میں پوری طرح الجھے ہوئے تھے لیکن رکن شوریٰ نہ تھے معاملے کی جو صورت آئی اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو راقم الحروف نے بعد میں اپنے استعفیٰ میں تحریر کئے :-

" ماچھی گوٹھ حاضر ہوا تو جس چیز کا خدشہ تھا وہی ہوا۔[1] کلھیا میں گڑ پھوڑا جا چکا تھا۔ ایک متفقہ قرارداد شوریٰ کی طرف سے اجتماعِ ارکان میں پیش ہونی تھی' اجتماع کا سارا پروگرام ایک سوچی سمجھی سکیم کے ساتھ اس طرح بنایا جا چکا تھا کہ اول تو کوئی اختلافی آواز اٹھائی ہی نہ جا سکے۔ اور اٹھے بھی تو پوری طرح محبوس ہو کر! میں یہاں منتظمینِ اجتماع کی نیتوں پر حملہ نہیں کرنا چاہتا۔ انہوں نے جو کچھ کیا انتہائی خلوص کے ساتھ 'اھون البلیّتین' کے مشہور و معروف فلسفے کے

حاشیہ متعلق بہ صفحہ سابقہ :

لیکن جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا مولانا نے یہ ترمیم دل سے قبول نہ کی تھی بلکہ اسے صرف مصلحتِ وقت کا تقاضا سمجھ کر مجبوراً قبول کیا تھا۔ اس لئے کہ اس موقع پر ان کے فعال نائبین میں سے ایک دوسری انتہائی اہم شخصیت یعنی ___ محمد باقر خان مرحوم آمادۂ بغاوت ہو گئے تھے! ___ ضرورت کے وقت خم کھا جانا ___ اور پھر موقع دیکھ کر خم ٹھونک کر میدان میں آ جانا مروّجہ دنیوی سیاست کے اعتبار سے کامیابی کے ناگزیر لوازم میں سے ہے ___ یہ دوسری بات ہے کہ ؎

ایں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را!

[1] ملاحظہ ہو راقم الحروف کا وہ خط جو اس نے قائم مقام امیر جماعت کے توسط سے مرکزی مجلس شوریٰ کو لکھا۔

تحت ایک بہت بڑے شر یعنی جماعت کے انتشار سے بچنے کے لئے کیا۔ لیکن یہ بھی بہرحال اپنی جگہ ایک واقعہ ہے کہ اجتماع کو جس طرح CONDUCT[1] کیا گیا اس میں کسی اختلافی آواز کا اٹھنا خصوصاً ایسی حالت میں کہ 'اکابرین' میں سے تو کوئی میدان میں رہا ہی نہیں تھا چند بے وقعت 'اصاغرین' باقی تھے ممکن نہ تھا......"

اجتماعِ ارکان

ڈاکٹر عثمانی صاحب کا نعرۂ حق...... اجتماعِ ارکان کی پہلی نشست کا آغاز ہوا ہی تھا کہ کراچی کے درویش منش رکن ڈاکٹر سید مسعود الدین حسن عثمانی دہائی دیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ سب سے پہلے انہیں اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی اس تحریر کو پڑھ کر سنا دیں جو انہوں نے قائمقام امیر جماعت کے توسط سے مرکزی مجلس شوریٰ کو ارسال کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی جرأتِ ایمانی کا مظاہرہ کچھ ایسے طریقے سے ہوا کہ منتظمینِ اجتماع نے بے چون و چرا ان کو اپنی تحریر پڑھ کر سنانے کی اجازت دے دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تحریر میں مرکزی مجلس شوریٰ کے وسط جنوری کے اجلاس کے بعض فیصلوں سے شدید اختلاف کیا اور زیر انعقاد اجتماعِ ارکان کے سلسلے میں کچھ تجاویز پیش کیں، ساتھ ہی قیمِ جماعت کے اس بیان پر شدید تنقید کی جو انہوں نے سعید ملک صاحب کے بیان کے جواب میں دیا تھا اور مولانا مودودی کے اس اقدام کے سلسلے میں وضاحت طلب کی جو انہوں نے ارکانِ جائزہ کمیٹی کے خلاف کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ تھا کہ یہ طریقہ کہ امیرِ جماعت' جماعت کے آج تک کے اختیار کردہ طریق کار کی پوری تاریخ بیان کریں اور آئندہ کی پالیسی کے بارے میں ایک قرارداد پیش کریں ــــ جماعت کی سابقہ روایات کے بالکل خلاف ہے اور موجود حالات میں اس سے بدگمانی اور سوءِ ظن کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے برعکس ہونا یہ چاہئے کہ شوریٰ نومبر دسمبر ۵۶ء کی متفقہ قرارداد ہی کو اس اجتماعِ ارکان میں استصواب کے لئے پیش کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے اپنے الفاظ میں:

"اس زمانے میں جب کہ شیطان نے ہمارے داخلی استحکام کو منہدم کرنے کے

---

[1] اس کی تفصیلات آئندہ بیان ہوں گی۔

لئے بھرپور حملہ کیا تھا اور جب کہ شیطان کو یہ موقع پوری طرح مل گیا تھا کہ وہ جماعت میں اعتماد اور حسنِ ظن کی فضا کو مسموم کردے ، اس امر کی سخت ضرورت تھی کہ جماعت کے ہونے والے کُل پاکستان اجتماع میں مسائل اور معاملات پیش کرنے کے لئے ایسا طریق کار تجویز کیا جاتا جو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہوتا...... لیکن مجلس شوریٰ کے تجویز کردہ طریق کار پر غور کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں غور وفکر کا پورا حق ادا ہونے سے رہ گیا ہے...... ہم بہر حال اپنے اکابر کے سلسلے میں حسنِ ظن سے کام لینے کے عادی رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ غیر معمولی حالات میں حسن ظن کی انتہائی حد کو کام میں لانے کے باوجود دل کو اطمینان حاصل نہیں ہوتا......"

"یہ امر بھی انتہائی تشویش کا باعث ہے کہ مجلس شوریٰ نے اس قرارداد کو جو شوریٰ کے اجلاس منعقدہ نومبر دسمبر میں پندرہ یوم کے غور وخوض کے بعد متفقہ طور پر منظور کی گئی تھی ارکان کے اجتماع کے آغاز سے کالعدم قرار دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سلسلے میں جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں وہ کسی طرح دل کو مطمئن نہیں کرتے...... میری ناقص رائے میں اگر اب بھی اسی قرارداد کو ارکان کے اجتماع میں فیصلے کیلئے پیش کیا جائے تو یہ بہت ہی مناسب ہوگا......"۔

اپنی تحریر کو پڑھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب جذبات سے بہت زیادہ مغلوب ہوگئے اور شدتِ تأثر میں ان کی آواز بھی گلو گیر سی رہی۔ نتیجۃً ان کی بات عام ارکانِ جماعت میں سے تو شاذ ہی کسی کی سمجھ میں آئی۔ رہے وہ لوگ جن کا سمجھنا مفید ہو سکتا تھا تو وہ سب کچھ سمجھ کر بھی نہ سمجھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہی تھے! بہر حال اپنی طرف سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس فرض کو ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی جس کے بارے میں خود ان کے الفاظ یہ ہیں:

"حالات کی نزاکت کے پیش نظر میں اپنے آپ کو اس بات پر مجبور پاتا ہوں کہ اس فرض کی ادائیگی کے لئے اٹھ کھڑا ہوں جس کا اقرار میں نے جماعت کے ساتھ خدا کو حاضر ناظر جان کر کیا تھا...... ایک دن ضرور آئے گا کہ ظاہر وباطن سے سارے پردے اٹھ جائیں گے اور اس روز میں اپنی اس کوشش کو اپنے پروردگار کے سامنے رسوائی سے بچنے کا ذریعہ بناؤں گا"۔

آخرت میں ڈاکٹر صاحب اپنی اس حق گوئی کا جو اجر چاہیں پائیں' جماعت اسلامی

پاکستان کے کل پاکستان اجتماعِ ارکان میں بہرحال ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی اور اجتماع کی کارروائی طے شدہ پروگرام کے مطابق جاری رہی۔ چنانچہ اس کے بعد قیّم جماعت نے ایک مفصل رپورٹ پڑھ کر سنائی اور اجتماع کی ایک پوری نشست اس کے نذر ہو گئی۔

امیرِ جماعت پر اظہارِ اعتماد...... قیّم جماعت کی رپورٹ کے بعد سب سے پہلے مولانا مودودی پر اظہارِ اعتماد اور ان سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست پر مشتمل قرارداد پیش ہوئی اور اس پر دھواں دھار تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا، جو اکثر و بیشتر ان ہی مضامین پر مشتمل تھیں جو کسی بھی اظہار اعتماد کی قرارداد میں ہوتے ہیں یعنی مولانا مودودی کی تعریف و توصیف اور اقامتِ دین کے لئے ان کی سعی و جہد کو خراج تحسین اور ان کے تدبّر اور فہم و فراست پر کامل اعتماد کا اظہار۔ اس خیال سے کہ جماعت کے اربابِ حل و عقد کے مابین اختلاف و انتشار کی خبروں سے جو تشویش عام ارکانِ جماعت کے قلوب و اذہان میں پیدا ہو گئی ہے اس کو کم کیا جائے، اس قرارداد پر ان لوگوں سے بطور خاص تقریریں کرائی گئیں جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کو مولانا مودودی سے اختلاف ہے ــــ ان حضرات نے اگرچہ اپنی حد تک اپنی تقریروں میں محتاط الفاظ استعمال کئے ــــ اور بعض مواقع پر ذو معنی باتیں بھی کہیں جن کا اصل مفہوم یا وہ خود جانتے تھے یا مولانا مودودی اور یا وہ چند لوگ جو پورے پس منظر سے باخبر تھے۔ لیکن عام ارکان جماعت نے ان کو بہرحال ان کے ظاہری مفہوم ہی پر محمول کیا۔ اور یہی اس وقت سب کا مطلوب و مقصود بھی تھا ــــ

مولانا اصلاحی نے اس قرارداد پر جو تقریر کی وہ فن خطابت کا ایک حسین مرقع تھی اور اس میں ان کا تخاطب بظاہر تمام شرکائے اجتماع سے لیکن دراصل صرف مولانا مودودی سے تھا۔ اپنی اس تقریر میں مولانا نے دراصل مولانا مودودی کو اس امر پر سرزنش کی تھی کہ اقامتِ دین کے لئے لوگوں کو بلانے اور انہیں اپنے اپنے ماحول و مشاغل سے منقطع کرنے کے بعد اب ان کا یہ رویہ بالکل غلط ہے کہ ساتھیوں اور رفیقوں کے مشوروں کو بالکل نظر انداز کر کے صرف اپنی من مانی کرنے پر اصرار کریں اور ان کی جانب سے معمولی سے اظہارِ اختلاف اور ذرا سی تنقید پر استعفیٰ کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ اسی سلسلۂ کلام میں جب انہوں نے عام ارکانِ جماعت سے خطاب کرتے ہوئے کچھ اس طرح کے الفاظ کہے کہ:

"آپ لوگ چاہیں تو مولانا مودودی کے پاؤں پڑیں اور چاہیں تو ان کا دامن پکڑنے کی کوشش کریں لیکن میں ان کا گریبان پکڑ کر ان سے سوال کرتا ہوں کہ

سب کو جمع کر کے اب وہ خود کہاں جانا چاہتے ہیں"۔
ظاہر ہے کہ اس کا اصل مفہوم صرف مولانا مودودی ہی سمجھ سکتے تھے!
یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ راقم الحروف سٹیج پر حاضر ہوا اور اس نے اولاً ان لوگوں کے رزِ عمل پر اظہارِ حیرت کیا جن کے بارے میں اسے یہ معلوم تھا کہ وہ مولانا مودودی کے نقطۂ نظر سے شدید اختلاف رکھتے ہیں اور ان کے دلوں میں اب واقعۃً مولانا مودودی کے لئے کوئی احترام اقی نہیں رہ گیا ہے کہ وہ کس طرح اس قرارداد کی تائید میں تقریریں کر رہے ہیں۔ اس پر تظمینِ اجتماع اور دوسرے لوگوں میں سے خصوصاً نعیم صدیقی صاحب نے شور مچایا کہ اس قسم ی باتیں اس موقع پر نہیں کہی جا سکتیں، جس کو بھی ایسی کوئی بات کہنی ہے وہ اس نشست میں کہے جو احتساب کے لئے مخصوص کی گئی ہے؎ ۔۔۔۔ مجبوراً میں نے اس بات کو یہیں چھوڑ کر ضابطے اور قاعدے کی بات پیش کی کہ :

"یہ اجتماعِ ارکان اس غرض سے بلایا گیا تھا کہ ارکان جماعت پالیسی اور طریقِ کار کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کا جائزہ لے کر آئندہ کیلئے اپنا لائحہ عمل طے کریں گے۔ اس اجتماع کی ابتداء کسی بھی شخص پر اظہارِ اعتماد کے ساتھ کرنا صحیح نہیں ہے۔ کجا ان امیرِ جماعت پر جو از یومِ تاسیس تا امروز جماعت کی امارت کے منصب پر فائز رہے ہیں اور جماعت کے موجودہ طریق کار سمیت اس کی آج تک کی تمام پالیسی ان ہی کے ذہن کی تخلیق ہے۔ ان پر اظہار اعتماد کی قرارداد منظور ہو جانے کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ اجتماعِ ارکان ان کی جملہ پالیسیوں کی بھی توثیق کر رہا ہے ۔۔۔ پھر کسی مزید بحث و تمحیص کا جواز کیا باقی رہ جائے گا؟"۔

میری یہ بات اس وقت تو نقار خانے میں طوطی کی صدا ہو کر رہ گئی ۔۔۔ اور میرے بعد پھر اظہار اعتماد سے بھرپور تقاریر کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن کچھ دیر بعد خود مولانا مودودی سٹیج پر آئے اور انھوں نے راقم الحروف کا نقطۂ نظر قبول کر کے قرارداد پر غور اور بحث کو ملتوی کر دیا۔

؎ ظاہر بات ہے کہ اگرچہ میری اس تنقید کا براہ راست ہدف وہ بزرگ ارکان جماعت تھے جو پالیسی اور طریق کار کے بارے میں وہی نقطۂ نظر رکھتے تھے جو میرا تھا لیکن اگر میری یہ بات بڑھنے دی جاتی تو اس سے اجتماع کا رخ بالکل تبدیل ہو جاتا۔ اور اتحاد و اتفاق کا سارا ملمع اسی موقع پر اتر کر رہ جاتا ۔۔۔ اور کیا عجب کہ پورے ڈرامے کا ڈراپ سین اسی وقت ہو جاتا ۔۔۔ لہٰذا لطف کی بات یہ ہے کہ اس موقع پر بزرگ اصحاب اختلاف کی جانب سے مدافعت ان صاحب (نعیم صدیقی) نے کی جنھوں نے بعد میں خود اپنی تقریر میں انہیں امراضِ دماغی میں مبتلا قرار دیا ۔۔۔

یہاں 'نقض غزل' کا وہ حصہ ختم ہو گیا جو اب سے تیئیس (۲۳) سال قبل ۶۷-۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ جب اُن تلخ حوادث و واقعات پر صرف دس (۱۰) برس گزرے تھے جن پر جماعت اسلامی کی تاریخ کا یہ تاریک باب مشتمل ہے۔ لہٰذا 'محافظ خانۂ ذہن' کی فائلیں بھی ابھی 'بند' (Close) نہیں ہوئی تھیں اور 'نہاں خانۂ قلب' کے داغ بھی تازہ تھے ـــــ مزید بر آں اس وقت تک ان حوادث و واقعات کے ذمّہ دار اور متأثّرین سب بقیدِ حیات تھے' چنانچہ جب اُن کی جانب سے کسی بات کی تردید یا تصحیح نہیں ہوئی تو گویا بالواسطہ توثیق و تصدیق ہو گئی ـــــ ویسے بھی 'نقض غزل' کی شائع شدہ اقساط کا اکثر و بیشتر حصہ بعض 'دستاویزات' پر مشتمل تھا جن کی تردید یا تکذیب کا امکان خارج از بحث ہو تا ہے!

البتہ ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان کے بقیہ اور اصل حصے کی روداد اور اس کے بعد کے حوادث و واقعات کا معاملہ مختلف ہے۔ اس لئے کہ کُل دو (۲) دستاویزات کے سوا جن کا ذکر بعد میں آئے گا' اُن کا کوئی تحریری ریکارڈ نہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے نہ اُس کے علم کی حد تک کسی اور کے پاس! ۔ لہٰذا ان کے ضمن میں کُل انحصار یادداشت پر کرنا ہو گا جس میں کم از کم واقعات کی زمانی ترتیب میں تقدیم و تاخیر کی حد تک خطا کا امکان یقیناً موجود ہے!

اس امکان کو 'تاحدّ امکان' کم کرنے کے لئے راقم نے اپنی شدید علالت کے باوجود ماہ جنوری ۹۰ء کے دوران متعدد "بقیۃ السّلف" حضرات سے ملاقات کی۔ اور اس کے لئے بعض سفر بھی بطور خاص اختیار کئے۔ چنانچہ فیصل آباد جا کر مولانا عبد الغفّار حسن اور حکیم عبد الرحیم اشرف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا' قصور جا کر جناب ارشاد احمد حقّانی سے گفتگو کی۔ جناب مصطفیٰ صادق نے کرم فرمایا کہ جیسے ہی میری خواہش اُن کے علم میں آئی وہ خود تشریف لے آئے (اور واقعہ یہ ہے سب سے زیادہ معلومات بھی ان ہی سے حاصل ہوئیں۔) ـــــ اواخر جنوری میں کراچی کا ایک سفر انجمن خدام القرآن سندھ کے پروگرام کے سلسلے میں پہلے سے طے تھا' لیکن اگر 'نقض غزل' کے سلسلے میں شیخ سلطان احمد صاحب سے ملاقات کی شدید خواہش نہ ہوتی تو شاید میں اپنی علالت کی بنا پر اس سفر کو ملتوی کر دیتا۔ لیکن شدید تکلیف کے باوجود میں نے یہ سفر اختیار کیا اور شیخ صاحب موصوف کا کرم کہ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے مفصّل ملاقات اور سیر حاصل گفتگو کا موقع عنایت فرمایا۔ **فجزاھم اللّٰہ عنی خیر الجزاء!**

ان ملاقاتوں کا یہ فائدہ تو یقیناً بسا غنیمت ہے کہ بعض ایسے بزرگوں اور سابق ہم سفروں سے تجدیدِ ملاقات ہو گئی جن سے ملاقاتوں کا سلسلہ عرصہ سے منقطع تھا... مزید بر آں 'نقشِ غزل' کے شائع شدہ مواد کی بحیثیت مجموعی تصویبِ مزید اور تصدیقِ مکرر بھی ہو گئی... صرف اس عمومی 'شکایت' کے ساتھ کہ حوادث و واقعات کے بیان میں اختصار بہت زیادہ ہے اور بعض 'تلخ تر' حقائق و واقعات بیان ہونے سے رہ گئے ہیں...... تاہم اجتماع ماچھی گوٹھ کے ضمن میں اس کے سوا کہ بعض یادیں تازہ ہو گئیں' اور انگریزی محاورے کے مطابق Notes ایک دوسرے سے Tally کر گئے' کوئی خاص اضافی مواد حاصل نہیں ہو سکا۔

☆ ☆ ☆

ادھر خود جماعتِ اسلامی نے تو اپنی تاریخ کے اس 'تاریک باب' کے اخفاء کا اتنا اہتمام کیا کہ جماعت کی ایک مستقل روایت کو ختم کر دیا۔ اور 'رودادوں' کی اشاعت کا سلسلہ ہی بند کر دیا۔ اس لئے کہ اگر اس اجتماع کی روداد شائع کی جاتی تو لامحالہ اختلاف کرنے والے ارکان کی تقریریں بھی شائع کرنی پڑتیں۔ لہٰذا مناسب خیال کیا گیا کہ صرف مولانا مودودی کی تقریر شائع کر دی جائے' باقی رہی مفصّل روداد تو اس سے خود بھی "غضِّ بصر" کر لیا جائے' اور نہ صرف موجود الوقت لوگوں بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی بے خبر رکھّا جائے۔ رہا جماعت کا اپنا دفتری ریکارڈ تو اس کے ضمن میں بھی ع 'اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی!" کہ اُس کا بھی بہت سا حصہ اچھرہ سے منصورہ منتقلی کے دوران ضائع ہو گیا ہے' اور اب وہاں بھی متعلقہ تفاصیل موجود نہیں ہیں۔ گویا معاملہ صرف یہی نہیں ہے کہ ؎ "وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں۔ اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا!"۔ بلکہ صورتِ واقعہ کچھ ایسی بن گئی ہے کہ ع "جلا کے خاک کیا' خاک کو غبار کیا!"۔

یہ دوسری بات ہے کہ ع "جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر' لہو پکارے گا آستیں کا!" کے مصداق اجتماع ماچھی گوٹھ اور اس کے بعد کے حوادث و واقعات کے ضمن میں دو دستاویزات محفوظ رہ گئیں جن کے بین السطور حالات و واقعات کی پوری تصویر موجود ہے ... ایک راقم کا استعفاء از رکنیتِ جماعت جو اجتماع ماچھی گوٹھ کے لگ بھگ دو ماہ بعد لکھا گیا تھا (اور اب اندازہ ہوتا ہے کہ اُس کا اس قدر تفصیل سے تحریر ہونا بھی اللہ تعالےٰ کی خصوصی مشیّت کے تحت تھا' اس لئے کہ وہ بجائے خود 'نقشِ غزل' کا مکمل خلاصہ ہے!)... اور دُوسرا مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک وضاحتی خط جو اجتماع ماچھی گوٹھ

کے لگ بھگ ایک سال بعد اس وقت لکھا گیا جب مولانا نے رکنیت جماعت سے استعفاء دیا اور انہیں بے شمار خطوط موصول ہوئے جن میں اُن سے استعفے کے وجوہ و اسباب دریافت کیے گئے تھے! مولانا کی یہ مفصل تحریر بھی اُن کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے 'نقشِ غزل' کی ایک خود مکتفی تصویر ہے' چنانچہ اُن دنوں اس کی سائیکلو سٹائل شدہ نقول کثیر تعداد میں ایک 'گشتی مراسلہ' کی صورت میں تقسیم ہوئی تھیں!

بنابریں... 'نقشِ غزل' کی تکمیل کے سلسلے میں ہم اولاً ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان کی بقیہ کارروائی کے اہم حصے 'یادداشت' کی بناپر درج کر رہے ہیں' اور اس ضمن میں جو کچھ لکھا جارہا ہے اس کے حرف حرف کی صداقت پر حلف لینے کو تیار ہیں سوائے صرف اس ایک بات کے کہ جیسے پہلے عرض کیا جاچکا ہے' واقعات کی زمانی ترتیب میں تقدیم و تاخیر کا امکان موجود ہے! ثانیاً متذکرہ بالا دونوں دستاویزات شائع کی جارہی ہیں جن کے بین السطور میں وہ "آئینۂ گفتار" موجود ہے جس میں ہر جویائے حق علامہ اقبال کے ان الفاظ کے مصداق کہ ع "آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!" جماعتِ اسلامی کی تاریخ کے ۵۶ء اور ۵۷ء کے دو سالوں پر مشتمل بُحرانی دور کے اصل حقائق اور واقعات کی "دھندلی سی اک تصویر" دیکھ سکتا ہے۔

اجتماعِ ارکان کی بقیہ رُوداد

مولانا مودودی کی قرارداد اور تقریر

'قراردادِ اعتماد' پر بحث کے ملتوی ہونے کے بعد مولانا مودودی نے جماعتِ اسلامی کی تاریخ میں پہلی بار جماعت کی پالیسی کے ضمن میں اپنی سوچ اور رائے ایک مفصل قرارداد کی صورت میں پیش کیا۔ اور اس کی وضاحت کے لئے ایک نہایت مفصل اور مدلل تقریر کی جو چھ گھنٹے سے زائد جاری رہی اور غالباً تین نشستوں میں مکمل ہو سکی۔

یہ قرارداد اور تقریر بعد میں "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" ...

عنوان سے شائع ہوئی، اور اس کا جو نسخہ اس وقت راقم کے پیشِ نظر ہے وہ اس کے بارہویں ایڈیشن کا ہے جو اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ (یہ وضاحت اس لئے کر دی گئی کہ اجتماع کے بعد ترتیب و تسوید اور طباعت و اشاعت کے مختلف مراحل کے دوران اس میں کوئی لفظی ردّوبدل ہوا ہو تو اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی اور ریکارڈ محفوظ نہیں ہے)

یہ قرارداد بھی مولانا مودودی کی مرتب کردہ تھی اور اس کے لئے مفصل تقریر بھی مولانا لاہور ہی سے پوری طرح تیار کر کے لائے تھے۔ لیکن، جیسے کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، مجلسِ شوریٰ کے اجلاس کے دوران جو سلسلۂ گفت و شنید جاری رہا اور جو سعیٔ مصالحت بروئے کار آئی اُس کے نتیجے میں اس میں مولانا امین احسن اصلاحی کے اختلافی نقطۂ نظر کو سمونے اور شامل کرنے یعنی Accomodate کرنے کی خاطر ان کے تجویز کردہ جملے کا اضافہ کر دیا گیا تھا... اور اس طرح اب یہ 'قرارداد' مولانا مودودی کی ذاتی نہیں رہی بلکہ اسے مجلسِ شوریٰ کی 'متفقہ قرارداد' کی حیثیت حاصل ہو گئی جسے مولانا نے گویا شوریٰ کے نمائندے (Spokesman) کی حیثیت سے پیش کیا۔ لیکن جیسے کہ راقم کو پہلے ہی سے اندیشہ تھا، جس کا واضح اظہار بھی راقم نے اپنے اُس خط میں کر دیا تھا جو راقم نے جماعتِ اسلامی منٹگمری (ساہیوال) کے دیگر پانچ ارکان کی ہم نوائی میں قائم مقام امیر جماعتِ اسلامی پاکستان کے نام تحریر کیا تھا، سابقہ 'اتفاق' کی طرح اس 'اتفاق' کا بھانڈا بھی چوراہے میں پھُوٹ کر رہا۔ اس لئے کہ اس قسم کی مصنوعی مصالحتیں شاید اصلاحی و سماجی انجمنوں اور سیاسی جماعتوں میں تو کسی درجے میں قابلِ عمل ہوں، کسی انقلابی تحریک میں ہرگز ممکن العمل نہیں ہو سکتیں۔

چنانچہ مولانا مودودی مرحوم نے اپنی چھ گھنٹے سے زائد لمبی تقریر میں اپنے، اور اپنے ہم خیال ارکانِ شوریٰ کے ذہن کی نمائندگی تو بہ تمام و کمال ـــــ اور بہ حسن و خوبی کر دی، لیکن اس سے بالواسطہ طور پر جماعت کی پالیسی کے بارے میں اختلافی ذہن رکھنے والے ارکانِ شوریٰ کے خیالات اور نظریات کی کامل نفی ہو گئی (مولانا

مودودی کی یہ تقریر کامل طبع شدہ موجود ہے' لہٰذا اس کے ضمن میں مزید کچھ عرض کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے)

مولانا اصلاحی کا خطاب

اس کے فطری ردّ عمل کے طور پر مولانا امین احسن اصلاحی اٹھے اور انہوں نے اصولی طور پر قرارداد کی مکمّل تصویب و تائید کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ اس کے بعض "مضمرات اور مقدرات" مولانا مودودی کی تقریر میں بیان ہونے سے رہ گئے ہیں جنہیں بیان کیا جانا ضروری ہے۔ یہ "مضمرات اور مقدّرات' ظاہر ہے کہ 'اصلاً اُن کے اس جملے کے منطقی نتائج تھے جس کا اضافہ اُن کے اصرار پر اِس قرارداد میں ہوا تھا' اور واقعہ یہ ہے کہ یہ مولانا اصلاحی کی ذہانت اور فطانت کا نہایت حیران کن مظہر تھا کہ انہوں نے ایک طویل قرارداد میں گنتی کے چند الفاظ کے اضافے سے اپنے پورے فکری اختلاف کو سمو دیا تھا۔۔۔ بہرحال اب جو مولانا اصلاحی نے اُن "مضمرات اور مقدرات" کو بیان کرنا شروع کیا تو مولانا مودودی کے موقف اور نظریئے کی کامل تردید ہو گئی اور گویا ایک 'دعویٰ' (Thesis) کے مقابلے میں "جوابِ دعویٰ" (Anti-Thesis) پوری آب و تاب اور کامل شان و شوکت کے ساتھ سامنے آ گیا۔۔۔

مولانا اصلاحی کی یہ تقریر جہاں دلائل و براہین سے مسلّح' اور شکوہِ الفاظ اور حسنِ بیان سے مرصّع اور مسجّع تھی' وہاں جذبہ و جوش کا مظہر اتم اور حسنِ خطابت کا اعلیٰ مرقع بھی تھی ۔۔۔ افسوس کہ فکرِ صحیح اور فنِ خطابت کا یہ شاہکار امتزاج ریگستانِ بہاولپور کی خاموش فضاؤں میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔ اور اب اُس کا مکمل ریکارڈ تو دور رہا۔ اُس کے مضمون کا خلاصہ بھی صفحہ ہستی سے ناپید ہو چکا ہے (اگرچہ ہمیں یقین ہے کہ قیامت کے دن مولانا کا یہ بیان جماعت کی قیادت کے خلاف بہت بڑے الزام اور حجت کے طور پر پیش ہو گا!)۔۔۔ کاش کہ جماعت نے اسے محفوظ رکھا ہوتا تو خواہ اُس وقت ان کا موقف ردّ کر دیا گیا تھا' بعد میں مزید غور و فکر اور نظرِ ثانی کا امکان تو باقی رہتا اور اگر بالفرض اس کی نوبت بھی نہ آتی تو آنے والی نسلوں کو تو معلوم ہو

سکتا کہ تاریخِ جماعت اسلامی کے اس اہم موڑ پر کس نے کیا کہا تھا اور کس کا موقف کیا تھا؟...... اور یہ صورت تو نہ ہوتی کہ "اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں - بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟"...... کے مصداق کسی کو کچھ معلوم نہیں...... لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"

جہاں تک یادداشت کام کرتی ہے' مولانا اصلاحی کی پوری تقریر ایک لفظ یعنی "توازن" کے گرد گھومتی تھی جو خود مولانا مودودی کی مرتب کردہ قرارداد کے اصل متن میں بھی شامل تھا - البتّہ مولانا اصلاحی نے اُس میں جس جملے کا اضافہ کرایا تھا اس سے وہ زیادہ مؤکد بھی ہو گیا تھا اور اس نے گویا پورے لائحۂ عمل کے لئے محافظ اور مہیمن کی صورت اختیار کر لی تھی -

قرارداد اور اس کی ترمیمیں

مولانا مودودی نے اپنی قرارداد کی بناء اس لائحہ عمل پر قائم کی تھی جو انہوں نے ۱۹۵۱ء کے سالانہ اجتماع کے موقع پر پیش کیا تھا - اور جس پر اصولی اعتبار سے جماعت اُس وقت سے عمل پیرا تھی'...... یہ لائحۂ عمل چار اجزاء پر مشتمل تھا...... یعنی (۱) افکار کی تطہیر اور تعمیر نو - (۲) صالح افراد کی تلاش و تنظیم و تربیت - (۳) اجتماعی اصلاح کی سعی (یعنی اصلاحِ معاشرہ) - اور (۴) نظامِ حکومت کی اصلاح -

جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۵ نومبر تا ۱۰ دسمبر ۱۹۵۶ء میں جو قرارداد منظور کی تھی اس کی شق نمبر ۲ ان الفاظ پر مشتمل تھی

> "۲ـ مجلس شوریٰ کی رائے میں جو لائحہ عمل ۱۹۵۱ء کے اجتماعِ عام منعقدہ کراچی میں پیش کیا گیا تھا اور جو اب تک جماعتِ اسلامی کا لائحہ عمل ہے وہ اصولاً بالکل درست ہے اس کو برقرار رہنا چاہئے ـ لیکن مجلسِ شوریٰ یہ محسوس کرتی ہے کہ دستورِ اسلامی کی پیہم جدوجہد کی وجہ سے لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کے لئے خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا ہے اور اس کے باعث ہمارے بنیادی کام میں بہت بڑی کسر رہ گئی ہے ـ اس لئے مجلس کی متفقہ رائے یہ ہے کہ جماعت کی بنیادی دعوت اور لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کی طرف اب پوری توجہ اور کوشش صرف کرنے کی ضرورت ہے اور اس بنا پر مرکز

دست کسی انتخابی مہم کے لئے کام کرنا قبل از وقت ہو گا۔ البتہ اسلامی اقدار کے قیام و بقا اور دستورِ اسلامی کے تحفظ ' اصلاح اور نفاذ کے لئے ناگزیر اقدامات سے دریغ نہ ہونا چاہئے"۔

قرارداد ماچھی گوٹھ میں مولانا مودودی نے نہ صرف یہ کہ اس پورے قضیئے کو بالکل گول کر دیا۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر سارا زور "قیادت کی تبدیلی" پر مرکوز کر دیا... اور مخالف ذہن کی تسلی اور اطمینان کے لئے صرف اس اصولی اور مبہم بات پر اکتفا کی کہ :

"اس موقع پر ایک صالح قیادت کو بروئے کار لانے کے لئے صحیح طریق کار یہ ہے کہ اس لائحۂ عمل کے چاروں اجزاء پر توازن کے ساتھ اس طرح کام کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے کہ ہر جزو کا کام دوسرے جزو کے لئے موجبِ تقویت ہو!"۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے اسی "توازن" پر مورچہ لگاتے ہوئے قرارداد میں اس مقام پر ان الفاظ کا اضافہ کرایا تھا کہ :

"اور جتنا کام پہلے تین اجزاء میں ہوتا جائے اسی نسبت سے ملک کے سیاسی نظام میں دینی نظام کے حامیوں کا نفوذ و اثر عملاً بڑھتا چلا جائے!"۔

چنانچہ اب ارکانِ جماعت کے اجتماعِ عام میں جب مولانا اصلاحی نے اپنے اس جملے کے "مضمرات اور مقدّرات" کو کھول کر بیان کیا تو ان کی پوری تقریر عملاً دسمبر ۵۶ء کی قرارداد شوریٰ کی مندرجہ بالا شق نمبر ۲ کی تشریح و تفسیر بن گئی[1] اور اس طرح جماعت کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں یا اصحابِ حلّ و عقد کے مابین جماعت کی پالیسی اور طریقِ کار کے بارے میں جو متضاد خیالات اور نظریات ایک عرصے سے

---

[1] اس مرحلہ پر مولانا اصلاحی کا ایک یادگار جملہ تو نقل کئے بغیر آگے بڑھنے پر طبیعت ہر گز آمادہ نہیں ہے جو راقم کو حرف بحرف یاد ہے۔ مولانا نے انقلاب قیادت کی جدوجہد کے ضمن میں اس چار نکاتی لائحہ عمل کے چاروں اجزاء کے مابین "توازن" برقرار رکھنے کی اہمیت کے سلسلے میں فرمایا کہ :

"اگر اس کے بغیر آپ کبھی کسی الٹی سیدھی تدبیر سے قیادت کے منہ زور گھوڑے پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایسی دولتی رسید کرے گا کہ قیادت و سیادت کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا!"۔

پروان چڑھ رہے تھے' اور جن کی سرے سے کوئی خبر یا اطلاع جماعت کے ارا کین کی عظیم اکثریت کو نہیں تھی اچانک ایک بھیانک تضاد کی صورت میں اجتماع ارکان کے سامنے آ گئے ۔۔۔ چنانچہ پورا مجمع ایسے ہو گیا جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو' اور جملہ ارا کین جماعت پر ایک حالتِ متحیرہ طاری ہو گئی کہ ۔
دیکھیئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا - گنبد نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا!

نعیم صدیقی صاحب کی جانب سے مولانا اصلاحی کا تعاقب

اس پر' جوابِ آں غزل' کے انداز میں ارکانِ مجلسِ شوریٰ میں مولانا مودودی کے موقف اور نقطۂ نظر کے سب سے بڑے حامی اور طریقِ کار اور پالیسی کے ضمن میں مولانا کے خیالات کے سب سے بڑے ترجمان جناب نعیم صدیقی اٹھے اور انہوں نے ایک بھرپور تقریر میں " توازن " کے اس "ہیضے " کو " ذہنی عدمِ توازن " کا مظہر اور شاخسانہ قرار دیا اور گویا مولانا اصلاحی اور ان کے ہم خیال لوگوں کو خللِ دماغی کے عارضہ میں مبتلا ... یعنی ذہنی مریض قرار دیدیا ...... نفسِ مضمون سے قطع نظر' نعیم صدیقی صاحب کی تقریر بھی ایک جانب نہایت مرتب اور مربوط بھی تھی' اور دوسری جانب فصاحت و بلاغت کا عمدہ نمونہ بھی - اور اگرچہ راقم الحروف کی یہ رائے اپنے زمانہ طالب علمی ہی کے دوران پختہ ہو چکی تھی کہ نعیم صاحب نے اپنے اندازِ تقریر میں ایک حد تک مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کے اسلوبِ خطاب کی خوبیوں کو جمع کر لیا ہے' چنانچہ اُن کی تقریر میں مولانا مودودی کا سا ربط و تسلسل بھی ہوتا ہے اور مولانا اصلاحی کا سا خطیبانہ انداز بھی' تاہم اُن کی اس تقریر کے بارے میں یہ باور کرنا میرے لئے بھی مشکل تھا کہ وہ فی الفور یعنی ارتجالاً (Extempore) کی گئی تھی ۔۔۔ اور اسے قارئین خواہ میرے سوءِ ظن پر محمول کر لیں' خواہ انگریزی محاورے (Too Good To Beleive) کے مطابق اندازِ تحسین پر' بہرحال تقریر کا انداز تو اِسی کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے پہلے ہی سے خوب اچھی طرح تیار کیا گیا تھا (واللہ اعلم!!)

اس کا نتیجہ وہی نکلا جو منطقی طور پر نکلنا چاہئے تھا ــــ یعنی وہ بُحران جس نے مولانا اصلاحی کی تقریر کے بعد ایک سکتہ بلکہ سکوتِ مرگ کی سی کیفیت اختیار کر لی تھی نعیم صاحب کی تقریر کے بعد ایک ہیجان کی صورت اختیار کر گیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے پورے مجمعے نے دو متحارب گروہوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مولانا مودودی کی جانب سے دعوتِ مبارزت

اس ہیجانی اور طوفانی کیفیت میں مولانا مودودی دوبارہ سٹیج پر آئے اور انہوں نے اولاً اپنے مخصوص دھیمے اور پر سکون انداز میں مولانا اصلاحی کے اعتراضات اور دلائل کا ردّ کیا اور تان اس پر توڑی کہ اگر اس قرارداد سے یہ مطالب بھی اخذ کئے جا رہے ہیں، یا ان "مقدرات و مضمرات" کو بھی مستنبط کیا جا رہا ہے تو میں اس کے سدِّ باب کے لئے اس میں ابھی ترمیم کئے دیتا ہوں تا کہ آئندہ کے لئے کسی ابہام یا اشتباہ کا امکان ہی باقی نہ رہے...... چنانچہ انہوں نے قرارداد میں مولانا اصلاحی کے اصرار پر اضافہ شدہ الفاظ کے فوراً بعد ان الفاظ کا اضافہ کر دیا کہ:

> "مگر یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ توازن قائم نہ رہنے کو کسی وقت بھی اس لائحۂ عمل کے کسی جزو کو ساقط یا معطل یا مؤخر کر دینے کے لئے دلیل نہ بنایا جا سکے گا!"۔

اسے عوامی انداز بیان میں یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح مولانا مودودی نے مولانا اصلاحی کے نہلے پر دہلا دے مارا، اور بھرے مجمعے میں مولانا اصلاحی کو دعوتِ مبارزت دیدی کہ اگر ہمّت اور سکت ہے تو مقابلے میں آ جاؤ، اور اِس قرارداد سے اپنا اتفاق واپس لیتے ہوئے کوئی متبادل قرارداد یا قراردادِ عدمِ اعتماد لے کر سامنے آؤ تا کہ آٹے دال کا بھاؤ بھی معلوم ہو جائے، اور یہ بات بھی کھل جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے! گویا (غالبؔ کے مصرعے میں قدرِ قلیل تبدیلی کے ساتھ)...... "آؤ... یہ گوئے ہے، اور یہ میدان"!

مولانا مودودی کی جانب سے اس واضح چیلنج کے بعد کے چند لمحات نہ صرف اجتماعِ ماچھی گوٹھ بلکہ جماعتِ اسلامی کی پوری تاریخ کے لئے فیصلہ کن موڑ کی

حیثیت رکھتے ہیں - اِس لئے کہ مولانا مودودی نے ایک بار پھر اپنے مزاج کی مستقل ساخت ' یا گزشتہ چند مہینوں کے دوران میں ظاہر ہونے والے حالات و واقعات کی بنا پر پیدا شدہ "تنگ آمد بجنگ آمد" کی فوری اور وقتی کیفیت کے تحت ایسا قدم اٹھا دیا تھا جس سے نہ صرف یہ کہ دستورِ جماعت کی رُوح بُری طرح مجرُوح ہو رہی تھی بلکہ معقولیت کے جملہ تقاضے بھی پامال ہو کر رہ گئے تھے ... اور ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر اُس وقت مولانا اصلاحی بھی اپنی راجپوتی آن اور شان کا مظاہرہ کرتے تو اغلباً جماعت کی مکمّل تباہی ورنہ کم از کم اِس کا دو حصّوں میں تقسیم ہو جانا لازمی ولابدی تھا-

صورتِ حال کا تجزیہ

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگر مولانا مودودی کا ذہن اِس قدر یکسُو تھا تو انہیں اپنی قرارداد میں مولانا اصلاحی کے اضافے کو ہر گز قبول نہیں کرنا چاہئے تھا- اس صورت میں اجتماعِ ماچھی گوٹھ کی کارروائی اُسی رخ پر چلتی جس کی نشان دہی ہم' چند ارا کینِ جماعتِ اسلامی منٹگمری نے کی تھی 'یعنی مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی اپنی اپنی قراردادیں لے کر ارکان کے سامنے آتے اور اپنے اپنے نقطۂ نظر کی کماحقہٗ وضاحت کرتے اور ارکانِ جماعت علیٰ وجہ البصیرت کسی ایک راہ کو اختیار کر لیتے- لیکن جب انہوں نے مولانا اصلاحی کی ترمیم کو قبول کر لیا تو اب وہ قرارداد اُن کی ذاتی نہیں رہی تھی بلکہ نہ صرف اُن کی اور مولانا اصلاحی کی' بلکہ دستورِ جماعت کی رو سے امیر جماعت اور مجلس شورٰی کی متفق علیہ قرارداد بن گئی تھی...... اور مولانا اصلاحی کی تقریر کے بعد اگر انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ مولانا اصلاحی کا اضافہ انہوں نے سہوًا اور اس کے "مضمرات اور مقدّرات" کے شعور و دراک کے بغیر قبول کر کے غلطی کی تھی تو ان کے لئے صاف اور سیدھا' اور نہ صرف معقولیت بلکہ شرافت اور مروّت پر مبنی راستہ یہ تھا کہ اجتماعِ ارکان کو تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر کے مرکزی مجلس شورٰی کا اجلاس منعقد کرتے اور اس میں اپنی مجوزہ ترمیم پیش کرتے' پھر اگر مولانا اصلاحی اور اُن کے ہم خیال

دگ بھی اسے قبول کر لیتے تو فبہا' ورنہ مولانا اصلاحی کے لئے پورا موقع موجود ہوتا
کہ ٹھنڈے دل کے ساتھ از سرِ نو غور کر کے اپنا آئندہ لائحۂ عمل طے کر لیں' پھر
نواہ وہ خاموشی اختیار کرتے' جیسے کہ انہوں نے اجتماع ارکان میں کی' خواہ خم
مونک کر میدان میں آجاتے اور وہ طرزِ عمل اختیار کرتے جو بعد میں خود انہوں
نے اپنے گشتی مراسلے میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ "میں نے شوریٰ کو بتایا کہ
گر آپ لوگ اس قرارداد کو اجتماعِ عام میں لائیں گے تو میں دسمبر والی شوریٰ کی
متفق علیہ) قرارداد جماعت کے سامنے پیش کروں گا اور امیر جماعت اور ان کے
صحاب نے اس قرارداد کو دفن کرنے کے لئے جو ہتھکنڈے چلائی ہیں اور جو
قدامات کئے ہیں وہ سب اجتماعِ عام (ارکان) میں بیان کروں گا...... میری تقریر کے
قت میرے ہاتھ میں قرآن ہو گا اور میں اپنے داہنے امیرِ جماعت کو بٹھاؤں گا اور
ئیں قائم مقام امیر جماعت چودھری غلام محمد صاحب کو' اور یہ دونوں حضرات
یری جس بات کو کہہ دیں گے کہ جھوٹ ہے میں بغیر کسی حجت کے اسے واپس
لے لوں گا۔" دونوں صورتوں میں ذمہ داری مولانا اصلاحی کی ہوتی اور مولانا مودودی
پر کوئی حرف نہ آتا۔

لیکن اس صاف اور سیدھے راستے کو چھوڑ کر جو طرزِ عمل مولانا مودودی
نے اختیار کیا' یعنی یہ کہ مجلس شوریٰ کو نظر انداز ہی نہیں' گویا اس کے وجود ہی
کی نفی کرتے ہوئے پورے قضیئے کو اچانک ایسے ارکان کے اجتماعِ عام میں پیش کر
یا جن کی عظیم اکثریت نہ صرف یہ کہ پالیسی اور طریقِ کار کے ضمن میں اختلافِ
رائے سے اس روز سے قبل تک قطعاً ناواقف تھی' بلکہ اُن تلخ اور تکلیف دہ' بلکہ نا
گفتہ بہ حالات و واقعات سے تو سرے سے بے خبر محض تھی جو دسمبر ۵۶ء اور
جنوری ۵۷ء میں جماعت کے بعض حلقوں (بالخصوص لاہور' لائل پور اور راولپنڈی)
ں رونما ہوئے تھے... تاکہ ایک ناواقف اکثریت سے محض اپنی ذاتی مقبولیت کے
ل پر حسبِ منشا فیصلہ حاصل کیا جا سکے...... یہ طرزِ عمل مولانا مودودی نے اگر نا
انستہ اور غیر شعوری طور پر اختیار کیا تب بھی اسے نہ صرف جماعتِ اسلامی بلکہ
تِ اسلامیہ پاکستان کی بد قسمتی بلکہ شامتِ اعمال قرار دیا جائے گا' اور اگر خوب

سوچ بچار کے بعد جان بوجھ کر مصلحتاً اختیار کیا تب تو اسے میکیاولی سیاست کے شاہکار سے کم کوئی نام دیا ہی نہیں جاسکتا اور اس کی کوئی نظیر کم از کم ماضئ قریب کی تاریخ میں تو سوائے قادیانیت کی تاریخ کے اس واقعے کے اور کہیں نہیں مل سکتی، کہ جب حکیم نور الدین کے انتقال کے بعد نئی خلافت کے تصفیے کے ضمن میں قادیانی گروہ کے اُس مرکزی مشاورتی ادارے نے 'جو آغاز سے اس وقت تک بالکل جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ ہی کے مانند' آخری بااختیار ادارہ رہا تھا' مرزا بشیر الدین محمود احمد کی بجائے 'اور اُس کی بھرپور کوشش کے علی الرّغم' مولوی محمد علی لاہوری کے حق میں فیصلہ کر دیا تو مرزا محمود نے جیسے بھی بن پڑا معاملہ مجلس عامہ (جنرل باڈی) میں پیش کرا کے ایک ہیجانی اور جذباتی ماحول میں 'ناواقف اور ناکندہ تراش لوگوں کی اکثریت سے اپنے حق میں فیصلہ حاصل کر لیا تھا۔

دوسری طرف جب مولانا اصلاحی نے مولانا مودودی کی اس' مبارزت' کے جواب میں نہ کوئی احتجاج کیا' نہ شوریٰ کے اجلاس کے انعقاد کا مطالبہ کیا' نہ ترمیم شدہ قرارداد سے اپنا 'اتفاق' واپس لے کر کوئی متبادل قرارداد پیش کی' بلکہ نہ صرف یہ کہ خود کامل سکوت اختیار کیا' بلکہ جب بعض دوسرے ارکانِ شوریٰ (جیسے مولانا عبد الغفار حسن) نے بولنا چاہا تو اُن پر بھی اپنے اثر اور رسوخ کو استعمال کر کے انہیں چپ کرا دیا' تو اِس طرزِ عمل کو بھی کسی طرح نہ درست قرار دیا جاسکتا ہے' نہ اس دستور کی روح کے مطابق جس کی دہائی انہوں نے اُس وقت تک بھی بارہا دی تھی۔ اور بعد میں تو اپنے تمام شکووں اور شکایتوں کو اُسی پر مبنی قرار دیا۔

مولانا اصلاحی کے اس طرزِ عمل کو کسی معتدل اور متوازن یا درمیانہ اور اوسط موقف پر مبنی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ اُس کے بارے میں دو انتہائی آراء میں سے ایک کو اختیار کئے بغیر چارہ نہیں ہے...... یعنی یا تو اسے انتہائی بزدلی کا مظہر' اور اس خوف پر مبنی قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس وقت اگر مولانا مودودی کو براہ راست چیلنج کرنے کی روش اختیار کی تو اس میں بھی کوئی تعجب کی بات نہ ہو گی کہ باضابطہ 'پٹائی' ہو جائے (اس لئے کہ صوبۂ سرحد سے تعلق رکھنے والے ارکانِ جماعت کے تیور اُس وقت بلاشبہ اسی انداز کے تھے) بصورتِ دیگر بھی شکست فاش اور اس کے

نتیجے میں رسوائی اور جگ ہنسائی قطعاً یقینی ہے...... یا پھر دوسری جانب مولانا کے طرزِ عمل کو جماعت کے ساتھ انتہائی خلوص و اخلاص، اور خود مولانا مودودی کے ساتھ کم از کم ناگزیر حد تک حسنِ ظن کے برقرار رہنے پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے...... ان میں سے جہاں تک مقدم الذکر توجیہہ کا تعلق ہے وہ مولانا کے نسلی پس منظر (مولانا نسلاً راجپوت ہیں) اور خود ذاتی مزاج اور سب سے بڑھ کر ایک سال بعد کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر قابلِ قبول نظر نہیں آتی۔ رہی مؤخر الذکر توجیہہ تو اس کا حصۂ اوّل تو حسنِ ظن کی بنا پر قبول کیا جا سکتا ہے، لیکن دوسرا جزو اُس خط کے پیشِ نظر ہرگز کسی بھی درجے میں قابلِ قبول نہیں ہے جو تقریباً دو ماہ قبل ارکانِ جائزہ کمیٹی کے خلاف مولانا مودودی کے الزام نامے کے جواب میں مولانا اصلاحی نے تحریر کیا تھا! (اس خط میں 'اگر مگر' کے پردوں میں اگر کوئی بات مخفی رہ بھی گئی تھی تو ایک سال بعد رکنیت جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد جو خط و کتابت مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین ہوئی اس نے تو ع "پر شب کی منتوں نے تو کھو دی رہی سہی!" کے مصداق اگلے پچھلے سارے ہی پردے فاش کر دیئے)

ان دونوں انتہاؤں کے مابین صرف ایک ہی ممکن توجیہہ باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ مولانا مودودی کے اس اچانک حملے سے مولانا اصلاحی بالکل بھونچکے ہو کر رہ گئے ہوں اور ان کی قوّتِ فیصلہ فوری طور پر مفلوج ہو گئی ہو...... اور بہتر یہی ہے کہ اصل حقیقت کو "یَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ" ______ پر ملتوی کر کے فی الوقت یہی گمان کیا جائے کہ مولانا اصلاحی کے طرزِ عمل کا اصل سبب یہی تھا، واللہ اعلم۔

☆ ☆ ☆

ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان کا اصل اور فیصلہ کن حصّہ تو وہی تھا جو بیان ہو گیا باقی تو محض قواعد و ضوابط کی خانہ پُری اور صرف بھرتی کی کارروائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ راقم کو بالکل یاد نہیں آ رہا کہ مولانا مودودی کی جانب سے اس ترمیم شدہ قرارداد کے دوبارہ پیش ہو جانے کے بعد اس کے حق میں یا اس سے اتفاق کے علی الرّغم کسی قدر قیل و قال پر مشتمل کوئی اور تقریر ہوئی تھی یا نہیں۔ ایک گمان سا

ہوتا ہے کہ شاید جناب مصطفیٰ صادق کی تقریر بھی اسی مرحلے پر ہوئی ہو اس لئے کہ انہوں نے اصل قرارداد سے کامل اتفاق کرتے ہوئے اس سے "عملی انحراف" کی چند نہایت نمایاں مثالیں پیش کی تھیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کی تقریر کی اس ماحول میں بھی کافی پذیرائی ہوئی تھی، تاہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ بھی بعض دوسری تقاریر سے مشابہ تھی، لہٰذا اس کا ذکر اُن ہی کے ساتھ مناسب ہوگا!

یہ بھی اب اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ مولانا مودودی کی اس قرارداد پر رائے شماری کس مرحلے پر ہوئی، قیاس بھی یہی کہتا ہے اور گمان غالب بھی یہی ہے کہ رائے شماری اس قرارداد میں ترمیم کی تجویز پر مشتمل قراردادوں اور بالکل جداگانہ اور متبادل قراردادوں کے پیش ہونے کے بعد ہی ہوئی ہوگی، پھر چونکہ اس رائے شماری کے اعداد و شمار کا بھی کوئی دوسرا ریکارڈ موجود نہیں ہے، لہٰذا حسنِ ظن کے تقاضے پر مستزاد مجبوری بھی ہے، اور ماچھی گوٹھ کے حالات کے اعتبار سے قرین قیاس بھی، کہ "تحریک اسلامی کے آئندہ لائحہ عمل" نامی کتاب کے دیباچہ میں وارد شدہ اس بیان کو تسلیم کیا جائے کہ "ارکان جماعت میں سے ۹۲۰ نے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی پیش کردہ قرارداد کے حق میں اور صرف ۱۵ نے اس کے خلاف رائے دی۔ اس طرح یہ قرارداد جماعت کی ۹۸ فی صد سے بھی زیادہ اکثریت سے پاس کی گئی۔" (صفحہ ۴)

آگے بڑھنے سے قبل اس قرارداد کا مکمل متن مع جملہ ترامیم بھی سامنے آجائے تو بہتر ہے وھوھٰذا:

"جماعتِ اسلامی پاکستان اس امر پر اللہ تعالےٰ کا شکر بجالاتی ہے کہ اب سے پندرہ سال قبل جس نصب العین کو سامنے رکھ کر، اور جن اصولوں کی پابندی کا عہد کر کے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا، آج تک وہ اسی منزلِ مقصود کی طرف انہی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے بڑھتی چلی آرہی ہے۔ اس طویل اور کٹھن سفر کے دوران میں اگر اس سے اقامتِ دین کے مقصد کی کوئی خدمت بن آئی ہے تو وہ سراسر اللہ کا فضل ہے جس پر وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہے، اور اگر کچھ کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد ہوئی ہیں تو وہ اس کے اپنے ہی قصور کا نتیجہ ہیں جن پر وہ اپنے مالک سے عفو و درگزر اور مزید ہدایت و توفیق کی دعا کرتی ہے۔

جماعت اسلامی اس بات پر مطمئن ہے کہ تحریکِ اسلامی کا جو لائحۂ عمل نومبر ۱۹۵۱ء میں ارکان کے اجتماعِ عام منعقدہ کراچی میں امیر جماعت نے مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے پیش کیا تھا وہ بالکل صحیح توازن کے ساتھ مقصدِ تحریک کے تمام نظری اور عملی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، اور وہی آئندہ بھی اس تحریک کا لائحۂ عمل رہنا چاہئے۔

اس لائحۂ عمل کے پہلے تین اجزاء (یعنی تطہیرِ افکار و تعمیرِ افکار، صالح افراد کی تلاش و تنظیم و تربیت اور اجتماعی اصلاح کی سعی) تو جماعت اسلامی کی تشکیل کے پہلے ہی دن سے اس کے لائحۂ عمل کے اجزاءِ لازم رہے ہیں، البتہ ان کو عمل میں لانے کی صورتیں حالات و ضروریات کے لحاظ سے اور جماعت کے وسائل و ذرائع کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ ان کے بارے میں جماعت اب یہ طے کرتی ہے کہ آئندہ کوئی دوسرا جماعتی فیصلہ ہونے تک ان تینوں اجزاء کو اُس پروگرام کے مطابق عملی جامہ پہنایا جائے جو اس قرارداد کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کیا جارہا ہے۔ نیز جماعت کا یہ اجتماع عام مجلسِ شوریٰ، اور تمام حلقوں، اضلاع اور مقامات کی جماعتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس پروگرام پر اس حد تک زور دیں کہ لائحۂ عمل کے چوتھے جزو کے ساتھ جماعت کے کام کا ٹھیک توازن قائم ہو جائے اور قائم رہے۔

اس لائحہ عمل کا چوتھا جز جو نظامِ حکومت کی اصلاح سے متعلق ہے، در حقیقت وہ بھی ابتدا ہی سے جماعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ جماعت نے ہمیشہ اس سوال کو زندگی کے عملی مسائل میں سب سے اہم اور فیصلہ کن سوال سمجھا ہے کہ معاملاتِ زندگی کی زمام کار صالحین کے ہاتھ میں ہے یا فاسقین کے ہاتھ میں، اور حیاتِ دنیا میں امامت و رہنمائی کا مقام خدا کے مطیع فرمان بندوں کو حاصل ہے یا اس کی اطاعت سے آزاد رہنے والوں کو۔ جماعت کا نقطۂ نظر ابتداء سے یہ ہے کہ اقامتِ دین کا مقصد اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک اقتدار کی کنجیوں پر دین کا تسلّط قائم نہ ہو جائے۔ اور جماعت ابتداء ہی سے یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھتی ہے کہ دین کا یہ تسلّط یک لخت کبھی قائم نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ ایک تدریجی عمل ہے جو غیر دینی نظام کے مقابلے میں دینی نظام چاہنے والوں کی پیہم کشمکش اور درجہ بدرجہ پیش قدمی سے ہی مکمّل ہوا کرتا ہے۔ جماعتِ اسلامی نے اس مقصد کے لئے تقسیمِ ہند سے پہلے اگر عملاً کوئی اقدام نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ مواقع کا فقدان اور ذرائع کی کمی بھی تھی اور یہ وجہ بھی تھی کہ اس وقت کے نظام میں اس مقصد کے لئے کام کرنے میں بعض شرعی موانع تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب اللہ تعالےٰ نے مواقع اور ذرائع دونوں فراہم کر دیئے اور شرعی موانع کو دور

کرنے کے امکانات بھی پیدا کر دیئے تو جماعت نے اپنے لائحۂ عمل میں اس چوتھے جزو کو بھی، جو اس کے نصب العین کا ایک لازمی تقاضا تھا، شامل کر لیا۔ اس میدان میں دس سال کی جدوجہد کے بعد اب غیر دینی نظام کی حامی طاقتوں کے مقابلے میں دینی نظام کے حامیوں کی پیش قدمی ایک اہم مرحلے تک پہنچ چکی ہے۔ ملک کے دستور میں دینی نظام کے بنیادی اصول منوائے جا چکے ہیں۔ اور ان منوائے ہوئے اصولوں کو ملک کے نظام میں عملاً نافذ کرانے کا انحصار اب قیادت کی تبدیلی پر ہے۔ اس موقع پر ایک صالح قیادت بروئے کار لانے کے لئے صحیح طریقِ کار یہ ہے کہ اس لائحۂ عمل کے چاروں اجزاء پر توازن کے ساتھ اس طرح کام کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے کہ ہر جزو کا کام دوسرے جزو کے لئے موجبِ تقویت ہو، اور جتنا کام پہلے تین اجزاء میں ہوتا جائے، اسی نسبت سے ملک کے سیاسی نظام میں دینی نظام کے حامیوں کا نفوذ و اثر عملاً بڑھتا چلا جائے۔ مگر یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ توازن قائم نہ رہنے کو کسی وقت بھی اس لائحہ عمل کے کسی جزو کو ساقط یا معطل یا مؤخر کر دینے کے لئے دلیل نہ بنایا جا سکے گا۔

علاوہ بریں چونکہ جماعتِ اسلامی اپنے دستور کی رُو سے اپنے پیشِ نظر اصلاح و انقلاب کے لئے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے کی پابند ہے، اور پاکستان میں اس اصلاح و انقلاب کے عملاً رونما ہونے کا ایک ہی آئینی راستہ ہے، اور وہ ہے انتخابات کا راستہ، اس لئے جماعتِ اسلامی ملک کے انتخابات سے بے تعلق تو بہر حال نہیں رہ سکتی، خواہ وہ ان میں بلاواسطہ حصہ لے یا بالواسطہ یا دونوں طرح۔ رہا یہ امر کہ انتخابات میں کس وقت ان تینوں طریقوں میں کس طریقے سے حصہ لیا جائے، اس کو جماعت اپنی مجلسِ شوریٰ پر چھوڑتی ہے تاکہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر حالات کا جائزہ لے کر اس کا فیصلہ کرے۔"

مؤلّف کی متبادل قرارداد اور اس کا حشر

اگر یہ بات کسی درجے میں بھی درست ہے کہ ۔ "ایک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق ۔ نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی!" تو واقعہ یہ ہے کہ اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں اصل رونق اس خاکسار کی قرارداد اور تقریر سے پیدا شدہ "ہنگامے" کے باعث ہوئی، اور ۔ "گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے ۔ قصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو!" کے مصداق اس اجتماع کو اصل رنگ راقمِ

لہو ہی نے فراہم کیا۔ اس لئے کہ راقم اگرچہ تا حال فیض کے ان دو اشعار کا مصداق کامل تو نہیں بن سکا کہ

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری۔ تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر ۔ کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار!

تاہم اجتماع ماچھی گوٹھ کے دوران وہ اِن کے نصف مصداق ضرور بن گیا۔ چنانچہ سرِ بازار رسوائی بھی پوری شدت سے ہوئی اور ایک داعیٔ اسلام اور قائدِ تحریکِ اسلامی کی سرِ عام مخالفت کا ہدف بھی بننا پڑا۔ بلکہ مَیں آج بھی سوچتا ہوں تو قسمت کی اس ستم ظریفی پر حیران ہو کر رہ جاتا ہوں کہ اُس وقت حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مجھے پچیس سال سے بھی کم عمر میں چار و ناچار ایک ایسے شخص کے مدِ مقابل کی حیثیت سے کھڑا ہونا پڑا، جسے میں اُس وقت تو اپنا مرشد و ہادی سمجھتا تھا، آج بھی کم از کم محسن ضرور سمجھتا ہوں...... اور جو علم و فضل، اور شہرت و وجاہت سے قطع نظر عمر میں بھی میرے والد کے برابر تھا۔ (مولانا مودودی مرحوم اور میرے والد شیخ مختار احمد مرحوم، دونوں کا سنِ پیدائش ۱۹۰۳ء ہے)... تاہم اس شدید احساس کے باوجود کہ ع "یہ آج تری دنیا میں ہمیں تقدیر کہاں لے آئی ہے؟" راقم اُس وقت بھی مطمئن تھا اور اب بھی مطمئن ہے کہ یہ صورت اس کے لئے نہ پسندیدہ تھی نہ اختیاری، بلکہ حالات کے اس جبر پر مبنی تھی کہ مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے معزز اراکین مجلس شوریٰ تو جن مصلحتوں یا اندیشوں کی بنا پر دَبک گئے تھے وہ ان ہی کو معلوم تھیں، میرے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" پر عمل کرتے ہوئے جماعت اور اس کی قیادت کا حقِ نصح ادا کرنے کی امکان بھر کوشش کروں۔

چنانچہ راقم نے مولانا مودودی کی قرارداد کے مقابلے میں ایک متبادل قرارداد پیش کی جس کا متن درج ذیل ہے:

"جماعتِ اسلامی پاکستان کا یہ اجتماعِ ارکان بہت سوچ و بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اگرچہ جماعت نے پچھلے پندرہ سالوں میں اپنے نصب العین سے اصولاً انحراف نہیں کیا ہے لیکن ۴۷ء میں پاکستان میں نظامِ اسلامی کے قیام کے لئے جو طریق کار جماعت نے

اختیار کیا تھا اور جس پر جماعت تا امروز عمل پیرا ہے وہ مجموعی طور پر اس طریقِ کار سے بالکل مختلف ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ یہ طریقِ کار اپنے سابقہ طرزِ عمل سے مختلف بلکہ متضاد ہونے کے علاوہ پاکستان کے عوام اور اس کے برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں کچھ ایسی خوش فہمیوں اور خود جماعت کی طاقت و وسائل و ذرائع کے بارے میں ایسے اندازوں پر مبنی تھا جو بعد میں کلیۃً درست ثابت نہ ہو سکے۔ اس طریق کار کے تحت ساڑھے نو سالہ جدوجہد کا منفی طور پر یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا ہے کہ کوئی اور نظام بھی اس ملک میں اپنی جڑیں گہری نہیں جما سکا لیکن مثبت طور پر نظامِ اسلامی کے قیام کے لئے جو کچھ کیا جا سکا ہے وہ اس طویل اور انتھک جدوجہد کے مقابلے میں بے حد کم ہے کہ جو ان نو سالوں میں جماعت کو کرنی پڑی ہے۔ اس جدوجہد کا ماحصل دستور میں شامل شدہ چند کمزور اور متزلزل اسلامی دفعات اور صرف مسئلۂ دستور پر اس ملک کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اسلامی نقطۂ نظر سے علمی راہنمائی کے سوا کچھ نہیں۔ اس عرصے میں نہ تو عوام کی اسلامی نقطۂ نظر سے ٹھوس فکری و ذہنی تربیت کی جا سکی ہے نہ اخلاقی و عملی، اور اس معاملے کا دردناک ترین پہلو یہ کہ اس طریق پر جدوجہد کے دوران جماعت کو نہ صرف اپنے کارکنوں کے سرمایۂ دین و اخلاق اور متاعِ خلوص و للّٰہیت کے ایک حصے کا ضیاع برداشت کرنا پڑا ہے بلکہ اسے خود اپنی بین الاقوامی، اصولی، اسلامی جماعت ہونے کی حیثیت سے ہاتھ دھو کر ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کر لینی پڑی ہے۔

موجودہ طریقِ کار کے غلط ہونے کے علاوہ جماعت کا یہ اجتماعِ ارکان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے مطابق جدوجہد کو آئندہ جاری رکھنے کی صورت میں جماعت کو جو خطرات پیش آ سکتے ہیں وہ ان تمام نتائج و خدشات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں جو اس طریقِ کار کو چھوڑ کر سابق طریق کو اختیار کرنے میں پیش آ سکتے ہیں۔

بنابریں جماعت کا یہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ موجودہ طریقِ کار کو اسی لمحہ ترک کر کے اسی طریقِ کار کو اصولاً دوبارہ اختیار کرنے ہی پر جماعت کی اخروی و دنیوی فوز و فلاح کا دارومدار ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ چنانچہ یہ اجتماع فیصلہ کرتا ہے کہ ماضی کے بارے میں اس نقطۂ نظر اور مستقبل کے بارے میں اس فیصلے کو اصولاً تسلیم کرنے کے بعد اس کے مطابق آئندہ کا لائحہ عمل تجویز کرنے کے لئے جماعت کے اربابِ حلّ و عقد جمع ہو کر سوچ بچار کریں اور ایک تفصیلی لائحۂ عمل مرتّب کر کے اس اجتماع کے سامنے پیش کریں"۔

اسرار احمد عفی عنہ رکن منٹگمری

ظاہر ہے کہ یہ قرارداد میرے اس مفصل بیان کے حاصلِ بحث اور لبّ لباب کی حیثیت رکھتی تھی، جو میں نے "جائزہ کمیٹی کی خدمت میں[1]" پیش کیا تھا ... اور جس نے نہ صرف ارکان جائزہ کمیٹی بلکہ بہت سے دوسرے اراکینِ مجلسِ شوریٰ کو اس نتیجے تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا تھا جس کے دباؤ کے تحت نومبر دسمبر ۵۶ء کی قرارداد شوریٰ میں ہزار احتیاطوں اور اندیشہ ہائے دور دراز کے باوجود حسب ذیل الفاظ بطور شق نمبر ۱ شامل ہو گئے تھے :

"جماعت نے تقسیم ملک سے پہلے اور بعد اب تک جو کام کیا ہے اس کے متعلق مجلسِ شوریٰ اس بات پر مطمئن ہے کہ جماعت اپنے اصول، مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے، البتہ تدابیر کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں اور صحیح قرار دینے کی صورت میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفید نتائج کے ساتھ بعض مضر نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں ۔ جنہیں رفع کرنے کی ہم سب کو کوشش کرنی چاہئے" ۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے اُس خط میں، جو اجتماع ماچھی گوٹھ کے لئے روانہ ہونے سے قبل منٹگمری ہی سے قائم مقام امیر جماعت چودھری غلام محمد (مرحوم) کے نام پانچ دیگر ارکانِ جماعت کی معیت میں ارسال کیا تھا صراحت کے ساتھ لکھ دیا تھا کہ: "ہمیں اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ ہم اجتماعِ ارکان میں اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت سے رکھ دیں ..... مزید تشریح مناسب ہے کہ ہمیں کم از کم اتنا وقت درکار ہوگا کہ ہم اپنے اُس متفقہ بیان[2] کو جو ہم نے جائزہ کمیٹی کے

---

[1] یہ بیان اب "تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" نامی کتاب کی صورت میں مطبوعہ موجود ہے جو بڑے سائز کے ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے ... راقم کے پاس اس کا اصل مسودہ تاحال محفوظ ہے اور ان سطور کی تحریر کے وقت ایک ضرورت سے اسے نکال کر دیکھا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس کا عنوان اُس وقت میں نے "جائزہ کمیٹی کی خدمت میں!" ہی تحریر کیا تھا۔

[2] واضح رہے کہ جماعت اسلامی منٹگمری کے ان ارکان نے جائزہ کمیٹی سے ملاقات پر بھی یہی کہا تھا کہ ہمارے نظریات تقریباً وہی ہیں جو ڈاکٹر اسرار احمد کے ہیں، اور پھر جب راقم اپنا بیان ضبطِ تحریر میں لے آیا تب بھی انہوں نے اس سے اپنے کامل اتفاق کا اظہار کر دیا تھا!

امنے پیش کیا تھا پڑھ کر اجتماع ارکان میں سنا دیں اور آئندہ کے بارے میں ایک
راروداد مرتب کر کے اُسے وضاحت کے ساتھ پیش کر سکیں" --- اور اس کے
اتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ: "اگر یہ قابل قبول نہ ہو تو ہمیں اجتماع سے
ل ہی مطلع کر دیا جائے - ہم اس کے لئے پورے انشراحِ صدر کے ساتھ تیار ہیں
لہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں - اور نہ اپنی منزل کھوٹی کریں
ور نہ جماعت کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوں!" - اور 'جیسے کہ پہلے
رض کیا جا چکا ہے' اس تحریر کے جواب میں ہمیں بذریعہ تار مطلع کیا گیا تھا کہ
جتماع ارکان میں سب کو اظہارِ خیال کا پورا موقع دیا جائے گا -

لیکن جب ماچھی گوٹھ پہنچنا ہوا تو فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اجتماع کو جس
ورسے Conduct کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے اس میں ہمارے مطالبے کا بہ تمام و
مال پورا ہونا تو قطعاً ناممکن ہے' صرف یہ کوشش کی جا سکتی ہے کہ اپنے نقطۂ نظر
کو ایک مختصر تقریر میں واضح کیا جائے' اور اس کے لئے اگرچہ میرے پاس اپنے
بان کی صورت میں وسیع مواد اور مفصّل دلائل و شواہد موجود تھے لیکن یہ بہرحال
زم تھا کہ اس طویل بیان میں سے موقع کی مناسبت سے اہم تر مواد کا انتخاب کرا جاتا
ور اسے از سرِ نو مرتب کر کے تقریر تیار کی جاتی - اور اس کے لئے' ظاہر ہے
کہ' یہ لازم تھا کہ یہ معلوم ہوتا کہ مجھے تقریر کے لئے کتنا وقت دیا جا سکے گا ---
لذا میں دورانِ اجتماع قائم مقام امیر جماعت سے اس سلسلے میں مسلسل استفسار
کرتا رہا جس کا یہی مستقل جواب ملتا رہا کہ "ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا" -

بنابریں میں اپنی تقریر قطعاً تیار نہ کر سکا... اور جب ع "مری بار کیوں
دیر اتنی کری" کے مصداق اجتماع کے تیسرے دن کے تقریباً خاتمے کے لگ بھگ
'متبادل قراردادوں" کی باری آئی... اور میرا نام پکارا گیا تو میں تقریباً خالی الذہن
کیفیت کے ساتھ اٹھا اور اس نہایت ہی مختصر تمہید کے بعد اپنا بیان پڑھنا شروع کر دیا
کہ:

"میں اگرچہ اس وقت شدید مشکل سے دوچار ہوں' اور مجھے مختلف نوع کی
بے شمار داخلی اور خارجی رکاوٹوں کا سامنا ہے' تاہم جماعت کی پالیسی اور

طریق کار کے ضمن میں اختلافی ذہن رکھنے والے اکابرین کے مقابلے میں ایک نہایت اہم سہولت بھی مجھے حاصل ہے ------ اور وہ یہ کہ جہاں اس بات کا قوی امکان اور شدید اندیشہ ہے کہ اگر اکابرینِ جماعت میں سے کوئی شخص امیر جماعت 'مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی قرارداد کے بالمقابل متبادل قرارداد لے کر کھڑا ہو تو یہ گمان کیا جائے کہ وہ خود منصبِ امارتِ جماعت کا طالب اور خواہاں ہے 'وہاں بحمد اللہ ' میری نو عمری ' کم مائیگی اور بے بضاعتی کے پیش نظر ' میرے بارے میں ایسے کسی گمان کا کوئی امکان موجود نہیں ہے ' ------ اور اپنی پرسوں کی افتتاحی تقریر میں امیر جماعت نے یہ بات دو ٹوک انداز میں کہہ کر کہ: "پالیسی اور طریقِ کار پر بحث و تمحیص کے بعد جس شخص کی بات ارکانِ جماعت مان لیں ' پھر اُسی کو جماعت کی رہنمائی کرنی چاہیئے !" اکابرین کے قدموں میں جو بھاری بیڑیاں ڈال دی ہیں 'الحمد للہ کہ مشہور فارسی مقولے " عصمتِ بی بی است از بے چادری ! " کے مصداق میں اُن سے آزاد ہوں !!"

ان تمہیدی الفاظ کے بعد جب میں نے اپنا بیان پڑھنا شروع کیا تو چند ہی منٹ کے بعد اجتماع میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا[1]- میرے بیان کے آغاز میں چونکہ میرا کچھ ذاتی تعارف بھی شامل ہے تو ابھی میں اسی کو پڑھ رہا تھا کہ ایک ترکستانی قاری صاحب جنھوں نے انقلاب روس کے بعد ہجرت کی تھی اور پہلے افغانستان اور پھر ہندوستان تشریف لائے تھے 'اور اُن دنوں اچھل باغ ' رحیم آباد' میں قرات کے استاد

---

[1] اس طوفان کا آغاز تو میرے سٹیج پر آتے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ سٹیج کے پیچھے ایک میز پر جماعت کے شعبۂ نشر و اشاعت کے جو کارکن بیٹھے ہوئے تھے اُن میں سے مصباح الاسلام فاروقی مرحوم نے فرمایا: "اچھا ہوا کہ گورمانی کے ایجنٹ بھی سامنے آگئے!" (لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات اُس وقت میرے علم میں نہیں آئی تھی بلکہ بعد میں بھائی اللہ بخش سیال صاحب کے ذریعے معلوم ہوئی جو پنڈال کے اُس حصے میں بطور کارکن مامور تھے ______ انھوں نے نہایت درشتی سے فاروقی صاحب کا محاسبہ بھی کیا جس پر مرحوم نے معذرت کر لی ! (اللہ ان کی خطا سے درگزر فرمائے اور ان کی مغفرت کرے!)

کی حیثیت سے خدمات سر انجام دے رہے تھے' اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا:" میری عمر مقرّر کی عمر سے بہت زیادہ ہے' اور میں نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے' اگر میں اپنی داستانِ حیات بیان کرنے لگوں تو وہ مہینوں جاری رہے گی' لہٰذا اس سلسلے کو بند کیا جائے!"[1] ------ اس کے تھوڑے سے وقفے کے بعد پروفیسر عبد الغفور احمد بڑے غصّے میں اٹھے اور انہوں نے نہایت جلالی شان میں چیخ کر کہا: " ہمارے پاس اس بکواس کو سننے کے لئے کوئی وقت نہیں ہے!" ------ اور یہ گویا ایک اشارہ تھا جس پر پنڈال میں ہنگامہ پوری شدّت کے ساتھ برپا ہو گیا - اور بہت سے ارکان نے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر بلند آوازیں میرے خلاف گل افشانی شروع کر دی - اور ایک زوردار مطالبہ سامنے آ گیا کہ ڈاکٹر اسرار کو قطعاً وقت نہ دیا جائے!

دوسری طرف ------ بعض حضرات نے اسی شدّ ومدّ کے ساتھ میری حمایت اور مجھے غیر محدود وقت دینے کے حق میں آواز اٹھائی' ------ ان میں سے تین حضرات کی باتیں مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہیں: (۱) مولانا سیّد وصی مظہر ندوی نے تو صرف اس پر اکتفا کی کہ "میں اپنے حصے کا وقت بھی ڈاکٹر اسرار کو دیتا ہوں"- (۲) سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم نے فرمایا:" ڈاکٹر اسرار جیسے لوگ تحریکوں کو روز روز نہیں ملا کرتے' انہیں پورا وقت دیا جائے اور اگر اس وجہ سے اجتماع کی کارروائی میں ایک دن کا اضافہ ناگزیر ہو تو اُس کا کل خرچ میں اپنی ذاتی جیب سے ادا کروں گا" ------

(۳) سب سے زیادی تیکھی بات راؤ خورشید علی خاں مرحوم نے کہی کہ:" یہاں استبداد (راؤ صاحب نے Repression کا لفظ استعمال کیا تھا) کی بدترین مثال قائم کی جا رہی ہے' ڈاکٹر اسرار اپوزیشن کا لیڈر رہے ہے[2]' اسے بھی اتنا ہی وقت ملنا چاہئے

---

[1] قاری صاحب موصوف کا نام تو مجھے یاد نہیں' لیکن اُن کی صورت ابھی تک نگاہوں کے سامنے موجود ہے' وہ بہت نیک اور مخلص انسان تھے' اور اُن کی جانب سے میرے دل میں ہرگز کوئی شکایت یا کدورت نہیں ہے۔ ان کا انتقال اجتماع کے بعد جلد ہی ہو گیا تھا۔
اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ!

[2] فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھیے!

جتنا لیڈر آف دی ہاؤس (یعنی مولانا مودودی مرحوم) نے لیا ہے (گویا چھ گھنٹے!)'
------اس پر خود مولانا مودودی سٹیج پر تشریف لائے اور انہوں نے پہلے تو اس پر
شدید احتجاج کیا کہ یہاں وہ اصطلاحات استعمال کی جا رہی ہیں جن کا جماعت اسلامی
کے ساتھ سرے سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے' چنانچہ انہوں نے فرمایا: "یہاں نہ کوئی
حزبِ اقتدار ہے' نہ حزبِ اختلاف!" ---اور اس کے بعد کسی قدر غیظ اور غضب
کے عالم میں میری وہ نوٹ بک مجھ سے لے کر جس میں میرا بیان درج تھا (اور وہ
اصل مسوّدہ تھا) اسے ہاتھ بلند کر کے ہوا میں لہرایا اور فرمایا کہ "اس قدر ضخیم
کتاب کو اِس اجتماعِ عام میں کیسے پڑھا جا سکتا ہے ؟" -

اس پر میدانِ کارزار پھر گرم ہو گیا---اور دونوں جانب سے تیز و تند
جملوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا- اور پورا نصف گھنٹہ اس ہنگامے کی نذر ہو گیا
جس کے دوران میں سٹیج پر مائک کے سامنے چپ چاپ کھڑا دونوں قسم کی باتیں
سنتا رہا' اگرچہ ظاہر ہے کہ اُن میں طنز' تمسخر' اور استہزاء ہی نہیں' نفرت
حقارت اور طیش پر مبنی جملوں کا پلڑا بہت بھاری تھا! تاہم راقم کے لئے تو یہ اندازِ
مخالفت' اور یہ طرزِ حمایت دونوں ہی -

"عجب دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را - عذابِ فرقتِ لیلیٰ و صحبتِ لیلیٰ '
کے مصداق یکساں پریشان کن (Embarrasing) تھیں-

بالآخر میں نے مہرِ سکوت کو توڑا اور عرض کیا "مجھے آپ حضرات کی وقت کی
بخوبی اندازہ ہے'---- لیکن تھوڑی دیر کے لئے آپ حضرات میری مشکل پر بھی
غور فرمائیں --- میری مشکل یہ ہے کہ اگر میں اس وقت آپ لوگوں کے سامنے
اپنا اختلافِ رائے بیان نہیں کرتا اور جماعت سے علیحدہ ہو کر بات کرتا ہوں تو آپ
کا یہ الزام مجھ پر واقع ہو گا کہ تم نے جماعت کے اندر بات کیوں نہ کی ؟ ورنہ مجھے نہ

حاشیہ صفحہ سابقہ

راؤ صاحب کے اس ایک جملے سے پورا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اکابر کے خاموش ہونے اور
دبک جانے نے کس طرح "کَبُرَنِی مَوْتُ الْکُبَرَاءِ" ______
کے مصداق راقم کو کسی مشکل ہی نہیں نہایت مضحکہ خیز پوزیشن میں ڈال دیا تھا!

تقریر کا ڈھنگ آتا ہے، نہ ہی اس کا شوق ہے! --- اب اگر آپ لوگ مجھے وقت نہیں دے سکتے تو غور فرمالیجئے کہ پھر میری حجت آپ پر قائم ہو جائے گی کہ آپ نے مجھے جماعت کے اندر رہتے ہوئے اظہارِ اختلاف کا موقع نہ دیا!"[1]- بہر حال میں تو اپنے مندرجہ بالا الفاظ کہہ کر سٹیج سے اتر آیا --- لیکن اب مولانا مودودی مرحوم سمیت سٹیج کے آس پاس بیٹھے ہوئے اکابرین میں کھسر پھسر اور صلاح و مشورہ شروع ہوا --- جس کے نتیجے میں اعلان کیا گیا کہ مجھے تین گھنٹے دیئے جائیں گے۔ اگرچہ اُن میں وہ نصف گھنٹہ بھی محسوب ہو گا جو پہلے ہی صَرف ہو چکا ہے۔

اس پر میں نے اپنا بیان دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن اس حال میں کہ ایک جانب مسلسل ہوٹنگ ہوتی رہی اور دل آزار اور اشتعال انگیز فقرے چُست کیے جاتے رہے، دوسری جانب میں خالی الذہن تو پہلے ہی سے تھا، اب نصف گھنٹے کے شدید ہنگامے (Pandemonium) اور مسلسل ہوٹنگ سے میرے اعصاب بھی متأثر ہو چکے تھے --- اور تیسری جانب وقت کی پابندی کے باعث مجھے اپنے بیان کے بعض حصے چھوڑنے پڑ رہے تھے جس سے عبارت کا ربط اور تسلسل

---

[1] میں نے اپنی اس وقت کی جس داخلی کیفیت کی ترجمانی ان الفاظ سے کی تھی اجتماع ماچھی گوٹھ کے کچھ ہی عرصہ بعد فیض احمد فیضؔ کی ایک نظم میں مجھے اُس کی نہایت بھرپور اور حد درجہ فصیح و بلیغ ترجمانی نظر آئی۔ جناب فیضؔ کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"دُشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد، کچھ تو ہو!
چیخے ہے درد! اے دلِ برباد کچھ تو ہو!

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا؟
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا!
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا!

آلودہ خوں سے پنجۂ صیّاد کچھ تو ہو!
خوں پر گواہ دامنِ جلّاد کچھ تو ہو!
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو!"

ٹوٹ رہا تھا' - اور بالآخر وقت معیّنہ میں پورا بیان ختم بھی نہ ہو سکا اور مجھے بات ادھوری ہی چھوڑ کر سٹیج سے اتر آنا پڑا --- بنابریں مجھے اپنے اور اپنی قرارداد کے اس حشر پر تو ہرگز تعجب نہیں ہوا کہ اس کے حق میں صرف چار ووٹ آئے' البتہ اس پر ضرور تعجب ہوا کہ بڑے ہی باہمت تھے وہ لوگ جنہوں نے مجھے ووٹ دیئے!!

تاہم اس سرگزشت میں ایک اہم لمحۂ فکریہ ہے مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کے ہم خیال دوسرے اکابرین اور اراکین مجلسِ شورٰی کے لئے کہ اگر مجھ ایسے نوعمر' حقیر اور بے بضاعت شخص کو اس اجتماع میں اتنا وقت مل سکتا تھا' اور وہ بھی مولانا مودودی ایسی عظیم شخصیت کی مخالفت کے علی الرّغم' تو اگر وہ بھی کمرِ ہمّت کس لیتے تو ۔ "اٹھ باندھ کمر' کیا ڈرتا ہے - پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے؟" کے مصداق نصرتِ خداوندی ضرور دست گیری کرتی اور کیا عجب کہ جماعت کا رخ تبدیل ہو جاتا...... تاہم یہ صرف ایک دکھے ہوئے دل کی صدا ہے' ورنہ ع "مجھے ہے حکمِ اذاں' لا الٰہ الا اللہ!!" کے مصداق ہمیں تو اسی کا حکم ہے کہ اس پر ایمان پختہ رکھیں کہ "مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَالَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ" ۔ــــــــــــ اور "اِنَّ کَلِمَۃَ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّیْطَانِ"... واللہ اعلم!!

دیگر قراردادیں اور تقاریر

میری متبادل قرارداد کے علاوہ مولانا مودودی کی قرارد میں جو ترامیم تجویز کی گئیں' یا دیگر متبادل قراردادیں پیش کی گئیں ان کی راقم کے ذہن میں بھی صرف ایک دھندلی سی یاد باقی ہے' --- اور خود متعلقہ حضرات کو بھی زیادہ تفاصیل یاد نہیں' لہٰذا اُن کا صرف اجمالی تذکرہ کافی ہے -

۱- جناب ارشاد احمد حقّانی نے ایک متبادل قرارداد پیش کی تھی اور اس پر تقریر بھی کی تھی' لیکن اب اِن دونوں کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے' تاہم انہیں ووٹ مجھ سے زیادہ ملے تھے - یعنی اغلباً ۱۸ -

اس سے بھی اہم تر معاملہ اُن کا اس وقت سامنے آیا جب آئندہ جماعت میں پالیسی اور طریقِ کار کے ضمن میں اختلافی ذہن رکھنے والے لوگوں کے لئے گنجائش'

پیدا کرنے کا مسئلہ زیر بحث تھا اور اس سلسلے میں بھی ایک قرارداد پر غور ہو رہا تھا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ "جماعت کی پالیسی سے اختلاف رکھنے والے لوگ بھی اگر جماعت کے مقصد اور نصب العین سے پورا اتفاق رکھتے ہوں تو جماعت میں شامل رہ سکتے ہیں، تاہم وہ اپنا اختلافِ رائے سوائے آل پاکستان اجتماعِ ارکان کے نہ پبلک میں بیان کر سکیں گے نہ خود ارکانِ جماعت کے مقامی، ضلعی، حتیٰ کہ حلقہ وار اجتماعات میں! اور یہ پابندی قلم پر بھی ہوگی اور زبان پر بھی، یہاں تک کہ خالص نجی گفتگوؤں میں بھی اپنے اختلافی خیالات کا اظہار ممنوع ہوگا" (واضح رہے کہ یہ سب یادداشت کی بنا پر تحریر کیا جا رہا ہے اور اس میں لفظی غلطی کا امکان موجود ہے، تاہم حاصلِ کلام یقیناً یہی تھا!) ---- تو اس پر حقانی صاحب نے کہا کہ "ایسے اہم مسئلے کو اس طرح رَوا رَوی میں طے کرنا غلط ہے، ہمیں اس قرارداد کی نقول مہیا کی جائیں اور اس پر غور و خوض کا موقع بھی دیا جائے اور بحث و تمحیص کا بھی!" - اور جب انہیں قیمِ جماعت میاں طفیل محمد صاحب نے جواب دیا کہ آپ کا یہ مطالبہ منظور کرنا ممکن نہیں تو اس پر انہوں نے اجلاس سے احتجاجاً واک آوٹ کیا جس پر مولانا مودودی یہ کہتے ہوئے سنے گئے: "یا اللہ یہ میں جماعت میں کیسی باتیں دیکھ رہا ہوں!" - حقانی صاحب کے اس احتجاجی واک آوٹ میں مولوی محی الدین سلفی مرحوم نے بھی ساتھ دیا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے پنڈال سے باہر چلے گئے! ----- بہر نوع وہ قرارداد بھی پاس ہو گئی، اور اس طرح پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں اختلافی ذہن رکھنے والوں پر متذکرہ بالا جملہ قدغنیں اور پابندیاں عائد ہو گئیں۔

۲- جناب مصطفیٰ صادق صاحب نے سرکاری قرارداد سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ "ہم کارکنوں کی اصل مشکل یہ ہے کہ ہمارے سامنے جو پالیسی مقالات، مضامین، تقاریر، اور مرکزی شوریٰ کے فیصلوں کی صورت میں آتی ہے، ہم اسے حرزِ جان بنا لیتے ہیں اور اس پر خود بھی دھواں دھار تقریریں اور گرما گرم بحثیں شروع کر دیتے ہیں، ---- لیکن پھر اچانک ہمارے سامنے عمل بالکل مختلف بلکہ متضاد صورت میں آتا ہے" (روایت بالمعنیٰ) ---- اس ضمن میں انہوں نے جماعت کی انتخابی پالیسی کا بطورِ خاص ذکر کیا اور

پھر وہ واقعات گنوائے جن سے ظاہر ہوا کہ عملاً اس پالیسی کی دھجیاں مرکز اور حلقہ جات کے اہم ترین اور ذمہ دار ترین لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں بکھیری ہیں - مثلاً (۱) خود مولانا مودودی نے انہیں حکم دیا کہ مولانا محی الدین لکھوی کو ان کے گاؤں سے لے کر آئیں اور ان کا ووٹ میاں عبد الباری مرحوم کے حق میں ڈلوائیں - جبکہ میاں صاحب موصوف مروجہ نظام انتخابات کے تحت ہی الیکشن میں حصہ لے رہے تھے اور بطور خود امیدوار تھے' اور امیدواری کو ہم نے حرامِ مطلق قرار دیا ہے - انہوں نے کہا کہ میں نے اس حکم کی تعمیل "زیرِ احتجاج" (یعنی Under Protest) کی کہ یا تو آپ اپنا موقف علی الاعلان بدلیں اور اگر کوئی غلط رائے سہواً قائم ہو گئی تھی تو اس سے علانیہ رجوع کریں ----- ورنہ اس پر سختی سے عمل کریں - (۲) اسی طرح بہاولپور کے الیکشن میں جماعت نے ووٹروں کو خوب کھانے بھی کھلائے اور ان کے لئے ٹرانسپورٹ بھی فراہم کی - اور پھر حسابات بالکل جعلی اور جھوٹے پیش کر دیئے! اس پر بعض حضرات نے تو دبے الفاظ میں تردید کی کوشش کی لیکن (جناب مصطفیٰ صادق کے بیان کے مطابق) ملتان کے سید نصیر الدین مرحوم اور صادق آباد کے بھائی (وہ میرے بہنوئی ہیں) اللہ بخش سیال صاحب نے سٹیج پر آ کر بیان دیا کہ "یہ الزام غلط ہے' --- حسابات ہم نے پیش کئے تھے' اور وہ بالکل صحیح اور مطابقِ واقعہ تھے" --- تب سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم خود کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ: "اس الیکشن میں جماعت کے پنچائتی نظام کے تحت نمائندہ میں تھا اور میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ سید نصیر الدین اور اللہ بخش سیال کے بیان سے بڑا جھوٹ ہو ہی نہیں سکتا!" -

اس ناگوار بحث کو تو اگرچہ مولانا مودودی مرحوم نے خالص پارلیمنٹری لطائف کے انداز میں یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ "سردار صاحب' تب تو اصل مجرم آپ ہیں' اور اس سارے معاملے کی جواب دہی آپ کو کرنی چاہئے!" --- لیکن مصطفیٰ صادق صاحب کی اس پوری گفتگو کا گہرا اثر ارکانِ جماعت کی بہت بڑی تعداد نے قبول کیا --- چنانچہ انہیں اہلِ اختلاف میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے --- یعنی ان کی یادداشت کے مطابق ۱۳۸ تا ۱۴۸ - جن میں ایک ووٹ (بقول

خود ان کے) شیخ سلطان احمد صاحب (کراچی) کا بھی تھا جو پورے اجتماع کے دوران قطعاً خاموش تماشائی بنے رہے تھے بلکہ کراچی سے روانہ ہی یہ کہہ کر ہوئے تھے کہ:
"میں تو ایک ڈرامہ دیکھنے جا رہا ہوں!"-

۳- سب سے زیادہ مضحکہ خیز معاملہ حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب کا ہوا کہ انہوں نے ایک باقاعدہ متبادل قرارداد پیش کی --- اور اس کے حق میں ایک مفصّل اور مدلّل تقریر بھی کی، لیکن تقریر کے اختتام پر 'رائے شماری کی ذلت سے بچنے کی خاطر' اپنی قرارداد واپس لے کر سٹیج سے اتر آئے! - فیا للعجب!!

ملتوی شدہ 'قرارداد اعتماد'
اور امارتِ جماعت سے استعفے کی واپسی کیلئے مولانا مودودی کی شرائط

پالیسی کی بحث کے اس طرح اختتام پذیر ہو جانے کے بعد مولانا مودودی پر اظہارِ اعتماد کی وہ قرارداد دوبارہ پیش ہوئی جس سے اجتماع کی کارروائی کا آغاز ہوا تھا لیکن جس پر گفتگو کو مولانا مودودی نے میرے نکتۂ اعتراض سے اتفاق کرتے ہوئے ملتوی کر دیا تھا- اور اجتماع کی جو روداد اوپر درج ہو چکی ہے اس کے پیش نظر ظاہر ہے کہ اب اس قراردادِ اعتماد کا بھاری اکثریت سے منظور ہونا ہر اعتبار سے فطری بھی تھا اور منطقی بھی! بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اب اُس کا رسمی (Formal) طور پر پیش ہونا بھی نرا تکلّف تھا!

تاہم پالیسی کے ضمن میں اُن سے اختلاف رکھنے والے جملہ اکابر و اصاغر پر "فتح مبین" حاصل کر لینے کے باوجود مولانا مودودی نے امارت جماعت سے اپنا استعفاء واپس لینے اور دوبارہ امارت کی ذمّہ داری سنبھالنے میں پس و پیش سے کام لیا- اس سلسلے میں اُن کا موقف یہ تھا کہ:

> "جماعت کی امارت کی ذمّہ داریاں ادا کرنے کے معاملے میں میری راہ میں کچھ مشکلات اور موانع حائل ہیں - جب تک وہ دور نہ ہوں میں امارت کی ذمّہ داری نہیں سنبھال سکتا - مزید بر آں وہ موانع و مشکلات ایسی ہیں کہ انہیں ارکان جماعت کے اجتماع عام میں بیان کرنا بھی میرے نزدیک قرینِ

مصلحت نہیں ہے' لہٰذا میں تجویز کرتا ہوں کہ جماعت کے جملہ تنظیمی حلقوں سے فی حلقہ دو دو افراد منتخب کر لئے جائیں جن کے سامنے میں اپنی مشکلات بیان کر دوں ------ پھر اگر وہ میری راہ کے ان موانع کو دور کرنے کی کوئی راہ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں تو میں اپنا استعفاء واپس لے لوں گا اور امارتِ جماعت کی ذمہ داری دوبارہ سنبھال لوں گا" (روایت بالمعنیٰ)

اب ظاہر ہے کہ اس وقت تک ارکانِ جماعت کی ایک عظیم اکثریت "کشتگانِ خنجرِ تسلیم" کی صورت اختیار کر ہی چکی تھی لہٰذا مولانا کی یہ تجویز فی الفور منظور ہو گئی - اور جھٹ پٹ ارکانِ جماعت کی ایک نہایت محدود تعداد (جو کسی طرح بھی بیس سے زائد نہیں ہو سکتی) پر مشتمل وہ "مجلسِ نمائندگان" وجود میں آ گئی جسے بعد میں مولانا اصلاحی نے "خلوتیانِ راز کی محفل" سے تعبیر کیا-

اس مجلس میں' یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ' کسی بھی اختلاف کرنے والے شخص کا منتخب ہونا خارج از امکان تھا' لہٰذا اس میں ہماشما کا تو ذکر ہی کیا' مولانا اصلاحی سمیت اختلافی ذہن رکھنے والا کوئی رکن شوریٰ بھی منتخب نہیں ہوا -

خلوتیانِ راز کے اس دیوانِ خاص میں ع "بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد ؟" کے مصداق مولانا نے کیا فرمایا' نمائندگان میں سے کس نے کیا کہا' اور کیا فیصلے ہوئے اس کی اس مجلس کے شرکاء کے سوا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی- چنانچہ وہاں ناز و نیاز کے کون کون سے مراحل طے ہوئے' اور بالآخر کیا قول و قرار ہوئے یہ سب باتیں سربستہ راز رہیں اور مولانا امین احسن اصلاحی ایسی اہم شخصیت کے علم میں بھی یہ باتیں کئی ماہ بعد اس وقت آئیں جب کوٹ شیر سنگھ کے اجتماعِ شوریٰ میں یہ پٹاری کھلی اور اس میں سے بقول مولانا اصلاحی وہ "بلی" برآمد ہو گئی جسے انہوں نے لگ بھگ دس سال قبل' کئی سال کی مسلسل کوششوں سے بزعمِ خویش ہلاک کر دیا تھا!

بہرحال یہ ہے وہ "مجلس نمائندگان" کا اجلاس جس میں مولانا مودودی نے اپنی وہ تقریر جواب پہلی بار ہفت روزہ 'آئین' کے ماہانہ ایڈیشن بابت ربیع الاول ۱۴۱۰ھ میں شائع ہوئی ہے (اور جسے ہم بھی 'میثاق' بابت دسمبر ۱۹۸۹ء میں من و عن نقل کر چکے

ہیں) یا تو پوری کی پوری کی' یا اُس کا خلاصہ پیش کر دیا۔ اور قرائن یہی کہتے ہیں کہ مجلس نمائندگان نے مولانا مودودی کے نقطۂ نظر کو من و عن قبول کرتے ہوئے ایسے پختہ قول و قرار اور مؤثق وعدہ وعید کر لئے جن کے نتیجے میں جماعتِ اسلامی کا وہ نیا دستور عالمِ وجود میں آیا جس کے بارے میں مولانا اصلاحی نے اپنے گشتی مراسلے میں یہ الفاظ تحریر کئے کہ: "اس نئے دستور کو کوئی سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو مگر میں سمجھتا ہوں۔ اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے سارے اختیارات مجلسِ عاملہ کو حاصل ہیں اور مجلسِ عاملہ امیر جماعت کی جیب میں ہے!" ------ بہر حال اس مسئلے کے بارے میں راقم کو اس وقت کچھ عرض نہیں کرنا' اس پر اپنا محاکمہ ہم علیٰحدہ تحریر کریں گے۔

البتہ ایک واقعے کا تذکرہ مناسب ہے اور وہ یہ کہ غالباً اسی بحث کے دوران جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف مولانا مودودی کا الزام نامہ یا فرد قرارداد جرم بھی زیر بحث آئی۔ اور اب اگرچہ یہ بالکل یاد نہیں آتا کہ یہ بحث کب' کس کی جانب سے' اور کس انداز میں شروع ہوئی۔ تاہم یہ اچھی طرح یاد ہے کہ اس پر بھی ایوان میں پھر اک بار خوب گرمی سردی پیدا ہوئی' اور یہ منظر بھی راقم کی نگاہوں کے سامنے پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ اس بحث کی گرما گرمی میں ایک موقع پر مولانا مودودی اس درجہ غضب ناک ہو گئے تھے کہ وہ روسٹرم جس کا مولانا نے سہارا لیا ہوا تھا بُری طرح آگے پیچھے جھُول رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرحلے پر سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو اندیشہ ہوا کہیں مولانا روسٹرم سمیت سٹیج سے نیچے نہ گر جائیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے فوری طور پر اٹھ کر روسٹرم کو سہارا دیا --- اگرچہ خود مولانا نے اس پر کسی قدر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے فرمایا: "اچھا تو آپ لوگ ڈر رہے تھے کہ میں گر جاؤں گا!"۔

بہر حال' اصل مسئلے کے ضمن میں مولانا نے فرمایا کہ: "میں اُن تمام حضرات کو جن کی رائے یہ ہے کہ میں نے ارکانِ جائزہ کمیٹی کے خلاف جو اقدام کیا وہ دستورِ جماعتِ اسلامی کی حدود سے تجاوز کے مترادف ہے' چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ملک میں دستوری قوانین کے جس ماہر کو چاہیں اُس کے سامنے یہ مسئلہ پیش کر کے

فیصلہ حاصل کر لیں - اُس ماہر قانون کی پوری فیس میں اپنی ذاتی جیب سے ادا کر دوں گا" --- مولانا کے اس چیلنج کا بھی غالباً کوئی فوری جواب نہ ارکانِ جائزہ کمیٹی میں سے کسی کی جانب سے آیا' نہ ہی مولانا اصلاحی یا کسی دوسرے رکن جماعت یا رکن شوریٰ کی جانب سے ! واللہ اعلم !!

☆ ☆ ☆

یہاں ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکانِ جماعتِ اسلامی کی روداد' جتنی اور جیسی کچھ یادداشتوں کی مدد سے مرتب کی جا سکی' ختم ہوتی ہے ------ البتہ صرف دو باتیں مزید تذکرہ کے لائق ہیں' اگرچہ اُن کی اہمیت عمومی نہیں' راقم الحروف کے لئے ذاتی ہے -

ایک یہ کہ جب راقم اپنا بیان ختم کر کے سٹیج سے نیچے اُترا ------ اور از خود یا مولانا مودودی کے طلب فرمانے پر اُن کے پاس گیا' تو مولانا نے فرمایا: "آپ کو معلوم ہے کہ مجھے آپ سے کتنی محبت ہے؟" - جس کا جواب میں نے یہ دیا کہ: "مولانا مجھے اس کا پورا اندازہ ہے --- اور میں نے اپنی دانست میں اسی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے" - اس پر' یہ قطعاً یاد نہیں کہ' مولانا مرحوم کا ردِ عمل کیا تھا!

دوسرے یہ کہ جب اجتماع کے خاتمے کے بالکل قریب ارکان کے حلقہ وار اجلاس ہو رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ امیر حلقۂ اوکاڑہ چودھری عبد الرحمٰن مرحوم مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں جن میں حد درجہ محبت اور شفقت بھی شامل ہے اور کسی قدر خوف اور اندیشہ بھی! ------ اس پر جب میں نے اُن سے عرض کیا کہ: "چودھری صاحب آپ پریشان نہ ہوں' میں جماعت سے علیحدہ نہیں ہوں گا" تو وہ منظر بھی میری نگاہوں کے سامنے پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی' چنانچہ ان کا چہرہ بھی گلنار ہو گیا---- اور وہ فوراً اٹھ کر سٹیج کے پاس گئے اور وہاں بات طے کر کے آئے اور مجھے حکم دیا کہ یہی بات سٹیج سے بھی کہہ دو - چنانچہ میں سٹیج پر گیا اور میں نے وہاں یہ الفاظ کہے کہ:

"اگرچہ پالیسی کے بارے میں میری رائے اب بھی وہی ہے جو میں نے اپنے بیان میں ظاہر کی' اور ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اس ضمن میں مجھے امیرِ جماعت کی طویل تقریر میں قطعاً کوئی روشنی نہیں ملی ---- تاہم میں جماعت میں شامل رہوں گا' اس لئے کہ میں جماعت کے بغیر اپنے وجود کا تصوّر تک نہیں کر سکتا!"

چنانچہ اس پر پورے پنڈال میں خوشی کی ویسی ہی لہر دوڑ گئی جیسی مجھے چودھری عبد الرحمٰن خاں مرحوم کے چہرے پر نظر آئی تھی!

۳- اس کے ساتھ ہی ایک تیسرا واقعہ بھی جو دفعتاً یاد آ گیا ہے بیان کر دینا مناسب ہے - اور وہ یہ کہ دورانِ اجتماع ایک مرحلے پر جماعتِ اسلامی منٹگمری کے دو ارکان نے جو میرے پوری طرح ہم خیال تھے مجھ پر دباؤ ڈالا اور شدید اصرار کیا کہ ہمیں فوری طور پر یہیں با جماعت رکنیت سے استعفاء دے دینا چاہئے تو میں انہیں اجتماع گاہ سے باہر ریلوے لائن پر لے گیا اور وہاں چہل قدمی کرتے ہوئے انہیں سمجھایا کہ: "اس اجتماع میں میں شدید ذہنی و قلبی اذیّت سے دوچار رہا ہوں' اس کیفیت میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا میرے نزدیک اصولی طور پر غلط ہے ------ میں یہاں سے واپس جا کر پر سکون ماحول میں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ پورے معاملے پر از سرِ نو غور کروں گا' --- اور رمضان المبارک قریب ہے' اس میں جتنے دن بھی میسر آ سکے اُن میں اعتکاف کروں گا اور اُسی میں اپنے مستقبل کے بارے میں آخری فیصلہ کروں گا!" - (یہ دو ارکانِ جماعت جن کا تعلّق اصلاً تو پاک پتن سے تھا لیکن کچھ حالات کی نا مساعدت کے باعث وہ ایک عرصے سے منٹگمری میں اقامت پذیر تھے سید شیر محمد شاہ' اور نور محمد قریشی صاحب تھے!)

اجتماعِ ماچھی گوٹھ کے بعد

ماچھی گوٹھ سے واپسی کے بعد کے دو ماہ راقم الحروف پر شدید ذہنی کشمکش اور روحانی کرب کے عالم میں گزرے - اور ان کے دوران راقم ایک سہ گونہ عقدۂ لانیحل (Three Dimensional Dilemma) کی گتھیوں کو سلجھانے میں سر گرداں رہا - چنانچہ :

(۱) ایک جانب جماعت اسلامی کے قیام کا مقصد اور اُس کا نصب العین ' اُس کا پیش کردہ تصوّرِ دین ' اور اس کا ایک عرصے کے بعد از سرِ نو واضح کردہ تصوّرِ فرائضِ دینی ایسے اہم اور اساسی امور تھے جن کی حقانیت مجھ پر دن بدن واضح سے واضح تر ہوتی چلی گئی تھی - تا آنکہ اُس وقت تک بحمد اللہ میری رسائی قرآن حکیم کے علم و حکمت کے اُن گوشوں تک براہ راست ہو چکی تھی جن سے یہ امور ماخوذ اور مستنبط تھے ! للہذا اپنی دینی ذمّہ داریوں سے گریز اور فرائض دینی کی ادائیگی سے فرار کی جملہ راہیں راقم کے لئے مسدود ہو چکی تھیں - گویا راقم کا حال فیضؔ کے اس شعر کے مطابق تھا کہ ؎

جُزدار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

(۲) دوسری طرف جماعتِ اسلامی کی پوری قیادت سے شدید مایوسی کی کیفیت تھی جو اجتماع ماچھی گوٹھ کے باعث شدید تر ہی نہیں وسیع تر بھی ہو گئی تھی - اس لئے کہ اب یہ کیفیت صرف مولانا مودودی اور اُن کے ہم نوا لوگوں کے بارے ہی میں نہیں تھی ' مولانا اصلاحی اور اُن کے ہم خیال حضرات کے بارے میں بھی تھی --- بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ماچھی گوٹھ کے اجتماع کے بعد اس ضمن میں مؤخر الذکر کا پلڑا بھاری ہو چکا تھا -

اس سلسلے میں اپنے شدّتِ احساس کے اظہار کے لئے اُس واقعے کے بیان میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ماچھی گوٹھ کے اجتماع سے فراغت کے فوراً بعد صادق

آباد میں سردار محمد اجمل خان لغاری سے ملاقات ہوئی تو گفتگو کے دوران میری مایوسی اور دل شکستگی ان الفاظ کا جامہ پہن کر زبان پر آ گئی کہ "میں اس وقت جماعتِ اسلامی کا اُبلیس ہوں!" - اس پر اُس شدید قلبی لگاؤ کی بنا پر جو سردار صاحب مرحوم کو مجھ سے تھا ان کی زبان سے فوراً یہ الفاظ نکلے "معاذ اللہ! معاذ اللہ!! خدا کے لئے ایسے الفاظ زبان سے نہ نکالیں!" --- تب میں نے وضاحت کی کہ "ابلیس کے لفظی معنی انتہائی مایوس شخص کے ہیں، اور اس وقت میرا حال واقعۃً یہ ہے کہ میں جماعت کی پوری قیادت سے انتہائی درجہ میں مایوس ہو چکا ہوں، اس لئے کہ مولانا مودودی اور ان کے ہم نوا حضرات سے تو میں ماچھی گوٹھ آنے سے قبل ہی مایوس ہو چکا تھا، ماچھی گوٹھ میں مولانا اصلاحی اور اُن کے ہم خیال لوگوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اُن سب سے بھی قطعاً مایوس ہو گیا ہوں، تو بتایئے کہ اب میرے لئے امید کی روشنی کہاں باقی رہ گئی؟" -

(۳) تیسری جانب یہ اندیشہ شدّت کے ساتھ لاحق تھا کہ جماعتی زندگی کے سہارے کے بغیر موجودہ حالات میں انسان کا عزیمت کی راہ پر گامزن رہنا تو در کنار کسی مقام پر کھڑے رہنا بھی ناممکن کی حد تک مشکل ہے - اس لئے کہ انسان اگر مسلسل آگے نہ بڑھ رہا ہو تو ع "سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں" کے مطابق ایک مقام پر کھڑے رہنا بھی ممکن نہیں ہوتا بلکہ گوناگوں 'عذرات' کی بنا پر فوراً ریورس گیئر (Reverse Gear) لگ جاتا ہے اور انسان 'رخصت' کی ڈھلوان راہ پر پھسلتا چلا جاتا ہے! ------ اِدھر " من آنم کہ من دانم " کے مصداق اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کی "بضاعتِ مزجات" (سورہ یوسف : ۸۸) اور اِس سے بھی بڑھ کر اپنی کم عمری بھی لامحالہ پیش نظر تھی لہٰذا اس کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا کہ خود اپنے بل پر کسی نئی جماعت یا تنظیم کے قیام کی کوشش کی جائے!!

اس سلسلے میں بھی ایک لطیفہ (یا کثیفہ؟) ریکارڈ پر آ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے - اجتماع ماچھی گوٹھ سے متصلاً قبل کا ذکر ہے کہ ایک روز شاہ عالم مارکیٹ لاہور کے ایک ہوٹل میں حکیم عبد الرحیم اشرف اور ان کے ہم خیال و ہم نوا، اور

کاروباری شریک چودھری عبدالحمید (مرحوم) سے ملاقات ہوئی تو اثنائے گفتگو میں حکیم صاحب کی زبان سے مولانا مودودی کی شان میں ایک استہزائیہ جملہ نکل گیا۔ اس پر میں اُن پر برس پڑا اور میں نے نہایت درشتی اور گستاخی کے ساتھ کہا: "حکیم صاحب! آپ لوگوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ جماعت میں شامل ہونے سے پہلے بھی مولوی تھے' اور نماز روزہ اور شعائرِ دینی کے پابند' آپ نے جماعت میں شامل ہو کر گویا اپنے مذہبی لباس پر تحریک اور تنظیم کی شیروانی مزید پہن لی تھی' اور اب اگر آپ اس شیروانی کو اتار بھی دیں گے تو کوئی بڑی بات نہیں ہو گی' اس لئے کہ اندر سے مکمل مولوی پھر برآمد ہو جائے گا' جبکہ ہمارا معاملہ اس کے برعکس بہت نازک ہے' ہمارا دین و مذہب سے کل تعلق اس کے حرکی تصوّر کے حوالے سے ہے اور شدید خطرہ ہے کہ اگر تحریکی وابستگی برقرار نہ رہے تو کہیں نماز روزہ سے بھی نہ جاتے رہیں' اور چہروں سے داڑھیاں تک غائب نہ ہو جائیں!" ۔ (اس پر حکیم صاحب موصوف نے جو جواب دیا وہ اگرچہ اس وقت کی گفتگو سے تو متعلق نہیں ہے' تاہم مناسب ہے کہ ریکارڈ پر لے آیا جائے' انہوں نے فرمایا: "ڈاکٹر صاحب! آپ اِس وقت صدمہ کی جس کیفیت سے دوچار ہیں' ہم اُس سے گزر چکے ہیں' اور اب ہم پر اُس شخص کی سی کیفیت طاری ہے جو اپنی مایوسی اور دل شکستگی کے کرب کو خوش گپیوں کے ذریعے کم کرنے کی کوشش کرتا ہے!") -----

قصہ مختصر' اواخر فروری ۱۹۵۷ء سے اواخر اپریل تک کے دو ماہ راقم پر

۔ "اِسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں - کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی" کے مصداق اسی "پس چہ باید کرد" اور

"To Be Or Not To Be Is The Question"

کی ادھیڑ بُن میں گزرے ---- تاآنکہ ماہ رمضانِ مبارک کا آخری عشرہ آن پہنچا تو میں اس کے نصفِ آخر میں (زندگی میں پہلی بار) اعتکاف کے لئے منٹگمری کے محلہ اسلام آباد کی جامع مسجد میں داخل ہو گیا جس کے امام اور خطیب مولوی شمس الدین

صاحب تھے جو مقامی جماعت کی امارت سے میری معزولی[1] کے بعد سے اس منصب پر فائز تھے۔

اعتکاف کی حالت میں کامل یکسوئی کے ساتھ غور و فکر کے باوجود پورے تین دن اسی تذبذب کے عالم میں گزرے ------ لیکن چوتھے روز علی الصبح مولوی شمس الدین صاحب ماہنامہ ترجمان القرآن کا تازہ پرچہ لے کر آئے تو گویا مجھے اشارۂ غیبی حاصل ہو گیا۔ اس لئے کہ اس کے "اشارات" میں مولانا مودودی نے ضعفِ ارادہ بسیط" اور "ضعفِ ارادہ مرکب" کے حوالے سے جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں اختلافِ رائے کے حامل لوگوں کی کردار کشی کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اگرچہ ماچھی گوٹھ میں اختلاف رکھنے والے لوگوں پر جن حدود و قیود' اور پابندیوں اور قدغنوں کا فیصلہ ہوا ہے

---

[1] یہ معاملہ بھی دلچسپ اور لائق ذکر ہے۔ اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر ۱۹۵۶ء تک' جب میری حاضری یا "پیشی" بمقام اوکاڑہ جائزہ کمیٹی کے سامنے ہوئی' میں مقامی جماعتِ ساہیوال کا امیر تھا۔ لیکن جیسے ہی میرے اختلافی خیالات کی بھنک مرکز میں پہنچی' میری معزولی کا حکم صادر ہو گیا۔ میں نے احتجاجاً امیر جماعت کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا کہ اگرچہ پالیسی کے بارے میں میری رائے مختلف ہے' تاہم میں نے جماعت کے لئے سرگرمی کے ساتھ کام کرنے میں ہرگز کوئی کمی نہیں کی ہے' تو کیا صرف اختلافِ رائے بھی کوئی جرم ہے؟ ------ مزید برآں جماعت کے دستور کی رو سے امیر حلقہ تو مرکز کا نامزد کردہ ہوتا ہے لہٰذا اُس کی معزولی کا اختیار بھی مرکز کو ہے' لیکن مقامی جماعت کے امیر کو تو ارکان جماعت منتخب کرتے ہیں' لہٰذا اسے معزول کرنے کا اختیار بھی ان ہی کو ہونا چاہئے' مزید یہ کہ: "مجھے اس اعتبار سے تو بہرحال خوشی ہوئی ہے کہ ایک ذمہ داری سر سے اتر گئی اور ایک بوجھ سے کندھا ہلکا ہو گیا لیکن اس اعتبار سے دکھ ہوا ہے کہ اگر ان چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی دستور کی روح اور معروف طریقِ کار کی پیروی نہ کی جائے تو پھر آخر کہاں کی جائے گی" (تحریر ۲۰ نومبر ۱۹۵۶ء) ------ لیکن وہاں جب مولانا عبد الجبار غازی' مولانا عبد الغفار حسن' حکیم عبد الرحیم اشرف' اور شیخ سلطان احمد ایسے اہم حضرات تک کے معاملے میں نہ دستور کی پرواہ تھی نہ عرفِ عام کی پیروی تو ------ "تا بہ دیگراں چہ رسد؟" ------ کے مصداق میں کس کھیت کی مولی تھا!!

اس نے انہیں پہلے ہی ۔ "نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے - گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے!" کا مصداق کامل بنادیا ہے' لیکن غالباً مولانا مودودی اس پر بھی مطمئن نہیں ہیں بلکہ عملاً اپنے اُسی فیصلے پر کاربند ہیں جس کا ذکر انہوں نے ماچھی گوٹھ کے لئے روانہ ہوتے وقت لاہور ریلوے اسٹیشن پر چودھری غلام محمد مرحوم سے کیا تھا--- یعنی: "میں ان لوگوں سے تنگ آچکا ہوں اور اب مزید اُن کے ساتھ نہیں چل سکتا' اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ انہیں ذلیل کر کے جماعت سے نکال دیا جائے!"- اس پر ذہن اور قلب نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ قبل اس کے کہ نوبت وہاں تک پہنچے کیوں نہ خود ہی پیش قدمی کر کے مولانا کی اس تشویش کو فوری طور پر رفع کر دیا جائے------ چنانچہ میں نے قلم اٹھایا اور ۲۹ رمضان المبارک ۷۶ ۱۳ھ کو بحالتِ صوم و اعتکاف' بصد حسرت و یاس' اور نہایت بوجھل دل کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے استعفاء تحریر کر دیا- گمان غالب یہ ہے کہ یہ ماہ اپریل کی ۲۶ تاریخ تھی - (جو اتفاقاً میری تاریخ پیدائش بھی ہے!) مقامی جماعت کے احباب' بالخصوص مولوی شمس الدین صاحب نے تو میرے استعفے کو آگے بھیجنے (یعنی Forward کرنے) میں تقریباً دو ہفتے لئے- اور اس کے دوران میں مجھے استعفاء واپس لینے پر آمادہ کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی' جس میں بعض ہم عمروں کی منت سماجت بھی شامل تھی اور بعض بزرگوں کی محبّت آمیز فہمائش بھی- بالآخر مایوس ہو کر مولوی شمس الدین صاحب نے مجھے ۱۰ مئی ۵۷ء کو خط لکھا:

> "نہایت افسوس کے ساتھ آج ارکانِ جماعت نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کا استعفاء منظوری کے لئے جناب امیرِ جماعت کے پاس بھیج دیا جائے ------ آپ نے شفا خانہ میں روزانہ دو گھنٹے بلا معاوضہ کام کرنے کی جو پیشکش کی ہے' اسے ہم شکریئے کے ساتھ قبول کرتے ہیں - اُمّید ہے کہ آپ باقاعدگی کے ساتھ وقت دیتے رہیں گے - خاکسار شمس الدین' امیر جماعت اسلامی منٹگمری"-

اِسی طرح دفترِ حلقہ نے بھی اپنے حصّے کی کارروائی کے لئے لگ بھگ ایک ہفتہ-

لیا' اس لئے کہ وہاں سے میرے استعفے کے ساتھ جو خط (یعنی Covering letter) مرکزی دفتر پہنچا اس پر تاریخ تحریر ۱۸ مئی درج تھی۔ (اگرچہ مجھے اب یہ قطعاً یاد نہیں ہے کہ اس دوران میں حلقے کے ذمہ دار حضرات کی جانب سے میرے ساتھ کوئی سلسلۂ جنبانی قائم کیا گیا تھا یا نہیں) ------ لیکن مرکز میں تو گویا میرے استعفے کا شدت سے انتظار ہو رہا تھا کہ جیسے ہی امیرِ حلقہ کا خط پہنچا غالباً اُسی لمحے منظوری کا خط بھی ارسال کر دیا گیا جس پر ۱۹ مئی ۵۷ء کی تاریخ درج تھی اور عبارت حسب ذیل تھی:

"محترمی و مکرمی چودھری عبد الرحمٰن صاحب' امیر جماعت اسلامی' حلقۂ اوکاڑہ

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

بحوالہ آپ کا خط نمبر ۴۲۲ مورخہ ۱۸ مئی ۵۷ء ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا جماعت کی رکنیت سے استعفاء جناب امیر جماعت اسلامی پاکستان مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی نے منظور فرما لیا ہے' اور ان کا نام ارکانِ جماعت کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔۔

خیر اندیش: صفدر حسن صدیقی' ناظم شعبۂ تنظیم جماعت اسلامی' پاکستان

نقول بنام (۱) جناب شمس الدین صاحب' امیر جماعت اسلامی' منٹگمری شہر

(۲) ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' معرفت دفتر جماعت اسلامی' منٹگمری شہر۔"

اور اس طرح راقم الحروف کی زندگی کا وہ دس سالہ دور اختتام کو پہنچ گیا جس کی حسین یاد ابھی تک نہاں خانۂ قلب میں محفوظ ہے[1] ' ---- لیکن یہ واضح رہے کہ میں نے صرف جماعت اسلامی سے تنظیمی تعلق منقطع کیا تھا' تحریک اسلامی سے ہرگز نہیں ---- اس کے ساتھ تو میرا ذہنی اور عملی دونوں طرح کا تعلق بحمد اللہ دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا ------ چنانچہ پہلے کسی موقع پر اپنی اس کیفیت کے اظہار کے لئے کہ جماعت سے تنظیمی تعلق کے انقطاع کے باوجود'

---

[1] حاشیے کی عبارت اگلے صفحے پر دیکھئے

تحریک اسلامی کے ساتھ وابستگی کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا راقم نے علامہ اقبال کے اس شعر کا حوالہ دیا تھا کہ ۔

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی - شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی!

آج اس کیفیت کی تعبیر کے لئے تو ایک دوسرا شعر بھی ذہن میں آ رہا ہے۔ ----- یعنی ۔ "ہوئے ہیں وہ جس دن سے ناراض شعری - ترقی پہ ہے اضطرابِ محبت" --- لیکن مناسب یہ ہے کہ اپنی اس سرگذشت کے اختتام پر فیض احمد فیض کے وہ اشعار درج کر دوں جو اُس زمانے میں طویل عرصے تک میرے قلب و ذہن کی دنیا پر چھائے رہے تھے ------ اور جنہوں نے بلاشبہ مجھے اپنے عزم کے برقرار رکھنے میں بہت مدد دی تھی :۔

یہ فصل امیدوں کی ہمدم - اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی - اب کے بھی اکارت جائے گی!

دھرتی کے کونوں کھدروں میں - پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو!

حاشیۂ صفحۂ سابقہ

۔ صحیح تر الفاظ میں میرا جماعتِ اسلامی سے تعلق ساڑھے نو برس رہا۔ اس لئے کہ میں نے اوائل نومبر ۴۷ء میں واردِ لاہور ہوتے ہی جماعت اسلامی لاہور کے کرشن نگر کے حلقۂ ہمدرداں سے تنظیمی تعلق استوار کر لیا تھا۔ اور چونکہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی کی تعلیم کے دوران میں کرشن نگر ہی میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم رہا' لہٰذا میری تنظیمی وابستگی بھی اسی حلقۂ جماعت کے ساتھ رہی۔ میڈیکل کالج کے پانچ سال میں نے اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ گزارے ---- اور جس دن فائنل ایم بی بی ایس کا نتیجہ نکلا اسی دن رکنیتِ جماعت کی درخواست تحریر کر دی ------- مولانا اصلاحی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے بارے میں اپنے استاذ و امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کا ایک جملہ نقل کیا کرتے ہیں کہ: "ہمارے مناظر احسن کے سارے ہی مناظر احسن ہیں!" اسی طرح جماعت کے ساتھ میری اس ساڑھے نو سالہ وابستگی کے دوران کی ساری ہی یادیں حسین اور دلکش ہیں ------- سوائے ۵۳-۵۲ء کے سیشن کے درمیانی چھ ماہ جن کے دوران میرا جمعیت کی کراچی کی قیادت سے مزاجی اور نظریاتی دونوں طرح کا تصادم رہا------- یا پھر ۵۷-۵۶ء کے آخری چھ ماہ جن کے دوران کی بعض یادیں کرب ناک ہی نہیں سوہانِ روح ہیں!

پھر مٹی سینچو اشکوں سے - پھر اگلی رت کی فکر کرو!

پھر اگلی رت کی فکر کرو - جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا - تب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

مولانا اصلاحی اور دیگر اکابر کی علیحدگی

اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد لگ بھگ ایک سال کے عرصے کے دوران
ارکانِ جماعت نے رکنیت سے استعفادیا، اُن میں سے جو کُل پاکستان سطح پر معروف
تھے، ان کی فہرست میں اوپر سے پہلے نمبر پر مولانا امین احسن اصلاحی تھے - اور
والوں میں آخری نام اس خاکسار کا تھا! -- یہی وجہ ہے کہ جہاں بعض دوسرے
حضرات کی طرح، میرے استعفے کا تو گویا بے چینی سے انتظار کیا جارہا تھا (ع
سراپا انتظار ، اُو منتظر!!) - وہاں مولانا اصلاحی کو استعفے سے باز رکھنے، اور رکنیت
جماعت برقرار رکھنے پر آمادہ کرنے کے لئے سر توڑ کوششیں ہوئیں[1] - چنانچہ
ایک جانب مصالحت کنندگان نے ایک عرصے تک سلسلۂ جنبانی جاری رکھا
دوسری جانب انہیں یہ پیشکش کی گئی کہ آپ جماعت کی عام تنظیمی اور عوامی
سرگرمیوں سے منقطع ہو کر خالص علمی و فکری اور تحقیقی و تصنیفی کام میں
جائیں، چنانچہ جماعت کے مرکزی دفتر کے قریب ایک کوٹھی کرایہ پر لی گئی
اسے نہایت شاندار انداز میں مرصّع و مفروش (Furnish) کیا گیا اور اُن
ظاہری اعزاز و اکرام اور خاطر مدارات (Pampering) کا خصوصی اہتمام
------ اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان باتوں کا ایک حد تک خ

---

[1] یہی وجہ ہے کہ مستعفی ہونے میں ترتیب بالکل برعکس رہی، چنانچہ ان میں سب سے پہلا
میرا تھا اور سب سے آخری مولانا اصلاحی کا!

خواہ اثر بھی مولانا کی طبیعت نے قبول کیا - چنانچہ سکھر کے جناب نجیب صدیقی صاحب کی روایت ہے کہ اجتماع ماچھی گوٹھ کے کچھ عرصہ بعد مولانا اصلاحی سکھر تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اُن ارکانِ جماعت کو جو اجتماع ماچھی گوٹھ سے پہلے غیر مطمئن اور اب بالکل مایوس تھے جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہونے سے باز رکھنے کی بھرپور کوشش کی' اور ہر ممکن طریقے پر ترغیب دی کہ وہ جماعت کے اند رہتے ہوئے اصلاح حال کی کوشش کریں - اگرچہ اُن کے اعتراضات کا اُن کے پاس کوئی معقول جواب موجود نہ تھا!

ویسے بھی مولانا اصلاحی نے اس پورے عرصے کے دوران اس موقف سے اتفاق کا کم از کم اظہار نہیں کیا تھا کہ جماعت اپنے سابقہ طریق کار سے کلی طور منحرف ہو چکی ہے' بلکہ اُن کا علانیہ موقف صرف یہ تھا کہ ہم عدم توازن کا شکار گئے ہیں' ----- باقی مولانا مودودی کے ساتھ اُن کی اصل جنگ' دستورِ جماعت او اس کے ضمن میں جمہوریت اور شورائیت کی اہمیت کے مسئلے پر تھی! ----- اس کے سلسلے میں جو کچھ ماچھی گوٹھ میں "خلوتیانِ راز" کی محفل میں طے پا چکا اُس سے وہ بالکل بے خبر تھے[1]

ع "کب کھلا تجھ پر یہ راز' انکار سے پہلے کہ بعد؟" کے مصداق مو اصلاحی پر یہ راز اس وقت بم کے دھماکے کے مانند کھلا' جب ۱۹۵۷ء کے اواخر کوٹ شیر سنگھ (ضلع لاہور) میں مجلسِ شوریٰ (جو اب جماعت کے لئے ایک دستور کی تدوین کے اختیار کی حامل 'مجلسِ دستور ساز' کی حیثیت بھی اختیار کر تھی) کا اجلاس منعقد ہوا - اور اس میں مولانا مودودی نے تنظیم اور تحریک کے فر اور تحریک اسلامی کے قائد و امیر کے حقوق و اختیارات کے ضمن میں اپنا وہ فا شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جو ہفت روزہ آئین کے حوالے سے میثاق دسمبر میں شائع شدہ تقریر میں وارد ہوا ہے - تب مولانا اصلاحی کو محسوس ہوا کہ جمہور

---

[1] گویا اس کیفیت کے بالکل برعکس کہ ؎ "مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز - در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست"! - اور یہ غالباً مولانا کی تصوف سے دشمنی ہی کا مظہر

اور شورائیت کا کم از کم وہ تصوّر جس کے وہ شدت سے قائل تھے ع "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند" کے مانند نسیاً منسیاً ہوا چاہتا ہے' اور اب جو فضا جماعت میں پیدا ہو چکی ہے اس میں اس کے حق میں آواز اٹھانا بھی ممکن نہیں رہا- چنانچہ وہ خاموشی کے ساتھ اجلاس سے اٹھے اور لاہور واپس آ گئے- اس کے بعد بھی بعض مخلصین نے 'مصالحت' کے لئے کسی قدر تگ و دَو کی' جو بری طرح ناکام ہو گئی اور بالآخر ایک جانب ۱۳ جنوری ۱۹۵۸ء کو مولانا نے قطعی اور حتمی انداز میں جماعت کی رکنیت سے مختصر خط کے ذریعے استعفاء دے دیا- اور دوسری جانب چند دنوں بعد جب وجوہِ استعفاء کے استفسار کے لئے آنے والے اشخاص اور خطوط کا تانتا بندھ گیا تو کسی قدر تفصیلی تحریر لکھ دی جس نے بعد میں ایک 'گشتی مراسلے' کی صورت اختیار کر لی جس کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے----اور اگرچہ ۱۳ جنوری ۵۸ء کے بعد مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین جن تیز و تند' اور تلخ و ناخوشگوار خطوط کا تبادلہ[1] ہوا وہ اِس داستان کا الم ناک ترین' اور عبرت ناک ترین باب ہے' تاہم اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم اس 'نقشِ غزل' کے ضمیمے کے طور پر خود اپنے استعفے کے ساتھ مولانا اصلاحی کا بھی صرف استعفے کا خط اور مذکورہ گشتی مراسلہ شائع کر رہے ہیں- چنانچہ اس طرح 'نقش غزل' کے 'دو خلاصے' قارئین کے سامنے آ جائیں گے یعنی پہلا جماعت کی ایک چوٹی کی شخصیت کے تجربہ و تجزیہ پر مشتمل' اور دوسرا ایک عام کارکن کے مشاہدات اور آراء پر مبنی- جو نہ ارکانِ شوریٰ میں سے تھا' نہ اربابِ حلّ و عقد میں' لہٰذا رازہائے درونِ پردہ سے ناواقف تھا-

راقم الحروف اور مولانا اصلاحی کے استعفوں کے درمیانی نو ماہ کے دوران جو نمایاں اور معروف لوگ جماعت سے علیحدہ ہوئے اُن کا معاملہ دوسرے اعتبارات سے بھی راقم اور مولانا کے بین بین رہا- چنانچہ اُن میں سے بعض حضرات کے استعفوں کا تو شدت سے انتظار ہو رہا تھا' یہاں تک کہ بعض (جیسے مثلاً مولانا عبد الغفار حسن) کے ساتھ تو یہ معاملہ بھی پیش آیا کہ اِدھر انہوں نے استعفاء مرکز

---

[1] یہ خط و کتابت ہفت روزہ 'ندا' کے ۷ اور ۱۴ مارچ ۱۹۸۸ء کے دو شماروں میں شائع ہو چکی ہے-

رسال کیا' اُدھر مرکز سے اظہارِ وجوہ کا طلبی نامہ روانہ ہو گیا کہ وجوہات بیان بھیجئے کہ کیوں نہ آپ کو جماعت سے خارج کر دیا جائے' ــــــــــ اور دونوں کا اک میں کراس ہوا' جبکہ بعض دوسرے حضرات (جیسے مثلاً سردار محمد اجمل ان لغاری مرحوم) کو جماعت میں روکے رکھنے کی شدید اور پیہم کوششیں دگئیں![1]

مزید بر آں' اِن میں سے ہر ایک کے پاس ع "جو میں بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری!" کے مصداق ایک دل خراش داستان ہے جس کو ن کر انسان دم بخود رہ جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں جن "بقیۃ السّلف" حضرات سے ملاقات ہوئی (بقیۃ السّیف' اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ "کشتۂ شمشیر" تو وہ تھے) انہوں نے جب اپنے زخم دکھانے شروع کئے تو راقم کو اپنی داستان ہیچ نظر آنے لگی ۔ چنانچہ یہ عام تأثر سامنے آیا کہ "تم نے نقضِ غزل' کے ضمن میں بڑی لمبی لمبی چھلانگیں لگائی ہیں' جس کے نتیجے میں بہت سے تلخ تر حقائق و واقعات بیان ہونے سے رہ گئے ہیں۔" تاہم اس پر تقریباً اجماع نظر آیا کہ کسی ایک شخص کے لئے اِن تمام سر گذشتوں کا بیان کرنا ناممکن ہے' اس کی تو صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ ہر شخص اپنا اپنا ماجرا خود تحریر کرے ۔ (چنانچہ بعض حضرات نے اس کا ارادہ بھی ظاہر کیا ۔)

---

[1] اور یہ اس لئے کہ سردار صاحب مرحوم و مغفور سابق ریاست بہاولپور میں مولانا مودودی کی دعوت پر لبیک کہنے والے پہلے شخص تھے' اور نہ صرف یہ کہ اُس علاقے میں جماعت کی دعوت کے فروغ کا سہرا سب سے بڑھ کر انہی کے سر ہے' بلکہ علاقے کے ایک بڑے جاگیردار خاندان سے متعلق ہونے کے ناطے اس علاقے کے جملہ وابستگان بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی نہ کسی درجہ میں اُن کے حُسنِ سلوک کے ممنون احسان رہے تھے' ــــــــــ یادش بخیر اسی نوع کی ایک شخصیت صوبہ سرحد میں خان سردار علی خاں مرحوم کی تھی ۔ ان کا یہ قول بھی ریکارڈ پر آ جائے تو مناسب ہے جو انہوں نے مولانا اصلاحی سے مخاطب ہو کر کہا تھا: "مولانا ہمیں آپ سے کلی اتفاق ہے اور ہم آپ کی ایک ایک بات کو درست سمجھتے ہیں لیکن ہم سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کا ساتھ اِس لئے نہیں چھوڑ سکتے کہ ہم' خوانینِ سرحد' پر گزشتہ صدی کے بھی ایک سیّد (سیّد احمد شہیدؒ) سے بے وفائی کا الزام تاحال قائم ہے!"

اس سلسلے میں محترم شیخ سلطان احمد صاحب کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ 'آئین' کے مضمون نگار نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"مولانا سلطان احمد صاحب (سابق قائم مقام امیر جماعت اسلامی پاکستان) کے بارے میں ایک مرتبہ میری چودھری غلام محمد مرحوم سے گفتگو ہوئی - انہوں نے بتایا کہ مولانا سلطان احمد صاحب کو جماعت کی پالیسی سے کوئی ایسا اختلاف نہ تھا جو دور نہ ہو سکتا ہو - لیکن بعض دیگر حضرات کی طرح وہ اس وقت کی صورت حال سے دل گرفتہ ہو گئے تھے اور ان کا ذہنی سکون بری طرح متاثر ہو گیا تھا[1]-"

جبکہ واقعہ یہ ہے کہ راقم نے اپنی حالیہ ملاقاتوں میں متذکرہ بالا تأثر بھی سب سے زیادہ شدید اُن ہی میں پایا - اور اس انتہائی رائے میں بھی سب سے بڑھ کر جازم اُن ہی کو پایا کہ مولانا مودودی کے جماعت کی امارت سے استعفے کے بعد سے لے کر اجتماع ماچھی گوٹھ کے اختتام تک کے تمام واقعات ایک سوچے سمجھے منصوبے' اور پوری مہارت کے ساتھ 'پلاٹ' کئے گئے 'ڈرامے' کے مظہر ہیں!

---

[1] گویا وہی نعیم صدّیقی صاحب کا ماچھی گوٹھ کی تقریر والا حربہ' جو انہوں نے مولانا اصلاحی کے خلاف استعمال کیا تھا!

نقضِ غزل کا حاصل

مولانا مودودی مرحوم کے اس "نقضِ غزل "[1] کے نتیجے میں جماعتِ اسلامی کے جن ارکان نے جماعت سے علیٰحدگی اختیار کی اُن کی کل تعداد تو غالباً ایک سو سے زائد نہ تھی، لیکن مجموعی تعداد سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں جماعتِ اسلامی کی قیادت کی صفِ دوم تقریباً بالکل "صاف" ہو گئی ----- اس پہلو سے جو شدید نقصان جماعت اور تحریک کو پہنچا اس کا کسی قدر اندازہ حسبِ ذیل تجزیے سے ہو سکتا ہے:

(۱) وہ چاروں حضرات جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے جن پر گزشتہ دس سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً مولانا مودودی کی نظر بندی کے دوران امارتِ جماعت کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا تھا --- اور اِس طرح گویا جماعت میں ان کی حیثیت اور مرتبہ و مقام مسلّم تھا، یعنی مولانا عبد الجبار غازی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبد الغفار حسن، اور شیخ سلطان احمد، ---- واضح رہے کہ ان ہی میں سے تین حضرات جائزہ کمیٹی کے رکن بھی تھے -

(۲) جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی اکثریت یا باضابطہ علیٰحدہ ہو گئی یا مفلوج ہو کر رہ گئی، اِس لئے کہ اُن بیس ارکان میں سے جو عرصۂ دراز سے تقریباً مستقل طور پر شوریٰ میں شامل چلے آ رہے تھے اور اِس طرح گویا جماعت میں انہیں "اربابِ حلّ و عقد" کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، آٹھ تو جماعت سے باضابطہ علیٰحدہ ہو گئے ------ یعنی متذکرہ بالا چار حضرات کے علاوہ حکیم عبد الرحیم اشرف (کنوینر جائزہ کمیٹی) - چودھری عبد الحمید (فیصل آباد) - جناب سعید ملک (لاہور) اور سردار محمد اجمل خان لغاری (رحیم آباد، ریاست بہاولپور) ---- اور بقیہ بارہ میں سے بھی کم از کم نصف ایسے تھے جنہوں نے رکنیت جماعت سے

---

[1] بحوالہ سورۃ النحل آیت ۹۲

مستعفی ہونے کا انتہائی قدم تو فوری طور پر نہیں اٹھایا لیکن ان کے خیالات و نظریات وہی تھے جو مستعفی ہونے والے حضرات کے تھے' لہٰذا وہ جماعت میں عضو معطل ہو کر رہ گئے ---- چنانچہ اُن میں سے بعض کو تو یہ صدمہ گھُن کی طرح کھا گیا - اور وہ جلد ہی انتقال کر گئے جیسے محمد باقر خاں (ملتان) اور دوسرے کچھ عرصہ کے بعد مختلف وقفوں کے ساتھ جماعت کو چھوڑ گئے جیسے مولانا عبد الحق جامعی (خان پور) ڈاکٹر محمد نذیر مسلم (رحیم یار خاں) اور سیّد وصی مظہر ندوی (حیدر آباد' سندھ) وغیرہم - اور بعض جماعت کے ساتھ چلتے تو زندگی کے آخری لمحے تک رہے' لیکن اُن میں وہ پچھلا سا جوش و خروش باقی نہ رہا جیسے خان سردار علی خاں (سرحد) -

(۳) مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبد الغفار حسن کے علاوہ جماعت کے ارکان میں سے صرف ایک ہی عالم دین اور تھے جو تصنیف و تالیف کی بنا پر معروف تھے ---- یعنی مولانا افتخار احمد بلخی (مرحوم) - وہ بھی جماعت سے علیحدہ ہو گئے -

(۴) اسی طرح روزنامہ صحافت کے میدان میں بھی صرف دو ہی ارکان جماعت نمایاں ہوئے تھے' یعنی جناب سعید ملک' اور ارشاد احمد حقانی' یہ دونوں بھی جماعت کو چھوڑ گئے -

جماعتِ اسلامی کی قیادت کی دوسری صف کی اِس پوری ٹیم کے دفعتاً میدان سے ہٹ جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جماعت میں فوری طور پر شدید قحط الرّجال پیدا ہو گیا[۱] جس کے اثرات تاحال محسوس ہو رہے ہیں' کہ ۔ "نہ اٹھا پھر کوئی رومی

---

[۱] اس ضمن میں بھی یہ لطیفہ یا کثیفہ ریکارڈ ہو جائے تو اچھا ہے کہ سانحۂ ماچھی گوٹھ کے کچھ عرصے بعد مولانا مودودی مرحوم دورے پر کراچی تشریف لے گئے تو وہاں اجتماعِ ارکان میں جماعت سے ایسے اہم لوگوں کی علیٰحدگی پر اکثر ارکانِ جماعت نے شدید تشویش کا اظہار کیا. اِس پر مولانا مودودی نے اعداد و شمار کے حوالے سے جواب دیا کہ جتنے لوگ جماعت سے علیٰحدہ ہوئے ہیں انہی دنوں میں ان سے زائد جماعت میں شامل ہو گئے ہیں' تو ایک خاتون نے مولانا کی خدمت میں ایک رقعہ ارسال کیا جس پر درج تھا : "مولانا آپ نے ہیرے پھینک کر جھولی میں کنکریاں بھر لی ہیں !" ------- اور یہ خاتون شیخ سلطان احمد صاحب کی اہلیۂ محترمہ تھیں جو شیخ صاحب موصوف کے مستعفی ہو جانے کے بعد بھی کافی عرصہ تک جماعت کی رکن رہیں !

عجم کے لالہ زاروں سے - وہی آب و گِلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی" کے مصداق جماعت میں پھر نہ کوئی صاحبِ فکر اور صاحبِ تصنیف عالم ابھر کر سامنے آسکا، نہ کوئی نیا ادیب یا صحافی منظرِ عام پر آسکا، (اس میدان میں اگر کچھ نوجوان سامنے آئے بھی، تو انہوں نے اپنا "جداگانہ تشخص" برقرار رکھنے کو ترجیح دی، اور جماعت میں شمولیت کو اپنے مقام سے فروتر گردانا!) ------ نہ ہی کوئی صاحبِ فکر داعی سامنے آسکا جو اپنے زورِ خطابت سے "رُوح کو تڑپا دے اور قلم کو گرما دے!"-

اور اِس سے بھی بڑھ کر رُوح فرسا اور حسرت ناک نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ جماعت کے دورِ اوّل کے ان "باقیات الصالحات" کے جماعت سے علیٰحدہ ہونے کے بعد جماعت کو تیزی سے اپنے سابق موقف سے کامل انحراف، سابقہ پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیوں، اور عوام النّاس کے حافظے کے کمزور ہونے کے مشہور اصول پر اعتماد کرتے ہوئے پے در پے قلابازیاں کھانے اور ع "چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اِک تیز رو کے ساتھ!" کے مصداق آئے دن بلا جھجک اپنی وفاداریوں اور سیاسی قبلوں" کے تبدیل کرنے سے روکنے والی کوئی مؤثر قوت موجود نہ رہی ------ یہی سبب ہے اس کا کہ "یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" ------ کے مصداق جماعت کی زمین بھی تبدیل ہو گئی اور آسمان بھی بدل گیا- تا آنکہ آج صورت یہ ہے ع "کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!"

(۵) متذکرہ بالا حضرات تو وہ ہیں جو اُس وقت کُل پاکستان سطح پر معروف تھے (اور اُن کی یہ فہرست بھی ظاہر ہے کہ کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتی- اِس لئے کہ اس کی بنیاد صرف حافظہ اور یادداشت پر ہے) ان کے علاوہ ایسے حضرات کی فہرست بہت طویل ہے جو اپنے اپنے علاقوں اور حلقوں میں مختلف اعتبارات سے معروف اور ممتاز تھے، ------ جیسے مثلاً کراچی میں جناب ظفر الاحسن، اور شیخ جمیل الرحمٰن جماعت کے ساتھ طویل تعلّق کے علاوہ اصابتِ رائے کے اعتبار سے معروف تھے، تو ڈاکٹر مسعود الدّین حسن عثمانی مرحوم سرگرم اور فعّال ترین کارکنوں کی فہرست میں بلند ترین مقام پر فائز ہونے کے علاوہ انفاق مال اور خدمتِ خلق کے اعتبار سے بہت مشہور تھے ------ اِسی طرح فیصل آباد کے میاں فضل احمد

مرحوم جماعت سے طویل تعلّق اور اصابت رائے کے اعتبار سے ممتاز تھے تو چودھری قدرت علی حلقہ کے قیّم ہونے کی بنا پر معروف تھے' اسی طرح لاہور میں چودھری قدرت علی کے چھوٹے بھائی جناب مصطفےٰ صادق بھی چونکہ طویل عرصہ تک حلقہ لاہور کے قیّم رہے تھے لہٰذا تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں کی بنیاد پر تو نمایاں تھے ہی' اب صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھ چکے تھے ------ اور اِن کے علاوہ مولوی محی الدّین سلفی مرحوم' مولوی برکت علی' خلیفہ نذیر احمد' اور میاں محمد اسلم نہایت فعّال کارکنوں میں شامل تھے - اِسی طرح ساہیوال سے جو ارکان جماعت سے علیٰحدہ ہوئے ان میں میرے بڑے بھائی اظہار احمد اِس اعتبار سے نمایاں تھے کہ ان کا تحریک سے تعلّق قبل از تقسیم ہند سے تھا اور وہ اُس زمانے میں اپنی گزیٹڈ افسری کی قربانی دے چکے تھے جب یہ بہت بڑا عہدہ شمار ہوتا تھا' تو سیّد شیر محمد شاہ' نور محمد قریشی اور حافظ خادم احمد وغیرہم نہایت سنجیدہ لیکن فعّال کارکنوں میں شامل تھے! ——— وَقِس علیٰ ذالک!!

اِس 'نقض غزل' کا شکار ہونے والے جتنے ارکانِ جماعت سے مَیں ذاتی طور پر واقف ہوں اُن میں نوجوان اور وجیہہ' ذہین اور فطین' فعّال اور سرگرم' محنتی اور ایثار پیشہ' اور سنجیدہ و متین لیکن خوش گفتار و خوش مزاج کارکنوں کا سب سے حسین گلدستہ سکھر شہر سے تعلّق رکھتا تھا - اُن میں محترم نجیب صدّیقی صاحب کے علاوہ جن کے نام یاد آ سکے وہ ہیں: میاں محمد لطیف مرحوم' شیخ سر تاج الدّین سولیجہ مرحوم' شیخ محمد عمر' خورشید عاقل صدّیقی' جناب عزیز حمیدی' اور جناب عبد السّمیع ------ اِن سب حضرات کے چہرے اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہیں اور یہ پورا گلدستہ میرے لئے تاحال - " پھر رہا ہے میری آنکھوں میں وہی جانِ بہار جس کا ہم رنگ کوئی پھول گلستاں میں نہیں!" کی حیثیت رکھتا ہے -

اور یہ تو صرف اُن ارکانِ جماعت کے نام ہیں جن سے مَیں متعارف تھا' اور اُن میں سے بھی صرف وہ جو فی الفور یاد آ سکے --- (ویسے جیسے جیسے یادداشت کا محافظ خانہ کھلا ہے کچھ اور نام بھی یاد آ رہے ہیں' جیسے کراچی کے جناب سالم جان اور احتشام الدّین' فیصل آباد کے چودھری غلام حسین رندھاوا اور حافظ علم الدّین'

منڈی ڈھاباں سنگھ کے مولانا محمد حنیف امرتسری، شیخوپورہ کے ڈاکٹر نذر محمد، اور گگو منڈی کے مولوی عبد الرّحیم وغیرہم۔ لیکن ظاہر ہے کہ اِس فہرست کو لمبا کرنے سے کچھ حاصل نہیں، اصل قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک خلوص و اخلاص کا مجسمہ اور وفا کا پتلا تھا)------، جماعت سے علیحدگی کے عمل کے دوران یہ سب نہایت شدید صدمہ سے دوچار رہے، اِس کے بعد بھی ان سب پر ایک عرصے تک سکتہ سا طاری رہا-- اور بالآخر سب کے سب حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے۔

اِن حوادث کے باعث رنج و غم اور صدمہ کی شدّت کے اندازے کے لئے چند مثالیں کفایت کریں گی (۱) مولانا عبد الجبّار غازیؒ نے نومبر دسمبر ۵۶ء کی جائزہ کمیٹی کی رپورٹ والے اجلاسِ شوریٰ کے دوران رو رو کر مولانا مودودی کو جماعت کے ابتدائی ایام کی کیفیات یاد دلائیں اور گڑگڑا کر کہا کہ "مولانا! خدا کے لئے باہمی اعتماد کی وہی فضا دوبارہ پیدا کرنے کی کوشش کیجئے!"- لیکن جب انہیں مولانا کی جانب سے سرد مہری کا احساس ہوا تو اس صدمہ کے باعث اُن پر دل کا دورہ پڑا اور وہ صاحبِ فراش ہو گئے---- اور اِس کے چند ہی روز بعد وہ خاموشی کے ساتھ ماچھی گوٹھ کے اجتماع سے بہت پہلے ہی رکنیت سے مستعفی ہو کر راولپنڈی چلے گئے (۲) گگو منڈی کے مولوی عبد الرّحیم ایک نوجوان اہلِ حدیث عالمِ دین تھے- اور ان کی بہت طویل اور گھنی داڑھی تھی- ایک بار وہ جماعتِ اسلامی ساہیوال کے شفاخانے میں مجھ سے ملاقات کے لئے آئے تو اُس وقت کے حالات پر اِس طرح دھاڑیں مار مار کر روئے کہ چپ کرانا محال ہو گیا----- اور سب سے بڑھ کر یہ کہ (۳) میرے اور مولانا عبد الغفار حسن کے ایک مشترک عزیز عتیق احمد صاحب ایم اے، ایل ایل بی علیگ (مرحوم) ماچھی گوٹھ جاتے ہوئے اختلاف کے تذکرے اور چرچے سے اتنے شدید متأثر ہوئے کہ فوری طور پر دماغی توازن کھو بیٹھے، چنانچہ انہیں راستے ہی میں رحیم یار خاں کے اسٹیشن پر اتار لینا پڑا اور اُن کی تیمارداری کی مصروفیت کے باعث مولانا عبد الغفار حسن بھی اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں صرف جزوی طور پر شریک ہو سکے! یہ چند مثالیں "نمونہ

مشتے از خروارے" کے مصداق ہیں... ؎ "قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا!"۔
اور یہ تو "نقصِ غزل" کے نقصانات کا صرف ایک رخ ہے!

اِس بھیانک تصویر کا دوسرا اور افسوس ناک تر رُخ یہ ہے کہ صرف اُن چند علماء کرام کو چھوڑ کر' جو جماعت میں شامل ہونے سے پہلے بھی مذہبی زندگی ہی بسر کرتے تھے' اور جو جماعت سے علیحدگی کے بعد بھی خدمتِ دین کے ضمن میں مختلف النّوع مشاغل جیسے تصنیف و تالیف' تعلیم و تدریس' تبلیغ و اصلاح' یا خطابت و امامت میں مصروف ہوگئے ------ جماعت سے مستعفی ہونے والے لوگوں کی عظیم اکثریت رفتہ رفتہ ماحول میں جذب ہوتی چلی گئی - ان میں سے بعض تو اس حد تک بھی پہنچ گئے کہ نماز روزے سے بھی گئے اور داڑھیاں بھی غائب ہو گئیں' اکثر و بیشتر نے روایتی طور پر دین کے شعائر کی تھوڑی بہت پابندی تو جاری رکھی لیکن اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو بگٹٹ حصولِ دنیا کے رُخ پر ڈال دیا! اور اِس کے ضمن میں مجبُوری کے عُذر کے تحت زمانے کے جملہ مروّجہ طور طریقے اختیار کرلیے!! اور اِس طرح گویا اُن کی اخلاقی اور رُوحانی موت واقع ہو گئی---- راقم کو جب کبھی ایسے لوگوں کا خیال آتا ہے تو کبھی تو یہ مصرعہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے کہ ؎ "مَیں کِس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں؟"------ اور کبھی یہ شعر ذہن میں اٹک کر رہ جاتا ہے ؎

ممکن ہو گر تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

بعض حضرات ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو حصولِ دولت کی دوڑ' اور معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے کے جنون سے تو بچالیا لیکن خواہ اِس سبب سے کہ عمر کی ایک خاص حد سے گزر جانے کے باعث کسی نئے تجربے یا از سرِ نو عزمِ سفر کی ہمت نہ رہی' خواہ اِس وجہ سے کہ کوئی نیا قافلہ تشکیل نہ پاسکا' یا ؎ "پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو مَیں" کے مصداق کسی نئے "راہبر" پر دل نہ ٹھکا' بہر حال جب اقامتِ دین کے رُخ پر کوئی عملی پیش قدمی نہ ہو سکی تو اُن کی صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ گئیں اور وہ ؎ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز!" کے مصداق کامل

—— اور ؎

تری رہبری کا یہ فیض ہے ' قدم اہلِ شوق کے رک گئے!
نہ کوئی جوازِ سفر ملا ' نہ کوئی دلیلِ قیام ہے!!

کی مجسّم تصویر بن کر رہ گئے!

اور اِس داستان کا الم ناک ترین باب یہ ہے کہ بعض اکابر علماء جو جماعت
میں تھے تو شعلۂ جوالہ اور مجسّم حرکت و عمل تھے رفتہ رفتہ ؎ "آگ تھے
ابتدائے عشق میں ہم - ہو گئے خاک انتہا یہ ہے!!" کی تصویر بن گئے - اور جیسے جیسے
وقت گزرا اُن کے دینی فکر اور مذہبی تصوّرات میں سے تحریکی عنصر ختم ہوتا چلا گیا
تا آنکہ آج حال یہ ہے کہ جن کے نزدیک کبھی دعوتِ دین اور اقامتِ دین کی
جدّوجہد فرضِ عین کا درجہ رکھتی تھی آج مختلف حیلوں بہانوں سے اُس کا استخفاف
کر کے صرف علمی و تعلیمی کاموں کو کافی و شافی قرار دے رہے ہیں' اور جن کے
نزدیک کبھی التزامِ جماعت لازم اور لابدّ منہ ہوا کرتا تھا آج جماعت سازی کو "فتنہ"
قرار دے رہے ہیں اور اِس طرح ؏ "بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا"
اور ؏ "کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں" سے بھی بڑھ کر
اِس شعر کے مصداق کامل بن گئے ہیں کہ ؎

خود بدلتے نہیں ' قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

الغرض ' اکابر و اصاغر اور عالموں اور عامیوں سمیت جماعت سے علیحدہ
ہونے والے لوگوں کی اکثریت دین کے کم از کم تحریکی تصوّر سے ' نظری نہیں تو
عملی طور پر دست بردار ہو گئی - اور اب ان میں سے بیشتر کا حال اِس شعر کے
مطابق ہے کہ ؎ "بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے - مسلماں نہیں ' راکھ کا ڈھیر
ہے" ——— اور صرف معدودے چند لوگوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ
وہ ؏ "ایک بُلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک!" ——— یا کم از کم ؏ "آگ
بجھی ہوئی نہ جان ' آگ دبی ہوئی سمجھ!" کے مصداق ہیں! -

گویا بحیثیت مجموعی جماعت سے علیحدہ ہونے والے لوگوں پر یہ شعر صد فی صد راست آتا ہے کہ ؂

سب کہاں ؟ کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صُورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!

اور اِس طرح نقضِ غزلؔ کے اس حادثۂ فاجعہ نے دو دھاری تلوار کا کام کیا کہ ایک جانب دعوتِ دین اور تحریک اسلامی کو شدید نقصان پہنچایا تو دوسری طرف ایک معتد بہ تعداد میں مخلص اور متحرّک خادمانِ دین کو کم از کم تحریکی اعتبار سے موت کے گھاٹ اتار دیا ؏ "ڈھونڈ اب اُن کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر"۔

قارئینِ کرام!

- آپ کا زرِ تعاون ختم ہونے کی تاریخ لفافے/پرچیاں نام و پتہ کے لیبل پر درج ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ مذکورہ تاریخ اگر گزر چکی ہو تو ہمیں جلد از جلد مطلع فرمائیں کہ آپ کے نام پرچہ بدستور جاری رکھا جائے! اِس مقصد کے لیے الگ سے یاددہانی کے خطوط ارسال نہیں کیے جا رہے۔
- بیرونِ ملک قیام پذیر حضرات سے گذارش ہے کہ جہاں ممکن ہو اپنے پرچے الگ الگ ناموں سے منگوانے کے بجائے کسی ایک نام سے اکٹھے منگوا کر باہم تقسیم کا انتظام فرمائیں۔
- سالانہ اجتماع کے موقعہ پر کتب/کیسٹس خریدنے کے خواہشمند حضرات اگر پیشگی بذریعہ ڈاک اپنی مطلوبہ کتب/کیسٹس کی فہرست ہمیں ارسال کر سکیں تو ہمارے لیے سہولت کا باعث ہو گا۔

شکریہ!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کرے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے


پیلو کی بازیافت
مسواک سے
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تک
پیلو صدیوں سے دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ
پیلو کے اوصاف
مسوڑے مضبوط، دانت صاف
پاکستان سے محبت کرو - پاکستان کی تعمیر کرو
Adarts-HTP-3/85

بقیہ: 'تذکرہ و تبصرہ'

یہ صورتِ حال ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان میں اُس وقت اپنے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچ گئی تھی جب مولانا مودودی نے بھرے اجتماع میں اپنی قرارداد میں مولانا اصلاحی کے تجویز کردہ اضافے کے 'نہلے' پر اپنے اضافۂ مزید کا 'دہلا' دے مارا تھا ـــــ اور گویا مولانا اصلاحی کو برسرِ عام دعوتِ مبارزت دیدی تھی، اس پر ہم اپنی حالیہ تحریر میں جو اسی شمارے میں شائع ہو رہی ہے اپنا یہ تأثر بیان کر چکے ہیں کہ اگر اس کی 'صریح بزدلی' سے کم تر کوئی توجیہہ ممکن ہے تو صرف یہ کہ اِس غیر متوقع اور اچانک حملے سے مولانا اصلاحی بھونچکا ہو کر رہ گئے ہوں، اور اُن کی قوتِ فیصلہ عارضی طور پر مفلوج ہو گئی ہو!

چنانچہ ؏ "ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!" کے مصداق مولانا اصلاحی کو اُس وقت کے تذبذب یا کم ہمتی اور بزدلی کی بھرپور سزا بھی جلد ہی مل گئی۔ اس لئے کہ ماچھی گوٹھ کی فتحِ عظیم کے بعد مولانا مودودی کی خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ کوٹ شیر سنگھ کے اجتماعِ شوریٰ میں انہوں نے کمال اعتماد کے ساتھ اپنا پورا فلسفۂ تنظیم و جماعت اور تصوّرِ قیادت و امارت کھول کر بیان کر دیا اور اس طرح گویا مولانا اصلاحی کو دوبارہ ایک کھلی دعوتِ مبارزت دیدی ـ جس کے جواب میں مولانا کو راہِ فرار اختیار کرتے ہی بنی ـ یہی وجہ ہے کہ جنوری ۵۸ء میں جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو جانے کے بعد جو خط و کتابت مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کے مابین ہوئی اس میں مولانا مودودی کا پلڑا بہت بھاری نظر آتا ہے اور وہ مولانا اصلاحی کو بار بار دلیل اور منطق کے میدان میں مقابلے کی دعوت دیتے دکھائی دیتے ہیں، جبکہ مولانا اصلاحی گریز اور فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں ـ اس لئے کہ ماچھی گوٹھ کے بعد سے جماعت کی زمین اور آسمان سب بدل گئے تھے اور نئے حالات میں مولانا اصلاحی کے لئے مولانا مودودی کے سامنے آنا قطعاً ناممکن تھا!

ـــــــ اس کیفیت کا تقابل اگر اس وقت کی صورتِ حال سے کیا جائے جب مولانا اصلاحی نے مولانا مودودی کے جائزہ کمیٹی کے خلاف الزام نامے کا جواب تحریر کیا تھا تو

ع "بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!" کے مصداق زمین اور آسمان کا فرق نظر آتا ہے! **فاعتبروا یااولی الابصار!**

ہمیں مولانا اصلاحی سے ایک شکایت اور بھی ہے' اور وہ یہ کہ انہوں نے آج تک اقامتِ دین کے لئے قائم ہونے والی جماعت کے تنظیمی ڈھانچے اور اس میں جمہوریت اور شورائیت کے تقاضوں کے ضمن میں اپنے تصوّرات کو کبھی تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا- اس سلسلے میں انہوں نے مجلس شوریٰ میں تو یقیناً اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہو گا- اور اس کے حق میں دلائل بھی دیئے ہوں گے (بلکہ مولانا کے ایک خط سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں کسی موقع پر دوسرے اصحابِ علم و فضل سے بھی رجوع کیا گیا تھا) تب ہی وہ پیچ در پیچ فارمولا طے پایا ہو گا جس کا ذکر ہو چکا ہے ------ لیکن جماعت کے عام ارکان کے سامنے اُن کے نقطۂ نظر کی وضاحت کبھی نہ آسکی- حالانکہ اس فارمولے کے دستورِ جماعت میں ثبت ہو جانے کے بعد اس کے حق میں کسی وضاحتی تحریر کی اشاعت ہرگز قابل اعتراض نہ ہوتی ------ پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جماعت میں شامل ہوتے ہوئے اس بحث کو پبلک میں چھیڑنا ادنیٰ درجہ ہی میں سہی' بہر حال نامناسب تھا' تب بھی اس کا کیا جواب ہے کہ جماعت سے علیٰحدگی کے بعد کے بتیس ۳۲ سالوں کے دوران بھی مولانا نے اس موضوع پر ایک حرف تک سپرد قلم نہیں کیا- کہ آئندہ کام کرنے والوں ہی کے لئے رہنمائی کا سامان فراہم ہو جاتا ------ اس کی بھی کم از کم ہمارے نزدیک دو کے سوا کوئی تیسری توجیہہ ممکن نہیں ہے' یعنی یا تو اُن کے نزدیک فریضۂ اقامتِ دین کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہی' --- یا انہیں اس کی ادائیگی کے لئے قائم ہونے والی جماعت کے ضمن میں اپنے اُن نظریات اور تصوّرات پر اعتماد نہیں رہا جن کی بنیاد پر انہوں نے سالہا سال تک مولانا مودودی کے ساتھ وہ کشتی جاری رکھی جسے خود انہوں نے "گربہ کشتن" کی کوشش سے تعبیر کیا ------ ان میں سے مؤخر الذکر توجیہہ کے خلاف تو ہماری اپنی گواہی موجود ہے کہ کم از کم ۱۹۷۲ء تک تو مولانا اپنے جمہوری اور شورائی تصوّرات پر اس حد تک عازم اور جازم تھے کہ جب اُس سال مرکزی انجمن

خدّام القرآن لاہور قائم ہوئی اور اس میں اُس کے صدر مؤسّس کو ویٹو کا حق تفویض کیا گیا تو مولانا نے احتجاج کے طور پر 'میثاق' کی پیشانی پر سے "زیر سر پرستی مولانا امین احسن اصلاحی" کے الفاظ ہٹوا دیئے - اور یہ الفاظ بھی فرمائے کہ "اسی مسئلے پر تو میں نے مولانا مودودی سے جنگ کی تھی!"-

بنابریں صرف مقدّم الذکر توجیہہ باقی رہ جاتی ہے لیکن اسے تسلیم کرنے سے بھی ذہن اس لئے انکاری ہے کہ صرف اقامتِ دین کی اجتماعی جدّوجہد ہی کے لئے تو مولانا اصلاحی نے سرائے میر 'اعظم گڑھ سے دار الاسلام' پٹھان کوٹ ہجرت کی تھی جبکہ علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے ضمن میں تو وہاں مدرسۃ الاصلاح اور دائرۂ حمیدیہ ایسے ادارے بھی موجود تھے 'اور اُن کا اپنا ماہنامہ 'الاصلاح' بھی جاری تھا - مزید بر آں مولانا مودودی کی اختیار کردہ اصطلاح "قیامِ حکومتِ الٰہیہ" کی جگہ "اقامتِ دین" کی اصطلاح کو تو انہوں نے ہی رواج دیا تھا' ------ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی معرکۃ الآراء کتاب "دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار" آج تک شائع ہو رہی ہے جس کے دوسرے اور اہم ترین باب "تبلیغ کس لئے؟" کے آخر میں اُس کی پوری بحث کے خلاصے اور لبِّ لباب کے طور پر یہ زوردار الفاظ تا حال موجود ہیں:

"اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے:

(ا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لئے تبلیغِ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی امت کے سپرد فرمایا تاکہ یہ امت ہر ملک' ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے-

(ب) اس تبلیغ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے' زبان سے کی جائے' عمل سے کی جائے- بلا تقسیم و تفریق' پورے دین کی کی جائے' بے خوف لومۃ لائم اور بے رو رعایت کی جائے' اور اگر ضرورت داعی ہو تو جان دے کر کی جائے-

(ج) اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا اور

جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

(د) اس ادارہ کے منتشر ہو جانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری امت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہو گئی۔

(ھ) اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لئے باقی رہ گئی ہیں! یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

(و) اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرضِ رسالت کو ادا نہ کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے' بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔" (صفحات ۴۶-۴۷)

الغرض' مولانا اصلاحی کا موقف پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے؟ یہ ع "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!" اور ہمیں یہ باتیں لکھتے ہوئے اگرچہ قلبی اذیت محسوس ہو رہی ہے تاہم یہ سب کچھ لکھ اس لئے دیا ہے کہ ابھی ماشاءاللہ مولانا اصلاحی بقیدِ حیات ہیں اور بحمد اللہ سوائے ایک حاسۂ سماعت کے ان کے جملہ ذہنی قوای سلامت ہی نہیں پوری طرح چاق و چوبند ہیں' لہٰذا اب بھی وقت ہے کہ مولانا محمد منظور نعمانی کی طرح مولانا بھی وضاحت کے ساتھ لکھ دیں کہ وہ جن تصورات کے تحت جماعت میں شامل ہوئے تھے اُن میں سے کن کن سے نظری و فکری طور پر رجوع کر چکے ہیں اور کن کن پر علمی اور ذہنی طور پر قائم ہیں' خواہ کسی سبب سے عملاً کاربند نہ ہوں تاکہ مستقبل کے مؤرخ کو بھی صحیح فیصلہ کرنے میں مدد ملے اور آئندہ نسلوں کو بھی رہنمائی کا سامان حاصل ہو!!

مولانا مودودی مرحوم نے جو تقریر اولاً ماچھی گوٹھ میں "مجلس نمائندگان" کے سامنے اور بعد میں کوٹ شیر سنگھ میں مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں کی تھی اس کے مرکزی خیال یعنی ایک انقلابی جماعت میں قائد اور امیر کی حیثیت کے ضمن میں اُن

رائے سے ہم اپنا کامل اتفاق ظاہر کر چکے ہیں ——— لیکن اس مرکزی خیال
ٔ وائیں اور رہائیں اس میں دو باتیں ایسی بھی ہیں جن سے ہمیں نہ صرف یہ کہ شدید
لاف ہے' بلکہ فتنہ کی بُو بھی آتی ہے- لیکن اس وقت اُن پر مفصل بحث نہیں کی جا
ن صرف اجمالی اشارہ ہی کیا جاسکتا ہے-

اُن میں سے ایک کا تعلق جماعت میں اختلافِ رائے کے حق اور اظہارِ
ئے کی آزادی سے ہے جس کی پر زور نفی مولانا نے اپنے مخصوص طرزِ نگارش
ر خطابی انداز کو بھرپور طور پر بروئے کار لا کر اس طرح کی ہے کہ ایک عام
ری یا سامع فوری طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا- لیکن اگر ذرا بنظر غائر دیکھا
ئے تو اس سے عقل اور نقل دونوں کے تقاضے بری طرح پامال ہوتے نظر آتے ہیں
ں لئے کہ یہ فہمِ عام (Common Sense) اور فطرتِ انسانی کے بھی خلاف ہے'
ر قرآن و سنّت کے اُن نصوص کے بھی منافی ہے جن میں مشاورتِ باہمی کی پُر زور
کید کی گئی ہے-

اور دوسرا معاملہ قائد اور امیر کی شخصیت کو ع "پیراں نمے پرند و
ریداں مے پرانند!" کے مصداق اور مولانا کے اپنے الفاظ کے مطابق 'خود بنانے اور
سروں سے بنوانے' کا ہے تاکہ اُس کی عظمت کا نقش قلوب و اذہان پر قائم ہو جائے
راس کی گہری محبت اور عقیدت دلوں میں رچ بس جائے ——— اور اس سلسلے
ں مولانا جب تحریک کی کامیابی کی شرائط کے ضمن میں "ایک شخصیت کے جادو" کی
ہیت کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ "اس جادو کو فروغ دینے" کا بھی ذکر کرتے
ں ——— تو اس سے شخصیت پرستی کے فتنے کے لئے نہ صرف یہ کہ دروازہ
پٹ کھل جاتا ہے بلکہ اس کے جواز کا ایک پورا فلسفہ بھی سامنے آ جاتا ہے!
——— یہ فلسفہ مولانا کے بعض دوسرے قریبی رفقاء (بالخصوص جناب نعیم صدیقی)
کے ذریعے تو بہت پہلے سے فروغ پا رہا تھا' چنانچہ 'لغزشِ غزل' کے اب سے تیئس۲۳ سال
ل کے تحریر کردہ حصّے میں اس پر مفصل کلام موجود ہے (ملاحظہ فرمائیں 'میثاق'
نوری ۶۹ء صفحات ۶۶ تا ۶۸) تاہم خود مولانا کے اپنے الفاظ میں اس کی پر زور وکالت اسی
قریر یا تحریر کے ذریعے سامنے آئی ہے-

بہر حال ہمارے نزدیک مولانا کے فلسفۂ تحریک کے یہ دو پہلو قائدِ تحریک کے اختیارات کے بارے میں اُن کی رائے کے ساتھ شامل ہو کر ایک بالکل فاشسٹ جماعت کا نقشہ سامنے لاتے ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے بارے میں ان کے بعض ناقدین اور معاندین کا یہ الزام بھی بے بنیاد نہ تھا کہ اُن کا مزاج فسطائی ہے اور یہ اطلاع بھی غلط نہ تھی کہ انہوں نے خیری برادران سے بھرپور تأثر قبول کیا تھا جن کے ذہن اور فکر کی ساری اٹھان نازی جرمنی میں ہوئی تھی!

بہر حال ہم مولانا کے فلسفۂ تحریک کے ان دونوں پہلوؤں سے کامل براءت کے ساتھ ساتھ اپنے اس یقینِ کامل کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کا عطا کردہ نظامِ بیعت متذکرہ بالا دونوں لعنتوں کے بغیر تحریک کے جملہ تقاضے بہ احسنِ وجوہ پورا کر سکتا ہے اور اس میں مشاورتِ باہمی کی روح کو بھی بہ تمام و کمال سمویا جا سکتا ہے اور اختلافِ رائے کے حق اور اظہارِ رائے کی آزادی پر بھی کسی قدغن کی ضرورت نہیں ہوتی ------ چنانچہ بحمد اللہ تنظیمِ اسلامی کی صورت میں ہمارا یہ یقین واذعان ایک واقعی تجربے کی صورت میں سامنے آ رہا ہے اور ہم اس پر صدقِ دل سے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہ:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ"

آئندہ کے لئے دعا کرتے ہیں:

"رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ"

اٰمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ !!

افکار و آراء

رمضان المبارک کے دوران
حرمِ مکّی سے پورے ماہ نمازِ تراویح ٹیلی کاسٹ
کرنے کے ضمن میں حکومت کے اربابِ حلّ وعقد سے ایک اہم گزارش

مارچ ۱۹۹۰ء کے اواخر (۲۸ یا ۲۹ مارچ) سے پاکستان میں ماہ رمضان المبارک کی آمد ہونے والی ہے۔ اس بابرکت و پُر عظمت مہینے کی فضیلت ہر مسلمان پر عیاں ہے۔ خاص طور پر ماہ رمضان المبارک کا قرآن حکیم سے جو خصوصی تعلق ہے اس کے متعلق قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالےٰ ہے:

"رمضان کا مہینہ وہ (ماہ مبارک) ہے جس میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کو الگ الگ کرنے والا ہے" (البقرہ آیت نمبر ۸۵)

رمضان المبارک کے مہینے میں صلوٰۃ التراویح کا خصوصی اہتمام بھی اس لئے کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا قرآن حکیم سے تعلق مضبوط کیا جائے۔ پچھلے دس پندرہ سالوں سے پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ملک میں ہونے والے اکثر شبینوں کو ٹیلی کاسٹ اور نشر کرتا ہے۔ نیز ستائیسویں شب (لیلتہ القدر) کو خانہ کعبہ سے براہ راست ٹیلی کاسٹ کر کے ختم قرآن مجید اور اس کے ساتھ ہونے والی دعا بھی قومی رابطہ پر پورے پاکستان میں دکھائی جاتی ہے۔

ہماری گزارش ہے کہ پورے رمضان المبارک میں ہر شب کو خانہ کعبہ میں ہونے والی صلوٰۃ التراویح پاکستان ٹیلی ویژن سے قومی رابطہ پر پاکستان بھر میں ٹیلی کاسٹ کرنے کا انتظام کیا جائے۔ سعودی عرب اور پاکستان کے ٹائم میں دو گھنٹے کا فرق ہے۔ بیت اللہ شریف میں صلوٰۃ التراویح ساڑھے آٹھ بجے شب کو شروع ہوتی ہے' پاکستان میں اس وقت رات کے ساڑھے دس کا وقت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس انتظام

سے پاکستان ٹیلی ویژن کے کسی پروگرام میں خلل واقع نہیں ہو گا البتہ اس سے کئی فائدے حاصل ہوں گے۔ مثلاً:

۱- ہماری آبادی کی اکثریت قرآن مجید سے واجبی سا تعلق رکھتی ہے۔ خانہ کعبہ سے اس ایک مہینے کی مسلسل ٹیلی کاسٹ اور براڈ کاسٹ سے لوگوں کا قرآن کریم سے تعلق مضبوط ہو گا۔

۲- صلوٰۃ التراویح میں ۹۹ فی صد مرد حضرات شریک ہوتے ہیں 'خواتین قرآنِ حکیم کی ایمان افروز سماعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ یہی کیفیت پیرانہ سال اور مریض حضرات کی ہوتی ہے۔ اس انتظام سے یہ محروم لوگ بھی قرآن حکیم کی سماعت سے مستفیض ہو سکیں گے۔

۳- رمضان المبارک میں دن کا روزہ اور رات کی عبادت اس کی اصل روح ہے لہٰذا رات کی عبادت میں حرم شریف سے قرآن حکیم کو سننے سے اس کے ساتھ قلبی تعلق بڑھے گا، اس کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں سہولت ہو گی اور اس کی تلاوت میں آسانی پیدا ہو گی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن حکیم کا پیغام گھر گھر پہنچے گا اور قراءت و تلاوت گھر گھر گونجے گی۔

۴- سعودی عرب میں پورے رمضان میں حرمین شریف میں ہونے والی صلوٰۃ التراویح Live-Telecast کی جاتی ہے لہٰذا حکومتِ سعودی عرب سے معاملات بہ آسانی طے کئے جا سکتے ہیں۔

حکومت پاکستان کے اربابِ حلّ و عقد سے مخلصانہ گزارش ہے کہ اس تجویز کو روبعمل لانے کے لئے جلد از جلد مناسب اقدامات کریں اور رمضان المبارک کی تمام راتوں کو صلوٰۃ التراویح کو حرم شریف سے ٹیلی کاسٹ اور براڈ کاسٹ کرنے کا انتظام کریں تاکہ ہر گھر رمضان المبارک کی نورانی راتوں میں قرآن حکیم کی ملکوتی آواز سے گونجتا رہے .... یقیناً یہ بندوبست حکومتِ وقت کی نیک نامی کا بھی باعث ہو گا۔

زین العابدین جواد

صدر انجمن خدّام القرآن سندھ (رجسٹرڈ) کراچی

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد: ۳۹

شمارہ: ۵

شوال المکرم ۱۴۱۰ھ

مئی ۱۹۹۰ء

فی شمارہ -/۵

سالانہ زرِ تعاون -/۵۰

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/-
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove IL 60516
Tel : 312 969 6755

c/o Mr Rashid A Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel 313 977 8081

CANADA US $ 12/-
c/o Mr. Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel · 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/-
c/o Mr Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel 01 805 8732

MID-EAST DR 25/-
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/-
c/o Mr. Hyder M D Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel · 42127

K S A SR 25/-
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/-
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ ۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

معزز قارئین کرام!

اپنے زرتعاون کی میعاد جو کہ آپ کے نام / پتہ کے لیبل پر درج ہے ختم ہونے پر براہِ کرم ہمیں جلد از جلد مطلع فرمادیں کہ آپ کے نام پرچہ بدستور جاری رکھا جائے؟ اس سے ہمیں یہ بھی اطمینان رہے گا کہ پرچہ آپ تک پہنچ رہا ہے اور آپ کا پتہ تبدیل نہیں ہوا ہے۔ اگر آپ زرتعاون بذریعہ وی۔پی۔پی ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے بروقت ہمیں تحریر فرمائیں! شکریہ، آپ کے تعاون کے متمنی

منیجر سرکولیشن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ سوال

ملک کے اکثر حصوں میں اس بار عید الفطر مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق جمعۃ المبارک کو منائی گئی جبکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے بعض حصوں میں جمعرات کا دن یوم عید قرار پایا۔ اور یوں ایک بار پھر اس سوال نے شدت کے ساتھ سر اٹھایا کہ اس معاملے میں اگر رویتِ بصری ہی شرط ہے تو شمالاً جنوباً لگ بھگ ڈیڑھ ہزار میل کے عرض میں پھیلے ہوئے ایک ملک کے کسی ایک خطے میں دیکھے جانے والے چاند کا اطلاق پورے ملک پر کیونکر ہو! پھر تو رمضان اور عید وغیرہ کے معاملے میں ہر علاقے میں مقامی رویت کا اعتبار ضروری ٹھہرے گا۔ اس پہلو سے کسی ایک ملک میں دو دو یا تین تین عیدوں کا ہونا بھی قرینِ امکان ہوگا اور اس پر تشویش بے جا قرار پائے گی۔ اور اگر عید کو قومی و ملی یکجہتی کی علامت تصور کیا جائے اور ضروری خیال کیا جائے کہ پورے ملک میں ایک ہی عید ہونی چاہیے تو پھر اس معاملے کو کسی ایک ملک اور اس کی سرحدی حدود تک محدود کرنے کی بجائے پورے عالمِ اسلام کو ایک وحدت تصور کرتے ہوئے پوری دنیا میں ایک ہی دن عید منانا زیادہ قرینِ عقل و منطق ہوگا۔ اس لیے کہ کراچی اور حیدر آباد کی نسبت امرتسر اور دہلی فاصلے کے اعتبار سے مردان یا بنوں سے زیادہ قریب ہیں۔ بنوں میں دیکھے گئے چاند کا اعتبار اگر کراچی میں کیا جاسکتا ہے تو دہلی میں کیوں نہیں کیا جاسکتا جو مکانی اعتبار سے قریب تر ہے! کیا سرحد پر کھنچی ہوئی محض ایک سیاسی اور جغرافیائی سی لکیر اس معاملے میں رکاوٹ بن سکتی ہے؟ اس نوع کے سوالات قریباً ہر سال عید یا بقر عید کے موقع پر سوچنے سمجھنے والے ذہنوں کو پریشان کرتے ہیں۔ اور علماء کرام کے ذمے ہے کہ وہ اس معاملے کے جملہ پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوتے اس بارے میں ایک واضح رائے لوگوں کے سامنے رکھیں تاکہ قوم کو اس معاملے میں ذہنی یکسوئی حاصل ہو سکے۔

آج سے قریباً بائیس برس قبل سابق صدر ایوب خان کے دورِ حکومت کے آخری ایام میں بھی ہلالِ عید کے مسئلے نے بڑی شدت سے سر اٹھایا تھا اور ملک میں دو عیدیں منائی

جانے کے باعث خاصی بدمزگی پیدا ہوئی تھی۔ امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اُس موقع پر 'میثاق' کے انہی صفحات میں اِس موضوع پر قلم اٹھایا تھا اور اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو کھول کر سامنے رکھا تھا۔ انہوں نے علماء کرام سے یہ اپیل بھی کی تھی کہ وہ اس معاملے میں قوم کو صحیح رہنمائی دیں اور انہیں ذہنی عذاب سے نجات دلائیں لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! (امیر تنظیم کا یہ مضمون اب 'اسلام اور پاکستان' نامی کتابچے میں شامل ہے)

اس سال مسجد دار السلام میں نمازِ عید کا وقت پونے چھ بجے طے کیا گیا تھا۔ بعض احباب کا خیال تھا کہ اتنی صبح لوگوں کے لیے نمازِ عید کے لیے پہنچنا دشوار ہوگا۔ اور اس بار اتنا بڑا اجتماع نہیں ہو سکے گا جتنا کہ اس سے پہلے یہاں کا معمول رہا ہے' لیکن الحمدللہ کہ شرکاء کا ذوق وشوق دیدنی تھا۔ وقت سے پہلے ہی مسجد دار السلام سے ملحق تمام پلاٹ اپنی تنگ دامانی کا شکوہ کرتے نظر آتے تھے۔ تعدادِ شرکاء کے اعتبار سے یہ اجتماعِ عید گزشتہ تمام اجتماعات سے زیادہ بھرپور تھا۔ امیر تنظیم نے اپنے خطابِ عید میں بہت کم وقت میں بہت سی باتوں پر اظہارِ خیال فرمایا۔ اِس مختصر مگر جامع خطاب کو اِسی شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔

اس سالانہ اجتماع کے موقع پر تنظیم کا نظام العمل جس کی ضرورت ایک عرصے سے شدت سے محسوس کی جارہی تھی، چھپ کر آگیا تھا اور اس کا اجتماعی مطالعہ بھی رفقاء کو کرایا گیا تھا۔ اور اگرچہ اس کی ترتیب وتسوید امیر تنظیم اسلامی اور شوریٰ کے اُن ارکان کی جو لاہور ہی میں مقیم ہیں، شدید محنت اور کوشش کی مرہونِ منت تھی، لیکن چونکہ اسے اجتماع سے قبل عجلت میں تیار کیا گیا تھا لہٰذا اسے فوری طور پر نافذ العمل قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس میں ترمیم یا اضافے کی گنجائش رکھتے ہوئے رفقاء سے ایک معین وقت کے اندر اندر تجاویز اور سفارشات طلب کی گئیں تاکہ پھر اسے حتمی شکل دی جا سکے۔ الحمدللہ کہ بعض بہت مفید تجاویز بھی سامنے آئیں جن کی روشنی میں نظام العمل کو مناسب حک و اضافے کے بعد حتمی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ 'نظام العمل' بھی اِسی شمارے میں شامل ہے۔

مارچ ۱۹۹۰ء کے 'میثاق' میں شائع شدہ 'نقضِ غزل' کی مفصّل قسط پر بعض احباب اور بزرگوں کی جانب سے ہمیں خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں بعض تاثراتی نوعیت کے ہیں اور بعض میں جزوی طور پر بعض واقعات کے بارے میں شک اور اختلاف رائے کا اظہار کیا گیا تھا۔ خواہش تو یہ تھی کہ اُن خطوط اور اُن کے جواب میں محترم ڈاکٹر صاحب کی توضیحات کو اسی شمارے میں شامل کیا جاتا لیکن بوجوہ ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ 'میثاق' کے آئندہ پرچے میں ان شاء اللہ العزیز اِن چیزوں کو شاملِ اشاعت کیا جائے گا۔

---

۲۱ اپریل کو مرکزیہ مجلس اقبال کے زیرِ اہتمام حسبِ سابق الحمرا آرٹ کونسل میں یومِ اقبال کے حوالے سے ایک بھرپور تقریب منعقد ہوئی جس میں اس بار بھی پچھلے بعض مواقع کی مانند امیر تنظیم اسلامی کو بطورِ خاص دعوتِ خطاب دی گئی تھی۔ ماہِ رمضان کے دوران دورۂ ترجمۂ قرآن کی شدید مصروفیت کے باعث امیر محترم نے پوری کوشش کی کہ ان کی معذرت قبول کرلی جاتی لیکن منتظمین امیر محترم کی شرکت پر مُصر رہے۔ امیر محترم نے اپنے خطاب میں جہاں فکرِ اقبال کے حوالے سے 'رجوع الی القرآن' کی اہمیت پر زور دیا وہاں ملکی سیاسی صورتِ حال کے تناظر میں مسلم لیگ کے احیاء کی ضرورت کو شدّت سے اجاگر کیا۔ یہ پوری تقریر ہفت روزہ 'ندا' کی ۸ مئی کی اشاعت میں شائع ہوگئی ہے۔ 'میثاق' کے اکثر قارئین چونکہ 'ندا' کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتے ہیں لہٰذا اِس تقریر کا 'میثاق' میں اعادہ ضروری نہیں سمجھا گیا!

پاکستان کا مستقبل
روشن یا تاریک ؟

کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی کا فکر انگیز خطاب

جو انہوں نے ۲۳ مارچ کو یومِ قراردادِ پاکستان کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا، اِن شاءَ العزیز 'میثاق' کی آئندہ اشاعت میں شامل ہوگا۔

تذکرہ و تبصرہ

حالیہ ملکی سیاسی صورتحال کے بعض خوش آئند پہلو اور قومی اتحاد و یگانگت کی واحد مثبت اساس قرآن حکیم

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب عید

ترتیب و تسوید : عاکف سعید

برادرانِ دین!

اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ پچھلے چند ہفتوں کے دوران ہمارے ملکی حالات میں جو بڑی تشویش ناک صورت حال پیدا ہو گئی تھی، پچھلے چند دنوں سے اس میں بہتری کے آثار نمودار ہوئے ہیں۔ میں ان میں سے بعض پہلو آج آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے دو حکم میرے پیش نظر ہیں۔ سورۂ ابراہیم میں فرمایا گیا: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ" کہ اگر تم میرے احسانات کا شکر ادا کرو گے تو میں اور احسانات فرماؤں گا۔ "وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ" اور اگر تم کفرانِ نعمت کرو گے تو جان لو کہ میری سزا بھی بہت شدید ہے۔ اور دوسرا حکم جو میرے پیش نظر ہے وہ سورۃ الضحیٰ کی آخری آیت کے حوالے سے ہے کہ "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کہ اللہ کا جو انعام و احسان کسی بندے پر ہوا ہو، اسے چاہئے کہ اس کا چرچا کرے اور اس کو بیان کرے۔ میرے نزدیک اللہ کے فضل و کرم کے چار پہلو ایسے ہیں کہ جن کے اعتبار سے ہم مسلمانانِ پاکستان کو اللہ کا شکر قلب کی گہرائیوں سے ادا کرنا چاہئے۔

سیاسی کشیدگی میں بہتری کے آثار

قریباً ڈیڑھ سال کی مسلسل کشیدگی اور بیزار کن محاذ آرائی کے بعد اب الحمدللہ کہ ہماری مرکزی حکومت اور بعض صوبائی حکومتوں اور بالخصوص پنجاب کی حکومت میں‘جو ہمارا سب سے بڑا صوبہ بھی ہے‘ کچھ مفاہمت کی فضا نظر آئی ہے- وہ فضا کہ جس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں تھیں‘ مفاہمت کا وہ ماحول جو کہیں نظر نہیں آ رہا تھا اب اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس کے کچھ آثار نظر آنے لگے ہیں- اللہ کرے کہ یہ سراب نہ ہو حقیقت ہو‘ اللہ کرے کہ یہ بھی ایک سیاسی چال نہ ہو بلکہ دلی جذبے کے ساتھ اس کی ضرورت کا احساس ہو گیا ہو‘ اللہ کرے کہ یہ عارضی نہ ہو مستقل ہو۔

سندھ اور کراچی کے حالات : چند خوش آئند پہلو

_______________ اس کے ساتھ ہی اللہ کا دوسرا بڑا فضل و کرم ہم پر یہ ہوا ہے کہ اگرچہ ہمارے بعض سیاست دان تو بار بار یہ خبر بد سناتے رہے کہ فیملی پلاننگ ہونے والی ہے‘ عنقریب جھاڑو پھرنے والی ہے‘ لیکن ظاہر بات ہے کہ اللہ کا فضل و کرم اور اس کی مشیت و حکمت سب سے برتر ہے- حالات واقعی وہی تھے جو وہ سیاست دان بیان کر رہے تھے‘ اندیشہ تھا کہ کسی بھی وقت کوئی ہولناک تصادم اندرونِ سندھ ہو جائے اور بد ترین خانہ جنگی کی فضا مسلط ہو جائے لیکن اللہ کا بڑا فضل ہے اور آپ بھی اس پر اللہ کا شکر ادا کیجئے کہ اندرونِ سندھ کوئی بڑا تصادم نہیں ہوا- جو کچھ اس وقت وہاں ہو رہا ہے وہ تخریب کاری ہے یا ڈاکے ہیں- اور اس نوع کی تخریب کاری اور ڈاکہ زنی سے ملک کا کوئی بھی حصہ محفوظ نہیں ہے- بلکہ اب یہ صورت تو پنجاب میں بھی شدت سے پیدا ہو گئی ہے- سندھ اور کراچی میں جو کچھ ہو رہا ہے‘ یہ تخریب کاری ہے- کوئی دو چار اشخاص گاڑی میں بیٹھے ہوئے آئیں اور فائرنگ کرتے گزر جائیں - یہ جانی حادثہ اور نقصان تو یقیناً ہے‘ لیکن یہ معاملہ قومیتوں کے کھلے تصادم سے بہت مختلف ہے - اللہ کا

فضل ہے کہ اندرونِ سندھ اب وہ فضا نہیں ہے جو پہلے تھی - ڈاکوں اور تخریب کاری کا سلسلہ البتہ جاری ہے - اللہ تعالیٰ ہمیں ان دو مصیبتوں سے بھی نجات دے - (آمین)

کراچی کی صورت حال بھی اللہ کے فضل و کرم سے اب بہتر ہے - ہمیں اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ ساتھ اپنی افواج اور صدر مملکت کا بھی شکر گزار ہونا چاہئے کہ الطاف حسین صاحب کے مرن برت سے وہاں جو انتہائی خوفناک صورت حال پیدا ہو گئی تھی وہ اب کم از کم وقتی طور پر ٹل گئی ہے - میں سمجھتا ہوں کہ فوج کی طرف سے بروقت کارروائی اور فیصلہ کن انداز میں اپنی قوت کا مظاہرہ اس معاملے میں بہت مؤثر رہا - پھر صدر مملکت کے ساتھ ساتھ بعض بزرگ سیاست دانوں نے بھی اس معاملے میں قابل تعریف کردار ادا کیا - نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب ہمارے بزرگوں میں سے ہیں - ان کی مساعی کو اللہ تعالیٰ نے بار آور فرمایا - اور صورت حال کی کشیدگی جو اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی الحمد للہ کہ اب بہت حد تک اعتدال پر آ گئی ہے - اگرچہ ان دنوں کراچی سے آنے والے بعض حضرات نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ شاید یہ صورت حال عارضی ہے اور عید کے بعد ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی والے پھر پر تول رہے ہیں، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اللہ کو خلوصِ دل سے پکاریں، اس سے دعا کریں، جس کسی کے بس میں جو ہو وہ کر گزرے تو تمام معاملات کا اصل اختیار تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کی رحمت سے قوی امید ہے کہ وہ ہماری دست گیری فرمائے گا......... قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا جو انہوں نے خاص طور پر مکہ مکرمہ کے لئے مانگی تھی کہ "رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" میں آج سوچ رہا تھا کہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ ہمیں اس دعا کا ورد کرتے رہنا چاہئے - اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ هٰذِهِ الْبِلَادَ اٰمِنَةً - کہ اے اللہ اس ملک کو امن کا گہوارہ بنا دے - وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ - اور اے اللہ اس کے بسنے والوں کو رزق اور امن دونوں نعمتیں عطا فرما - وَوَفِّقْنَا اَنْ نُّقِيْمَ دِيْنَكَ الْمَتِيْنَ فِيْهَا - اور اے اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم تیرے دینِ متین کو یہاں قائم کر سکیں! ہمیں یہ امن

اس لئے چاہئے اور یہ مہلت ہمیں اس لئے درکار ہے کہ ہم اپنی اس کوتاہی کی تلافی کر سکیں کہ پاکستان کو بنے چوالیس برس ہو چکے ہیں (قمری حساب سے) لیکن یہ اپنے مقصدِ قیام کی طرف پیش قدمی نہیں کر سکا - اس کی ذمہ داری کسی ایک فرد یا جماعت پر ڈالنا درست نہ ہوگا بلکہ ہم سب اس کے مجرم ہیں' ہم سب اللہ کے یہاں جواب دہ ہیں' اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو سب کو اپنا اپنا قصور نظر آئے گا - اللہ تعالیٰ ہمیں مہلت دے کہ ہم توبہ کر سکیں اور اپنی پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کر سکیں - آمین -

کشمیر کے معاملے میں اتفاق رائے ، ایک نیک شگون

تیسرا معاملہ جس پر ہمیں اللہ کا تہ دل سے شکر ادا کرنا چاہئے کشمیر کے حوالے سے ہے کہ یہ وہ واحد قومی و ملی مسئلہ ہے جس پر حکومت اور اپوزیشن میں اتفاق رائے ہوا اور باہم افہام و تفہیم کی مثبت فضا قائم ہوئی - حالانکہ سیاست کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں - حکومت اور اپوزیشن کے درمیان گویا ہر مسئلہ کو' Exploit' کرنے کے لئے ایک مقابلہ جاری رہتا ہے - لیکن اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا اس معاملے میں ہمارے مابین Concensus' رہا ہے - بعض سیاست دانوں نے اپنی تقریروں میں اگرچہ کسی قدر اختلاف کا اظہار کیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی حکومت آزاد کشمیر ہو یا مرکزی حکومت ہو' صوبائی حکومتیں ہوں یا سیاسی جماعتیں ہوں سبھی نے حکومت کی موجودہ پالیسی سے اتفاق کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ یہ صحیح خطوط پر ہے - یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس پالیسی پر جس طرح عمل ہونا چاہئے وہ نہیں ہو رہا ہے - میں خود اسلام آباد میں کشمیر کے مسئلہ پر حکومت کی بریفنگ کے موقع پر یہ کہہ کر آیا تھا کہ ہمارا' Diplomatic Offensive' بھی بہت کمزور ہے - ایسا نہ ہو کہ ہم ابھی اس کو گرم کرنے اور اس رخ پر پیش قدمی کرنے میں ہی کافی وقت لگا دیں اور اُدھر جو لوہا گرم ہے وہ ٹھنڈا ہو جائے - چنانچہ اس معاملے میں یہ اختلاف رائے تو ہو سکتا ہے کہ آیا جتنا کام ہونا چاہئے تھا وہ ہو رہا ہے یا نہیں لیکن یہ کہ جس سمت میں ہونا چاہئے اس پر میرے نزدیک قوم میں کوئی اختلاف نہیں!

سیاست کے رُخ میں ایک خوشگوار تبدیلی کے آثار

چوتھی لائقِ تشکر اور قابلِ اطمینان بات جسے میں ملکی حالات میں ایک اہم پیش رفت قرار دیتا ہوں یہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاست پچھلے ڈیڑھ سال بلکہ اس سے بھی زائد عرصے سے اصولوں کے بجائے صرف دو شہیدوں یا دو شخصیتوں کے گرد گھوم رہی تھی۔ میرا مشاہدہ ہے کہ اس صورت حال میں بہتری کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ اب تک تو انہی دو کے حوالے سے تمام معاملات و مسائل پر بات ہوتی تھی' انہی کو الیکشن مہم میں بنیادی حیثیت دی گئی تھی۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جلیل القدر پیغمبروں کے بارے میں بھی فرمایا ہے اور یہ بات سورۃ البقرہ میں دو مرتبہ آئی ہے کہ "تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ○" "کہ یہ وہ گروہ ہے جو گزر گیا' جو انہوں نے کمایا وہ ان کے اپنے لئے تھا اور تمہارے لئے وہ ہو گا جو تم کماؤ گے اور تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔ پیپلز پارٹی نے آتے ہی بھٹو صاحب کے نام کے ساتھ شہید کا لاحقہ لگا کر جس طرح جذباتی فضا پیدا کی تھی' میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اب انہوں نے بھی اللہ کا شکر ہے کہ اپنی غلطیوں اور ان کے نتائج سے کچھ نہ کچھ سبق حاصل کیا ہے۔ اسی طرح ضیاء الحق صاحب کے نام کے ساتھ جس طرح ایک جذباتی فضا وابستہ کر دی گئی تھی میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی اب بہتری کے آثار ہیں۔ اور کچھ نہ کچھ حقیقت پسندی کا مظاہرہ دونوں جانب سے کیا جانے لگا ہے۔ اور یقیناً ملکی سیاست کے اعتبار سے یہ اچھی علامات ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ سیاست اصولوں اور نظریات کی بنیاد پر چلنی چاہئے۔ میں نے حال ہی میں یومِ اقبال کے موقع پر تقریر کی تھی۔ اس میں سب سے زیادہ قابلِ تشویش بات اسے قرار دیا تھا کہ ہماری سیاست نظریاتی نہیں رہی جذباتی ہو گئی ہے۔ یہ اشخاص کے گرد گھومتی ہے یا مفادات کے بل پر استوار کی جاتی ہے۔ حالانکہ ہونی چاہئے نظریاتی سیاست! اس سیاسی تنزل و انحطاط میں یقیناً ایک طویل مارشل لاء کا بھی عمل دخل تھا جس نے سیاست ہی کو ملک سے ختم کر دیا تھا۔ پھر غیر جماعتی انتخابات نے بھی نظریاتی

سیاست کی کونپل کو مزید مسل کر رکھ دیا - اور اس کے بعد یہ دو "شہیدوں" کی بنیاد پر نہایت بیزار کن سیاست پچھلے ڈیڑھ برس سے چل رہی تھی - لیکن اب الحمد للہ اس میں بہتری کے آثار میں دیکھ رہا ہوں -

جمہوریت بہرصورت آمریت سے بہتر ہے !

یہ چار باتیں جو میں نے گن کر آپ کو بتائی ہیں اب ان پر دو اعتبارات سے میں آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں - پہلی بات یہ کہ ان سے نکلنے والے اس نتیجے کو مستقل طور پر ذہن میں بٹھا لینا چاہئے کہ جمہوریت خواہ کتنی بھی بری ہو وہ آمریت سے بہرحال بہتر ہے خواہ وہ آمریت بظاہر کتنی ہی اچھی ہو! آمر ایک شخص ہوتا ہے' وہ شخص اپنی ذات میں خواہ کتنا ہی اچھا ہو' لیکن اس دور میں وہ جمہوریت کا بدل ہرگز نہیں بن سکتا- یہ ضرور ہے کہ ہمیں پاکستان میں ' اسلامی جمہوریت ' کے لئے کوشش کرنی چاہئے لیکن جمہوریت بہرحال اس دور کا تقاضا ہے، خاص طور پر پاکستان کے مخصوص حالات میں جنہیں نظر انداز کرنا غیر دانش مندانہ فعل ہوگا- یہ ملک ووٹ کے ذریعہ سے قائم ہوا تھا تلوار کے ذریعہ سے قائم نہیں ہوا تھا - پھر اس کے مختلف علاقوں اور ان میں آباد مختلف لسانی قومیتوں کے مابین ان چالیس سالوں کے دوران اس قدر بُعدِ ذہنی واقع ہو چکا ہے کہ اب آمریت اس ملک کے لئے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہے - یہ تو ممکن ہے کہ فتنہ و انتشار اور مخالفانہ آوازوں کو طاقت کے بل پر دبا دیا جائے لیکن یہ تمام خرابیاں اندر ہی اندر کینسر کی طرح پروان چڑھتی ہیں - جبکہ جمہوریت کا معاملہ یہ ہے کہ اس نوع کی گھٹن اور حبس کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ ہر خرابی کھل کر سامنے آجاتی ہے - پھر اس میں لامحالہ "لو اور دو" (Give & Take) کا اصول اپنانا پڑتا ہے - اس ضمن میں قاضی حسین احمد صاحب کا چند روز پہلے کا وہ بیان بہت عمدہ تھا - میں نے تو حسرت سے سوچا کہ کاش وہ پہلے دن ہی سے یہ انداز اختیار کر لیتے - انہوں نے بڑی حقیقت پسندانہ بات فرمائی تھی کہ جو عوام کا مینڈیٹ ہے اس کو تسلیم کیا جانا چاہئے - مرکز میں پیپلز پارٹی کو عوام کا مینڈیٹ ملا ہے ہمیں اس کو ذہناً تسلیم کرنا

چاہئے - پنجاب میں آئی جے آئی کو مینڈیٹ ملا ہے اُن کو چاہئے کہ وہ ہمیں تسلیم کریں! تو واقعہ یہ ہے کہ جمہوریت میں 'Checks and Balances' ہوتے ہیں' احتساب کا معاملہ ہوتا ہے - یہ بھی واقعہ ہے کہ مرکز و پنجاب کی یہ محاذ آرائی جہاں بعض اعتبارات سے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئی ہے وہاں اس میں ایک پہلو خوبی کا بھی ہے - اگر آئی جے آئی کی قوت میدان میں نہ ہوتی تو نہ جانے یہ یک رخا انداز کہاں تک چلا گیا ہوتا! یہ اباحیت پسندی اور یہ خالص سیکولرانہ سوچ نہ جانے کیا کیا گل کھلاتی! پھر وہ میوزک ۸۹ نہ معلوم ۹۰ء اور ۹۱ء میں کن کن لعنتوں کی شکل میں ظہور کرتا - یقیناً اس محاذ آرائی میں تشویش کا ایک بڑا پہلو بھی تھا لیکن یہ بات واضح ہو گئی کہ جمہوریت میں منقسم اختیار (Divided Mendate بھی بحالاتِ موجودہ افادیت سے بالکل خالی نہیں ہوتا ! -

صحت مند سیاسی فضا کے لیے دو مضبوط سیاسی جماعتیں ناگزیر ہیں!

لیکن اس معاملے میں آئندہ کے اعتبار سے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اِس وقت سیاسی سطح پر تنقید و احتساب اور کھینچ تان کا جو معاملہ ہے وہ عمودی تقسیم (Vertical Polarisation) کے تحت ہو رہا ہے - مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان محاذ آرائی اور تصادم اول روز سے جاری ہے - حالانکہ سیاسی رسہ کشی افقی (Horizontal) بنیادوں پر ہونی چاہئے - تبھی ملک میں صحت مند سیاسی فضا کی توقع کی جا سکے گی - ہمارے موجودہ جمہوری نظام کا تقاضا بھی یہ ہے کہ دو مضبوط پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابل ہونی چاہئیں اور اُن کی آپس کی سیاست اصولوں' نظریات اور منشور کی بنیاد پر ہونی چاہئے - یہ اگر نہیں ہوگا تو ہم قومی سیاسی زندگی کے اس منحوس چکر (Vicious Circle) سے نجات حاصل نہ کر سکیں گے جس کی لپیٹ میں ہم پچھلے چالیس سال سے آئے ہوئے ہیں - ہر ہوشمند انسان یہ جانتا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کے تجربے کی ایک بار پھر ناکامی ملک و ملت کے اعتبار سے اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہو سکتا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ہمیں [illegible]

مسلم لیگ کا احیاء : وقت کی اہم ضرورت

میں نے اس بار یوم اقبال کی اپنی تقریر میں بھی جس کی بہت مختصر سی رپورٹنگ اخبار میں آئی تھی' یہ عرض کیا تھا اور یہ بات اس سے پہلے بھی میں بار بار مختلف مواقع پر عرض کرتا رہا ہوں کہ اصل ضرورت مسلم لیگ کو منظم کرنے اور نظریاتی سطح پر اس کے احیاء کی ہے - دو قومی نظریئے کی بنیاد پر عوامی سطح پر اس جماعت کی تنظیم نو وقت کی اہم ضرورت ہے - یہ درحقیقت ہمارے ملک کے بقا اور اس میں جمہوریت کے بقاء کا سوال ہے - اللہ تعالیٰ ان قدیم مسلم لیگیوں کو ہمت دے جو کچھ لوگوں کو جمع کر سکتے ہوں اور مسلم لیگ کی تنظیم نو کر سکتے ہوں کہ وہ اس اہم کام پر کمربستہ ہو جائیں - میں تو یہاں تک کہتا رہا ہوں کہ اگر ایک وقت میں ایک آمر کے اشارے پر ایک کنونشن لیگ وجود میں آ سکتی تھی تو اس وقت قومی و ملکی تقاضے کے تحت ایسا کیوں نہیں ہو سکتا! مختلف قیادتوں نے مسلم لیگ کو آپس میں بانٹ رکھا ہے - کوئی کسی کی جیب میں ہے اور کوئی کسی کی جیب میں!

ع "چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری" کا سا نقشہ ہے - میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ضرورت ہے کہ پھر کوئی کنونشن ہو جو کہ لیگی ذہن کے لوگوں کو اور مخلص کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرے - اللہ کرے کہ کوئی باہمت شخص اس کا بیڑا اٹھائے!

مفاہمت کی موجودہ فضا ایک منفی بنیاد پر استوار ہے!

دوسری بات جو ہمارے لئے قابل غور ہے' ہمارے موجودہ اتحاد کے بارے میں ہے- برا نہ مانیئے گا' میں ایک تلخ حقیقت آپ کے سامنے رکھنا چاہ رہا ہوں کہ یہ جو وقتی سی مفاہمت کی فضا قائم ہوئی ہے اور قوم کسی حد تک متحد نظر آ رہی ہے' یہ اتحاد مثبت اساسات پر نہیں ایک منفی اساس پر ہے! اتحاد بہرحال اپنی جگہ پر باعثِ برکت ہوتا ہے چاہے منفی بنیادوں پر ہو - لیکن جس طرح تحریک پاکستان کے موقع پر مسلمانانِ ہند کا اتحاد مثبت بنیادوں پر نہیں تھا' ہندو کا خوف تھا جس نے ہمیں جمع کر دیا تھا - ایک بڑی اور منظم قوم

سے ہمارا سابقہ تھا جو تعلیم ' سرمایہ اور تنظیم میں ہم سے بہت آگے تھی ' ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمارا قومی تشخص ختم کر دے گی - ہماری زبان اور کلچر کو مٹا دے گی! اس خوف نے ہمیں جمع کیا تھا ' لیکن اس کے بعد چوالیس سال ہو چکے ہیں افسوس کہ ہم نے اس منفی بنیاد کو کسی مثبت جذبے کا رخ نہیں دیا! اب پھر ہماری صفوں میں جو تھوڑا بہت اتحاد نظر آ رہا ہے تو پھر شکریہ ادا کیجئے اسی ہندو قوم کا کہ یہ اس کے طرز عمل کا نتیجہ ہے - اس نے کشمیر میں مسلمانوں پر جس طرح مظالم کی انتہا کی ہے اور ہمارے قومی وجود کے لئے جو شدید خطرہ کھڑا کر دیا ہے ' یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ہمیں جمع کیا ہے! میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ اتحاد اپنی جگہ مبارک ہے - وہ اتحاد کہ جس نے ہمیں پاکستان لے دیا تھا اگرچہ وہ بھی مثبت نہیں تھا منفی تھا ' لیکن اس کے ذریعے بھی تاریخ کا ایک عظیم معجزہ رونما ہوا تھا - آج بھی بھارت کے خوف نے ہمیں اکٹھا کر دیا ہے - اس پر بھی ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے - لیکن ہمارے لئے اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ اس اتحاد کو مثبت بنیادوں پر استوار کریں!

اتحاد و مفاہمت کی واحد مثبت اساس : قرآن حکیم

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انسانی اتحاد کی مثبت بنیادیں کیا ہوتی ہیں؟ انسانی اتحاد کی بنیادیں ہوتی ہیں نظریاتی ہم آہنگی اور مقاصد کا اشتراک! حیوانوں اور انسانوں میں نمایاں فرق یہی ہے - گایوں ' بھینسوں یا بکریوں اور بھیڑوں کے ایک بڑے گلّے کو صرف ایک آدمی جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہو ' آسانی سے کنٹرول کر سکتا ہے - لیکن انسانوں کا معاملہ مختلف ہے - یہ حیوانِ عاقل ہے - اس کے نظریات ہوتے ہیں ' اس کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں جن کے تحت وہ زندگی بسر کرتا ہے - نظریات کی ہم آہنگی اور مقاصد کا اشتراک ہی بنیاد بنتا ہے مثبت اتحاد کی - اور یہ وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید نے ہمیں فراہم کر دی ہے - اس بات کو علامہ اقبال نے کس قدر عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے -

از یک آئینی مسلماں زندہ است   پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاکیم و دل آگاہ اوست   اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

میں نے اس بار یومِ اقبال کی تقریر میں یہ اشعار بھی سنائے تھے- بلاشبہ اس دور میں قرآن مجید کی عظمت کی سب سے بڑی علامت علامہ اقبال ہیں - اس دور میں قرآن کی طرف بلانے والی سب سے بڑی شخصیت انہی کی ہے - اس دور کی علمی و فکری سطح پر قرآن کی حکمت کو بیان کرنے والے علامہ اقبال ہی ہیں' لیکن افسوس کہ ہم محض ان کے مجاور بن کر رہ گئے ہیں - سال بہ سال بلکہ سال میں دو مرتبہ ہم ان کی برسی منا لیتے ہیں' کبھی یومِ پیدائش کی' کبھی یوم وفات کی - اصل ضرورت تو یہ ہے کہ ان کے پیغام کو لے کر کھڑے ہوں - اور وہ پیغام کیا ہے قرآن کی طرف آؤ' چلو قرآن کی طرف! ع "قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!" تمہارا قومی و ملی استحکام اسی سے وابستہ ہے - یہی 'حبل اللہ' ہے - یہی وہ قوت ہے جو تمہیں ایک دوسرے سے جوڑے گی اور یہی ہے جو تمہیں دنیا کے اندر دوبارہ سربلندی عطا فرمائے گی - پانچویں جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے جب میں نے بانگِ درا پڑھی تھی تو علامہ اقبال کے دو اشعار میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئے تھے - ایک 'شکوہ' کا شعر تھا' علامہ کی مشہور نظموں میں سے ہے -

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے !

بندۂ مسلم یا بندۂ مومن کی زندگی کا مقصد اس جامِ ہدایت کو گردش میں لانا ہے جو اللہ نے قرآن حکیم کی شکل میں عطا کیا ہے - اس نور سے چار دانگ عالم کو منور کرنا مسلمان کا فریضہ ہے - دوسرا شعر' جوابِ شکوہ' کا ہے -

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

یہی شعر تھے جو بالکل بچپن ہی میں ذہن میں اٹک گئے تھے - خدا کا شکر ہے کہ اس نے 'رجوع الی القرآن' کی اس دعوت کو آگے بڑھانے کی سعادت سے بہرہ مند فرمایا - حال ہی میں رجوع الی القرآن کی اس تحریک کے منظر و پس منظر کو ہم نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے -

گزشتہ پچیس برس میں اس ضمن میں جو کام اللہ کے فضل و کرم سے ہم سے ہو سکا اس کا خلاصہ اس میں بیان کر دیا ہے- تاکہ یہ ہینڈ بک بن جائے آئندہ کے لئے!

قرآن کالج - دعوت رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگِ میل

اس وقت مجھے آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ میٹرک کے امتحان کا نتیجہ اب نکلنے والا ہے- ہم نے قرآن کالج بنایا- کیوں بنایا کہ کچھ نوجوان ایسے ہوں جو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کو اپنا مشن بنالیں- بلکہ ابتداءً تو ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ والدین ایسے ہوں جو اپنی اولاد کو وقف کرنے کے لئے تیار ہوں- اور وہ بات نہیں ہونی چاہئے کہ جس کی طرف سورۃ البقرہ میں ' انفاق فی سبیل اللہ ' کی بحث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ تم اللہ کے نام پر مال نکالو جو بالکل ردّی ہو اور از کار رفتہ ہونے کے باعث تمہارے دل سے اتر گیا ہو- ہمارا عام دستور بھی یہی ہے کہ اُس بچے کو خدمتِ دین یا تعلیمِ دین کے لئے وقف کرتے ہیں جو اور کسی کام کا نہ ہو' جو ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے سب بچوں میں کمتر ہو- ہمارے زوال کے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ دین اور دینی تعلیم کو ہم نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے- جب تک اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کے چشم و چراغ اور با صلاحیت نوجوان اس کام میں نہیں لگیں گے حالات کے رخ میں کوئی دیرپا اور مثبت تبدیلی نہیں آئے گی- میں پچھلے ۲۵ برس سے اس شہر لاہور میں دعوتِ قرآنی کا فریضہ انجام دے رہا ہوں- اس مسجد (دارالسّلام) میں خدمت انجام دیتے اب چودھواں برس ہونے کو آیا ہے- آپ سب اس پر گواہ ہیں کہ میں نے یہاں کبھی آپ سے چندے کی اپیل نہیں کی- کبھی کوئی پیسہ نہیں مانگا' کبھی آنے جانے کا کوئی خرچ بھی طلب نہیں کیا- الحمد للہ کہ یہ سب خدمت اللہ کے لئے ہے- لیکن اب میں آپ سے 'چندہ' مانگ رہا ہوں کہ آپ اپنی اولاد میں سے وہ بچہ اللہ کے دین اور تعلیمِ قرآن کے لئے وقف کیجئے جو بہترین صلاحیتوں کا مالک ہو- تاکہ ایسے بچوں کو ہم دین سکھائیں' قرآن پڑھائیں' ساتھ ساتھ ایف اے اور بی اے کی نصابی تعلیم کا اہتمام بھی کریں- انہیں فلسفہ' معاشیات اور

سیاسیات پڑھائیں - ہمیں ایسے بچے تیار نہیں کرنے جو صرف دین کے ذریعہ روٹی کمانے والے ہوں' ہمیں ایسے دیندار اور صاحبِ فہم نوجوان تیار کرنے ہیں جو اپنے لئے کسی باوقار پروفیشن کا انتخاب کریں' خواہ وہ قانون کے شعبے کو اختیار کریں' خواہ Competition کی لائن کو اپنے لئے منتخب کریں اور خواہ Teaching Profession کا انتخاب کریں اور کسی کالج یا یونیورسٹی میں تدریسی شعبے سے منسلک ہو جائیں - میں پہلے بھی کسی موقع پر آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہندوؤں نے ایک زمانے میں سروِنٹس آف انڈیا سوسائٹی (Servants of India Society) کے نام سے ایک ادارہ بنایا تھا اور اس کا اصول یہ بنایا تھا کہ ان میں صرف وہ شامل ہوں گے جو (۱) کبھی سرکاری ملازمت نہیں کریں گے - ذہن میں رکھئے وہ انگریز کا دور تھا! (۲) صرف قومی اداروں میں ملازمت کریں گے اور پروفیشن بھی صرف معلمی (Teaching) کا اختیار کریں گے - اور (۳) یہ کہ ساری عمر پچھتر روپے سے زائد تنخواہ نہیں لیں گے - یہ ہندو قوم کی عظمت کی دلیل ہے کہ سینکڑوں لوگ اس سوسائٹی سے وابستہ ہوئے اور انہوں نے تمام عمر ان اصولوں کی پابندی کی -

اسی لاہور شہر میں ایک زمانے میں دیال سنگھ کالج کے پرنسپل اور ان کی بیوی دونوں سروِنٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر تھے - غور کیجئے کہ دیال سنگھ کالج کے پرنسپل اور ان کی تنخواہ ۷۵ روپے ماہوار! ان کا ڈرائنگ روم اتنا سادہ تھا کہ اطراف میں دو چٹائیاں ہوتی تھیں اور درمیان میں منیموں والا ڈیسک - بڑے سے بڑا ملاقاتی بھی وہیں آتا اور ان کی سادگی سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہتا - حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں نے قومی تعمیر کے لئے بہت کام کیا تھا -

امریکہ میں عیسائیوں کے ایک فرقے مورمنز (Mormans) کے بارے میں بھی اس سے قبل میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ انہوں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ان کا جو بچہ ہائی اسکول تک تعلیم مکمل کرلے گا' واضح رہے کہ ان کا ہائی اسکول بارہ برس کا ہوتا ہے' پھر اس کے دو برس محض دین کے لئے اور دینی تعلیم کے لئے مخصوص رہیں گے - ایک سال ان کی

تعلیم ہوگی اور دوسرے سال میدان میں جا کر کام کریں گے - دو سال دین کے لئے لگانے کے بعد ان کے لئے موقع ہو گا کہ وہ اپنے کسی دنیاوی کیریر میں پیش رفت کر سکیں - لیکن آج ہم اللہ کے نام لیوا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا کس حال میں ہیں؟ اور مجھے زیادہ صدمہ ہوتا ہے ان لوگوں کے حال پر جو برس ہا برس سے میرے دروسِ قرآن میں شریک ہو رہے ہیں ' رجوع الی القرآن کے کام میں اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق میرے ساتھ تعاون بھی کرتے ہیں لیکن جب بچوں کو کالج میں داخل کرانے کا مرحلہ آتا ہے تو ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ ان کے لئے گویا محمدؐ رسول اللہ صلیّ اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کوئی وزن نہیں رکھتا کہ "خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ" - تم میں بہترین وہ ہے جو قرآن پڑھے اور پڑھائے - ہمارا حال یہ ہے کہ ہر ڈاکٹر یہ چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی ڈاکٹر بنے اور انجینئر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا انجینئر ہونا چاہئے - خدا کے لئے سوچئے' اس ملک کے لئے ضرورت ہے' دین کے لئے ضرورت ہے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی عاقبت کے اعتبار سے یہ انتہائی نفع بخش سودا ہے کہ آپ اپنے بچے کے لئے اس کیریر کا انتخاب کریں جسے نبی اکرمؐ نے بہترین قرار دیا ہے - کیا عجب کہ یہ بچہ آپ کی آخرت کے لئے توشہ بن جائے - اگر آپ کے بچے دین کے لئے کام کریں گے تو جب تک ان کے اس نیک کام کے اثرات دنیا میں رہیں گے' آپ کا کھاتہ اللہ کے یہاں کھلا رہے گا - اور اس میں نیکیوں کا اندراج ہوتا رہے گا - ابھی چونکہ وقت ہے کہ آپ خود کو اور بچے کو اس مبارک کام کے لئے ذہناً آمادہ کر سکتے ہیں لہٰذا آپ کو یاددہانی کرا دی ہے - یہ بات جان لیجئے کہ میرا کسی کے ساتھ اصل تعلق چاہے قریبی رشتہ دار ہوں' دین کے حوالہ سے ہے - مجھے تو اُسی سے پیار ہے کہ جو دین کے لئے کام کرنے کو تیار ہے - میرا روئے سخن اپنے ساتھیوں کی جانب بھی ہے اور بالخصوص اپنے اعزّہ و اقارب کی جانب ہے کہ اس جانب توجّہ دیں اور اپنے بچوں کو اس کام کے لئے تیار کریں -

---

کشمیر کا مسئلہ۔ ایک نئی داستانِ عزیمت اور وقتِ دعا

آخری بات مجھے کشمیر کے مسئلے کے بارے میں عرض کرنی ہے کہ اللہ کے فضل کرم سے ہمارے کشمیری بھائیوں نے ہمت دکھائی ہے' انہوں نے قربانیاں دی ہیں۔ انہوں نے تاریخِ حریت کا ایک نیا باب اپنے خون سے رقم کیا ہے۔ یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ انشاء اللہ۔ میں نے یوم اقبال کی تقریر میں بھی علامہ کا یہ شعر پڑھا تھا۔ جب ترکوں پر مظالم ہو رہے تھے تو علامہ نے یہ شعر کہا تھا۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

آج اس شعر میں اگر 'عثمانیوں' کی جگہ 'کشمیریوں' کا لفظ لکھ دیا جائے تو بات غلط نہ ہوگی۔

اگر کشمیریوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

کیا عجب کہ کشمیر کا گہوارہ ہی اسلام کا گہوارہ بن جائے۔ لیکن افسوس صرف یہ ہے کہ وہاں بھی کوئی ایک نظم (Discipline) نہیں ہے بلکہ مختلف گروپ اپنے اپنے انداز میں اس تحریک کے لئے کام کر رہے ہیں۔ یقیناً بعض گروپ ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے صرف اسلام ہی کے لئے کام کیا ہے' جنہوں نے بے حیائی کے اڈے وہاں بند کرا دیئے اور جو کام ہم سے اب تک نہیں ہو سکا وہ انہوں نے وہاں کروا لئے۔ مجھ سے ایک کشمیری مسلمان نے کہا کہ آپ لوگ یہاں جو کام چالیس برس میں نہیں کر سکے وہاں چند نوجوانوں نے چند دنوں میں کروا لیا۔ میں اس کے جواب میں سوائے اپنی نگاہیں زمین میں گاڑنے کے اور کچھ نہ کر سکا! لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کچھ گروپ ایسے بھی ہیں کہ جو بیرونی اشاروں پر حرکت کر رہے ہیں۔ اور وہ ایسے کام بھی کر رہے ہیں جو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے درست نہیں۔ وہاں کے وائس چانسلر کو جس طریقے سے قتل کیا گیا' میں نے اپنے ایک خطاب میں اس پر تشویش کا اظہار کیا تھا تو اس پر بعض حضرات کو شکایت ہوئی تھی۔ 'نوائے وقت' کے 'سرِ

راہ ' کے کالم نویس نے بھی بڑے شائستہ انداز میں گرفت کی تھی۔ لیکن کل کے 'نوائے وقت' میں آپ نے دیکھ لیا ہوگا انہوں نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ کسی واقفِ حال نے انہیں بتلایا ہے کہ اس قسم کی حرکتیں ایک ایسا گروپ کر رہا ہے جو کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق نہیں چاہتا۔ وہ کچھ کمیونسٹ نظریات کے لوگ ہیں اور یہ سارے ہتھکنڈے بھی کمیونسٹ حضرات کے ہیں۔ کل (۲۶ر اپریل) کے نوائے وقت کا سرِ راہ' پڑھ لیجئے' حقیقت آپ کے سامنے واضح ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ کشمیریوں کو ہمت دے اور انہیں یکجا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ کرے کہ وہ سب ایک قیادت کے تحت کام کریں اور اپنی اس جدّوجہد میں صرف وہی طریقے اختیار کریں جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھلائے ہیں۔ ہم اغیار کے نقشِ قدم کی پیروی کیوں کریں! ہمارے لئے اسوۂ کاملہ ہیں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ انہوں نے بیس برس کے اندر اندر ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ ہم سیرت کا مطالعہ کریں اور اس سے اپنے نشاناتِ راہ کا تعین کریں۔ میری کتاب "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کا مطالعہ بھی کیجئے اور پھر کچھ مثبت کام کا فیصلہ کیجئے!

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

بقیہ: 'نظام العمل'

اداروں پر بھی ہو گا ——— البتہ سماجی تنظیموں اور اداروں' یا پیشہ ورانہ اور محکمانہ یونینوں (Trade Unions) کے ضمن میں خاص حالات میں نرمی برتی جا سکتی ہے۔ تاہم ان کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے بھی تنظیم کی اجازت ضروری ہو گی۔

■■

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت

علماء و صلحاء کے کرنے کا اصل کام

اور عذابِ الٰہی سے نجات کی واحد راہ

امیرِ تنظیم اسلامی کے فکر انگیز خطاب کی دوسری اور آخری قسط

ـــــ ترتیب و تسوید : حافظ خالد محمود خضر ـــــ

اب تک میں نے دو باتیں عرض کی ہیں ـــــ ایک یہ کہ امتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس کے لیے قرآن حکیم کی اصطلاحات دو ہیں: شہادت علی الناس اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دوسری یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اب ہم تیسری بحث کی طرف آتے ہیں کہ ان دونوں میں اہم تر نہی عن المنکر ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے متعدد اضافی مقامات ایسے ہیں جہاں صرف نہی عن المنکر کا بیان ہے۔ ہمارے اصولِ فقہ میں بھی یہ اصول ہے کہ 'نہی' بہ نسبت 'امر' کے زیادہ زوردار اور مؤثر ہے۔ مثال کے طور پر دو حدیثوں کو لیجیے۔ ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ تم میں سے جب بھی کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت 'تحیۃ المسجد' ادا کرے[1]۔ دوسری حدیث میں یہ ہے کہ عصر کی نماز کے بعد سورج غروب ہونے تک کوئی نماز نہیں ہے[2]۔ اب اگر کوئی شخص عصر کے بعد مسجد میں آئے تو وہ کیا کرے؟ ہمارے فقہاء اس مسئلے میں نہی کو امر کی نسبت مقدم سمجھتے ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص عصر کے بعد غروبِ آفتاب سے پہلے مسجد میں آتا ہے تو وہ تحیۃ المسجد ادا نہیں کرے گا۔

---

[1] اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يَجْلِسَ (متفق علیہ : عن ابی قتادۃ)

[2] لَا صَلٰوةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغِيْبَ الشَّمْسُ (متفق علیہ، عن ابی سعید الخدری)

قرآن و حدیث کی رُو سے خاص طور پر علماء اور صوفیاء کے کرنے کا اصل کام یہی نہی عن المنکر ہے اور عذابِ الٰہی سے نجات کی واحد راہ بھی یہی ہے۔ اس کے ضمن میں ہم قرآنِ حکیم کی چند آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین احادیث کا مطالعہ کریں گے۔

قرآن حکیم میں اہلِ کتاب کے جو حالات وارد ہوئے ہیں اُن کی حیثیت درحقیقت ایک آئینے کی سی ہے جو مسلمانوں کو دکھایا جا رہا ہے۔ میری تقاریر اور مضامین میں بنی اسرائیل کے بارے میں بارہا اس حدیث کا حوالہ آیا ہے کہ حضورؐ نے خبر دی تھی کہ میری امت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔ میری امت میں بھی وہ ساری خرابیاں پیدا ہوں گی جو اُن میں پیدا ہوئی تھیں، یہاں تک کہ اگر اُن میں کوئی بدبخت ایسا اٹھا تھا جس نے اپنی ماں سے علی الاعلان زنا کیا ہو تو میری امت میں سے بھی کوئی نہ کوئی ایسا پیدا ہو گا جو یہ حرکتِ شنیع کرے گا[۱]۔ اسی کے حوالے سے قرآن حکیم نے بنی اسرائیل پر جو تنقید کی ہے اس کو پڑھیے۔

علماءِ یہود پر قرآن کی تنقید

سورۃ المائدہ کی آیات ۶۲-۶۳ میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے آیا ہے:

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

---

[۱] لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ، حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَيَكُوْنَنَّ فِىْ اُمَّتِىْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ۔ (رواہ الترمذی عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما)

"اور تم دیکھو گے ان میں سے ایک کثیر تعداد کو کہ تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں گناہ کے کاموں میں اور ظلم و زیادتی میں اور حرام خوری میں۔ بہت بُرے کام ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ کیوں نہیں منع کرتے انہیں ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے۔ بہت ہی بُرے عمل ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔"

یعنی اگرچہ کہنے کو یہ لوگ اللہ کے نام لیوا ہیں، موسیٰؑ کے امتی ہیں، تورات کے ماننے والے ہیں، سینکڑوں نبیوں پر ایمان کے دعویدار ہیں، ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں — لیکن عملاً ان کا حال یہ ہے کہ بجائے نیکیوں میں پیشقدمی کرنے کے، تین بُرے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔(۱) الْإِثْم: گناہ کا کام، فرائض میں کوتاہی کا ارتکاب، حق تلفی اور لوگوں کے حقوق کو غصب کرنے اور سلب کرنے کا کام — (۲) وَالْعُدْوَان: اور ظلم و زیادتی، تعدی (۳) وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ: اور ان کی حرام خوری۔ اس حرام خوری کے مختلف انداز تھے۔ سود بھی تھا، جوا بھی تھا۔ اور یہی دوڑ آپ کو اپنے ہاں بھی نظر آجائے گی۔ آپ کے اس ملک میں جتنے بڑے پیمانے پر جوا گزشتہ دنوں ہوا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ سیور ریفل کی شکل میں کروڑوں بلکہ اربوں روپے کا جوا کھیلا گیا۔ اور آپ کی وزیر اعظم نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں تو وزیر خزانہ سے کہنے والی ہوں کہ باقی ٹیکس وغیرہ سب کو چھوڑیں اور ریلاٹری کا دھندا شروع کریں۔ اس میں جو رقم اکٹھی ہوتی ہے ہم نے کسی اور کام میں نہیں دیکھی۔ انعامات کی امید پر جو لاکھوں افراد جوئے کے مرتکب ہوئے ہیں، یہ کون لوگ تھے؟ یہ آسمان سے اُترنے والی کوئی دوسری مخلوق نہیں تھی۔ یہ کوئی ہندو نہیں تھے، یہودی نہیں تھے، بلکہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام لیوا تھے۔

آگے فرمایا: لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ "کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے صوفیاء اور ان کے علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے"۔ ربانی کہتے ہیں اللہ والے کو، 'رَبّ' سے ربانی بنا ہے یعنی درویش، فقراء، صوفیاء اور صلحاء وغیرہ۔ 'احبار' جمع ہے 'حبر' کی۔ حبر کہتے ہیں بہت بڑے عالم کو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو 'حبر الامۃ' کہا جاتا ہے۔ ان کے لیے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی دُعا فرمائی تھی کہ اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْل یعنی اے اللہ اسے دین کا تفقہ عطا فرما اور قرآن حکیم کے اصل مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت عطا فرما۔ حضورؐ کی دعا کی برکت سے وہ امت کے سب سے بڑے عالم ہو گئے تو ظاہر بات ہے کہ جس طرح ہماری امت میں بڑے بڑے عالم اور صوفیاء ہیں، ایسے ہی بنی اسرائیل میں بڑے بڑے عالم اور فقیہہ بھی ہوتے تھے اور صوفیاء اور درویش بھی۔ تو فرمایا کہ ان کے کرنے کا کام تو یہ تھا کہ وہ لوگوں کو گناہ کی بات کہنے اور حرام خوری سے روکتے، لیکن فی الحقیقت وہ کیا کام کر رہے ہیں ؟ انہوں نے اپنے فرضِ منصبی کو ترک کر دیا ہے۔ وہ لوگوں کو بُرائی سے روکتے نہیں ——— اور روکیں بھی کیسے ؟ حرام خوری سے روکیں گے تو لوگ ان کی طرف رجوع نہیں کریں گے، کسی دوسرے کی طرف کر لیں گے۔ میں آپ کو ایک حقیقی واقعہ بتاتا ہوں کہ ایک صاحب نے خود مجھ سے کہا کہ میں آئندہ آپ کے ہاں جمعہ پڑھنے نہیں آؤں گا۔ میں نے پوچھا: کیوں کہنے لگے کہ آپ ہمیں ہر چند جمعوں کے بعد وہ سُود کی شناعت والی حدیث سنا دیتے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ سُود کے بغیر تو ہمارا کاروبار چلتا نہیں۔ اب ایسی حدیثیں سننے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم لوگ وہ کام کر رہے ہیں جسے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے ساتھ بدکاری سے بھی ستر گنا بڑا گناہ بتایا ہے۔ آپ ہمیں ایسی حدیثیں سناتے رہتے ہیں، چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ آپ کے ہاں نہیں آؤں گا۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میرا کام تو سنانا ہے، پہنچانا ہے، سمجھانا ہے۔ سننا چاہو تو سنو! آج نہیں تو شاید اللہ تعالیٰ کل توفیق عطا فرما دیں لیکن اگر سننا نہیں چاہتے تو میں زبردستی تو نہیں کر سکتا۔ اب وہ علماء جن کی مجبوری یہ ہے کہ اُن کا معاش کا معاملہ وہیں سے ہے، جن کی تنخواہیں انہی سُود خور سرمایہ داروں کی طرف سے آ رہی ہیں وہ انہیں کیسے کہیں کہ حرام خوری ترک کر دو۔ اکثر و بیشتر وہی چودھری اور سرمایہ دار مساجد کے منتظم اور مہتمم ہیں۔ وہی تو ہیں جو یہاں بہترین قالین لا کر بچھاتے ہیں۔ اب اُن کے کاروبار میں حرام ہے تو انہیں کون

ل؎ اَلرِّبٰو سَبْعُوْنَ جُزْءً اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ

(رواہ ابن ماجہ والبیہقی فی شعب الایمان : عن ابی ہریرہ)

روکے! اِلاّ ماشاء اللہ۔ اس معاشرے میں کچھ سعید روحیں بھی ہیں جن کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک قلیل تعداد امین اور دیانتدار تاجروں اور کاروباری حضرات کی بھی یقیناً موجود ہے اور معدودے چند علماء بھی ایسے ہیں جو کسی ملامت کے خوف کے بغیر نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں لیکن معاشرے میں ایسے لوگوں کا وجود آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ جب معاشرے سے نہی عن المنکر ختم ہو جاتا ہے تو پھر تباہی و بربادی عام ہو جاتی ہے۔ آج اس مضمون کو اچھی طرح سمجھئے قرآن کہتا ہے کہ "کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے صوفیاء اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے"۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ: "بہت برا ہے وہ عمل جو انہوں نے اختیار کر رکھا"

سورۃ المائدہ میں آگے چل کر اسی کے ہم مضمون چار آیات مزید آئی ہیں:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

"بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسٰی ابن مریم (علیہما السلام) کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور (حدودِ الٰہی سے) تجاوز کرتے تھے۔ (اور ان کا اصل جرم یہ تھا کہ) وہ ایک دوسرے کو شدت کے ساتھ منع نہیں کرتے تھے ان برائیوں سے جو وہ کرتے تھے۔ بہت ہی برا طرزِ عمل ہے جس پر وہ کاربند تھے۔ تم دیکھو گے ان میں سے بہت سوں کو کہ دوستی رکھتے ہیں کافروں سے۔ کیا ہی برا سامان انہوں نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے کہ اللہ کا غضب ہوا ان پر اور عذاب میں وہ ہمیشہ ہمیش رہنے والے ہیں۔

اور اگر وہ (واقعۃً) ایمان رکھتے ہوتے اللہ پر اور نبیؐ پر اور اس شے پر جو اُس پر نازل کی
گئی تو وہ کافروں کو اپنا دوست نہ بناتے لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) ان میں سے اکثر
نافرمان ہیں۔"

یہاں اُن لوگوں کا تذکرہ ہے جو اگرچہ بنی اسرائیل میں سے تھے، موسیٰ علیہ السلام کے
اُمتی تھے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے لاڈلے اور چہیتے ہونے کا دعویٰ بھی تھا، لیکن اُن کی روش
گناہ و معصیت اور حرام خوری کی تھی۔ چنانچہ ان پر انبیاء کی زبان سے لعنت فرمائی گئی۔ حضرت
داؤدؑ کی زبانی ان پر کیا کیا لعنتیں ہوئیں، ان کے الفاظ آج ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ اس وقت
جو بھی 'زبور' موجود ہے جسے 'PSALMS' کہا جاتا ہے اور جو عہد نامہ قدیم (OLD TESTAMENT)
کا حصہ ہے اس میں ایسی باتیں موجود نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر حضرت داؤدؑ
کی زبان سے جو تنقید کی باتیں کہلوائی تھیں، انہیں یہود نے زبور کے صفحات سے کھرچ دیا ہے
لیکن اللہ کا بڑا شکر ہے کہ ایسی باتیں اناجیل میں اب بھی موجود ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے
خاص طور پر علمائے یہود پر بہت تنقیدیں کی ہیں۔ انہیں سانپ کے سنپولیوں سے تعبیر کیا ہے،
فرمایا: "تم سانپ کے سنپولیوں کے مانند ہو۔ تمہارا حال یہ ہے کہ تم نے اپنے اُوپر تقویٰ کا لبادہ
اوڑھا ہوا ہے اور اندر سے تمہارا کردار انتہائی گھناؤنا ہے۔" علمائے یہود کو مخاطب کر کے حضرت مسیحؑ
نے یہ الفاظ بھی فرمائے: "تمہارا حال اُن قبروں کے مشابہ ہے جنہیں اُوپر سے تو سفیدی کی گئی ہے
اور بڑی خوشنما نظر آرہی ہیں لیکن اُن کے اندر گلی سڑی ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔" اور یہ بہترین
ضرب المثل بھی حضرت مسیحؑ ہی کی ہے جو ہمارے ہاں عام طور پر ادب میں استعمال ہوتی ہے
کہ "تم مچھر چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو۔" ہمارا حال بھی یہی ہے کہ چھوٹی چھوٹی
باتوں پر جھگڑے ہو رہے ہیں لیکن بڑے بڑے گناہوں کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں۔ سُود خوری
پر کوئی نہیں رو کے گا لیکن رفع یدین، آمین بالجہر اور تراویح کی تعداد پر بڑے بڑے پوسٹر بھی چھپیں
گے، بڑے چیلنج بھی ہوں گے، لمبی چوڑی بحثیں اور مناظرے بھی ہوں گے اور پوری پوری
کانفرنسیں بھی ہوں گی۔ حالانکہ دین میں ان کی اہمیت بالکل جزوی اور ثانوی ہے۔ دوسری
طرف سُود کا عین دین ہو رہا ہے، جوا اور سٹہ سب کچھ چل رہا ہے، لیکن کسی کو کچھ کہنے کی توفیق

نہیں۔ اصل میں یہی وہ بات ہے جس کی بنا پر بنی اسرائیل پر لعنت کی گئی۔ آگے فرمایا:
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ "یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور حدودِ الٰہی سے تجاوز کی روش اختیار کی"۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر رحمت فرماتا ہے تو وہ بھی اس کے اعمال کی مناسبت سے' اور اگر اللہ کی طرف سے لعنت ہوتی ہے تو وہ بھی یونہی نہیں ہو جاتی، بلکہ لوگوں کی اپنی بدکاری اور بداعمالی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اب آگے وہ اصل مضمون آرہا ہے جس کے سلسلے میں یہ آیات بیان کر رہا ہوں: كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوهُ۔ ان کا سب سے بڑا جرم' سب سے بڑی نافرمانی اور سب سے بڑا اعتدا یہ ہے کہ جو غلط کام وہ کرتے تھے' اس پر ایک دوسرے کو شدت کے ساتھ منع نہیں کرتے تھے، روک ٹوک نہیں کرتے تھے۔ 'تناہی' باب تفاعل سے ہے۔ اسی باب سے لفظ 'تواصی' ہے: وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ شدت اور اشتراک باب تفاعل کا خاصہ ہے یعنی باہم کسی کام کو انتہائی شد و مد کے ساتھ سرانجام دینا۔ تو 'تناہی' کے معنی ہوں گے پوری تاکید اور شدت کے ساتھ آپس میں ایک دوسرے کو گناہوں سے روکنا ٹوکنا۔ قرآن یہود پر فردِ جرم عائد کر رہا ہے کہ ان کا اصل جرم جس کی بنا پر ان پر لعنت کی گئی وہ یہی تھا کہ وہ منکرات سے ایک دوسرے کو پوری تاکید کے ساتھ روکتے نہیں تھے۔ کسی بگڑے ہوئے معاشرے کے مختلف طبقات کے اندر مختلف خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن وہ ایک دوسرے کی برائیوں پر روک ٹوک اس لیے بند کر دیتے ہیں کہ اس طرح خود ان کی اپنی برائیوں پر بھی تنقید ہو گی۔ لہٰذا ان کے مابین گویا ایک شریفانہ معاہدہ (A GENTLEMAN AGREEMENT) ہو جاتا ہے کہ کوئی کسی کو کچھ نہ کہے۔ آج کل کے دور میں تو بسا اوقات اس کو رواداری کا نام بھی دیا جاتا ہے کہ ہر ایک کا اپنا اپنا خیال' اپنا اپنا نظریہ' اپنے اپنے معیارات اور اپنی اپنی اقدار۔ لہٰذا کسی کو دوسرے پر تنقید کا حق نہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس مضمون سے متعلق ہم ایک حدیث کا مطالعہ بھی کر لیں تاکہ قرآن مجید کی تفسیر حدیثِ رسولؐ کی روشنی میں سامنے آجائے۔ حدیث چونکہ طویل ہے لہٰذا اس کا ترجمہ و تفہیم ہم متن کے ساتھ ساتھ کریں گے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قال قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ مَا دَخَلَ النَّقْصُ عَلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ۔

بنی اسرائیل میں سب سے پہلے جو نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا ــــــ

دیکھیے کسی قوم میں جب زوال آتا ہے تو درجہ بدرجہ آتا ہے۔ کوئی آدمی زینے پر چڑھتا ہے تو ایک ایک سیڑھی کر کے چڑھتا ہے اور نیچے اُترتا ہے تب بھی درجہ بدرجہ اُترتا ہے۔ اسی طرح گراوٹ بھی ایک دم سے نہیں آتی۔ بڑے بڑے بند جب ٹوٹتے ہیں تو شروع میں چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بڑی بڑی نہروں میں شگاف ایسے پڑتے ہیں کہ بسا اوقات کسی چوہے کے بل کے ذریعے سے پانی آتا ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے ایک بڑا شگاف پڑ جاتا ہے۔ تو وہ چوہے کا بل کون سا ہے جو قوموں کو برباد کرتا ہے؟ اس کا ذکر فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بنی اسرائیل میں جو اولین نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا:

اَنَّہٗ کَانَ الرَّجُلُ یَلْقَی الرَّجُلَ فَیَقُوْلُ

کہ ان میں سے ایک شخص دوسرے شخص سے ملاقات کرتا تھا تو یہ کہتا تھا ــــــ

یَا ھٰذَا اتَّقِ اللّٰہَ وَدَعْ مَا تَصْنَعُ، فَاِنَّہٗ لَا یَحِلُّ لَکَ

اے فلاں، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور جو تم کر رہے ہو اس کو چھوڑ دو، اس لیے کہ یہ تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔

کہ بھائی یہ کاروبار جو تم کر رہے ہو یہ سُود پر مبنی ہے، اسے چھوڑ دو۔ یہ تمہارا طرزِ معاشرت اللہ کے احکام کے مطابق نہیں ہے، اسے تبدیل کرو۔ مثلاً آج ہم کسی سے یہ کہیں گے کہ سیور ریفل کی طرح کی سکیموں میں روپیہ مت لگاؤ، یہ جوا ہے، جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ یہ جو بے پردگی اختیار کی ہے اس کو چھوڑ دو، یہ چیزیں جائز نہیں ہیں، حلال نہیں ہیں ــــــ یہاں تک تو بات اس نے صحیح کی، بُرائی کے اُوپر روک ٹوک کی، نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا ــــــ لیکن

ثُمَّ يَلْقَاهُ مِنَ الْغَدِ وَهُوَ عَلٰى حَالِهٖ

پھر اس کی اسی شخص سے اگلے روز دوبارہ ملاقات ہوتی تھی اور وہ اپنے سابق حال پر قائم ہوتا تھا۔

یعنی جس بُرائی میں وہ مبتلا تھا، اس کو اس نے ترک نہیں کیا اور اسی طرح اپنی سابقہ حالت پر قائم رہا۔ وہ حرام خوری سے باز نہیں آیا، اپنا سُودی کاروبار بند نہیں کیا، جوا کھیلنے سے توبہ نہیں کی، بلکہ حرام کاموں میں اسی طرح ملوّث رہا۔

فَلَا يَمْنَعُهٗ ذٰلِكَ اَنْ يَّكُوْنَ اَكِيْلَهٗ وَشَرِيْبَهٗ وَقَعِيْدَهٗ

لیکن یہ چیز مانع نہیں ہوتی تھی اُس (پہلے شخص) کے راستے میں کہ وہ اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ اور ہم نشین بنے۔

یعنی اس کے باز نہ آنے کے باوجود وہ ناصح (اسے بدی سے روکنے والا) اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتا بھی تھا، پیتا بھی تھا، اس کا ہم نشین بنتا تھا، اس کے ساتھ خوش گپیاں کرتا تھا۔ اس کا مقاطعہ اور بائیکاٹ نہیں کرتا تھا۔ دیکھئے، نمازِ وتر میں آپ روزانہ دُعائے قنوت میں یہ الفاظ کہتے ہیں وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ ۔ اے اللہ جو شخص بھی تیرا فاجر ہوگا، تیرے احکام توڑنے والا ہوگا، ہم اس سے لاتعلقی کر لیں گے، اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیں گے۔ لیکن عملاً ہمارا حال کیا ہے، اس پر خود غور کر لیجئے! کیا آج ہمارا طرزِ عمل بھی وہی نہیں ہے جو بنی اسرائیل کے مصلحین کا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن جیسے انجام سے محفوظ رکھے۔

فَلَمَّا فَعَلُوْا ذٰلِكَ ضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ ۔

جب انہوں نے یہ روش اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں کو آپس میں مشابہ کر دیا۔

کہ جب یہ روش عام ہو گئی اور غیرت و حمیتِ دینی ختم ہو گئی تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی باہم ایک جیسا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ جب تک کہ ایسے لوگوں کا مقاطعہ اور سوشل بائیکاٹ نہ ہو ان کے رنگ سے آپ بھی نہیں بچ سکیں گے۔ ان کا وہ رنگ آپ پر چڑھ جائے گا اور آپ کے دِل کے اوپر بھی وہی اثرات طاری ہو جائیں گے۔

اس کے بعد حضورؐ نے سورۃ المائدہ کی یہی چار آیات تلاوت فرمائیں جو ہمارے زیرِ مطالعہ
ہیں یعنی:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا . . . . فاسقون ○

یہ گویا کہ ان چار آیات کی مستند شرح ہے جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
صحابہؓ کے سامنے بیان فرمائی کہ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں پہلے پہل جو نقص
واقع ہوا وہ یہ تھا کہ لوگوں میں احساس تھا، ان کے علماء منکرات سے روکتے تھے کہ خدا کے لیے
برائی سے باز آجاؤ لیکن ان کے باز نہ آنے پر ان سے قطع تعلق نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے
ہم نوالہ وہم پیالہ بنے رہتے تھے اور ان کے ساتھ مجلسی روابط قائم رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ
تو بدلے نہیں، خود یہ ناصحین اور مصلحین بدل گئے۔ ان کے اپنے دلوں کی کیفیت تبدیل ہو گئی
اور ان کے اوپر بھی وہی فاسقانہ رنگ چڑھ گیا۔[1]

ثم قال:

(ان آیات کی تلاوت کے بعد) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كَلَّا وَاللهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

ہرگز نہیں، خدا کی قسم تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا۔

وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور تمہیں لازماً بدی سے روکنا ہوگا۔

وَلَتَأْخُذُنَّ عَلٰى يَدِ الظَّالِمِ

اور تمہیں لازماً ظالم کے ہاتھ کو قوت کے ساتھ پکڑ لینا ہوگا۔

وَلَتَأْطِرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا

اور تمہیں اس کو لازماً حق کی طرف جبراً موڑنا ہوگا۔

---

[1] بقول علامہ اقبال ؎

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی　　خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ

وَلَتَقْصُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا

اور اسے حق کے اُوپر قائم رکھنا ہوگا۔

اللہ اللہ ــــــ، کلامِ نبوّت کی فصاحت و بلاغت ملاحظہ فرمائیے اور پھر یہ انتہائی تاکیدی انداز بھی ہے۔ آگے فرمایا:

اَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ

یا پھر اللہ تمہارے دل بھی ایک دوسرے کے مشابہ کر دے گا۔

یعنی اگر تم بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرو گے اور اس ضمن میں اپنی ذمّہ داری ادا نہیں کرو گے تو اللہ تمہارے دِلوں کو بھی آپس میں ایک جیسے کر دے گا۔ انہی لوگوں جیسی قلبی کیفیات، وہی بے حسی، وہی بے غیرتی تمہارے اندر بھی پیدا ہو جائے گی۔

ثُمَّ لَيَلْعَنُكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ

پھر اللہ تعالیٰ تم پر بھی لعنت فرمائے گا جیسے ان (یہود) پر لعنت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس آخری انجام سے بچائے جس سے بنی اسرائیل دوچار ہوئے۔

رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيّ وَقَالَ حَدِيْثٌ حَسَنٌ

اس حدیث کو امام ابو داوٗدؒ اور امام ترمذیؒ دونوں نے روایت کیا ہے۔ اور (امام ترمذیؒ نے) فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔

هٰذَا لَفْظُ اَبِي دَاوُدَ، وَلَفْظُ التِّرْمِذِيّ:

متذکرہ بالا الفاظ روایتِ ابو داوٗدؒ کے ہیں اور ترمذیؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں (جو آگے آرہے ہیں):

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَمَّا وَقَعَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ فِي الْمَعَاصِيْ

جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہو گئے

نَهَتْهُمْ عُلَمَاؤُهُمْ

تو اُن کے علماء نے انہیں روکا۔ (یعنی ابتدا میں اُن کے علماء نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہے)۔

فَلَمْ يَنْتَهُوا

لیکن وہ باز نہ آتے۔

فَجَالَسُوهُمْ فِي مَجَالِسِهِمْ وَوَاكَلُوهُمْ وَشَارَبُوهُمْ

(لیکن اس کے باوجود ان علماء نے) ان کی ہم نشینی اور ان کے ساتھ باہم کھانا پینا جاری رکھا۔

فَضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ

تو (اس کے نتیجہ میں) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو بھی باہم مشابہ کر دیا۔

وَلَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ

اور ان پر حضرت داوٗد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبانی لعنت فرمائی۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے رہے۔

فَجَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ مُتَّكِئًا وَقَالَ:

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کر بیٹھ گئے، جبکہ اس سے پہلے آپؐ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ اور فرمایا:

لَا، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ

ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔

حَتّٰى تَأْطِرُوْهُمْ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا

(تمہاری ذمہ داری اس وقت تک ادا نہیں ہو گی) جب تک کہ تم انہیں زبردستی حق کی طرف موڑ نہ دو!

قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی رُو سے ہمارے علماء و صلحاء کا اور ان صوفیاء کا جو لوگوں کو تزکیۂ نفس کے طریقے اور تقرب الی اللہ کے راستے بتا رہے ہیں، سب سے بڑا فرض یہی نہی عن المنکر ہے۔ ان سب پر واجب ہے کہ وہ

وگوں کو منکرات پر ٹوکیں، انہیں منع کریں، ان پر تنقید کریں ـــــ اور اگر باز نہ آئیں تو ان کے ساتھ قاطعہ کریں، ملنا جلنا چھوڑیں، ان پر یہ سوشل پریشر ڈالیں۔ اِس وقت اگرچہ اہلِ حق علما بھی موجود ہیں، دنیا کبھی ان سے خالی نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوگی ـــــ اس کی ضمانت دی ہے محمدؐ رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ لَا یَزَالُ فِی اُمَّتِیْ طَائِفَۃٌ قَائِمِیْنَ عَلَی الْحَقِّ (میری امت یں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا) ـــــ لیکن اِس وقت ان کی اکثریت کا حال کیا ہے؟ جیساکہ میں نے عرض کیا کہ ان میں سے اکثر وبیشتر بیچارے ملازم ہیں۔ انہی لوگوں کی طرف سے آنے والی تنخواہوں پر اُن علماء وخطباء کی معیشت کا دارومدار ہے۔ انہی کی طرف سے موصول ہونے والے ہدیوں اور نذرانوں سے ان کا معیارِ زندگی بلند ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ انہیں روکیں اور ٹوکیں تو کس طرح ؟ اِلّا ماشاء اللہ!

ان سے آگے بڑھ کر میں فعّال دینی جماعتوں کے بارے میں عرض کر رہا ہوں کہ پاور پالیٹکس میں ان کے ملوّث ہونے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کی ساری دوستیاں اور تعلقات اُنہی لوگوں کے ساتھ ہیں جو کُھلم کُھلا منکرات میں مبتلا ہیں۔ یہ اُنہی کے ولیموں میں شریک نظر آئیں گے اور اخبارات میں فوٹو چھپیں گے کہ فلاں حضرت بھی بیٹھے ہوتے ہیں، فلاں جماعت کے لیڈر بھی تشریف فرما ہیں، فلاں کے آدمی بھی آئے ہوتے ہیں ـــــ اور اس طرح کے ولیموں میں جو کچھ منکرات ہوتی ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ ان لوگوں کا جو رویہ ہے، جو کردار ہے اور ہماری پوری اجتماعی زندگی کے اندر جو زہر وہ گھول رہے ہیں اس سب سے صرفِ نظر کر کے صرف وقتی سیاست کے پیشِ نظر کسی وقت کسی کی ٹانگ گھسیٹنے کی خاطر ان کے ساتھ اتحاد ہو جائے گا اور کوئی تفریق نہیں ہوگی کہ اس کا نظریہ کیا ہے، اس کا رہن سہن کیسا ہے، اس کا ذریعہ معاش کیا ہے، اس کے ہاں پردہ ہے یا بے پردگی ہے، کوئی پروا نہیں! حدیث کے الفاظ "وَوَاکَلُوْھُمْ وَشَارَبُوْھُمْ" کے مصداق انہی کی ہم جلیسی، انہی کے ساتھ کھانا پینا، سماجی تقریبات میں ان کے ساتھ شرکت اور سیاسی اتحادوں میں ان کے ساتھ جمع ہو جانا یہ ساری روش اس مطلوب طرزِ عمل کی بالکل ضد ہے۔ اگر ہم اپنی روش تبدیل نہیں کریں گے تو پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بموجب ہم اللہ کی لعنت کے مستحق ہوں گے۔ جیساکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ لازماً تم پر بھی لعنت کرے گا جیسے اس نے لعنت فرمائی تھی بنی اسرائیل پر۔ اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امتی ہو تو بنی اسرائیل کو بھی بڑا فخر تھا کہ ہم ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں، ہم موسیٰؑ کے امتی ہیں، ہم تورات کے ماننے والے ہیں، نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ، کہ ہم تو اللہ کے بیٹوں کے مانند ہیں، اس کے بڑے لاڈلے اور چہیتے ہیں ——— لیکن ان کا یہ چہیتا اور لاڈلا ہونے کا دعویٰ اللہ تعالیٰ کے عدل کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنا۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا: ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ (ان پر مسلط کر دی گئی ذلت اور محتاجی اور وہ پھرے اللہ کا غصہ لے کر)۔

اگلی آیات میں ان کے مجلسی روابط کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ

تم دیکھو گے ان میں سے بہت سوں کو کہ دوستی اختیار کرتے ہیں انہی کی جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی۔

انہی کے ساتھ مجلسی روابط ہیں، انہی سے دوستیاں استوار ہو رہی ہیں اور محبت کی پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ اس دور میں ہماری دینی جماعتوں کے اتحاد اور گٹھ جوڑ ان لوگوں کے ساتھ ہو رہے ہیں جن کا دین و مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو برملا کہہ رہے ہیں کہ ہم اللہ کو نہیں مانتے۔ یہ گویا کہ بہت بڑا اجتماعی جرم ہے کہ کسی کے عقائد و نظریات، افعال کردار اور شخصیت و کردار کی تمیز کیے بغیر اس سے روابط بڑھا لیے جائیں۔

لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ

بہت بری ہے وہ کمائی جو انہوں نے اپنے لیے آگے بھیجی ہے۔

یعنی ان کے اس طرزِ عمل کے نتیجے میں اللہ کے ہاں ان کے لیے جو کچھ جمع ہو رہا ہے بہت برا ہے۔ اور وہ کیا ہے؟

اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝

وہ یہ کہ اللہ کا غضب ہوا ان پر اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

بنی اسرائیل اپنے کرتوتوں کی بنا پر اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔ ان کے لیے قرآن مجید

میں ایک سے زائد مقامات پر " وَ بَآءُ وْ بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰہِ " کے الفاظ آتے ہیں اور یہاں انہیں 'خلود فی العذاب' کی سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہمیشہ ہمیش کے لیے عذاب تو خالص کفار کے لیے ہوگا اور جو کوئی تھوڑا سا ایمان بھی رکھتا ہو اس کے لیے دائمی عذاب نہیں ہے۔ لیکن یہاں یہ سزا علمائے یہود کے لیے فرمائی جا رہی ہے گویا ان کے طرزِ عمل سے درحقیقت ان کے ایمان کی نفی ہو رہی ہے۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ

اور اگر وہ (واقعۃً) ایمان رکھتے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور اُس شے پر جو اس پر نازل کی گئی۔

مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ

وہ انہیں اپنا دوست نہ بناتے۔

جو سمجھتے ہیں کہ ہم صاحبِ ایمان ہیں، اگر وہ واقعۃً ایمان رکھتے ہوتے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستیاں گانٹھتے اور ان سے مجلسی روابط استوار کرتے۔ ایمان کے اندر تو غیرت ہوتی ہے جو کسی درجے میں بھی ایسی بات برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) ان کی اکثریت فساق وفجار پر مشتمل ہے۔

سورۃ المائدہ کے یہ دو مقامات اور ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ کی روایت کردہ یہ دو احادیث جو میں نے آپ حضرات کے سامنے پیش کی ہیں، ان میں بلاشبہ ہمارے لیے ہدایت و رہنمائی کے خزانے مضمر ہیں۔ آپ انہیں خود بھی پڑھیے اور انہیں دوسروں تک بھی پہنچا دیجیے، انہیں عام کیجیے! اور اللہ کرے کہ یہ آیات اور احادیث اُن حضرات کے کانوں تک بھی پہنچ جائیں جو دین و مذہب کے نام لیوا ہیں اور وہ ان کی روشنی میں اپنے طرزِ عمل کے بارے میں کچھ غور کریں۔ ان دینی جماعتوں کی حالت دیکھ کر بالخصوص شدید صدمہ ہوتا ہے جو فی الوقت پاور پالیٹکس میں دائیں یا بائیں بازو کی بڑی سیاسی جماعتوں کے ضمیمے بنی ہوئی ہیں، جبکہ انہیں معلوم بھی ہے کہ فریقین میں انیس بیس سے زیادہ کا فرق نہیں ہے۔ وہی سرمایہ دار، جاگیردار اور زمیندار اِدھر بھی ہیں اور اُدھر بھی ____ اور ان کے لچھن، ان کے طرزِ معاشرت، ان کی تہذیب اور ان کی

رہتے ہیں، یا آجکل کی اصطلاح میں ہارس ٹریڈنگ ہو رہی ہے۔ لیکن مذہبی جماعتیں اِدھر یا اُدھر منسلک ہو کر اور اپنی طاقت ان کے پلڑوں میں ڈال کر خود اپنی منزل کھوٹی کرتی ہیں۔ مذہبی جماعتوں کے کرنے کا اصل کام تو، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، فریضۂ نہی عن المنکر کی ادائیگی ہے۔

اس سلسلے میں گزشتہ دنوں کچھ اچھی خبریں آتی تھیں اور بعض حلقوں کی طرف سے نہی عن المنکر کے ضمن میں زوردار موقف اختیار کیا گیا۔ کَثَّرَ اللّٰہُ اَمثَالَھُم (اللہ کرے کہ ان کی مثالیں اور بڑھیں!) اور مجھے اس پر خوشی ہے کہ کم از کم جماعت اسلامی نے تو اس سلسلے میں ڈٹ کر موقف اختیار کیا۔ اس اقدام کی جو برکتیں ظاہر ہو رہی ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ بھارتی طائفے کی آمد رک گئی ہے اور سالِ نَو کے جشن کے عنوان سے بڑے بڑے ہوٹلوں میں طوفانِ بدتمیزی کے جو مظاہرے ہوا کرتے تھے، وہ اب لوگوں کی اپنی کوٹھیوں کے اندر محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور اس موقع پر بعض ایسی تنظیموں کی طرف سے بھی جماعت کا ساتھ دینے کا اعلان آگیا تھا جن کے نہ صرف افکار و نظریات ان سے مختلف ہیں، بلکہ اُس وقت ان کے مابین شدید کشیدگی بھی تھی۔ چنانچہ اس سے اس بات کا ثبوت بھی مل گیا کہ یہی راستہ دینی جماعتوں کو مجتمع کرنے کا راستہ ہے!!

بعض حضرات تبلیغی جماعت سے بڑی مایوسی کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ لوگ تو سیاست کی بات بھی کرنے کو تیار نہیں، اور مسلمانوں پر اگر کہیں کوئی ظلم ہوتا ہے تو اس پر بھی کوئی آواز اُٹھانے کے روادار نہیں۔ یہ بات اگرچہ بنیادی طور پر غلط نہیں ہے، انہوں نے بطور پالیسی یہ روش اختیار کی ہے اور وہ نہی عن المنکر سے صرفِ نظر کر کے صرف امر بالمعروف کا کام کیے جا رہے ہیں —— اور میں ابھی قرآن حکیم کے نو مقامات کے حوالے سے ان کی اس غلطی کو واضح بھی کر چکا ہوں —— لیکن جو کام یہ کر رہے ہیں وہ بھی رائیگاں جانے والا نہیں ہے۔ یہ خیر و شر اور حلال و حرام کا شعور تو پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے یقین حاصل ہے کہ اس معاشرے میں اگر کوئی ایسی قوت پیدا ہو جائے جو نہی عن المنکر کو طاقت کے ساتھ کرنے کے لیے میدان میں آئے، تو تبلیغی جماعت کے ساتھ عوام کی جو طاقت ہے، ان کی بہت بڑی تعداد اس کام میں شریک ہو جائے گی۔ تحریک نظامِ مصطفےٰ میں بھی تو تبلیغی جماعت سے وابستہ بہت سے نوجوان میدان میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

اور میں آپ کو اسی تحریک کا وہ واقعہ یاد دلاتا ہوں جب لاہور کے نیلا گنبد چوک میں تبلیغی جماعت کا ایک نوجوان بار بار کی وارننگ کے باوجود سینہ تانے آگے بڑھتا رہا اور بالآخر سینے میں گولی کھا کر جامِ شہادت نوش کر گیا۔ ان واقعات میں انسان کے لیے عبرت کا وافر سامان پوشیدہ ہوتا ہے۔

اس ملک میں ۱۹۸۲ء میں میرے حوالے سے بعض مغرب زدہ خواتین نے جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا' مجھے اُسی وقت اس حقیقت کا تجربہ ہو گیا تھا کہ اگر واقعۃً کوئی جماعت نہی عن المنکر کا کام کرنے کے لیے کھڑی ہو جائے تو تمام مذہبی مکاتبِ فکر ساتھ دیں گے۔ اس لیے کہ ہمارا معاشرہ اگرچہ عملی طور پر انحطاط کا شکار ہے لیکن ہماری چودہ سو برس کی تاریخ نے ہمارا جو اجتماعی ذہن بنایا ہے اس کے تحت الشعور میں معروف اور منکر کے صحیح تصورات موجود ہیں۔ چنانچہ اُس موقع پر تمام مکاتبِ فکر کی مساجد سے میری تائید ہوئی، جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے میرے حق میں حیدر آباد سندھ میں تقریر کی' اور کراچی میں جماعت اسلامی کے حلقہ خواتین کی طرف سے مغرب زدہ خواتین کے جلوس کے جواب میں باپردہ خواتین کا کئی گنا بڑا جلوس نکالا گیا تو اُس وقت یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی تھی کہ ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی! لیکن اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے ایک جماعت ایسی ہو جو منکرات کے خلاف میدانِ عمل میں آنے والوں کو کنٹرول میں رکھ سکے۔ یہ نہ ہو کہ کہیں ع "دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد" کی صورت پیدا ہو جائے! جب تک یہ شکل نہ ہو جائے اس وقت تک میدان میں آنے کے مثبت نتائج نہیں نکل سکتے، بلکہ اس سے جو سیاسی بے چینی پیدا ہو گی اس سے کچھ اور لوگ فائدہ اُٹھا لے جائیں گے، جو ملحد و بے دین بھی ہو سکتے ہیں اور ملک و قوم کے دشمن بھی!!

نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت کے ضمن میں مزید دو احادیث کا مطالعہ کر لیجئے۔ میرے خطابات میں ان احادیث کا ذکر بار بار آیا ہے۔ "مسلمانوں کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل" میں بھی ان کا تذکرہ ہے لیکن وہاں متن موجود نہیں ہے۔ یہاں ہم متن کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ:

وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا

جو کوئی بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے

فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ

تو وہ اپنے ہاتھ سے اسے بدلے!

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ

اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اس برائی کو روکے!)

اس کو ذرا اچھی طرح نوٹ کر لیجیے کہ نہی عن المنکر کے جن دو درجوں کا بیان یہاں ہوا ہے اُن میں سے پہلا درجہ ہے "نہی عن المنکر بالید" کا ——— یعنی کوئی برائی نظر آئے تو "زورِ دست و ضربتِ کاری" سے اس کا قلع قمع کر دیا جائے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس برائی سے نمٹنے کے لیے مؤثر قوت موجود ہو۔ بصورتِ دیگر بندۂ مومن کا فرض ہے کہ وہ اس قوت کے حصول کے لیے کوشاں ہو ——— اور اس کے ساتھ ہی "نہی عن المنکر باللسان" کا فریضہ ادا کرے یعنی زبان سے لوگوں کو روکا جائے کہ خدا کے لیے اس سے باز آجاؤ، اسے چھوڑ دو۔ زبانی مدافعت میں قلم بھی داخل ہے۔ اِس مقصد کے لیے کتابیں اور رسالے شائع کیے جائیں۔ نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع بھی بروئے کار لائے جائیں۔ آج نہی عن المنکر باللسان کا ایک بہت بڑا ذریعہ آڈیو اور ویڈیو کیسٹس ہیں۔ آپ گفتگو اور تقاریر کو اس ذریعے سے عام کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی مقرر کی کوئی تقریر دُور دُور تک پہنچ سکتی ہے۔ آج میں یہاں جو تقریر کر رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ کل ہمارے کوئی دوست اس کا کیسٹ لے کر امریکہ یا آسٹریلیا پہنچ جائیں۔ ہمیں پتہ بھی نہیں ہوگا اور یہ کیسٹ وہاں پھیل رہا ہوگا۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس وقت میرے دروس و خطابات کے کیسٹ لاکھوں کی تعداد میں پوری دنیا میں گردش میں ہیں۔ میں نے حال ہی میں "حکمتِ قرآن" کا جنوری فروری ۹۰ء کا جو مشترکہ شمارہ شائع کیا ہے، اس میں دعوت رجوع الی القرآن کی ایک پوری تاریخ بیان کر دی ہے[1]۔ میں اس کے بارے میں بھی خاص طور پر عرض کروں گا کہ جس شخص کو بھی ہمارے اس کام سے

---

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کوئی علمی دلچسپی ہے وہ اس شمارے کو ضرور پڑھے اور اس کے مندرجات پر سنجیدگی سے غور کرے! اس میں پوری تاریخ بیان کی گئی ہے کہ امت کا تعلق قرآن سے کیوں کمزور پڑا۔ پھر یہ کہ قرآن کی طرف رجوع کا دوبارہ آغاز کب ہوا۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کیا مقام ہے اس کے بعد اب تفسیرِ قرآن کے جو سلسلے چل رہے ہیں وہ کون کون سے ہیں ـــــ اور اس راستے میں انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کی خدمات کیا ہیں۔ یہ ساری داستان آپ کو اس ایک پرچے میں مل جائے گی۔ اور اس وقت میرا ذہن اس کی طرف اس لیے منتقل ہوا کہ میں نے اس میں لکھا ہے کہ میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی عمر اور اپنی صلاحیتیں اس کام میں لگائی ہیں۔ مجھے یہ کام کرتے ہوئے پورے پچیس برس ہو گئے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں میں اس شہر کراچی سے منتقل ہو کر اپنے اس کام کو شروع کرنے کے لیے لاہور گیا تھا۔ اب ۱۹۹۰ء آگیا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میری عمر کی ربع صدی بیت چکی ہے کہ قرآن حکیم کا پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا ہی میرا اصل مشغلہ رہا ہے۔ ان میں سے چھ سال (۶۵ء تا ۷۱ء) ایسے ہیں کہ ساتھ مطب بھی چل رہا تھا۔ فروری ۷۱ء میں میں نے حرم شریف میں بیٹھ کر یہ طے کیا کہ اب ہمہ وقت یہی کام کروں گا۔ چنانچہ میں نے مطب بند کیا، پریکٹس چھوڑی اور اُس وقت کے بعد سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا کوئی لمحہ بھی فکرِ معاش میں بسر نہیں ہوا۔ میں نے اپنی ساری توانائیاں اور قوتیں اسی کام میں لگائی ہیں۔ اور آج مجھے بڑا اطمینان ہے کہ میرے یہ دروسِ قرآن دنیا کے کونے کونے میں سُنے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے فضل و کرم سے میرے اپنے تین بچوں سمیت پچیس تیس اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اب اسی انداز میں درس دے رہے ہیں۔ میرا یہ کام الحمدللہ جاری رہے گا اور یہ بات بڑھتی رہے گی، پھیلتی رہے گی، لوگوں تک پہنچتی رہے گی۔ اور ہمیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ کہاں کہاں تک یہ باتیں پہنچ رہی ہیں۔

میں نے اس پرچے میں لکھا ہے کہ میں اکتوبر ۸۹ء کے اواخر میں جب حیدر آباد دکن گیا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

[1] "حکمت قرآن" کے مذکورہ شمارے کے مندرجات محترم ڈاکٹر صاحب کی تازہ تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ (مرتب)

ہاں ایک روز میری تقریر ہوئی، جس کے کیسٹ رات بھر تیار کیے گئے۔ اگلے روز جب میری تقریر
ہوئی تو سات سو کیسٹ تیار ہو سکے تھے، جو سب کے سب فروخت ہو گئے۔ اور یہ کیسٹ وہ
شے ہے جو تین منٹ میں کاپی ہو جاتا ہے۔ نہ معلوم اس سے آگے کتنی جگہ پر بات پہنچ رہی
ہوگی۔ اور گزشتہ رات ہمارے ایک ساتھی نے بتایا کہ وہاں میں نے سیرت النبیؐ کے جلسے میں
تقریر کی تھی، جس میں ڈیڑھ پونے دو لاکھ سامعین تھے، قریباً ڈیڑھ گھنٹے کی اس تقریر میں سے
دس منٹ کی تقریر دُور درشن (ٹیلی ویژن) کے نیٹ ورک پر پورے انڈیا میں دکھائی گئی۔ تو
بات تو ان شاء اللہ پھیلتی رہے گی۔ میں اگرچہ بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہوں اور اکثر علیل رہتا
ہوں، لیکن بہرحال جب تک جان میں جان ہے اور جب تک بھی یہ اعضاء و جوارح ساتھ
دے رہے ہیں یہی کام کرنا ہے، اللہ کے اس پیغام کو پہنچانا ہے۔ نہی عن المنکر باللسان کا یہ
کام کرتے رہنا ہے۔ ہم غلط کو غلط کہیں گے، حرام کو حرام کہیں گے، خواہ کسی کو کتنا ہی ناگوار گزرے!
کسی کو نہیں سننا ہے، نہ سنے! جمعہ چھوڑ کر جاتا ہے، چلا جائے! الحمد للہ اس معاملے میں مجھے قطعاً
کوئی فکر نہیں ہوتی، لیکن بات وہی کہنی ہے جو صحیح ہو۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں
کہ آج تک یہ سوال کبھی میرے سامنے نہیں آیا کہ میری بات سے کون راضی ہے، کون ناراض!!
نہ میں نے ہر بات کہنے سے پہلے یہ ضرور سوچا ہے کہ آیا میرا اللہ اس پر راضی ہو گا یا ناراض۔
یا سوچا ہے کہ میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔ اس کے سوا تیسری بات کبھی سامنے
نہیں آئی۔

جہاں تک "نہی عن المنکر بالید" کا تعلق ہے تو اس بارے میں جو بات میں نے ہمیشہ کہی
ہے وہی اب کہہ رہا ہوں کہ اس کے لیے ایک منظم جمعیت درکار ہے۔ جب ایسے COMMITTED
DEDICATED لوگوں کی ایک معتدبہ تعداد جمع ہو جائے جو اس ثلاثہ نکاتی لائحہ عمل پر عمل کر چکے
ہوں، جو پہلے خود اپنی زندگی کے اندر حلال و حرام کی پابندی کر رہے ہوں، خود دین پر کاربند
ہوں، پھر وہ سمع و طاعت کا نظم اختیار کر کے ایک مضبوط جمعیت فراہم کریں اور ایک بنیانِ
مرصوص بن جائیں، تب چیلنج کا مرحلہ آئے گا اور طاقت کے بل پر یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اب ہم
یہ بات نہیں ہونے دیں گے۔ ہم حدود اللہ کے محافظ بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ پہلے ہماری

جان جائے گی، اُس کے بعد اللہ کی کوئی حد پامال ہو سکے گی۔ ہمارے جیتے جی یہ غیر شرعی کام نہیں ہو سکے گا! ہمارا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وہی الفاظ ہوں گے: اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟ "کیا دین میں تبدیلی کر دی جائے گی جبکہ میں زندہ ہوں!" اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقام تک پہنچائے۔ لیکن اس کے لیے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں طاقت فراہم کرنا ہو گی جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے فراہم کی۔ جب طاقت فراہم ہو گئی تب آپؐ نے تلوار سے جہاد کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ محمد رسول اللہ تیرہ برس تک اُسی بیت اللہ کا طواف کرتے رہے اور وہیں نماز پڑھتے رہے جہاں دائیں بائیں ہر طرف بُت رکھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے اُس وقت کسی بُت کو نہیں توڑا۔ پہلے طاقت فراہم کی۔ دعوت، تربیت اور تنظیم کے مرحلے طے کیے، اللہ کے ایسے فدائی اور شیدائی جمع کیے جو "اِنَّ اللہ اشۡتَرٰی . . . الخ" کی عملی تصویر بن گئے۔ پھر آپؐ کا مشرکین سے براہِ راست مسلح تصادم ہوا، بدر و اُحد کے معرکے ہوئے اور جب آپؐ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ نے ایک لمحے کے لیے بھی ان بتوں کا وجود گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ آپؐ "جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا" کے الفاظ فرما رہے تھے اور ایک ایک بُت کو توڑتے جاتے تھے۔ یہ ہے نبوی طریقِ انقلاب! یہاں میں نے دو جملوں میں بات کر دی ہے، اگر تفصیل پڑھنی ہے تو اس کے لیے "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے عنوان سے کتاب موجود ہے۔

اب آیئے نہی عن المنکر کے تیسرے درجے کی طرف۔ اس حدیث میں آگے یہ الفاظ ہیں:

فَاِنۡ لَّمۡ يَسۡتَطِعۡ فَبِقَلۡبِهٖ

اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو پھر اپنے دل سے!

یعنی اگر زبانوں پر بھی پہرے بٹھا دیئے گئے ہوں تو بُرائی کو دیکھ کر دل کے اندر ایک صدمہ اور ایک رنج اور دکھ اور کرب کا احساس تو ہو۔ فرمایا:

وَذٰلِكَ اَضۡعَفُ الۡاِيۡمَانِ

اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

منکرات کو دیکھ کر کسی کی جبیں پر بل بھی نہ پڑے، اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر ہو اور وہ اندر سے تلملا نہ اُٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے اس کی غیرتِ ایمانی دم توڑ چکی ہے روہ ایمان کی پونجی سے یکسر محروم ہوگیا ہے۔ اعاذ نا اللہ من ذلك!

یہ مسلم شریف کی روایت ہے۔ دوسری حدیث بھی مسلم شریف ہی کی ہے جو حضرت بداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے، یہ بڑی اہم حدیث ہے اور میں اس کے حوالے سے آج یک بڑا اہم مسئلہ بیان کروں گا جو اس سے قبل میں نے کبھی وضاحت سے عرض نہیں کیا۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ

کوئی نبی ایسے نہیں گزرے جنہیں اللہ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا ہو۔

اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَ اَصْحَابٌ

مگر یہ کہ اس کے لیے اس کی امت میں سے کچھ (لوگ نکلتے تھے جو اس کے) حواری اور اصحاب ہوتے تھے۔

حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کے لیے قرآن حکیم میں 'حَوَارِیُّوْن' کا لفظ آیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے لیے لفظ 'صحابہؓ' استعمال ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں دونوں لفظ جمع فرما دیئے۔ اب نوٹ کیجئے کہ انبیاء کے حواری اور اصحاب کرتے کیا تھے:

يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَ يَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ

وہ اس کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق چلتے تھے

یہ حواری اور اصحاب اپنے نبیؑ کی اقتدا کرتے تھے، پیروی کرتے تھے۔ جیسے نماز میں ایک امام ہوتا ہے اور اس کے پیچھے مقتدی اس کی پیروی کرتے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ

پھر (ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ) ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آ جاتے تھے ـــــــ

جیسے ہم ہیں، جیسے آج کی اُمّتِ مسلمہ ہے۔ یہ ناخلف لوگ کیا کرتے تھے؟ یہاں بھی حضورؐ نے وہی باتیں بیان فرمائیں:

يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ وَ يَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ

کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے ـــــ اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔

مثلاً بدعات، نئی نئی رسومات اور نئی نئی چیزیں ایجاد کر لی جاتی رہی ہیں جن کا اللہ کی کتاب میں کوئی حکم ہے، نہ اس کے رسولؐ کی سُنّت اور صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل میں ان کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسولؐ سے وفاداری کے زبانی دعوے جو ہیں وہ بہت بلند بانگ ہیں۔ اس طرزِ عمل کے بارے میں سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۞ اے مسلمانو، کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ لیکن کہنے میں کیا جاتا ہے! حضورؐ کے عشق کے دعوے کیجیے، عشقِ رسولؐ کے اظہار کے لیے بڑی لمبی چوڑی نعتیں پڑھ لیجیے ـــــ کیا گیا؟ کچھ بھی نہیں! محض زبان ہلا دینا تو بہت آسان ہے ـــــ چنانچہ اُن لوگوں کا طرزِ عمل یہ تھا کہ کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ آگے آپؐ نے فرمایا:

فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ

تو جو شخص ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے تو وہ مومن ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ

اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے وہ مومن ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ

اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنے دل سے وہ بھی مومن ہے۔

وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ

اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں!

گویا کہ احساس ہی نہیں رہا۔ منکرات پھیل رہے ہیں، بے حیائی عام ہو رہی ہے، بدعات پھیل رہی ہیں

رسُومات کے طومار پر طومار ہیں۔ اور جو کچھ آجکل شادیوں میں ہو رہا ہے وہ آپ کو معلوم ہے یہ
ہو رہا ہے اور ہمارے احساسات کے اُوپر جُوں تک نہیں رینگ رہی۔ معلوم ہوا کہ
"وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ" کے زمرے میں آ رہے ہیں۔ اللہ
معاف فرمائے اور ہمیں اپنے ایمان کی تجدید کی توفیق عطا فرمائے۔

اب یہاں اس حدیث کی رُو سے جو ایک اہم مسئلہ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ
کہ بدقسمتی سے عام طور پر سُنّی مسلمانوں میں ایک خیال عام ہو گیا ہے کہ اصحابِ اقتدار خواہ کتنے
ہی فاسق و فاجر اور ظالم و جابر ہوں، اُن کے طور طریقے خواہ کیسے ہی ہوں، اُن کے خلاف
بغاوت نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ آپ کو کفر کا حکم نہ دیں۔ اصل میں بعض احادیث اس مضمون کی
ہیں کہ جب تک کفرِ بواح کا حکم نہ دیا جائے بغاوت نہیں ہو سکتی۔ اُن احادیث کی وجہ سے بہت
سے لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا اور عام طور پر اہلِ سنّت میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ شاید خروج کسی
شکل میں جائز نہیں! اور میں اسی کا نتیجہ اس وقت کی سُنّی دنیا میں دیکھ رہا ہوں کہ بدترین جبر و استبداد
کے باوجود کہیں بیداری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ میرے لیے آجکل یہ مسئلہ بڑے گہرے
غور و فکر کا موجب ہو گیا ہے کہ اگرچہ دنیا میں سنّیوں کے مقابلے میں شیعہ تعداد کے اعتبار سے
۱/۱۰۰ بھی نہیں ہیں لیکن اس صدی میں اگر کہیں انقلاب برپا کیا تو شیعوں نے کیا ——
ایک بڑی مستحکم بادشاہت کا تختہ اُلٹا اور اپنی فقہ کے مطابق ایک نظام قائم کر لیا۔ جبکہ دوسری طرف
موریطانیہ سے لے کر انڈونیشیا تک پوری سُنّی دنیا میں جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور
الاخوان المسلمون جیسی عظیم تحریکوں کی موجودگی کے باوجود کہیں بھی انقلاب کے کوئی آثار ابھی
دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے۔ آخر اس کا کوئی سبب تو ہے! غور طلب مسئلہ ہے کہ اس کی
وجہ کیا ہے؟ یہ سُنّی مسلمان سُن ہو کر کیوں رہ گئے ہیں؟ یہ بڑا حساس مسئلہ (SENSITIVE ISSUE)
ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا میں نے آج تک اس پر کبھی گفتگو نہیں کی ہے
لیکن کچھ دنوں سے میں شدت کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ لازمی طور
پر فکر اور نظریے کے اندر کہیں کوئی خامی موجود ہے! مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ معاشی مسئلے پر
کھڑے ہو جائیں گے، سیاسی مسئلے پر کھڑے ہو جائیں گے، کسی کی ٹانگ گھسیٹنے کو جمع ہو جائیں

گئے سینکڑوں لوگ جانیں بھی دے دیں گے لیکن استحصالی نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کوئی منظم کوشش کہیں نظر نہیں آتی۔ ایسی منظم کوشش اسی دَور میں ایرانیوں نے کر کے دکھادی ہے جیسا کچھ بھی اُن کا دین ہے، جو بھی اُن کی فقہ ہے اور جو بھی اُن کے تصورات ہیں اُن سے ہمیں لاکھ اختلاف سہی، لیکن انہوں نے اسے نافذ تو کر کے دکھا دیا ہے۔ اور ہم نے کیا کیا؟ ہمارے ہاں بادشاہتیں چل رہی ہیں، ان بادشاہوں کے لیے ایک ایک محل کی تعمیر پر اربوں ڈالر صَرف ہوتے ہیں، جہاں بادشاہ سلامت کو سال بھر میں زیادہ سے زیادہ چار چھ دن قیام کرنا ہوتا ہے۔ جب کہ آپ اُسی ملک کے اندر جا کر دیکھیے کہ انسان بالکل حیوانوں کی طرح رہتے ہوئے بھی نظر آئیں گے۔ تو یہ نظام ہمارے ہاں کیوں نہیں بدل رہا؟

ان دنوں خاص طور سے مجھ پر یہ سوچ جو بہت زیادہ طاری ہے تو اس کی وجہ بھی میں بیان کیے دیتا ہوں۔ گزشتہ دنوں جب جہادِ افغانستان بڑی شدت کے ساتھ جاری تھا اور روسی افواج ابھی افغانستان سے نہیں نکلی تھیں اُس وقت ایک بات متواتر سننے میں آ رہی تھی کہ روسی ترکستان کی ریاستوں سمرقند و بخارا وغیرہ میں جہادِ افغانستان کے اثرات بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں، ان میں دینی جذبات زندہ ہو رہے ہیں —— اور ان شاء اللہ روس کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور افغانستان میں اس کی مداخلت کے نتیجے میں ان تمام ریاستوں میں بغاوت ہو جائے گی۔ لیکن میں حیران ہوں کہ بغاوت ہوئی تو سب سے پہلے یورپی علاقوں میں ہوئی۔ روس کی گرفت ذرا کمزور پڑی تو یورپ میں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور چوتھا ملک روسی استبداد کی زنجیریں توڑتا نظر آیا۔ پھر یہ کہ روس کی اپنی ریاستوں مثلاً بالٹک سٹیٹس، لیتھوانیا —— وغیرہ کے اندر بغاوت ہو گئی۔ گورباچوف نے جا کر معافیاں مانگی ہیں، خوشامدیں کی ہیں کہ ہم روسی دستور میں "طلاق کا حق" رکھ دیتے ہیں، خدا کے لیے اس وقت علیحدہ نہ ہوں، آئندہ کے کسی مرحلے کے لیے ہم باقاعدہ دستوری راستہ کھول دیں گے لیکن انہوں نے اس کی ایک نہیں مانی! اس کے بعد اگر کوئی بغاوت کی خبر سننے کو ملی تو آذربائیجان سے جہاں شیعہ مسلمان آباد ہیں۔ یہ سُنّی ریاستیں ساری سُن پڑی ہوئی ہیں اور ابھی تک ان میں کہیں سے بیداری کی کوئی لہر نہیں اُٹھی اور دَورِ حاضر کا اتنا عظیم جہاد، جہادِ افغانستان بھی اُن کے تنِ مُردہ

میں جان نہ ڈال سکا جس نے ع "جی اُٹھے مُردے تری آواز سے" کے مصداق کشمیریوں تک کو زندہ کر دیا، جن کے بارے میں "تپیسی تے مُھس کرسی" کا لطیفہ مشہور ہے!

میرے اپنے غور و فکر کی حد تک اس کی وجہ یہی ہے کہ سُنّی اسلام میں کچھ علمائے اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ حاکموں کے خلاف بغاوت نہیں ہو سکتی۔ حاکم چاہے کیسا بھی ہو جب تک وہ آپ کو کفر کا حکم نہ دے، آپ اس کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے محل میں شراب نوشی کرتا ہو، بدمعاشی کرتا ہو، کرتا رہے۔ لیکن بغاوت صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب وہ آپ کو کفر کا حکم دے۔ اس خیال نے سُنّی تصورات کے اندر ایک طرح کا انفعالی (PASSIVE) انداز پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ جو چیلنج کرنے والا ACTIVE انداز ہے، وہ آج ہمیں پوری سُنّی دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا۔ حالاں کہ حکمرانوں کے طرزِ عمل پر گرفت کرنے کے سلسلے میں اس صحیح حدیث کے الفاظ کس قدر واضح اور دو ٹوک ہیں۔ لیکن حدیث کے ضمن میں اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ ایک حدیث پر توجہ کو مرتکز کر دیا جاتا ہے اور دوسری کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، پورے ذخیرۂ احادیث پر متوازن انداز میں نظر نہیں رکھی جاتی۔ غور کیجیے کہ احادیث میں جہاں وہ حدیث موجود ہے کہ جب تک اربابِ اقتدار کفرِ بواح کا حکم نہ دیں، آپ ان کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے، وہاں ایسی احادیث بھی تو موجود ہیں کہ جب ایسے لوگ برسرِ اقتدار ہوں جن کی روش یہ ہو کہ "یقولون مالا یفعلون و یفعلون مالا یؤمرون"[۱] تو ان کے خلاف بندۂ مومن کا ردِّ عمل کیا ہونا چاہیے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن! اگر بغاوت نہیں ہو سکتی تو یہ جہاد

---

[۱] حضرت ابن مسعودؓ ہی سے مروی ایک حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں: سیکون امراء بعدی یقولون مالا یفعلون ویفعلون مالا یؤمرون (مسند احمد، حدیث ۴۳۶۳) ترجمہ: "عنقریب میرے بعد ایسے امراء (حکام) آئیں گے جو کہیں گے وہ بات جس پر عمل نہیں کریں گے اور کریں گے وہ کچھ جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا۔"

بالیدکس شے کا نام ہے؟ اگر ان کے اختیارات کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا تو یہ الفاظ حضورؐ نے کیوں استعمال کیے؟ فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن، ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن، ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن، ولیس وراء ذلک من الایمان حبۃ خردل۔

ہمارے ہاں اس فکر کو دراصل عام طور پر اہلحدیث علماء نے عام کیا ہے، ورنہ امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہی ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کے خلاف بغاوت ہوسکتی ہے۔ علماء حدیث اور فقہاء میں یہی تو فرق ہے کہ عالمِ حدیث کی زیادہ توجہ حدیث کے الفاظ پر ہوتی ہے، جبکہ فقیہ حدیث کے مفہوم کو مرکزِ توجہ بناتا ہے، وہ احادیث کو جمع کرتا ہے، ان کا تقابل کرتا ہے اور پھر کوئی نتیجہ نکالتا ہے تو امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ فاسق و فاجر حکمرانوں کو پہلے سمجھانے کی کوشش کیجیے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر زبانی طور پر کیجیے۔ اگر اس کا اثر نہ ہو تو پھر تلوار کے ذریعے سے انہیں سیدھا کیجیے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے اندر اس بات کی اجازت موجود ہے۔ البتہ امام صاحبؒ نے اس کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ طاقت اتنی فراہم ہو جانی چاہیے کہ کامیابی یقینی ہو جائے، یا کم از کم اس کا ۵۱ فیصد امکان ہو۔ یہ نہیں کہ چند آدمی کھڑے ہو کر نعرہ لگائیں اور پھانسی چڑھ جائیں۔ اور بات ختم ہو جائے۔ بلکہ پہلے دعوت، تنظیم اور تربیت کے ذریعے آپ ایسی منظم قوت فراہم کرلیں، پھر آپ انتہائی قدم بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے دین میں بغاوت حرام نہیں ہے۔ اس معاملے میں میری رائے میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف کتاب و سنت سے اقرب ہے۔

اس دَور میں جیسا کہ اس سے پہلے بھی تفصیلاً عرض کیا جاچکا ہے، بغاوت کا ایک بدل ALTERNATIVE سامنے آیا ہے اور اب طاقت کا استعمال مسلح تصادم کے بغیر بھی ممکن ہے۔ وہ یہ کہ میدان میں نکل کر اس طرح کے بھرپور مظاہرے اور PICKETING کرنا کہ حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑ جائیں! آپ کو یاد ہوگا کہ ضیاء الحق صاحب کے مارشل لاء کو ابھی صرف تین برس بھی نہیں ہوتے تھے، جب اہلِ تشیع نے سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کرلیا تھا اور اس جاندار مارشل لاء کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ناک رگڑوالی تھی۔ اسے ان کے تمام مطالبات ماننے پڑے تھے اور ایرانی شیعوں نے تو اس دَور کی سب سے بڑی مثال قائم کرکے دکھا دی۔ انہوں نے

منظّم مظاہرے کیے، لاکھوں کی تعداد میں سڑکوں پر نکل آئے اور ہزاروں کی تعداد میں جانیں قربان کر دیں۔ خاص طور پر اُس روز جس دن شاہ نے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا، کتنے ہزار ایرانیوں کے لاشے میدان میں پڑے تڑپ رہے تھے ـــــ اور شہنشاہِ ایران کو اپنی لاکھوں کی فوج اور حلیفوں کی حمایت کے باوجود اس طرح راہِ فرار اختیار کرنا پڑی کہ ع

دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں!

نہی عن المنکر میں اوّلین ہدف ـــــ فتنۃ النساء

ہم اپنے معاشرے میں پھیلے ہوئے منکرات کا جائزہ لیں تو ان میں ایک بہت بڑا منکر آزادیٔ نسواں کا فتنہ ہے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ (متفق علیہ)

"میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں کے فتنے سے زیادہ نقصان دہ فتنہ اور کوئی نہیں چھوڑا۔"

ہمارے معاشرے میں اس "فتنۃ النساء" نے درحقیقت بہت سی گندگی پھیلائی ہے۔ عورتوں کا نشوز، ان کا تبرّج، ان کا بن سنور کر نکلنا اور اخبارات کا ایسی حیا باختہ عورتوں کی تصویروں کو گھر گھر پہنچانے کا بیڑا اُٹھا لینا واقعتاً اس وقت ہمارے معاشرے کا ایک بہت تباہ کن فتنہ ہے اور یہ ایسا بڑا منکر ہے جس کے خلاف اقدام کی ضرورت ہے۔ نہی عن المنکر کے ضمن میں یہ بات جان لیجئے کہ ہمیں یقیناً ایک تدریج سے چلنا ہو گا اور اس تدریج میں سب سے مقدم اس فتنۃ النساء کی سرکوبی ہے، اس لیے کہ معاشرے کے اندر سب سے زیادہ اثر اسی کا پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں دوسرے منکرات بھی موجود ہیں اور ہمیں ان سب سے نبرد آزما ہونا ہے۔ مثال کے طور پر سُود ایک بہت بڑا منکر ہے، زمینداریاں، جاگیرداریاں اور تقسیمِ دولت کا غلط نظام یہ سب ایسے منکرات ہیں جن کی بیخ کنی کرنا ہے لیکن چونکہ ہمارے دین میں سب سے زیادہ تفصیلات

ائلی قوانین اور نظامِ معاشرت کے بارے میں ہیں اور یہ معاملہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا لین ترجیح اسی کو حاصل ہوگی۔ اور اسلام کا عائلی اور معاشرتی نظام ہی وہ چیز ہے جسے ہمارے وام سب سے زیادہ جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں۔ لہٰذا منکرات کے خلاف ہماری تحریک مزاحمت (RESISTANCE MOVEMENT) جب بھی اُٹھے گی اس کا آغاز اسی سے ہوگا!

پچھلے دنوں ہمارے ہاں اس فتنۃ النساء کے بعض ایسے مظاہر سامنے آئے ہیں جو ایک عجیب تضاد کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک طرف تو عورتوں کا مطالبہ ہے کہ انہیں برابری کے حقوق دیئے جائیں مثلاً میڈیکل کالجوں میں داخلہ اوپن میرٹ کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ اگر لڑکی کے نمبر زیادہ ہیں تو اس کا حق ہے کہ اس کو داخلہ ملے۔ یورپ کی نقالی میں مساواتِ مرد و زن کا مطالبہ کرنے والی خواتین کو اس مساوات کا نمونہ یورپ میں جاکر دیکھنا چاہیے کہ کوئی بوڑھی نحیف عورت بس میں کھڑی ہوگی اور کوئی جوان آدمی بھی اس کے لیے اپنی سیٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ وہاں کی عورت برابر کے حقوقِ شہریت رکھتی ہے اور اس کو اُس معاشرے میں کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں ملتی۔ لیکن ہمارے ہاں مساواتِ مرد و زن کے نعرے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف حال یہ ہے کہ اسمبلی میں خواتین کی نشستیں مخصوص کی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر برابری کا معاملہ ہے تو یہ کیوں میدان میں آکر الیکشن نہیں لڑتیں؟ اگر ان کے لیے مردوں کے شانہ بشانہ الیکشن لڑنے کی اجازت بھی رکھی گئی ہے تو پھر ان کی علیحدہ نشستوں کے کیا معنی؟ اگر بے نظیر عام الیکشن لڑ کر ایک سے زائد جگہ سے کامیاب ہوسکتی ہیں اور اگر عابدہ حسین مردوں کے مقابلے میں الیکشن جیت سکتی ہیں تو باقی خواتین اسی راستے سے کیوں نہیں آتیں؟ اور آپ نے یہ طرفہ تماشا ملاحظہ کیا کہ اس نئی حکومت کے قیام سے لے کر اب تک حکومت اور اپوزیشن کے مابین جس واحد بات پر اتفاق رائے ہوا ہے وہ یہی ہے کہ عورتوں کی علیحدہ نشستوں کا معاملہ برقرار رکھا جائے! ناطقہ سر بگریباں ہے . . . ! اس عرصے میں اور کسی پہلو سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، کسی اور معاملے پر حکومت اور اپوزیشن کا اتفاقِ رائے نہیں ہوا حتیٰ کہ اب تک کسی قسم کی کوئی قانون سازی بھی نہیں ہوسکی، لیکن اس ایک معاملے میں، جو اسلام کے مزاج کے صریحاً خلاف ہے، فریقین کا اتفاق رائے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے تمدنی تصورات

میں کوئی فرق نہیں، ان کی ذہنیتیں ایک سی ہیں، حکومت ہو یا اپوزیشن جدید مغربی معاشرت اور مغربی تہذیب میں دونوں رنگے ہوتے ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی اسلامی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں، لہٰذا اس مسئلے پر ان میں اتفاق ہے۔ اور ہمارے مرحوم صدر ضیاء الحق صاحب نے تو عورتوں کی نشستیں ایک دم دوگنی کر دی تھیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں معاف فرمائے! اور کمال یہ ہے کہ اگرچہ اس مسئلے پر مولانا سمیع الحق صاحب کا بیان آیا ہے اور انہوں نے اسے غیر اسلامی اور مغربی تہذیب کا مظہر قرار دیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ اس کے باوجود ہم مسلم لیگ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ تو وہی روش ہوئی جس سے ان آیات اور احادیث میں روکا گیا ہے کہ غلط بات کو غلط بھی کہنا لیکن ساتھ پھر بھی دیتے رہنا۔ اگر یہ غلط ہے تو غلط کا ساتھ کاہے کو دے رہے ہیں؟ ان سے ترکِ تعلق کیوں نہیں کرتے؟

اس بارے میں میرا موقف بالکل واضح ہے اور میں بارہا اسے بیان کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک اس طرح کی مخلوط اسمبلیوں میں کسی عورت کا رکنِ اسمبلی ہونا ہی اسلام کے خلاف ہے۔ اگر آپ عورت کے وزیر اعظم ہونے پر اعتراض کرتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ عورت کا وزیر ہونا بھی تو قابلِ اعتراض ہے۔ اس کا تو کام ہے کہ گھر کے اندر اپنی ذمہ داریاں سنبھالے۔ اسلام مرد اور عورت کے لیے الگ الگ دائرہ کار متعین کرتا ہے۔ آپ خواتین کو اسمبلی میں لانا چاہتے ہیں تو ان کے لیے علیحدہ اسمبلی بنا دیں۔ خواتین ووٹر ہی خواتین ارکانِ اسمبلی کا انتخاب کریں اور وہ ان کی نمائندہ بن کر اپنی علیحدہ اسمبلی میں بیٹھیں۔ اور یہ طے کر دیا جائے کہ جو بھی قانون سازی ہو وہ پہلے مردوں کی اسمبلی سے پاس ہو اور اس کے بعد اگر اسے خواتین کی اسمبلی سے بھی اکثریت ملے تب وہ کامیاب قرار دی جائے۔ اسی طرح میڈیکل کی تعلیم کے لیے بھی خواتین کے علیحدہ کالج بنائے جائیں، جن کا اپنا میرٹ ہو۔ اس وقت ہمارے پاس اتنی خواتین پروفیسرز اور ڈاکٹرز موجود ہیں کہ وہ پورے پورے کالج چلا سکتی ہیں۔ اسی طرح خواتین کے ہسپتال بھی علیحدہ ہوں جہاں سے ان کی تعلیمی ضروریات پوری ہو سکیں۔ تاہم یہ سب کچھ اسی وقت ہو گا جب مغربی تہذیب کا بھوت سر سے اترے گا۔ لیکن اگر آپ اس کے لیے تیار نہیں تو ٹھیک ہے، انہیں ہر معاملے میں برابری کا حق دیجئے کہ پھر وہ کھلم کھلا میدان میں آکر الیکشن بھی لڑیں اور

اوپن میرٹ پر داخلہ بھی حاصل کریں! بہرحال یہ دوطرفہ معاملہ قابل قبول نہیں ہے کہ ایک طرف تو اسمبلی کی سطح پر خواتین کی مخصوص نشستیں ہوں اور ان کا بالواسطہ (INDIRECT) الیکشن ہو رہا ہو، اور دوسری طرف میڈیکل کالجوں کے داخلے میں اوپن میرٹ کا معاملہ کیا جاتے کہ لڑکے لڑکیاں سب کو برابری کی بنیاد پر داخلہ مل سکے۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ ان طالبات کی اکثریت شادی کے بعد میڈیکل پروفیشن کو تج دیتی ہے۔ بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو پھر ساری عمر شادی نہیں کرتیں لیکن ظاہر بات ہے یہ ایک خلافِ فطرت زندگی ہے جو ہمارے دین کے مزاج کے یکسر خلاف ہے۔ اور یہ اُن چیزوں میں سے ہے جن کے بارے میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے: مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔" جسے میری سنّت پسند نہیں، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے"! معلوم ہوا کہ یہ چیزیں پسندیدہ نہیں ہیں۔ لیکن چلیے اگر یہی کچھ کرنا ہے تو آپ ہمیں دوطرفہ مار تو نہ ماریں۔! دین کے اعتبار سے تو یہ دونوں چیزیں غلط ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ دوطرفہ پالیسی خود ان کے اپنے موقف اور اپنے معیارات کے اعتبار سے بھی تضاد پر مبنی ہے۔ اس تضاد کو رفع ہونا چاہیے۔!

مَیں نے یہاں اس کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ مولانا سمیع الحق صاحب نے اس کو غلط اور غیر اسلامی کہنے کے باوجود یہ بھی کہا کہ ہم ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اس طرح تو بُرائی کو بُرائی کہنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اللہ تعالیٰ مجھے سوءِ ظن سے بچائے، یہ تو ایک ایسی کوشش معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو اس کھاتے میں بھی نام لکھوا دیا جائے کہ ہم نے بُرائی کو بُرائی کہا ہے لیکن دوسری طرف اپنی سیاسی مصلحت پر بھی آنچ نہ آئے۔ حدیثِ نبوی تو یہ بتا رہی ہے کہ بُرائی کو بُرائی کہہ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ" وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ "کے مصداق جو لوگ بُرائی کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں اُن سے قطع تعلق کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو پھر ازروئے فرمانِ نبوی دل بھی باہم مل جائیں گے، جڑ جائیں گے۔ اور سب کے دلوں پر ایک سا رنگ چڑھ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے!!

عذابِ الٰہی سے نجات کی واحد راہ

یہ ہماری آج کی گفتگو کا آخری موضوع ہے۔ اس سلسلے میں مَیں نے قرآن حکیم کے دو مقامات کا انتخاب کیا ہے، جن سے واضح ہوتا ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ کی طرف سے عذاب آتا ہے تو اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے جاتے ہیں جو آخری وقت تک نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ ورنہ گیہوں کے ساتھ بالعموم گھن بھی پس جاتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً (الانفال: ۲۵) کہ لوگو، بچتے رہو اللہ کے اُس عذاب سے جو تم میں سے صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا جو بدکار تھے۔ بلکہ جب کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو دوسرے لوگ بھی، جو اگرچہ اُس حرام خوری میں ملوث نہ ہوں، اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ اس سے بچاؤ کی ضمانت صرف ان کے لیے ہے جو نہی عن المنکر کے فریضے کو آخری وقت تک سرانجام دیتے رہیں۔ چنانچہ فرمایا:

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ
عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ
وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ○

(ھود: ۱۱۶)

"سو کیوں نہ ہوئے ان قوموں میں جو تم سے پہلے تھیں کچھ ایسے لوگ جن میں خیر کا اثر باقی رہ گیا تھا کہ وہ زمین میں فساد سے منع کرتے رہتے، مگر تھوڑے کہ جنہیں ہم نے بچا لیا اُن میں سے۔ اور پیچھے پڑے رہے ظالم اُسی چیز کے جس میں اُنہیں عیش ملا اور تھے وہ گناہ گار!"

یعنی پہلی قوموں میں سے جن لوگوں نے آخری دم تک یہ شرط پوری کی کہ وہ نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے رہے، اللہ نے انہیں عذاب سے بچا لیا۔ لیکن جن لوگوں نے یہ شرط پوری نہیں کی وہ اُسی عذاب یافتہ قوم کے ساتھ لپیٹ میں لے لیے گئے۔ اس آیت کا آخری ٹکڑا

بڑا عجیب ہے۔ اگر آپ اپنے اس وقت کے معاشرے کو بھی دیکھیں تو وہی نقشہ نظر آئے گا جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ ”اور وہ لوگ جنہوں نے ظلم کی روش اختیار کی تھی وہ اسی طور طریقے کے پیچھے پڑے رہے جس میں انہیں دولت و ثروت حاصل ہوئی تھی“۔ دن رات ایک ہی فکر ہے ایک ہی دُھن سوار ہے اور ایک ہی سوچ طاری ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لی جائے اور پھر اپنے اللوں تللوں شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں اسراف و تبذیر کے ذریعے اس دولت کی بھرپور نمائش کی جائے فرمایا: وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ”اور وہ سب مجرم تھے“! اور اسی جرم کی پاداش میں ان پر اللہ کا عذاب آیا۔ بہرحال اس وقت اس پوری آیت کا درس دینا مقصود نہیں، صرف ”اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ“ کے اعتبار سے حوالہ دیا جا رہا ہے کہ ان میں بہت ہی قلیل تعداد میں وہ لوگ تھے جو برائی سے روکتے رہے اور انہی کو ہم نے نجات دے دی! یہی مضمون سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۶۵ میں بھی وارد ہوا ہے:

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

”پس جب انہوں نے بھلا دیا اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی، تو نجات دی ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے برائی سے، اور پکڑا گنہگاروں کو بُرے عذاب میں بسبب ان کی نافرمانی کے!“

اس آیۂ مبارکہ میں یہود کے ایک قبیلے کا ذکر ہے جو ساحلِ سمندر پر آباد تھا۔ یہود کو سبت (ہفتہ) کا پورا دن یادِ الٰہی میں بسر کرنے کی ہدایت تھی اور اس روز ان کے لیے کسی دنیوی کاروبار کی اجازت نہ تھی۔ انہوں نے سبت کے قانون کو توڑنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کیا کہ ہفتہ کے روز مچھلیاں پکڑتے تو نہیں تھے، لیکن سارا دن ساحل کے ساتھ ساتھ کھدائی کرتے رہتے اور بڑے بڑے گڑھے بنا کر ان میں سمندر کا پانی لے آتے تھے جس میں مچھلیاں بھی آ جاتی تھیں۔ اگلے روز اتوار کو جا کر وہ ان مچھلیوں کو پکڑ لیتے تھے۔ گویا کہ سبت کے قانون کے اصل مقصد یعنی عبادت و ریاضت، ذکر و فکر، دعا و مناجات اور تلاوتِ کتابِ الٰہی کو یکسر نظر انداز کر کے

اس کے بجائے سارا دن دنیا کے دھندے میں لگے رہتے، لیکن قانونی طور پر اس حیلے کا سہارا لیتے اور صاف صاف کہتے کہ ہم تو سبت کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم ہفتہ کو تو مچھلیاں نہیں پکڑتے، بلکہ اتوار کو پکڑتے ہیں۔ اس پر قوم تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک گروہ وہ تھا جو اس جرم کا ارتکاب کر رہا تھا۔ دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو اگرچہ اس جرم میں ملوث نہیں تھے اور اس کام کو غلط بھی سمجھتے تھے لیکن وہ اس کا ارتکاب کرنے والوں کو روک ٹوک کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ گویا نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام نہیں دے رہے تھے۔ تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جو اللہ کے فضل و کرم سے خود بھی اس نافرمانی سے بچے ہوئے تھے اور جو لوگ یہ غلط روش اختیار کیے ہوئے تھے انہیں وہ روکتے ٹوکتے بھی تھے۔ اس سے پہلی آیت (نمبر ۱۶۴) میں ان میں سے دوسری قسم کے لوگوں کا قول بیان ہوا ہے : لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا "کیوں نصیحت کرتے ہو ان لوگوں کو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں سخت عذاب دینے والا ہے" یعنی اللہ تعالیٰ تو اب ان کو ہلاک کر کے رہے گا، یہ قوم اب باز آنے والی نہیں ہے، تم خواہ مخواہ انہیں روکنے کی کوشش میں اپنے آپ کو کیوں ہلکان کر رہے ہو؟ کیوں ان کے پیچھے لگے ہوتے ہو اور اپنی توانائیاں ضائع کر رہے ہو؟ ان کا جواب تھا : مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ "تمہارے رب کے حضور عذر پیش کرنے کی غرض سے اور شاید کہ وہ تقویٰ کی روش اختیار کر ہی لیں!" یعنی ہم تو اپنا نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے کیونکہ ہمیں تو اللہ کے حضور معذرت پیش کرنی ہے کہ اے اللہ ہم تو انہیں آخری وقت تک روکتے رہے، ہم اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ اور پھر کیا عجب کہ ہمارے سمجھانے سے اللہ کسی کے دل میں تقویٰ پیدا کر دے اور اسے اپنا طرز عمل بدلنے کی توفیق عطا فرما دے! اب اس کے بعد فرمایا گیا : فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ ــــ "تو جب انہوں نے نظر انداز کر دیا اس ساری نصیحت کو جو انہیں کی جا رہی تھی"۔ ان تک جو بھی نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا جا رہا تھا، اس سے ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ ــــ "ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو برائی سے روکتے رہے تھے"۔ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ

"اور جو لوگ ظلم کی روش اختیار کیے ہوتے تھے انہیں ہم نے ایک بہت بُرے عذاب میں پکڑ لیا بسبب اس کے کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا تھے!"

قرآنِ حکیم کے یہ دو مقامات ہیں جن کی رُو سے عذابِ الٰہی سے نجات کی ضمانت صرف اُن لوگوں کو ملتی ہے جو نہی عن المنکر کا فریضہ آخری وقت تک سرانجام دیتے رہیں، قطع نظر اس سے کہ اس کا اثر ہو یا نہ ہو، لوگ مانیں یا نہ مانیں!!

آخر میں اسی مضمون سے متعلق ایک حدیث کا مطالعہ کر لیجیے۔

اس حدیث کے راوی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ وہ حذیفہؓ ہیں جو "صاحبُ سِرِّ النبیؐ" (نبیؐ کے رازدان) کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر انہیں بعض افراد کے بارے میں نام بنام بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں شخص منافق ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ حذیفہ یہ میرا ایک راز ہے، اسے کسی کو بتانا نہیں! اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کے نفاق کا پردہ چاک نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ عبداللہ ابن اُبی کی نمازہ جنازہ بھی پڑھا دی جو کہ منافقین کا سردار تھا۔ میرے دروس میں یہ مضمون بڑی تفصیل سے آچکا ہے کہ اسلامی ریاست میں CATEGORIES بس دو ہی ہیں —— مسلم اور غیر مسلم۔ باقی رہے منافق تو وہ قانونی طور پر مسلمان ہی شمار ہوتے ہیں۔ بہرحال حضورؐ نے چونکہ انہیں ایک راز کے طور پر منافقین کے نام بتا دیئے تھے اس لیے ان کا نام "صاحبُ سرّ النبیؐ" پڑ گیا تھا۔ اور یہاں یہ بھی نوٹ کیجیے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا تھا: "اے حذیفہؓ! میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھ رہا ہوں، کہیں میرا نام تو ان میں نہیں تھا؟" اپنے ایمان کے بارے میں اس درجے احساس تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو، کہ کہیں اس دولتِ ایمان پر نفاق کا ڈاکہ نہ پڑ جائے! اور ہم اس درجے بے پروا ہیں کہ ہمیں اس کا کوئی اندیشہ نہیں، ہمیں تو اپنے مومنِ حقیقی ہونے پر مکمل یقین حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اصلاحِ احوال کی توفیق عطا فرمائے!

عَنْ حُذَيْفَةَ عَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ:

حضرت حذیفہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے

لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ

تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا اور تمہیں لازماً بدی سے روکنا ہوگا

اَوْلَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِّنْهُ

ورنہ پھر اس کا شدید اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی جانب سے ایک بڑا شدید عذاب بھیجے گا

ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ

پھر تم اسے پکارو گے، لیکن تمہاری دعا قبول نہیں ہوگی۔

رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَقَالَ حَدِیْثٌ حَسَنٌ

اسے روایت کیا امام ترمذیؒ نے اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں ذرا اپنے حالات کا جائزہ لیجئے۔ آج اس کا کیا سبب ہے کہ ہم اللہ کے حضور دعائیں کرتے ہیں، گڑگڑاتے ہیں لیکن فتنے ہیں کہ پھیلتے ہی جا رہے ہیں، فساد کی آگ بڑھتی ہی جا رہی ہے، امن وامان ختم ہو چکا ہے، رات کا چین اور دن کا اطمینان رخصت ہو چکا ہے، بالفاظِ قرآنی: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ "بحر و بر میں فساد پھیل چکا ہے"، لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ اللہ کے عذاب کی ایک صورت ہے اور نہ ہی ہمیں اس کی فکر ہے کہ اس عذاب سے بچنے کا راستہ کون سا ہے!!

آج کے درس کا حاصل یہ ہے کہ اس عذاب سے بچنے کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے نہی عن المنکر! اس کا کم سے کم درجہ جسے اختیار کرنا دنیاوی عذاب سے بچنے کے لیے ضروری ہے وہ 'بالّلسان' ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جدوجہد کی جائے اور ایسی جمعیت اور قوت فراہم کی جائے جو نہی عن المنکر بالید کا فریضہ سر انجام دے سکے۔ یہی وہ کام ہیں جو ہم اللہ کی تائید و توفیق سے کر رہے ہیں۔ انجمن خدام القرآن کی سطح پر قرآن کی یہ دعوت و تبلیغ، تعلیم و تعلّم اور نشر و اشاعت ــــــ اور پھر تنظیم اسلامی کے نام سے ایک قوت فراہم کرنے کی کوشش اللہ تعالیٰ کو جیسے کچھ منظور ہوگا، جب منظور ہوگا، اس کے نتائج ظاہر ہو جائیں گے ہمیں اس کی

کوئی فکر نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ ہم "قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰی رَبِّکُمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ" کے مصداق اللہ کی جناب میں ایک معذرت پیش کرنے کے قابل ہو جائیں اور پھر کیا معلوم کہ کب اللہ تعالیٰ کسے توفیق عطا فرما دیں۔ کل کی کسے خبر ہے؟ کون کہہ سکتا تھا کہ عمرؓ جو اپنے گھر سے محمدؐ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے چلا تھا، وہ ان کی خدمت میں اپنی تلوار اپنے گلے میں لٹکا کر حاضر ہو جائے گا، جیسے غلام لٹکایا کرتے تھے۔ حالات کو بدلتے ہوئے اللہ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔ اور اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہرگز کسی غفلت یا تساہل کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔ آج ہم نے جن آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ شریفہ کا مطالعہ کیا ہے، ان سب کے متن پر مشتمل ایک ڈیڑھ ورقہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کو دوبارہ پڑھیے، اسے حرزِ جان بنائیے اور اس سے آپ پر جو بھی حقیقت منکشف ہو اس پر اللہ تعالیٰ سے عمل کی توفیق طلب کیجیے!

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

رفتارِ کار

شہر لاہور میں تنظیم اسلامی حلقہ خواتین کی

دعوتی و تحریکی سرگرمیاں

(یہ رپورٹ تنظیمِ اسلامی کے پندرہویں سالانہ اجتماع کے موقع پر پیش کی گئی)

مرتبہ: بیگم شیخ رحیم الدین

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

مارچ ۱۹۷۵ء میں جب تنظیمِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو اِس کی دعوت کا اصل ہدف مرد حضرات ہی تھے۔ اگرچہ خواتین میں تنظیم کا حلقہ بنانے کی اہمیت کبھی بھی نظروں سے کلیتہً اوجھل نہیں رہی تاہم اس کی جانب کوئی عملی پیش رفت نہ ہو سکی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات نے ثابت کر دیا کہ جس طرح گاڑی کے دو پہیوں میں ہر لحاظ سے ہم آہنگی ضروری ہے بالکل اسی طرح مرد اور عورت کے درمیان نظریات میں ہم آہنگی بہت ضروری ہے خصوصاً دین کے معاملات میں جب نظریات کا ٹکراؤ گھر کی چار دیواری کے اندر ہونے لگ جائے تو یہ چیز دعوتِ دین کے وسعت پذیر ہونے کے عمل میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

لہٰذا اسی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے الحمد للہ جنوری ۸۳ء میں خواتین کے لئے بھی تنظیم میں شمولیت کا راستہ کھول دیا گیا۔ اس موقع پر تقریباً ۱۹ خواتین نے محترم امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر بیعت کی جس کا اصل مقصد یہی تھا کہ خواتین میں بھی دین کا وہ جامع اور انقلابی تصور اجاگر ہو جو محترم امیر تنظیم اسلامی دامت برکاتہ کی کوششوں سے مردوں میں نفوذ کر رہا ہے۔ یوں تنظیم اسلامی میں خواتین کا ایک حلقہ تشکیل پا گیا۔ لیکن چونکہ مرکزی سطح پر اس حلقہ کی وسعت کے ضمن میں خواتین کے ساتھ کچھ زیادہ تعاون نہیں کیا گیا پھر یہ کہ کچھ تنظیمی خواتین ستر و حجاب کے باعث اور "وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ" کے اصولی حکم کے پیش نظر اس حلقہ کی کنوینگ صحیح طور پر نہ کر سکیں لہٰذا اس وجہ سے ہمارا خواتین کا حلقہ کچھ زیادہ وسعت نہیں پا سکا اور اب تک تنظیمی خواتین کی تعداد ۱۲۲ سے زیادہ نہیں ہے۔

یہاں اب ہم اُن چند موٹی موٹی باتوں کا ذکر کریں گے جن پر اپنی ہمت و استطاعت اور اللہ کے فضل و کرم سے یہ حلقہ عمل پیرا ہے ——— مردوں کی طرح تنظیم اسلامی پاکستان کے خواتین کے حلقوں میں بھی سب سے مؤثر حلقہ لاہور ہی میں قائم ہے جہاں اُن کی تعداد ۷۰ ہے۔ امیرِ محترم کی زوجہ محترمہ ہی حلقہ خواتین کی ناظمہ ہیں۔ اور لاہور میں حلقۂ خواتین میں دعوتی سرگرمیاں اُن ہی کی زیر

نگرانی ہو رہی ہیں -

جنوری ۸۳ء سے مرکز یعنی قرآن اکیڈمی میں خواتین کا ماہانہ اجتماع الحمد للہ باقاعدگی سے ہو رہا ہے اِس میں درسِ قرآن اور درسِ حدیث کا پروگرام ہوتا ہے اور بسا اوقات امیر تنظیم اسلامی کے کیسٹس بھی سنوائے جاتے ہیں - کچھ دیگر دعوتی و تدریسی پروگرام بھی ہوتے ہیں - اس میں تنظیم بہنوں کے علاوہ عام خواتین بھی شرکت کرتی ہیں -

۱۹۸۶ء سے رفیقِ تنظیم محمد احمد صاحب کے مکان پر ماہانہ درس قرآن ہو رہا ہے - جس میں منتخب نصاب کا درس مکمل ہو چکا ہے - اس میں تقریباً ۳۵، ۴۰ خواتین شرکت کرتی ہیں - اور اب یہ درسِ قرآن وسطی تنظیم کے زیرِ اہتمام ہو رہا ہے -

۱۹۸۸ء سے رفیقِ تنظیم فیاض حکیم صاحب کے مکان واقع نواں کوٹ، ملتان روڈ پر خواتین کا ماہانہ اجتماع باقاعدگی سے ہو رہا ہے اور یہاں بھی منتخب نصاب کا درس مکمل ہو چکا ہے - یہاں بھی خواتین کی تعداد ۴۰ کے آس پاس ہوتی ہے - ۱۹۸۹ء سے یہ اجتماع جنوبی تنظیم کے زیرِ اہتمام ہو رہا ہے - اِس حلقے اجتماع مختلف رفقائے تنظیم کے مکان پر بھی ہوتا ہے -

۱۹۸۹ء سے شمالی تنظیم لاہور کے زیرِ اہتمام گڑھی شاہو مرکزی دفتر تنظیم اسلامی میں بھی خواتین ماہانہ اجتماع منعقد ہو رہا ہے - یہاں بھی درسِ قرآن و حدیث کے علاوہ مختلف موضوعات پر گفتگو کی جاتی ہے - یہاں اب تک ماہانہ تین یا چار اجتماعات ہوئے ہیں لیکن الحمد للہ خواتین کی تعداد میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے -

۱۹۸۷ء سے شرقی تنظیم لاہور کے زیرِ اہتمام خواتین کا تربیتی اجتماع بھی شروع کیا گیا ہے اِس اجتماع میں تنظیمی خواتین کو مختلف موضوعات پر تقریر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے - مزید بر آں اپنے بچوں اور اہلِ خانہ کی اصلاح کے معاملے پر بھی زور دیا جاتا ہے -

خواتین میں قرآن کا فہم و شعور پیدا کرنے کی غرض سے قرآن اکیڈمی میں ۱۹۸۴ء سے ترجمہ قرآن کی ایک ہفتہ وار کلاس شروع کی گئی تھی جس میں شروع میں خواتین کی تعداد تقریباً ۳۰ تھی - اس تعداد میں بتدریج کمی آتی گئی - تاہم تقریباً پندرہ خواتین نے ترجمہ اور مختصر تشریح کے ساتھ قرآنِ شریف مکمل کر لیا ہے - قرآن کے ترجمے کے علاوہ چالیس احادیث کا مختصر سا کورس بھی کروایا گیا ہے

اسی طرح کی ایک اور کلاس ۱۹۸۷ء سے شروع کی گئی - جس میں مختلف گروپس کی صورت میں تقریباً ۲۵ خواتین قرآن کا ترجمہ پڑھ رہی ہیں اور احادیث کا ایک مختصر سا کورس بھی انہوں نے مکمل کر لیا ہے -

اس کے علاوہ عربی کی ابتدائی گرامر کی تدریس کے لئے بھی وقتاً فوقتاً کلاسز ہوتی رہتی ہیں جن میں خواتین کی تعداد عام طور پر ۲۵ - ۳۰ تک ہوتی ہے - ہمیں قوی امید ہے کہ خواتین کے تنظیم میں آنے سے تنظیمی مردوں کے گھروں کے حالات بہتر ہوئے ہوں گے اور ان شاء اللہ مزید بہتر ہوں گے - ہماری درخواست ہے کہ تنظیم کے حلقۂ خواتین کے کام کو آگے بڑھانے میں تمام رفقاء تنظیم ہمارے ساتھ تعاون کریں اور مندرجہ ذیل باتوں پر توجہ دیں -

☆ تنظیم میں شامل مرد اور عورت دونوں مل کر قریبی رشتہ داروں اور دوسری خواتین میں تنظیم اسلامی کی دعوت کو بھرپور طور پر پھیلائیں - اور انھیں اجتماعات میں لانے کی کوشش کریں -

☆ تنظیم اسلامی کے حلقہ خواتین کے لئے کچھ مخصوص لٹریچر طبع کروایا جائے تاکہ دوسری بہنوں میں دعوت کا کام آسان ہو -

☆ تنظیم میں شامل خواتین اگر اجتماعات میں آنا چاہیں تو مردوں کو چاہئے کہ وہ اُن سے نہ صرف تعاون کریں بلکہ ان کو اس معاملے میں تشویق و ترغیب دلائیں -

☆ تنظیم میں شامل جن مردوں کی بیگمات دین کی طرف راغب نہیں ہیں، انھیں دلنشین انداز میں اور تحمل سے سمجھائیں تاکہ وہ اسلام کی تعلیمات کو مشکل نہ سمجھیں اور دلی آمادگی کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوں - بعض خواتین کو شکایت ہے کہ مرد اُن پر سختی کرتے ہیں جس سے اصلاحِ احوال کے بجائے بغاوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں -

☆ مسجد کے ساتھ جو خواتین ہال (قرآن اکیڈمی میں) ہے اُس کو صرف خواتین کے لئے ہی مخصوص رکھا جائے - اور اس میں مزید وسعت کی کوشش کی جائے - رمضان المبارک میں یہ ہال اپنی کم دامنی پر شاکی نظر آتا ہے -

يَدُ اللهِ علی الجماعۃِ

(الحدیث)

ہیئتِ تنظیمی

اور

نظامُ العمل

تنظیمِ اسلامی

شائع کردہ

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان، ۶۷۔ اے علامہ اقبال روڈ، لاہور

(فون :۔ ۳۰۵۱۱۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دفعہ ۱: مقصد، نصب العین اور تنظیمی اساس

ا۔ تنظیم اسلامی نہ معروف معنی میں سیاسی جماعت ہے، نہ مذہبی فرقہ، بلکہ ایک اصولی، اسلامی، انقلابی جماعت ہے جو پہلے پاکستان اور بالآخر کل روئے زمین پر اللہ کے دین کے غلبے، یعنی اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام، یا بالفاظ دیگر "اسلامی انقلاب" کے لئے کوشاں ہے۔

ب۔ انفرادی سطح پر اس کے جملہ شرکاء کا اصل نصب العین صرف رضائے الٰہی اور نجاتِ اخروی کا حصول ہے۔

ج۔ اس کے اساسی نظریات، اور بنیادی دینی تصورات ایک علیحدہ کتابچے میں تفصیل کے ساتھ قرار دادِ تاسیس مع توضیحات، بنیادی عقائد مع تشریحات، اور فرائض دینی کے جامع تصور کے خلاصے کے ذریعے بیان ہو گئے ہیں جنہیں تنظیم کے اساسی فکر اور رہنما اصولوں کی حیثیت حاصل ہے۔

د۔ تنظیم اسلامی کی تنظیمی اساس 'سمع و طاعت فی المعروف' کی شخصی بیعت پر قائم ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد ولد شیخ مختار احمد مرحوم کو اس کے داعی، مؤسس، اور تاحیات امیر کی حیثیت حاصل ہے اور اس میں شمولیت اُن کے ساتھ ذاتی طور پر بیعتِ مسنونہ کا تعلق استوار کر کے ہی ہو سکتی ہے۔ (دیکھئے دفعہ ۳ شق ب)

دفعہ ۲: امیر تنظیم کی نیابت اور خلافت

ا۔ امیر تنظیم کو یہ حق حاصل ہو گا کہ عند الوفات یا دورانِ حیات کسی مجبوری یا معذوری کی بنا پر اپنے منصب سے دست بردار ہونے کی صورت میں اپنا جانشین نامزد کر دیں۔ بصورت دیگر امیر تنظیم کا انتخاب مرکزی مجلس مشاورت (دیکھئے دفعہ ۸ - شق 'ج') اتفاق رائے، یا اختلاف کی صورت میں کثرتِ رائے سے کرے گی۔ آراء کے مساوی ہونے کی صورت میں نائب امیر یا ناظمِ اعلیٰ کو اضافی ووٹ کا حق حاصل ہو گا۔ لیکن مذکورہ بالا تمام صورتوں میں صرف وہی لوگ تنظیم

میں شامل سمجھے جائیں گے جو نئے امیر سے بیعت کر لیں!

- بیرونی ممالک کے اسفار' اور عارضی علالت کی صورت میں امیر تنظیم اپنا ایک قائم مقام امیر مقرر کریں گے - جن کی امارت امیر تنظیم کی سفر سے واپسی یا مرض سے صحت یابی پر از خود ختم ہو جائے گی-
- تنظیم کی وسعت کی صورت میں اگر ضرورت داعی ہو تو امیر تنظیم ایک یا ایک سے زائد نائب امراء کا تقرر کر سکیں گے-
- تنظیم کے جملہ ماتحت امراء (جیسے مقامی تنظیموں کے امراء وغیرہ) کی حیثیت بھی اصولی طور پر امیر تنظیم کے نائبین ہی کی ہو گی اور اُن کا نصب و عزل بالکلیہ اُن ہی کی صوابدید پر ہو گا- اگرچہ وہ اس کے لئے متعلقہ رفقاء سے حسبِ منشا مشورہ کر سکیں گے -

فعہ ۳: شمولیت

روئے ارضی کے کسی بھی مقام پر قیام پذیر ہر مسلمان (خواہ مرد ہو خواہ عورت) تنظیم میں شامل ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ :

(i) تنظیم کے اساسی نظریات اور تصوّرات سے فی الجملہ متفق ہو' اور

(ii) امیر تنظیم سے بیعت مسنونہ کے رشتے میں منسلک ہو جائے-

ـ تنظیم میں شمولیت کے لئے بیعت کے الفاظ :

(i) مردوں کے لئے وہی ہوں گے جو بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے ضمن میں صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ کی متفق علیہ روایت میں وارد ہوئے ہیں - البتہ ان میں "علی السّمع والطّاعۃ" کے بعد "فی المعروف" کے الفاظ کا اضافہ ہو گا۔

(ii) خواتین کے لئے بیعت کے الفاظ بعینہ وہی ہوں گے جو قرآن حکیم میں سورۂ ممتحنہ میں وارد ہوئے ہیں - (اور حدیث نبویؐ میں بھی بیعتِ عقبۂ اُولیٰ کے ضمن میں آئے ہیں!)

۳ـ تنظیم میں شامل مرد "رفیق" اور خواتین "رفیقہ" کہلائیں گی-

ـ پاکستان کی شہریت کے حامل رفقاء' خواہ پاکستان ہی میں مقیم ہوں' خواہ عارضی

[illegible]

دوسرے ممالک کی شہریت کے حامل رفقاء کا نظم جداگانہ ہوگا- چنانچہ پیشِ نظر نظام العمل ' املاً " تنظیم اسلامی پاکستان " کا ہے-

ھ- اسی طرح خواتین کا نظم بھی جداگانہ ہوگا- اور اس کے لئے امیر تنظیم کسی موزوں رفیقۂ تنظیم کو ناظمہ کی حیثیت سے نامزد کریں گے-

دفعہ۴: رفقاء کی درجہ بندی

ا- تنظیم اسلامی کے عہد نامہ رفاقت پر دستخط کرتے ہی ہر شخص تنظیم کا رفیق متصور ہوگا اور اسے فوری طور پر کسی اُسرہ یا مقامی تنظیم یا دفتر حلقہ ' یا مرکزی نظم سے منسلک کر دیا جائے گا- لیکن شق 'ب' میں درج شرائط کی تکمیل تک اسے "مبتدی رفیق" کہا جائے گا!

ب- ہر مبتدی رفیق کے لئے لازم ہوگا کہ جلد از جلد:

(i) ایک ہفتہ پر محیط "مبتدی تربیت گاہ" میں شرکت کرے جس کا نظام ایک معین تسلسل کے ساتھ مرکزی دفتر یا دفتر حلقہ میں جاری رہے گا-

(ii) ایک معین تربیتی نصاب کی تکمیل کرے!

(iii) اپنے آپ کو نظم کی پابندی کا خوگر بنائے جس کے ضمن میں نظم کے ذمہ دار حضرات (امیر مقامی تنظیم ' یا ناظم حلقہ ' یا ناظم اعلیٰ) کا اطمینان ضروری ہوگا-

ا- شق 'ب' میں مذکور شرائطِ ثلاثہ کی تکمیل کر لینے والے رفیق کو امیر تنظیم اپنے اطمینان کے بعد بیعت کی قبولیت کی سند جاری کریں گے اور اس کے بعد ہی وہ "ملتزم رفیق" شمار ہوگا-

ا- تنظیم میں اُسروں کے نقیب ' مقامی تنظیموں کے امراء ' اور مقامی و مرکزی ناظمین کا تقرر صرف ملتزم رفقاء میں سے ہوگا- نیز تنظیم کی مرکزی مجلسِ مشاورت (دیکھئے دفعہ ۸- شق 'ج') کے انتخاب کے ضمن میں حق رائے دہی بھی صرف ان ہی کو حاصل ہوگا-

- جو رفقاء ملتزم قرار پانے کے بعد کسی سبب سے اضمحلال کا شکار ہو جائیں اور نظم

کی پابندی نہ کریں، وہ "معتذر رفیق" کہلائیں گے - لیکن اس کا فیصلہ بھی ماتحت نظم کے مشورے سے امیر تنظیم خود کریں گے - اور انہیں دوبارہ متحرک اور منتظم بنانے کے لئے کوشش میں مقامی نظم کے علاوہ مرکز بھی حصہ لے گا!

و- معتذر رفقاء نہ تنظیم کے کسی منصب پر فائز رہ سکیں گے - نہ ہی مرکزی مجلسِ مشاورت کے انتخاب کے لئے رائے دے سکیں گے -

دفعہ ۵: تنظیم سے علیحدگی یا اخراج

ا- کسی رفیق کو محض نظم کی پابندی میں تساہل پر تنظیم سے خارج نہیں کیا جائے گا -

ب- البتہ اگر کسی رفیق تنظیم کے بارے میں یہ بات علم میں آئے کہ :

(i) وہ کسی فرض کا تارک یا حرام کا مرتکب ہے - اور اس میں اصلاح حال کا کوئی حقیقی ارادہ موجود نہیں ہے، یا

(ii) اس کے کسی عمل یا روش سے تنظیم کی بدنامی کا اندیشہ ہے، ... یا

(iii) وہ تنظیم کے نظم کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے،

تو ایسے رفیق کو تنظیم سے خارج کیا جا سکے گا!

ج- کسی رفیق کے تنظیم سے اخراج کا فیصلہ صرف امیر تنظیم کریں گے، ماتحت نظم صرف سفارش کر سکے گا - اور متعلقہ رفیق کو وضاحت کا پورا موقع دیا جائے گا!

د- اگر ضرورت داعی ہو تو کسی رفیق کے اخراج کا اعلان عام بھی کیا جا سکے گا!

ھ- ویسے تو چونکہ تنظیم اسلامی ہرگز اُس 'الجماعت' کی حیثیت نہیں رکھتی جس سے علیحدگی کے ضمن میں "مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ" کی وعید وارد ہوئی ہے ـــــ لہٰذا امیر تنظیم سے اپنی بیعت فسخ کر کے تنظیم سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق ہر رفیق کو ہر دم حاصل ہو گا ـــــ لیکن ایک خالص دینی ہیئتِ اجتماعیہ بالخصوص "بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف" کی اساس پر قائم ہونے والی تنظیم سے علیحدگی عام سیاسی یا سماجی تنظیموں سے علیحدگی کے مانند نہیں ہے، لہٰذا رفقاء کے احساس ذمہ داری اور عہد رفاقت کی مسئولیت کے پیش نظر توقع کی جائے گی کہ کوئی رفیق تنظیم

یہ انتہائی قدم اسی صورت میں اٹھائیں جب یا تو امیر تنظیم پر اعتماد باقی نہ رہے' یا پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں کوئی بنیادی اختلاف پیدا ہو جائے جو کسی طرح بھی رفع نہ ہو سکے ------ مزید بر آں یہ توقع بھی کی جائے گی کہ علیحدہ ہونے والے رفیق اپنے فیصلہ سے امیر تنظیم کو باضابطہ مطلع کر دیں' بصورت دیگر عند اللہ جواب دہی باقی رہے گی-

دفعہ ۶: تنظیمی ڈھانچہ

(۱) تنظیم اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ مرکزی نظام' حلقہ جاتی نظام' مقامی تنظیمیں' اُسرہ جات' اور منفرد رفقاء پر مشتمل ہو گا-

(۲) منفرد رفقاء

ا- اگر کسی مقام پر رفقاء کی تعداد پانچ سے کم ہو اور / یا کوئی ایسے رفیق موجود نہ ہوں جو نقیب کی ذمہ داری سنبھال سکیں تو وہ سب "منفرد رفیق" شمار ہوں گے اور براہ راست مرکز یا اس کی ہدایت کے مطابق دفتر حلقہ سے منسلک ہوں گے-

ب- ایسے رفقاء کو بھی منفرد قرار دے کر براہ راست مرکز یا حلقہ سے منسلک کر لیا جائے گا جن کا کسی خاص سبب کے باعث عام نظم سے وابستہ ہونا مناسب نہ ہو-

(۳) نظام اُسرہ

ا- جس مقام پر رفقاء کی تعداد پانچ یا اس سے زائد ہو جائے' اور کوئی ایسے رفیق بھی موجود ہوں جو نقیب کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں وہاں نظام اُسرہ قائم کر دیا جائے گا-

ب- اُسرہ کے نقیب کا تقرر مقامی امیر' یا ناظم حلقہ' یا امیر تنظیم کریں گے- اور ہر نقیب اپنے تقرر کرنے والے ہی کے سامنے جواب دہ ہو گا-

ج- ایک اسرہ میں کم از کم پانچ رفقاء شامل ہوں گے- اور کوشش کی جاتے گی کہ رفقاء کی تعداد دس سے زائد ہو جانے پر جلد از جلد علیحدہ اسرہ قائم

کیا جائے!

(۴) مقامی تنظیم

ا۔ جس مقام پر دس یا اس سے زیادہ ملتزم رفقاء موجود ہوں گے اور کوئی ایسے باصلاحیت رفیق بھی موجود ہوں گے جو امارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے اہل ہوں وہاں مقامی تنظیم قائم کر دی جائے گی۔

ب۔ بڑے شہروں میں ایک سے زائد مقامی تنظیمیں قائم کی جاسکیں گی!

ج۔ بڑی تنظیموں میں حسب ضرورت ناظم کا تقرر بھی ہو سکے گا اور دیگر معاونین کی خدمات بھی اعزازی یا بامعاوضہ حاصل کی جاسکیں گی لیکن نظم بالا کے ساتھ رابطے کی ذمہ داری اصلاً مقامی امیر ہی کی ہو گی۔

(۵) حلقہ جات

دعوت کی توسیع اور تنظیمی رابطوں کو آسان اور مستحکم بنانے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 'صوبوں یا ڈویژنوں کی سطح پر 'حلقہ جات قائم کیے جائیں گے - جو بالکلیہ مرکزی نظام کے تابع بلکہ اس کی توسیع (Extension) شمار ہوں گے -

دفعہ ۷: مرکزی نظام

ا جب تک کسی نائب امیر کا تقرر نہ ہو امیر تنظیم کے بعد تنظیم اسلامی کے مرکزی نظام میں اہم ترین منصب "ناظم اعلیٰ" کا ہو گا- چنانچہ تنظیم میں دو ناظم اعلیٰ ہوں گے :

(i) "ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان" اور

(ii) "ناظم اعلیٰ برائے بیرون پاکستان" -

یہ دونوں ایک جانب براہ راست امیر تنظیم کو جواب دہ ہوں گے- اور ان کی منشا کے مطابق کام کریں گے- اور دوسری جانب انہیں اپنے اپنے دائرے میں امیر تنظیم کے نمائندے کی حیثیت حاصل ہو گی- اور ان کے احکام جانب امیر تنظیم متصور ہوں گے-

۱- تنظیم اسلامی پاکستان کے مرکزی نظام میں ناظم اعلیٰ کے علاوہ حسب ذیل شعبوں کے ناظمین معین کئے جائیں گے جو نظم کے اعتبار سے ناظم اعلیٰ کے تحت ہوں گے لہٰذا ان کی تقرری میں بھی ناظم اعلیٰ کی رائے کو اہمیت دی جائے گی!

(i) معتمد (ii) ناظم تربیت

(iii) ناظم بیت المال (iv) ناظم نشر و اشاعت

تنظیم کی توسیع و ترقی کے ساتھ ساتھ نئے شعبے کھولے جا سکیں گے!

- تنظیم کے مرکزی حسابات کی جانچ پڑتال کے لئے ایک محاسب کا تقرر تنظیم کی مرکزی مجلس مشاورت کے منتخب ارکان کریں گے - اور وہ اپنی رپورٹ مرکزی مجلس مشاورت ہی کو پیش کرے گا!

- حلقہ جات مرکزی نظام ہی کا حصہ شمار ہوں گے اور ان کے ناظمین بھی ناظم اعلیٰ ہی کو جوابدہ ہوں گے!

دفعہ ۸: نظام مشاورت

- نظام بیعت کے مطابق تنظیم اسلامی کی سربراہی اور رہنمائی اصلاً امیر تنظیم کی ذمہ داری ہے ----- تاہم قرآن حکیم کی ہدایات :

(i) "وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ" (الشوریٰ ۳۸) اور

(ii) "وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ" (آل عمران ۱۵۹)

کی رُو سے مشورہ امیر تنظیم کی دینی اور تنظیمی 'ضرورت' ہے جس کو حسب ذیل طریقوں سے پورا کیا جائے گا ----- لیکن "بیعت سمع و طاعت فی المعروف" کے منطقی تقاضے کے طور پر یہ واضح رہنا چاہئے کہ ہر معاملے میں امیر تنظیم ہی کا فیصلہ آخری اور حتمی ہو گا اور جملہ رفقائے تنظیم اسے "منشط" اور "مکرہ" دونوں صورتوں میں تسلیم کرنے کے پابند ہوں گے اِلّا یہ کہ اس سے حدیث نبوی ؐ کے الفاظ : "اِلَّا اَنۡ تَرَوۡا كُفۡرًا بَوَاحًا عِنۡدَكُمۡ فِيۡهِ مِنَ اللّٰهِ بُرۡهَانٌ" کے مطابق شریعت کے کسی حکم کی صریحاً خلاف ورزی ہوتی ہو -

- تنظیم اسلامی کے مقاصد کے حصول کے لئے عملی پیش قدمی کے ضمن میں ضروری

فیصلے امیر تنظیم اپنے قریبی رفقاء اور مرکز کے مختلف شعبوں کے ناظمین کے مشورے سے کرتے رہیں گے جنہیں جدید اصطلاح میں "مجلس عاملہ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس مجلس عاملہ کے اجلاس حسب ذیل پروگرام کے تحت حتی الامکان پابندی سے ہوتے رہیں گے :

(i) ایک ہفتہ وار اجلاس جس میں مرکز کے مختلف شعبوں کے ناظمین اور معتمدِ تنظیم شرکت کریں گے۔

(ii) ایک ماہانہ اجلاس جس میں ناظمین مرکز کے علاوہ ناظمین حلقہ جات بھی شریک ہوں گے۔

- ایک معین "مرکزی مجلس مشاورت" جس میں شق 'ب' میں مذکور مجلسِ عاملہ کے علاوہ اس کے ارکان کی مجموعی تعداد سے کم از کم ڈیڑھ گنی تعداد میں رفقاء تنظیم کے منتخب نمائندے شامل ہوں گے، قائم کی جائے گی۔

(i) اس مجلس کے لئے منتخب بھی صرف وہی رفقاء کئے جا سکیں گے جو "منتظم" ہوں اور ان کے انتخاب کے لئے حق رائے دہی بھی صرف منتظم رفقاء ہی کو حاصل ہو گا۔

(ii) اس کا انتخاب تنظیم کے منتظم رفقاء کی کل تعداد اور مطلوبہ تعدادِ اراکین مجلس کو سامنے رکھتے ہوئے رفقاء کی ایک معین تعداد میں سے ایک نمائندے کے اصول پر ہو گا۔

(iii) اس مجلس کے اجلاس حتی الامکان لگ بھگ تین ماہ کے وقفے سے ضرور ہوتے رہیں گے۔

(iv) اس مجلس میں پالیسی اور طریق کار کے اہم امور پر بحث و تمحیص کا بھی پورا موقع ہو گا۔ اور امیر تنظیم اور اراکین مجلس عاملہ پر تنقید کی جا سکے گی۔ بشرطیکہ دفعہ ۱۲ شِق 'ب' کا تقاضا پورا کیا جا چکا ہو۔

(v) کوشش کی جائے گی کہ اس کا ایجنڈا بھی اجلاس سے پندرہ یوم قبل اراکین کو مل جائے ——— اور

(vi) اگر منتخب رکنِ مجلس کسی معاملے میں معلومات حاصل کرنا چاہے تو اس کا سوال اجلاس سے ایک ماہ قبل معتمد تنظیم کو موصول ہو جانا لازمی ہو گا!

د۔ مشاورت باہمی کی متذکرہ بالا جملہ مجالس میں امیر تنظیم حسب منشا دوسرے رفقاء کو بھی شرکت کی دعوت دے سکیں گے۔

ھ۔ ایک "توسیعی مشاورت" کا اجلاس تنظیم کے جملہ وابستگان کی آراء سے مستفید ہونے کے لئے ہر سال منعقد کیا جائے گا جس میں (i) جملہ رفقاء کو پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں تو اظہار رائے کی مکمل آزادی ہو گی۔ لیکن ذاتی تنقید یا محاسبہ صرف امیر تنظیم کا کیا جا سکے گا! ---(ii) امیر تنظیم اور ارکانِ مجلسِ عاملہ لازماً اور منتخب ارکانِ مجلسِ مشاورت حتی الامکان شریک ہوں گے --- لیکن ان سب کی حیثیت اصلاً سامع کی ہو گی تاکہ رفقاء کی رائے سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکے۔ (iii) البتہ اگر کسی معاملے میں شدید ضرورت محسوس ہوئی تو امیر تنظیم وضاحت کر سکیں گے (iv) یہ اجلاس چار یوم تک جاری رہ سکے گا لیکن اس میں اظہار خیال کا حق صرف ان رفقاء کو ہو گا جو پہلے ہی دن اجلاس کے 'آغاز' سے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کی تاخیر سے پہنچ جائیں (v) اس اجلاس میں رفقاء تنظیم کے علاوہ حضرات مرافقین (دیکھئے دفعہ ۱۰) کو بھی اظہار رائے اور حق نصیحت ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا' (vi) اس نوع کی توسیعی مشاورت کے اجلاس تنظیم کی توسیع کی مناسبت سے حسب ضرورت اضافی طور پر حلقہ جات کی سطح پر بھی منعقد کئے جا سکیں گے۔

مشاورت باہمی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مقامی تنظیموں کی سطح پر بھی تنظیم کے ذمہ دار حضرات اور اسرہ جات کے نقبا کے علاوہ 'منتخب رفقاء کے نمائندوں پر مشتمل مجلس شورٰی کا اہتمام کیا جائے گا ------ تاہم یہاں بھی فیصلہ کا آخری اختیار مقامی امیر ہی کو حاصل ہو گا!

دفعہ ۹: نظامِ مالیات

ا۔ رفقائے تنظیم اپنے صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ و عشر میں سے اگر ان کے قریبی رشتہ داروں اور پڑوسیوں میں مستحقین موجود ہوں تو ان کو پہنچانے کے بعد جو باقی بچے اسے تنظیم کے مرکزی بیت المال میں جمع کرانے کے پابند ہوں گے۔

ب۔ ہر رفیق اپنے آپ کو پابند سمجھے گا کہ کچھ نہ کچھ صدقات نافلہ بھی آیۂ بِرّ (سورۃ البقرہ-۱۷۷) کے مطابق ہر ماہ ضرور کرے- لیکن یہ ایک راز رہے گا اس کے اور اللہ تعالےٰ کے مابین-

ج- تنظیم اپنے اخراجات کے لئے انحصار اپنے رفقاء ہی کے جذبۂ انفاق پر کرے گی اور عام چندے کی اپیل نہیں کرے گی-

د۔ دعوتی اور تنظیمی اخراجات کے لئے سرمایہ کی فراہمی کی خاطر انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں ہر رفیق اپنی آمدنی کے کم از کم پانچ فی صد کے لگ بھگ ضرور تنظیم کو ادا کرے گا- کسی عذر کی صورت میں متعلقہ نظم کی سفارش پر امیرِ تنظیم جزوی یا کلّی رعایت دے سکیں گے!

ھ- منفرد رفقاء اپنی ماہانہ اعانتیں مرکزی بیت المال میں جمع کرائیں گے-

و- اسی طرح اُسرہ جات سے متعلق رفقاء بھی اگر اُن کا اُسرہ مرکز یا دفتر حلقہ سے منسلک ہو تو اپنی اعانتیں براہ راست مرکزی بیت المال میں جمع کرائیں گے' اور اگر اسرہ کسی مقامی تنظیم سے منسلک ہو تو اس کے بیت المال میں جمع کرائیں گے ---- گویا اسرہ کی سطح پر کوئی مستقل 'بیت المال' نہیں ہو گا-

ز- تنظیم میں مستقل بیت المال صرف مرکز اور مقامی تنظیم کی سطح پر ہو گا-

ح- مرکزی بیت المال امیر تنظیم' ناظم اعلیٰ' اور ناظم بیت المال کی مشترک تحویل میں ہو گا- اور اس کا بینک اکاؤنٹ بھی ان تینوں ہی کے نام پر کھلے گا جس سے رقوم ان میں سے کوئی سے دو حضرات کے دستخطوں سے نکلوائی جا سکیں گی-

ط- اسی طرح مقامی بیت المال بھی مقامی تنظیم کے امیر' ناظم مقامی بیت المال' اور کسی تیسرے شخص (معتمد' یا ناظم) کی مشترک تحویل میں ہو گا اور اس کی صورت بھی وہی ہو گی جو اوپر شق (ح) میں بیان ہو چکی ہے-

ی- مقامی تنظیمیں اپنی کل آمدنی کا نصف لازماً مرکزی بیت المال کو منتقل کر دیں گی' جس میں ہرگز کوئی استثناء نہیں ہو گا- اس کے علاوہ مرکز کی ضروریات اور مقامی تنظیموں کی سہولت کے مطابق مزید رقوم بھی مرکز طلب کر سکے گا-

ک- مقامی تنظیم کے بیت المال سے خرچ کرنے کا اختیار اصلاً مقامی امیر کو حاصل

ہو گا- لیکن اس ضمن میں وہ حتی الامکان مشورے سے کام کریں گے-

ج- اسی طرح مرکزی بیت المال سے خرچ کا اختیار بھی اصلاً امیر تنظیم کو حاصل ہو گا- اگرچہ وہ اپنے اس اختیار کو حسب منشاو سہولت ناظم اعلیٰ یا دیگر مرکزی ناظمین کو تفویض کر سکیں گے-

د- حلقہ جات میں کوئی مستقل بیت المال کا نظام نہیں ہو گا- بلکہ ان کے اخراجات مرکزی کے ذیل میں شمار ہوں گے- البتہ ایک معین دست گرداں رقم (Imprest) ناظم حلقہ اور معتمد کی مشترک تحویل میں رہے گی-

ہ- مقامی تنظیموں کے بیت المال کے حسابات اور املاک کی جانچ پڑتال کی ذمہ داری مرکزی بیت المال کے ناظم پر ہو گی- جبکہ مرکزی بیت المال کے حسابات اور املاک کی جانچ پڑتال کے لئے مرکزی مجلس مشاورت کے منتخب ارکان ایک "محاسب" کا تقرر کریں گے-

دفعہ ۱۰: حلقۂ مراقبین

ا- ایسے اصحاب علم و فضل پر مشتمل ایک "حلقۂ مراقبین" قائم کیا جائے گا جو کسی سبب سے تنظیم اسلامی میں باقاعدہ تو شامل نہ ہوں لیکن اس کے نظریات سے مجموعی اتفاق اور اس کے مقاصد سے عمومی دلچسپی رکھتے ہوں- اور یہ ذمہ داری قبول کر لیں کہ وہ عند الطلب مشورہ بھی دیتے رہیں گے اور تنظیم کی سرگرمیوں پر نگاہ بھی رکھیں گے تاکہ اگر کوئی غلط رجحان نظر آئے تو بر وقت متنبہ کر دیں-

ب- اس حلقے میں صرف وہی اہل علم و فضل شامل ہو سکیں گے جن سے خود امیر تنظیم اسلامی درخواست کریں-

ج- اس حلقے کے کوئی صاحب اگر کوئی غلط رجحان دیکھیں تو اولاً وہ امیر تنظیم کو متوجہ کریں گے- اگر انہیں ان کی رائے سے اتفاق ہو جائے گا تو اس صورت میں تو اصلاح ہو ہی جائے گی- بصورت دیگر ان کی رائے 'میثاق' میں شائع کر دی جائے گی تاکہ تمام رفقاء کے علم میں آجائے-

دفعہ ۱۱: اختلاف کے حقوق اور آداب

ا۔ جملہ رفقائے تنظیم پوری طرح آزاد ہوں گے کہ اہلِ سنّت کے جس فقہی مذہب یا مسلک پر چاہیں عمل کریں ------ لیکن اس ضمن میں مناظرانہ بحث و تمحیص سے کلی اجتناب ضروری ہو گا۔ اگرچہ خالص علمی انداز میں' اور افہام و تفہیم کے جذبے کے تحت تبادلۂ خیالات پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔

ب۔ اسی طرح ہر رفیق تنظیم آزاد ہو گا کہ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کے لئے معروف سلاسلِ سلوک میں سے جس سے چاہے منسلک ہو جائے اور کسی مربّی و مزکّی سے بیعتِ ارشاد کا رشتہ بھی استوار کر لے۔ تاہم یہ واضح رہنا چاہئے کہ بیعتِ تنظیم بیعتِ ارشاد پر فائق ہو گی۔

ج۔ اسی طرح تنظیم اپنے مقصد کے حصول کے لئے جو عملی تدابیر اختیار کرے یا ملکی حالات و مسائل کے بارے میں جو آراء امیر تنظیم ظاہر کریں اُن سے اختلاف کا حق بھی رفقائے تنظیم کو پوری طرح حاصل ہو گا اور مناسب احتیاط (دیکھئے شق 'د') کے ساتھ اُس کے اظہار میں بھی کوئی قباحت نہ ہو گی' تاکہ نہ تنظیم میں گھٹن محسوس ہو' نہ ذہنوں پر تالے پڑیں' بلکہ آزادیٔ فکر اور اظہارِ رائے کا صحت مند ماحول برقرار رہے اور اس طرح اختلاف رائے تنظیم کے حق میں رحمت اور اس کے مقاصد کے لئے مفید ثابت ہو۔ اختلاف رائے اور اس کے اظہار کے "صحت مند" ہونے کی علامت یہ ہو گی کہ متعلقہ رفیق کے طرزِ عمل میں "سمع و طاعت فی المعروف" کے اعتبار سے کوئی کمی یا تساہل نظر نہ آئے!

د۔ اختلاف رائے کے اظہار کے سلسلے میں حسب ذیل احتیاطیں ضروری ہوں گی:

(i) یہ اظہار رائے صرف ملتزم رفقاء ہی کے مابین ہونا چاہئے' چنانچہ ملتزم رفقاء کا مبتدی اور معتذر رفقاء کے ساتھ اس قسم کی گفتگو کرنا نظم کی خلاف ورزی متصوّر ہو گا۔ وہ مبتدی اور معتذر رفقاء کی بات سن کر اگر انہیں مطمئن کر سکیں تو دوسری بات ہے ورنہ سکوت لازم ہو گا!

(ii) ملتزم رفقاء کے ساتھ گفتگو میں بھی ان آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم اور مدلول کے مطابق مخاطب کے [illegible]

تنظیم بلکہ خود اُس رفیق کی خیر خواہی کے اعتبار سے بھی ضروری ہو گا جس سے اس نوع کی گفتگو کی جا رہی ہو:

● إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا (النساء: ۵۸)

● لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔ (النساء: ۸۳)

دفعہ ۱۲: ذاتی تنقید اور محاسبہ

ا۔ تنظیم کی پالیسی یا امیر تنظیم کی سیاسی آراء کے مقابلے میں کسی رفیق اور بالخصوص ذمّہ دار حضرات پر ذاتی تنقید اور شخصی محاسبے کے ضمن میں بہت زیادہ احتیاط اور حد درجہ احساس ذمّہ داری کو ملحوظ رکھنا لازم ہو گا۔

ب۔ اس سلسلے میں اس داخلی احساس اور شعوری تنبّہ کے ساتھ ساتھ کہ اس میں نہ اپنے عُجب اور تکبر کو دخل ہو' نہ دوسرے کی توہین و تذلیل یا اسے صدمہ پہنچانے کا جذبہ کار فرما ہو' بلکہ تنقید اور محاسبہ سراسر خلوص و اخلاص اور نصح اور خیر خواہی کے جذبے کے تحت ہو' حسب ذیل ضابطوں کی پابندی بھی لازمی ہوگی اور ان کی خلاف ورزی کرنے والا سرزنش کا مستحق اور تادیبی کارروائی کا مستوجب ہو گا :۔

(i) جس رفیق تنظیم' یا ذمہ دار ساتھی میں کوئی قابل اصلاح پہلو نظر آئے لازم ہو گا کہ پہلے اُسے علیحدگی میں بالمشافہ گفتگو کے ذریعے اصلاح کی جانب متوجہ کیا جائے۔ اور اس سلسلے میں ایک مناسب مدّت تک انتظار بھی کیا جائے ——— اس مرحلے کو طے کئے بغیر براہ راست تنقید اگر متعلقہ شخص کی غیر حاضری میں ہو گی تو "غیبت" کے حکم میں آئے گی جسے قرآن مجید میں مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے' اور اگر رُو در رُو لیکن دوسرے لوگوں کی موجودگی میں ہو گی تو "همز" اور "لمز" کے حکم میں ہو گی جس پر "وَیل" کی وعید وارد ہوئی ہے۔

(ii) لیکن اگر شق (i) کے مطابق مناسب کوشش کے بعد بھی یہ محسوس ہو کہ متعلقہ شخص میں یا تو اصلاح کا ارادہ ہی موجود نہیں ہے' یا قوتِ ارادی اتنی کمزور ہے کہ اصلاح پر قدرت حاصل نہیں' اور دوسری طرف اس

کی کمزوری یا کوتاہی بھی اس نوعیت یا درجہ کی ہے کہ اُس سے تنظیم کے مقصد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تب بھی اس معاملے کا عام چرچا غلط ہو گا اور صحیح طرزِ عمل یہ ہو گا کہ زیرِ تنقید رفیق تنظیم کے نظم کی جس سطح پر ہو اُس کا معاملہ اُس سے بالاتر سطح تک پہنچا کر اپنے آپ کو کم از کم فوری طور پر بریٔ الذّمہ سمجھا جائے!

(iii) پھر اگر یہ محسوس ہو کہ اس معاملے میں بالاتر نظم بھی کوتاہی یا تساہل سے کام لے رہا ہے تو معاملے کو درجہ بدرجہ اوپر لایا جا سکتا ہے - چنانچہ بلا لحاظِ مرتبہ و منصب جملہ رفقاءِ تنظیم کے معاملات براہِ راست امیرِ تنظیم کے سامنے بھی لائے جا سکیں گے اور کسی رکن مجلسِ مشاورت کے توسط سے مرکزی مجلس مشاورت کے اجلاس میں بھی پیش کیے جا سکیں گے - جبکہ خود امیرِ تنظیم پر تنقید اسی طریقِ کار کے مطابق مرکزی مجلس مشاورت میں بھی ہو سکے گی اور توسیعی مشاورت کے اجلاس میں بھی (دیکھئے دفعہ ۸ شق ھ)

ج - نظم کے ذمّہ دار حضرات کے اپنے حلقۂ نظم میں شامل رفقاء کے بارے میں ایسے صلاح و مشورہ پر جو تنظیم کے مصالح کے لئے ناگزیر ہو شق ب(i) کا اطلاق نہیں ہو گا۔

دفعہ ۱۳: بامعاوضہ کارکن

بامعاوضہ اور ہمہ وقتی کارکن تحریکوں اور تنظیموں کی ناگزیر ضرورت بھی ہوتے ہیں - اور دوسری جانب اگر احتیاط ملحوظ نہ رکھی جائے تو یہ ادارہ تحریکوں اور تنظیموں کی تباہی کا سبب بھی بن سکتا ہے - تنظیم اسلامی میں اس سلسلے میں حسبِ ذیل احتیاطیں ملحوظ رکھی جائیں گی:

ا - اُسروں کے نقباء، مقامی تنظیموں کے امراء اور امیر تنظیم کو حسبِ ضرورت مختلف قسم کی سہولتیں (جیسے رہائش یا ٹرانسپورٹ وغیرہ) تو بہم پہنچائی جا سکتی ہیں، لیکن ان مناصب پر کبھی کوئی باضابطہ تنخواہ یافتہ کارکن فائز نہیں ہو سکے گا - جب کہ باقی جملہ دفتری یا تنظیمی مناصب کے لئے بامعاوضہ ہمہ وقت کارکنوں کی حیثیت سے باصلاحیت رفقاء کی خدمات حاصل کی جا سکیں گی -

ب - دفتری یا دیگر عمومی نوعیت کی خدمات (جیسے کلرک، قاصد اور گاڑیوں کے

ڈرائیور وغیرہ) کے لئے سرکاری محکموں یا درمیانی درجہ کے کاروباری ادارو
کی سطح کے معاوضے دیئے جاسکیں گے۔ لیکن مقامی 'حلقہ جاتی' یا مرکزی "ناظم
کا معاوضہ بہر صورت اُس تنخواہ سے کم از کم پچیس فی صد کم ہو گا جو اُن کی
سی تعلیمی اور فنی استعداد کے حامل لوگوں کو سرکاری محکموں میں ملتی ہو!

ج۔ تنظیم کا کوئی بامعاوضہ کارکن نہ صرف رفقاءِ تنظیم' بلکہ ایسے لوگوں سے بھی
جن سے اُس کا تعارف تنظیم ہی کی وساطت سے ہوا ہو:
(i) نہ کوئی صدقہ یا اعانت قبول کر سکے گا۔ (ii) نہ تنظیم کی اطلاع اور اجا
کے بغیر ہدایا وصول کر سکے گا (ماسوائے اُن گھریلو ہدیوں کے جن کا تبادلہ برابر
بنیاد پر ہوتا ہے) (iii) نہ ہی کوئی قرض لے سکے گا!
بلکہ اپنی کسی ہنگامی ضرورت کے لئے تنظیم ہی سے رجوع کرے گا۔ ج
ضرورت کی نوعیت اور اپنے ذرائع کی وسعت کے مطابق تعاون کرنے
کوشش کرے گی!

دفعہ ۱۴: تنظیمِ اسلامی اور ملکی انتخابات

ا۔ تنظیم اسلامی نہ بحیثیت جماعت ملکی انتخابات میں حصہ لے گی' نہ ہی اپنے کس
رفیق کو اجازت دے گی کہ وہ کسی انتخاب میں خود بحیثیتِ امیدوار کھڑا ہو
کسی دوسرے امیدوار' یا جماعت یا محاذ کے حق میں کنویسنگ کرے۔ اس
معاملے میں خلاف ورزی اخراج عن التنظیم پر بھی منتج ہو سکے گی!

ب۔ البتہ رفقاء تنظیم اپنا حق رائے دہی' جو اصلاً قومی امانت ہے' ادا کرنے کے لئے
کسی امیدوار کو ووٹ دے سکیں گے۔ بشرطیکہ وہ امیدوار:
(i) کم از کم ظاہری اعتبار سے فسق وفجور کا مرتکب نہ ہو' ------ اور
(ii) کسی ایسی جماعت سے وابستہ نہ ہو جس کے منشور میں کوئی بات خلافِ
شریعت موجود ہو۔ تاہم نظم کے اعتبار سے اس ضمن میں متعلقہ رفیق کی
ذاتی رائے اور صوابدید ہی حتمی ہو گی!

ج۔ اس دفعہ کا اطلاق مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ کے علاوہ بلدیا

(باقی صہ۲۱)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے

جلد:	۳۹
شمارہ:	۶
ذوالقعدہ	۱۴۱۰ھ
جون	۱۹۹۰ء
فی شمارہ	-/۵
سالانہ زرِ تعاون	-/۵۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳
سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۶
پبلشر: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

'نقضِ غزل' کا ردِ عمل

سالِ رواں کے جنوری اور مارچ کے شماروں میں 'نقضِ غزل' کی اشاعت پر حسب شدید مخالفانہ ' مخلصانہ و ناصحانہ ' اور تائیدی و وضاحتی ' ہر نوع کا ردِ عمل موصول ہوا - آج صحبت میں اسی کے بارے میں کچھ عرض کرنا پیشِ نظر ہے -

---

قارئینِ 'میثاق' کو یاد ہو گا کہ 'نقضِ غزل' کی اشاعت کا زوردار داعیہ جنوری ۸۹ء میں میں بعض احباب سے گفتگو کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا - جدّہ کے ڈاکٹر فرحت علی برنی طائف کے ڈاکٹر شجاعت علی برنی سے ہونے والی اُس گفتگو کا مفصّل تذکرہ اوّلاً 'میثاق' فروری ۸۹ء میں ہوا تھا (صفحات ۹۲ تا ۹۵) - اور پھر اس کا حوالہ جنوری ۹۰ء کی اشاعت بھی دیا جا چکا ہے - (صفحات ۱۱ ' ۱۲) - اس گفتگو میں راقم الحروف کے سامنے اچانک یہ حقیقت بڑی شدّت کے ساتھ آئی تھی کہ جہاں تک جماعتِ اسلامی پاکستان کے موجودہ طریق سے میرے اور تنظیمِ اسلامی کے اختلاف کا تعلق ہے وہ تو میری تالیف " تحریکِ جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ " کے ذریعے پوری وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے ہے ... لیکن جہاں تک جماعت سے علیحدگی کا تعلّق ہے اس کے اصل سبب کے بارے عوام تو درکنار قریبی مخلصین اور احباب بھی بالکل اندھیرے میں ہیں اور اس کے لازم ہے کہ 'نقضِ غزل' کو مکمل کر کے شائع کر دیا جائے -

---

بالکل اسی نوع کا شدید احساس اِن سطور کی تحریر سے ٹھیک ایک ماہ قبل رمضان مبارک کی ایک شام کو ہوا - جب بعدِ افطار دعوتِ طعام میں جماعتِ اسلامی لاہور کے نمایاں ارکان سے بشمول سید اسعد گیلانی صاحب ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا - اس موقع

م گیلانی صاحب نے بڑے گہرے تأثر کے ساتھ فرمایا کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا
جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی میں سوائے ایک ملکی انتخابات میں حصّہ لینے یا نہ لینے
اور کیا فرق ہے!" جس پر میں نے عرض کیا کہ "یہ فرق معمولی نہیں بہت بڑا ہے!" (بلکہ
موقع پر میری زبان سے کچھ نامناسب الفاظ بھی نکل گئے تھے جن پر گہرا تأسّف تو مجھے
وقت لاحق ہو گیا تھا لیکن فی الفور معذرت کرنے سے اندیشہ تھا کہ کہیں "عذرِ گناہ بدتر
ناہ" والا معاملہ نہ بن جائے' لہٰذا میں نے سکوت ہی کو مناسب سمجھا- بعد میں بھی کئی بار
ں آیا کہ فون پر معذرت کر لوں لیکن اس میں بھی یہ احتمال نظر آیا کہ اس طرح "جہر
ہ" کے بارِ دگر اعادہ کی صورت نہ بن جائے... بہرصورت اب میں بغیر ان نامناسب
ا کو نقل کئے گیلانی صاحب سے علی رؤوس الاشہاد معذرت کرتا ہوں ع "گر قبول افتد
ہ عزّو شرف!)... اس پر گیلانی صاحب نے فرمایا کہ "انتخابات کا مسئلہ خواہ اپنی جگہ کتنا
بڑا کیوں نہ ہو آخر ہے تو صرف تدبیر ہی کا معاملہ!"...... جس پر میں نے عرض کیا کہ:
کی بات بالکل درست ہے' اور میں ہرگز اس اختلاف کی بنا پر جماعت سے علیحدہ نہ ہوتا
بلکہ جماعت میں اختلافِ رائے اور اس کے اظہار کے لئے راستے کھلے رکھے جاتے!"
نی صاحب نے جواباً ارشاد فرمایا کہ "جماعت میں اختلافِ رائے کی آزادی تو موجود ہے!"
ب میں نے عرض کیا کہ "مجھے اس بات کا جواب دیں کہ آیا ماچھی گوٹھ میں یہ طے ہوا تھا
ں کہ جماعت اسلامی کی طے شدہ پالیسی سے اختلاف رکھنے والے لوگ جماعت میں
سکتے ہیں لیکن (i) نہ بذریعہ تحریر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں (ii) نہ نجی گفتگوؤں میں
رائے پیش کر سکتے ہیں (iii) نہ ہی مقامی' حلقہ جاتی اجتماعاتِ ارکان میں اظہار خیال کر
ہیں...... بلکہ صرف اور صرف کُل پاکستان اجتماعِ ارکان ہی میں گفتگو کر سکتے ہیں! اب
۔ مجھے یہ بتایئے کہ اوّلاً ایسا اجتماع کئی کئی سال بعد منعقد ہوتا ہے' پھر اس میں کئی ہزار
د شریک ہوتے ہیں اور ارکان کے خصوصی اجتماع کے لئے بہت مختصر وقت ہی رکھا جا
ہے - چنانچہ حالیہ کُل پاکستان اجتماع میں آپ نے صرف ایک مختصر نشست ارکان کے
مخصوص رکھی تھی...... تو اس صورت میں اختلافِ رائے کا اظہار کیسے ممکن ہے؟"
ں پر محترم گیلانی صاحب نے تو سکوت اختیار فرمایا لیکن حاضرین میں سے ایک سینئر رکنِ
ت نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "صَدَقْتَ!"...... میں نے محترم گیلانی

صاحب سے یہ بھی دریافت کیا کہ: "آپ ہی کے اُس انٹرویو سے جو ہفت روزہ 'ندا'
شائع ہوا ہے، مجھے یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمد امین صاحب کو جماعت سے نکالا گیا ہے'
آپ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ ان کا 'جُرم' کیا تھا؟"...... اس پر جب انہوں نے یہ تسلیم کر
اُن کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے جماعت کی پالیسی کے بارے میں ایک سوال
مرتّب کر کے بعض ارکانِ جماعت کو ارسال کیا تھا تو میں نے عرض کیا کہ پھر بتائیے
جماعت میں اختلافی رائے کے پنپنے کا کونسا موقع ہے؟ اس پر جو خاموشی جملہ حاضر
طاری ہوئی اُس سے اُن کی شرافت اور متانت کا تو گہرا تأثر قلب نے قبول کیا لیکن
ملاقات اور گفتگو سے راقم الحروف کو مزید انشراح حاصل ہوا کہ 'نقضِ غزل' کی اشا
نہایت ضروری اور لازمی تھی۔

میرے لئے 'نقضِ غزل' کی اشاعت کے ضمن میں سب سے زیادہ اطمینان بخش
یہ سامنے آئی کہ میرے بعض نہایت قریبی اور دیرینہ رفقاءِ کار نے صراحتہً تسلیم کیا
"آپ کے جماعت اسلامی سے پالیسی کے اختلاف کے بارے میں تو ہمارا ذہن بھی
واضح تھا' اور ہمیں اس پر پورا شرحِ صدر بھی حاصل تھا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ جماعت
علیحدگی اختیار کرنے کے فیصلہ پر خود ہمیں پورا انشراح حاصل نہ تھا' اور اس معاملے
قلب و ذہن میں ایک دبی اور چھپی ہوئی سی خَلِش موجود تھی جو کبھی دُور نہ ہو سکتی
'نقضِ غزل' کی تکمیل اور یکجا اشاعت نہ ہوتی!"۔

مزید بر آں 'ذاتی طور پر میرے لئے اس سے کہیں بڑھ کر اطمینان بخش امر یہ
"کُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ" (القمر: ۳) کے مطابق اس کی اشاعت کی صورت مِن جانبِ اللہ پیدا
یعنی یہ کہ تحریکِ اسلامی کی قیادت و امارت کے فلسفے کے موضوع پر مولانا مودودی مر
وہ تقریر جس کو میں ع "جسے میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں!" کے مصداق
سال سے تلاش کرتا رہا تھا وہ اچانک از خود ہفت روزہ 'آئین' کے صفحات پر جلوہ گر ہو گ
سے جماعت اسلامی پاکستان کی تاریخ کے ۵۷-۱۹۵۶ء والے گمشدہ باب کے
بعض سوالات جو خود راقم کے ذہن کے سامنے حل طلب موجود تھے ایک دم حل
اور اس طرح راقم 'نقضِ غزل' کی تکمیل پورے اطمینانِ قلب اور انشراحِ صدر کے

سکا...... اور بحمد اللہ راقم کو پورا اطمینان ہے کہ اگرچہ فی الوقت اس کی اشاعت بعض
رات کو ناگوار گزری ہے لیکن ان شاء اللہ تحریکِ اقامتِ دین اور اعلاءِ کلمتہ اللہ کی
و جهد کے وسیع تر تقاضوں اور مصلحتوں کے اعتبار سے اس کا منظرِ عام پر آنا نہایت مفید
ات ہوگا - واللہ اعلم !!

اور اب آیئے "ردِّ عمل" کے جائزہ کی جانب!

اس سلسلے میں شدید ترین ردّ عمل اُن حضرات کا ہے جنھوں نے اپنی ناراضگی
اظہار کے طور پر میثاق کی خریداری منقطع کر دی ہے - اگرچہ ایسے حضرات کی تعداد
ی توقع سے بہت کم رہی تاہم ان کے جذبات کی نمائندگی ایبٹ آباد کے قاضی عبد
دوس صاحب کے درج ذیل خط سے ہو جاتی ہے :

محترم ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ - گزشتہ دو تین ماہ سے "میثاق" میں ان واقعات کا تجزیہ کیا جا رہا ہے جسے آپ "نقضِ غزل" کے عنوان کے تحت با لالتزام شائع فرما رہے ہیں - عام قاری کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ "جماعت اسلامی" کے رکن کیوں بنے - اور کن حالات اور وجوہات کی بناء پر آپ نے اس جماعت سے علیحدگی اختیار کی -

میرا مقصدِ حیات تو "خُذْ مَا صفا وَ دعْ مَا کَدَر" ہے اچھی بات جہاں سے ملے اسے اپنایا جائے اور مکروہات سے اجتناب کیا جائے -

ٹیلی وژن پر آپ کے درسِ قرآن سن کر آپ کا ہمنوا بنا لیکن "میثاق" کے "نقضِ غزل" نے آپ کی حق گوئی کو واضح کر دیا - مولانا مرحوم سید ابوالاعلےٰ مودودی نے اسلام کے لئے جو کچھ کیا اس کا جواب وہ خود اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے پیش ہو کر دیں گے - رحلت کے بعد ان کے افعال پر تنقید کسی طرح بھی جائز نہیں - کیا یہ کم ہے کہ وہ قرآن سیکھنے والوں کے لئے "تفہیم القرآن" کی صورت میں ایک اعلیٰ پایہ کی تفسیر اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں - قرآن ہمیں "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا" کی تلقین کرتا ہے اور امارت کے شوق میں علیحدہ

جماعت بنانے سے منع کرتا ہے - لیکن آپ نے "وَلَا تَفَرَّقُوْا" سے بچنے کے لئے "نقضِ غزل" کے پردہ کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی ہے -

اس لئے میں بامرِ مجبوری درخواست کرتا ہوں کہ آئندہ مجھے "میثاق" کی خریداری سے معذور جان کر رسالہ ارسال نہ کیا جائے -

ایک بار پھر اس اقدام کے لئے معذرت خواہ ہوں - فقط والسلام

عبد القدوس

خریداری نمبر M-C-PK-FP-ATD-0014

قاضی صاحب موصوف اور ان کے ہم خیال حضرات سے ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان کی رائے صائب اور فیصلہ مناسب ہے اس لئے کہ فی الواقع 'میثاق' صرف علمی و اصلاحی یا محض دعوتی و تبلیغی جریدہ نہیں ہے - بلکہ ایک انقلابی تحریک کا ترجمان ہے اور اس تحریک کے مُقتضیات اس کے لیے ہمیشہ مقدم رہتے ہیں - بنابریں ایسے حضرات کا 'میثاق' سے قطع تعلق کر لینا بالکل درست ہے جو اس تحریک سے کوئی دلچسپی یا ذہنی و قلبی مناسبت نہ رکھتے ہوں -

---

۲- دوسرا کسی قدر نرم اور اصلاً ناصحانہ اور مخلصانہ ردِّ عمل جدّہ 'سعودی عرب سے جناب غلام فرید خاں صاحب کی جانب سے موصول ہوا ہے - موصوف اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص (بی کام ' سی پی آئی اور ایف سی آئی آئی لندن) ہیں - اور انہی کے مانند خیالات و احساسات بعض دوسرے حضرات کی جانب سے بھی ظاہر ہوئے ہیں لہٰذا ان کا خط بھی مِن و عَن شائع کیا جا رہا ہے - خان صاحب موصوف رقم طراز ہیں :

محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم - میرا تعلق ایک دیندار خاندان سے ہے اور خود بھی دینِ اسلام کی تعلیمات کی کسی حد تک معلومات رکھتا ہوں اور مزید علم و عمل کی کوشش کرتا رہتا ہوں - ماحول بھی بفضلہٖ تعالیٰ تعلیم یافتہ اور اسلام کے دلدادہ افراد کا ہی رہا لہٰذا جب آپ کی دعوت کی گونج کان میں پڑی تو اُدھر بھی متوجہ ہوا - دیگر دینی رسائل کا مطالعہ رہتا ہی تھا آپ کا میثاق اور حکمت قرآن بھی سالانہ

بنیاد پر لکھوا لئے - جن کا مطالعہ بھی کرتا ہوں ابھی میثاق جنوری ۱۹۹۰ء کے مطالعہ سے فارغ ہوا ہوں اور در حقیقت یہ خط بھی جنوری کا میثاق پڑھنے کے بعد مجبوراً آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں -

ڈاکٹر صاحب اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے آپ کو بڑی خوبیوں سے نوازا ہے - فنِ خطابت میں فی الوقت آپ کا ثانی کوئی نہیں پھر اس خداداد صلاحیت کے ساتھ ساتھ آپ کو بہترین استاد بھی میسّر آئے خود بقول آپ کے مولانا مودودی مرحوم جیسے مفسرِ قرآن کا قرب آپ کو زمانۂ طالب علمی میں ہی مل گیا تھا جس نے آپ کی صلاحیتوں کو بے مثال جِلا بخشی اور آپ کو کان سے نکال کر چمکدار ہیرا بنا دیا -

یقیناً مولانا مودودی مرحوم کے کئی دوسرے شاگردوں نے بھی اپنی اپنی جگہ بڑا نام پیدا کیا انہوں نے بھی جنہوں نے بالکل دنیا ہی کو اپنے مستقبل کے لئے پسند کر لیا اور انہوں نے بھی جنہوں نے آخرت کو ترجیح دی - اول الذکر میں ...... صاحب اور ...... صاحب کی مثال ہے اور آخر الذکر میں امین احسن اصلاحی اور عبد الغفار حسن صاحب جو اپنے اپنے طریقہ سے دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں - مولانا مودودی مرحوم کو جو مقام اور مرتبہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بخشا وہ اظہر من الشمس ہے کہ ان کو عالمِ اسلام کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا ایوارڈ یعنی فیصل ایوارڈ ملا - نہ صرف انہیں بلکہ ان کے شاگرد ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب اور ابھی حال ہی میں پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد صاحب کو بھی فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا - چند ماہ پیشتر اسلامی ڈویلپمنٹ بینک نے اپنے پندرہ سال مکمل ہونے پر معاشیات کے میدان میں ۴۲ ممبر ممالک میں جس شخص کا انتخاب کیا وہ بھی پروفیسر خورشید احمد صاحب ہی تھے -

مذکورہ بالا انتہائی اہم شخصیات نے کسی نہ کسی درجہ میں مولانا مودودی مرحوم سے اکتسابِ علم کیا یا ان کی صحبت میں رہے - ان میں کئی نے اصولی اختلاف کی بنا پر اپنی راہیں بھی جدا کر لیں اور اپنے اختلاف کا برملا اظہار بھی کیا لیکن اس کے بعد یہ حضرات اپنے اپنے کام میں لگ گئے - امین احسن اصلاحی صاحب نے تصنیف و تالیف کی طرف توجّہ دی اور "تدبّر القرآن" جیسی تفسیر اور

'تزکیۂ نفس' جیسی اعلیٰ درجہ کی کتب لکھیں جو رہتی دنیا تک امت کو فائدہ پہنچاتی رہیں گی - ...... صاحب نے اپنے لئے نئی راہ کا انتخاب کیا اور اس پر رواں دواں ہیں - خوب دنیا کمائی - اس طرح ...... صاحب بھی شروع شروع میں مولانا مودودی پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرکے اپنی منزل کی طرف چل پڑے -

بفضلہٖ تعالیٰ آپ نے بھی اپنے لئے خیر کا راستہ اختیار کیا لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس کارِ خیر کے پیچھے کچھ مقابلہ بازی کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے - خیال یہ تھا کہ پختگیٔ عمر اور کثرتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ طبیعت میں نرمی اور ٹھہراؤ آتا جائے گا لیکن افسوس کہ آپ کے بہی خواہوں کی توقع پوری ہوتی نظر نہیں آتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی مزید پختہ ہو رہا ہے - قابل احترام جناب ڈاکٹر صاحب آپ کو شاید خود اندازہ نہ ہو (عام طور پر آدمی اپنی کمزوری سے واقف نہیں ہوتا) کہ آپ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کی مخالفت اور اس کے نتیجہ میں جماعت اسلامی کی مخالفت میں اخلاق کی کن کن حدود کو پھلانگ چکے ہیں - آپ نے مولانا مودودی مرحوم پر علمی سرقہ تک کا الزام بار بار لگایا ہے جبکہ آپ خود جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ 'تفہیم القرآن' یا 'تدبر القرآن' میں کم از کم ۹۰ فی صد ضرور ہی مل جاتا ہے - البتہ لفظ "میں" کی تکرار اور فنِ خطابت آپ کا اپنا ہوتا ہے - دریں حالات میں سمجھتا ہوں کہ میثاق میں سوائے اس کے کہ آپ کے جذبۂ مخالفت کی تسکین ہو ایک اتحادِ ملی کے حامی، صلح پسند اور اکابرینِ ملت کی عزت کرنے والے شخص کے لئے کچھ زیادہ نہیں - میرے خیال میں یہ بہتر ہوگا کہ اس قسم کا خاص شمارہ کم از کم مجھے تو نہ بھیجا جائے تاکہ ذہنی اذیت سے محفوظ رہوں البتہ آپ کے لئے میں ہمیشہ دعائے خیر کرتا رہوں گا - جو اکابرین ملت فوت ہو چکے ہیں وہ اپنے مالک و آقا کے پاس پہنچ چکے ہیں - اور اللہ ہی ان کے بارے میں بہتر جانتا ہے - ہم بھی ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں - والسلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہ

نیاز مند غلام فرید خان

JED-063

ہمیں غلام فرید خاں صاحب کے ایک ایک لفظ سے اُن کے خلوص اور اخلاص اور نُصح و خیر خواہی کا جذبہ جھلکتا محسوس ہوا ہے' اور اگر ایک آدھ جگہ تلخی کا اظہار ہوا ہے تو اُس سے بھی کسی عِناد یا بُغض کی بُو نہیں آئی...... مزید برآں جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' خان صاحب موصوف کا یہ خط بھی بہت سے حضرات کے جذبات اور احساسات کی نمائندگی کرتا ہے- بنابریں افادۂ عام کے لئے بعض وضاحتیں ضروری ہیں- امید ہے کہ خان صاحب موصوف اور ان کے طرز پر سوچنے والے حضرات ان گزارشات پر اپنے آپ کو ہماری جگہ متصوّر کرتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں غور فرمائیں گے-

راقم الحروف نے حال ہی میں ایک معروف صاحبِ علم و قلم سے گفتگو کے دوران اپنے بارے میں یہ' اعتراف' کیا کہ میرا ذہن اُس "تصوّرِ فرائضِ دینی" پر **متحجّر** (Fossilised) ہوگیا ہے جو مجھے ابتداً تحریک اسلامی کے اساسی لٹریچر یعنی مولانا مودودی مرحوم اور مولانا اصلاحی صاحب کی تصانیف کے ذریعے حاصل ہوا' اور بعد ازاں اس کی پوری اور نہایت تاکیدی توثیق کتابِ الٰہی اور سنّت و سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعے کے ذریعے حاصل ہوگئی- بنابریں میری مجبوری یہ ہے کہ میں دین کی کسی جُزوی خدمت اور محض علمی و تعلیمی یا صرف تبلیغی و اصلاحی کام پر مطمئن نہیں ہو سکتا-

میں اپنے اس فکر کے ہاتھوں اس درجہ' مجبور' ہوں کہ جن اکابر کا ذکر آپ بطور" اسوۂ حسنہ" کر رہے ہیں' ان کی شخصی قدر و منزلت' اور ان کی علمی یا تدریسی خدمات کے اعتراف کے باوجود میں نہ صرف یہ کہ ان کی پوزیشن کو کسی درجہ میں بھی قابلِ رشک نہیں سمجھتا' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اُن کے طرزِ عمل کو غیر منطقی اور ناقابلِ فہم ہی نہیں فراریت اور شکست خوردگی کا مظہر قرار دینا بھی غلط نہ ہوگا-

یہ حضرات جماعت اسلامی میں شامل نہ ہوئے ہوتے تو بات اور تھی' اس صورت میں وہ جو کام پہلے سے کر رہے تھے انہیں ہی جاری رکھتے تو کسی اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی لیکن صورتِ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے سترہ سترہ سال ایک تحریک کے ساتھ نمایاں طور پر وابستگی کی صورت میں بسر کئے' سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں کو اُس تحریک کی دعوت سے متعارف کرایا چنانچہ بہت سے لوگ اُنہی کے زیرِ اثر اور انہی کی وساطت سے جماعت

میں شامل ہوئے - اس کے بعد اگر انہوں نے کسی سبب سے جماعت سے علیحدگی اختیار کی تھی تو اُن کے لئے عقلی اور منطقی طور پر مندرجہ ذیل دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنا لازمی تھا:

۱- اگر اُن کے خیال میں اس تحریک کی اساسی دعوت و نصب العین ہی میں ع "مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی!" کے مصداق کجی تھی گویا اُس کا بنیادی فکر ہی غلط تھا تو انہیں صاف اعتراف کرنا چاہئے تھا کہ سترہ سال قبل جب انہوں نے مولانا مودودی مرحوم کی رفاقت اختیار کی تھی تو خود انہوں نے شدید علمی اور فکری ٹھوکر کھائی تھی اور وہ محض ایک شخص کی انشاپردازی سے اس درجہ مرعوب ہو گئے تھے کہ فکری اعتبار سے زہرِ ہلاہل کو قند سمجھ کر نوشِ جان کر بیٹھے...... اس اعتراف کے ساتھ لازم تھا کہ وہ جماعت کے اساسی فکر کی زہرناکی کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اس متبادل فکر کو بھی پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیتے جس پر اب انہیں انشراحِ صدر حاصل ہوا ہے۔ اور پھر اُس کے مطابق عملی جدّوجہد میں بالفعل مصروف ہو جاتے -

۲- اور اگر اُن کے نزدیک جماعت کا تحریکی فکر بھی بحیثیت مجموعی صحیح تھا اور اس کا ف بھی اصلاً درست تھا' تو ان کے لئے لازم تھا کہ معیّن طور پر یہ بتاتے کہ آیا جماعت کے طریق کار میں کوئی کجی آ گئی ہے' یا اس کے فلسفۂ تنظیم میں گمراہی کے جراثیم پیدا ہو گئے ں جن کے باعث اُن کی جماعت سے علیحدگی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو گئی ہے...... ں صورت میں بھی لازم تھا کہ وہ اپنے اس اختلاف کو معیّن طور پر بیان کرنے کے بعد اسی بق نصب العین اور اساسی فکر کے مطابق صحیح طریق کار اور صحت مند اصولِ تنظیم نیار کر کے اجتماعی جدّوجہد کو جاری رکھتے!

ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار نہ کر سکنے کے باعث جو نقصان اِن حضرات ذاتی طور پر پہنچا' اس صورت میں بھی کہ اُن کی حیثیتِ عرفی کو دھکّا لگا' اور اس اعتبار سے ا کہ اُن کی خداداد صلاحیتیں اور توانائیاں سکڑ کر رہ گئیں (یہ الفاظ خود مولانا امین احسن لاحی کے ہیں جو انہوں نے جماعت سے علیحدگی کے دس سال بعد ۱۹۶۷ء میں اجتماعِ رحیم خاں میں ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کے فیصلے کے موقع پر کہے تھے ... (جس کا تفصیلی اس اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ دیا جا رہا ہے -) اُس پر مستزاد اور زیادہ تکلیف دہ

بات یہ ہے کہ اُن کا وہ موقف بھی کمزور اور ناقابلِ اعتبار ہوگیا جو اپنی جگہ نہایت قوی اور مدلّل تھا۔ اس لئے کہ جماعت اسلامی کے عام ارکان اور کارکنان کا یہ الزام ان پر درست طور پر چسپاں ہوگیا کہ اگر یہ لوگ مخلص تھے اور ان کا موقف درست تھا تو انہوں نے جماعت سے علیحدہ ہو کر اس کے مطابق اجتماعی جدّوجہد کیوں نہ کی؟

قصّہ مختصر یہ کہ راقم الحروف اوّلاً...... اپنے فکر کے "متحجّر" ہو جانے کے ہاتھوں 'مجبور' ہے 'ثانیاً...... ع "میں ہوں اپنی شکست کی آواز!" کی صورت اختیار کر کے زندہ رہنے کے 'حوصلے' سے محروم ہونے کے باعث 'معذور' ہے بنابریں اُس کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ حسبِ سابق اقامتِ دین کی اجتماعی جدّوجہد کے لئے اپنا تن من دھن لگائے رکھے!...... اور چونکہ اُس نے نہ صرف یہ کہ عبادتِ ربّ کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ شہادتِ حق اور اقامتِ دین کے لئے اجتماعی جدّوجہد کی فرضیّت اور لزوم کا سبق ابتداءِ تحریک جماعتِ اسلامی ہی سے سیکھا تھا بلکہ عمرِ عزیز کے دس سال بھی اس کے ساتھ بھرپور عملی وابستگی کی صورت میں گزارے تھے ...... لہٰذا اس کے لئے لازم تھا کہ معیّن طور پر واضح کرے کہ : (۱) اس کے نزدیک جماعت کے اساسی فکر میں کوئی کمی یا خامی تھی یا نہیں اور تھی تو کیا؟ (۲) جماعت کے طریق کار میں کوئی غلطی دَر آئی ہے تو کونسی؟ اور (۳) اس کے طریقِ تنظیم میں کوئی قابلِ اصلاح پہلو ہے یا نہیں اور ہے تو کونسا؟...... چنانچہ میں یہ کام مجبوراً اور تحریک کے منطقی تقاضوں کے شدید دباؤ کے تحت کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب والشّہادۃ ہے ہی 'مجھے قریب سے جاننے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ نہ میرا کوئی پسندیدہ مشغلہ ہے 'نہ وقت گزاری کا بہانہ' بلکہ میرے عین مقصدِ حیات کا تقاضا ہے جسے میں ادا نہ کروں تو گویا اپنی معنوی موت کے وارنٹ پر خود دستخط ثبت کر دوں گا۔ اس لئے کہ میرے پاس ۔ "ماہم بہ لاغ ولابہ تسلّا شویم کاش ۔ ناداں ز بزمِ دوست چہ خوشنود می رود!" کے مصداق اپنے ضمیر کو تھپکیاں دے دے کر سلا دینے کا کوئی بہانہ موجود نہیں ہے!!

کاش کہ میرے ناصح اور خیر خواہ حضرات ع "وزدرونِ من نہ جُست اَسرارِ من!" پر عمل پیرا ہونے کے بجائے میرے معاملے پر ہمدردانہ غور کر سکیں!

محترم غلام فرید خاں صاحب کے خط میں ایک بات البتّہ مغالطہ آمیز ہے جس کی

وضاحت ضروری ہے - اور وہ یہ کہ میں نے کبھی مولانا مودودی مرحوم پر علمی سرقہ کا الزام عائد نہیں کیا - ویسے بھی علم اور حکمت کسی کی میراث نہیں ہیں - اور اس میدان میں سب جانتے ہیں کہ چراغ سے چراغ روشن ہوتا چلا آیا ہے...... مولانا مرحوم کے بارے میں میرا یہ احساس ضرور رہا ہے اور اسے میں نے بعض مواقع پر بیان بھی کیا ہے کہ انہوں نے اپنے اساسی فکر کے ضمن میں جن اکابر سے کسبِ فیض کیا اُن کے ذِکر اور شکر کا حق ادا نہیں کیا...... رہا خود میرے اپنے فکر میں مولانا کے خیالات کا انعکاس تو اس کا اعلان و اعتراف تو میں نے ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ کیا ہے...... یہاں تک کہ یہ الفاظ بھی تحریر کئے ہیں کہ "میں نے جماعت اسلامی کی گود میں آنکھ کھولی ہے اور جس طرح ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے ان حضرات (مولانا مودودی مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی) کی آنکھوں سے دیکھنا' ان کے کانوں سے سننا' ان کے دماغوں سے سوچنا اور ان کی زبانوں سے بولنا سیکھا ہے" - (تحریک جماعت اسلامی صفحہ ۴۱) ع "پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں!"

۳- مندرجہ بالا دونوں خطوط کے بالکل برعکس' اور مولانا مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی کے ساتھ انتہائی نفرت و عناد کا مظہر ردّ عمل رحیم یار خاں کے جناب ارشاد احمد علوی کے خط میں سامنے آیا ہے' ان کے خط میں مندرجہ بالا دو خطوط میں سے پہلے خط کے مانند تیزی اور تندی بھی ہے' اور دوسرے خط کے انداز میں (اگرچہ بالکل متضاد نقطۂ نظر سے) نصیحت اور فہمائش بھی!! واضح رہے کہ علوی صاحب بھی جماعت اسلامی کے سابق ارکان میں سے ہیں' اور ان کا یہ خط بھی ایک پورے مکتبِ فکر کی نمائندگی کرتا ہے:

محترمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب - السلام علیکم و رحمتہ اللہ

۲۰ سال بعد آپ پھر "غزل سرا" ہوئے - باسی کڑھی میں ابال آیا - اب بے وقت کی راگنی سے فائدہ؟ بروقت آپ لوگوں نے اپنا فرض ادا نہ کیا - جو لوگ رازہائے درونِ پردہ سے واقف تھے ان پر لازم تھا کہ وہ جماعت کے مخلصین کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیں - مگر اُس وقت آپ نے' حکیم اشرف صاحب نے اور دیگر نے بے خبروں کو بے خبر رکھنا ہی مناسب سمجھا - آپ نے ہمت کی اور

"نقضِ غزل" کی قسطیں شروع کیں مگر کوئی " بزرجمہر " اسی طرح آپ کے آڑے آگیا جیسے آپ شیخ جمیل الرحمٰن اور مولانا وصی مظہر ندوی کے آڑے آ گئے تھے - آپ لوگوں نے بعض حکیموں کے " صدری نسخوں " کی طرح اس اجتماعی امانت کو بھی اپنے سینہ میں دفن رکھا - اب جوش دکھانے کا فائدہ ؟

جن شرمناک تفصیلات اور افسوسناک حقائق سے آپ واقف ہیں ، اس کے بعد تو آدمی کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ع " جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں " مگر آپ کا حال ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ ہر وقت اسی گم کردہ راہ قافلہ میں شامل ہونے کے لئے بے چین رہتے ہیں - کئی بار آپ اظہار کر چکے ہیں اور ابھی گزشتہ دنوں پھر یہ بات دہرائی کہ آپ ساتھیوں سمیت جماعت میں شامل ہونے کے لئے تیار ہیں - بس ذرا طریق کار کو بدل لیں -

محترم ! طریق کار کا اختلاف کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے - اصل چیز بنیادی عقائد اور دینی فکر ہے - ان کی فکر ٹیڑھی ہے - یہ الحاد کا شکار ہیں - یہ لوگ خدا کے دین کو سیاسی عینک سے دیکھتے ہیں اور ہر بات کا سیاسی مفہوم نکالتے ہیں - " حکمتِ عملی " کے خود ساختہ اصول کے تحت دینِ حق میں ترمیم و تنسیخ کی جرأت کرتے ہیں - اور رسول خدا کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے - چنانچہ تمام خادمانِ دین ، بزرگان ، اسلاف حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ اور انتہا یہ کہ انبیاءؑ عظام سب کو تنقید کا نشانہ بنایا - صرف " رسولؐ خدا " کو معاف رکھا - اس کے علاوہ صرف مودودی صاحب کی ذات کو " چھوئی موئی " بنایا ہوا ہے - ان پر نہ صرف یہ کہ تنقید نہیں کرتے بلکہ تنقید برداشت بھی نہیں کرتے - شاید " حضرت " کو بھی " رسولؐ خدا " سمجھتے ہوں - اس دینی فکر کے ہوتے ہوئے طریق کار کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے -

صحابۂ کرامؓ پر کذّابوں ، دجّالوں اور رافضیوں کے لگائے ہوئے تمام بہتانات کی تائید کر کے اور خود بھی دو چار بہتان جڑ کر مودودی صاحب نے اپنی اصلیت ظاہر کر دی - اس کے بعد بھی کوئی صاحبِ ایمان شخص مودودی صاحب یا ان کے اندھے مقلّدین کے بارہ میں کوئی حسنِ ظن رکھتا ہے تو وہ خود بھی مشکوک ہے

باوجود آپ کو مشکوک بنا رکھا ہے - آپ ابھی تک "بُتِ مودودی" کے پجاری ہیں - آپ کی دینی بصیرت کیا ہے کہ آپ اِس شخصیت کو تا حال نہیں پہچان سکے - اگر تمام حقائق کے باوجود آپ اس گمراہ جماعت کا حصہ بننا چاہتے ہیں تو بسم اللہ کیجئے - دیر کیا ہے ع پہنچے گی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر ہے (تصرف کے لئے معذرت)

آپ ایسے باخبر شخص کے لئے تو ضروری تھا کہ پوری جرأت کے ساتھ اس لائن سے اظہارِ برأت کر دیتا - کم از کم درجہ یہ تھا کہ سو فی صد نظر انداز کر کے پوری یکسوئی کے ساتھ دینِ حق کی خدمت کرتے رہیں - مگر آپ بہانہ بہانہ سے مودودی صاحب کی ذات اور ان کی جماعت کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں - اپنا اخلاص ' نیاز مندی اور خدمات گنواتے ہیں - میرے محترم! آپ الٹے بھی لٹک جائیں تو وہ کبھی نہیں مانیں گے الاّ یہ کہ آپ بھی ان کی طرح اندھے مقلّد بن جائیں -

صحیح العقیدہ مسلمانوں کو آپ سے خطرہ یہ رہتا ہے کہ جس طرح آپ کے پیر و مرشد مودودی صاحب نے خالص دین کے نام پر قوم کا مکھن جمع کیا اور اسے شیعیت کے قدموں میں لے جاکر ڈال دیا اب آپ بھی بچا کھچا مکھن اپنے گرد دین کے نام پر جمع کر کے مودودیت کے قدموں میں لے جاکر ڈال دیں گے - کاش! آپ اس دلدل سے نکل سکتے - یکسو ہو جاتے - صحابہ کرام پر بہتانات لگانے والوں سے ذرہ بھر بھی دلچسپی نہ رکھتے - خدا کے لئے محترم! اپنے آپ کو سنبھالیں - "اُسی عطار کے لونڈے" سے دوا لینے کا خیال ترک کر دیں جس کے سبب "بیمار" پڑے ہیں - اللہ تعالیٰ توفیق سے نوازیں - آمین

والسلام آپ کا خیر خواہ
ارشاد احمد علوی

محترم ارشاد احمد علوی اور ان کے ہم خیال حضرات کی خدمت میں کچھ گزارشات پیش کرنے کے بارے میں کچھ سوچتے ہوئے اچانک ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوا کہ تقریباً ایک ماہ پیشتر پشاور سے خیبر میڈیکل کالج کی ایک طالبہ کا خط موصول ہوا تھا جس میں انہوں نے مولانا مودودی مرحوم اور تفہیم القرآن کے بارے میں بعض علماءِ کرام کی آراء

حوالے سے اپنے لئے رہنمائی چاہی تھی۔

آنعزیزہ کو جو جواب راقم نے ارسال کیا تھا، مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اس مقام پر کو من و عن درج کر دیا جائے...... وھو ھذا:۔

" آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی شخصیت کے دو پہلو تھے: ایک یہ کہ وہ ایک عالم، مفکر اور مصنف تھے، اور اُن کی علمی آراء اور نظریات میں صحیح چیزیں بھی ہیں اور غلط بھی، چنانچہ جہاں انہوں نے اسلام کے سماجی اور سیاسی اور کسی حد تک معاشی نظام کی وضاحت میں بہت وقیع خدمات سر انجام دیں، وہاں انبیاء کرامؑ اور صحابہ کرامؓ کے تذکرہ میں اُن کا قلم عام طور پر بھی بے باک ہو جاتا ہے، ...... اور بالخصوص ان کی تصنیف "خلافت و ملوکیت" تو بہت ہی گمراہ کُن کتاب ہے ...... دوسرے یہ کہ وہ ایک تحریک کے داعی تھے، اور انہوں نے اقامتِ دین کی جدّوجہد اور غلبۂ دین کے لئے جہاد کی فرضیت کو خوب سمجھا اور سمجھایا۔ میری اُن سے اصل دلچسپی اسی پہلو سے ہے۔ اور میں اپنی دعوت اور تحریک کا تعلق ان ہی کی دعوت اور تحریک کے ساتھ جوڑتا ہوں۔ البتّہ مجھے صدمہ ہے کہ انہوں نے ۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد اپنے ہی اصولی موقف سے انحراف اختیار کر لیا!...... یہاں یہ بات بھی واضح ہو جائے تو اچھا ہے کہ ہمارے قدیم مذہبی نظامِ تعلیم سے وابستہ علماءِ کرام کی اکثریت فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت سے غافل ہے۔ چنانچہ انہیں مولانا مودودی مرحوم کی برائیاں تو نظر آتی ہیں خوبیاں بالکل نظر نہیں آتیں۔

بہر حال آپ کی طلب صادق ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ عنکبوت کی آخری آیت میں وارد شدہ پختہ وعدے کے مطابق آپ کو ضرور ہدایت دے گا۔ تفہیم القرآن۔ آپ ضرور پڑھیں لیکن اس کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی بھی لازماً مطالعہ میں رکھیں۔ اس سے تفہیم کے ممکنہ مضر اثرات کا ازالہ ہو جائے گا۔ البتّہ دین کا تحریکی تصوّر آپ کو تفہیم کے علاوہ کسی اور تفسیر سے نہیں ملے گا"۔

اسی تسلسل میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی شخصیت کا رِدّعمل بھی سامنے آ جائے جسے حلقہ دیوبند کے اکابر علماء کے ساتھ صرف محبّت اور عقیدت ہی کا نہیں قریبی

تعلق اور ذاتی روابط کا شرف بھی حاصل ہے - ان کے مختصر لیکن نہایت معنی خیز ردِ عمل کی اہمیت واضح نہیں ہوگی اگر اُن کا ذاتی تعارف سامنے نہ آجائے ——— جو حسنِ اتفاق سے خود اُن کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے - یہ اُن کے اُس طویل مکتوب میں شامل تھا جو 'میثاق' کی جنوری ۸۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا... جو حسب ذیل ہے:

" دہلی کا رہنے والا ہوں - ولادت ۱۹۲۸ء میں ہوئی - ننھیال ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خاندان سے متعلق ہے - والد صاحب حضرت شیخ الہندؒ سے نسبت رکھتے تھے - خلافت کے زمانہ سے پریکٹس چھوڑ کر تجارت اور انکم ٹیکس کے مقدمات کی پیروی تک محدود رہ گئے تھے - نہایت دین دار اور متقی بزرگ تھے - حج سے فراغت کے ایک سال بعد ۱۹۴۵ء میں وفات پاگئے - حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ سے تعلق بڑھا لیکن بیعت نہ ہوئے اور آخر میں مولوی محمد الیاس صاحبؒ بانیٔ جماعتِ تبلیغ سے عشق کی حد تک تعلق تھا...... ہم تین بڑے بھائی حافظ ہوئے اور عربی ' فارسی کے عالم بھی - ساتھ ہی ضرورتِ وقت کے پیش نظر انگریزی تعلیم سے بھی بے بہرہ نہ رہے - یہ شاید اس کا اثر تھا کہ سابق وزیر و وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی کے تعلیمی دور میں دہلی میں میرے والد صاحب ہی اُن کے سرپرست و نگران تھے ...... میں نے دورۂ حدیث حضرت مفتی اعظم ' محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور شیخ الاسلام مولوی سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے زیر سایہ مکمل کیا ' تفسیر میں مولوی محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ میرے استاد تھے - درسِ نظامی میں ان حضرات کے علاوہ مولوی اشفاق حسین صاحب کاندھلویؒ اور مولوی شریف اللہ صاحبؒ (یہ دونوں حضرات مولوی ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اور مولوی اخلاق حسین صاحب قاسمی کے بھی استاد تھے) بھی شامل تھے ...... قاسمی صاحب مجھ سے نسبتاً سینئر تھے وہ میرے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ کے ہیں ...... میں نے حفظِ قرآن کے بعد تجوید اور پھر سبعہ قراءت وغیرہ کی بھی تکمیل کی ...... میری علمی ' دینی اور ذہنی تربیت مولوی محمد کفایت اللہ صاحبؒ اور مولوی قاری محمد طیب صاحبؒ (بعد میں یہ دونوں حضرات رشتہ میں میرے سمدھی بھی بنے)، مولوی سید حسین احمد صاحبؒ مدنی جو میرے شیخ اور مشفق استاد بھی تھے، مولوی محمد الیاس صاحبؒ ' مولوی ابو الکلام آزاد صاحب ' مولوی احمد سعید صاحب ' مولوی حفظ

الرحمٰن صاحبؒ سیوہاروی اور قطبِ وقت حضرت مولوی عبد القادر صاحبؒ رائپوری جیسے اکابر کی نگرانی میں ہوئی۔حاشا یہ خود ستائی نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ ان سب کی ہی خصوصی محبتیں ،شفقتیں اور قربتیں مجھے نصیب رہیں۔ فللّٰه الحمد علیٰ ذٰلك!"

اس "طویل" تعارف کے بعد "نقضِ غزل" پر موصوف کا "مختصر" تبصرہ ملاحظہ ہو:

راں، دہلی نمبر 6

۳؍ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ ۳۱؍ مارچ ۱۹۹۰ء

محترم المقام زید مجدکم!

السلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہ متعنا اللّٰہ بطول بقائکم

مزاج سامی!

شعبان کی آخری تاریخوں میں دہلی واپس لوٹنے پر "میثاق" نظر نواز ہوا۔ تین ماہ کے پرچے پیشِ نظر رہے۔ "حکمتِ قرآن" کا صرف مارچ کا ہی شمارہ ملا۔ جنوری و فروری کے پرچے نہیں ملے۔ "نقضِ غزل" بالاستیعاب پڑھا۔ اس ترشی نے تو جماعت اسلامی کا تمام ہی نشہ اتار دیا۔ گویا بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ میں نے بالمشافہ بھی عرض کیا تھا آپ ڈاکٹر نہ بنتے تو اچھے بیرسٹر بنتے۔ صغریٰ کبریٰ کی بساط کس سلیقہ سے جماتے ہیں، پھر نتائج پر سر نہ دھنا جائے تو کیا کیا جائے؟

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

تنظیم اسلامی کے سلسلے میں آپ کا ویٹو کا حق ہمیشہ دل میں کھٹکتا تھا، "نقضِ غزل" پڑھنے سے کلی طور پر شرحِ صدر ہوگیا اور آپ کی مصلحت دل میں اتر گئی اور آپ کی پیش بینی کا اور بھی سکہ جم گیا۔ شاید ذوق کا شعر ہے ۔

نکہ نہیں حرفِ دل نشیں تھا، دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر
جو نکلا آنکھوں کے راستے سے تو دل میں اترا خدنگ ہو کر

نیاز مند

اختر ہاشمی

اور اب آیئے بعض ایسے امور کی جانب جن میں کسی غلطی کی تصحیح' یا کسی واقعہ
تردید' یا بعض ذاتی وضاحتیں شامل ہیں -

۱- ان میں سے ایک تصحیح زبانی موصول ہوئی - چنانچہ بھائی اللہ بخش سیال صاحب
بتایا کہ وہ ترکستانی قاری صاحب جنہوں نے ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان میں میرے خلا
سب سے پہلے احتجاج کیا تھا فوت نہیں ہوئے بلکہ بحمد اللہ بقیدِ حیات ہیں - دراصل
اجتماعِ ماچھی گوٹھ کے فوراً بعد (غالباً سردار محمد اجمل خاں لغاری مرحوم سے ناراض ہو
رحیم آباد سے نقل مکانی کر گئے تھے - غالباً اسی سے میرے ذہن میں تأثر پیدا ہوا کہ شاید
کا 'انتقال' ہو گیا ہے - بہرحال میں نے اُن کا تذکرہ اچھے ہی الفاظ میں کیا تھا - اور اب قار
'میثاق' کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ موصوف واپس رحیم آ
تشریف لا کر حسبِ سابق بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کی خدمت سر انجام دے رہے ہیں!

۲- دوسری مختصر وضاحت کراچی کے جناب محمد احتشام الدّین صاحب کی جانب
موصول ہوئی ہے جو درج ذیل ہے:

محترمی و مکرمی ڈاکٹر صاحب السلام علیکم

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے - مارچ کا میثاق نظر سے گزرا - صفحہ
۹۴ پر میرا نام آپ نے اُن حضرات میں شاملِ تحریر فرمایا ہے جو اختلاف کی بنا پر
جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے - اس سلسلہ میں عرض ہے کہ میں چونکہ
سرکاری ملازم تھا اور جماعت نے فیصلہ کیا تھا کہ سرکاری ملازمین کو رکنِ جماعت
نہیں رکھا جائے گا اس بنا پر مجھے جماعت سے مستعفی ہونا پڑا - امید ہے کہ آپ
ریکارڈ درست فرمالیں گے اور آئندہ ماہ کے میثاق میں اس کی تصحیح شائع فرمادیں
گے - شکریہ

محمد احتشام الدین

سابق رکن جماعت اسلامی کراچی

اس سلسلے میں اتنی وضاحت ہماری جانب سے بھی ضروری ہے کہ کراچی میں ۵۹ء

دوران راقم نے موصوف کو ہمیشہ ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی مرحوم کے حلقے میں کسی
رو تنظیم کے ضمن میں ہونے والے مشوروں میں شریک دیکھا تھا جس کی بنا پر یہ گمان
جماعت کی پالیسی کے ضمن میں اُن کا موقف بھی وہی ہے جو دوسرے علیحدہ ہونے
لوگوں کا ہے - لطف یہ ہے کہ اپنے اس خط میں بھی انہوں نے ایک واقعاتی تصحیح تو کی
لیکن اس اہم اور بنیادی امر کی تردید نہیں کی !!

تیسری قدرے طوالت طلب وضاحت یا تصحیح جدّہ ' سعودی عرب سے جناب صبا
صاحب کی جانب سے موصول ہوئی ہے ' اُن کا گرامی نامہ بھی مِن وعَن شائع کیا جا رہا

محترمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ! السلام علیکم

جس 'میثاق' کا شدت سے انتظار تھا کل ہی موصول ہوا - "نقضِ غزل" کی
جہاں بہت سی باتوں سے مجھے اتفاق نہیں وہیں ایک بات تو ایسی ہے جو بالکل خلافِ
واقعہ ہے - میں اس طرف متوجہ کرانا ضروری سمجھتا ہوں - آپ نے ص ۳۹ پر
"حقیقی عزائم" کے تحت جو واقعہ چودھری غلام محمد صاحب مرحوم کی طرف
منسوب کیا ہے چودھری صاحب نے میرے استفسار پر اس کی حلفیہ تردید کی تھی -
امید ہے آپ اسے بھی اپنے رسالہ میں شائع فرمائیں گے -

بات یوں ہوئی کہ یہی واقعہ ۱۹۴۲ء کے 'میثاق' میں بھی چھپا تھا - 'میثاق' کا شروع
سے میں خریدار رہا ہوں - میں نے جب پڑھا تو یہ بات مجھے انہونی سی محسوس ہوئی -
طبیعت مضطرب ہوئی ' میں کراچی کے دفترِ جماعت پہنچا تاکہ اس کی تحقیق کروں -
چودھری صاحب موجود تھے - اُن کے پہلو میں کرسی پر جناب صادق حسین
صاحب بھی تشریف فرما تھے - میں نے چودھری صاحب کے سامنے 'میثاق' رکھتے
ہوئے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے ؟ پڑھنے کے بعد چودھری صاحب نے دراز سے
قرآن مجید نکالا اور اس پر ہاتھ رکھ کر کہا: "صبا صاحب یہ بالکل جھوٹ ہے - ان
لوگوں کو ذرا خدا کا خوف نہیں - مخالفت میں اندھے ہو گئے ہیں" - میں نے کہا کہ
پھر اس کی تردید اخبار میں آنی چاہئے تو فرمایا: "کس کس بات کی تردید کی جائے - اس
میں نہ جانے کتنی باتیں ہیں - صبر سے کام لیجئے اور اللہ کے حوالے کر کے مثبت

کام میں لگے رہیئے۔"

یہ بات میں خدا کو شاہد گردانتے ہوئے بیان کر رہا ہوں - ہو سکتا ہے الفاظ میں ردّو بدل ہو مگر مفہوم بالکل یہی تھا - مجھے آج تک وہ منظر اور چودھری صاحب کا انداز یاد ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو - میں ان کی ہدایت کے مطابق اسے نظر انداز کر گیا تھا لیکن آپ نے ان باتوں کا پھر اعادہ کیا ہے جس سے ساری بھولی بسری باتیں ذہن میں تازہ ہو گئیں اور اس وقت کے تاثرات اور اضطرابی کیفیت پھر عود کر آئی - کاش آپ ان سب کو دفن کر کے اپنے مثبت کاموں میں لگے رہتے اور بنائے کہنہ کو ویران کرنے میں قوت ضائع کرنے کی بجائے تعمیرِ نو پر صرف کرتے تو مفید ہوتا۔

خیر اندیش

صبا حسنی

ص۔ب۔۷۴۳۶۔جدہ

اس ضمن میں کسی قال و اقول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ چوہدری غلام محمد مرحوم عرصہ ہوا کہ فوت ہو چکے ' اب ان کے بارے میں کچھ عرض کرنا مناسب نہیں ' ...... ویسے بھی معاملہ اصلاً ان کے اور مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب کے مابین تھا اور ہم نے ان ہی کی روایت کے حوالے سے درجِ 'میثاق' کیا تھا - اور وہ بحمد اللہ بقید حیات ہیں - اب اگر وہ مناسب سمجھیں اور "احقاقِ حق" اور "ابطالِ باطل" کی ذمہ داری ادا کرنا ضروری خیال فرمائیں تو 'میثاق' کے صفحات حاضر ہیں - اور اگرچہ اُن کی جانب سے اب تک کا سکوت توثیق ہی کے مترادف ہے تاہم اگر وہ اس واقعے کی تردید کر دیں تو خدا گواہ ہے کہ سب سے زیادہ خوشی ہمیں ہوگی -

البتہ ذاتی وضاحت کے ضمن میں عرض ہے کہ اس واقعے کی بر وقت تصحیح یا تردید کرنے سے احتراز کر کے چوہدری صاحب مرحوم نے بھی غلطی کی تھی اور خود صبا صاحب نے بھی - اس لئے کہ ہمارا یہ طرزِ عمل ان دونوں حضرات کی نگاہوں سے [illegible] نہیں ہو سکتا کہ ۶۷ - ۱۹۶۶ء میں جب 'تلفظِ غزل' کی اشاعت جاری تھی ایک تصحیح سید صدر الحسن گیلانی مرحوم کی جانب سے موصول ہوئی تھی جسے ہم نے بتمام و کمال شائع کر دیا حالانکہ وہ معاملہ چنداں اہم نہ تھا...... تو اگر اُس وقت یہ تصحیح یا تردید بھی موصول ہو جاتی

کیوں شائع نہ ہوتی - جبکہ یہ معاملہ نہایت اہم اور فیصلہ کن حیثیت کا حامل تھا...... چنانچہ ہم اپنی اس صفائی کے ثبوت میں 'میثاق' بابت جون ۶۷ء سے گیلانی صاحب مرحوم کا خط اور اس پر اپنا تبصرہ من و عن نقل کر رہے ہیں:

محترم صدیق الحسن گیلانی ' سابق امیرِ جماعت اسلامی حلقہ راولپنڈی و حال انچارج شعبہ پارلیمانی امور مرکز جماعت اسلامی ' اچھرہ ' تحریر فرماتے ہیں:

" آپ نے 'میثاق' میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے جس میں آپ نے دس بارہ سال پہلے کے کچھ واقعات بیان فرمائے ہیں - دسمبر ۱۹۶۶ء کے 'میثاق' میں صفحہ ۳۸ پر میرا ذکر آیا ہے اور آپ نے لکھا ہے کہ ملک سعید صاحب کو بھی معطل کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا - لیکن ملک صاحب بہت ہوشیار آدمی تھے - میرا ارادہ بھانپ کر پہلے ہی پریس کانفرنس کر کے مستعفی ہو گئے - اور جماعت پر سنگین الزامات لگائے ...... اصل واقعات یوں ہیں کہ میں نے ملک سعید صاحب کی رکنیت بہت پہلے معطل کر دی تھی - حکیم عبد الرحیم اشرف وغیرہ کے معاملات بہت بعد میں پیش آئے ہیں - رکنیت سے معطلی کا فیصلہ اور چارج شیٹ ملک صاحب کی خدمت میں بھی ارسال کر دی تھی اور مرکزی دفتر کو بھی بھیج دی گئی تھی - محترم امیر جماعت نے مولانا عبد الغفار حسن صاحب اور محمد باقر خاں مرحوم پر مشتمل اک ٹریبونل مقرر کر دیا تھا اس ٹریبونل نے چارج شیٹ کی ایک نقل ملک صاحب کو دوبارہ دی اور چند روز کی مہلت دے کر تاریخ مقرر کر دی تاکہ ملک صاحب چارج شیٹ کا جواب دے سکیں - جس تاریخ کو انہیں ٹریبونل کے سامنے پیش ہو کر جواب دہی کرنا تھی اسی روز انہوں نے پریس کانفرنس کر کے جماعت سے تعلق منقطع کر دیا۔

آپ کو اگر ایڈمنسٹریشن کا کچھ تجربہ ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہو گا کہ بہت سی ضابطہ کی کارروائیاں ہر ایڈمنسٹریشن چلانے والے آدمی کو کرنا پڑتی ہیں اور بسا اوقات اپنے دوستوں کے خلاف بھی کرنا پڑتی ہیں - ضابطہ کی کارروائیوں میں ذاتی رجحانات اور خیالات ' دوستی اور مخالفت کا کوئی دخل نہیں ہوتا - یہ کارروائیاں علی الاعلان تمام کارکنوں کے سامنے ہوتی ہیں اور نظم بالا کو بھی ان پر

غور کرنا ہوتا ہے - اگر بے جا کارروائی ہو تو خود کارروائی کرنا والا بھی مطعون ہوتا ہے - ایسی کارروائیوں کو بد نیتی پر مبنی قرار دینا میری ناقص رائے میں بہت بڑی زیادتی ہے بلکہ ظلم عظیم ہے - میں نے ہمیشہ ضابطے کی ہر کارروائی اپنے ایمان و ضمیر کے مطابق کی ہے اور کبھی اپنے ذاتی رجحان کو کسی کارروائی کی بنا نہیں بنایا - یہ ملک صاحب کی صوابدید تھی کہ انہوں نے ٹریبونل کے سامنے پیش ہونے سے گریز کیا اور مستعفی ہو گئے۔

" پ - ن : ملک صاحب کو ذاتی طور پر مجھ سے یا مجھے ان سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی - ہم دونوں نے قومی اسمبلی کا الیکشن مارشل لاء کے دور میں ۱۹۶۲ء میں لڑا تھا اور دوستانہ ماحول میں الیکشن کے کام کئے - مجھے صرف ۴۶ ووٹ ملے تھے اور انہیں صرف ۹ ووٹ مل سکے - شاید اس لئے کہ وہ الیکشن کو ناجائز سمجھ کر کام کر رہے تھے اور ناجائز ذرائع بھی اسی لئے استعمال کر رہے تھے " -

مندرجہ بالا وضاحت اگرچہ زیادہ تر ایک اجمال کی تفصیل کی نوعیت کی ہے تاہم قارئینِ 'میثاق' کی خدمت میں پیش ہے تاکہ وہ " نقضِ غزل " کے متعلقہ مقام کی 'تصحیح' فرما لیں...... رہی نیک نیتی اور بد نیتی کی بحث تو اس معاملے میں ؏ " ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی " کی صورت بن جائے گی - جہاں " حکمتِ عملی " کے خوش نما الفاظ کے پردے میں "End Justifies Means" کے نظریئے کو جوں کا توں اپنا لیا گیا ہو' وہاں 'نیت' کے مسئلے پر گفتگو محض وقت کا ضیاع ہے۔

" پس نوشت " میں گیلانی صاحب نے بلا ضرورت و بے محل ملک سعید صاحب پر کیچڑ اچھال کر دل کی بھڑاس نکالنے کی جو کوشش فرمائی ہے وہ کسی طرح داعیانِ 'اقامتِ دین' کے شایانِ شان نہیں ... اس سلسلے میں اگر کوئی وضاحت ملک صاحب کرنا چاہیں تو 'میثاق' کے صفحات حاضر ہیں !

بہرحال ہم نے جناب صبا حسنی کی یہ تصحیح یا تردید بھی شائع کر دی ہے اگرچہ وہ دنیا کے ہر قاعدہ و قانون کے اعتبار سے "Time-Barred" ہے!

۴- آخری طویل...... اور دلچسپ وضاحت جناب مصطفےٰ صادق صاحب کی جانب سے اس اصرار کے ساتھ موصول ہوئی ہے کہ اسے ضرور شائع کر دیا جائے...... چنانچہ ان کی مکمل تحریر بھی ہدیہ قارئین کی جا رہی ہے:

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

"میثاق" کے شمارہ مارچ ۱۹۹۰ء میں اجتماع ماچھی گوٹھ میں میری تقریر کے حوالے سے جو باتیں آپ نے شائع کی ہیں مجھے ان کی اشاعت پر اس لحاظ سے سخت صدمہ ہوا کہ میں آج تک ان باتوں کو اس انداز میں شائع کرنا یا شائع کرانا مناسب نہیں سمجھتا تھا- آپ کو یاد ہو گا کہ اس موضوع پر آپ سے میری گفتگو ہوئی تھی، اس میں بھی میں نے یہ گزارش کی تھی کہ اجتماع ماچھی گوٹھ سے واپسی کے بعد اُس وقت تک کے قیم جماعت اسلامی محترم میاں طفیل محمد صاحب نے مجھ سے اپنی اس تقریر کا مکمل متن طلب کیا تھا اس لئے کہ وہ اسے (ان کے خط کے مطابق) اجتماع کی روداد میں شامل کرنا چاہتے تھے- میں نے میاں صاحب کے اس خط کے جواب میں خود حاضر ہو کر ان سے عرض کیا تھا کہ میری یہ تقریر صرف ارکانِ جماعت کے اجتماع کے لئے تھی اس کا روداد میں شامل کرانا میں مناسب نہیں سمجھتا- میاں صاحب سے اپنی اس گفتگو کا ذکر میں نے آپ سے بھی بطورِ خاص کیا تھا-

اس کے بعد آپ نے ٹیلی فون پر مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی تقریر میں اپنے مضمون میں شامل کرنا چاہتا ہوں لیکن میں چونکہ ملاقات کے دوران اس کے Notes نہیں لے سکا اس لئے آپ اسے مرتب کر کے بھجوا دیں- اس پر بھی میں نے آپ سے یہ گزارش کی تھی کہ میں اپنی اس تقریر کی اشاعت کے حق میں نہیں ہوں- اس پر آپ نے بے تکلفانہ انداز میں استفہامیہ طور پر کہا تھا کہ آپ میری اس سلسلہ میں مدد نہیں کریں گے؟- میں نے جواباً عرض کیا تھا کہ آپ اس موضوع پر اب تک اکیلے ہی کام کرتے آئے ہیں اور یہی شاید مناسب بھی ہے- پھر آپ نے آخری جملہ یہ کہا کہ "چلئے پھر آپ کم از کم اپنے طور پر اپنی معلومات کو اور اُس دور سے متعلق واقعات کو مرتب کر کے شائع ضرور کرائیں

تاکہ ماضی کے تجربات آئندہ کام کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہو سکیں "۔
اس پر ہماری گفتگو ختم ہوگئی۔

" میثاق " کے تازہ شمارہ میں مجھ سے جو باتیں آپ نے منسوب کی ہیں وہ معنی اور مفہوم کے اعتبار سے اگرچہ درست ہیں لیکن ایک تو فی الحقیقت یہ جماعت کے داخلی معاملات تھے اور دوسرے میں یہ پہلو بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ماچھی گوٹھ میں میری تقریر کسی خاص فرد یا افراد کے خلاف محض الزامی نوعیت کی باتوں پر مشتمل نہیں تھی۔اس کے برعکس میں نے توان تمہیدی کلمات سے اپنی تقریر کا آغاز کیا تھا کہ ماضی میں انتخابی سرگرمیوں کے دوران اگر کچھ غلطیاں اور لغزشیں وقوع پذیر ہوئی ہیں تو یہ ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ تاہم ذمہ داری جب تقسیم کی جائے گی تو جماعت کے مرکزی عہدیداروں اور دوسرے اہم مناصب پر فائز اصحاب عام ارکانِ جماعت کے مقابلے میں جواب دہی کے نقطۂ نظر سے زیادہ ذمہ دار قرار پائیں گے - اپنی اس تقریر میں مَیں نے بلاشبہ انتخابی معرکہ آرائی میں جماعت کے کارکنوں کی ایسی سرگرمیوں کا ذکر کیا تھا جو جماعت کی طے کردہ پالیسی کے یکسر منافی تھیں لیکن ان امور کی نشان دہی کا مقصد (جو میں نے اپنی تقریر میں واضح بھی کر دیا تھا) صرف اور صرف یہ تھا کہ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنے کے لئے ماضی کے تجربات اور واقعات کو ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہئے - اپنے اس موقف کی وضاحت کے لئے میں نے محترم امیرِ جماعت سے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ مخاطب ہوتے ہوئے یہ گزارش بھی کی تھی کہ " پنجاب اور بہاولپور کے انتخابات کے مقابلے میں ملک بھر کے انتخابات کی مثال بالکل ایسی ہے کہ آپ نے پہلے ہمیں چھوٹے بڑے ندی نالوں کو عبور کرنے کا حکم دیا جنہیں عبور کرتے وقت ہم کیچڑ میں لت پت ہوگئے اب ہمیں ایک وسیع اور گہرے سمندر میں کود جانے کا حکم دیا گیا تو خود ہی غور فرمالیں کہ اس مہم جوئی میں کارکنوں پر کیا بیتے گی اور اس امتحان میں ہم کس حد تک سرخرو ہوسکیں گے "

اس تقریر کو اگرچہ بعض شرکاءِ جماعت نے سخت ناپسند کیا لیکن جیسا کہ

آپ خود لکھ چکے ہیں ارکانِ جماعت کی ایک معقول تعداد نے میری تائید بھی کی۔ اس سب کچھ کے باوجود میں ذہناً ان واقعات کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو کبھی آمادہ نہیں کر پایا۔ یہی میں نے آپ سے بھی عرض کیا تھا۔ ہو سکتا ہے میری یہ بات آپ کے ذہن سے محو ہو گئی ہو، تاہم اب آپ سے میری بصد ادب یہ درخواست ہے کہ "میثاق" کی آئندہ اشاعت میں میرا یہ عریضہ شائع کر دیں اور اس کے ساتھ ہی آپ کی خدمت میں مَیں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ "میثاق" کے محولہ بالا مضمون میں مجھ سے جو باتیں منسوب کی گئی ہیں براہ کرام انہیں اپنی زیرِ تالیف کتاب میں شامل نہ کریں۔

شکریہ، والسلام

مصطفیٰ صادق

اس 'وضاحت' کے بارے میں ہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اپنی فراہم کردہ معلومات کے ضمن میں مصطفیٰ صادق صاحب کا یہ فرمانا کہ انہوں نے راقم کو ان کی اشاعت سے روک دیا تھا اگر بعد کی اختراع نہیں تو یقیناً ایسے 'معہودِ ذہنی' کی حیثیت رکھتا ہے جو ان کے ذہن میں ہو تو ہو زبان پر ہرگز نہیں آیا!...... میاں طفیل محمد صاحب سے اپنی گفتگو کا ذکر انہوں نے بطورِ واقعہ ضرور کیا تھا' اور میری اس گزارش سے بھی کہ مناسب ہے کہ ہر شخص اپنی مفصّل سرگزشت لکھ کر تاریخ کا قرض ادا کر دے انہوں نے نہ صرف یہ کہ اتفاق کیا تھا بلکہ اس ضمن میں بعض دوسرے حضرات کے اصرار کا بھی تذکرہ فرمایا تھا...... تاہم انہوں نے خود میرے یہاں تشریف لا کر جس انشراح کے ساتھ تفاصیل بیان کی تھیں (جن پر میں ان کا شکریہ علی الاعلان ادا کر چکا ہوں) قطع نظر اس 'واقعے' کے کہ انہوں نے مجھے ان کی اشاعت سے ہرگز نہیں روکا' سوال یہ ہے کہ اگر فی الواقع اُن کی اشاعت مطلوب نہ تھی تو انہوں نے انہیں بیان کس لئے کیا تھا؟

بہرحال راقم الحروف کے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ بحمد اللہ انہوں نے یہ وضاحت فرما دی ہے کہ "مجھ سے جو باتیں آپ نے منسوب کی ہیں وہ معنی اور مفہوم کے اعتبار سے "... "درست ہیں!" جس کے لئے میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

باقی اس 'وضاحت' میں 'دلچسپی' کا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے "جماعت کے داخلی معاملات

اور اُن کے ضمن میں ناپسندیدہ تفصیلات کی اشاعت کو اپنے نزدیک سخت مکروہ قرار دیتے ہوئے اپنے 'واجب الاشاعت' خط میں بعض مزید تفصیلات کا اضافہ فرمادیا ہے! اب ع "کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!" ......

ہم اپنے خیال کے مطابق 'نقضِ غزل' کے ردّ عمل پر گفتگو مکمل کر چکے تھے کہ اچانک یاد آیا کہ ہمارے ناصحین ' محبّین اور مخلص ناقدین میں سے ایک اور اہم شخصیت کا خط بھی سات سمندر پار سے آیا ہوا ہے - ہماری مراد جناب شمیم احمد صدیقی صاحب سے ہے جو تحریک اسلامی کے ساتھ نہایت قدیمی اور گہرا تعلق رکھتے ہیں - موصوف کا آبائی تعلق سرزمینِ لکھنؤ سے ہے - وہاں سے وہ مشرقی پاکستان منتقل ہوئے جہاں وہ جماعت اسلامی کے نہایت سرگرم اور صفِ اول کے کارکنوں میں شامل رہے - ۷۰-۱۷ء کے حوادث سے دل برداشتہ ہو کر امریکہ 'ہجرت' کر لی - اب نیویارک میں مقیم ہیں اور وہاں مقامی طور پر امریکی نژاد مسلمانوں میں وہاں کے مقامی ماحول اور مخصوص مزاج کے مطابق تحریک اسلامی کا ایک نیا قافلہ تشکیل دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں - جماعت اسلامی کی تحریک سے گہری قلبی و ذہنی وابستگی اور مولانا مودودی مرحوم کی ذات سے شدید محبت و عقیدت کے ساتھ ساتھ راقم الحروف سے بھی ذہنی مناسبت اور دلی محبت رکھتے ہیں - ان کی شدید خواہش ہے کہ کسی طرح جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے مابین خلیج پاٹ دی جائے اور یہ دونوں تنظیمیں اول تو باہم مدغم ہو کر ورنہ کم از کم یک جان دو قالب ہو کر فریضۂ اقامت دین کے لئے شانہ بہ شانہ جدوجہد کریں - گزشتہ سال ڈیٹرائٹ (میشی گن - امریکہ) میں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام جو سات روزہ تربیتی کیمپ منعقد ہوا تھا اس میں وہ از اول تا آخر شریک رہے تھے اور اس میں جو اختتامی تقریر راقم نے کی تھی اسے بے حد سراہا تھا ——— پاکستان کے بھی انہوں نے بعض سفر اسی ارادے سے کئے کہ جماعتِ اسلامی کے قائدین 'جن میں سے اکثر کے ساتھ ان کی دیرینہ شناسائی ہے' سے ملاقات کر کے جماعت اور تنظیم کے مابین فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کریں ——— اگرچہ اس میں انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی -

صدیقی صاحب کے لئے 'نقضِ غزل' جس صدمہ کا باعث بنا ہو گا ہمیں اُس کا پورا

اندازہ ہے، اس لئے کہ اس سے ایک جانب قلبی محبت و عقیدت کو ٹھیس پہنچی ہوگی دوسری جانب اُس خواہش کے ضمن میں بھی کہ ہمارے اور جماعت اسلامی کے ما بعُد و فصل کم ہو کم از کم وقتی طور پر ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!" کی سی کیفیت پیدا ہوئی ہو چنانچہ ان کا ایک بہت مفصل خط برادرم قمر سعید صاحب کے نام موصول ہوا جس کے اقتباسات درج ذیل ہیں -

۱- " 'تقضِ غزل' دین کی کوئی اچھی خدمت نہیں ہے - اس سے دلوں میں اور بُعد پیدا ہوگا، تلخیاں ابھر کر کشمکشِ حیات میں مزید زہر گھول دیں گی اور اس سے دین کی راہ اور کھوٹی ہوگی - اگر مولانا مرحوم نے بقول ڈاکٹر صاحب کے کچھ غلطیاں کی تھیں تو وہ اب تاریخ کا حصّہ ہیں - ڈاکٹر صاحب کا کام تاریخ سازی ہے، تاریخ کا لکھنا نہیں ہے - غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ مستقبل کا مؤرخ کرے گا، جس کے پاس ذاتی پسند و ناپسند جیسی کوئی چیز نہ ہوگی، اس کے ہاں جذبات کی آمیزش نہ ہوگی - اُس وقت تاریخ اپنا بے لاگ تبصرہ دے گی اور پھر آنے والی نسلیں مولانا مرحوم اور ڈاکٹر صاحب دونوں کے تاریخ میں پیش کردہ کردار پر رائے زنی کریں گی" -

۲- " میں نے اپنے پچھلے خطوط میں بھی ڈاکٹر صاحب سے یہ مؤدبانہ عرض کیا تھا اور اب پھر عرض کر رہا ہوں کہ آپ صرف مثبت انداز میں اقامتِ دین کی جدّوجہد میں لگے رہیں - آپ کا اخلاص، آپ کی دینی خدمات اور آپ کی جانفروشانہ کوششیں حق کے مثبت کارکنوں کو کھینچ کھینچ کر آپ کے کارواں کی گردِ راہ بنا دیں گی - آپ کا کارواں چلتا رہے گا، لوگ ملتے رہیں گے - اگر منزل سَر کر لی تو فبہا، اور اگر شہادت علی النّاس کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے شہیدِ راہ ہوگئے تو عین کامیابی! پھر اس قافلہ کی قیادت کچھ اور لوگ آگے بڑھ کر سنبھال لیں گے - دوسروں پر انگشت نمائی کرنا ایک داعی کا شیوہ نہیں - دوسروں کا چراغ بجھا کر اپنا چراغ جلانے میں دنیا میں کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا ہے - ڈاکٹر صاحب کی پوزیشن تو اس سے بہت سوا ہے - ان کا کام تو عقابوں کے نشیمن پر کمندیں ڈالنا ہے، نہ کہ گرے ہوئے پرندوں پر ٹھونگیں مارنا - یہ ان کے رتبہ سے بہت فروتر کام ہے - ان کی آواز تو مکّہ و مدینہ میں گونج رہی ہے ------- اور اب تو ساتوں سمندر پار اقصائے عالم میں ہر سُو پھیل چکی ہے - ان کے سوچنے کا انداز عالمی ہے،

نہ کہ مقامی - وہ اپنی اَن تھک کوششوں سے تحریکِ اسلامی کے قافلے کو ایک آفاقیت کا روپ دے چکے ہیں - دوسری طرف مولانا مرحوم کا اپنا ایک مقام ہے جس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا - وہ ایک فکر کے حامل تھے - انہوں نے ایک تحریک چلائی، ایک کارواں تیار کیا اور آگے چل پڑے - وہ اپنا کام پورا کر کے مالکِ حقیقی کے پاس پہنچ گئے - اب ہم ان کے کاموں میں کیڑے ڈالنے کے لئے نہیں، بلکہ ان کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھانے کے لئے آگے بڑھے ہیں - اگر ان کی چلائی ہوئی تحریک بقول ڈاکٹر صاحب کے اب گم کردہ راہ ہو گئی ہے تو آپ اس راہ پر گامزن ہو کر اسے مہمیز لگائیں - وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا - وہ کب فرصت دیتا ہے کہ آپ پیچھے مڑ کر دیکھیں، پلٹ پلٹ کر ماضی میں گم رہیں - ایک بار ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں تجزیہ کر کے ڈاکٹر صاحب نے اپنا فرض پورا کر دیا - اب بار بار نشتر زنی کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا - وہ اپنا وقت ضائع کریں گے اور دوسروں کے منہ کے مزوں کو کڑوا اور کسیلا کر دیں گے ....

شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ وہ اس طرح حق کی راہ کھوٹی کر کے حق کے شہ سواروں کو آپس ہی کی چشمک زنی میں الجھا دے، تاکہ اپنے حیرت بداماں رہیں، غیر تماشا دیکھتے رہیں اور وہ پوری بازی جیت کر یا الٹ کر چلتا بنے "-

صدیقی صاحب کی نصیحت و فہمائش کے ضمن میں ہمارا موقف کسی حد تک دوسرے خطوط کے سلسلے میں جو گزارشات پیش کی جا چکی ہیں اُن میں بیان ہو چکا ہے، تاہم تین نکات کی جانب مزید توجہ منعطف کرانی ضروری ہے -

ایک یہ کہ مستقبل کے مؤرخ پر آسمان سے وحی تو ہرگز نازل نہیں ہوگی اور اگر اُسے اپنی تحقیق و تفتیش کے لئے ضروری مواد حاصل نہ ہو سکا تو وہ صحیح فیصلے تک کیسے پہنچے گا؟ اُدھر ۵۷-۱۹۵۶ء کے حوادث و واقعات سے متعلق ریکارڈ کو جماعت اسلامی نے ایسے دفن کیا ہے کہ ایک طرف اُس رپورٹ کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا جو جماعت کی مرکزی مجلس شورٰی کی نامزد کردہ جائزہ کمیٹی نے ایک سال کی محنت و مشقت سے تیار کی تھی جس پر جائزہ کمیٹی کے ارکان کی توانائیوں اور اوقات کے صرفِ کثیر کے علاوہ جماعت اسلامی کے بیت المال کا بھی زرِ کثیر صرف ہوا ہو گا - پھر ماچھی گوٹھ کی اختلافی تقاریر کو نسیاً منسیاً کرنے کے لئے جماعت کی روداروں کی اشاعت کا سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا - حد یہ ہے کہ خود مولانا مودودی

مرحوم نے تحریک اسلامی کی قیادت اور امارت کے سلسلے میں اپنے ذہن کو جس تقریر میں کھول کر بیان کیا تھا اسے بھی ایسے غائب کیا کہ میں سالہا سال کی تلاش کے باوجود اس تک رسائی حاصل نہ کر سکا ------- اور وہ سامنے آئی بھی تو ایک خالص خدائی تدبیر' اور ایک مخلص اور پُرجوش لیکن ناسمجھ کارکن کی 'غلطی' کے نتیجے میں!

راقم کے بارے میں صدیقی صاحب کا یہ فرمانا کہ میرا کام تاریخ نگاری نہیں صدفی صد درست ہے' (اگرچہ مجھ ایسے ناچیز اور نااہل کے لئے "تاریخ سازی" کے لفظ کا استعمال محض اُن کے حسنِ ظن کا مظہر ہے!) خود راقم نے بھی اگر 'نقش غزل' کے ضمن میں "تاریخ کا حق ادا کرنے" کا ذکر کیا ہے تو ثانوی اعتبار سے ------- راقم کو اصل تشویش اس امر کی لاحق تھی کہ ان حوادث کے اصل اسباب کے متعین نہ ہونے کا نہایت مُضر نتیجہ یہ نکل سکتا ہے (جو بالفعل بہت سے لوگوں کے رویّہ میں ظاہر ہو بھی چکا ہے) کہ نہ صرف یہ کہ تحریک اسلامی کے اصول و مبادی اور اساسی نظریات کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں بلکہ اقامتِ دین کی جدوجہد ہی کی جانب سے مایوسی اور بددلی پیدا ہو جائے!- جبکہ اس کے برعکس اگر متعیّن کر دیا جائے کہ غلطی کیا اور کب ہوئی تو باقی سارے اصول و مبادی اور کُل صغریٰ کبریٰ شکوک و شبہات کی زد میں آنے سے بچ جاتے ہیں! وھُوَ المطلوب!!

دوسرے یہ کہ صدیقی صاحب غور فرمائیں کہ کیا دنیا میں کبھی کوئی مثبت کام تنقید کا ناگزیر مگر ناخوشگوار فریضہ سرانجام دیئے بغیر ہوا ہے؟ ------- گویا کیا قرآنی اصطلاح میں "احقاقِ حق" اور "ابطالِ باطل" لازم و ملزوم نہیں ہیں؟ کیا قرآن میں پہلے مشرکین اور پھر اہل کتاب اور منافقین پر شدید تنقید بلا ضرورت کی گئی ہے؟ کیا خود مولانا مودودی مرحوم نے کانگریس کے ہم نوا علماء پر شدید تنقید نہیں کی تھی؟ درآنحالیکہ ان کی دینی تعلیم و تربیت اُن ہی کے حلقے میں ہوئی تھی اور انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز بھی جمعیت علماء ہند کے جریدے "الجمعیّت" کے حلقۂ ادارت سے وابستگی ہی کے ذریعے کیا تھا- پھر کیا انہوں نے متحدہ قومیت کے خلاف مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے مؤثر اور مدلل اثبات کے باوجود "مسلم قوم پرستی" کو اُسی طرح کا بُت قرار دے کر اس پر اسی شدت سے سنگ باری نہ کی تھی جیسی کہ علامہ اقبال مرحوم نے 'وطنیت' کے بت پر کی تھی (ان تازہ خداؤں

میں بڑا سب سے وطن ہے - جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!) قصہ مختصر عالمِ واقعہ میں "صرف مثبت" کام کی کوئی مثال ہو تو ضرور پیش کریں -

صدیقی صاحب اور ان کے ہم خیال لوگ ذرا غور فرمائیں تو یہ حقیقت بالکل واضح اور مبرہن نظر آئے گی کہ محض مثبت کام تو صرف انفرادی نیکی اور پارسائی کے ضمن میں ہو سکتا ہے ------ اس سے بڑھ کر آپ دعوتِ حق اور تبلیغ دین کی بات کریں گے تو کم از کم پاک و ہند کے ماحول میں یا تو آپ کو تبلیغی جماعت میں شامل ہونا ہو گا ورنہ اس سے اپنے نظری اور عملی فرق و امتیاز کو واضح کرنا ہو گا - اسی طرح اگر آپ یہاں اقامت دین اور غلبۂ دین حق کی بات کریں گے تو بھی دو ہی صورتیں ممکن ہیں یعنی یا آپ جماعت اسلامی میں شامل ہو جائیں! ورنہ پھر اس سے اپنے اختلاف کو پوری وضاحت اور شدّ و مدّ کے ساتھ بیان کریں! ------ اور اگر کسی نیک اور مرنجان مرنج آدمی کو یہ 'منفی' کام برا لگے تو اس کے لئے واحد راہ یہ ہے کہ دعوت و اقامت دین کی جدوجہد سے کنارہ کش ہو کر اوّل تو کلیتہً نفرادی نیکی اور پارسائی کے دامن میں پناہ لے لے ------ ورنہ زیادہ سے زیادہ کسی علمی مشغلے یا محض تعلیمی و تدریسی خدمت میں مصروف ہو جائے' ------ اور راقم کا اصل 'جرم' یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن نہیں کر سکا - اس لئے کہ سر سید احمد خان مرحوم کے الفاظ "قرآنے کہ من دارم" کے مصداق میں جس قرآن سے واقف ہوں وہ تو شہادت علی الناس کو امتِ مسلمہ کا اجتماعی فریضہ' اقامت دین کی جدوجہد کو فرضِ عین' اور ان دونوں فرائض کی ادائیگی کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کو ایمان حقیقی کا رکنِ لازم قرار دیتا ہے' لہٰذا ہمارے لئے تو صورت وہی ہے کہ -

"جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ - ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!"

تیسرے یہ کہ صدیقی صاحب ماچھی گوٹھ میں پیش کردہ "تجزیئے" کو کسی حد تک مناسب اور ضروری قرار دے رہے ہیں لیکن اول تو فی الواقع اسے ماچھی گوٹھ میں پیش ہونے ہی نہیں دیا گیا' ------ پھر اُسے اُس وقت اِس سے بھی زیادہ ناپسند قرار دیا گیا تھا جیسا کہ آج صدیقی صاحب کو 'نقض غزل' ناپسند ہوا ہے' یہاں تک کہ جب دس سال بعد اس کی اشاعت ہوئی تو راقم کے ایک نہایت قریبی اور مخلص دوست' پرائمری کے زمانے سے کلاس فیلو' یکے از مؤسسین مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور انجمن کے نائب

اور مستقل معاون نے اسے سخت ناپسند کیا تھا۔ اور باصرار یہ پیشکش کی تھی کہ " پوری کتاب میر
یکمشت خرید لیتا ہوں، گویا تمہاری کُل لاگت مع نفع کے تمہیں مل جائے گی۔ لیکن خدا
اِس کتاب کو عام نہ کرو!!" پھر جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، اس کے ذریع
مقدمے کا صرف ایک حصّہ سامنے آیا تھا ـــــــ یعنی یہ کہ میرا جماعت کی موجودہ پالیس
سے اختلاف کیا ہے؟ ـــــــ مقدمے کا دوسرا اور اہم تر حصّہ یعنی یہ کہ میں ۔
جماعت سے علیحدگی کیوں اختیار کی؟ ابھی تک پردۂ خِفا میں تھا ۔ اس کا کوئی ذکر " تحریک
جماعت اسلامی " میں موجود نہیں ہے ۔ اس لئے کہ وہ تو جماعت کی رکنیت سے مستعف
ہونے سے چھ ماہ قبل ضبط تحریر میں آئی تھی ـــــــ اور جیسے کہ اس تحریر کے بالکل آغ
میں بیان ہو چکا ہے اس سوال کے تشفّی بخش جواب کے لئے 'نقضِ غزل' کی اشاعت
ناگزیر تھی ۔

رہا جماعت اسلامی کے ساتھ اتّحاد و اتفاق یا کم از کم تعاون و تناصُر کی فضا پیدا کرنے
معاملہ جس کی خواہش مختلف گوشوں سے اس سے قبل بھی سامنے آتی رہی ہے، اور ا
دنوں کچھ زیادہ ہی شدّ و مدّ کی صورت اختیار کر گئی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ شاید پوری دنیا میں ا
کا راقم الحروف سے بڑھ کر خواہش مند کوئی نہ ہو ۔ لہٰذا جب بات چل ہی نکلی ہے تو مناس
ہے کہ اس معاملے سے متعلق بعض حقائق و واقعات بھی اپنے ہی خواہوں کے سام
رکھ دیئے جائیں ۔

جہاں تک اِتّحاد اور ادغام کا تعلق ہے اگرچہ وہ بظاہرِ احوال ع "حلول و اتحاد ایں جا
است!" کا مصداق کامل نظر آتا ہے لیکن میری یہ پیشکش تمام واقفانِ حال کے علم میں
(اور کئی سال سے ہے!) کہ اگر جماعت انتخابی سیاست کے میدان سے کنارہ کشی اختیا
لے تو میں اور میرے رفقاء فوراً جماعت میں شامل ہو جائیں گے ۔ اس میں میں یہ تخف
مزید کئے دیتا ہوں کہ ـــــــ اگر جماعت کو انتخابات سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی
شاق محسوس ہو، اور گویا کہ اِس کے مترادف نظر آئے کہ جماعت اپنی چالیس سالہ پا
کے غلط ہونے کا اقرار کر لے ـــــــ تو میں اُس تجویز کو قبول کرنے کے لئے بھی
ہوں جو حال ہی میں ڈاکٹر محمد امین صاحب (جنہیں جماعت سے خارج کر دیا گیا) نے پیش

ہے یعنی یہ کہ جماعت آئندہ پچیس سال کے لئے ہی یہ طے کرلے کہ وہ ملکی انتخابات
یں حصہ نہیں لے گی۔ البتّہ اس صورت میں جماعت کے تنظیمی ڈھانچے میں ایسی تبدیلی
انی ضروری ہوگی جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اظہار رائے پر کوئی قدغن نہ رہے اور
ختلاف رائے کے راستے (Channels) معیّن صورت میں کھول دیئے جائیں، بلکہ
ختلافی آراء کے پنپنے اور پروان چڑھنے کے امکانات بھی موجود ہوں۔ (اس ضمن میں
قارئین اگر اس نظام العمل کا مطالعہ کریں جو ہم نے تنظیم اسلامی کے لئے اختیار کیا ہے تو
ندازہ ہو جائے گا کہ ہم نے بیعت کے نظام میں بھی اِن دونوں باتوں کا کس قدر اہتمام کیا ہے۔
یہ نظام العمل مئی ۹۰ء کے 'میثاق' میں شائع کیا جاچکا ہے) ------ اور اگرچہ ہمیں یہ
علوم ہے کہ اِس شرط کا پورا ہونا اللہ کی قدرت سے بعید نہ ہوتے ہوئے بھی، موجودہ
حالات میں کم از کم بظاہرِ احوال ناممکنات میں شامل ہے، تاہم ہماری پیشکش قائم ہے!

ع "کہ عنقا را بلند است آشیانہ!" کے مصداق اس مقام سے نیچے اتر کر جہاں تک
بھی تعاون کا تعلق ہے، ہم اس کے لئے بھی ہمیشہ تیار رہے ہیں اور ریکارڈ پر ایسے متعدّد
اقعات موجود ہیں کہ اس ضمن میں ہماری بار بار کی پیشکشوں کو سختی کے ساتھ ردّ کیا گیا۔
مثلاً:

۱۔ ۱۹۷۳ء میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ
شروع ہوا تو راقم خود چل کر نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اس
یں شرکت کی دعوت دی۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کے ساتھ تو ہمارا شدید اختلاف ہے۔
یں نے عرض کیا کہ کیا خان عبد الولی خان صاحب سے آپ کا کامل اتفاق ہے؟ پھر اگر آپ
یاسی پلیٹ فارم پر ولی خاں اور اصغر خاں کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں تو قرآنی پلیٹ فارم پر میرے
ساتھ کیوں تشریف نہیں رکھ سکتے؟۔ انہوں نے فرمایا کہ میں جانتا تھا کہ آپ یہ دلیل دیں
گے ------ تاہم آپ کی کانفرنس میں میری شرکت ناممکن ہے! ------ اس کے بعد
ی مسلسل دو سال تک راقم دعوت نامہ ارسال کرتا رہا ------ اور اس کا سلسلہ اُس
قت بند کیا جب اُن کی جانب سے ایک تلخ خط موصول ہوا کہ جب ہم نے آپ کو واضح
ور پر بتا دیا ہے کہ ہم شرکت نہیں کرسکتے تو آپ خواہ مخواہ ہمیں دعوت نامے کیوں ارسال
کرتے ہیں!

۲- اسی طرح کی ایک دعوت تنظیم اسلامی کی ایک تربیت گاہ کے سلسلے میں جناب اسعد گیلانی صاحب کو دی گئی تو انہوں نے فی الفور آمادگی ظاہر فرما دی ——— لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وقت کے امیرِ جماعت نے انہیں منع فرما دیا!!

۳- ۸۲ء میں جماعت اسلامی نے تعلیمِ قرآن کانفرنس منعقد کی اور اس میں میاں طفیل محمد صاحب نے دعوتِ عام دی کہ "ہمیں قرآن کی بنیاد پر جمع ہو جانا چاہئے" تو راقم نے فوری طور پر پیشکش کی کہ اگر آپ کے سامنے اشتراکِ عمل اور تعاونِ باہمی کا کوئی پروگرام ہے تو واضح فرمائیں اس کے لئے سب سے پہلے میں اور میری تنظیم لبیک کہتی ہے۔ جس کے جواب میں مشترکہ لائحہ عمل اور اس کے حدود و خطوط معیّن کرنے کی بجائے گول مول نصیحت کے ساتھ ہمارے دستِ تعاون کو جھٹک دیا گیا (اس سلسلے میں جو خط راقم نے لکھا تھا اور اس کا جو جواب میاں صاحب کی جانب سے موصول ہوا، دونوں شاملِ اشاعت کئے جا رہے ہیں!)

۴- اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماعات کئی سال سے پنجاب یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں منعقد ہوتے ہیں اور اُن میں جماعتِ اسلامی کے زعماء کے علاوہ دیگر علماء یا دانشور حضرات کو بھی دعوتِ خطاب دی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود کہ راقم کیمپس کا قریب ترین پڑوسی بھی ہے ——— اور جمعیت کا سابق ناظم اعلیٰ بھی، آج تک اُسے ان اجتماعات میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔

جمعیت کے اس طرزِ عمل کے مقابلے میں راقم الحروف کی روش ہمیشہ یہ رہی کہ جب بھی کسی کالج میں منعقد ہونے والی کسی محدود تقریب میں دعوتِ خطاب دی گئی سر کے بل حاضر ہوتا رہا ——— اور کبھی اسے اپنی 'انا' یا Prestige کا مسئلہ نہیں بنایا کہ جب آپ اپنے بڑے اجتماعات میں مجھے مدعو نہیں کرتے تو میں ان چھوٹے چھوٹے اجتماعات میں کیوں آؤں؟ ———

۵- یہی معاملہ حال ہی میں لاہور میں پیش آیا کہ جب مرکز کے اہتمام میں ایک 'عظیم الشان' بین الاقوامی کشمیر کانفرنس 'الحمراء' میں منعقد کی گئی تو اس میں شرکت کی دعوت مجھے نہیں دی گئی ——— اس کے باوجود جب لاہور کی جماعت نے "ہفتۂ انسدادِ منکرات" کے سلسلے میں ایک سیمینار جناح ہال میں منعقد کیا اور اس میں مجھے بلایا تو میں بلا

چُون وچرا حاضر ہو گیا ـــــــ (وہاں جو تقریر راقم نے کی تھی وہ اگرچہ ہفت روزہ 'ندا' میں شائع ہو چکی ہے' تاہم چونکہ 'میثاق' کا حلقۂ قارئین اس سے وسیع تر ہے لہٰذا اِسے اس اشاعت میں بھی شامل کیا جا رہا ہے -) ـــــ

۶- ستم بالائے ستم یہ کہ جماعت کا جو کُل پاکستان اجتماع چند ماہ پیشتر مینارِ پاکستان کے سائے میں منعقد ہوا تھا اس کے بارے میں جماعت کے بعض قریبی لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہ مشہور کیا گیا ہے کہ "انہیں (یعنی راقم کو) بھی دعوتِ خطاب دی گئی تھی لیکن وہ خود ہی نہیں آئے ـــــ اور اُن سے اپنا سٹال لگانے کو بھی کہا گیا تھا لیکن انہوں نے خود نہیں لگایا!" ـــــ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے نام صرف وہ دعوت نامہ موصول ہوا تھا جو عام سامعین کو رسماً بھیجا جاتا ہے ـــــ اس میں کسی تقریر یا خطاب کا کوئی ذکر تک نہ تھا- اور سٹال کے ضمن میں جب ہم نے خود رابطہ کیا تھا تو بتایا گیا تھا کہ ساری جگہ پہلے ہی الاٹ ہو چکی ہے اور اب کسی سٹال کی گنجائش باقی نہیں رہی-

اب محبّین اور مخلصین خود غور فرمائیں کہ کمی ہماری جانب سے ہے یا دوسری جانب سے!

اور جب بات اس حد تک پہنچ ہی گئی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے 'تکملہ کے طور پر چند باتیں بھی' طوالت کے خوف کے باوجود گوش گزار کر دی جائیں-

راقم الحروف اپنی دعوت اور تحریک کے اعتبار سے مولانا مودودی مرحوم اور جماعتِ اسلامی کو اپنے معنوی 'والدین' سمجھتا ہے- چنانچہ راقم نے بارہا صراحتہً عرض کیا ہے اپنی دانست میں راقم جس تحریک اور دعوت کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے اس کی اس بیسویں صدی عیسوی میں پہلی کڑی کی حیثیت حاصل ہے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم اور ان کی حزب اللہ کو' اور دوسری کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے معنوی جانشین مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی ـــــ اگرچہ میری تحریک کا سلسلۂ نسب مولانا آزاد مرحوم کی زندگی کے بھی صرف آٹھ سالوں سے جُڑا ہے یعنی ۱۹۱۳ء تا ۱۹۲۰ء اور مولانا مودودی مرحوم کی تحریک کے بھی صرف آٹھ ہی سالوں سے متعلق ہے یعنی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۷ء ـــــ اسی طرح جماعت اسلامی کے بارے میں ۱۹۴۷ء

کی تحریر کا یہ اقتباس تو اسی تحریر میں آچکا ہے کہ جیسے ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے اکابرینِ جماعت سے دیکھنا، سننا، سوچنا اور بولنا سیکھا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے ان ہی جذبات کے اظہار کے لئے ایک موقع پر علامہ اقبال مرحوم کی مشہور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے اس شعر کو ذریعہ بنایا تھا کہ۔

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی!

جس پر بعض احباب بالخصوص مکہ مکرمہ سے زبیر عمر صدیقی صاحب کا بڑا جذباتی ردِ عمل موصول ہوا تھا۔

تاہم از روئے قرآن والدین کا حق ادب و احترام اور حسنِ سلوک اور مصاحبتِ معروف ہی کا ہے، ان کی اطاعت یا اتباع ہر حال میں لازم نہیں، (سورۂ بنی اسرائیل آیات ۲۳ تا ۲۵، سورۂ عنکبوت آیت ۸، اور سورۂ لقمان آیات ۱۴، ۱۵) چنانچہ کسی معاملے کی نوعیت کی مناسبت سے اُن سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے، اور حکم عدولی بھی کی جا سکتی ہے، اور عدل و انصاف کی بات اُن کے خلاف پڑ رہی ہو تو بھی ڈنکے کی چوٹ کہنا ضروری ہے (سورۂ نساء آیت ۱۳۵) ------ چنانچہ میں نے مولانا مودودی مرحوم کے دینی فکر میں جو کجی نظر آئی اس کی بھرپور نشان دہی کی، ("اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" نامی کتابچے میں "تعبیر کی کوتاہی" کے عنوان سے بحث، اور "عظمتِ صوم" نامی تحریر میں "اسلام کا روحانی نظام" کے موضوع پر مولانا مرحوم کے نظریئے کی نفی) اِسی طرح قیامِ پاکستان کے بعد کی مجموعی پالیسی میں جو کجی نظر آئی اس پر بھی مبسوط مقالہ لکھا ("تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی جائزہ") ------ پھر ۵۷-۱۹۵۶ء کے بُحرانی دَور کے جو اقدامات تباہ کُن محسوس ہوئے اُن پر بھی گرفت کی، "خلافت و ملوکیت" نامی کتاب میں بعض نہایت جلیل القدر صحابہؓ پر جو جارحانہ تنقید وارد ہوئی اُس سے بھی اعلانِ براءت اور اظہارِ بیزاری کیا، اور بالآخر تحریک اور تنظیم کی قیادت و امارت کے تصوّر کے ضمن میں جو غلطی نظر آئی اُس کی بھی نشان دہی کر دی ------ لیکن بحمد اللہ آج تک نہ اُن کی ذات پر کوئی حملہ کیا اور نہ اُن کی نجی اور گھریلو زندگی کو کبھی موضوعِ گفتگو بنایا ------ بلکہ ایک خاص دَور میں مقدم الذکر امور کے ضمن میں بھی اگر لہجہ تیز اور زبان سخت ہو گئی تھی تو اس پر بھی علیٰ رؤس الاشہاد

معذرت کر لی!

تاہم چونکہ والدین سے خواہ کتنا بھی اختلاف کیوں نہ ہو جائے' رہتے تو وہ والدین ہی ہیں' اور اُن کی احسان مندی کا جذبہ ہر سلیم الفطرت انسان میں بہرحال برقرار رہنا چاہئے لہٰذا میں نے بھی جماعت سے علیٰحدگی کے بعد کے تینتیس[۳۳] سالوں میں سے صرف ایک آٹھ سالہ دَور (۶۲ء تا ۷۰ء) کے علاوہ نہ اس سے قبل کے پانچ سالوں کے دوران اپنے قلب میں اس جذبہ و احساس کی کوئی کمی محسوس کی' نہ ہی بعد کے بیس سالوں کے دوران اِن میں کمی کا کوئی شائبہ محسوس کیا! فالحمدُ للہ علیٰ ذالک!

عجیب اتفاق ہے کہ میرے صُلبی و جسمانی والد شیخ مختار احمد مرحوم کا سِن پیدائش بھی ۱۹۰۳ء تھا' اور میرے تحریکی و معنوی والد مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم کی ولادت بھی اُسی سال ہوئی تھی ——— پھر وہ دونوں ہی عرصہ ہوا کہ اس دنیا سے رخصت اور " تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ " کے مصداق بن چکے ہیں - جبکہ میری والدہ ماجدہ بھی تا حال بقیدِ حیات ہیں اور میری معنوی ماں جماعتِ اسلامی بھی قائم اور موجود ہے! اور میں جیسے یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ والدہ صاحبہ کا سایہ تا دیر سلامت رکھے' ایسے ہی قلب کی گہرائیوں سے یہ دعا بھی مسلسل نکلتی رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعت کے اربابِ حلّ و عقد کو توفیق دے کہ وہ حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہوئے پوری جرأتِ رندانہ کے ساتھ اپنے سابقہ طریقِ کار کی طرف مراجعت کرلیں - تاکہ ع " آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!" کی صورت پیدا ہو جائے ———

" وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْز !! " لہٰذا " اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ !! "

الغرض ——— یہ ہیں مولانا مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی کے بارے میں میرے قلبی احساسات و جذبات جن کے اظہار میں مجھے ہرگز کوئی باک نہیں' خواہ اسے کوئی ارشاد احمد علوی یا اُن کے ہم خیال جماعت کی خوشامد اور ع " میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب! " کا مصداق قرار دیں' خواہ کوئی صفدر میر یا اُن کے ہم نوا ——— "Kowtowing Before The Jama'at" سے تعبیر کریں' ———

تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں جملہ اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر مولانا مودودی کی ہر بات سے متفق ہونے کا اعلان کر دوں' یا اُن کے ہر اقدام کو درست قرار دے

دوں' یا اُن کو معاذ اللہ تنقید سے بالاتر سمجھنے لگوں۔ اُن سے میرے علمی اختلافات بے شمار ہیں' یہاں تک کہ اُن کے بعض نظریات و خیالات کو میں گمراہی سے تعبیر کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا!

مزید برآں جس طرح والدین معناً ایک وحدت ہوتے ہوئے بھی اپنا اپنا جداگانہ مقام رکھتے ہیں چنانچہ حدیثِ نبویؐ کی رُو سے والدہ کا حق والد پر تین درجہ فائق ہے' اسی طرح مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی خواہ ایک اعتبار سے ایک حیاتیاتی اکائی اور وحدت ہوں اپنی اپنی جداگانہ حیثیت بھی رکھتے ہیں ـــــــ بالخصوص اب جبکہ مولانا مودودی مرحوم کی وفات پر دس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے اُن کے علمی نظریات اور ذاتی خیالات کا کوئی لازمی تعلق جماعتِ اسلامی کے ساتھ نہیں ہے (چنانچہ اصولاً تو اس کا واضح فیصلہ اور برملا اعلان بھی ۱۹۵۶ء ہی میں کر دیا گیا تھا!) ـــــــ لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ "جماعتِ اسلامی" سے میرا اختلاف صرف "طریقِ کار" کا ہے ـــــــ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جماعت کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ "وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ" (النمل:۱۴) کے مصداق خواہ برملا تسلیم کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہوں' دل سے قائل ہو چکے ہیں کہ انتخابات کے ذریعے اقامتِ دین کی منزل کی جانب کوئی پیش قدمی ممکن نہیں ہے!! (بلکہ سننے میں آیا ہے کہ جماعت کے موجودہ امیر قاضی حسین احمد صاحب نے تو بعض اجتماعات میں اس کا برملا اعلان بھی کر دیا ہے ـــــــ اگرچہ' اگر ہماری اطلاعات صحیح ہیں تو' اس کے متبادل کے طور پر جس راستے کی وہ نشان دہی کر رہے ہیں وہ ایک خطرناک داؤ کے مترادف ہے!! ـــــــ جس کے ضمن میں نُصح و اخلاص کا حق راقم نے اپنی اس تقریر کے بین السطور میں ادا کر دیا ہے جو جماعت کے حالیہ سیمینار میں ہوئی تھی اور اس پرچے میں بھی شائع کی جا رہی ہے!)

'میثاق' کا یہ شمارہ بھی جنوری اور مارچ کے شماروں کے مانند "تفقِ غزل" ہی کے سلسلے کی کڑی بن گیا ہے ـــــــ اگرچہ یہ کڑی آخری ہے اور آئندہ ان صفحات میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں آئے گا۔ بلکہ "تفقِ غزل" کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔ تاہم "تفقِ غزل" کے اس تکملہ کے ساتھ بطور ضمیمہ راقم کا جماعت کی رکنیت سے

'استعفاء' شائع کیا جا رہا ہے جو ۲۶ر اپریل ۵۷ء مطابق ۲۹ر رمضان المبارک ۷۶ھ کو بحالتِ صوم و اعتکاف لکھا گیا تھا جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ آج سے ثلث صدی قبل جب راقم نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی تھی تو اُس وقت اُس کے جذبات و احساسات کیا تھے! ——— اور یہ کہ اگر میں یہ کہتا رہا کہ ؎

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے یہ الفت اور محکم ہو گئی

اور عملاً اس شعر کی تصویر بنا رہا کہ ؎

گو مَیں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

تو "وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ" کے مصداق اس میں نہ کوئی تصنّع ہے نہ تکلّف ——— بلکہ یہ میرے فکر و نظر کی حقیقی ترجمانی اور میرے جذبہ و احساس کا واقعی انعکاس ہے! ——— ع
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے!"

اعتذار

'میثاق' کے پچھلے شمارے میں ادارے کی جانب سے دو مضامین کے بارے میں یہ اعلان شامل تھا کہ جون کے شمارے میں انہیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی: ایک 'نقضِ غزل' کے ردّعمل میں موصول ہونے والے خطوط اور ان کے جواب میں امیر تنظیم اسلامی کی توضیحات کا اور دوسرے 'پاکستان کا مستقبل: روشن یا تاریک' کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی کے مفصل خطاب کا ——— الحمدللہ کہ اوّل الذکر مضمون حسبِ وعدہ زیرِ نظر شمارے میں شامل ہے اور اس کی حیثیت 'نقضِ غزل' کے تکملے کی ہے۔ تاہم مؤخر الذکر کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ 'میثاق' کی تنگ دامانی بیک وقت ان دونوں انتہائی مفصل مضامین کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ (ادارہ)

الہدیٰ قسط ۶۵
مباحث جہاد فی سبیل اللہ
درس نمبر ۲

جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ

شہادت علی النّاس

سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں

(۲)

نبوّت و رسالت سے متعلق ایک اہم حقیقت کا بیان

بسم اللہ اولہ و آخرہ : سورۃ الحج کے آخری رکوع کے جزو اوّل کی تیسری آیت میں نبوّت و رسالت سے متعلق ایک نہایت اہم حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا : " اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ " لفظ اِصطفیٰ 'صفی' سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں چن لینا، پسند کر لینا، ' TO CHOOSE ' ، اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ چن لیتا ہے پسند فرما لیتا ہے۔ آگے چلئے ! رُسُل جمع ہے رسول کی۔ اور 'اَرْسَلَ-یُرْسِلُ-اِرْسَالاً' کے معنی ہیں بھیجنا۔ تو رسول کے معنی ہوئے بھیجا ہوا، فرستادہ، پیغامبر، سفیر، ایلچی ــــ پوری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا " اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی !" یہ درحقیقت سلسلۂ رسالت یا سلسلۂ وحی کی دو کڑیاں ہیں کہ جن کو یہاں بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

نبوت و رسالت کی اصل غرض و غایت

ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ نبوت و رسالت یا وحی کی اصل غرض و غایت کیا ہے ! یہی کہ نوعِ انسانی تک اللہ کا پیغامِ ہدایت پہنچ جائے۔ انسان روزِ قیامت یہ نہ کہہ سکے ! اے اللہ

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو چاہتا کیا ہے! تجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے! ان کی اس دلیل کو ختم کرنے اور اللہ کی طرف سے حجت قائم کرنے کے لیے رسول بھیجے گئے اور وحی و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا گیا۔ اس ضمن میں یہ دو الفاظ اپنے ذہن میں ٹانک لیجئے: قطع عذر اور اتمامِ حجت۔ یہ ہے مقصد نبوت کا، رسالت کا، وحی کا اور انزالِ کتب کا۔ اس مضمون کے بیان میں سورۃ النساء کی یہ آیت بہت اہم ہے: "رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ": "رسولوں کو ہم نے بھیجا مبشر اور نذیر بنا کر تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل باقی نہ رہے" اُن کے پاس اپنی غلط روی کے لیے کوئی عذر نہ رہے۔ آپ غور کیجئے کہ ایک طرف اللہ کی ذات ورائے الورا، ثم ورائے الورا، ثم وراء الورا ہے اور اتنی لطیف ہے کہ لفظ 'لطیف' بھی کسی درجے میں کثافت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ ادھر انسان ہے پستیوں کا مکین، 'اسفل سافلین' ــــ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ــــ چنانچہ اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لیے حکمت خداوندی نے یہ طریقہ تجویز فرمایا کہ درمیان میں دو کڑیاں (LINKS) اختیار کی گئیں۔ پہلا لنک پہلی کڑی ہے 'رسولِ مَلَک'۔ یعنی فرشتوں میں سے ایک ایلچی اور پیغامبر کا انتخاب عمل میں آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتہ نورانی مخلوق ہے، اپنی اس نورانیت کی وجہ سے وہ خدا سے منجملہ ایک قرب رکھتی ہے کہ وہ کلام اللہ کی تلقی کرتا ہے اللہ سے۔ وہ پیغام حاصل کرتا ہے اللہ سے اور اسے جا پہنچاتا ہے انسانوں میں سے ایک منتخب مرد کو، ایک چُنے ہوئے فرد کو جو اخلاق اور سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانیت کی معراج پر فائز ہوتا ہے۔ مخلوق ہونے کے اعتبار سے فرشتہ اور انسان دونوں ایک دوسرے سے قرب رکھتے ہیں۔ اور اس بنا پر ان کے مابین ایک اتصال ممکن ہے۔ چنانچہ رسولِ مَلَک نے وہ پیغام اللہ سے حاصل کر کے رسولِ بشر تک پہنچایا اور اب رسولِ بشر کی یہ ذمہ داری ہوئی کہ وہ پہنچائے اس پیغام کو اپنے ابنائے نوع تک۔ اس کا پہنچانا قولاً بھی ہوگا، عملاً بھی ہوگا۔ وہ زبان سے بھی اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے گا، انہیں اس کے قبول کرنے کی دعوت دے گا اور عمل سے اس کا ایک نمونہ بھی پیش کر کے حجت قائم کر دے گا۔ یہ دعوت اور یہ پیغام محض کوئی نظری یا خیالی (THEORETICAL) شے نہیں ہے، یہ کوئی ناقابلِ عمل پیغام نہیں ہے بلکہ اس کا ایک عملی نمونہ بھی موجود ہے۔ اسی لیے قرآن مجید اس نکتے پر خصوصی زور دیتا ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"۔ اُن کی پوری

شخصیت نوعِ انسانی کے لئے ایک اُسوہ اور نمونہ بن جائے کیلئے تمام بشری تقاضوں کے باوصف وہ وحیِ الٰہی کی اس تعلیم پر عمل کر کے دکھا دے اور اس کا ایک عملی نمونہ پیش کر دے۔ تاکہ لوگوں کے پاس اپنی بے عملی اور غلط روی کے لیے کوئی دلیل اور کوئی عذر باقی نہ رہے۔ یہ ہے نبوت و رسالت کی اصل غرض و غایت!

ایمان بالملائکہ کی خصوصی اہمیت

اس آیت کے حوالے سے یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ ایمان بالملائکہ کی اہمیت کیا ہے! ورنہ ظاہر تو اس بات پر ایک تعجب سا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایمان بالملائکہ پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے۔ آیۂ برّ میں جو ہمارے اس منتخب نصاب کا دوسرا سبق تھا، ملائکہ پر ایمان کا ذکر موجود تھا۔ : " وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ "۔ اسی طرح حدیثِ جبریل کو ذہن میں لائیے۔ جب حضرت جبریلؑ نے حضورؐ سے سوال کیا کہ " اَخْبِرْنِىْ عَنِ الْاِيْمَانِ " تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جواب بھی دیا گیا کہ " اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ...... اِلَى الْاٰخِرِ "۔ معلوم ہوا کہ ایمان بالملائکہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کے بغیر وحی کی توجیہ ممکن نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے کچھ فلاسفۂ قدیم نے اور انہی کے اتباع میں بہت سے دانشورانِ جدید نے بھی۔ اس دور میں سر سید احمد خاں کو اس طبقۂ فکر کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے ملائکہ کے وجود کا صریح انکار کیا کہ ملائکہ کا کوئی صاحبِ تشخص وجود نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وحی کی توجیہ کیا ہے! بالآخر انہیں کہنا پڑا کہ وحی کا چشمہ تو قلبِ نبیؐ سے ہی پھوٹتا ہے۔ وحی کو نبی تک لانے والی خارج میں کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ وحی کو لانے والے خارجی عنصر کے اس انکارِ مطلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کا مسئلہ ایک چیستان بن گیا۔ وحی کی اصل حقیقت پھر کیا ہے؟ سر سید احمد خاں نے ایک شعر میں اپنے اس گمراہ کن خیال کو بڑے شدومد کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

اگرچہ مصرعِ ثانی میں معشوق کا لفظ دو معنی دے رہا ہے! یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ

معشوق سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق سے ان کی مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ بہرحال حضرت جبرئیل کو انہوں نے یوں کہا جا سکتا ہے "کہ یک بینی و دو گوش اس معاملے سے نکال باہر کیا۔ قرآن مجید کا یہ مقام اس معاملے کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں دو مرتبہ ضرور آتے ہیں؛ ذہن میں رکھئے کہ یہ مضمون سورۃ التکویر میں بھی آیا ہے اور اس کا اعادہ سورۃ النجم میں بھی ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصل مَلَکی حالت میں دو بار دیکھا ہے۔ اس ملاقات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ کسی روایت میں اگر راویوں کی کڑیاں متصل نہ ہوں، ان کی ملاقات ثابت نہ ہو تو روایت ناقابلِ اعتماد ہو جائے گی۔ قرآن بھی ایک روایت ہے۔ یہ اللہ کی حدیث ہے جو بروایت جبرئیلؑ پہنچی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہنچایا انسانوں تک۔ اس اہم اور نازک معاملے میں روایت کی ان کڑیوں کا اتصال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سورۃ التکویر میں حضورؐ اور حضرت جبرئیلؑ کی ملاقات کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا ہے: "وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝" کہ حضورؐ نے حضرت جبرئیلؑ کو دیکھا تھا افقِ مبین پر! اسی طریقے سے سورۃ النجم میں دوسری ملاقات کا ذکر ہے "وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝" کہ حضرت جبرئیل کو اصل مَلَکی صورت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار شبِ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھا تھا۔ قرآن مجید نے ان دونوں کی اس ملاقات کو دو مقامات پر اس قدر صراحت کے ساتھ اسی لیے بیان کیا ہے کہ یہ وحی کی دو کڑیاں ہیں۔ رسولِ مَلَک نے اللہ تعالیٰ سے اس پیغام کو حاصل کر کے پہنچایا رسولِ بشر تک اور رسولِ بشر نے اس کو پہنچا دیا خلقِ خدا تک۔ یہ گویا کہ ایمان بالرسالت کی ایک اہم بحث تھی جو اس مقام پر ایک آیت میں آ گئی!

اب چوتھی آیت میں عقیدۂ معاد اور عقیدۂ آخرت کا بیان ہے: "يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۝" "وہ (اللہ تعالیٰ) جانتا ہے جو کچھ کہ لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔" لیکن یہ جاننا کس لیے ہے؟ جواب بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ "وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝" "بالآخر سارے معاملات اللہ کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے۔" تمام معاملات اس کی عدالت میں پیش ہوں گے آخری فیصلے کے لیے۔ ہر شخص کو وہاں

حاضر ہونا ہوگا جواب دہی کے لیے ۔ یہاں ایک آیت میں بڑے اختصار کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا گویا لبِّ لباب اور خلاصہ سامنے لے آیا گیا ہے ۔ اس اختصار کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس سورۂ مبارکہ (سورۂ حج) کے پہلے رکوع میں چونکہ انتہائی وضاحت کے ساتھ آخرت کا بیان ہوا ہے، لہٰذا یہاں آخری رکوع میں اس کی طرف ایک اجمالی اشارے پر اکتفا کیا گیا۔

بہرحال یہ چار آیات ہیں جن کا آغاز ' یَااَیُّھَاالنَّاسُ ' کے خطاب سے ہوا ہے ۔ ان میں جو اہم مضامین آئے ہیں اُن میں شرک کا ابطال، توحید کا اثبات، شرک کا اصل سبب (مَاقَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ)، شرک کا انسان کی سیرت و کردار پر یہ اثر کہ پھر وہ ایک پست شخصیت کا مالک ہو کر رہ جاتا ہے' اور توحید کا اصل حاصل کہ اللہ کے پجاری اور اللہ کے پرستار خود اپنی ذات میں بھی ترفع حاصل کرتے ہیں' پھر نبوت و رسالت کی اہم بحث میں سلسلۂ وحی کی دو کڑیوں رسولِ مَلک اور رسولِ بشر کا ذکر اور اس کے بعد عقیدۂ آخرت کا بیان سب شامل ہیں ۔

اہلِ ایمان سے دین کے تقاضے

اب اگلی آیت میں خطاب اُن سے ہے جو ان حقائق کو مان چکے ہوں' ان پر ایمان لا چکے ہوں ۔ چنانچہ آغاز ہو رہا ہے ' یَااَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ' کے الفاظ سے ۔ اے اہلِ ایمان! یعنی اے وہ لوگو جنہوں نے مان لیا توحید کو، جنہوں نے تسلیم کر لیا آخرت کو' جو ایمان لے آئے رسالت پر' آؤ کہ تمہیں بتایا جائے کہ اب تمہیں کرنا کیا ہے! دین تم سے کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے' تمہاری دینی ذمہ داریاں کیا ہیں ؟ آپ دیکھیں گے اس مقام پر دو آیتوں میں دین کے عملی تقاضوں کو نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا ۔ اور پے بہ پے فعلِ امر کا استعمال ہے کہ یہ کرو اور یہ کرو اور یہ کرو! یہ ہیں دین کے عملی تقاضے! فرمایا :۔

' یَااَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا " اے اہلِ ایمان، رکوع کرو ' وَاسْجُدُوْا " اور سجدہ کرو ۔ " وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ " اور اپنے رب کی پرستش کرو، بندگی کرو" وَافْعَلُوا الْخَیْرَ " اور نیک کام کرو' بھلے کام کرو ۔ " لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ " ٥ تاکہ تم فلاح پاؤ! " وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ " اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے ۔ " ھُوَ اجْتَبٰکُمْ " اس نے تمہیں چن لیا ہے' پسند کر لیا ہے ۔ " وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ " اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ۔ مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ " یہ تمہارے باپ ابراہیم ہی کا طریقہ ہے ۔ " ھُوَ سَمّٰکُمُ

الْمُسْلِمِيْنَ لا " اس نے تمہارا نام رکھا مسلمان۔ " مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا " اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی۔ " لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ " تاکہ ہو جائیں رسولؐ گواہ تم پر۔ " وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ " اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر۔ " فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ " پس قائم کرو نماز! " وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ " اور ادا کرو زکوٰۃ! " وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ " اور اللہ سے چمٹ جاؤ! اللہ کے دامن سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ۔ " هُوَ مَوْلٰىكُمْ " وہ تمہارا حامی ہے، مددگار ہے، پشت پناہ ہے۔ " فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ " ۵ؐ تو کیا ہی اچھا ہے وہ ساتھی اور مددگار اور کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ اور حمایتی۔

پہلا تقاضا: ارکانِ اسلام کی پابندی

ان دو آیات پر غور کیجئے۔ پہلی آیت میں چار اوامر وارد ہوئے اور ان میں ایک بڑی خوبصورت معنوی ترتیب نظر آتی ہے۔ اس حقیقت کو اختصار کے ساتھ سمجھنے کے لئے ایک ایسی سیڑھی کا نقشہ اپنے ذہن میں لائیے جس کے چار قدمچے (STEPS) ہوں۔ دیکھئے کسی بھی مدعیٔ ایمان سے دین کا پہلا تقاضا یہ ہوگا کہ وہ ارکانِ اسلام کی، شعائرِ دین کی اور فرائض کی پابندی کرے۔ ان میں اوّلین فریضہ کہ جس کو اسلام اور کفر میں امتیاز قرار دیا گیا ہے ــــــ اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْكُفْرِ وَالْاِسْلَامِ الصَّلٰوةُ ــــــ نماز ہے یہ ' عماد الدین ' یعنی دین کا ستون ہے۔ ارکانِ اسلام میں سے رُکنِ رکین یہی نماز ہے اس آیت میں نماز کے دو ارکان یعنی رکوع اور سجود کے حوالے سے مراد درحقیقت نماز ہے اور یہ نماز گویا نمائندہ ہو گئی تمام ارکانِ اسلام کی۔ اس لیے کہ یہ ان میں سرفہرست ہے۔ لہٰذا مطالباتِ دینی کی پہلی سیڑھی مشتمل ہے ارکانِ اسلام کی پابندی پر۔

دوسرا تقاضا: عبادتِ ربّ

اب دوسری سیڑھی کی طرف قدم بڑھاؤ " وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ " صرف نماز روزہ ہی مطلوب نہیں ہے، رب کی پرستش، اس کی بندگی اور اس کی اطاعتِ کُلّی پوری زندگی میں درکار ہے۔ یہ اطاعت بلا چون و چرا ہونی چاہیئے اور بلا استثناء بھی! زندگی کو حصوں اور اجزا میں تقسیم نہ کر دیا گیا ہو کہ ایک حصّے میں اس کی اطاعت کی جاتی ہو اور زندگی کے بعض گوشے

اس اطاعت سے یکسر خالی ہوں۔ احکامِ خداوندی کی تفریق نہ ہو جائے کہ کوئی سر آنکھوں پر اور کوئی پاؤں تلے! وہ بندگی اور اطاعت کلّی مطلوب ہے جو محبتِ خداوندی سے سرشار ہو کر کی جائے۔ یہ دوسری سیڑھی ہے مطالباتِ دین کی۔ اور درحقیقت ارکانِ اسلام سے بھی مطلوب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے اندر یہ صلاحیت واستعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اپنی پوری زندگی کو اپنے رب کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال سکے۔ نماز و روزہ اور زکوٰۃ و حج سب اسی لیے ہیں کہ انسان پوری زندگی بندگیٔ رب کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن سکے! یہ دوسرا تقاضا ہوا۔

تیسرا تقاضا: بھلائی کے کام اور خدمتِ خلق

اس سلسلے کی تیسری سیڑھی کا بیان اس آیۂ مبارکہ میں "وَافْعَلُوا الْخَيْرَ" کے الفاظ میں ہوا ہے کہ نیک کام کرو، بھلے کام کرو۔ یہاں ظاہر بات ہے کہ خدمتِ خلق کے کام مراد ہیں کہ انسان کا وجود اپنے ہم نوع افراد کے لیے، پوری نوعِ انسانی کے لیے سراپا خیر کا موجب اور سبب بن جائے۔ اس کے بھی دو درجے ذہن میں رکھیے۔ ایک درجہ وہ ہے جسے آپ خدمتِ خلق کا بنیادی تصوّر کہہ سکتے ہیں اور جس سے سب لوگ واقف ہیں یعنی یہ کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، اگر کوئی لباس سے محروم ہے تو اسے کپڑے پہنائے جائیں، کوئی بیمار ہے تو اس کی دوا دارو کا اہتمام کر دیا جائے، کسی راہ چلتے کو راستہ بتا دیا جائے۔ اسی طرح یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور محتاجوں کی خبرگیری اور سرپرستی کا شمار بھی خدمتِ خلق کے کاموں میں ہوگا۔ آیۂ برّ میں یہ بحث ہم پڑھ آئے ہیں: "وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ"

خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح

———— لیکن غور کیجئے گا۔ خدمتِ خلق ہی کی ایک بلند تر سطح اور بھی ہے، وہ بلند تر سطح ہے بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پہ لانا، وہ کہ جن کی زندگی کا رُخ غلط ہو گیا ہے، جو ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں، جو اپنی بے بصیرتی کے باعث آگ کے الاؤ میں کودنا چاہتے ہیں، ان کو سیدھی راہ پہ لانا۔ خلقِ خدا

راہ ہدایت کی طرف دعوت دینا، اس سے بڑا خدمتِ خلق کا معاملہ اور کوئی نہیں!
ن لئے کہ موٹی سی بات ہے کہ اگر کسی کو غذا فراہم کر کے اس کے پیٹ میں لگی ہوئی
بھوک کی آگ کو آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا ہُوا، اگر وہ ہمہ تن آگ کے حوالے ہونے والا
ہو اور آپ کو اس کی فکر نہ ہو! یہ کوئی ایسا بڑا خدمتِ خلق کا کام تو نہ ہُوا۔ اگر کسی کی کوئی
تی سی دنیاوی ضرورت آپ نے پوری کر بھی دی درآنحالیکہ آپ کو یقین ہے، اگر
اقعتاً آپ کی آنکھیں کھُل چکی ہیں کہ وہ جس ڈگر پر چل رہا ہے اس کا انجام ہلاکت کے سوا
ور کچھ نہیں تو آپ نے اس کے ساتھ کیا بھلائی کی! جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے جس میں تم گر پڑنا
ہتے ہو اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر اور تمہارے کپڑے گھسیٹ گھسیٹ کر تمہیں اس
سے روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہی مضمون سورۃ التحریم میں بھی وارد ہُوا تھا: "يَا أَيُّهَا
الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا" کہ اے اہلِ ایمان بچاؤ اپنے
آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے! اور حضورؐ کا وہ طرزِ عمل کہ "يَا فَاطِمَةُ
بِنْتُ مُحَمَّدٍ أَنقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ" اور "يَا صَفِيَّةُ عَمَّةُ
رَسُولِ اللهِ أَنقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ" کہ آپؐ اپنے گھر کے ایک ایک
فرد کو گویا جہنّم کی آگ سے خبردار فرماتے تھے اور اس سے خود کو بچانے کی تلقین فرمایا
کرتے تھے۔ یہ خدمتِ خلق کی بلند ترین منزل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب
تک وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا آپؐ کی حیاتِ طیّبہ میں خدمتِ خلق کی وہ ابتدائی منزل
بتمام و کمال موجود تھی۔ یتیموں کی خبر گیری ہے، مسکینوں کی خدمت ہے، مسافروں کی
مہمان نوازی ہے، یہ تمام چیزیں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں حضورؐ کی سیرت میں موجود تھیں۔
لیکن پھر جب آپ کے پاس وہ "الحق" آگیا، ہدایتِ خداوندی نازل ہو گئی،
جب آپ پر حقائق منکشف کر دیئے گئے، جب عالمِ آخرت کے اسرار آپؐ کی
نگاہوں پر روشن کر دیئے گئے۔ پھر آپؐ کی ساری مساعی، ساری تگ و دو، ساری
دوڑ دھوپ اور خدمتِ خلق کا وہ پورا جذبہ مرتکز ہو گیا اسی پر کہ خلقِ خدا کو خدا کی
بندگی کی دعوت دیں، راہِ ہدایت کی طرف بلائیں، نیند کے ماتوں کو جگائیں، جو لوگ
مدہوش ہیں اور ہلاکت و بربادی کی طرف دوڑے جا رہے ہیں اُن کی آنکھیں کھولنے
کی کوشش کریں۔ یہ چار باتیں جو درحقیقت منبر کی تین سیڑھیوں کے مشابہ ہیں، بیان

ہے یعنی یہ کہ جماعت آئندہ پچیس سال کے لئے ہی یہ طے کر لے کہ وہ ملکی انتخابات میں حصہ نہیں لے گی - البتہ اس صورت میں جماعت کے تنظیمی ڈھانچے میں ایسی تبدیلی لانی ضروری ہوگی جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اظہار رائے پر کوئی قدغن نہ رہے اور اختلاف رائے کے راستے (Channels) معیّن صورت میں کھول دیئے جائیں، بلکہ اختلافی آراء کے پنپنے اور پروان چڑھنے کے امکانات بھی موجود ہوں - (اس ضمن میں قارئین اگر اس نظام العمل کا مطالعہ کریں جو ہم نے تنظیم اسلامی کے لئے اختیار کیا ہے تو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم نے بیعت کے نظام میں بھی اِن دونوں باتوں کا کس قدر اہتمام کیا ہے - یہ نظام العمل مئی ۹۰ء کے 'میثاق' میں شائع کیا جاچکا ہے) ------ اور اگرچہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اِس شرط کا پورا ہونا اللہ کی قدرت سے بعید نہ ہوتے ہوئے بھی، موجودہ حالات میں کم از کم بظاہرِ احوال ناممکنات میں شامل ہے، تاہم ہماری پیشکش قائم ہے!

ع "کہ عنقا را بلند است آشیانہ!" کے مصداق اس مقام سے نیچے اتر کر جہاں تک باہمی تعاون کا تعلق ہے، ہم اس کے لئے بھی ہمیشہ تیار رہے ہیں اور ریکارڈ پر ایسے متعدّد واقعات موجود ہیں کہ اس ضمن میں ہماری بار بار کی پیشکشوں کو سختی کے ساتھ ردّ کیا گیا- مثلاً:

۱- ۱۹۷۳ء میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا تو راقم خود چل کر نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اس میں شرکت کی دعوت دی - انہوں نے فرمایا کہ آپ کے ساتھ تو ہمارا شدید اختلاف ہے - میں نے عرض کیا کہ کیا خان عبد الولی خان صاحب سے آپ کا کامل اتفاق ہے؟ پھر اگر آپ سیاسی پلیٹ فارم پر ولی خاں اور اصغر خاں کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں تو قرآنی پلیٹ فارم پر میرے ساتھ کیوں تشریف نہیں رکھ سکتے؟ - انہوں نے فرمایا کہ میں جانتا تھا کہ آپ یہ دلیل دیں گے ------ تاہم آپ کی کانفرنس میں میری شرکت ناممکن ہے! ------ اس کے بعد بھی مسلسل دو سال تک راقم دعوت نامہ ارسال کرتا رہا ------ اور اس کا سلسلہ اُس وقت بند کیا جب اُن کی جانب سے ایک تلخ خط موصول ہوا کہ جب ہم نے آپ کو واضح طور پر بتادیا ہے کہ ہم شرکت نہیں کر سکتے تو آپ خواہ مخواہ ہمیں دعوت نامے کیوں ارسال کرتے ہیں!

۲- اسی طرح کی ایک دعوت تنظیم اسلامی کی ایک تربیت گاہ کے سلسلے میں جناب اسعد گیلانی صاحب کو دی گئی تو انہوں نے فی الفور آمادگی ظاہر فرمادی ------ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وقت کے امیرِ جماعت نے انہیں منع فرمادیا!!

۳- ۸۲ء میں جماعت اسلامی نے تعلیمِ قرآن کانفرنس منعقد کی اور اس میں میاں طفیل محمد صاحب نے دعوتِ عام دی کہ "ہمیں قرآن کی بنیاد پر جمع ہو جانا چاہئے" تو راقم نے فوری طور پر پیشکش کی کہ اگر آپ کے سامنے اشتراکِ عمل اور تعاونِ باہمی کا کوئی پروگرام ہے تو واضح فرمائیں اس کے لئے سب سے پہلے میں اور میری تنظیم لبیک کہتی ہے -- جس کے جواب میں مشترکہ لائحہ عمل اور اس کے حدود و خطوط معین کرنے کی بجائے گول مول نصیحت کے ساتھ ہمارے دستِ تعاون کو جھٹک دیا گیا (اس سلسلے میں جو خط راقم نے لکھا تھا اور اس کا جو جواب میاں صاحب کی جانب سے موصول ہوا' دونوں شاملِ اشاعت کئے جارہے ہیں!)

۴- اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماعات کئی سال سے پنجاب یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں منعقد ہوتے ہیں اور اُن میں جماعتِ اسلامی کے زعماء کے علاوہ دیگر علماء یا دانشور حضرات کو بھی دعوتِ خطاب دی جاتی ہے' لیکن اس کے باوجود کہ راقم کیمپس کا قریب ترین پڑوسی بھی ہے ------ اور جمعیت کا سابق ناظم اعلیٰ بھی' آج تک اُسے ان اجتماعات میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی -

جمعیت کے اس طرز عمل کے مقابلے میں راقم الحروف کی روش ہمیشہ یہ رہی کہ جب بھی کسی کالج میں منعقد ہونے والی کسی محدود تقریب میں دعوتِ خطاب دی گئی سر کے بل حاضر ہوتا رہا ------ اور کبھی اسے اپنی 'انا' یا Prestige کا مسئلہ نہیں بنایا کہ جب آپ اپنے بڑے اجتماعات میں مجھے مدعو نہیں کرتے تو میں ان چھوٹے چھوٹے اجتماعات میں کیوں آؤں؟ ------

۵- یہی معاملہ حال ہی میں لاہور میں پیش آیا کہ جب مرکز کے اہتمام میں ایک 'عظیم الشان' بین الاقوامی کشمیر کانفرنس 'الحمراء' میں منعقد کی گئی تو اس میں شرکت کی دعوت مجھے نہیں دی گئی ------ اس کے باوجود جب لاہور کی جماعت نے "ہفتۂ انسدادِ منکرات" کے سلسلے میں ایک سیمینار جناح ہال میں منعقد کیا اور اس میں مجھے بلایا تو میں بلا

چون و چرا حاضر ہو گیا ----- (وہاں جو تقریر راقم نے کی تھی وہ اگرچہ ہفت روزہ 'ندا
میں شائع ہو چکی ہے' تاہم چونکہ 'میثاق' کا حلقۂ قارئین اس سے وسیع تر ہے لہٰذا اِ
اس اشاعت میں بھی شامل کیا جا رہا ہے -) ---

۶- ستم بالائے ستم یہ کہ جماعت کا جو کُل پاکستان اجتماع چند ماہ پیشتر مینارِ پاکستان ـ
سائے میں منعقد ہوا تھا اس کے بارے میں جماعت کے بعض قریبی لوگوں سے معلوم ہ
کہ یہ مشہور کیا گیا ہے کہ "انہیں (یعنی راقم کو) بھی دعوتِ خطاب دی گئی تھی لیکن وہ خود
نہیں آئے ----- اور اُن سے اپنا سٹال لگانے کو بھی کہا گیا تھا لیکن انہوں نے خود نہیں
لگایا!" ----- جبکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے نام صرف وہ دعوت نامہ موصول ہوا تھا جو عا
سامعین کو رسماً بھیجا جاتا ہے ----- اس میں کسی تقریر یا خطاب کا کوئی ذکر تک نہ تھا
اور سٹال کے ضمن میں جب ہم نے خود رابطہ کیا تھا تو بتایا گیا تھا کہ ساری جگہ پہلے ہی الاٹ
چکی ہے اور اب کسی سٹال کی گنجائش باقی نہیں رہی -

اب محبین اور مخلصین خود غور فرمائیں کہ کمی ہماری جانب سے ہے
دوسری جانب سے!

اور جب بات اس حد تک پہنچ ہی گئی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے 'تتمہ
کے طور پر چند باتیں بھی 'طوالت کے خوف کے باوجود گوش گزار کر دی جائیں -

راقم الحروف اپنی دعوت اور تحریک کے اعتبار سے مولانا مودودی مرحوم اور جماعت
اسلامی کو اپنے معنوی 'والدین' سمجھتا ہے - چنانچہ راقم نے بارہا صراحتہً عرض کیا ہے ا
دانست میں راقم جس تحریک اور دعوت کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے ا
کی اس بیسویں صدی عیسوی میں پہلی کڑی کی حیثیت حاصل ہے مولانا ابو الکلام آز
مرحوم اور ان کی حزب اللہ کو' اور دوسری کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے معنوی جانشی
مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی ----- اگر
میری تحریک کا سلسلۂ نسب مولانا آزاد مرحوم کی زندگی کے بھی صرف آٹھ سالوں سے مج
ہے یعنی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء اور مولانا مودودی مرحوم کی تحریک کے بھی صرف آٹھ ہی سالوں
متعلق ہے یعنی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۷ء ----- اسی طرح جماعت اسلامی کے بارے میں ۱۹۴۷

کی تحریر کا یہ اقتباس تو اسی تحریر میں آ چکا ہے کہ جیسے ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے اکابرینِ جماعت سے دیکھنا' سننا' سوچنا اور بولنا سیکھا ہے - اس کے علاوہ میں نے اپنے ان ہی جذبات کے اظہار کے لئے ایک موقع پر علامہ اقبال مرحوم کی مشہور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے اس شعر کو ذریعہ بنایا تھا کہ ۔

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی !

جس پر بعض احباب بالخصوص مکّہ مکرّمہ سے زبیر عمر صدیقی صاحب کا بڑا جذباتی ردِّ عمل موصول ہوا تھا-

تاہم از روئے قرآن والدین کا حق ادب و احترام اور حسنِ سلوک اور مصاحبتِ معروف ہی کا ہے' ان کی اطاعت یا اتباع ہر حال میں لازم نہیں' (سورۂ بنی اسرائیل آیات ۲۳ تا ۲۵' سورۂ عنکبوت آیت ۸' اور سورۂ لقمان آیات ۱۴' ۱۵) چنانچہ کسی معاملے کی نوعیت کی مناسبت سے اُن سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے' اور حکم عدولی بھی کی جا سکتی ہے' اور عدل و انصاف کی بات اُن کے خلاف پڑ رہی ہو تو بھی ڈنکے کی چوٹ کہنا ضروری ہے (سورۂ نساء آیت ۱۳۵) ------ چنانچہ میں نے مولانا مودودی مرحوم کے دینی فکر میں جو کمی نظر آئی اس کی بھرپور نشان دہی کی' ("اسلام کی نشاۃِ ثانیہ : کرنے کا اصل کام" نامی کتابچے میں تعبیر کی کوتاہی" کے عنوان سے بحث' اور "عظمتِ صوم" نامی تحریر میں "اسلام کا روحانی نظام" کے موضوع پر مولانا مرحوم کے نظریئے کی نفی) اِسی طرح قیام پاکستان کے بعد کی مجموعی پالیسی میں جو کجی نظر آئی اس پر بھی مبسوط مقالہ لکھا (" تحریک جماعتِ اسلامی : ایک تحقیقی جائزہ") ------ پھر ۵۷-۱۹۵۶ء کے بُحرانی دَور کے جو اقدامات تباہ کُن محسوس ہوئے اُن پر بھی گرفت کی' "خلافت و ملوکیت" نامی کتاب میں بعض نہایت جلیل القدر صحابہؓ پر جو جارحانہ تنقید وارد ہوئی اُس سے بھی اعلانِ براءت اور اظہارِ بیزاری کیا' اور بالآخر تحریک اور تنظیم کی قیادت و امارت کے تصوّر کے ضمن میں جو غلطی نظر آئی اُس کی بھی نشان دہی کر دی ------ لیکن بحمد اللہ آج تک نہ اُن کی ذات پر کوئی حملہ کیا اور نہ اُن کی نجی اور گھریلو زندگی کو کبھی موضوعِ گفتگو بنایا ------ بلکہ ایک خاص دَور میں مقدّم الذکر امور کے ضمن میں بھی اگر لہجہ تیز اور زبان سخت ہو گئی تھی تو اس پر بھی علیٰ رؤس الاشہاد

معذرت کر لی!

تاہم چونکہ والدین سے خواہ کتنا بھی اختلاف کیوں نہ ہو جائے' رہتے تو وہ والدین ہی ہیں' اور اُن کی احسان مندی کا جذبہ ہر سلیم الفطرت انسان میں بہرحال برقرار رہنا چاہئے' لہٰذا میں نے بھی جماعت سے علیحدگی کے بعد کے تینتیس۳۳ سالوں میں سے صرف ایک آٹھ سالہ دَور (۶۲ء تا ۷۰ء) کے علاوہ نہ اس سے قبل کے پانچ سالوں کے دوران اپنے قلب میں اس جذبہ و احساس کی کوئی کمی محسوس کی' نہ ہی بعد کے بیس سالوں کے دوران اِن میں کمی کا کوئی شائبہ محسوس کیا! فالحمدُ للہِ علیٰ ذالِک!

عجیب اتفاق ہے کہ میرے صُلبی و جسمانی والد شیخ مختار احمد مرحوم کا سِنِ پیدائش بھی ۱۹۰۳ء تھا' اور میرے تحریکی و معنوی والد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ولادت بھی اُسی سال ہوئی تھی ——— پھر وہ دونوں ہی عرصہ ہوا کہ اس دنیا سے رخصت اور " تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ " کے مصداق بن چکے ہیں - جبکہ میری والدہ ماجدہ بھی تاحال بقیدِ حیات ہیں اور میری معنوی ماں جماعتِ اسلامی بھی قائم اور موجود ہے! اور میں جیسے یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ والدہ صاحبہ کا سایہ تادیر سلامت رکھے' ایسے ہی قلب کی گہرائیوں سے یہ دعا بھی مسلسل نکلتی رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعت کے اربابِ حلّ و عقد کو توفیق دے کہ وہ حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہوئے پوری جرأتِ رندانہ کے ساتھ اپنے سابقہ طریق کار کی طرف مراجعت کر لیں - تاکہ ع " آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!" کی صورت پیدا ہو جائے ———

" وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز !! " لہٰذا " اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ!! "

الغرض ——— یہ ہیں مولانا مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی کے بارے میں میرے قلبی احساسات و جذبات جن کے اظہار میں مجھے ہرگز کوئی باک نہیں' خواہ اسے کوئی ارشاد احمد علوی یا اُن کے ہم خیال جماعت کی خوشامد اور ع " میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب! " کا مصداق قرار دیں' خواہ کوئی صفدر میر یا اُن کے ہم نوا ——— "Kowtowing Before The Jama'at" سے تعبیر کریں' ———

تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں جملہ اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر مولانا مودودی کی ہر بات سے متفق ہونے کا اعلان کر دوں' یا اُن کے ہر اقدام کو درست قرار دے

دوں ' یا اُن کو معاذ اللہ تنقید سے بالاتر سمجھنے لگوں۔ اُن سے میرے علمی اختلافات بے شما ہیں ' یہاں تک کہ اُن کے بعض نظریات و خیالات کو میں گمراہی سے تعبیر کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا!

مزید بر آں جس طرح والدین معناً ایک وحدت ہوتے ہوئے بھی اپنا اپنا جداگانہ مقام رکھتے ہیں چنانچہ حدیثِ نبویؐ کی رُو سے والدہ کا حق والد پر تین درجہ فائق ہے ' اسی طرح مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی خواہ ایک اعتبار سے ایک حیاتیاتی اکائی اور وحدت ہوں اپنی اپنی جداگانہ حیثیت بھی رکھتے ہیں ------ بالخصوص اب جبکہ مولانا مودودی مرحوم کی وفات پر دس سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے اُن کے علمی نظریات اور ذاتی خیالات کا کوئی لازمی تعلق جماعتِ اسلامی کے ساتھ نہیں ہے (چنانچہ اصولاً تو اس کا واضح فیصلہ اور برملا اعلان بھی ۱۹۵۶ء ہی میں کر دیا گیا تھا!) ------ لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ "جماعتِ اسلامی" سے میرا اختلاف صرف "طریقِ کار" کا ہے ------ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جماعت کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ "وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ" (النمل: ۱۴) کے مصداق خواہ برملا تسلیم کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہوں ' دل سے قائل ہو چکے ہیں کہ انتخابات کے ذریعے اقامتِ دین کی منزل کی جانب کوئی پیش قدمی ممکن نہیں ہے!! (بلکہ سننے میں آیا ہے کہ جماعت کے موجودہ امیر قاضی حسین احمد صاحب نے تو بعض اجتماعات میں اس کا برملا اعلان بھی کر دیا ہے ------ اگرچہ ' اگر ہماری اطلاعات صحیح ہیں تو ' اس کے متبادل کے طور پر جس راستے کی وہ نشان دہی کر رہے ہیں وہ ایک خطرناک وادی کے مترادف ہے!! ------ جس کے ضمن میں نُصح و اخلاص کا حق راقم نے اپنی اس تقریر کے بین السطور میں ادا کر دیا ہے جو جماعت کے حالیہ سیمینار میں ہوئی تھی اور اس پرچے میں بھی شائع کی جا رہی ہے!)

'میثاق' کا یہ شمارہ بھی جنوری اور مارچ کے شماروں کے مانند "نقضِ غزل" ہی کے سلسلے کی کڑی بن گیا ہے ------ اگرچہ یہ کڑی آخری ہے اور آئندہ ان صفحات میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں آئے گا- بلکہ "نقضِ غزل" کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا تاہم "نقضِ غزل" کے اس تکملہ کے ساتھ بطور ضمیمہ راقم کا جماعت کی رکنیت سے

'استعفاء' شائع کیا جا رہا ہے جو ۲۹ر اپریل ۵۷ء مطابق ۲۹ر رمضان المبارک ۷۶ ۱۳ھ کو بحالتِ صوم و اعتکاف لکھا گیا تھا جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ آج سے ثلث صدی قبل جب راقم نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی تھی تو اُس وقت اُس کے جذبات و احساسات کیا تھے! ------ اور یہ کہ اگر میں یہ کہتا رہا کہ ؎

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے یہ الفت اور محکم ہو گئی

اور عملاً اس شعر کی تصویر بنا رہا کہ ؎

گو مَیں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

تو "وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ" کے مصداق اس میں نہ کوئی تصنّع ہے نہ تکلّف ------ بلکہ یہ میرے فکر و نظر کی حقیقی ترجمانی اور میرے جذبہ و احساس کا واقعی انعکاس ہے! --- ع
'کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے!"

اعتذار

'میثاق' کے پچھلے شمارے میں ادارے کی جانب سے دو مضامین کے بارے میں یہ اعلان شامل تھا کہ جون کے شمارے میں انہیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی: ایک 'نقضِ غزل' کے ردّ عمل میں موصول ہونے والے خطوط اور ان کے جواب میں امیر تنظیم اسلامی کی توضیحات کا اور دوسرے 'پاکستان کا مستقبل: روشن یا تاریک' کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی کے مفصل خطاب کا ---- الحمد للہ کہ اوّل الذکر مضمون حسبِ وعدہ زیر نظر شمارے میں شامل ہے اور اس کی حیثیت 'نقضِ غزل' کے تکملے کی ہے۔ تاہم مؤخر الذکر کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ 'میثاق' کی تنگ دامانی بیک وقت ان دونوں انتہائی مفصل مضامین کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ (ادارہ)

الہدیٰ قسط ۶۵

مباحث جہاد فی سبیل اللہ درس ۲

جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ

شہادت علی النّاس

سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں

(۲)

نبوّت و رسالت سے متعلق ایک اہم حقیقت کا بیان

بسم اللہ اولہ وآخرہ : سورۃ الحج کے آخری رکوع کے جزو اوّل کی تیسری آیت میں نبوّت و رسالت سے متعلق ایک نہایت اہم حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا :
" اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ " لفظ اِصطفیٰ 'صفی' سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں چن لینا، پسند کر لینا، ' TO CHOOSE ' 'اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ' کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ چن لیتا ہے پسند فرما لیتا ہے۔ آگے چلئے ! 'رُسُل' جمع ہے رسول کی۔ اور 'اَرْسَلَ۔یُرْسِلُ۔اِرْسَالًا' کے معنی ہیں بھیجنا۔ تو رسول کے معنی ہوئے بھیجا ہوا' فرستادہ، پیغامبر، سفیر، ایلچی ـــــ پوری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا " اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی !" یہ درحقیقت سلسلۂ رسالت یا سلسلۂ وحی کی دو کڑیاں ہیں کہ جن کو یہاں بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

نبوت و رسالت کی اصل غرض وغایت

ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ نبوّت و رسالت یا وحی کی اصل غرض وغایت کیا ہے! یہی کہ نوعِ انسانی تک اللہ کا پیغامِ ہدایت پہنچ جائے۔ انسان روزِ قیامت یہ نہ کہہ سکے :" اے اللہ

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو چاہتا کیا ہے ! تجھے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے ! ان کی اس دلیل کو ختم کرنے اور اللہ کی طرف سے حجت قائم کرنے کے لیے رسول بھیجے گئے اور وحی و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا گیا۔ اس ضمن میں یہ دو الفاظ اپنے ذہن میں ٹانک لیجئے : قطع عذر اور اتمام حجت۔ یہ ہے مقصد نبوت کا ، رسالت کا ، وحی کا اور انزالِ کتب کا۔ اس مضمون کے بیان میں سورۃ النساء کی یہ آیت بہت اہم ہے : "رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ": " رسولوں کو ہم نے بھیجا مبشر اور نذیر بنا کر تا کہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی دلیل باقی نہ رہے" اُن کے پاس اپنی غلط روی کے لیے کوئی عذر نہ رہے۔ آپ غور کیجئے کہ ایک طرف اللہ کی ذات وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اتنی لطیف ہے کہ لفظ 'لطیف' بھی کسی درجے میں کثافت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ ادھر انسان ہے پستیوں کا مکین ، اسفل سافلین ، ـــــ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ـــــ چنانچہ اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لیے حکمت خداوندی نے یہ طریقہ تجویز فرمایا کہ درمیان میں دو کڑیاں (LINKS) اختیار کی گئیں۔ پہلا لنک پہلی کڑی ہے ' رسولِ ملک '۔ یعنی فرشتوں میں سے ایک ایلچی اور پیغامبر کا انتخاب عمل میں آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتہ نورانی مخلوق ہے۔ اپنی اس نورانیت کی وجہ سے وہ خدا سے منجملہ ایک قرب رکھتی ہے ، وہ کلام اللہ کی تلقی کرتا ہے اللہ سے۔ وہ پیغام حاصل کرتا ہے اللہ سے اور اسے جا پہنچاتا ہے انسانوں میں سے ایک منتخب مرد کو ، ایک چنے ہوئے فرد کو جو اخلاق اور سیرت و کردار کے اعتبار سے انسانیت کی معراج پر فائز ہوتا ہے۔ مخلوق ہونے کے اعتبار سے فرشتہ اور انسان دونوں ایک دوسرے سے قرب رکھتے ہیں۔ اور اس بنا پر ان کے مابین ایک اتصال ممکن ہے۔ چنانچہ رسولِ ملک نے وہ پیغام اللہ سے حاصل کر کے رسولِ بشر تک پہنچایا اور اب رسولِ بشر کی یہ ذمہ داری ہوئی کہ وہ پہنچائے اس پیغام کو اپنے ابنائے نوع تک۔ اس کا پہنچانا قولاً بھی ہوگا ، عملاً بھی ہوگا۔ وہ زبان سے بھی اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے گا ، انہیں اس کے قبول کرنے کی دعوت دے گا اور عمل سے اس کا ایک نمونہ بھی پیش کر کے حجت قائم کر دے گا۔ یہ دعوت اور یہ پیغام محض کوئی نظری یا خیالی (THEORETICAL) شے نہیں ہے ، یہ کوئی ناقابلِ عمل پیغام نہیں ہے بلکہ اس کا ایک عملی نمونہ بھی موجود ہے۔ اسی لیے قرآن مجید اس نکتے پر خصوصی زور دیتا ہے کہ " لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ "۔ اُن کی پوری

شخصیت نوعِ انسانی کے لئے ایک اُسوہ اور نمونہ بن جائے کہ اپنے تمام بشری تقاضوں کے باوصف وہ وحیِ الٰہی کی اس تعلیم پر عمل کر کے دکھادے اور اس کا ایک عملی نمونہ پیش کر دے۔ تاکہ لوگوں کے پاس اپنی بے عملی اور غلط روی کے لیے کوئی دلیل اور کوئی عذر باقی نہ رہے۔ یہ ہے نبوّت و رسالت کی اصل غرض و غایت!

ایمان بالملائکہ کی خصوصی اہمیت

اس آیت کے حوالے سے یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ ایمان بالملائکہ کی اہمیت کیا ہے! ورنہ بظاہر تو اس بات پر ایک تعجب سا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایمان بالملائکہ پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے۔ آیۂ برّ میں جو ہمارے اس منتخب نصاب کا دوسرا سبق تھا، ملائکہ پر ایمان کا ذکر موجود تھا۔: "وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ"۔ اسی طرح حدیثِ جبریل کو ذہن میں لائیے۔ جب حضرت جبرئیلؑ نے حضورؐ سے سوال کیا کہ "اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ" تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی جانب سے جواب یہی دیا گیا کہ "اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ...... اِلَی الْاٰخِر"۔ معلوم ہوا کہ ایمان بالملائکہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کے بغیر وحی کی توجیہ ممکن نہیں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے کچھ فلاسفۂ قدیم نے اور انہی کے اتباع میں بہت سے دانشورانِ جدید نے بھی۔ اس دَور میں سرسید احمد خاں کو اس طبقۂ فکر کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے ملائکہ کے وجود کا صریح انکار کیا کہ ملائکہ کا کوئی صاحبِ تشخص وجود نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وحی کی توجیہ کیا ہے! بالآخر انہیں کہنا پڑا کہ وحی کا چشمہ تو قلبِ نبیؐ سے ہی پھوٹتا ہے۔ وحی کو نبی تک لانے والی خارج میں کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ وحی کو لانے والے خارجی عنصر کے اس انکارِ مطلق کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کا مسئلہ ایک چیستان بن گیا۔ وحی کی اصل حقیقت پھر کیا ہے؟ سرسید احمد خاں نے ایک شعر میں اپنے اس گمراہ کن خیال کو بڑے شدّ و مد کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

اگرچہ مصرعِ ثانی میں معشوق کا لفظ دو معنی دے رہا ہے، یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ

معشوق سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معشوق سے ان کی مراد ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ بہرحال حضرت جبرئیل کو انہوں نے یوں کہا جا سکتا ہے "کرِبکرِ بینی و دو گوشش اس معاملے سے نکال باہر کیا۔ قرآن مجید کا یہ مقام اس معاملے کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں دو مرتبہ ضرور آتے ہیں، ذہن میں رکھئے کہ یہ مضمون سورۃ التکویر میں بھی آیا ہے اور اس کا اعادہ سورۃ النجم میں بھی ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصل مَلکی حالت میں دو بار دیکھا ہے۔ اس ملاقات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ کسی روایت میں اگر راویوں کی کڑیاں متصل نہ ہوں، ان کی ملاقات ثابت نہ ہو تو روایت ناقابلِ اعتماد ہو جائے گی۔ قرآن بھی ایک روایت ہے۔ یہ اللہ کی حدیث ہے جو بروایتِ جبرئیل پہنچی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہنچایا انسانوں تک۔ اس اہم اور نازک معاملے میں روایت کی ان کڑیوں کا اتصال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ سورۃ التکویر میں حضور اور حضرت جبرئیل کی ملاقات کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا ہے: "وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۝" کہ حضور نے حضرت جبرئیل کو دیکھا تھا افقِ مبین پر! اسی طریقے سے سورۃ النجم میں دوسری ملاقات کا ذکر ہے " وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝" کہ حضرت جبرئیل کو اصل مَلکی صورت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار شبِ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھا تھا۔ قرآن مجید نے ان دونوں کی اس ملاقات کو دو مقامات پر اس قدر صراحت کے ساتھ اسی لیے بیان کیا ہے کہ یہ وحی کی دو کڑیاں ہیں۔ رسولِ مَلک نے اللہ تعالیٰ سے اس پیغام کو حاصل کر کے پہنچایا رسولِ بشر تک اور رسولِ بشر نے اس کو پہنچا دیا خلقِ خدا تک۔ یہ گویا کہ ایمان بالرسالت کی ایک اہم بحث تھی جو اس مقام پر ایک آیت میں آئی!

اب چوتھی آیت میں عقیدۂ معاد اور عقیدۂ آخرت کا بیان ہے: " يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ " وہ (اللہ تعالیٰ) جانتا ہے جو کچھ کہ لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔" لیکن یہ جاننا کس لیے ہے؟ جواب بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ " وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝" بالآخر سارے معاملات اللہ کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے" تمام معاملات اس کی عدالت میں پیش ہوں گے آخری فیصلے کے لیے۔ ہر شخص کو وہاں

حاضر ہونا ہوگا جواب دہی کے لیے۔ یہاں ایک آیت میں بڑے اختصار کے ساتھ عقیدۂ آخرت کا گویا لبِّ لباب اور خلاصہ سامنے لے آیا گیا ہے۔ اس اختصار کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ (سورۂ حج) کے پہلے رکوع میں چونکہ انتہائی وضاحت کے ساتھ آخرت کا بیان ہوا ہے، لہٰذا یہاں آخری رکوع میں اس کی طرف ایک اجمالی اشارے پر اکتفا کیا گیا۔ بہرحال یہ چار آیات ہیں جن کا آغاز 'یَا اَیُّهَا النَّاسُ' کے خطاب سے ہوا ہے۔ ان میں جو اہم مضامین آئے ہیں اُن میں شرک کا ابطال، توحید کا اثبات، شرک کا اصل سبب (مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ)، شرک کا انسان کی سیرت و کردار پر یہ اثر کہ پھر وہ ایک پست شخصیت کا مالک ہو کر رہ جاتا ہے' اور توحید کا اصل حاصل کہ اللہ کے پجاری اور اللہ کے پرستار خود اپنی ذات میں بھی ترفّع حاصل کرتے ہیں' پھر نبوّت و رسالت کی اہم بحث میں سلسلۂ وحی کی دو کڑیوں رسولِ مَلَک اور رسولِ بشر کا ذکر اور اس کے بعد عقیدۂ آخرت کا بیان سب شامل ہیں۔

اہلِ ایمان سے دین کے تقاضے

اب اگلی آیت میں خطاب اُن سے ہے جو ان حقائق کو مان چکے ہوں' ان پر ایمان لا چکے ہوں۔ چنانچہ آغاز ہو رہا ہے 'یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کے الفاظ سے۔ اے اہلِ ایمان! یعنی اے وہ لوگو جنہوں نے مان لیا توحید کو، جنہوں نے تسلیم کر لیا آخرت کو' جو ایمان لے آئے رسالت پر' آؤ کہ تمہیں بتایا جائے کہ اب تمہیں کرنا کیا ہے! دین تم سے کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے' تمہاری دینی ذمہ داریاں کیا ہیں ــــ؟ آپ دیکھیں گے اس مقام پر دو آیتوں میں ان کے عملی تقاضوں کو نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا۔ اور پے بہ پے فعل امر کا استعمال ہے کہ یہ کرو اور یہ کرو اور یہ کرو! یہ ہیں دین کے عملی تقاضے! فرمایا:۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا " اے اہلِ ایمان، رکوع کرو " وَاسْجُدُوْا " اور سجدہ کرو۔ " وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ " اور اپنے رب کی پرستش کرو، بندگی کرو۔" وَافْعَلُوا الْخَیْرَ " اور نیک کام کرو' بھلے کام کرو۔ " لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ "○ تاکہ تم فلاح پاؤ! " وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ " اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ " هُوَ اجْتَبٰکُمْ " اس نے تمہیں چن لیا ہے' پسند کر لیا ہے۔ " وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ " اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔

اَلْمُسْلِمِیْنَ ۵ ” اس نے تمہارا نام رکھا مسلمان ۔ ” مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ ھٰذَا “ اس سے پہلے بھی اور اس میں بھی ۔ ” لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْکُمْ “ تاکہ ہو جائیں رسول گواہ تم پر ۔ ” وَتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ “ اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر ۔ ” فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ “ پس قائم کرو نماز ! ” وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ “ اور ادا کرو زکوٰۃ ! ” وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ “ اور اللہ سے چمٹ جاؤ ! اللہ کے دامن سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ ۔ ” هُوَ مَوْلٰکُمْ “ وہ تمہارا حامی ہے ، مددگار ہے ، پشت پناہ ہے ۔ ” فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۵ “ تو کیا ہی اچھا ہے وہ ساتھی اور مددگار اور کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ اور حمایتی ۔

پہلا تقاضا : ارکانِ اسلام کی پابندی

ان دو آیات پر غور کیجئے ۔ پہلی آیت میں چار اوامر وارد ہوئے اور ان میں ایک بڑی خوبصورت معنوی ترتیب نظر آتی ہے ۔ اس حقیقت کو اختصار کے ساتھ سمجھنے کے لئے ایک ایسی سیڑھی کا نقشہ اپنے ذہن میں لائیے جس کے چار قدمچے (STEPS) ہوں ۔ دیکھئے کسی بھی مدعیٔ ایمان سے دین کا پہلا تقاضا یہ ہوگا کہ وہ ارکانِ اسلام کی ، شعائرِ دین کی اور فرائض کی پابندی کرے ۔ ان میں اوّلین فریضہ کہ جس کو اسلام اور کفر میں امتیاز قرار دیا گیا ہے ـــــ اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْکُفْرِ وَالْاِسْلَامِ الصَّلٰوةُ ـــــ نماز ہے یہ ' عماد الدین ' یعنی دین کا ستون ہے ۔ ارکانِ اسلام میں سے رُکنِ رکین یہی نماز ہے اس آیت میں نماز کے دو ارکان یعنی رکوع اور سجود کے حوالے سے مراد درحقیقت نماز ہے اور یہ نماز گویا نمائندہ ہو گئی تمام ارکانِ اسلام کی ۔ اس لیے کہ یہ ان میں سرفہرست ہے لہٰذا مطالباتِ دینی کی پہلی سیڑھی مشتمل ہے ارکانِ اسلام کی پابندی پر ۔

دوسرا تقاضا : عبادتِ ربّ

اب دوسری سیڑھی کی طرف قدم بڑھاؤ ” وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ “ صرف نماز روزہ ہی مطلوب نہیں ہے ، رب کی پرستش ، اس کی بندگی اور اس کی اطاعتِ کُلّی پوری زندگی میں درکار ہے ۔ یہ اطاعت بلا چون وچرا ہونی چاہیے اور بلا استثناء بھی ! زندگی کو حصّوں اور اجزا میں تقسیم نہ کر دیا گیا ہو کہ ایک حصّے میں اس کی اطاعت کی جاتی ہو اور زندگی کے بعض گوشے

اس اطاعت سے یکسر خالی ہوں۔ احکامِ خداوندی کی تفریق نہ ہو جائے کہ کوئی سر آنکھوں اور کوئی پاؤں تلے! وہ بندگی اور اطاعتِ کلی مطلوب ہے جو محبتِ خداوندی سے سر ہو کر کی جائے۔ یہ دوسری سیڑھی ہے مطالباتِ دین کی۔ اور درحقیقت ارکانِ اسلام سے بھی مطلوب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے اندر یہ صلاحیت و استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اپنی زندگی کو اپنے رب کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال سکے۔ نماز و روزہ اور زکوٰۃ و حج اسی لیے ہیں کہ انسان پوری زندگی بندگیٔ رب کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل بن سکے! دوسرا تقاضا ہوا۔

تیسرا تقاضا: بھلائی کے کام اور خدمتِ خلق

اس سلسلے کی تیسری سیڑھی کا بیان اس آیۂ مبارکہ میں "وَافْعَلُوا الْخَيْرَ" کے الفاظ میں ہوا ہے کہ نیک کام کرو، بھلے کام کرو۔ یہاں ظاہر بات ہے کہ خدمتِ خلق کے کام مراد ہیں کہ انسان کا وجود اپنے ہم نوع افراد کے لیے، پوری نوعِ انسانی کے لیے سراپا خیر کا موجب اور سبب بن جائے۔ اس کے بھی دو درجے ذہن میں رکھیے۔ ایک درجہ تو ہے جسے آپ خدمتِ خلق کا بنیادی تصور کہہ سکتے ہیں اور جس سے سب لوگ واقف ہیں یعنی یہ کہ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، اگر کوئی لباس سے محروم ہے تو اسے کپڑے پہنائے جائیں؛ کوئی بیمار ہے تو اس کی دوا دارو کا اہتمام کر دیا جائے، کسی راہ چلتے کو راستہ بتا دیا جائے۔ اسی طرح یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور محتاجوں کی خبر گیری اور سرپرستی کا شمار بھی خدمتِ خلق کے کاموں میں ہوگا۔ آیۂ برّ میں یہ بحث ہم پڑھ آئے ہیں: "وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ"

خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح

——— لیکن غور کیجئے گا۔ خدمتِ خلق ہی کی ایک بلند تر سطح بھی ہے، وہ بلند تر سطح ہے بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لانا، وہ کہ جن کی زندگی کا رُخ غلط ہو گیا ہے، جو ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں، جو اپنی بے بصیرتی کے باعث آگ کے الاؤ میں کود جانا چاہتے ہیں، ان کو سیدھی راہ پہ لانا۔ خلقِ خ

کو راہِ ہدایت کی طرف دعوت دینا، اس سے بڑا خدمتِ خلق کا معاملہ اور کوئی نہیں! اس لئے کہ موٹی سی بات ہے کہ اگر کسی کو غذا فراہم کر کے اس کے پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ کو آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا ہوا، اگر وہ ہمہ تن آگ کے حوالے ہونے والا ہو اور آپ کو اس کی فکر نہ ہو! یہ کوئی ایسا بڑا خدمتِ خلق کا کام تو نہ ہوا۔ اگر کسی کی کوئی وقتی سی دنیاوی ضرورت آپ نے پوری کر بھی دی درآنحالیکہ آپ کو یقین ہے، اگر واقعتاً آپ کی آنکھیں کھل چکی ہیں کہ وہ جس ڈگر پر چل رہا ہے اس کا انجام ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں تو آپ نے اس کے ساتھ کیا بھلائی کی! جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے جس میں تم گر پڑنا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر اور تمہارے کپڑے گھسیٹ گھسیٹ کر تمہیں اس سے روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہی مضمون سورۃ التحریم میں بھی وارد ہوا تھا: "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا" کہ اے اہلِ ایمان بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے! اور حضورؐ کا وہ طرزِ عمل کہ "یَا فَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ" اور "یَا صَفِیَّۃُ عَمَّۃُ رَسُوْلِ اللّٰهِ اَنْقِذِیْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ" کہ آپؐ اپنے گھر کے ایک ایک فرد کو گویا جہنم کی آگ سے خبردار فرماتے تھے اور اس سے خود کو بچانے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ یہ خدمتِ خلق کی بلند ترین منزل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب تک وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں خدمتِ خلق کی وہ ابتدائی منزل بتمام و کمال موجود تھی۔ یتیموں کی خبر گیری ہے، مسکینوں کی خدمت ہے، مسافروں کی مہمان نوازی ہے، یہ تمام چیزیں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں حضورؐ کی سیرت میں موجود تھیں۔

لیکن پھر جب آپ کے پاس وہ "الحق" آگیا، ہدایت خداوندی نازل ہو گئی، جب آپ پر حقائق منکشف کر دیئے گئے، جب عالمِ آخرت کے اسرار آپؐ کی نگاہوں پر روشن کر دیئے گئے۔ پھر آپؐ کی ساری مساعی، ساری تگ و دو، ساری دوڑ دھوپ اور خدمتِ خلق کا وہ پورا جذبہ مرتکز ہو گیا اسی پر کہ خلقِ خدا کو خدا کی بندگی کی دعوت دیں، راہِ ہدایت کی طرف بلائیں، نیند کے ماتوں کو جگائیں، جو لوگ مدہوش ہیں اور ہلاکت و بربادی کی طرف دوڑے جا رہے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کریں۔ یہ چار باتیں جو درحقیقت منبر کی تین سیڑھیوں کے مشابہ ہیں، بیان

رنے کے بعد فرمایا: " لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ "۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔ 'لَعَلَّ' کے
ل معنی ہوتے ہیں 'شاید'۔ تو ترجمہ یوں ہوگا 'شاید کہ تم فلاح پاؤ'، اور یہ 'شاید'
لفظ جب شاہانہ انداز میں کلام الٰہی میں آتا ہے تو اس میں حتمیت کا مفہوم پیدا ہوجاتا
ہے جیسے کوئی بادشاہ اگر کسی سے کہے کہ اگر تم یہ کرو تو شاید ہم تمہارے ساتھ یہ معاملہ
یں، تو درحقیقت یہاں یہ 'شاید' ایک مکمل وعدے کی صورت اختیار کرجاتا ہے۔
فرمایا " لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ " یہ سب کچھ کروگے تو فلاح سے ہم کنار ہوگے۔ یہ
روگے تو کامیابی حاصل کرسکوگے۔

اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں!"

معلوم ہوا کہ اب ہم پھر اُسی مقام پر پہنچ گئے جہاں
ے کہ ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس آیۂ مبارکہ میں گویا سورۃ العصر اپنے جملہ مضامین
ے ساتھ پھر ہمارے سامنے آگئی۔ اس لئے کہ وہاں نجات کی شرطِ اوّل تھی ایمان۔
ل خطاب ہوا ہے 'يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' کے الفاظ سے۔ اے اہل ایمان!
ل ایمان کے فوراً بعد وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی شرط مذکور تھی۔ یہاں اسی عمل صالح
ے 'ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ' کے
ظ میں چار اوامر کی شکل اختیار کرلی۔ رکوع کرو، سجدہ کرو، بندگی کرو اپنے
ب کی اور تمہارا عمل خیر پر مبنی ہوجائے۔ البتہ 'وَافْعَلُوا الْخَيْرَ' کو اس کے وسیع تر
ہوم میں لیجئے جیسے کہ حضورؐ نے فرمایا: " خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ "
وگوں میں بہتر وہی ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچا رہا ہو جن سے لوگوں کو نفع پہنچ رہا ہو۔
ب ظاہر بات ہے کہ نفع صرف دنیا کا نفع ہی تو نہیں ہے۔ یہ تو نفع کا نہایت محدود
ور ہے۔ اور اگر فی الواقع آنکھیں کھل گئی ہوں، حقیقت منکشف ہوگئی ہو، آخرت
م انسان کو حاصل ہوگیا ہو۔ تو اب 'نفع' کا مفہوم بدل جائے گا۔ اب انسان کو نظر آئے گا
صل نفع تو آخرت کا نفع ہے۔ اصل جیت وہاں کی جیت اور اصل ہار وہاں کی ہار ہے۔
رۃ التغابن میں ہم پڑھ چکے: " ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ " وہ ہے ہار اور جیت کے
یلے کا دن! جو اس روز نفع میں رہا وہ حقیقۃً نفع میں رہا اور جو اس روز گھاٹے میں قرار دیا
ا وہی اصل میں گھاٹا پانے والا!

فلاح کا دار و مدار دینی فرائض کی ادائیگی پر ہے!

اس آیۂ مبارکہ پر پھر اپنی توجہ کو مرکوز کیجیے! " یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ " اے اہلِ ایمان، رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو (اس کی اطاعت کلی پر کاربند ہو جاؤ اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر) اور بھلے کام کرو (نیکیاں کرو، خلقِ خدا کی خدمت کرو) یہ سب کام کرو گے تو فلاح پاؤ گے! آپ غور کیجیے کہ اگر صرف دعویٰ ایمان سے فلاح اور کامیابی کا حصول یقینی ہو جائے تو کیا یہ سارا کلام، نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ، مہمل نہیں قرار پائے گا! یہ بے معنی بات ہو گی۔ یہ منطق کی اصطلاح میں تحصیلِ حاصل قرار پائے گا۔ جو چیز محض دعویٰ ایمان سے یا مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے خود بخود حاصل ہو جائے۔ اس کے لیے اتنا کھکھیڑ مول لینا، اتنی محنت اور مشقت کرنا سعیٔ لاحاصل قرار پائے گا۔ پھر یہ رکوع و سجود، بندگیٔ رب، پوری زندگی میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعتِ کلی اور خدمتِ خلق پہ کمربستہ ہو جانا گویا یہ سب اضافی چیز قرار پائیں گے! لیکن قرآن حکیم اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتا ہے۔ جیسے کہ سورۃ العصر میں یہ بات وضاحت سے سامنے آئی تھی کہ نجات کی شرائط چار ہیں! وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

چوتھا تقاضا: جہاد فی سبیل اللہ

———— ایمان اور عمل صالح کی حد تک بحث تو سورۃ الحج کی اس ایک آیت میں مکمل ہو گئی جس کا مطالعہ ہم نے ابھی کیا ہے۔ اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے قائم مقام کے طور پر، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کے حوالے سے اب اصطلاح آ رہی ہے یہاں جہاد کی۔ چنانچہ دوسری آیت جو اس رکوع کی آخری آیت ہے، پوری کی پوری جہاد ہی کے موضوع پر ہے۔ فرمایا: وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ " اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ جہاد کا حق ہے" آپ دیکھیں گے کہ اس رکوع کے پہلے اور دوسرے حصے کے مابین مضامین کے اعتبار سے بڑا گہرا ربط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ترتیبِ مضامین کے اعتبار سے ہمارے اس منتخب نصاب میں اب جہاد ہی کا مضمون چل رہا تھا لیکن

اس آخری آیت کے مفہوم کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس پورے رکوع کا مضمون سامنے آجائے ۔

رکوع کے دونوں حصّوں کا تقابل کیجئے! اوپر لفظ آیا تھا " مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ " کہ انہوں نے خدا کو نہ پہچانا جیسے کہ پہچاننا چاہیئے تھا ۔ وہ اللّٰہ کے مقام و مرتبے اور اللّٰہ کی صفاتِ جمال و کمال کا کوئی اندازہ نہ کر پائے جیسا کہ اس کے اندازے کا حق تھا۔ وہی اسلوب یہاں آرہا ہے ۔ " وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۔ " یہ دو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں ۔ (۱) خدا کی معرفت جیسا کہ اس کا حق ہے اور (۲) خدا کے لیے جہاد، کوشش، جدّ و جہد اور محنت جیسا کہ اس کا حق ہے ۔ پہلی چیز ایمان کا لُبِّ لباب اور ایمان کا اصل حاصل ہے ۔ انسان کی نظری و فکری و عملی قوتوں کی معراج ہے اللّٰہ کی معرفت! اور انسان کے قوائے عملیہ کا جو بہترین ہدف اور ان کا بہترین مصرف ہے وہ ہے جہاد فی اللّٰہ! اللّٰہ کے لیے جہاد ۔ دَر حقیقت ' فِی اللّٰہ ' سے مراد بھی کم و بیش وہی ہے جو ' فِي سَبِيْلِ اللّٰه ' سے ہے جس پر مفصّل گفتگو پچھلے سبق میں ہو چکی ہے ۔ آیت کے الفاظ پر توجہ کو جمائیے ! " وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ " اور محنتیں کرو، کوششیں کرو، جدوجہد کرو، لگاؤ اِس راہ میں اپنی جانیں اور اپنے مال اور کھپاؤ اپنی جسمانی قوتیں اور صلاحیتیں اور صرف کرو اپنے اوقات اِس طور سے اور اِس شان سے کہ جس شان سے کہ اللّٰہ کے لیے محنت کرنے کا حق ہے ۔ یہاں ذہن میں رکھیے کہ انسان محنتیں کرتا ہے، مشقتیں بھی کرتا ہے لیکن یہ مسئلہ کہ اس کی محنت اور مشقت پر کس کا کتنا حصّہ حق ہے، اس کی صحیح تعیین ہی پر دار و مدار ہے اُس کے صحیح یا غلط ہونے کا ۔ ہم میں سے اکثر لوگ وہ ہیں جو اپنے آپ کو گویا کہ ہمہ تن کھپا دیتے (INVEST کر دیتے) ہیں اپنی اولاد پر ۔ بلکہ ہم میں سے اکثر و بیشتر کے معاملے میں یہ بات شاید غلط نہ ہو گی جو ایک صاحب نے بڑے عجیب پیرائے میں ایک زمانے میں مجھ سے کہی تھی کہ میں تو اپنی بیوی بچوں کا ملازم ہوں کپڑے اور روٹی پر! میری ساری محنت صرف ہوتی ہے کمانے پر ۔ اور اس کمائی کا مصرف کیا ہے؟ میرے یہ گھر والے، اِن کی ضروریات، اِن کا پیٹ پالنا، ان کا تن ڈھانپنا اور بس! یہ انتہائی تلخ حقیقت ہے کہ اگر تجزیہ کیا جائے تو ہمارے ننانوے فیصد لوگوں کی سعی و جہد، اِن کی بھاگ دوڑ، ان کی محنت کا اصل حاصل اس کے سوا کچھ نہیں! سوال یہ ہے کہ انسان اگر اپنے اہل و عیال کے لیے محنتیں اور مشقتیں کر رہا ہے تو وہ اللّٰہ

عیال آخر اس کو کیا ' REPAY ' کر سکیں گے ! اس کی اس محنت اور جد وجہد کی کیا قیمت ادا کر سکیں گے ؟ اُسے اس کا کیا بدلہ دے سکیں گے ! اکثر و بیشتر تو وہی اولادِ انسان کے بڑھاپے کے وقت اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہوتی ہے ۔ یہ الفاظ بھی زبان سے نکلتے ہیں کہ ابّا جان آپ پرانے زمانے کے لوگ ہیں، آپ کو کیا معلوم کہ جدید زمانے کے تقاضے کیا ہیں ! اس وقت جس طرح کلیجہ اندر سے کٹتا ہے کہ یہ ہیں وہ کہ جن پر ہم نے اپنے آپ کو نچھاور کر دیا تھا، لگا دیا تھا اور کھپا دیا تھا ! تو فرمایا : " وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ " تم سوچو کہ تمہاری محنت و مشقت اور تمہاری سعی و جہد کا اصل حق دار کون ہے ؟ کیا وہی نہیں جو تمہارا خالق ہے ، تمہارا مالک ہے ، تمہارا پروردگار ہے ، تمہارا پالنہار ہے اور تمہارا رازق ہے ! اگر واقعتاً تم نے اُسے پہچان لیا ہے ، اگر یہ تمہارا اقرارِ لسانی محض ایک عقیدہ نہیں ہے جو زبان پر ہو بلکہ اس کی حقیقت بھی کسی درجے میں تمہیں حاصل ہو چکی ہے اور تمہارے دل و دماغ اس حقیقت سے منوّر ہو چکے ہیں تو اس کا تو پھر ایک ہی نتیجہ نکلنا چاہیے ۔ وہ یہ کہ تمہاری سعی و جہد کا اوّلین ہدف اور تمہاری قوتوں اور توانائیوں کا اوّلین مصرف اللہ اور اس کے دین کی سربلندی قرار پانا چاہیے ۔ اور تمہاری قوتوں اور صلاحیتوں کا بہتر اور بیشتر حصہ لگنا چاہیے اور کھپنا چاہیے اللہ کے لیے ! اسی کا نام ہے جہاد فی اللہ یا جہاد فی سبیل اللہ ! اس طور سے جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے ۔ یہ نہ ہو کہ معمولی سی کوشش یا تھوڑی سی محنت کر کے اور ذرا سا ایثار یا تھوڑا سا وقت لگا کر یا کچھ تھوڑا سا کہیں چندہ دے کر انسان اپنے دل کو مطمئن کر بیٹھے کہ میں نے حق ادا کر دیا ۔ میں نے اپنی ذمّہ داری ادا کر دی ۔ اللہ کے لیے جتنا کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نے کر دیا ! یہاں ' حقّ جہادہ ' کے الفاظ بہت اہم ہیں اور ان کے ذریعے اس عمل کو جس شدّ و مد کے ساتھ اور جس وسعت کے ساتھ ہونا چاہیے اور زندگی میں اِس کو جس درجے اہمیت ، جو مقام اور مرتبہ ملنا چاہیے ، اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ۔ ابھی یہ مضمون جاری رہے گا ـــ جہاد فی سبیل اللہ کا ہدفِ اوّلین یعنی شہادت علی الناس درحقیقت اس آخری آیت کا اصل مضمون ہے ، جس کے پیشِ نظر اس مقام کو منتخب نصاب کے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے ـــ

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ !

"انسدادِ منکرات" کی مہم میں

اُسوۂ رسولؐ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے!

سُود کی لعنت کو ختم کرنے کے سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حقیقت ناشناسی ہوگی!

جماعتِ اسلامی کے زیراہتمام سیمینار سے امیر تنظیم اسلامی کا خطاب

بشکریہ ہفت روزہ 'ندا' لاہور

حمد و ثناء اور ادعیہ مسنونہ کے بعد

محترم صدرِ محفل، زعمائے ملت اور معزز حاضرین!

آپ بھی جانتے ہیں اور مجھے بھی اس کا اندازہ تھا کہ اس قسم کے اجتماعات میں کسی مفصّل تقریر کا موقع نہیں ہوتا۔ متعدّد مقررین اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں، لہٰذا کسی ایک شخص کو زیادہ وقت نہیں دیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس اجتماع میں شرکت کے لئے بالخصوص یہ اہتمام کیا کہ آج کے سیمینار کے موضوع سے متعلق اپنی ایک تقریر جو پچھلے دنوں مسجد دارالسّلام میں ہوئی تھی اور کچھ عرصہ قبل "میثاق" میں شائع بھی ہوئی، اسے میں نے ہنگامی طور پر ایک کتابچہ کی شکل میں تیار کرایا اور وہ اس وقت آپ حضرات کی خدمت میں ہدیتاً پیش کی جاچکی ہے۔

کتابچہ 'نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیّت' کا تعارف

چونکہ مجھے اپنے اندازے سے نسبتاً زیادہ وقت دے دیا گیا ہے لہٰذا میں پہلے اس کتابچے کا تعارف کرا دینا چاہتا ہوں۔ امّتِ مسلمہ کے اجتماعی فرضِ منصبی کے لئے قرآن حکیم میں دُو اصطلاحات آئی ہیں۔ ایک اصطلاح نسبتاً فلسفیانہ ہے جس کو سمجھانے کے لئے بہت سے صغریٰ کبریٰ جوڑنے ضروری ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بالعموم اس اصطلاح کو سمجھا نہیں گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عہدِ حاضر میں یہ بات بھی بہت اچھی علامات میں سے ہے کہ اس اصطلاح کا صحیح مفہوم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی معرکۃ الآراء

کتاب "دعوتِ دین اور اس کا طریق کار" میں اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی مشہور تقریر "شہادتِ حق" میں نہایت خوبصورتی اور دلائل کے ساتھ واضح کر دیا ہے - یہ کہ اس امت کا فرضِ منصبی شہادت علی النّاس یا شہادتِ حق ہے - البتہ قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے کہ جو مضمون وہ فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں بیان کرتا ہے 'عوام کی سہولت کے لئے اسے عام فہم انداز میں بھی ادا کرتا ہے اس لئے کہ یہ کتابِ ہدایت صرف علماء 'فضلاء اور حکماء کے لئے نہیں 'عوام کے لئے بھی ہے چنانچہ عام فہم اصطلاح 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' ہے -

امتِ مسلمہ کے لئے یہ اصطلاح صرف سورۂ آل عمران میں دو مرتبہ وارد ہوئی ہے - میں نے ابھی جن آیاتِ مبارکہ کا حوالہ دیا ہے 'مجھے اس کے بارے میں بھی تفصیلاً عرض نہیں کرنا البتہ ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جو اس امت کے بہت بڑے حصے میں پیدا ہو چکی ہے - امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم و ملزوم ہیں 'ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں 'ایک ہی گاڑی کے دو پہیے ہیں - قرآن مجید میں دس مقامات پر ایک وحدت کی حیثیت سے یہ اصطلاح آئی ہے لیکن افسوس کہ ہمارے ایک بہت ہی مؤثر طبقے نے اس کے اندر تفریق پیدا کر دی -'نہی عن المنکر' کو اپنے لائحہ عمل سے خارج کر دیا اور صرف امر بالمعروف 'دعوتِ خیر 'تلقین اور وعظ و نصیحت پر اکتفا کر لیا -

علماءِ کرام کے کرنے کا اصل کام

اس سے ایک بہت بڑی غلطی جو پیدا ہوئی ہے 'در حقیقت اسی کی اصلاح کے لئے میں نے یہ تقریر کی تھی کہ واقعہ اگرچہ یہ ہے کہ یہ دونوں اپنی جگہ لازم و ملزوم ہیں لیکن قرآن و حدیث کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اہم تر حصہ نہی عن المنکر کا ہے - عذابِ الٰہی سے بچنے کی واحد راہ نہی عن المنکر ہے - علماء و صلحاء اور جو حضرات کسی بھی اعتبار سے امت میں رہنمائی کے منصب پر فائز ہوں 'ان کے کرنے کا اصل کام نہی عن المنکر ہے - یہ ہے در حقیقت وہ بنیادی بات جو چونکہ ہمارے مذہبی طبقات میں سے بعض اہم حصوں کے ذہنوں سے نکل چکی ہے لہٰذا اس کا از سرِ نو اثبات اور

اس کو نئے سرے سے واضح کیا جانا ضروری ہے۔ اسی غرض سے میں نے یہ تقریر کی جو اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس اعتبار سے میں ایک حدیث کا حوالہ آپ حضرات کو ضرور دینا چاہوں گا جو ہمارے لئے بہت ہی آنکھیں کھول دینے والی بات ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بنی اسرائیل میں جو اولین نقص پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کسی دوسرے سے ملاقات پر کہتا تھا: اے فلاں' اللہ سے ڈرو' اور جو کام تم کر رہے ہو اسے چھوڑ دو' اس لئے کہ وہ تمہارے لئے جائز نہیں ہے! لیکن پھر جب ان کی اگلے روز ملاقات ہوتی تھی تو اس کے باوجود کہ وہ شخص اپنی اسی روش پر قائم ہوتا تھا یہ بات اس پہلے شخص کو اس کے ساتھ کھانے پینے میں شرکت اور مجالست سے نہیں روکتی تھی' تو جب انہوں نے یہ روش اختیار کی تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی باہم مشابہ کر دیا"۔ اس کے بعد آپؐ نے آیاتِ قرآنی (سورۂ مائدہ ۷۸ تا ۸۱) " لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا . . . . فَاسِقُوْنَ " تک تلاوت فرمائیں اور پھر فرمایا: " ہرگز نہیں! خدا کی قسم تمہیں لازماً نیکی کا حکم دینا ہوگا اور بدی سے روکنا ہوگا اور ظالم کا ہاتھ پکڑ لینا ہوگا' اور اسے جبراً حق کی جانب موڑنا اور اس پر قائم رکھنا ہوگا ورنہ اللہ تمہارے دل بھی ایک دوسرے کے مانند کر دے گا' اور پھر تم پر بھی اسی طرح لعنت فرمائے گا جیسے اُن پر کی تھی!" اس حدیث کو روایت کیا امام ابو داؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے۔

متذکرہ بالا الفاظ روایتِ ابی داؤد کے ہیں جبکہ روایتِ ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو (ابتدا میں) اُن کے علماء نے ان کو ان سے روکا لیکن جب وہ باز نہ آئے اور (اس کے باوجود) انہوں نے ان کی ہم نشینی اور باہم کھانا پینا جاری رکھا تو اللہ نے ان کے دل بھی باہم مشابہ کر دیئے اور پھر ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام) کی زبانی لعنت فرمائی اور یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے تھے"۔ اس کے بعد آنحضورؐ اٹھ کر بیٹھ گئے در آں حالیکہ اس سے قبل آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے اور پھر آپ نے فرمایا: " نہیں' اُس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب تک تم ان کو حق کی جانب موڑ نہ دو گے (تمہاری ذمہ داری ادا نہ ہوگی)"۔ امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے!

اس حدیثِ مبارکہ کے حوالے سے جماعت اسلامی کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اس نے اس اہم شعبے کی طرف ایک منظم طریقے سے توجہ کی ہے البتہ اس کے ضمن میں ادب کے ساتھ چند گزارشات پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں- پہلی بات یہ کہ یہ کام جیسا کہ میرے پیش روؤ مقررین نے بھی بیان کیا' صرف ہفتوں تک محدود نہیں رہنا چاہئے- یہ تو سب سے نمایاں' آپ کے کرنے کا اصل کام' دائم و قائم اور آپ کا سب سے ممتاز وصف' آپ کا شعار بن جانا چاہئے- یہ صورت صرف مہم کی صورت میں چند دنوں تک رہی تو اس کی برکتیں ظاہر نہیں ہو پائیں گی- یوں وہ صرف ایک جماعتی Issue بن کر رہ جائے گا اور ایک خاص جماعت کے لئے گویا کہ لوگوں کی نگاہ میں پبلسٹی کے حصول کا ایک ذریعہ' چاہے اپنی جگہ آپ کی نیت کچھ بھی ہو- یہ کام دائم و قائم اور مسلسل ہونا چاہئے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہی اصل اور نمایاں ترین وصف ہونا چاہئے-

اُمّتِ مسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل

جب امت مسلمہ کا اصل فرضِ منصبی یہی ہے' جب ہمیں نکالا ہی اسی لئے گیا ہے کہ

" كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ "-

پھر اگر پوری امت اس فرض کو فراموش کر کے سو گئی ہو تو اس صورت میں بھی جو طرزِ عمل ہونا چاہئے اس کی طرف بھی قرآن مجید نے رہنمائی فرما دی کہ اس سوئی ہوئی بڑی امت میں سے کچھ لوگ تو ہوش میں آئیں' کچھ تو جاگیں اور جگائیں اور مل جل کر ایک قوت بنیں ________ اور وہ قوت تین کام کرے- یہ آیت بڑی اہم ہے- میں نے اس سے پہلے ایک تقریر میں امتِ مسلمہ کے لئے سہ نکاتی لائحہ عمل پیش کیا تھا جو سورۂ آل عمران کی آیات ۱۰۲' ۱۰۳ اور ۱۰۴ میں دیا گیا ہے- امتِ مسلمہ کے لئے یہ سہ نکاتی لائحہ عمل ہے اور اس کا نکتہ عروج ہے:

" وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "-

تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جس کا کام ہی یہ ہو کہ وہ خیر کی طرف دعوت دے

اس کے بارے میں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے کہ 'خیر' سے مراد کیا ہے - پورا اسلام بھی خیر ہے 'پورا دین بھی خیر ہے ' ہر بھلائی خیر کے درجے میں آجائے گی اور ہر معروف بھی خیر ہے لیکن چونکہ امر بالمعروف آگے علیحدہ بھی آ رہا ہے لہٰذا میرے نزدیک یہاں "يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ" کا مفہوم معیّن کرنا ہو گا - درحقیقت سب سے بڑا خیر قرآنِ حکیم ہے - "هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْ نَ" - یہ کہیں بہتر ہے 'خیر سے بھی اعلیٰ ہے 'خیرِ کثیر ہے 'خیرِ اعظم ہے 'خیر اعلیٰ ہے - اس کی طرف بلانا اور پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی طرف بلانا تین کام ہوئے - انہی کے لئے اپنے آپ کو خاص کر لیجئے 'اسی کو اپنا سب سے بڑا شعار بنا لیجئے اور اسی کو اپنی پالیسی کا بنیادی مقصد بنا لیجئے - اس کے ضمن میں دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہوں گا ' اس میں بھی حدیثِ نبویؐ اور سنتِ نبویؐ ہمارے لئے گویا کہ سرمۂ چشم ہیں - ہمارے لئے رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے والی ہیں ' دو عظیم حدیثیں ہیں جن میں سے ایک تو بہت عام ہے کہ تم میں سے جو شخص بھی کسی منکر کو دیکھے 'اس کا فرض ہے کہ ہاتھ سے 'طاقت سے روکے - اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو یا زبانوں پر بھی تالے ڈال دیئے گئے ہوں تو کم سے کم دل سے اسے برا سمجھے 'گھٹن ہو ' انسان کو ایک صدمے کی کیفیت لاحق رہے کہ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

فرمایا کہ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے -

ایک اور حدیث جو اپنے مفہوم میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے لیکن چونکہ ذرا طویل ہے اس لئے وہ ہمارے ہاں عام طور پر بیان نہیں ہوتی - میرے نزدیک اس موضوع پر اہم ترین حدیث وہی ہے - حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ فرماتے ہیں مجھ سے پہلے اللہ نے جس نبی کو بھی اُس کی امت میں مبعوث فرمایا تو اللہ نے اس کو اپنے کچھ ساتھی اور حواری عطا فرمائے کم یا بیش ' زیادہ یا تھوڑے ' کچھ نہ کچھ صحابہ یا حواری تو ملے - وہ کیا کرتے تھے ؟ - اپنے نبی کی سنّت کو مضبوطی سے تھامتے تھے ' ان کے حکم کے مطابق عمل کرتے تھے لیکن اس کے بعد ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ ایسے ناخلف پیدا ہوتے رہے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے - الفاظ بہت بلند وبالا ' نہایت عمدہ تقاریر 'لیکن عمل کا خانہ خالی -

محبت کے دعوے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لیکن عملی زندگی کی طرف نگاہ جائے تو معلوم ہو کہ میلوں دُور کا بھی تعلق نہیں - چنانچہ کرتے وہ تھے جن کا انہیں حکم نہیں ہوا تھا- اب اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ جو ان کے ساتھ جہاد کرے اپنے ہاتھ سے 'وہ مومن ہے اور جو ان کے ساتھ جہاد کرے اپنی زبان سے، وہ مومن ہے اور جو ان کے ساتھ جہاد اور کشمکش کرے اپنے دل سے' وہ بھی مومن ہے اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں رہتا-

نہی عن المنکر بالید' کا مرحلہ کب آتا ہے؟

یہ دوسری حدیث مسلم شریف کی روایت ہے اور میرے نزدیک اپنے مفہوم کو اور زیادہ واضح کرتی ہے لیکن ہیں ان دونوں احادیثِ مبارکہ کے حوالے سے جو بات اس وقت کہنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ نہی عن المنکر باللّسان اور نہی عن المنکر بالید کے درمیان ایک فصل ہے' فاصلہ ہے اور یہ نہایت نازک مرحلہ بھی ہے - اسی نازک مرحلے پر صحیح فیصلہ کرنا تحریکوں اور جماعتوں کے مستقبل اور کامیابی وناکامی کا اصل دارومدار بن جاتا ہے- چنانچہ اگر Pre-maturally 'وقت سے پہلے' مناسب قوت حاصل کئے بغیر نہی عن المنکر بالید کا فریضہ شروع کر دیا گیا تو وہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا- اس سلسلے میں رہنمائی کے لئے ہمیں سنتِ رسولؐ' سیرتِ طیّبہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا- دیکھئے سب سے بڑا منکر تھا بت پرستی اور اسی کے خلاف سب سے پہلے آواز اٹھائی گئی: "قُولُوا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" - اعلانِ عام کیا گیا یہ بُت کیا ہیں' یہ دیویاں کیا ہیں' یہ تو کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ چھوڑے اور اللہ نے ان کے لئے کوئی برہان نہیں اتاری لیکن نوٹ کیجئے کہ باللّسان دعوت ہوتی رہی' نہی عن المنکر ہوتا رہا تاہم کسی بت کو توڑا نہیں گیا- بُت موجود رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی کعبہ کا طواف کرتے رہے جس میں بت رکھے ہوئے تھے - محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی صحنِ حرم میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے رہے جہاں دائیں' بائیں' پیچھے اور آگے بت ہی بت تھے -

اُسوۂ رسولؐ کی پیروی ضروری ہے!

یہی ہمارے لئے اصل اسوہ ہے - آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مکہ میں جو مسلمان تھے وہ

معاذ اللہ ثم معاذ اللہ' بزدل نہیں تھے' وہ بے غیرت نہیں تھے' ان میں سے ہر ایک اپنی جان قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار تھا لیکن کہا گیا کہ صبر کرو' اپنے آپ کو تھامے رکھو۔ مجھے علامہ اقبال کا وہ شعر یاد آیا کہ ؂

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

لیکن پھر ایک وقت آیا کہ ہاتھ کھول دیئے گئے۔ "اجازت دی جاتی ہے کہ ان لوگوں سے قتل کرو کیونکہ انہوں نے ظلم روا رکھا"۔ لیکن یہ نوٹ کیجئے کہ ایک قائد کی سرکردگی میں ایک جماعت فدائین اور سرفروشوں کی تیار ہوئی اور پھر اس نے جہاد بھی کیا' قتال بھی کیا۔ جب وہ طاقت حاصل ہو گئی تو مکہ میں داخل ہو کر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا کام جو کیا وہ ان بتوں کو توڑ دینا ہی تھا۔ "حق آگیا اور باطل نے راہ فرار اختیار کی۔ اسے تو جانا ہی تھا"۔

یہ اسوۂ رسول ہے اور بڑا نازک مرحلہ ہے یہ فیصلہ کرنا کہ آپ نہی عن المنکر باللسان کریں گے یا بالید بھی کریں گے۔ یاد رکھئے اس کے لئے فیصلہ حضورؐ کا ذاتی نہیں تھا' یہ فیصلہ وحی کے ذریعے سے ہوا۔ اب ختمِ نبوت کے بعد ظاہر بات ہے کہ تحریکوں کو خود فیصلے کرنے ہیں جس کے لئے اپنی بہترین اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہو گا۔ لیکن یہ الل ٹپ فیصلہ کرنے کی باتیں نہیں ہیں۔ یہ تحریک اور جماعت کی اعلیٰ ترین قیادت کا فیصلہ ہو گا۔ اس کو اپنی بہترین اجتہادی قوت کو بروئے کار لا کر فیصلہ کرنا ہے۔ یہ فیصلہ انفرادی نہیں ہونا چاہئے اور پھر یہ فیصلہ اعلانیہ بھی ہو گا' خفیہ نہیں ہو گا۔ اگر یہ دونوں شرطیں پوری نہ ہوئیں تو یہ فساد فی الارض بن جائے گا۔ اس سے خیر وجود میں نہیں آئے گا۔

ہمیں ہر معاملہ میں سنتِ رسولؐ کو اپنے سامنے رکھنا ہے۔ تیاری کیجئے' طاقت فراہم کیجئے' منظم قوت بڑھایئے' اپنے Base کو Extend کیجئے۔ ایک وقت آئے گا کہ Open Challenge throw کیا جائے گا' ایک واضح چیلنج دیا جائے گا کہ آئندہ اب یہاں ہم نہیں یا یہ منکر نہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کر رہا ہوں' نوجوانوں کا جوش میں نے ابھی دیکھ لیا ہے اور گوجرانوالہ میں اس کی ایک عملی شکل بھی سامنے آگئی ہے لیکن اس ضروری تیاری کے بغیر کوئی اقدام نہ کیجئے۔ ظاہر بات ہے کہ میں اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ پر عمل کر رہا ہوں' میں چاہتا ہوں کہ اس کو آپ کے سامنے رکھ دوں کہ یہ کام کرنے کا ہے

لیکن ابھی نہیں - اس کو بڑھائیے' اپنے Base کو وسیع کیجئے اور پھر کھلم کھلا اعلان کیجئے' Point Out کیجئے کسی ایک شے کو کہ یہ شے اب نہیں ہوگی - یا ہم نہیں یا یہ نہیں - پھر پیچھے ہٹنے کا معاملہ نہیں' پھر پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے والی بات بھی نہیں' پھر تو سینوں پر گولیاں کھانی ہوں گی' پیٹھ نہیں دکھانی ہوگی لیکن اس سے پہلے پہلے انفرادی طور پر' وقتی ہیجان میں' وقتی اشتعال کے تحت قدم اٹھالینا درحقیقت فساد فی الارض کے ذیل میں آئے گا - یہ اصلاح کے اور طریقہ نبویؐ کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا ہوگا -

" امرِ حال " کو پہچانیئے

تیسری اور آخری بات عرض کر رہا ہوں اور یہاں میں اپنے تبلیغی بھائیوں کی اصطلاح مستعار لیتا ہوں - وہ کہا کرتے ہیں " امرِ حال " کو پہچاننا ضروری ہے - میں نے بھی اپنے اس کتابچہ میں اگرچہ یہ لکھا ہے کہ سب سے بڑا فتنہ ہمارے معاشرے میں فتنۃ النساء ہے اس لئے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں اپنی امت پر عورتوں کے فتنہ سے بڑھ کر کوئی فتنہ چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں - یہ فتنہ نساء یہی ہے جو فحاشی' عریانی اور بے پردگی کی صورت میں طوفان کی شکل اختیار کر چکا ہے - یقیناً یہ سب سے بڑا فتنہ ہے' عام حالات میں ہمیں اسی کے خلاف اقدام کرنا چاہئے اور منظم طریقے پر کرنا چاہئے لیکن ایک تو اس کے ضمن میں بھی میں یہ عرض کروں گا کہ اس کا جو سب سے بڑا منبع اور سرچشمہ آپ کے معاشرے میں بن چکا ہے اور جس پر عوامی دباؤ اثر انداز بھی ہو سکتا ہے' وہ آپ کا اُردو پریس ہے - لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والا اخبار ہے جو عام آدمی کی ضرورت ہے - آپ کو معلوم ہے کہ پوری دنیا میں اس کے ساتھ یہ رنگین صفحات نہیں ہوتے - عریاں تصویروں والے پرچے بھی اُن کے ہاں مستقل چھپتے ہیں' جن کا ذوق ہے وہ خریدیں اور پڑھیں لیکن روزنامہ اخبار عوام کی ضرورت ہے - اس کو اخبار ہونا چاہئے' فحاشی کا اڈہ نہیں بن جانا چاہئے - یہ لعنت سوائے پاکستان کے اور کہیں نہیں ہے اور یہ ہر گھر میں داخل ہو رہی ہے - سینما میں تو جو جائے گا' اس کو دیکھے گا لیکن یہ لعنت ہر روز آپ کے گھر میں داخل ہو رہی ہے - پھر ظلم یہ کیا گیا ہے کہ ان رنگین صفحات کو اخبار کا حصہ بنا دیا گیا ہے - اگر اڈہ لگانا ہے تو سب سے پہلے ان کے خلاف لگائیے' منظم طریقے سے لگائیے البتہ امرِ حال کے حوالے سے ایک اور بات کہنا چاہتا تھا -

معاشی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں لانے کا یہ سنہری موقع ہے

میرے نزدیک "امرِ حال" یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں ایک سنہری موقع آیا ہے، معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لانے کا سنہری موقع! اِس وقت اگر ہم نے اپنی توجہات کو کسی دوسری چیز کی طرف منعطف کر دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ درحقیقت حالات کی نبض پر ہمارا ہاتھ نہیں ہے۔ ہم گویا حالات کے تقاضوں سے اغماض کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے جیسا کہ ابھی جسٹس عامر رضا صاحب نے فرمایا یہ جاگیرداری جب تک موجود ہے آپ کی سیاست کبھی نہیں سدھر سکتی۔ یہ سرمایہ داری کی لعنت جب تک موجود ہے، حالات تبدیل نہیں ہوں گے۔ سرمایہ داری کا سب سے بڑا Instrument سود کی لعنت ہے۔ فحاشی کا سدّباب اسی لیے تو ہے کہ زنا جیسے کبیرہ گناہ کے راستوں کو بند کیا جاتے۔ اور زنا میں بھی ماں سے زنا! اندازہ کیجئے کہ سُود کا جرم اس سے بھی ستر گنا زیادہ ہے۔ ابو داؤد کی روایت ہے کہ سود کے گناہ کے ستر حصے ہیں۔ ستر میں بھی سب سے ہلکا، سب سے چھوٹا حصہ اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے۔

سود سرمایہ داری کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اسے توڑنے اور سرمایہ داری و جاگیرداری کو ختم کرنے کے لئے ایک انقلاب ضروری ہوتا ہے اور جیسا کہ جسٹس صاحب نے ابھی فرمایا، انقلاب میں بڑی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ ناگزیر ہے، وہ قربانیاں دینی ہی پڑیں گی لیکن اتمامِ حجت کے لئے اگر ایک پُرامن راستہ اس وقت سامنے آیا ہے تو پوری قوت کو مجتمع کر کے قومی اسمبلی اور سینٹ، وزیرِاعظم اور صدر مملکت کے اوپر پورا دباؤ ڈال دینا چاہئے کہ مالیاتی قوانین کو وفاقی شریعت کورٹ کے دائرہ کار سے باہر رکھنے کی مدت جو ختم ہو رہی ہے، اب اس کی توسیع نہیں ہونی چاہئے۔ یہ ہے درحقیقت اس وقت سب سے بڑا کرنے کا کام۔ اگر ہم نے اپنی قوتوں کو اور چیزوں کی طرف منتشر کر دیا تو یہ درحقیقت حالات کو سمجھ نہ سکنے کی بات ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان کو حل کرنے کی توفیق دے تو جاگیرداری میں بڑے اہم مسائل ہیں۔ جیسے کہ میں نے اخبارات میں بعض اشتہارات شائع کرائے ہیں، آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ یہ بات فیصلہ طلب ہے کہ پاکستان کی زمینیں عشری ہیں یا خراجی۔ آیا جو معاملہ مصر، عراق و

شام کے بارے میں حضرت عمرؓ نے کیا تھا' اسی کا اطلاق اراضئ پاکستان پر ہوتا ہے یا نہیں- ظاہر بات ہے میری ایک رائے ہو سکتی ہے' آپ کی الگ ایک رائے ہو سکتی ہے- مولانا عبدالرحمٰن مدنی تشریف فرما ہیں' ان کی ایک رائے ہو سکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کے دستور میں جو شریعت کورٹ ہے' اسی میں کیوں نہ آیئے- ہو سکتا ہے سارے دلدّر اسی سے دور ہو جائیں- ہو سکتا ہے کہ یہ سارے منحوس قسم کے ٹیکس جو اس ملک میں لگے ہوئے ہیں' انکم ٹیکس' سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی وغیرہ سب کے سب ختم ہو جائیں اگر زمینوں کا خراج براہ راست بیت المال میں جمع ہو جائے- یہ ٹیکس وہ ہیں جنہوں نے ہر شہری کو جھوٹا اور بے ایمان بنا کر رکھ دیا ہے- کتنا ہی نیک ہو' نمازی ہو' تہجد گزار ہو' اس کا ضمیر آلودہ ہو جاتا ہے کہ جھوٹ بول رہا ہے' جھوٹ پر حلف اٹھا رہا ہے اس لئے کہ صحیح حساب کتاب دینے کے بعد گویا یہ طے ہو جاتا ہے کہ آپ اپنی بساط لپیٹئے' دکان بڑھایئے-

اس صورت حال میں یہ مرحلہ بہت اہم ہے- پھر یہ کہ فرض کیجئے کہ عشری زمینیں ہیں ذاتی ملکیت میں ہیں تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ بٹائی جائز ہے کہ ناجائز- کم سے کم یہ بات تو سب مانیں گے کہ یہ مزارعت' یہ بٹائی مختلف فیہ ہے' متفق علیہ نہیں- امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حرامِ مطلق' امام مالکؒ کے نزدیک حرامِ مطلق- ظاہر بات ہے کہ یہ باتیں ایسے ہی تو نہیں- اب طے کرنے کی ضرورت ہے' فیصلہ ہونا چاہئے- سود کا استیصال اور جوئے سٹے کا فوری خاتمہ آپ کے معاشرے میں سرمایہ داروں کے عمل دخل کو ختم کر دے گا اور اگر ان دُو ایشوز کے طے ہونے سے جاگیرداری کا بھی خاتمہ ہو جائے تب ہی ملک کی گاڑی صحیح سمت میں رواں دواں ہو سکے گی ورنہ جیسے کہ ابھی معاشرے کا مرثیہ پڑھا ہے آپ کے سامنے جسٹس عامر رضا صاحب نے' ایسے ہی مرثیہ ہم بھی پڑھتے رہیں گے- نتیجہ اس کا کچھ نہیں نکلے گا-

آخر میں میں یہ کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں تہِ دل سے ممنون ہوں- یہ نہ سمجھئے کہ مجھے اس کا اندازہ نہیں کہ جماعت اسلامی لاہور نے مجھے اپنے سیمینار میں شرکت کی دعوت دے کر کتنا بڑا کام کیا ہے- اللہ کرے کہ اس سے اور خیر وجود میں آئیں بھلائی کی طرف پیش قدمی ہو' اتحاد و یک جہتی میں اضافہ ہو تاکہ ہم اپنے اصل متفق علیہ نصب العین کی طرف زیادہ قوت کے ساتھ پیش قدمی کر سکیں-

اقول قولی ھٰذا و استغفر اللہ لی و لکم و لسائر المسلمین-

کُرۂ ارض رُوح افزا کے حصار میں!



آئینہ دارِ ثقافت : مشروبِ مشرق و مغرب

اب تک اتنی تعداد میں بن چکا ہے کہ اس کی بوتلیں کُرۂ ارض کا احاطہ کرتی ہیں۔

ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی نے تقریباً نو سو سال قبل جہلم کے نزدیک ایک پہاڑ پر بیٹھ کر دنیا کا قطر ناپا تھا جو ۷۹۰۰ میل تھا۔ اس پیمائش کو بعد میں جدید سائنسی تحقیق نے درست قرار دیا۔ حکیم حافظ عبدالمجید نے دہلی میں بیٹھ کر نباتات گل و گلاب اور فواکہات کے طبی خواص کے بموجب ۱۹۰۶ء میں رُوح افزا کا عہد ساز فارمولا مرتب کیا

یہ نادرِ روزگار شربت رُوح افزا اس عرصہ میں اتنی تعداد میں تیار ہو کر فروخت ہو چکا ہے کہ اس کی بوتلیں اپنی تعداد کے لحاظ سے پورے کُرۂ ارض کا احاطہ کرتی ہیں اور اب رُوح افزا مشروبِ خلائق کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

شماریات کے مطابق صرف پاکستان میں ۱۹۴۸ء سے اب تک رُوح افزا کی جتنی بوتلیں تیار ہوئیں ان سے تیار ہونے والے **دو ارب دس کروڑ اکانوے لاکھ نواسی ہزار چار سو چالیس گلاس** خلائق کی تسکین کا سامان کر چکے ہیں۔

پاکستان میں رُوح افزا کی تیاری پر اب تک استعمال ہونے والی خام اشیاء کا گوشوارہ:

- شکر
- ست لیموں

۷،۹۲،۵۲،۷۹۴ کلوگرام
سات کروڑ بانوے لاکھ باون ہزار سات سو چورانوے کلوگرام

- عرقِ رُوح افزا ★
- عرقِ گلاب
- عرقِ بہار
- عرقِ کیوڑا

۱،۰۶،۵۱،۴۰۷ لیٹر
ایک کروڑ چھ لاکھ اکاون ہزار چار سو سات لیٹر

★ عرقِ رُوح افزا میں مختلف جڑی بوٹیوں، سبزیوں اور پھلوں کے عرقیات شامل ہیں۔

رُوح افزا کے لیے ۱۹۰۶ء سے ماہرین نباتات کاشت کر رہے ہیں، باغبان گل و گلاب اگا رہے ہیں اور ہزارہا انسان فواکہات پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ لاکھوں ٹن گل اگایا جا رہا ہے۔ بے شمار انسان اور لاتعداد مشینیں شب و روز مصروفِ عمل ہیں اور نگراں ماہرین عرق سازی سے تیاری تک اعلیٰ معیار برقرار رکھنے پر توجہ دے رہے ہیں، تب جا کر رُوح افزا تیار ہو کر شائقین تک پہنچتا ہے۔ اسی عرق ریزی کی وجہ سے تمام دنیا رُوح افزا کی قدردان ہے اور یہ مشروبِ خلائق ہے۔

مشروبِ مشرق

رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں بے مثال **رُوح افزا**

مشروبِ خلائق

Hamdard
تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے

ADARTS HRA 1/90

ضمیمہ 'نقضِ غزل'

(۱)

مؤلّفِ 'نقضِ غزل' کا استعفا
از رکنیتِ جماعت

(تحریر کردہ اپریل ۱۹۵۷)

(۲)

جماعتِ اسلامی کی جانب سے اتّحاد کی عمومی دعوت کے جواب میں
'تعاون علی البر' کی پیشکش پر مشتمل

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا خط
بنام
میاں طفیل محمد، سابق امیر جماعت اسلامی
اور

میاں صاحب کا جواب بنام ڈاکٹر صاحب
(شائع شدہ 'میثاق' جولائی ۸۲ء)

مؤلّف کا جماعت اسلامی کی رکنیّت سے

استعفاء

—— (اپریل ۱۹۵۷ء) ——

ذیل کی سطور ۲۹ رمضان المبارک کو مسجد میں اعتکاف کی حالت میں لکھ رہا ہوں اور ان کے ذریعے اُس فیصلے کا اظہار مقصود ہے جس پر میں حالتِ اعتکاف میں مسلسل تین روز کے سوچ و بچار کے بعد پہنچا ہوں یعنی یہ کہ میں جماعتِ اسلامی کی رکنیّت سے مستعفی ہو جاؤں۔

---

۱۵ نومبر ۵۴ء کو جب میں نے جماعت کی رکنیّت کے لیے درخواست تحریر کی تو جماعت کے بارے میں میرا نقطۂ نظر یہ تھا:

"میں یہ محسوس کرتا ہوں اور آج سے نہیں بلکہ آج سے چار سال قبل سے محسوس کر رہا ہوں کہ اقامتِ دین میرا فرض ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس دور میں پیدا ہوا جبکہ خالصتہً اقامتِ دین کے کام کے لیے جماعتِ اسلامی قائم ہو چکی ہے اور میں آسانی کے ساتھ اس میں شریک ہو کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سعی کر سکتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں جماعتِ اسلامی کے وجود کو اپنے لیے ایک نعمت متصوّر کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو خود کام کرنا بہر حال بس میں نہ ہوتا اور اللہ کے ہاں بازپرس کڑی ہو جاتی ..." اور

"... میں یہ سمجھتا ہوں کہ پوری دنیا میں خالص تحریکِ اسلامی تو محض جماعتِ اسلامی ہے (پاکستان کی بھی اور ہندوستان کی بھی) البتہ دینی مقاصد کے لیے اور اچھے کام کرنے والے ادارے بھی ہیں اور جماعتیں بھی ہیں۔ پاکستان میں بھی اور باقی دنیا میں بھی۔ ان اداروں

جماعتوں نے مجھے اس حد تک تو متاثر کیا ہے لیکن جماعت اسلامی کے سوا کسی اور ادارے یا جماعت کے مقصد اور طریق کار کو میں خالصۃً اسلامی اور ٹھیٹھ دینی نہیں سمجھتا! ...“

بدقسمتی سے جماعت کے بارے میں میرا یہ نقطۂ نظر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ فروری ۵۵ء میں میری درخواست رکنیت منظور ہوئی اور اس کے چند ہی ماہ بعد سے جماعت کے بارے میں میرے شکوک و شبہات بڑھنے شروع ہو گئے تاآنکہ اجتماع سالانہ تک میں جماعتِ اسلامی پاکستان کے بارے میں کم از کم اپنے فہم کی حد تک ایک جچی تلی رائے قائم کر چکا تھا۔ اس اجتماع کے موقع پر جماعت کے اندر بے اطمینانی اور پالیسی کے بارے میں اختلاف کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی اور میں مطمئن ہو گیا کہ ایک پُرسکون ماحول اور افہام و تفہیم کے انداز میں کمیٹی کے سامنے اپنی بات رکھ سکوں گا۔ اجتماع سے واپسی کے بعد میں جائزہ کمیٹی کی آمد کے انتظار میں رہا۔ بالآخر ۱۲ ستمبر ۵۶ء کو بمقام اوکاڑہ ترمیم شدہ جائزہ کمیٹی سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا اور اواخر اکتوبر تک میں نے اپنے خیالات کو ایک مفصل بیان کی شکل میں قلم بند کر کے مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب کنوینر جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اپنے اس بیان میں مَیں نے قبل از تقسیم ہند کی جماعت اسلامی اور بعد از تقسیم کی جماعت اسلامی پاکستان کا تفصیل کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ کیا اور اپنی ناقص قوتِ تحریر کی حد تک پوری طرح محنت اور کوشش کر کے اپنی یہ رائے واضح کی کہ پالیسی اور طریق کار کے اعتبار سے تقسیم سے ماقبل اور اس کے مابعد کی جماعت میں واضح تفاوت و اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔ اور جبکہ قبل از تقسیم کی جماعت ایک خالص اور ٹھیٹھ اسلامی تحریک کا نقشہ پیش کرتی ہے وہاں بعد از تقسیم کی جماعت ایک ایسی قومی، سیاسی جماعت بن گئی ہے جس میں دین کا داعیہ چاہے کم یا زیادہ موجود ہو خالص اسلامی تحریک کی خصوصیات موجود نہیں ہیں۔ پھر اپنی محدود بصیرت کے مطابق میں نے اس بنیادی غلطی کی نشاندہی بھی کی کہ جس کے باعث اس تحریک کی نوعیت میں اس قدر عظیم الشان فرق آگیا تھا۔ آخر میں مَیں نے لکھا تھا:

”میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۴۷ء میں جب طریق کار تبدیل کیا گیا تو عامۃ

طور پر ان لازمی نتائج کو جاننے کے باوجود اور اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا ہو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہو رہی تھی۔ لیکن یہ بہرحال میں سمجھتا ہوں اور اسی کو وضاحت کے ساتھ میں نے اس قدر طویل تحریر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے . . . . .

میری رائے میں اصل تحریک اسلامی ۱۹۴۷ء میں حقیقتاً اور اصولاً ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جماعتِ اسلامی کی قومی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اس اصل تحریکِ اسلامی کے کچھ اثرات ایک عرصہ تک برسرِ کار رہے ہیں لیکن اب وہ بھی دم توڑ چکے ہیں اور اب اس تحریک میں سے کچھ باقی ہے تو وہ ان چند پاک نفوس کے سوا اور کچھ نہیں ہے جنہیں اس اصل تحریک اسلامی کی دعوت نے کھینچا تھا اور جو ابھی تک جماعتِ اسلامی کی قومی تحریک کا دامن اسی اصل تحریکِ اسلامی کے مغالطے میں تھامے چلے آ رہے ہیں!"

اس میں صرف اس بات کا اضافہ اور کر لیجئے کہ اس قدر شدید رائے رکھنے کے باوجود اس وقت تک میں مایوس نہیں تھا بلکہ ایک طرف مجھے قوی امید بھی کہ :

". . . . مجھے اب مستقبل کے بارے میں کوئی امید ہے تو وہ بھی ان پاک نفوس کے خلوص سے ہے کہ اگر آج بھی ان پر واضح ہو جائے کہ فلاں جگہ سے ہم غلط موڑ مڑ آئے ہیں اور اب غلط راستے پر چل رہے ہیں تو وہ آگے ہی بڑھنے کی دُھن میں غلط راستے ہی پر چلتے رہنے کو گوارا کرنے کی بجائے واپس مڑ کر صحیح راستہ اختیار کرنے میں پس و پیش سے کام نہ لیں گے چاہے اس طرح انہیں ایک طویل مسافت کو دوبارہ قطع کر کے سفر کو تقریباً از سرِ نو ہی شروع کرنا پڑے . . . ."

اور دوسری طرف اپنے ہی برسرِ غلط ہونے کے امکان کے پیشِ نظر میں نے یہ گزارش بھی کی تھی:۔

". . . پھر اللہ گواہ ہے کہ اس بات کے کہنے میں کوئی بُری نیت محرک نہیں بنی ہے۔

اس غرض سے یہ گزارشات پیش کر رہا ہوں کہ اس طریقے سے اللہ تم ہماری غلطی کو (اگر وہ ہے!) واضح کر دے تو فبہا، ورنہ کم از کم مجھ پر تو اپنی غلطی واضح ہو جائے گی اور میں زیادہ اطمینانِ قلب کے ساتھ تحریکِ اسلامی کے ساتھ وابستہ ہو کر عملاً کام کر سکوں گا!"

یہی وجہ ہے کہ اس بیان کے تحریر کرنے تک مجھ پر نہ بددلی چھائی اور نہ ہی قوی میں جمود پیدا ہوا بلکہ میں حسبِ سابق تندہی کے ساتھ جماعت کا کام کرتا رہا۔ اپنے بیان میں میں نے لکھا تھا کہ اب تک:

"جماعت اور اس کے کام کے لیے سرگرمی اور محویت میں میرے اندر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے . . . !"

جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے لے کر اجتماع ماچھی گوٹھ تک جماعتِ اسلامی پاکستان کے حلقوں میں جن ناخوشگوار اور کریہہ واقعات کا چکر چلا ہے ان کو محض یاد کرنے ہی سے انسان کو سخت ذہنی اذیت اور رُوحانی کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پندرہ روزہ شوریٰ کے دَوران جس میں رپورٹ پر غور ہوا شوریٰ کے فعال عناصر کا دو متقابل اور متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جانا، بہت ردّوقدح کے بعد اور بالآخر "خوفِ انتشار" کی بنا پر بالاکراہ کسر و انکسار کے ذریعے ایک لایعنی اور مہمل قرارداد کا پاس ہونا، پھر اس کی مختلف توجیہیں اور جماعت کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف ردّعمل، اس کے نتیجے کے طور پر سازشوں کی برملا تہمتیں، اکابرینِ جماعت کا ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی گری ہوئی رائیوں کا اظہار، سعید ملک کا سنسنی خیز استعفاء اور اس کا اسی انداز میں قیّمِ جماعت کی طرف سے تعاقب، امیرِ جماعت کا جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان پر "نجویٰ" گروہ بندی اور "غیر شعوری سازش" کا الزام، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا استعفاء از رکنیتِ جماعت، امیرِ جماعت کا جذباتی انداز میں استعفاء از امارتِ جماعت، ایسے الفاظ کے ساتھ کہ جس سے کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اب مولانا تادمِ حیات کبھی امارت کا منصب دوبارہ قبول نہ کریں گے جبکہ کچھ دوسرے لوگوں نے سمجھا کہ یہ محض ایک اظہارِ اعتماد (VOTE OF CONFIDENCE) کا مطالبہ ہے اور پھر جماعت کے اندر ایک مہم کے انداز میں امیرِ جماعت پر قرار دادہائے اعتماد، دو اراکینِ مرکزی شوریٰ کی رکنیت

جماعت کا تعطّل، مولانا عبد الجبار غازی صاحب کا استعفاء از رکنیت، مولانا عبد الغفار حسن صاحب کا استعفاء از مناصبِ جماعت، سلطان احمد صاحب کا استعفاء از رکنیتِ شوریٰ ——— اور اختلاف کرنے والے لوگوں کا یہ حال کہ انتہائی سخت باتیں کہہ رہے ہیں، گھناؤنے سے گھناؤنے الزامات لگائے جا رہے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ نیتوں پر شدید حملے ہو رہے ہیں اور حال ہی کے نہیں ماضی کے واقعات سے استشہاد ہو رہا ہے۔ لیکن جب کہا جاتا کہ شرافت کے ساتھ اس گند سے نکلیے اور جو کام ان سے بن پڑتا ہے انہیں کرنے دیجیے اور جو کام آپ کر سکتے ہوں آپ باہر جا کر کیجیے تو اس بات سے باصرار انکار ——— یہ سارے معاملات میرے لیے اس اعتبار سے تو غیر متوقع نہ تھے کہ میری تو رائے ہی یہ تھی اب جماعت ایک قومی سیاسی جماعت بن گئی ہے اور یہ اس کے ناگزیر ثمرات ہیں لیکن اس لحاظ سے کمر توڑ دینے والے تھے کہ جماعت میں اخلاقی تنزّل اور گراوٹ کے بارے میں ابھی اتنی پست رائے میں نے بھی قائم نہیں کی تھی! اس عرصہ میں میں اولاً تو جماعت میں ایک عضوِ معطّل بن کر رہ گیا اور بالآخر جنوری ۵۷ء میں میں نے شدّتِ تاثر میں جماعت کی رکنیت سے زبانی استعفاء مقامی امیر جماعت کے سامنے پیش کر دیا لیکن جب مقامی اراکین و امیر اور حلقہ کے ذمّہ دار حضرات نے سمجھایا کہ اجتماع ماچھی گوٹھ تک صبر کر لو تو میں نے بھی اس بات کو معقول پا کر اپنا استعفاء واپس لے لیا۔

اجتماع سے کچھ دن قبل اطلاعات ملنی شروع ہوئیں کہ لاہور میں مطلع صاف ہو رہا ہے، اور ایک بار پھر سمجھوتے کی کوشش ہو رہی ہے تاکہ اجتماعِ ارکان سے قبل ہی شوریٰ کی طرف سے ایک متفقہ قرارداد منظور ہو جائے اور ارکان کے سامنے اکابرین جماعت کا اختلافِ رائے پیش نہ ہو۔ اس پر میں نے دیگر پانچ ارکانِ جماعتِ اسلامی منٹگمری کی شرکت میں ایک مفصل خط قائم مقام امیر جماعت کے توسط سے جماعت کی شوریٰ کو لکھا (وہ جماعت کے ریکارڈ میں محفوظ ہو گا اسے دیکھ لیا جائے!) جس میں شوریٰ سے یہ گزارش کی گئی تھی کہ بار بار ایسی کمزور مصالحت کی کوششیں نقصان دہ ثابت ہوں گی جس کی بنیاد کسی مثبت اور واقعی اساس کی بجائے جماعت کے اندر انتشار کے خوف کی منفی اساس پر ہو۔ اکابرین جماعت میں جو دو نقطہ ہائے نظر پالیسی اور طریقِ کار کے

بارے میں پائے جاتے ہیں انہیں صاف صاف ارکان میں آجانا چاہیے اور پھر ارکان کو شعوری طور پر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ کدھر جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کے لیے صحیح یہ ہوگا کہ اگر وہ ارکان کے رجحان کے ساتھ RECONCILE کر سکیں تو فبہا، ورنہ جماعت کے اندر مزید فساد کرنے اور کش مکش برپا کرنے کی نسبت خود ان کے لیے بھی اور جماعت کے حق میں بھی بہتر یہی ہے کہ وہ جماعت سے نکل جائیں۔" خط کے آخر میں خط لکھنے والوں نے اپنے بارے میں دو صورتیں تجویز کی تھیں:

"اوّلاً یہ کہ کم از کم ہمیں اس بات کا پورا موقع دیا جائے کہ ہم اجتماع ارکان میں اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت سے رکھ دیں اس کام کے لیے جتنا وقت ہمیں درکار ہو ہمیں دیا جائے اور ہم پر کوئی روک ٹوک نہ کی جائے کہ یہ کہا جا سکتا ہے اور یہ نہیں، تاکہ ہم پورے طور پر مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے اپنی بات کہہ دی ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ ہم "منافقت" کے ساتھ چلنے کو اپنے اوپر بھی ظلم سمجھتے ہیں، اس لیے کہ اس طرح آخرت میں اجر تو دُور رہا عذاب کا خطرہ نظر آتا ہے ـــــ اور جماعت پر بھی ظلم سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے مجموعی ذہن سے علیحدہ ایک ذہن رکھتے ہیں اور پھر بھی ساتھ چلیں اور عملاً اس کا حاصل یہ ہو کہ نہ خود چلیں اور نہ دوسروں کو چلنے دیں۔

اور اگر یہ بھی قابل قبول نہ ہو تو ہمیں اجتماع سے قبل ہی مطلع کر دیا جائے۔ ہم اس کے لیے پورے انشراح صدر کے ساتھ تیار ہیں کہ خاموشی کے ساتھ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں، اور نہ اپنی منزل کھوٹی کریں اور نہ جماعت کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوں۔ ہماری اس طرح کی علیحدگی ان شاء اللہ جماعت کے لیے نقصان کا موجب نہ ہوگی بلکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح ہم شاید جماعت کی کوئی نہ کوئی خدمت ہی سرانجام دے سکیں گے۔"

ماچھی گوٹھ حاضر ہوا تو جس چیز کا خدشہ تھا وہی ہوا۔ کلھیا میں گڑ پھوڑا جا چکا تھا۔ ایک متفقہ قرارداد شوریٰ کی طرف سے اجتماع ارکان میں پیش ہوئی تھی۔ اجتماع کا سارا پروگرام

ایک سوچی سمجھی سکیم کے ساتھ اس طرح بنایا جا چکا تھا کہ اوّل تو کوئی اختلافی آواز اٹھائی ہی نہ جا سکے اور اٹھے بھی تو پوری طرح محبوس ہو کر۔ مَیں یہاں منتظمینِ اجتماع کی نیتوں پر حملہ نہیں کرنا چاہتا انہوں نے جو کچھ کیا انتہائی خلوص کے ساتھ "اھوَنُ البلیتین" کے مشہور و معروف فلسفہ کے تحت ایک بہت بڑے شر یعنی جماعت کے انتشار سے بچنے کے لیے کیا لیکن یہ بھی بہر حال اپنی جگہ ایک واقعہ ہے کہ اجتماع کو جس طرح CONDUCT کیا گیا اس میں کسی اختلافی آواز کا اٹھنا خصوصاً ایسی حالت میں کہ 'اکابرین' میں سے کوئی میدان میں رہا ہی نہیں تھا، چند بے وقعت 'اصاغرین' باقی تھے ممکن نہ تھا! مولانا مودودی کے لیے درآں حالیکہ وہ اس وقت امیر نہیں تھے غیر محدود وقت کی کھلی چھٹی اور اختلاف کرنے والوں کے لیے سختی سے جھگڑا کر کر کے محدود وقت دینا اور پھر اس پر سختی سے عمل کرانا۔ اور باوجود اس کے کہ یہ ایک غیر معمولی اور ہنگامی اجتماع تھا ابتدا سے اس کا پروگرام معمولی اجتماعات کی طرح بنا کر بہت سا وقت قیمِ جماعت کی رپورٹ پر صرف کرا دینا خواہ خلوص کے ساتھ ہی ہوا ہو، بہر حال اختلاف کرنے والوں کے ساتھ انصاف نہ تھا۔

"تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتّٰى" کا جو منظر اس اجتماع نے پیش کیا اس میں جماعت کے لیے بڑی عبرت ہے۔ بالکل مختلف الخیال اور متضاد آراء کے حامل لوگوں کو جوڑ کر ساتھ لے کر چلنے کی کوشش یہی نتائج برپا کر سکتی ہے۔ قراردادِ شوریٰ کی متفق علیہ تھی اور متعینہ طور پر مولانا مودودی صاحب کو شوریٰ ہی نے SPOKES MAN بنا کر اس قرارداد کی تشریح پر مامور کیا تھا لیکن مولانا کی چھ گھنٹے سے زائد تقریر کے بعد بھی مولانا امین احسن اصلاحی نے محسوس کیا کہ اس قرارداد کے کچھ "مضمرات اور مقدّرات" بیان ہونے سے رہ گئے ہیں اور پھر ان کو بیان کرنے جو کھڑے ہوتے تو ایک ایسی تقریر کر ڈالی کہ مولانا مودودی صاحب کی پوری تقریر کی تردید ہو گئی اور مجبوراً نعیم صدیقی صاحب کو اصلاحی صاحب کی تقریر کے اثرات دھونے کے لیے تقریر کرنی پڑی اور یہاں تک کہنا پڑا کہ اصلاحی صاحب امراضِ دماغی میں مبتلا ہیں۔ متعدد معزز اراکین شوریٰ کا یہ حال رہا کہ "مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ" نہ ادھر ہوتے ہیں نہ اُدھر، ابھی قرارداد سے اتفاق ہے تو ابھی اتفاق ختم ہو گیا ہے اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے، تاآنکہ ایک صاحب اپنا اتفاق واپس لے کر ایک متبادل قرارداد لاتے ہیں اور اس کے حق

میں ایک طویل، مدلّل اور مفصّل تقریر کرتے ہیں، لیکن آخر میں اچانک خود اپنی ہی پیش کردہ قرارداد واپس لے کر سٹیج سے اُتر آتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

میرے لیے اس میں بھی کوئی عجیب بات نہ تھی، اس لیے کہ میں پہلے ہی اپنے خط میں لکھ چکا تھا:

"اس طرح 'حبِّ علیؓ' کی بجائے 'بغضِ معاویہؓ' پر جو اتحاد قائم ہو، ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد بے حد کمزور ہوگی . . . . !"

ذاتی طور پر میں اس اجتماع میں ایک بڑے مخمصہ میں پھنس گیا تھا۔ مولانا مودودی صاحب نے پالیسی کی جو تشریح بیان کی اس سے میرا اضطراب کم ہونے کی بجائے کچھ مزید ہی ہو گیا تھا۔ اب میرے سامنے دو راستے تھے ایک[1] یہ کہ اپنی بات بیان کرنے کی کوشش کروں۔ اس صورت میں اپنی بے بضاعتی اور عدم قدرتِ کلام مانع آتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنے گا! ــــــ لہٰذا بولنے کا حشر معلوم۔ دوسرے[2] یہ کہ خاموش رہوں۔ اس شکل میں بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ جماعت کے اندر رہوں۔ لیکن اس صورت میں اگر اب نہیں بولتا تو آئندہ کسی موقع پر بولنا غلط ہوگا۔ ہر شخص یہ معقول بات کہہ سکے گا کہ جہاں بولنے کا موقعہ تھا وہاں بولے نہیں، اب کیوں فساد مچاتے ہو۔ دوسری یہ کہ جماعت کو خاموشی سے چھوڑ جاؤں۔ اس صورت میں بھی جماعت کا یہ الزام اور یہ حجت مجھ پر قائم ہو جاتی تھی کہ بغیر اختلاف کا اظہار کیے نکل جانا صحیح نہیں ہے! چنانچہ میں نے طے کیا کہ جو ہو سو ہو بہر حال اپنی بات ارکان کے سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا!

اس خیال سے کہ اگر پہلے سے معلوم ہو جائے کہ مجھے کتنا وقت مل سکے گا تو اسی کے مطابق اپنی تقریر تیار کر سکوں، میں نے متعدد بار چودھری غلام محمد صاحب[1] سے جو اجتماع CONDUCT کر رہے تھے پوچھا کہ مجھے آپ کس قدر وقت دے سکیں گے۔ جواب ہر بار یہی ملا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، چنانچہ میں اپنی کوئی تقریر تیار نہ کر سکا۔ جو قرارداد میں نے مرتّب کر کے دی اس کے لیے

---

[1] اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرماتے اور انہیں جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرماتے۔

ایک طویل تقریر ہونی چاہیے تھی لیکن کچھ معلوم نہیں تھا کہ وقت بھی مل سکے گا یا نہیں حتیٰ کہ عین وقت پر بھی تکرار ہی ہو کر رہی۔ آدھ گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد مجھے غالباً ڈھائی گھنٹے دیئے گئے لیکن اب میں تھا اور میرا بیان۔ تقریر کوئی تیار نہ تھی! دوسری طرف اس آدھ گھنٹے کے بحث مباحثے نے مجھے پہلے ہی بدحواس کر دیا تھا۔ میں نے اپنا بیان پڑھنا شروع کیا تو پے در پے INTERRUPTIONS کی گئیں، درشت حتیٰ کہ ناشائستہ کلمات تک کہے گئے اور میں صبر کے گھونٹ پی پی کر اپنا بیان پڑھتا رہا۔ وقت معینہ کے اندر بیان ختم بھی نہ ہو پایا اور مجھے لاچار بیان کو ادھورا ہی چھوڑ دینا پڑا۔

میرے لیے اپنا یہ انجام تو قطعاً غیر متوقع نہ تھا، لیکن جماعت کے اراکین کی ایک بہت بڑی تعداد نے اس اجتماع کے موقع پر اور خصوصاً میری تقریر کے دوران جس اخلاق کا مظاہرہ کیا اس پر ضرور دکھ ہوا۔ اکابرینِ جماعت اس پر بھی ہر چیز کے بہتر پہلو ہی پر نظر رکھنے کے اصول کے تحت یہ کہہ کر مطمئن ہو جائیں کہ یہ سب کچھ دراصل اس لیے ہوا کہ اراکینِ جماعت کو اپنا مسلک کس قدر عزیز ہے کہ وہ کسی دوسری بات کو سن نہیں سکتے (جیسا کہ فی الواقع مولانا مودودی نے کہا بھی!) تو وہ ایسا کرنے کا اختیار رکھتے ہیں لیکن اگر عبرت حاصل کرنی ہو تو محض اس اجتماع کے موقع پر ارکان نے جس "اخلاق، ضبط اور نظم" کا ثبوت دیا ہے وہی جماعت کے تیزی سے روبہ انحطاط ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے روشن دلیل ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ ——— لیکن اس اجتماع کا ایک پہلو میرے لیے بہت تسکین اور تسلی کا موجب بھی ہوا اور وہ یہ کہ مولانا مودودی نے اس اجتماع میں ایک بہت پختہ اور مضبوط موقف (FIRM STAND) اختیار کیا اور پوری جرأت کے ساتھ اپنی بات کہی اور کھلم کھلا اپنے آئندہ کے عزائم کا اظہار کیا۔ اس طرح اس مرتبہ قرارداد اور اس کے مفہوم میں وہ گنجلک پن اور ابہام باقی نہیں رہا جو دسمبر ۵۶ء کی شوریٰ کی قرارداد میں پایا جاتا ہے۔ مولانا نے جس مضبوطی اور ہمت کے ساتھ اپنی بات صاف صاف رکھ دی اس کے لیے میں ذاتی طور پر ان کا مشکور ہوں، اس لیے کہ اس طرح میرے لیے معاملہ زیادہ صاف ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اجتماع سے قبل جماعت کو ایک خالص قومی و سیاسی جماعت کا رول ادا کرنے کے لیے ابھی بہت سی منزلیں

طے کرنی تھیں جنہیں وہ بصورتِ دیگر آہستہ آہستہ کچھ شرماتی کچھ کتراتی طے کرتی لیکن اس اجتماع میں اس نے ایک ہی زقند میں ان سب کو عبور کر لیا ہے۔

اسے میری کورچشمی اور نافہمی پر مبنی قرار دیا جائے تو بھی مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن واقعہ بہرحال یہی ہے کہ مجھے مولانا مودودی کی طویل تقریروں میں کوئی ایسی وزنی دلیل نہ ملی جس کی بنا پر میں اپنے موقف کو تبدیل کر سکتا۔ یہاں مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ اس کے برعکس میں نے یہ محسوس کیا کہ خود مولانا موصوف بھی اپنے موقف پر پورے طور سے مطمئن نہیں ہیں بلکہ اس غلط احساس کی بنا پر کہ "اب واپس لوٹ کر جانے کا امکان نہیں ہے لہٰذا آگے ہی بڑھنا چاہیئے" اپنے موقف کے لیے دلائل لا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اجتماع میں صاف صاف اعلان کیا کہ "مولانا کی تقریر اور اس میں بیان شدہ دلائل سے میرا قطعاً اطمینان نہیں ہوا ——— البتہ میں جماعت کا رکن رہوں گا!"

جماعت کی رکنیت جاری رکھنے کا فیصلہ میں نے مندرجہ ذیل تین وجوہ سے کیا تھا:

۱:—— یہ کہ میں اس "گرم گرم" ماحول میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا جس میں میں خاص طور پر ایک بہت سخت MENTAL TORTURE کی سی کیفیت میں گرفتار رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر ٹھنڈے ماحول میں ازسرِنو اپنے موقف کا بھی جائزہ لوں اور مولانا مودودی کے دلائل کا بھی مطالعہ کروں ——— شاید مجھے کوئی روشنی مل جائے!

۲:—— یہ کہ میں ذرا "اپنے شیطان" کا بھی جائزہ لے لینا چاہتا تھا جیسا کہ خود مولانا مودودی نے فرمایا تھا (اور صحیح فرمایا تھا) کہ ہر شخص کو اپنے شیطان سے باخبر رہنا چاہیے۔

۳:—— تیسرے یہ کہ ایک مجبوری بھی میرے سامنے تھی کہ جماعت کو چھوڑ کر کوئی اور "جائے پناہ" بھی اپنے دین اور ایمان کو بچانے کی نظر نہ آتی تھی اس وجہ سے میں چاہتا تھا کہ حتی الامکان اس جائے پناہ کو ہاتھ سے نہ کھوؤں!

اجتماع ماچھی گوٹھ کے بعد سے آج تک ... میں مسلسل ان مسائل پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے ہر معاملہ میں دونوں پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ خود اپنے

آپ سے بے حد بدظن ہوکر بھی معاملات پر غور کیا ہے۔ کتنی ہی بار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے جماعت سے مستعفی ہوجانا چاہیے لیکن میں پھر رُک جاتا رہا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ رمضان کے آخری عشرہ میں سے جتنے دن بھی مجھے مل سکے ان میں اعتکاف کروں گا اور یکسوئی کے ساتھ اور اللہ سے رہنمائی کی دُعا کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کروں گا۔

- جہاں تک میرے اصولی موقف کا تعلق ہے جتنا بھی میں نے سوچا اسی قدر اسے صحیح پایا اور جتنا غور کیا اسی قدر اس کی صحت پر میرا یقین بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اجتماع سے قبل 'ترجمان' کے 'اشارات' اور ایک خاص مضمون "دو خطوط اور ان کا جواب" بھی دیکھے مولانا کی تقریروں کے NOTES بھی دوبارہ دیکھے۔ چودھری محمد اکبر صاحب نے جو دلائل میرے سامنے رکھے ان پر بھی غور کیا۔ مجھے ان میں کہیں روشنی نہ ملی اور جو رائے میں نے اپنے مفصل بیان میں تحریر کی ہے، میں اس میں کوئی تبدیلی نہ کرسکا۔

- جہاں تک "اپنے شیطان" کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ مجھے پہلے بھی اس کا احساس تھا لیکن ماچھی گوٹھ میں مولانا مودودی کے اس طرف توجہ دلانے اور پھر ایک نجی ملاقات میں جناب نعیم صدیقی صاحب کے بھی اس طرف متوجہ کرنے پر میں نے اس معاملہ میں اپنی حد تک پوری باریکی سے جائزہ لیا اور خدا گواہ ہے کہ اپنے آپ سے بدظن ہوکر سوچ بچار کیا۔

۱: میں نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ خیالات میرے دل میں کسی اور نے ڈال دیئے ہوں اور میں کسی اور کا آلۂ کار بن گیا ہوں ——— تو مجھے اطمینان ہوا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے یہ سب کچھ میری ذاتی سوچ بچار کا نتیجہ تھا۔ اپنے بیان کے تحریر کرنے تک اس معاملہ میں میری گفتگو نہ کبھی سعید ملک صاحب سے ہوئی اور نہ ہی کسی اور ایسے نمایاں شخص سے جو اختلافی ذہن رکھتا ہو۔ صرف لغاری[1] صاحب سے گفتگو ہوئی، وہ بھی اس وقت جبکہ میں اپنی آرا۔ بنا چکا تھا۔ ان سے مل کر مجھے اپنی بات پر انشراح صدر تو ضرور ہوا لیکن کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا۔ رہا مقامی طور پر تو یہاں یہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ میں نے دوسروں کو تھوڑا بہت متاثر کیا ہو لیکن کسی اور سے ایسا کوئی تاثر لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

---

[1] سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم، رحیم آباد، ضلع رحیم یار خاں

۲: پھر میں نے سوچا کہ میں کہیں کسی آزمائش سے جی چرا کر تو نہیں بھاگ رہا ہوں — تو اس سلسلے میں بھی مجھے اطمینان ہی ہوا کہ اول تو اس وقت جبکہ میں استعفاء دے رہا ہوں ایسی کوئی بڑی آزمائش درپیش ہی نہیں ہے۔ پھر جو چھوٹے موٹے امتحانات اس راہ میں پیش آئے ہیں ان کے مواقع پر اللہ کا فضل ہی شاملِ حال رہا ہے اور کبھی بددلی نزدیک نہیں آسکی ہے۔ زمانہ طالبِ علمی کا اختتام اور عملی زندگی کی ابتداء ایک نوجوان شخص کے لیے کئی ایک چھوٹی بڑی آزمائشیں لے کر آتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس موقع پر میں نے اپنے قدموں میں کوئی کمزوری محسوس نہ کی اور پورے ثبات کے ساتھ جمعیت کی رکنیت سے جماعت کی رکنیت کی طرف منتقل ہو گیا۔ اجتماع ماچھی گوٹھ کا MENTAL TORTURE بھی میرے لیے ایک امتحان تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس موقع پر بھی محض جذبات میں میں نے کوئی اقدام نہیں کیا اور اس کے بعد بھی سوا دو ماہ تک مسلسل سوچ بچار کرتا رہا ہوں۔

۳: پھر میں نے اس اعتبار سے اپنا جائزہ لیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ (مولانا مودودی کے الفاظ میں) پہلے ضعفِ ارادہ پیدا ہوا ہو اور پھر اُس نے یہ مرکب شکل اختیار کر لی ہو تو مجھے اطمینان ہوا کہ کم از کم میرے معاملہ میں تو یہ صورتِ حال بھی ہرگز موجود نہیں ہے۔ میں اپنے بیان کی تحریر کے وقت تک جماعت کا تمام کام پوری تندہی اور سرگرمی سے کرتا رہا ہوں اور یہ صورت ہرگز نہیں ہوئی کہ پہلے اعضا اور جوڑ بند ڈھیلے پڑے ہوں اور بعد میں میں نے اپنے تعطّل کی وجہ جواز کے طور پر یہ سارا فلسفہ گھڑا ہو — بلکہ مجھے کم از کم اپنے آس پاس کی حد تک تو معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ جو لوگ سُست پڑ گئے ہیں اور جن میں مقصد اور تحریک کے ساتھ عملی دلچسپی کم ہو گئی ہے وہ تو ایک نفسیاتی سہارے کے طور پر جماعت کی رکنیت کو چپٹا چپٹا کر سینے سے لگاتے ہیں اور اپنا حال دیکھ کر پھر کسی عام رکن پر بھی تنقید کی جرأت نہیں کرتے کجا کہ پوری جماعت اور اس کی قیادت پر!

۴: ایک یہ خدشہ بھی میرے سامنے پیش کیا گیا کہ شاید جماعت کی صفوں میں "ترقی"

رنے

نہ ملنے کے باعث تیرے نفس نے ایک چوٹ کھائی ہوئی خودی کی مانند یہ سارا زہر اُگلا ہے!! ——— میں نے اس پر بھی غور کیا تو مجھے اپنے بارے میں اس کا بھی کوئی امکان نظر نہ آیا۔ اس لیے کہ جماعتی صفوں میں جلد ترقی کرنی ہوتی تو مجھے اس کا موقع ملا تھا جبکہ اُس وقت کے امیرِ جماعت (مولانا امین احسن صاحب) نے مجھے اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد یہ مشورہ دیا تھا کہ میں لاہور ہی میں رہوں اور "اپنی ساری اُمنگیں سیاست کے میدان میں پوری کروں"۔ لیکن میں نے اس مشورہ کو رد کر کے منٹگمری میں سکونت اختیار کی! پھر سیدھی بات یہ بھی ہے کہ جماعت میں "ترقی درجات" ہاں میں ہاں ملانے اور مکھی پر مکھی مارنے سے ملتی ہے' نہ کہ اُلٹی تنقیدیں کرنے سے!!

شیطان کے ان تمام ممکنہ واروں کا میں نے جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی مجھ پر کارگر نہیں ہوا۔ میں نے اپنے ذہن کے ایک ایک کونے کو ٹٹولا ہے لیکن شیطان کی کوئی کمین گاہ تلاش نہ کر سکا۔ اب ایک آخری امکان ہے اور وہ یہ ہے کہ شیطان میرے ذہن کے ریشے ریشے میں اور میرے خون کے ایک ایک خلیے میں اس طرح سرایت کر چکا ہو کہ اس نے مجھے اس قابل ہی نہ چھوڑا ہو کہ میں اپنے دل و دماغ میں اس کا سراغ لگا سکوں ——— تو اگر ایسی کیفیت ہے تو بھی جماعت کی رکنیت کے جاری رکھنے نہ رکھنے کا تو بہرحال کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہی ہو چکا ہے تو ظاہر ہے کہ مجھ سے کوئی خیر تو بن ہی نہیں آ سکتا اگر جماعت میں رہوں گا تو فتنہ انگیزی کروں گا اور فساد پھیلاؤں گا۔

● اجتماع کے بعد کے ان سوا دو ماہ میں، میں نے یہ محسوس کیا کہ نہ میں جماعت کے کسی کام کا رہ گیا ہوں اور نہ جماعت سے مجھے اب کوئی دینی فائدہ پہنچ سکتا ہے' بلکہ اب میرا جماعت کے اندر رہنا خود میرے لیے بھی نقصان دہ ہے اور جماعت کے لیے بھی۔ جماعت کے اجتماعی ذہن کے خلاف ایک ذہن لے کر جماعت کے اندر رہنا اپنی حیثیت کے مطابق چھوٹے یا بڑے پیمانے پر جماعت میں کش مکش کو باقی رکھنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جماعت کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہے کوئی سیاسی جماعت جبکہ ابھی وہ خارجی کش مکش کے دور میں ہو اگر اندرونی طور پر بھی کش مکش میں [illegible] کے حق میں بُرا ہی ہے' اچھا کسی طرح نہیں ہے۔ لہٰذا میرا وجود جماعت کیلئے

کسی حیثیت سے مفید نہیں ہے بلکہ مُضر ہے۔ دوسری طرف اب جماعت کی رکنیت سے میرے اندر "نفاق" کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے! ایک چیز کو غلط اور ناحق سمجھتے ہوتے بھی میں مجبور ہوں کہ پبلک میں جماعت کے رکن کی حیثیت سے اس کی حمایت کروں اور یہ چیز اب میرے لیے ناممکن بنتی چلی جارہی ہے!!

مندرجہ بالا امور پر غور و فکر کے بعد میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جماعت سے مستعفی ہو جاؤں، لہٰذا میرا استعفاء حاضر ہے!!

جماعت کے ساتھ میرا جذباتی اور غیر شعوری تعلق ۴۷ء سے، شعوری ہمدردی کا تعلق ۵۱ء سے (جبکہ میں نے جمعیت کی رکنیت اختیار کی) اور باقاعدہ رکنیت کا تعلق گزشتہ سوا دو سال سے ہے۔ اس دس سال کے عرصہ میں میری پوری دنیا جماعت ہی کے چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہی ہے۔ تعلقات اور دوستیاں، محبتیں اور اُلفتیں، حتّٰی کہ رشتے داریاں تک اسی حلقہ میں محدود رہیں۔ بیٹھنا اُٹھنا بھی اسی میں رہا اور ہنسنا بولنا بھی اسی میں رہا۔ اب دفعتاً اس حلقہ سے نکلتے ہوتے دل و دماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں۔ کتنے ہی بزرگوں سے مجھے والہانہ عقیدت ہے اور کتنے ہی ساتھیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آج کے بعد شاید میرے بزرگ میری عقیدت کی قدر نہ کریں اور میرے دوست میری محبت پر اعتماد نہ کریں تو دل اندر سے سکڑا سا جاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں جب سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا ہوں کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا!

میں نے جب جماعت کی رکنیت اختیار کی تھی تو اس وقت بھی اسے کوئی بچّوں کا کھیل نہ سمجھا تھا اور آج جبکہ اسے ترک کر رہا ہوں تو یہ اقدام بھی بغیر سوچ بچار کے کسی جذباتی کیفیت میں

نہیں کر رہا ——— میں جائزہ کمیٹی سے ملاقات اور اس کے لیے اپنے مفصّل بیان کی تحریر سے بھی ایک سال قبل سے شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوں ———

——— اور اس واقعہ کو بھی آج چھ ماہ سے اُوپر کا عرصہ ہو چکا ہے جس میں میں نے جذبات سے خالی ذہن کے ساتھ، اور جذبات کی رفاقت کے ساتھ ——— دونوں ہی طرح مسلسل غور و فکر کیا ہے اور آخر میں اللہ تعالےٰ سے رہنمائی کی دُعا کرتے ہوئے ایک فیصلہ کیا ہے۔ جب اندر آیا تھا تو "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا" کے ساتھ "رَبِّ اَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ" کی دُعا کرتا ہوا آیا تھا اور آج جب باہر جا رہا ہوں تو اپنے اللہ سے "اَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ" کی دعا کرتا ہوا جا رہا ہوں۔

جن حالات اور کیفیات سے گزر کر میں نے جماعت کی رکنیت سے تعلق منقطع کیا ہے وہ میں نے اپنی حد تک صحیح صحیح اور صاف صاف بیان کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد بھی کسی "نفسیاتی تجزیے" کی ضرورت ہو تو جماعت کے کتنی اہلِ قلم کو ماشاء اللہ اس میں مہارت تامّہ حاصل ہی ہے۔ میں اللہ تعالےٰ سے دُعا کروں گا کہ ایسے کسی تجزیے سے کوئی فائدہ ہی اُٹھا سکوں۔

آخر میں دست بدعا ہوں: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيْرِنَا وَكَبِيْرِنَا وَذَكَرِنَا وَاُنْثَانَا۔ اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ۔ آمین!

خاکسار: **اسرار احمد**

تحریر ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ مطابق اپریل ۱۹۵۷ء بحالت اعتکاف بعد عصر

بخدمت میاں طفیل محمد امیر (کالعدم) جماعت اسلامی پاکستان

'مسئلہ خواتین' اور 'الہدیٰ' کے ضمن میں تائید کا شکریہ

اور 'دعوتِ اتحاد' پر 'تعاون علی البر' کی پیشکش!

محترمی و مکرمی میاں صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!
مزاج گرامی!

مسلمان معاشرے میں خواتین کے فرائض اور دائرہ کار کے بارے میں میری یب رائے کے خلاف جو مظاہرہ کراچی کی کچھ مغرب زدہ خواتین کی جانب سے ہوا تھا ں پر آپ کا جو مومنانہ ردّ عمل سامنے آیا اور میرے ٹی وی پروگرام 'الہدیٰ' د جاری رکھنے کا جو پرزور مطالبہ آپ نے کیا اس پر میری جانب سے ہدیۂ تشکر تم تنظیم اسلامی قاضی عبدالقادر صاحب نے آپ کو پہنچا دیا تھا اور اس پر آپ کا اب بھی جناب اسلم سلیمی صاحب کی وساطت سے مجھے مل گیا تھا - یعنی یہ کہ پ نے جو کچھ کیا تصحیح دینی کے جذبے کے تحت اور اپنا فرض سمجھ کر کیا جس پر سی شکریے کی آپ کو ضرورت نہیں ہے - میرے نزدیک یہ بھی آپ کے خلوص و خلاص ہی کا مظہر ہے! د حال ہی میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے ایک بزرگ یق کار شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے بھی آپ کو شکریے کا خط لکھا تھا اور اُن کے نام جوابی خط میں بھی آپ نے ان ہی جذبات کا اظہار فرمایا ہے -

اس وقت ملک میں خواتین کو مردوں کے "شانہ بشانہ" لانے کا جو عمل اسلامی حدود و تعزیرات کے نفاذ اور ملکی قوانین خصوصاً عدالتی نظام کو 'اسلامیانے' کے 'شانہ بشانہ' جاری ہے میرے خیال میں اسی پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے

کی ضرورت ہے بالخصوص اس تازہ خبر کا نوٹس ضرور لیا جانا چاہیئے کہ خواتین کو تمام یونین کونسلوں کی سطح پر نمائندگی ملے گی - اور اس طرح ایک اخباری اندازے کے مطابق سیاسی میدان میں فعّال خواتین کی تعداد ایک دم دس گنا ہو جائے گی -

میرے اس عریضے کی تحریر کا اصل محرک آپ کی اُس تقریر کی اخباری رپورٹ ہے جو آپ نے پچھلے دنوں لاہور میں "تعلیم القرآن کانفرنس" میں کی تھی جس میں اس اخباری اطلاع کے مطابق آپ نے جملہ مسلمانانِ پاکستان کو دعوت دی تھی کہ وہ اسلام اور قرآن کی اساس پر متحد ہو جائیں ——— اس ضمن میں مَیں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ اخباری اطلاع درست ہے تو آپ کے پاس اس 'اتحاد' کیلئے تفصیلی پروگرام کیا ہے؟ اور آیا اس سے مراد (کالعدم) جماعت اسلامی میں شمولیت کی دعوت ہے یا یہ کسی وسیع تر دینی اتحاد کی پیشکش ہے؟ اور اگر یہ وسیع تر دینی اتحاد کی دعوت ہے تو بالفرض اگر میں آپ کی اس پکار پر لبیک کہوں تو ایک طرف مجھے کیا تقاضے پورے کرنے ہوں گے اور آپ کی مجھ سے توقعات کیا ہوں گی؟ اور دوسری طرف اس مجوزہ "تعاون علی البرّ والتقویٰ" کے ضمن میں اشتراکِ عمل کے لئے کونسا میدانِ کار آپ کے سامنے ہے؟

مَیں چونکہ یہ سوال محض سرسری' یا برسبیلِ شغل نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس میں پوری طرح سنجیدہ ہوں لہٰذا ——— اس کے باوصف کہ میرا گمان ہے کہ تحریک اسلامی کے قائد ہونے کے ناطے آپ ان امور سے ناواقف نہیں ہوں گے ——— تاہم اپنے بارے میں چند وضاحتیں کئے دیتا ہوں :

۱ - مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے مجموعی دینی فکر میں دین کے باطنی عنصر (یعنی وہ Esoteric Element جو عام طور پر 'تصوّف' کے عنوان سے جانا پہچانا جاتا ہے) کی کمی کو شدّت کے ساتھ محسوس کرنے کے باوجود دین کا جو انقلابی اور تحریکی تصوّر انہوں نے پیش فرمایا اور خصوصًا فرائض دینی کی جو نشاندھی انہوں نے کی اُس کا مَیں نہ صرف یہ کہ پوری طرح قائل ہوں بلکہ اپنی بساط بھر اُس پر عامل بھی ہوں - فللّٰہِ الحمد !!

۲ - جماعتِ اسلامی کی قبل از تقسیم ہند پالیسی کو مجموعی اعتبار سے میں آج بھی صحیح سمجھتا ہوں - البتہ جماعتِ اسلامی پاکستان کی بعد از تقسیم پالیسی کو میں صرف غلط ہی نہیں سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر سمجھتا ہوں — اور اپنے مقدور بھر کوشش اس امر کی کر رہا ہوں کہ اُس سابقہ نہج پر ایک تحریک دوبارہ اٹھے - اور اگرچہ مَیں خوب جانتا ہوں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے اور تحریکیں روز روز نہیں اٹھا کرتیں، لیکن اپنے شعورِ فرض کے مطابق کوشش کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر دینے ہیں، مَیں کامیابی کی واحد صورت مضمر دیکھتا ہوں - لہٰذا جیسے تیسے کوشش میں لگا ہوا ہوں - تاکہ اور کچھ نہیں تو اللہ تعالیٰ کے حضور "معذرت" تو پیش کر سکوں!

۳ - مَیں دیکھ رہا ہوں کہ ثلث صدی کی سیاسی جدوجہد کے حاصل اور دو بار کے شدید مایوس کن اور تلخ تجربوں کے بعد اب جماعت کا مجموعی رُخ سیاست سے دعوت و تبلیغ کی طرف مڑ رہا ہے - لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اس تبدیلی میں انقلابی رنگ شعوری اور واضح طور پر اجاگر نہ ہوا تو یہ تبدیلی مفید نہیں بلکہ مُضر ہو گی - اور اُس انقلابی رنگ کو شعوری اور واضح طور پر از سرِ نو اجاگر کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ سابقہ غلطی کا واضح اور برملا اعتراف و اعلان ہو — اور یہی وہ اصل مشکل ہے جس کے حل کی کوئی امید نہیں، بقول اقبال ؏ "منزل ہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں!"

تاہم اس سب کے باوجود — اگر کسی وسیع تر دینی اتحاد اور اشتراکِ عمل کا کوئی واضح پروگرام آپ کے سامنے ہو تو ان شاء اللہ العزیز آپ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس ضمن میں "انا اول المسلمین" کی سی شان کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے پائیں گے!!

اُمید ہے کہ آپ جواب سے جلد نوازیں گے -

اگر آپ اس سلسلے میں مجھ سے کسی گفتگو یا تبادلۂ خیال کی ضرورت محسوس فرمائیں تو بلا جھجک جب چاہیں طلب فرما لیں، میں بخوشی حاضر ہو جاؤں گا -

فقط والسلام   خاکسار: اسرار احمد عفی عنہ

میاں طفیل محمد صاحب کا جواب (بلا تبصرہ!)

محترمی و مکرمی ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ - گرامی نامہ ملا - یاد فرمائی کا شکریہ -

قطع نظر اس اخباری رپورٹ کے جس کا حوالہ آپ نے اپنے خط میں دیا ہے، تحریک اسلامی کے بنیادی نکات دعوت میں سے ایک نکتہ اُمّت مسلمہ کا اتحاد ہے اسی بنا پر ہم مسلمانانِ پاکستان کو بھی اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتے ہیں اور اس کا مفہوم بالکل واضح ہے - اسلام کے بنیادی عقائد اور اصول احکام متفق علیہ ہیں اس لئے سب کو انہی کو بنیاد بنا کر کام کرنا چاہیئے اور انہی پر زور دینا چاہیئے - فروعی اختلافات کو جائز حدود کے اندر رکھنا چاہیئے اور انہیں تفرقہ اور جدال کا سبب نہیں بننا چاہیئے - اگر اس بات پر اتفاق کر لیا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے تو وہ آویزش اور کشمکش جو آج مسلمانوں کے مختلف فرقوں، گروہوں اور جماعتوں کے مابین پائی جاتی ہے وہ "تعاون علی البرّ والتقویٰ" میں بدل سکتی ہے اور اقامتِ دین کی منزل جو ہر مسلمان کا مقصود ہونا چاہیئے بہت قریب آ سکتی ہے -

جہاں تک اشتراک عمل کا تعلق ہے اس کے لئے اس بنیادی اتفاق کے بعد طریق کار اور حکمت عملی کی یکسانی بھی درکار ہے - اب آپ خود ہی غور فرما لیں کہ تحریک یا جماعت اسلامی کے بارے میں جب آپ یہ فرماتے ہیں - "البتہ جماعت اسلامی پاکستان کی بعد از تقسیم پالیسی کو میں صرف غلط ہی نہیں سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر سمجھتا ہوں -" — تو اس کے بعد اشتراک عمل کی کیا بنیاد باقی رہ جاتی ہے - ایسی صورت میں جب تک طریق کار اور حکمت عملی پر اتفاق نہ ہو جائے دین کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے اپنے طریق کار اور پالیسی کے مطابق اقامت دین کا مثبت کام کیا جائے اور کسی دوسرے کے کام کو پبلک پلیٹ فارم پر یا پریس میں ہدف ملامت و نکتہ چینی نہ بنایا جائے -

والسلام - خاکسار (طفیل محمد)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۳۹
شمارہ: ۷
ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ
جولائی ۱۹۹۰ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرتعاون -/۵۰

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/-
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove I L 60516
Tel · 312 969 6755

c/o Mr Rashid A Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel . 313 977 8081

CANADA US $ 12/-
c/o Mr Anwar H Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/-
c/o Mr Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel 01 805 8732

MID EAST DR 25/-
c/o Mr. M Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/-
c/o Mr Hyder M D Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel 42127

K S A SR 25/-
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O Box 251
Riyadh 11411
Tel . 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/=
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰-فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱-داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی-فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

معزز قارئین کرام!

اپنے زرِ تعاون کی میعاد جو کہ آپ کے نام/پتہ کے لیبل پر درج ہے ختم یا غلط درج ہونے پر براہِ کرم ہمیں جلد از جلد مطلع فرمادیں کہ آپ کے نام پرچہ بدستور جاری رکھا جائے ؟ اس سے ہمیں یہ بھی اطمینان رہے گا کہ پرچہ آپ تک پہنچ رہا ہے اور آپ کا پتہ تبدیل نہیں ہوا ہے۔ اگر آپ زرِ تعاون بذریعہ وی۔پی۔پی ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے بر وقت تحریر فرمائیں۔

شکریہ' آپ کے تعاون کے متمنی

منیجر سرکولیشن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آج کل بیرونِ ملک سفر پر ہیں۔ اپنے اس سفر میں جس کا دورانیہ طے شدہ پروگرام کے مطابق تین ہفتوں پر محیط ہوگا انہیں سپین کے علاوہ برطانیہ اور فرانس بھی جانا ہے اور واپسی ان شاء اللہ ۲ جولائی تک متوقع ہے ــــ جیسا کہ اکثر احباب کے علم میں ہے یہ پروگرام اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکا کی دعوت پر تشکیل پایا تھا۔ اس ایسوسی ایشن کا سالانہ کنونشن اس بار سپین میں منعقد ہو رہا ہے اور اس میں محترم ڈاکٹر صاحب کو مہمان مقرر کے طور پر مدعو کیا گیا ہے۔

سپین کے بارے میں یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگی کہ دنیا کے اُن ممالک میں جو اپنی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کے باعث سیاحوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنتے ہیں، یہ ملک سرِ فہرست ہے۔ پھر مسلمانوں کے لیے اضافی کشش یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا ایک نشان ہی نہیں، "تہذیب حجازی کا مزار" بھی ہے۔ غرناطہ اور قرطبہ کی ہواؤں میں اُن صحرانشینوں کی ہنگامہ پرور آوازوں کی گونج آج بھی موجود ہے۔ جن کے دل ذوقِ شہادت سے معمور تھے اور جن کے سیلِ رواں کے سامنے بند باندھنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ نصف صدی قبل اقبال وہاں گئے تھے اور خون کے آنسو روتے رہے۔ اُن کا سوزِ جگر "مسجد قرطبہ" نامی نظم میں ڈھل کر لافانی ہوگیا ــــ ملت کا درد رکھنے والے ایک حساس اور باشعور انسان کے جذبات کی اس سے بہتر ترجمانی شاید قیامت تک ممکن نہ ہوگی۔

سپین کے علاوہ امیر محترم کو برطانیہ اور فرانس بھی جانا ہے۔ برطانیہ میں تو اللہ کے فضل و کرم سے انجمن و تنظیم کے حلقے تشکیل پا چکے ہیں، فرانس میں بھی مخلص ساتھیوں کا ایک حلقہ وجود میں آ چکا ہے۔ توقع ہے کہ پاکستان واپسی پر ۱۶ جولائی کے خطاب جمعہ میں امیر محترم اپنے دورے کے تاثرات بیان فرمائیں گے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اگست کے شمارے میں اس کا ایک خلاصہ ضرور ہدیۂ قارئین کر دیا جائے۔

پچھلے شمارے کے ذریعے یہ اطلاع قارئین تک پہنچ چکی ہوگی کہ قرآن کالج میں الیف اے کے داخلے شروع ہو چکے ہیں ___ داخلہ فارم جمع کرانے کی آخری تاریخ ۱۶ رجون طے پائی تھی ___ لیکن صوبۂ سندھ اور صوبہ سرحد میں میٹرک کے نتائج کے اعلان میں چونکہ غیر معمولی تاخیر ہوئی ہے، لہٰذا بعد میں اس ضمن میں یہ لچک رکھ دی گئی تھی کہ ۱۶ رجون کے بعد موصول ہونے والی درخواستوں کو بھی شامل کر لیا جائے گا ___ آج کی تاریخ (یعنی ۲۷ رجون) تک نصف صد سے زائد درخواستیں موصول ہو چکی ہیں جن میں سے ۶۰ فی صد سے زائد درخواست گزار طلبہ کا تعلق بیرونِ لاہور سے ہے ۔ لیکن کالج ہاسٹل کی تنگ دامانی کے باعث ہم بیرونِ لاہور سے بہت کم طلبہ کو اپنے کالج میں داخلہ دے پائیں گے ۔ چنانچہ اُن میں ہمیں سلیکشن کرنا ہوگی اور میرٹ معیّن کرنا ہوگا ۔ ہاں لاہور میں مقیم طلبہ کے لیے قرآن کالج سے استفادے کا پورا موقع ہوگا اور نئی کلاس میں اُن کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو جگہ دینے کی کوشش کی جائے گی ۔

حسبِ وعدہ امیرِ تنظیم اسلامی کا خطاب بعنوان ' پاکستان کا مستقبل ، روشن یا تاریک ؟' اس شمارے میں شامل ہے ۔ اکثر احباب کے علم میں ہے کہ یہ خطاب امیرِ محترم نے اسی سال ۲۳ مارچ کو یومِ پاکستان کی مناسبت سے تنظیم اسلامی کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ میں ارشاد فرمایا تھا ۔ خطاب اتنا جامع اور مؤثر تھا کہ فوراً ہی احباب کی جانب سے اس کی اشاعت کا بھرپور تقاضا شروع ہو گیا تھا ___ اگرچہ اس فکر انگیز خطاب کے بہت سے مباحث ' استحکامِ پاکستان ' نامی کتاب میں آ چکے ہیں لیکن یہ خطاب اس پہلو سے زیادہ جامع اور بھرپور ہے کہ اس میں محض مسئلے کا تجزیہ ہی نہیں ، حل بھی پیش کیا گیا ہے ۔ چنانچہ اس ضمن میں پاکستان کے موجودالوقت حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بعض معیّن تجاویز بھی اس خطاب کا حصہ ہیں ___ پھر ہمارے اُن قارئین کے لیے بھی یہ خطاب خصوصی کشش رکھتا ہے جو امیرِ تنظیم اسلامی کی تحریر کو ثقیل اور بوجھل خیال کرتے ہیں ۔ تقریر کی زبان چونکہ نسبتاً زیادہ سادہ ہوتی ہے لہٰذا اُمید ہے کہ اس خطاب کی صورت میں ' استحکامِ پاکستان ' کا ایک قدرے سادہ اور آسان فہم ایڈیشن اُنہیں دستیاب ہو جائے گا ، اور ان کی شکایت کے ازالے کا کچھ سامان ہو سکے گا ۔ (ان شاء اللہ)

الہدیٰ قسط ۶۶

مباحث جہاد فی سبیل اللہ
درس ۲

جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اُولیٰ

شہادت علی النّاس

سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں

—————(۳)—————

مطالباتِ دین کا خلاصہ

اَحْمَدُہٗ وَاُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع کا جزوِ ثانی جو دعوتِ عمل پر مشتمل ہے یا جس میں یوں کہنا چاہیے کہ ایمان کے عملی مقتضیات کا بیان ہوا ہے کہ ایک بندۂ مومن سے اس کا دین کیا تقاضا کرتا ہے' دو آیات پر مشتمل ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ۝ وَجَاہِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ ؕ ہُوَ اجْتَبٰىکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰہِیْمَ ؕ ہُوَ سَمّٰىکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۬ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ہٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَہِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚۖ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ؕ ہُوَ مَوْلٰىکُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۝

ترجمہ: "اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے رب کی اور بھلے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چُن لیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے۔ اُس نے تمہارا نام رکھا مسلمان، پہلے بھی اور اس میں بھی، تاکہ ہو جائیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم گواہ تم پر اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر۔ پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اللہ سے چمٹ جاؤ۔ وہی ہے تمہارا پُشت پناہ۔ تو کیا ہی اچھا ہے پُشت پناہ اور کیا ہی عمدہ ہے مددگار!

یہ دو آیات ہیں جن میں ایمان کے مقتضیات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ پہلی آیت نسبتاً چھوٹی ہے، دوسری طویل، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کی طویل ترین آیات میں سے ہے تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ ان آیات میں جیسا کہ آپ نے نوٹ کیا ہوگا پے بہ پے فعلِ امر وارد ہوئے ہیں کہ یہ کرو اور یہ کرو اور یہ کرو۔ حکمتِ قرآنی کا یہ اصول پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلام کی دعوت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہے دعوتِ ایمان جو عام ہے پوری نوعِ انسانی کے لیے، ہر فردِ نوعِ بشر کے لیے۔ اور دوسری ہے دعوتِ عمل۔ ظاہر بات ہے کہ اِس کے مخاطب صرف وہی ہو سکتے ہیں کہ جو ایمان کا اقرار کر چکے ہوں، جو دعویٰ کرتے ہوں اللہ کو ماننے کا، آخرت کو ماننے کا اور نبوت و رسالت کو ماننے کا۔ ایسے ہی لوگوں سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اب ایمان کے ان عملی تقاضوں کو پورا کرو! اس ضمن میں یہاں جو چند الفاظ وارد ہوئے ہیں اگر نگاہ کو صرف ان کے ظاہر تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ کسی قدر گہرائی میں اتر کر غور کیا جائے تو مطالباتِ دین اور دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں ایک بڑا عمدہ نقشہ سامنے آتا ہے جسے اگر ایک سیڑھی سے مشابہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جیسے ایک منبر کے قدمچے (Steps) ہوتے ہیں۔ جن پر قدم رکھ کر انسان درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا ہے۔ اسی طرح مقتضیاتِ دین یا دین کے عملی مطالبات کا تدریجاً اور سلسلہ وار بیان ان دو آیتوں میں آیا ہے۔

پہلی سیڑھی: ارکانِ اسلام

فرمایا "اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا"۔ رکوع کرو اور سجدہ کرو! قرآن

مجید میں اکثر وبیشتر آپ دیکھیں گے کہ نماز کے مختلف ارکان کا ذکر ہوتا ہے لیکن ان سے نماز مراد لی جاتی ہے ۔ جیسے سورۃ المزمّل میں فرمایا گیا : " قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا " ۔ " کھڑے رہا کرو رات کو سوائے اس کے کچھ حصّے کے " ۔ اب ظاہر بات ہے کہ کھڑے ہونے سے یہاں نماز میں کھڑے ہونا مراد ہے ۔ اسی طرح سورۃ الدھر کی آیت ہے : " وَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَیْلًا طَوِیْلًا " ۔ " اور رات کے ایک حصّے میں اللہ کے سامنے سربسجود رہا کرو اور تسبیح کیا کرو " ! یہاں تسبیح اور سجدہ سے مراد درحقیقت نماز ہی ہے ۔ چنانچہ سورۃ الحج کی اس زیرِ نظر آیۂ مبارکہ میں بھی رکوع اور سجود سے مراد نماز ہے ۔ اور نماز درحقیقت ارکانِ اسلام میں رُکنِ رکین ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ارکانِ اسلام میں سے پہلا رکن کلمۂ شہادت ہے لیکن وہ آپ سے آپ یہاں گویا UNDERSTOOD ہے اس لیے کہ جب گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے " یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا " کے الفاظ سے تو سیدھی سی بات ہے کہ وہی لوگ یہاں مخاطب ہیں جو کلمۂ شہادت ادا کر چکے ہیں ۔ اس کے بعد ارکانِ اسلام میں سے اہم ترین رکن بلاشبہ نماز ہے : " اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْاِسْلَامِ وَالْکُفْرِ الصَّلٰوۃُ " لہٰذا اوّلاً اسی کا حوالہ دیا گیا کہ نماز قائم کرو ۔ گویا نماز کی حیثیت تمام ارکانِ اسلام میں نمائندہ رکن کی ہے اور اس کے ذیل میں زکوٰۃ ، روزہ اور حج آپ سے آپ مندرج ہیں ، خواہ لفظاً وہ مذکور نہ ہوں ۔ یہ حقیقت اگلی آیت کے آخر میں جا کر کھل جائے گی کہ یہاں رکوع وسجود سے مراد صرف نماز نہیں بلکہ تمام ارکانِ اسلام مراد ہیں ۔ بہرحال یہ بات بالکل منطقی ہے اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ جو شخص ایمان کا اقرار کرتا ہے اُس پر سب سے پہلی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ارکانِ اسلام کی پابندی کرے ۔ یہ پہلی سیڑھی ہے ۔ اس پر قدم جماؤ تب دوسری سیڑھی کی طرف بڑھو ! ۔

دوسری سیڑھی : بندگیٔ ربّ

وہ دوسری سیڑھی کیا ہے ! " وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ " : اپنے رب کی بندگی کرو ! اس کے عبد اور غلام بن کر زندگی بسر کرو ۔ اس کو اپنا آقا سمجھو اور اپنے آپ کو اُس کا مملوک جانو اپنے کُل وجود کا مالک اسی کو سمجھو اور اپنی پسند و ناپسند ، اپنی چاہت ، اپنی مرضی ، ان سب سے اس کی اطاعت کے حق میں دستبردار ہو جاؤ ! یہ اطاعت تمہاری پوری زندگی پر حاوی ہونی چاہیے بغیر اس کے کہ اُس کے کسی جُز کو اُس سے مستثنیٰ کیا گیا ہو ۔ اسی کی مرضی کے سانچے میں ا

آپ کو ڈھالو! اور یہ پورا طرزِ عمل اختیار کرو اللہ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر!
اس منتخب نصاب میں اس سے پہلے ایک سے زائد مقامات پر عبادت کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا چکی ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جنہیں ہم عبادات کہتے ہیں، سب اصلاً اسی ہمہ گیر عبادت کے لیے مطلوب ہیں۔ یہ اس عبادتِ عظیمہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے فرض کئے گئے ہیں۔ نسیان اور غفلت کا علاج نماز سے کیا گیا۔ اپنے نفس کے تقاضوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے روزہ عطا کیا گیا۔ مال کی محبّت کی گرفت دل سے کم کرنے کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی۔ اور ان تمام مقاصد کو پورا کرنے والی ایک جامع اور عظیم عبادت حج کی شکل میں تجویز کی گئی۔ لیکن غور کیجئے کہ ان سب کا مقصد یہی تو ہے کہ بندگیٔ رب کا تقاضا پورا کرنے میں جو رکاوٹیں اور موانع ہیں انسان کے اندر ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ارکانِ اسلام کی پہلی سیڑھی کے بعد 'عبادتِ رب' کی یہ دوسری سیڑھی منطقی طور پر بہت مربوط ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ!

تیسری سیڑھی: افعالِ خیر، خدمتِ خلق

لیکن اسی پر بس نہیں، ابھی اس سے آگے ایک تقاضا اور بھی ہے: "وَافْعَلُوا الْخَیْرَ"۔ نیک کام کرو، بھلے کام کرو، خلقِ خدا کی خدمت پر کمربستہ ہو جاؤ۔ خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَنْفَعُ النَّاسَ۔ اسے یوں سمجھئے کہ اللہ کی عبادت کا تقاضا تو اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے پورا ہو جائے گا۔ لیکن اس سے آگے بھی انسان کے لیے نیکی کا، خیر کا، بھلائی کا ایک وسیع و عریض میدان ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا سورۃ البقرہ میں: "وَلِکُلٍّ وِّجْھَۃٌ ھُوَ مُوَلِّیْھَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ"۔ کہ ہر کسی نے اپنا کوئی نہ کوئی ہدف بنایا ہوا ہے جس کی طرف اس کا رُخ ہے بس اے اہلِ ایمان تم نیکیوں میں، بھلائیوں میں، حسنات میں، خیرات میں، صدقات میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ تو جہاں تک عبادت کا تقاضا ہے وہ تو احکامِ خداوندی پر عمل کرنے سے پورا ہو گیا لیکن اب آگے بڑھو، یہ خدمتِ خلق کا میدان کھلا ہوا ہے۔ یہ ہے مفہوم "وَافْعَلُوا الْخَیْرَ" کا۔ البتہ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ خدمتِ خلق

کا ابتدائی درجہ یقیناً وہی ہے جس سے سب واقف ہیں یعنی بھوکے کو کھانا کھلانا، کسی کے پاس تن ڈھانپنے کو اگر کچھ نہیں ہے تو اس کا تن ڈھانپ دینا، کسی بیمار کے علاج معالجے اور دوا دارو کا اہتمام کر دینا، کسی کی عیادت یا مزاج پرسی کر دینا وغیرہ۔ حضورؐ نے تو اس کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ فرمایا: "تَبَسُّمُکَ فِی وَجْہِ اَخِیْکَ صَدَقَۃٌ" کسی اپنے ملاقاتی سے کشادہ روئی اور متبسم چہرے کے ساتھ ملاقات کر لینا بھی صدقہ ہے۔ یہ بھی خیر اور نیکی کا کام ہے، کہ وہ آئے تو آکر پشیمان نہ ہو کہ میں خواہ مخواہ کیوں آیا بلکہ وہ محسوس کرے کہ تمہیں اس سے مل کر ایک فرحت ہوئی ہے۔ تاکہ اس کی طبیعت میں بھی ایک انبساط پیدا ہو۔ تو یقیناً خیر، بھلائی، نیکی اور خدمتِ خلق کا بنیادی تصور یہی ہے۔ لیکن اس سے ایک بلند تر سطح بھی ہے۔

خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح

وہ بلند تر سطح یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگی غلط رخ پر پڑ گئی ہے اور وہ لوگ کہ جو اپنی غفلت اور نادانی کے باعث ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں، ان کی عاقبت سنوارنے کی فکر کرنا۔ جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے جیسے کہ آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ ہے، تم اس میں گرپڑنا چاہتے ہو اور میں تمہارے کپڑے پکڑ پکڑ کر تمہیں گھسیٹ کر اس ہلاکت خیز انجام سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ چنانچہ خلقِ خدا کو خدا کی بندگی کی دعوت دینا اور بھولے اور بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم اور سواء السبیل پر لے آنے کی کوشش کرنا درحقیقت خدمتِ خلق کی بلند ترین سطح ہے۔ موٹی سی بات ہے، ہم خود سوچ سکتے ہیں، ایک انسان کے پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ کو اگر آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا حاصل اگر وہ سموچا آگ کا نوالہ بننے والا ہے! آپ کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کا دارومدار دراصل اس بات پر ہے کہ آیا آخرت پر یقین ہے یا نہیں! اگر یقین ہے تو جیسا کہ ہم سورۃ التحریم میں پڑھ آئے ہیں کہ کسی شخص کو اگر آخرت کا یقین ہے تو وہ اپنی اولاد اور اپنے اہل و عیال کے بارے میں سب سے بڑھ کر جس چیز کے لیے کوشاں ہوگا وہ ان کی آخرت کی بھلائی ہوگی۔ اگر آخرت نگاہوں کے سامنے ہے ہی نہیں تو ظاہر بات ہے کہ اپنے اہل و عیال کی صرف دنیوی منفعت ہی پیشِ نظر رہے گی۔ یہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ ایک ایسے شخص کے نزدیک

جس کی باطنی آنکھ کھل چکی ہے اور جسے آخرت کی حقیقت نظر آگئی ہے اصل خدمت خلق
کا کام خلقِ خدا کو راہِ ہدایت پر لانا ہوگا کہ جس سے ان کی ابدی زندگی ' ہمیشہ کی زندگی سنور جائے
اگرچہ ظاہر بات ہے کہ ایسا شخص اس دنیا میں بھی کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اُٹھے گا
آیۂ برّ میں ہم تفصیل کے ساتھ یہ پڑھ چکے ہیں : " وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْ
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ " . اسی حقیقت
کو حضورؐ نے یوں تعبیر فرمایا تھا : " مَنْ يُّحْرَمِ الرِّفْقَ فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ
کہ جو شخص دل کی نرمی سے ' دردمندی سے محروم ہے وہ کُل کے کُل خیر سے محروم ہو گیا۔ تو
خدمتِ خلق کے اس درجے کی اپنی جگہ اہمیت ہے ۔

ہمیں حضورؐ کی سیرتِ مطہرہ میں خدمتِ خلق کے یہ دونوں پہلو بتمام و کمال نظر آتے
ہیں۔ وحی کے آغاز سے قبل بھی آپؐ انسانیتِ کاملہ کی معراج پر فائز تھے ۔ انسانی ہمدردی
مادہ آپؐ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپؐ یتیموں کی خبر گیری کرنے ' بیواؤں کی سرپرستی
فرمانے ' مساکین اور محتاجوں کی امداد کرنے اور مسافروں کی مہمان نوازی فرمانے میں پیش پیش
تھے جس کی سب سے بڑی شہادت آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے اُس موقع
پر دی تھی جب پہلی وحی کے بعد آپؐ پر بربنائے طبع بشری کچھ گھبراہٹ کی کیفیت طاری
تھی ۔ لیکن خلعتِ نبوت سے سرفراز کئے جانے کے بعد جب حقائق منکشف ہوتے ' جب
آپ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے (وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَ
لَهِيَ الْحَيَوَانُ ' لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ) تو اب آپؐ کی پوری زندگی ' آپؐ کی تمام توانائیاں
آپؐ کا ایک ایک لمحہ بسر ہو رہا ہے خلقِ خدا کو آخرت کے بُرے انجام سے بچانے کی کوشش
میں ۔ یہی خدمتِ خلق کی معراج ہے ۔ یہ اس کی بلند ترین منزل ہے ۔

چڑھائی تو بہرطور چڑھنی ہے!

بہرحال پہلی آیت میں یہ تین سیڑھیاں سامنے رکھ دی گئیں ۔ اب تمہیں چڑھنا ہو
ایک عجیب آیت قرآن مجید میں سورۃ مدثر میں وارد ہوئی ہے : " سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا
" ہم چڑھوائیں گے اُسے بلندی " ۔ ولید بن مغیرہ کے ذکر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں
آخرت کے عذاب کا نقشہ کھینچا گیا کہ وہاں چڑھایا جائے گا اسے بلندی پر ' اسے بلند

چڑھوائی جائے گی۔ یہ بلندی انسان کو بہرحال چڑھنی پڑے گی، اس دنیا میں چڑھ لے یا پھر آخرت میں وہ یہ چڑھائی چڑھنے پر مجبور ہوگا۔ اس دنیا میں اہلِ ایمان کو عملِ صالح کی چڑھائی چڑھنی ہوگی اسی طرح دین کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے محنت اور جدوجہد درکار ہوگی، سیڑھی بہ سیڑھی چڑھنا ہوگا۔ ہم پر تو ارکانِ اسلام کی پابندی ہی بہت شاق ہے، اُس سے اوپر پوری زندگی میں اللہ کی اطاعتِ کاملہ! ہمارے اعتبار سے بہت بھاری، بہت ثقیل، بہت مشکل معلوم ہوتی ہے ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لَا اِلٰہ را

پھر اس سے اوپر بھی ایک تقاضا ہے دین کا، اپنے آپ کو ہمہ تن خلقِ خدا کی خدمت میں صرف کر دینا، اس کے لیے وقف کر دینا، اور لگا دینا۔ یہ ہے مطالباتِ دینی کی تیسری منزل۔

'فلاح' کی اُمید!

ان تین تقاضوں کے بیان کے بعد فرمایا: " لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ": تاکہ تم فلاح پاؤ! 'لَعَلَّ' کا اس انداز میں ترجمہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ یہ کلامِ الٰہی ہے ورنہ 'لَعَلَّ' کا اصل لفظی مفہوم عربی زبان میں 'شاید' کا ہے۔ گویا لغوی ترجمہ یوں ہوگا "شاید کہ تم فلاح پاؤ"۔ لیکن چونکہ شاہانہ کلام میں لفظ 'شاید' اگر آئے تو وہ ایک حتمی وعدے کی صورت ہوتا ہے، جیسے کوئی بادشاہ وقت اگر اپنے کسی درباری سے یہ کہے کہ تم یہ کام کرو شاید کہ ہم تمہیں فلاں چیز دیں تو دراصل یہ ایک پختہ وعدہ ہے، اس لیے سورۃ الحج کی اس آیت میں ہم ترجمہ یوں کرتے ہیں: "تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ لیکن اس آیت کے حوالے سے بھی کم سے کم اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے کہ یہ فلاح ایسے ہی حاصل ہو جانے والی چیز نہیں ہے۔ یہ اتنی بے وقعت شے نہیں ہے کہ بس زبان سے چند کلمات ادا کرنے سے حاصل ہو جائے۔ اگر اسلام اور ایمان کا صرف زبانی اقرار کافی ہوتا تو ان الفاظِ مبارکہ کا یہاں لانا کہ اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ' یہ سب تحصیلِ حاصل قرار پائے گا۔ پھر یہ سارا کلام، نعوذ باللہ مِنْ ذٰلِكَ، ایک مہمل اور عبث کلام قرار پائے گا، اگر کوئی یہ سمجھے کہ فلاح اس کے بغیر بھی حاصل ہوتی ہے۔

یہاں گویا کہ اس آیۂ مبارکہ کی شکل میں وہ پورا سبق ایک مرتبہ پھر ہمارے سامنے آگیا جو سورۃ العصر کا حاصل اور ہمارے اس پورے علمی و ذہنی سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ " وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ وہاں وہ بات منفی اسلوب میں تھی۔" زمانہ گواہ ہے تمام انسان خسارے اور گھاٹے میں رہیں گے۔" " اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝" سوائے ان کے جو ایمان لائیں، نیک عمل کریں ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور وصیت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں۔ یہاں دیکھیے، وہی بات ایک مثبت اسلوب میں آئی ہے۔ اگر فلاح کے طالب ہو، کامیابی چاہتے ہو، رُشد سے ہم کنار ہونا چاہتے ہو، تو تمہیں کچھ محنت و مشقت لازماً کرنی ہوگی ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

وہ محنت کیا ہے؟ اس کی وضاحت ہے سورۃ الحج کی اس آیت میں کہ " اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا " پہلی چیز ہے نماز، اور اس کے ساتھ ہی گویا بقیہ ارکانِ اسلام زکوٰۃ، روزہ اور حج بھی اس کے تابع ہیں اور ان کا التزام بھی ضروری ہے۔ پھر دوسرا تقاضا بندگیٔ رب کا ہے: " وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ " ہر معاملے میں اپنے رب کی اطاعت پر کمربستہ ہو جاؤ پوری زندگی کو اُس کے حوالے کر دو اور اس سے بھی آگے بڑھ کر " وَافْعَلُوا الْخَيْرَ " بھلائی پر، خدمتِ خلق پر کمربستہ ہو جاؤ۔ لوگوں کی خیر خواہی، لوگوں کی فلاح، خلقِ خدا کی ابدی بہبود کے لیے اپنی قوتیں، اپنی توانائیاں اور اپنی صلاحیتیں صرف کر دو، اپنے اوقات لگاؤ اور کھپاؤ! یہ ساری محنت کرو تو امید کی جا سکتی ہے کہ: " لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ " شاید کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے بعد دوسری آیت میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، سورۃ العصر میں بیان کردہ نجات کی چار شرائط میں سے آخری دو یعنی " وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ " کے لیے ایک جامع اصطلاح آگئی " جہاد "۔

جہاد کی اہمیّت

اب ذرا جہاد کی اہمیت کے حوالے سے دونوں آیات کا موازنہ کیجیے! پہلی آیت میں چار فعل امر آئے تھے: اِرْكَعُوْا، وَاسْجُدُوْا، وَاعْبُدُوْا اور وَافْعَلُوْا، اور اس دوسری آیت میں جو حجم کے اعتبار سے بہت طویل ہے صرف ایک فعل امر آیا ہے " وَجَاهِدُوْا فِی

اللہِ حَقَّ جِهَادِہٖ "۔ معلوم ہوا کہ جہاد کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے ۔ پوری آیت جہاد اور اس کی غرض و غایت ہی کے بیان پر مشتمل ہے ۔

فرمایا " جہاد کرو اللہ کے لیے "۔ ' فی اللہ ' ، دراصل فی سبیل اللہ کا مخفف ہے ۔ مراد ہے اللہ کی راہ میں "IN THE CAUSE OF ALLAH" یا یوں کہیے : "FOR THE CAUSE OF ALLAH" اس کے لئے محنتیں کرو ، جدّوجہد کرو ، کوششیں کرو ، کشمکش ، تصادم اور مجاہدہ اس میدان میں ہونا چاہیے ۔ یہ تمہارے ایمان کا جو تھا بنیادی تقاضا ہے ۔

"حقّ جہادہٖ" کا حقیقی مفہوم

یہاں نوٹ کیجیے اس رکوع کے پہلے جزو میں شرک کی مذمت اور اس کے سبب کے بیان کے ضمن میں الفاظ وارد ہوئے تھے : " مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِہٖ "۔ وہی اسلوب یہاں ہے : " جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِہٖ "۔ یہ محنت ، کوشش ، جدّوجہد اور تصادم ہوگا اللہ کے لیے ، جس پر تم ایمان لائے ہو ، جسے تم نے اپنا مطلوب و مقصود اور محبوب حقیقی قرار دیا ہے ، اور یہ جہاد اور مجاہدہ ، کوشش اور یہ سعی اتنی ہونی چاہیے جتنا اور جیسا کہ اُس کا حق ہے ۔ غور کرو تم پر کس کا کتنا حق ہے ! کیا تم خود اپنے خالق ہو کہ اپنے نفس کے تقاضوں اور اس کے حقوق ہی کے پورا کرنے میں اپنی تمام توانائیاں ، اپنی قوتیں اور اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہو ! سوچو ، کس کے تم پر کتنے حقوق ہیں ! والدین کے حقوق ہیں ، ادا کرو ! لیکن غور کرو کہ والدین کے دل میں محبت و شفقت کے جذبات پیدا کرنے والا کون ہے ! تم پر کس کا حق کتنا ہے معیّن تو کرو ۔ اگر کوئی اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنے وطن کے لیے وقف کر چکا ہے تو کیا صرف وطن کے حقوق کی ادائیگی ہی اس کے ذمّے تھی ! یہ درست ہے کہ وطن کا زیر بارِ احسان ہر شخص ہوتا ہے ۔ وہ زمین کہ جس سے اس کے لیے غذا کے خزانے اُبلتے رہے ہیں یقیناً اس کا ایک احسان اُس کی گردن پر ہے ۔ لیکن احسانات کو ناپو تو سہی ، کس کا کتنا حق ہے ! معلوم ہوگا کہ تمام حقوق پر فائق حق اللہ کا ہے ۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام حقوق اللہ کے حقوق کے تابع ہو جائیں ۔ وہ بات جو شرک کی حقیقت کے ضمن میں ' شرک فی الحقوق ' کی بحث میں کافی تفصیل سے بیان ہو چکی ہے اُسے یہاں اپنے ذہن میں تازہ کیجئے کہ انسان پر اوّلین حق

اللہ کا ہے۔ سورۂ لقمٰن کے دوسرے رکوع میں یہ مضمون آیا تھا: "اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ": کہ شکر کر میرا اور اپنے والدین کا۔ اگر یہ فہرست مرتب کی جائے کہ انسان پر کس کس کے حقوق ہیں تو سرفہرست آئے گا اس کا خالق و مالک، اس کا پروردگار، اُس کا پالنہار۔ جس نے اسے عدم سے وجود بخشا، جو اس کی کُل ضروریات فراہم کر رہا ہے، جو اسے درجہ بدرجہ تدریجی مراحل سے گزارتا ہوا ترقی کے مراحل طے کرا رہا ہے، وہ ہے کہ جس کے حقوق سب سے فائق ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان یقیناً صد فی صد درست ہے کہ "وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَیْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَیْكَ حَقًّا" تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔ یہ سب حقوق تسلیم! لیکن یہ طے ہے کہ اللہ کا حق سب سے فائق ہے تو اب ذرا سوچو کہ تمہاری توانائیوں کا کتنے فیصد اپنے نفس کے لیے صَرف ہو رہا ہے، کتنے فی صد تم اپنی اولاد کے لیے صرف کر رہے ہو، کتنا جزو اپنی توانائیوں کا تم نے اپنی قوم یا وطن کے لیے وقف کیا ہے اور اُس کا کتنا حصّہ ہے جو تم نے خدا کے لیے وقف کیا ہے! وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔ کہیں کسی محفل میں ذرا سا کلمۂ خیر کہہ دینے یا دین کے کسی کام میں کوئی چندہ دے دینے سے یہ سمجھ لینا کہ اللہ کا حق ادا ہو گیا، انگلی کٹوا کر شہیدوں میں شریک ہونے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے! یہاں اس کا سدّباب کیا جا رہا ہے: "وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ"۔

ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے کہ واقعتاً انسان کی شخصیت کے دو ہی پہلو ہیں۔ ایک اس کا علم اور فکر ہے اس کی نظری اور فکری قوتیں ہیں اور دوسرا اس کا عمل ہے، بھاگ دوڑ ہے، سعی و جہد ہے، اس کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا بروئے کار آنا ہے۔ ان دونوں کا جو نقطۂ عروج ہے اس کو اس رکوع کے دو حصوں میں اس طرح بیان کیا گیا کہ ایک ہے اللہ کی معرفت، اللہ کا اندازہ جیسا کہ اس کا حق ہے: "مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ"۔ اور دوسرے ہے اللہ کے لیے محنت، بھاگ دوڑ اور سعی و جہد۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ کہ انسان کا جینا اور مرنا، جاگنا اور سونا، بیٹھنا اور اُٹھنا، یہ سب درحقیقت اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ اُسی کے لیے جدوجہد، اُسی کے لیے کوشش، اُسی کے لیے بھاگ دوڑ، گویا اُسی میں ہمہ تن انسان اپنے آپ کو جھونک دے، یہ ہے جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔

فریضۂ رسالت کی ادائیگی اب اُمّت کے ذمّے ہے!

اُگلا لفظ بہت ہی معنی خیز اور قابلِ توجہ ہے : " هُوَ اجْتَبٰكُمْ " کہ اے مسلمانو! اے ایمان کے دعویدارو اور اے ہمارے رسول محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُمتی ہونے کے دعویدارو! تم اپنا مقام اور مرتبہ پہچانو، تم اُسی طرح چُن لیے گئے ہو، جس طرح رسولؐ چنے ہوئے ہیں۔ لفظ ' اِصطفٰی ' اور ' اجتبٰی ' عربی زبان کے دو بڑے قریبُ المفہوم الفاظ ہیں۔ اگرچہ ان میں وہ ایک باریک سا فرق بھی ہے جو انگریزی کے دو الفاظ ' CHOICE ' اور ' SELECTION ' میں ہے۔ ' CHOICE ' میں پسند کرنے والے کی پسند کو زیادہ دخل ہوتا ہے جبکہ ' SELECTION ' فی الاصل کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ کسی معیّنہ ہدف کے لیے کسی موزوں ترین شخصیت یا جماعت کا انتخاب ' SELECTION ' کہلائے گا۔ اِصطفٰی میں ' CHOICE ' کا معاملہ ہوتا ہے اور اجتبٰی میں سلیکشن کا۔ لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار یہ دونوں الفاظ بہرحال بہت قریبُ المعنیٰ ہیں۔ چنانچہ محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لیے یہ دونوں ہی الفاظ مستعمل ہیں۔ محمدِ مصطفٰی اور احمدِ مجتبٰی صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ چنانچہ وہی لفظ جو رسولوں کے لیے مستعمل ہے یہاں اُمّت کے لیے آیا ہے : " هُوَ اجْتَبٰكُمْ " "تمہیں چن لیا گیا ہے" تمہیں پسند کر لیا گیا ہے، ایک مقصدِ عظیم کے لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے۔ یہ مقصدِ عظیم کیا ہے! ذہن میں رکھئے کہ اس رکوع کے نصفِ اوّل میں نبوت و رسالت کے جس سلسلۃ الذھب کا بیان آیا تھا، اس سنہری زنجیر میں گویا ایک کڑی کا اضافہ ہوا ہے ختمِ نبوت کے باعث۔ اب کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ ہی کوئی اور رسول مبعوث ہوگا۔ چنانچہ خلقِ خدا پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت کا فریضہ اب اس اُمّت کے سپرد کیا گیا ہے جو اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف۔ گویا کہ وہ ہدایت جس کی تلقّی اوّلاً جبرئیل نے کی تھی اللہ سے، اور پہنچا دیا تھا جسے محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تک، اور پھر جسے پہنچایا محمدؐ رسول اللہ نے اُمّت تک، اب اس اُمّتِ محمدؐ کا فریضۂ منصبی ہے کہ وہ اُسے پہنچائے پوری نوعِ انسانی تک۔ گویا یہ اُمّت اُس سلسلۃُ الذّھب کی ایک کڑی (LINK) کی حیثیت سے مستقلاً اس کے ساتھ جوڑ دی گئی، ٹانک دی گئی۔ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں الفاظ بالکل ہم وزن لائے گئے ہیں۔ وہاں فرمایا تھا " اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ

(باقی ص ۸ پر)



Hamdard
پیلو کی بازیافت
ہمدرد
مسواک سے
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تک
پیلو کے مؤثر اور مجرب اجزا پر مشتمل ایک مکمل طبی ٹوتھ پیسٹ پیش کر کے ہمدرد نے حفظِ دندان کی دنیا میں بھی اوّلیت حاصل کر لی ہے۔
پیلو صدیوں سے دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمدرد کی تحقیقِ جدید نے پیلو کے ان افادی اجزاء اور دوسری مجرب جڑی بوٹیوں سے ایک جامع فارمولے کے مطابق ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تیار کیا جو پوری طرح دانتوں اور مسوڑھوں کی حفاظت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
Hamdard
ہمدرد
پیلو ٹوتھ پیسٹ
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
پیلو کے اوصاف
مسوڑھے مضبوط، دانت صاف
ہمدرد
پاکستان سے محبت کرو - پاکستان کی تعمیر کرو
Adarts-HTP-3/86

پاکستان کا مستقبل روشن یا تاریک ہے

امیر تنظیم اسلامی کا ایک فکر انگیز خطاب

ترتیب وتسوید: حافظ خالد محمود خضر

معزّز حاضرین اور محترم خواتین! آپ کے علم میں ہے کہ آج مجھے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرنی ہے کہ آیا پاکستان کا مستقبل روشن ہے یا تاریک! تاریک ہے تو کیوں؟ اور روشن ہو تو کیسے؟ لیکن ظاہر بات ہے کہ مستقبل کو حال اور ماضی سے جدا نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ہمیں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کسی قدر گفتگو اپنے ماضی کے بارے میں بھی کرنی ہوگی اور اپنے حال کو بھی ایک حد تک زیر بحث لانا ہوگا کہ ہمارا حال اس وقت ہے کیا؟ دنیا ہمارے بارے میں کیا کہہ رہی ہے؟ ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

کیا ہم کسی وجودِ مصدّقہ کے حامل ہیں؟

علامہ اقبال نے مولانا روم کے تتبع میں وجودِ مصدّقہ (Authentic Personality) کو جانچنے کا جو پیمانہ پیش کیا ہے اس پر ہم خود کو پرکھ کر بحیثیت قوم اپنی حقیقی صورت حال کا بہ آسانی اندازہ کر سکتے ہیں - علامہ کے نزدیک اس بات کا فیصلہ کہ کسی انسان کی شخصیت یا سیرت کیسی کچھ مستند (Authentic) ہے' تین اعتبارات سے ہوتا ہے:

۱-   انسان خود اپنے آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے' اپنا جائزہ لے کہ اپنی نگاہ میں وہ خود کیا ہے؟

۲-   انسان اپنے آپ کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھے کہ دوسرے اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ ایک مسنون دعاء ذہن میں آ رہی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں چیزوں کو جمع فرمایا ہے- آپؐ یہ دعا کیا کرتے تھے :

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا

کہ اے اللہ مجھے اپنی آنکھوں میں تو چھوٹا دکھا (کہ کہیں دل میں تکبّر اور عُجب نہ پیدا ہو جائے) لیکن لوگوں کی آنکھوں میں بڑا کر (تاکہ تیرے دین کی بڑائی ہو اس لئے کہ میں تیرے دین کا خادم اور تیرا نمائندہ ہوں)

۳-   اور تیسرے یہ کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرے- خود کو جانچے کہ اسؐ کی نگاہ میں وہ کیا ہے! مولانا روم کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

جانِ جملہ علم ہا ایں است و ایں
تا بدانی من کیم در یومِ دیں

کہ تمام علم کالبِّ لباب اور خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ قیامت کے دن میرا کیا حشر ہو گا؟ وہاں میں کس کے جھنڈے تلے کھڑا ہوں گا؟

اسی حوالے سے ہمیں جائزہ لینا ہے کہ ہم قومی اور ملکی سطح پر کسی وجودِ مصدّق کے حامل ہیں یا نہیں؟ اس کے ضمن میں اصلاً دو ہی باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں' ورنہ حال اور ماضی کا یہ مرثیہ بہت طویل ہو جائے گا-

"ٹائمز آف لنڈن" کا تجزیہ

سب سے پہلے تو "ٹائمز آف لنڈن" جو کہ ایک بہت پرانا اخبار ہے' اس کے حوالے سے مجھے یہ بات عرض کرنا ہے کہ جب ہمارے ہاں آزادی کی چالیسویں سالگرہ یعنی اکتالیسواں یومِ استقلال منایا گیا تو اس اخبار کے موجودہ ایڈیٹر نے ایک اداریہ لکھا اور اس میں چالیس سال قبل کا حوالہ دیا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان تقسیم ہوا اور دو آزاد ملک وجود میں آئے تو اخبار کے اُس وقت کے ایڈیٹر نے اِس اہم واقعہ پر اداریہ قلمبند کیا تھا'

جس میں اس نے ان دونوں نوزائیدہ ملکوں کے مستقبل کے بارے میں اپنا اندازہ بیان کیا تھا کہ آج دنیا میں جو دو ملک وجود میں آئے ہیں' ان میں سے ایک کا مستقبل بہت روشن ہے اور دوسرے کا بہت تاریک! پاکستان کا مستقبل بہت روشن ہے' اس لئے کہ یہ ایک قوم کا ملک ہے اور انہیں باہم جوڑنے والی ایک بہت بڑی قوت(Binding Force)مذہب کی طاقت موجود ہے لہٰذا ان کی یکجہتی اور ان کا اتحاد مثالی ہے - ان کے ہاں نہ کوئی نسلی امتیازات ہیں اور نہ کوئی علاقائی تعصبات! ایک مذہب ان کو جوڑے ہوئے ہے یعنی یہ سب ایک 'حبل اللہ' میں بندھے ہوئے ہیں - لہٰذا اس ملک کا مستقبل بہت روشن ہے - جبکہ بھارت کا مستقبل بڑا تاریک ہے کیونکہ اس ملک کو جمع رکھنے والی کوئی قوت موجود نہیں - یہاں بہت سی نسلیں آباد ہیں' بہت سی بولیاں ہیں' بہت سے کلچر ہیں' بہت سے تمدن ہیں - کوئی بھی ایسی شے جو ان سب کے مابین قدرِ مشترک ہو' وہ موجود نہیں -

" ٹائمز آف لنڈن " کا موجودہ ایڈیٹر اپنے پیش رو (Predecessor) کی یہ Assessment نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ اس وقت میں جو صورت حال دیکھ رہا ہوں وہ اس کے بالکل برعکس ہے - بھارت ایک بہت بڑی طاقت بن چکا ہے - وہ اپنے علاقے کی منی سپرپاور ہے - اس کے ہاں جمہوریت ہے' اس کے ہاں ابھی تک کسی خطے کی علیحدگی عمل میں نہیں آئی - اس کا ایک دستور ہے جس کی پٹڑی پر ریاست کی گاڑی رواں دواں ہے - اس کے برعکس پاکستان کی صورت حال ...... یہاں ٹائمز آف لنڈن کے ایڈیٹر کے الفاظ نقل کرنے کی ضرورت نہیں - یہاں تو وہی شعر صادق آتا ہے ؂

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ !

اُس وقت جس " روشن مستقبل " کے اندازے لگائے گئے تھے' وہ آج ہمارے تاریک حال کی صورت میں ہمارا مقدّر ہے -

پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی شکست وریخت

ایک اور بات جو آپ کو بری لگے گی' لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ چونکیں' وہ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان نظری اور نظریاتی سطح پر بھی ختم ہو چکا ہے اور زمنی اور واقعاتی

اعتبار سے بھی ختم ہو چکا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے وہ پاکستان آج موجود نہیں ہے جو ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا تھا۔ اس کو تو ہم حسرت سے کہتے ہیں :
پاکستان جو کبھی تھا! (Pakistan That Was!) اُس پاکستان کو بہت عرصے تک ہم بچا کھچا پاکستان (What Remains of Pakistan)، کہتے رہے'
————— پھر آہستہ آہستہ ہم نے اسی کو 'پاکستان' تسلیم کر لیا۔ نظریاتی سطح پر یہ ملک مسلم قومیت کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ لیکن وہ مسلم قومیت آج کہاں ہے؟ ع ڈھونڈ اب اس کو چراغ رخ زیبا لے کر!۔ اندرا گاندھی نے تو ۱۹۷۱ء میں یہ کہا تھا کہ "ہم نے دو قومی نظریئے کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے"۔ اور آج تو وہ نظریۂ پاکستان اس پاکستان میں بھی نہیں ملتا۔ کہاں ہے وہ نظریۂ پاکستان؟ اور کہاں ہے وہ مسلم قومیت؟ ع ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے! اب تو ہمارے زیڈ اے سلہری صاحب بھی مسلم قومیت پر لکھتے لکھتے تھک گئے ہیں اور اب اس کا نام نہیں لیتے۔ آخر کب تک لکھتے رہیں گے؟ ایک ہوائی اور خیالی بات کے اوپر کب تک طبع آزمائی ہوتی رہے گی؟ اب تو قومیتیں ہیں، عصبیتیں ہیں، جو لسانی بھی ہیں، نسلی بھی ہیں اور علاقائی بھی۔ مسلم قومیت تو ہباءً منثورًا اور نسیاً منسیاً ہو چکی!

ان دونوں حقائق کو سامنے رکھئے۔ آدمی حقائق کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور آنکھیں بند کر لینے میں عافیت سمجھتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پاکستان دونوں اعتبارات سے ختم ہو چکا ہے۔ اب اگر اللہ نے توفیق دی تو اس کا دوسری مرتبہ جنم (Re-Birth) ہوگا، انشاء اللہ! میری اس گفتگو میں وہ رخ بھی آئے گا لیکن اس وقت حال کا جائزہ لے لیجئے۔ حقائق سے صرفِ نظر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ملک کا دولخت ہونا، تاریخ کی عظیم ترین ہزیمتوں میں سے ایک کا ٹیکہ ہمارے ماتھے پر لگنا اور ہمارے ایک لاکھ کے لگ بھگ کڑیل جوانوں اور جرنیلوں کا اُن ہندوؤں کی قید میں چلے جانا جن پر ہم نے آٹھ سو برس تک حکومت کی تھی، انہی حقائق کے شواہد میں سے ہے! ان کے سینوں پر تو اس کا داغ اتنا گہرا ہے کہ وہ اسے ہزار سال کہتے ہیں۔ اندرا گاندھی نے کہا تھا :

"We have avenged our thousand years defeat"

(ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا ہے!)

دہلی میں اسلامی حکومت ۱۲۰۶ء میں قائم ہوئی تھی اور اس اعتبار سے مسلم حکمرانوں کا دور ساڑھے چھ سو برس پر محیط ہے۔ لیکن اگر محمد بن قاسم (رحمہ اللہ) کی آمدِ سندھ سے شمار کیا جائے تو یہ مدّت ہزار برس سے بھی زائد ہے۔ بہرحال انہوں نے اس کے اوسط کے اعتبار سے کہا کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا ہے۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اگر مذہب اور اخلاق کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہمارا دیوالہ نکل چکا ہے۔ اگر کوئی اس حد تک نہ جائے تو یہ مانے بغیر تو چارہ نہیں کہ جس جگہ ہم ۱۹۴۷ء میں تھے اس سے بہت پیچھے جا چکے ہیں۔ آج ہمارے ہاں جھوٹ' بد دیانتی' بے ایمانی اور بے حیائی کو جس درجے فروغ حاصل ہو چکا ہے اُس وقت اس کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ لوگ ہارس ٹریڈنگ کے نام تک سے واقف نہیں تھے۔ آج حالت یہ ہے کہ قوم کے قائدین برملا بک رہے ہیں۔ اور وہ قائدین جن کے ماتھے پر مذہب کا لیبل ہے' اگر ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دس لاکھ روپے لئے ہیں' تو انہیں بھی اس اعتراف میں کوئی پشیمانی محسوس نہیں ہوتی کہ ہاں' ہم نے لئے ہیں' اخراجات کے نام پر لئے ہیں' ہم بکے نہیں ہیں' ہم نے سودا کیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ایسی سودے بازی کا تصوّر مذہبی شخصیات کے لئے تو بہت دور کی بات ہے' کسی ملحد کے بارے میں بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

آج ہر اعتبار سے جائزہ لے لیجئے' نفاقِ باہمی اور نفاقِ کردار دونوں ہم پر پوری طرح مسلّط ہیں۔ ایک تو وہ کردار کا نفاق ہے جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا:

اٰيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا ائْتُمِنَ خَانَ۔ (متفق علیہ' عن ابی ہریرۃؓ)۔

"منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بولے جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور جب امین بنایا جائے خیانت کرے"۔

ہمارے ہاں جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی بڑا جھوٹا' اتنا ہی بڑا بے ایمان اور اتنا ہی بڑا خائن ہے۔ اور ہمارے ہاں اب یہ معروف کے درجے میں آ چکا ہے۔ اس میں کوئی شرم و حجاب نہیں رہا۔ نفاقِ کردار کے علاوہ ہم نفاقِ باہمی کی صورت میں بھی عذابِ خداوندی کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّ يُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ (الانعام: ٦٥)

"(اے نبیؐ، ان سے) کہہ دیجئے کہ وہ قادر ہے اس پر کہ بھیج دے تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے، یا تمہارے قدموں کے نیچے سے، یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے سے ٹکرا دے اور تم میں سے ایک کو دوسرے کی قوت کا مزہ چکھا دے!"۔

یعنی ایک دوسرے کے خنجر ایک دوسرے کے سینوں میں پیوست ہو جائیں۔ یہ بدترین عذاب ہے جس میں اللہ کو نہ اوپر سے کچھ نازل کرنے کی ضرورت ہے، نہ زمین کو پھاڑ کر کچھ نکالنے کی ضرورت ہے۔ آپس میں ہی لڑو، مرو! اور یہ کس جرم کی پاداش ہے؟ یہ میں بعد میں عرض کروں گا۔

جو حضرات بھی بین الاقوامی پریس سے کچھ ربط و تعلّق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ عالمی اخبارات میں پاکستان کے بارے میں کس طرح کے تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً: "Pakistan is at the verge of balkanization"

(پاکستان تو ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی بالکل سرحد پر پہنچ چکا ہے)۔

پروفیسر ژائرنگ یہاں کے اسٹاف کالج میں رہے ہیں۔ ان کا ایک جملہ ملاحظہ کریں، جس کی فصاحت و بلاغت پر تو داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ:

"Pakistan is still in the search of an Identity"

(پاکستان تو تاحال کسی تشخّص کی تلاش میں ہے) یعنی میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ کیوں ہوں؟ یہی نہیں معلوم! قومی سطح پر ہمارا کوئی وجودِ مصدّقہ ہے بھی یا نہیں؟ خود ہماری آنکھوں میں یا دنیا کی آنکھوں میں؟ یہ بات جان لیجئے کہ ایک نام سے کسی ملک کے باقی رہ جانے کو زندگی نہیں کہتے۔ آج کی دنیا میں صورت حال بدل چکی ہے۔ سپر پاورز کے ٹکراؤ اور تقابل کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور ملکوں کو بھی ایک تحفّظ ملا ہوا ہے۔ لیکن جس طرح بڑے بڑے درختوں کے نیچے اگنے والا جھاڑ جھنکار (Under Growth) کسی شمار میں نہیں ہوتا، ویسے ہی بڑی طاقتوں کے سایۂ عافیت میں پنپنے والے ملکوں کا وجود وجودِ مصدّقہ کہلانے کا حق نہیں رکھتا۔ ان کا وجود کوئی باوقار و باعزت وجود، واقعتاً خود اختیاری خود مختاری والا وجود، اپنے فیصلے خود اپنے ہاتھ میں رکھنے والا وجود، اپنی پالیسیاں خود بنانے والا وجود اور اپنی

معیشت کے ڈھانچے اور سانچے خود تیار کرنے والا وجود تو نہیں ہے - محض ایک نام سے کسی ایک ملک کا دنیا میں ہونا وجودِ مصدّقہ نہیں ہے ' کوئی "Authentic Personality" نہیں ہے -

---

جنگ کا خوف ــــ قومی سطح پر بزدلی کا مظہر

اب دوسری بات کی طرف آیئے - ہمارے زوال کی انتہائی ایک بہت بڑی نشانی یہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم انتہائی بزدل ہو چکے ہیں - آج ملکی اور قومی سطح پر کشمیر کے معاملے میں ہمارا اس بات پر اجماع (Consensus) ہے کہ "دیکھنا' کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ بھارت کو جنگ چھیڑنے کا موقع ملے" - یہ ہے ہمارے خوف کا عالم اور ہمارے لرزہ بر اندام ہونے کی کیفیت! ہماری حکومت اور حزبِ مخالف صرف دو چیزوں کے بارے میں اتفاقِ رائے رکھتی ہیں اور یہ دونوں انتہائی گراوٹ کی علامت ہیں - ان میں سے ایک چیز مسئلہ کشمیر کے بارے میں ان کا یہ مشترکہ موقف ہے - سندھ سے چند خواتین کی چیخ وپکار محمد بن قاسم کو یہاں لے آئی تھی لیکن آج سینکڑوں خواتین کی چیخیں یہاں پہنچ رہی ہیں اور ہم خوف کے مارے کچھ بھی نہیں کر سکتے! کیا ہندوستانی مسلمانوں نے اسی لئے اپنا خون دے کر ہمیں آزادی دلوائی تھی ؟ میں جب قیام پاکستان کے تینتیس برس بعد (۱۹۸۰ء میں) پہلی مرتبہ بھارت گیا ہوں تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ علی گڑھ کے مسلمانوں کی باتوں سے کس طرح میرا کلیجہ شق ہوا ہے - وہ لوگ کہتے تھے کہ ۱۹۷۱ء تک ہمارا یہ خیال تھا کہ پاکستان ہمارا محافظ ہے ' لیکن اب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان اپنی حفاظت ہی کر لے تو بڑی بات ہے - ہمیں اپنی حفاظت اب خود کرنی ہے ' اب ہم بھیڑ بکریوں کی طرح نہیں مریں گے ' بلکہ مار کر مریں گے -

بہرحال صورت حال اس وقت یہ ہے کہ "مجاہدِ اول" سے لے کر "مجاہدِ آخر" تک سب جنگ سے خائف ہیں - سب سے بڑھ کر جنگ سے گھبرانے والے خود مجاہدِ اول ہیں - ان کی ساری مجاہدانہ تقریریں ہباءً منثورًا اور نسیاً منسیاً ہو گئی ہیں اور اب ایک ہی بات کہہ رہے ہیں : "احتیاط ' احتیاط ' احتیاط ...!" - مجاہدِ آخر قاضی حسین احمد صاحب کا حال

یہ ہے کہ ایک ہی سانس میں دو باتیں کریں گے - جہاد و قتال کی بھی اور جنگ سے گریز کی بھی!
آزاد کشمیر کی حکومت کے تحت ہونے والی کشمیر کانفرنس میں انہوں نے قتال اور جنگ کی بات کر کے آخری بات یہ کہی کہ انہیں (کشمیریوں کو) کسی جنگی امداد کی ضرورت نہیں ہے' بس مالی امداد کی ضرورت ہے - یہ ہمارے سیاست دانوں کی ایک ضرورت ہے اور عہدِ حاضر کی ڈپلومیسی کا یہ تقاضا ہے کہ یہ عوام کی طرف رخ کریں گے تو جہاد اور قتال کی بات کریں گے اور حکومت پر تنقید کریں گے - لیکن حکومت کی طرف رخ کریں گے تو کہیں گے کہ ہم حکومت کی پالیسی سے بالکلیہ متفق ہیں - لیکن میں اس وقت حکومت یا حزب اختلاف کے حوالے سے بات نہیں کر رہا' بلکہ قومی سطح پر پھیلے ہوئے خوف کی تصویر کشی کر رہا ہوں - میری اپنی رائے بھی یہی ہے کہ واقعتاً حالات ایسے ہیں کہ حقیقت پسندی کا تقاضا یہی ہے!

ابھی پچھلے دنوں ہمارے ہاں (مرکزی انجمن خدام القرآن کے تحت) دعوتِ رجوع الی القرآن پر جو سہ روزہ سیمینار ہوا اس میں ایک ہندی عالمِ دین مولانا اخلاق حسین قاسمی یہ فرما گئے کہ "اپنے گھر کا فساد دُور نہیں ہوتا اور دوسروں سے جہاد کی باتیں کرتے ہو" - بتایئے اس سے زیادہ بلیغ جملہ کوئی ہو گا؟ کیا حال ہے کراچی اور حیدر آباد میں؟ محاذ آرائیاں بڑھتے بڑھتے اب باہمی قتل و غارت گری کی صورت اختیار کر گئی ہیں - پورے سندھ میں ایک لاوا ہے جو جوش مارنے کو بے قرار ہے - ہاں' اگر اس قوم میں یکجہتی ہوتی' اتحاد ہوتا' یہاں حقیقتاً لوگوں کی نمائندہ حکومت ہوتی جسے معلوم ہوتا کہ عوام ہمارے پیچھے ہیں تو پھر یقیناً اگر کوئی لیاقت علیؒ مکہ دکھاتا تو دنیا میں سمجھا جاتا کہ ہاں یہ مکہ واقعی کوئی مکہ ہے - لیکن اس وقت کے حالات یہ ہیں کہ خود اپنا گھر بدترین صورت حال سے دوچار ہے - میں کوئی سیاسی بات نہیں کر رہا' قومی سطح پر بات کر رہا ہوں - اس مسئلے میں رائے میری بھی یہی ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہیں ہونی چاہئے کہ ہندوستان کو جنگ کا جواز ملے - ہاں' اگر جنگ مسلّط ہو جائے تو پھر معاملہ بالکل اور ہو گا - دفاعی جنگ میں تو اللہ تعالیٰ کی نصرت ہر وقت شامل ہوتی ہے - اور ہمیں تو اپنے ایک ایک گھر کو مورچہ بنا کر لڑنا ہے -

جہاں تک حقیقت پسندی کا تعلق ہے تو اس حوالے سے ہمیں صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی فرق و تفاوت نظر آتا ہے - اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے بارے میں سورۃ الانفال

(آیت ٦٥) میں ارشاد فرمایا:

اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ ○

"یعنی اگر تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سو شخص ہوں تو وہ ہزار کافروں پر غالب آئیں گے - اس لئے کہ ان کے پاس علم نہیں، سمجھ نہیں، ایمان نہیں!" -

لیکن اس سے اگلی ہی آیت (٦٦) میں فرمادیا:

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰہِ

یعنی "اے مسلمانو! اب اللہ نے تم پر تخفیف کر دی ہے - اس کے علم میں ہے کہ اب تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو چکی ہے - پس اگر تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں ہزار ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے" - اس آیۂ مبارکہ میں کمزوری کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ "السّابقون الاوّلون" میں کمزوری پیدا ہو چکی تھی بلکہ جو نئے لوگ کثیر تعداد میں حلقۂ ایمان میں داخل ہوئے تھے ان کی اس درجے کی تربیت نہیں ہوئی تھی، لہٰذا اوسط گر گیا - اور اب کفّار کے مقابلے میں ایک اور دس کی نسبت کے بجائے ایک اور دو کی نسبت رہ گئی -

تو ان حقائق کے اعتبار سے صحیح بات وہی ہے - لیکن یہ ایک Index تو ہے کہ قومی سطح پر ہم اس وقت کہاں ہیں کہ اتحاد اور اتفاقِ رائے ہے تو اس مسئلے پر - بہت عرصے کے بعد ترستی ہوئی آنکھوں کو اتفاق کی کوئی بات نظر آئی تو وہ یہ ہے - اور اسی کے ساتھ ایک رخ اور بھی ہے جو ہماری دینی اور اخلاقی گراوٹ کا ثبوت ہے کہ ابھی تک ایک ہی شے ایسی ہے جس پر ہماری پارلیمنٹ میں حکومت اور حزبِ اختلاف کا اتفاق ہوا ہے - اور وہ یہ ہے کہ اسمبلیوں میں خواتین کی جو مخصوص نشستیں رکھی گئی تھیں، جن کی اب دستور میں مدّت ختم ہو رہی ہے، ان کو برقرار رکھا جائے - ہماری منافقت کا یہ حال ہے کہ ایک طرف عورت کی وزارتِ عظمیٰ کے خلاف تقریریں اور گفتگوئیں کرتے ہوئے منہ سے جھاگ نکلیں گے، لیکن دوسری طرف اسلام کی تعلیمات کے بالکل برعکس عورتوں کی

نشستوں کے معاملے میں اتفاقِ رائے ہوگا!

ہمارے قومی وجود کا عقدہ اور اس کا حل

ہم میں سے ہر شخص کو سوچنا چاہئے کہ آخر ان سب باتوں کا سبب کیا ہے؟ اگر ایک جملے میں اس کا سبب بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ ہمارے قومی وجود کا یہ ایک ایسا عقدہ (Dilemma) ہے جو اگرچہ لاینحل نہیں لیکن پیچیدہ ضرور ہے کہ ایک جانب ہم نے ایک ایسا ملک بنایا جس کی کوئی جڑ بنیاد اسلام کے سوا نہیں ہے - میری اس بات سے کسی کو اختلاف ہو بھی تو اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے استحکام کی کوئی بنیاد دین اور مذہب کے سوا نہیں ہے - اور دوسری طرف وہی دین و مذہب ہے جو یہاں ع : چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے! بظاہر تو یہ ایک عقدۂ لاینحل ہے' لیکن اس عقدے کا حل موجود ہے جو میں پیش کروں گا -

پاکستان کی اصل اساس

اب تک کی تشخیص جو ایک جملے میں ہوئی ہے یہ ذرا وضاحت طلب ہے - مجھے اس عقدے کے اس پہلو کا تذکرہ بھی کرنا ہوگا کہ پاکستان کس بنیاد پر وجود میں آیا تھا - اس لئے کہ اب اسے بھی مختلف فیہ مسئلہ بنا دیا گیا ہے - بانیانِ پاکستان میں سے جو بچے کھچے رہنما باقی ہیں' جو بڑوں کی موت کے بعد بڑے بن گئے ہیں' اگر وہ خود یہ کہیں کہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا تھا تو کچھ نہ کچھ پیچھے پلٹ کر دیکھنا پڑے گا کہ واقعہ کیا ہے؟ کبھی حسین شہید سہروردی صاحب نے یہ بات کہی تھی کہ : "پاکستان وجود میں آیا ہے محض معاشی مسئلے کی بنیاد پر!" - چلئے ان کی شخصیت تو متنازعہ فیہ (Controversial) لوگوں میں شمار ہوتی ہے لیکن جناب نور الامین کی شخصیت تو اختلافی نہیں رہی - وہ تو اوّل و آخر مسلم لیگی ہیں - انہوں نے بھی یہی کہا - 'اردو ڈائجسٹ' میں ان کا مفصل انٹرویو چھپا جس میں انہوں نے کہا کہ "اصل مسئلہ معاشی مسئلہ تھا!" - ابھی نظریۂ پاکستان کا سب سے بڑا محافظ (Custodian) تو پنجاب ہی ہے - اس کی اُس وقت کی بچی کھچی دو شخصیتیں ممتاز

دولتانہ صاحب اور شوکت حیات صاحب ہیں - دولتانہ صاحب نے کہا کہ "یہ خالص سیاسی مسئلہ تھا - اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا" - پھر جب اس پر کچھ گرفت ہوئی تو کچھ چکر انہوں نے کھائے، لیکن دلدل میں مزید پھنستے چلے گئے - اور شوکت حیات صاحب نے تو آخری بات کہہ دی کہ "یہ پاکستان کا مطلب کیالا الٰہ الا اللہ تو کچھ چھوکروں اور نوجوانوں کا لگایا ہوا نعرہ تھا، کوئی سنجیدہ بات نہیں تھی" - اب اگر نوجوان کنفیوژن میں ہوں اور انہیں پاکستان کی شناخت کے بارے میں اشکال ہوں تو الزام کسے دیا جائے ؟

اس مسئلے کے کچھ پہلو ایسے ہیں جو کنفیوژن، غلط فہمیوں یا فکری الجھاؤ کا سبب بنتے ہیں - لہٰذا ہم اس کا تھوڑا سا جائزہ لے لیتے ہیں - اصل میں اس مسئلے کی تین مختلف سطحیں (Levels) ہیں اور اسے اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ پانی، جو کہ از روئے قرآنی حیات کا مبدأ ہے، روئے ارضی پر تین سطحوں میں پایا جاتا ہے... (۱) سطح زمین پر دریاؤں، نہروں، ندیوں اور چشموں کی صورت میں بہہ رہا ہے - (۲) زیر زمین کم گہرائی میں بھی دستیاب ہے، جسے نلکوں اور کنوؤں وغیرہ سے حاصل کیا جاتا ہے - (۳) زیر زمین زیادہ گہرائی میں یعنی چار پانچ سو فٹ نیچے نہایت صاف شفاف پانی ہوتا ہے اور آج کل پینے کے لئے اسے ہی صحیح تر سمجھا جاتا ہے - پانی کی اس مثال سے اس مسئلے کی تین سطحیں بھی بالکل واضح ہو جاتی ہیں -

اس کی پہلی سطح بالکل دیوار پر لکھی گئی حقیقت (Writing on the Wall) کی مانند ہے اور وہ یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے - کوئی دولتانہ اور کوئی شوکت حیات اس کا انکار نہیں کر سکتا - پوری دنیا مانتی ہے کہ مذہب کے نام پر صرف دو ملک بنے ہیں...... ایک پاکستان اور دوسرا اسرائیل! اسرائیل کے بارے میں یہ بات غلط ہے، پاکستان کے بارے میں صحیح ہے!

لیکن اس سطح سے ذرا نیچے اتریں تو یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تحریک پاکستان کا اصل جذبہ محرکہ (Real Motivating Force) کیا تھا؟ کیا وہ مذہبی جذبہ تھا یا کوئی اور ؟ میرے نزدیک یہاں اختلاف کی گنجائش ہے اور میری اپنی رائے یہ ہے کہ وہ مذہبی جذبہ نہیں تھا - میرے پاس اس کی دو اور دو چار کی مانند دلیل یہ ہے کہ اگر مذہبی جذبہ ہوتا تو

تحریک پاکستان کی قیادت مذہبی لوگوں پر مشتمل ہوتی کیونکہ کسی تحریک کا جو اصل جذبہ ہوتا ہے سب سے گاڑھی صورت میں اس کی قیادت میں نظر آتا ہے - لیکن تحریک پاکستان کی قیادت مذہبی لوگوں پر مشتمل نہیں تھی - مذہبی لوگ معاونین تھے' چاہے وہ علماء کرام ہوں یا مشائخ و صوفیاء عظام ہوں' وہ قائدین نہیں تھے - پھر وہ کون سا جذبہ تھا جو اس تحریک کی بنیاد بنا؟ اسے صرف 'سیاسی' قرار دیا جانا بھی غلط ہے اور صرف 'معاشی' قرار دیا جانا بھی غلط ہے - میری رائے میں یہ ایک قومی مسئلہ تھا اور تحریک پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ قومی تھا - ایک چھوٹی قوم کو ایک بڑی قوم سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ بڑی قوم معاشی طور پر بھی ہمارا استحصال کرے گی' سماجی طور پر بھی ہمیں دبا دے گی اور تمدنی سطح پر بھی ہماری شناخت اور ہمارا تشخص ختم کر دے گی - اس کے علاوہ قومی سطح پر ہی ہمیں یہ خوف اور اندیشہ بھی لاحق تھا کہ جب اقتدار و اختیار اس قوم کے ہاتھ میں ہو گا تو یہ ہم سے اپنی کئی صدیوں کی محکومی کا انتقام لے گی -

اب مزید نیچے اتریں کہ جس قوم کو یہ خطرہ لاحق تھا اس کی قومیت کی بنیاد کیا تھی ؟ کیا وہ ایک مشترک نسل کی بنیاد پر ایک قوم تھی ؟ یا ایک زبان بولنے کی وجہ سے ایک قوم تھی ؟ قومیت کی جتنی بنیادیں بھی ہو سکتی ہیں' یہاں ان سب کی نفی ہو جائے گی - وہ ایک قوم تھی تو صرف اور صرف مذہب کی بنیاد پر! کسی پٹھان یا بلوچی عورت کے لباس اور مشرقی پاکستان کی کسی مسلم خاتون کے لباس میں زمین و آسمان کا فرق ہے - اسی طرح کھانے پینے کی عادات (Eating Habits) کس قدر مختلف ہیں - ایک بنگالی مسلمان انتہائی رغبت سے چاولوں کے ساتھ جس طرح کی مچھلی کھاتا ہے ہم میں سے اکثر اسے کھانا تو درکنار' دیکھ بھی نہیں سکتے! تو یہ پورے ہندوستان کے مسلمان کسی زبان' نسل یا کسی کلچر کی بنیاد پر قوم نہیں تھے - یہ قوم تھے تو مذہب کی بنیاد پر تھے! تو زیر زمین گہرائی سے جو سب سے صاف پانی نکلا وہ بھی مذہب ہی کا ہے - چنانچہ آخری تجزیئے (Final Analysis) کی بنیاد پر کوئی جڑ اور بنیاد اس ملک کی نہیں ہے سوائے اسلام کے! لیکن چلئے فی الحال اسے ہم مستقبل کے مؤرخ پر چھوڑ دیتے ہیں' اگرچہ اُس وقت کے اعتبار سے تو ہم بھی مستقبل میں بیٹھے ہیں' پھر بھی اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا اِس وقت اس کے استحکام کی کوئی بنیاد ہے ؟

استحکام پاکستان کی ٹھوس بنیاد

کسی بھی اجتماعیت کی شیرازہ بندی کے لئے کوئی قدرِ مشترک درکار ہوتی ہے - ابنِ خلدون نے اس کے لئے ایک لفظ "عصبیت" استعمال کیا ہے کہ کسی قوم یا کسی ملک کی قوت کا دارومدار کسی عصبیت پر ہوتا ہے - مثلاً نسلی عصبیت یا لسانی عصبیت وغیرہ - اس عصبیت کو ہم لوگ برا لفظ سمجھتے ہیں' حالانکہ فی الاصل برائی کا مفہوم اس لفظ میں شامل نہیں ہے - جو شے بری ہے وہ 'عصبیت جاہلیؔ' ہے - حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا تھا کہ ہمارے ابا جان حضرت یعقوبؑ نہ جانے کیوں محبت کرتے ہیں یوسف اور بنیامین سے' حالانکہ "وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ" ہم ایک گروہ ہیں' طاقت ہیں' دس کڑیل جوان ہیں - تو 'عُصبہ' سے 'عصبیت' بنا ہے - یعنی کسی اجتماعیت کو جوڑنے والی کوئی شے عصبیت کہلاتی ہے - اجتماعیت کی شیرازہ بندی کرنے والی کوئی عصبیت ہوگی تو اجتماعیت مضبوط ہوگی' ورنہ شیرازہ منتشر ہوگا - اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارے پاس کونسی عصبیت ہے جو ہمیں مجتمع رکھ سکے!

تاریخی تقدس

ملکوں اور قوموں کے استحکام کے لئے جو چیزیں بنیاد بن سکتی ہیں وہ میں یہاں ایک ایک کر کے بیان کرتا ہوا - آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی شے ہمارے پاس نہیں ہے - پہلی چیز ہوتی ہے تاریخی تقدّس (Historical Sanctity) کسی ملک کے نام کو تاریخی تقدس حاصل ہو جائے تو اس کا نام نہیں بدلا کرتا - چین کا بہت بڑا رقبہ جاپان کے زیرِ تسلّط رہا لیکن چین چین رہا اور جاپان جاپان - یہی کہا گیا کہ جاپان نے چین کے اتنے رقبے پر قبضہ کر لیا - یہ تقدّس ہمیں حاصل نہیں - پچاس برس پہلے پاکستان کے نام سے کوئی ملک دنیا میں موجود نہیں تھا - اور اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ جب مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہوئی تو ہمارے بنگالی بھائیوں نے پاکستان کا لیبل اٹھا کر خلیج بنگال میں پھینک دیا' اس لئے کہ ان کے نزدیک اس نام کی کوئی قدر و قیمت تھی ہی نہیں - ورنہ اگر دو بھائی مشترکہ طور پر کوئی چھوٹی سی دکان بھی کریں تو اس کا جو نام رکھتے ہیں اس نام کی کوئی قیمت 'کوئی Goodwill ہوتی ہے اگر وہ علیحدہ ہوں تو اس نام کی قیمت الگ سے مقرر کی جاتی ہے - لیکن پاکستان کے نام کی

اتنی قیمت بھی ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں نے نہیں سمجھی - حالانکہ دو کوریا آج تک موجود ہیں' دو یمن ہیں' دو جرمنی ہیں تو کیا دو پاکستان نہیں ہو سکتے تھے؟ اور ایک نام والے دو سرے ممالک تو ملحق بھی ہیں جبکہ ہمارے درمیان تو ہزار میل کا فاصلہ بھی تھا - یہ درحقیقت اس بات کا ثبوت ہے کہ ابھی اس نام کی کوئی قدر و قیمت یا Good will نہیں ہے' تاریخی تقدّس (Historical Sanctity) تو بڑا بھاری لفظ ہے -

جغرافیائی عامل

اس ضمن میں دوسرا اہم Factor ہوتا ہے جغرافیائی سرحدوں کی قدرتی تقسیم - بعض ممالک بڑے دریاؤں یا پہاڑوں کی صورت میں قدرتی سرحدوں کے حامل ہوتے ہیں جو انہیں حفاظت فراہم کرتی ہیں - لیکن ہمارا حال کیا ہے؟ مشرقی اور مغربی خطوں پر مشتمل پاکستان تو تاریخ کا ایک عجوبہ تھا' جس کے دونوں خطے ایک ہزار میل کے فاصلے پر تھے اور درمیان میں بہت بڑا دشمن ملک اور اُس غریب مشرقی پاکستان کا حال تو یہ تھا کہ تین اطراف سے اس دشمن ملک میں اس طرح گھرا ہوا تھا کہ کہیں کوئی قدرتی رکاوٹ (Natural Barier) نہیں - دھان کے کھیت اس طرح چلے گئے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہاں ایک ملک ختم ہو رہا ہے اور دوسرا شروع ہو رہا ہے - اور اُس وقت تک تو خاردار باڑ بھی نہیں تھی - بہرحال اب بھی جو ہمارا اصل دشمن ہے جس نے ہمارے وجود کو ذہناً تسلیم نہیں کیا اور اس کے صحافی یہاں آکر کہہ جاتے ہیں کہ ہم نے پاکستان کو تسلیم کیا ہے' دو قومی نظریئے کو تسلیم نہیں کیا' اس ملک کے ساتھ ہماری کوئی قدرتی سرحد نہیں ہے - گویا نہ تاریخ ہماری پشت پر ہے نہ جغرافیہ!!

قومی جذبہ

تیسری چیز جو کسی ملک کے استحکام کی بنیاد بن سکتی ہے وہ ہوتی ہے قومی عصبیت - واقعہ یہ ہے کہ کوئی مضبوط قوم پرستانہ جذبہ ہو تو وہ تاریخ سے بھی لڑ جاتا ہے اور جغرافیئے کو بھی شکست دے دیتا ہے - قائداعظم سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ پاکستان بنانا چاہتے ہیں' ذرا یہاں کے جغرافیئے کو تو دیکھئے! تو اس کے جواب میں انہوں نے یہ تاریخی جملہ کہا

"Some people are talking about some Geographical difficulties in the way of Pakistan May I ask them by what rule of Geography are they here!"

یعنی میں ان برطانویوں سے پوچھتا ہوں کہ وہ جغرافیئے کے کس اصول کے تحت سات سمندر پار سے آکر یہاں حکومت کر گئے ہیں؟ بہرحال کوئی قومی جذبہ اگر واقعتاً موجود ہو تو وہ جغرافیئے کو بھی شکست دے دیتا ہے اور تاریخ کے دھارے کا رخ بھی بدل دیتا ہے -

قوم پرستی کی اقسام

۱- نسلی قومیّت

قومیت کے لئے جو چیز بنیاد بن سکتی ہے وہ نسل بھی ہو سکتی ہے اور زبان بھی! نسلی قومیت کا جذبہ آج بھی بڑا مؤثر جذبہ ہے - جرمن قوم کہتی ہے "We are a Superior Race" (ہم ایک اعلیٰ نسل ہیں!) اور یہ بات ان کے ایک ایک بچے کے ذہن میں پروان چڑھی ہوئی ہے - یہودی کہتے ہیں:

"We are the chosen people of the Lord" (ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے اور لاڈلے ہیں) - قرآن حکیم نے ان کے الفاظ نقل کئے ہیں "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ"

درحقیقت اسرائیل نسل کی بنیاد پر بننے والا ملک ہے 'مذہب کی بنیاد پر نہیں - مذہبی یہودی تو اس کی پشت پر تھے ہی نہیں - آج بھی امریکہ میں جو مذہبی یہودی ہیں وہ پرو اسرائیل نہیں ہیں - یہ صیہونی تحریک (Zionist Movement) ایک نسلی تحریک تھی - آج بھی دنیا میں قومیت کے لئے سب سے بڑی بنیاد نسل ہے 'جو ہمارے پاس نہیں ہے - پاکستان تو نسلوں کی 'کھچڑی' بلکہ صحیح تر الفاظ میں 'حلیم' ہے - اس میں سامی النسل قومیں مثلاً قریشی 'سید 'علوی 'صدیقی 'عثمانی 'فاروقی بھی ہیں - پھر یہاں بلوچستان میں دراوڑی نسل بھی آباد ہے - ان کے علاوہ آریائی ہیں 'جن میں جاٹ 'راجپوت اور شیخ وغیرہ ہیں جو ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں - اور پھر مغل نسل میں سے ترک اور خلجی وغیرہ ہیں - چنانچہ نسلی قومیت ہمیں استحکام کی کوئی بنیاد فراہم نہیں کر سکتی -

۲- لسانی قومیت

قومی عصبیت کے لئے لسانی قومیت بھی ایک مضبوط بنیاد فراہم کر سکتی ہے - جیسے عرب قومیت کی بنیاد درحقیقت عربی زبان ہے - اور اس میں اتنی قوت تھی کہ اس کے بل پر صدر ناصر نے انگریزوں کو اٹھا کر بحیرۂ روم میں پھینکا تھا - اسی کی بنیاد پر الجزائر نے فرانس سے نجات حاصل کی تھی - لیکن ہمارے ہاں کسی زبان کے ساتھ بھی وہ عصبیت موجود نہیں ہے - ایک وقت میں تحریک پاکستان کے دوران اردو کو یہ حیثیت حاصل ہوگئی تھی' اس لئے کہ اُس وقت مقابلہ ہندو کی زبان ہندی سے تھا - جسے کہا گیا ع "یا بحث میں اردو ہندی ہے 'یا قربانی یا جھٹکا ہے!'" لیکن جب ہم آزاد ہوئے تو اردو کی وہ حیثیت نہیں رہی - آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں پہلی تقسیم زبان ہی کی بنیاد پر ہوئی ہے "بنگلہ بھاشا" (بنگالی زبان) ہی نے بنگلہ قومیت کے لئے بنیاد فراہم کی اور بالآخر بنگلہ دیش کو جنم دیا - پھر یہ پاکستان بھی ابھی تک اردو کو اپنی قومی زبان کی حیثیت سے اختیار نہیں کر سکا - اب بھی کم از کم ایک زبان ایسی ہے جو اردو کی برتری کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں - ہمارے سندھی بھائیوں کا یہ دعوٰی بے بنیاد نہیں ہے کہ اردو کل کی چھوکری ہے' تین چار سو برس پہلے اس کا وجود تک نہیں تھا - جبکہ سندھی زبان بڑی قدیم زبان ہے - قرآن مجید کی پہلی تفسیر اسی زبان میں لکھی گئی - کاش کہ ہمارے رہنماؤں کو عقل ہوتی اور پاکستان بننے کے فوراً بعد یہاں کی سرکاری زبان کے لئے عربی کے حق میں فیصلہ ہو جاتا تو یہاں نہ بنگلہ بھاشا کے لئے عصبیت ابھرتی اور نہ سندھی کے لئے! اس پر سب سے زیادہ زور خود سندھیوں نے لگایا تھا کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی کو بنایا جائے - میں جب داؤد گیا تھا تو مجھے ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں لکھی ہوئی ایک باقاعدہ کتاب ملی تھی جو اس کے حق میں تھی کہ عربی زبان کو سرکاری زبان بنایا جائے - اگر ایسا کر لیا جاتا تو اب تک ہماری دو نسلیں عربی سیکھ چکی ہوتیں اور ہم عرب دنیا کا حصہ بن چکے ہوتے - اُس وقت بہت سے اور لوگ بھی یہ کہنے والے تھے - مثلاً سر آغا خاں نے یہ بات کہی تھی' پھر زاہد حسین مرحوم نے یہ بات کہی - لیکن ہماری جذباتیت نے حقائق کو دیکھنے سے گریز کیا - بہر حال اس وقت میری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ پاکستان کو جوڑنے والی کوئی لسانی عصبیت موجود نہیں ہے' کاٹنے والی بہتیری ہیں!

۲- وطنی قومیت

اسی طرح وطنی عصبیت بھی ایک مؤثر عنصر ہے اور یہ آج کی دنیا کی سب سے معروف شے ہے - یعنی ایک ملک میں رہنے والے بلالحاظِ مذہب و نسل و زبان ایک قوم ہیں - لیکن میری بات کان کھول کر سن لیجئے کہ پاکستانی قومیت ہمارے پاسپورٹوں پر لکھنے کے لئے تو ہے ' لیکن حقیقت میں پاکستانی قومیت کا وجود نہ آج تک ہوا ہے ' نہ قیامت تک ہو گا - کیونکہ ہم نے وطنی قومیت کی کامل نفی پر ہی تو یہ ملک بنایا تھا - آخر کانگرس کے ساتھ ہمارا جھگڑا کیا تھا؟ ایک قومی اور دو قومی نظریہ تھا کیا؟

یہ تو کانگرس کا موقف تھا کہ ہندوستان کے رہنے والے ایک 'ہندوستانی قوم' (Indian Nation) ہیں ' خواہ وہ ہندو ہوں ' مسلم ہوں ' سکھ ہوں یا پارسی ہوں - ہم نے وطنی قومیت کے اس تصور کی نفی کی - قائداعظم کے الفاظ ہیں کہ ہم قومیت کے ہر معیار و تصور کے مطابق ایک علیحدہ قوم ہیں - ہماری قومیت کی بنیاد ہمارا مذہب اور ہماری ثقافت ہے - اور مصورِ پاکستان علامہ اقبال نے تو اس ضمن میں وہ بات کہی ہے کہ جو ؎

"عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اٹھا !"

کا مصداق ہے ' فرماتے ہیں - ؎

اِس دور میں مے اور ہے جام اور ہے ' جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مسلمان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے اس میں زمین کی عظمت اور تقدس کا کوئی حصہ ہے ہی نہیں - مسلمان کے خمیر میں آفاقیت ہے - اور خاص طور پر برعظیم پاک و ہند کے مسلمان نے تو اپنے دکھ پر کبھی آنسو نہیں بہائے - وہ ہمیشہ باہر کے مسلمانوں کے دکھ پر رویا

ہے - وہ دکھ طرابلس کے مسلمان کا ہو یا ترکی کے مسلمان کا! حمید الدین فراہیؒ رو رہے ہیں کہ - کیف القرار و قد نکس اعلامنا بطرابلس

(کیسے قرار آئے کہ ہمارے جھنڈے طرابلس میں سرنگوں ہو گئے ہیں!)

جنگِ طرابلس میں ایک بچی فاطمہ کی شہادت پر اس برِّ عظیم کا "برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز" خون کے آنسو روتا ہے - حضورِ رسالت مآبؐ میں حاضری پر عرض کرتا ہے -

"مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں"

خلافت کی تحریک دنیا کے کسی اور گوشے میں نہیں چلی' صرف ہندوستان میں چلی! کیا وہ ہندوستان کا مسئلہ تھا؟

بہرحال اس ملک میں پاکستانی نیشنل ازم بھی کسی صورت کامیاب نہیں ہو سکتا - جو کوئی اس پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں کان کھول کر سن لیں کہ اس کے لئے کوئی جڑ بنیاد ہے ہی نہیں - اگر آپ نے علاقہ اور زمین کو تقدس دیا تو ایک سندھی کے لئے سندھ ایک زیادہ بڑی حقیقت ہے - وہ جب کہتا ہے "مونجھو سندھڑی" (میرا پیارا سندھ) تو اس کے ایک ایک حرف میں اس کے تمام تر جذبات و احساسات اور قلبی کیفیات کی عکاسی ہوتی ہے - سندھ کے ساتھ اس کا زبان کے علاوہ تاریخ و ثقافت کا بھی اشتراک ہے - چنانچہ وطنی قومیت بھی ہمارے ملکی و قومی استحکام کی بنیاد نہیں بن سکتی' بلکہ یہ اس کے مخالف جاتی ہے - معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کا وہ شعر کسی اور مسلمان ملک پر راست آتا ہو یا نہ آتا ہو' ہم پر سو فیصد راست آتا ہے کہ -

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ !

استحکامِ پاکستان کی واحد بنیاد ـــــ اسلام

ہمارے پاس صرف اور صرف ایک ہی چیز ہے جو اس ملک کے استحکام کی بنیاد بن سکتی ہے۔ اور وہ ہے مذہبی جذبہ۔ یہ مذہبی جذبہ ہی پاکستان کو وجود میں لایا تھا اور یہی ہے جو اس کو مستحکم کر سکتا ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ اجتماعیاتِ انسانی (Human Sociology) کا کوئی طالب علم مجھے بتائے کہ اِن جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ "پاکستان" کے نام سے یہ جو خطّۂ ارضی ہے' کیا کوئی اور جذبہ ایسا ہو سکتا ہے جو اس کو جوڑ کر رکھے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس کی ولدیت اسلام ہے۔ جیسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اپنا نام بتایا کرتے تھے: 'سلمان ابن اسلام' اسی طرح یہ ملک پاکستان ابن اسلام ہے۔

مذہبی جذبے کے بارے میں البتہ یہ بات نوٹ کیجئے کہ یہ جذبہ دو قسم کا ہے۔ وہ مذہبی جذبہ جو پاکستان کو وجود میں لایا اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس مذہبی جذبے سے مختلف تھا جو آج ہمیں درکار ہے۔ اُس مذہبی جذبے میں صرف نام کا اسلام بھی کافی تھا۔ عمل میں اسلام ہو یا نہ ہو اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ کوئی شخص کتنا ہی بے عمل ہو' بے نمازی ہو' زانی ہو' شرابی ہو' شراب کا ٹھیکیدار کیوں نہ ہو' اس کے لئے دعوتِ عام تھی "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!" بس نام ہونا چاہیے عبد الرحمٰن یا غلام علی' اس کے کردار سے کوئی بحث نہیں' اس لئے کہ مقابلہ ہندو سے تھا۔ لیکن اب وہ معاملہ نہیں چل سکتا کیونکہ وہ ہندو تو اب سرحد کے اُس پار ہے۔ وہاں سے تو ہوا کے دوش پر محبت کے زمزمے آتے ہیں۔ ٹی وی' ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے ہم سے دوستی کا دم بھرا جاتا ہے۔ وہاں سے ہر قماش کے طائفے...... طوائفوں سمیت...... چلے آتے ہیں اور آج کے نوجوان مسلم کو اس دامِ فریب سے روکنے والی کونسی چیز ہے؟ تحریک پاکستان کے مذہبی جذبے کا محرک تو ایک ردِّ عمل تھا۔ ع "مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے" کے مصداق ہندو کی متعصب ذہنیت نے ہمیں محسوس کرا دیا تھا کہ ہم اور ہیں' وہ اور ہے۔ لیکن وہ جذبہ جو اُس وقت کام دے گیا اب نہیں دے سکتا۔ اب تو حقیقی' واقعی اور عملی اسلام درکار ہے' جسے لوگ پہچانیں کہ یہ اسلام ہے۔ اور وہ ان کے اندر سے جذبۂ ایثار' جذبۂ قربانی اور جذبہ جہاد کو ابھارے۔ یہ جذبے حقیقت کی بنیاد پر ابھرا کرتے ہیں، نعروں کی بنیاد پر نہیں!

پاکستانی معاشرے کا جائزہ اسلام اور ایمان کے حوالے سے

اب ذرا اس اعتبار سے اپنے معاشرے کا جائزہ لیجئے - میں یہ جائزہ دو اعتبارات سے لوں گا (۱) اسلام کے ساتھ عملی تعلق کے اعتبار سے اور (۲) اسلام کی جڑ بنیاد' ایمان' کے حوالے سے! میں اپنا مشاہدہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں - ممکن ہے کہ آپ میں سے کسی کو اس سے اتفاق نہ ہو - اس کے لئے میں چار ہم مرکز دائروں (Concentric Circles) کی مثال دیا کرتا ہوں - ایک ہی نقطے کے گرد گھومنے والے یہ دائرے مختلف قطر کے حامل ہیں...... ایک چھوٹا دائرہ' پھر ذرا بڑا دائرہ' پھر اس سے بڑا اور پھر بہت بڑا دائرہ - میرے نزدیک ہماری آبادی کا پچاسی فیصد حصہ اس بڑے دائرے میں ہے' جبکہ بقیہ تینوں دائروں میں پندرہ فیصد - ان میں سے بھی دوسرے میں آٹھ فیصد' تیسرے میں پانچ فیصد اور آخری میں دو فیصد سے زائد نہیں - یہ میرا اندازہ ہے - اس تقسیم میں آپ ہندسی اعتبار سے (Numerically) تھوڑا بہت اِدھر سے اُدھر جا سکتے ہیں - سب سے بڑا دائرہ جو ہماری آبادی کے پچاسی فیصد حصے پر محیط ہے' اس کے بارے میں آپ کو یہ ناخوشگوار حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ اس کا اسلام سے عملاً کوئی تعلق نہیں ہے - اس لئے کہ عملی تعلق کو جانچنے کے لئے ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیمانہ عطا فرمایا ہے - آپ نے ارشاد فرمایا :

بَیْنَ الْکُفْرِ وَالْاِیْمَانِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ

کفر اور ایمان کے مابین حد فاصل نماز ہی تو ہے -

آپ اس پیمانے کو ہاتھ میں لے کر ذرا جائزہ لیجئے کہ ہماری آبادی کے کتنے فیصد لوگ نماز پنجگانہ کے پابند ہیں - اس پیمانے پر عوام کو بھی پرکھئے اور خواص کو بھی' گلبرگ اور ماڈل ٹاؤن کے مکینوں کو بھی اور جھگیوں اور فٹ پاتھ پر رہنے والوں کو بھی' بڑے بڑے جاگیرداروں کو بھی اور غریب کسانوں کو بھی ------ آپ کو نسبت و تناسب میں کچھ فرق نظر نہ آئے گا! لے دے کر آپ کو عیدین کی نماز کا کچھ اہتمام نظر آ جائے گا' یا پھر مُردے کی تجہیز و تکفین اور شادی کے موقع پر نکاح وغیرہ جیسی سماجی رسومات (Social Customs) مسلمانوں جیسی مل جائیں گی - لیکن دین کے ساتھ عملی تعلق کا اصل معیار تو نماز پنجگانہ

ہے۔ اس معیار پر آپ کی آبادی کا پچاسی فیصد حصہ پورا نہیں اترتا۔

اس بڑے دائرے کو چھوڑ کر آپ اندر کے دائروں کی طرف آئیں تو زیادہ سے زیادہ پندرہ فیصد لوگ وہ ہوں گے جو نماز پنجگانہ کے پابند ہیں۔ پھر ان میں سے بھی آٹھ فیصد لوگ وہ ہیں جن کا تصوّرِ اسلام محدود (Limited) بھی ہے اور مسخ شدہ (Perverted) بھی! محدود اس معنی میں کہ نماز روزے سے آگے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ اور مسخ شدہ اس معنی میں کہ ان کے ہاں بلیک مارکیٹنگ بھی ہے' سودی کاروبار بھی ہے' جوا اور سٹہ بھی ہے، Forward Trading بھی ہے' اور جھوٹے اور غلط حسابات بھی ہیں ——— اور اس سب کے ساتھ ساتھ مساجد کی تعمیر بھی ہے' مدارس کے لئے عطیات بھی ہیں اور علماء کی خدمت بھی ہے۔ ان کے نزدیک مذہب صرف بعض علامات (Symbols) اور رسومات (Rituals) کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور اس کا کوئی تعلق نہ انسان کی انفرادی سیرت و کردار سے رہ گیا ہے نہ قومی و ملی امور اور اجتماعی معاملات سے۔ دین کا یہ تصور محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!

اس دوسرے دائرے کے اندر ایک تیسرا چھوٹا دائرہ ہے جو اُن لوگوں پر مشتمل ہے جن کا تصورِ دین و مذہب خاصا وسیع ہے اور وہ جانتے ہیں کہ دینِ اسلام انسان کی پوری زندگی کو اپنے احاطہ میں لینا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں احیائے اسلام کی آرزو اور اقامتِ دین کی تمنّا بھی موجود ہے ——— لیکن اس طبقے کی ایک بڑی اکثریت اس کے لئے خود کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اس راہ میں جدّوجہد کرنے والوں کے لئے زبان سے تائید و تحسین کے چند جملے تو ادا کر دیں گے' لیکن خود کسی ایثار و قربانی یا محنت و کوشش کے لئے آمادہ نہ ہوں گے۔

ان تینوں دائروں کے اندر ایک نہایت چھوٹا سا دائرہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں مذہب کے لئے سرگرم کار (Religious Activists) لوگوں کا حلقہ کہا جا سکتا ہے' جس میں ہماری کل آبادی کی ایک یا دو فیصد سے زیادہ تعداد شامل نہیں ہے۔ تو یہ ہے میرے نزدیک اسلام کے ساتھ ہمارے عملی تعلق کا ایک جائزہ!

اب ایمان کے اعتبار سے بھی جائزہ لے لیں۔ اس اعتبار سے میں دو حصے کروں گا۔

۱-عوام کا ایمان ۲-خواص کا ایمان- عوام کے ایمان کی حیثیت محض ایک "DOGMA" کی ہے- بس ایک عقیدے کی پوٹلی دماغ کے کسی کونے میں رکھی ہوئی ہے جو عمل پر اثر انداز نہیں ہوتی- ان کی حقیقی اقدار یعنی ان کے نزدیک زندگی میں کیا چیز اہم ہے اور کیا اہم نہیں ہے' اس کا کوئی تعلق اس ایمان کے ساتھ نہیں ہے- جبکہ خواص کا معاملہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں میں جو مذہبی لوگ ہیں ان کی اکثریت علماءِ سُوء پر مشتمل ہے- اگر ایسا نہ ہوتا تو دین کا حُلیہ اس طرح نہ بگڑتا- ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان کے نزدیک اصل شے پیسہ ہی ہے- ان کے ہاں بھی وہی تنخواہوں کے چکر ہیں' وہی جائیدادیں بنانے کی فکر ہے- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ

لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ

اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ نہیں بچے گا اور قرآن میں سے اس کے حروف کے سوا کچھ نہیں بچے گا-

وَعُلَمَاؤُهُمْ اَشَرُّ النَّاسِ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ

اور ان کے علماء (کا حال یہ ہوگا کہ وہ) آسمان کی چھت کے نیچے کے بدترین انسان ہوں گے-

ہمارے علماء کی اکثریت کا آج یہی حال ہے-

دوسری طرف ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ الحاد و مادہ پرستی کا شکار ہے اور اپنے دین سے بالکل بے بہرہ اور برگشتہ ہے- اس کی سب سے بڑی وجہ ہمارا نظام تعلیم ہے- ہماری کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمیں انگریز کی غلامی سے نجات ملے ہوئے نصف صدی ہونے کو ہے' لیکن ہم نے ابھی تک اپنے سابقہ آقاؤں کا دیا ہوا نظام تعلیم سینے سے لگا رکھا ہے- بہت عظیم ہیں وہ لوگ جو اس نظام تعلیم سے گزر کر بھی اپنے ایمان و اسلام کی پونجی سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتے- مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا ایک بڑا بلیغ جملہ ہے کہ "جو شخص اس نظام تعلیم سے گزر کر بھی مسلمان رہ جائے' اس کا معاملہ دو حالتوں سے خالی نہیں رہ سکتا- یا تو وہ بالکل کودن ہے اور یا مادر زاد ولی ہے"- یعنی یا تو اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں نے پڑھا کیا ہے' اور یا وہ مادر زاد ولی تھا جو اس پر کوئی شے اثر کر ہی نہیں سکی- البتہ سائنس کے

لالب علم اس کے مہلک اثرات سے پھر بھی کسی حد تک بچ جاتے ہیں' اور خود میں بھی سی لئے محفوظ رہا' کیونکہ سائنس میں مذہب کے ساتھ زیادہ تصادم نہیں ہے- مذہب سے ضادم ہوتا ہے ادب میں' کلچر میں ' سوشیالوجی میں ' پولیٹکل سائنس میں ' فلاسفی میں ' سائیکالوجی میں اور تاریخ میں - یہ مضامین مذہب کے سامنے چیلنج پیش کرتے ہیں اور ہمارے نظام تعلیم میں ان کے چیلنج کا کوئی جواب شامل نہیں ہے- چنانچہ طلبہ کی اکثریت س سے گمراہ ہو جاتی ہے-

---

تصویر کا روشن رُخ

میں نے اب تک جو بات آپ کے سامنے رکھی ہے' اس کا نتیجہ کیا نکلا کہ بڑی تاریکی ہے' بہت اندھیرا ہے' بلکہ تاریکی ہی تاریکی ہے "ظلمات بعضھا فوق بعض" کا عالم ہے- البتہ اس سب کے باوجود ایک روشن پہلو بھی ہے' جو ہمیں امید کا دامن تھامے رکھنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے- اسے ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ "مشیتِ ایزدی ہے"-

اسلام کا عالمی غلبہ اور پاکستان

جس طرح آسمان و زمین کی تخلیق میں 'گردشِ لیل و نہار میں' آسمان سے نازل ہو کر مردہ زمین کو زندہ کر دینے والی بارش اور اس طرح کی ہزاروں نشانیوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر موجود ہیں' اسی طرح اس کی مشیّت کے مظاہر بھی بہت واضح اور نمایاں ہیں- اور محسوس ہوتا ہے کہ اسی خطّۂ ارضی سے اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم مشیّت وابستہ ہے جس کی خبر دی تھی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ وہ وقت آ کر رہے گا کہ پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین اسی طرح غالب ہو گا جیسا کہ آنحضورؐ کے ہاتھوں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا- امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت مقداد ابن اسودؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر اور نہ کوئی کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ باقی رہے گا مگر یہ کہ اللہ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کر کے رہے گا ---- عزت والے کے اعزاز کے ساتھ اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ - یا تو اللہ تعالیٰ

لوگوں کو عزت عطا فرمادے گا اور کلمۂ اسلام کا قائل و حامل بنادے گا یا انہیں مغلوب فرمادے گا کہ اسلام کے محکوم بن جائیں!" یعنی یا تو اس گھر یا خیمہ والے اسلام قبول کرلیں گے اور وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ کے مصداق عزت والے ٹھہریں گے - بصورت دیگر يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ کے مصداق انہیں جزیہ دینا پڑے گا اور نیچے ہو کر رہنا پڑے گا - لہٰذا اسلام کو تو ہر گھر میں داخل ہونا ہی ہونا ہے!

دوسری روایت حضرت ثوبانؓ کے حوالہ سے امام مسلمؒ لائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے لئے کُل زمین کو لپیٹ دیا گیا اور مجھے اس کے مشارق و مغارب سب دکھائے گئے - اور یقیناً میری امت کی حکومت اُس پوری زمین پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے دکھائی گئی" - تو یہ مشیّتِ ایزدی ہے جسے پورا ہو کر رہنا ہے اور اس کی خبر دینے والے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو "الصّادق المصدوق" ہیں - ان کی سچائی میں کوئی شک و شبہ نہیں - اب ظاہر بات ہے کہ اس کا آغاز کسی ایک خطے سے ہوگا - اُس وقت بھی غلبۂ اسلام عرب کے ایک خطے سے شروع ہوا تھا اور پھر جو پھیلا تو اس حد تک کہ ع - تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا! ربع صدی سے بھی کم مدّت میں دریائے جیحوں سے لیکر بحرِ ظلمات تک اسلامی حکومت قائم ہوگئی - ع - بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے! اور اُس وقت اگر عبد اللہ بن سبا کی سرکردگی میں یہود کی سازش کامیاب نہ ہو جاتی جس نے مسلمانوں کو باہم لڑا دیا، تو روئے ارضی کا کوئی خطہ ایسا نہ رہ جاتا جہاں اسلامی اقتدار کا پرچم نہ لہراتا - کون تھا جو اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو آگے بڑھ کر روک لیتا - قیصر و کسریٰ کی حکومتیں یعنی اُس دور کی سپر پاورز مسلمانوں کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھیں - کوئی طاقت ایسی باقی نہ رہی تھی جو مقابلے پر آسکتی - یہ تو اندرونی انتشار تھا جس کے باعث غلبۂ اسلام کا عمل رک گیا - بہرحال یہ عمل پھر کہیں نہ کہیں سے شروع ہوگا اور مشیتِ الٰہی کے مظاہر اور شواہد یہ بتا رہے ہیں کہ وہ یہی خطۂ ارضی ہے! میں نے یہ شواہد اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں تفصیلاً بیان کئے ہیں، یہاں مختصراً بیان کروں گا -

الف ثانیؒ کی تجدیدی مساعی اور برعظیم پاک و ہند

پچھلے چار سو برس کی تاریخ گواہ ہے کہ مجدّدینِ امت اور ان کے تجدیدی کارنامے

ہمیں اسی خطۂ ارضی میں نظر آتے ہیں - سنِ ہجری کے الفِ اول یعنی پہلے ہزار سال پورے ہونے کے بعد گیارہویں صدی ہجری سے چودہویں صدی ہجری تک مجدد الف ثانی شیخ احمدؒ سرہندی' شیخ عبد الحقؒ محدث دہلوی' شاہ اسماعیلؒ شہید' سید احمدؒ شہید بریلوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی جیسے رجال دین اسی برعظیم پاک وہند میں پیدا ہوئے - (اس دوران عالم عرب میں ہمیں صرف ایک شخصیت محمد بن عبد الوہابؒ کی نظر آتی ہے جن کا معاملہ ' خاص طور پر پاک وہند میں ' خاصا اختلافی (Controversial) ہے - کیونکہ یہاں انگریزوں نے انہیں بہت بدنام کر دیا تھا - انہیں اگرچہ فلسفہ و منطق میں کوئی درک نہیں تھا ' لیکن ان کا کام اس اعتبار سے بہت عظیم تھا کہ انہوں نے مشرکانہ اوہام اور رسومات و بدعات کا خاتمہ کیا) تحریکِ شہیدین جیسی عظیم تحریکِ جہاد اسی سرزمین سے برپا ہوئی - پھر چودہویں صدی ہجری میں جتنی عظیم شخصیات اس خطۂ زمین میں پیدا ہوئیں پورا عالم اسلام اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے - شیخ الہند مولانا محمود حسن جیسے جامع صفات مجاہد و عالم دین' مولانا ابو الکلام آزاد جیسا داعیٔ قرآن اور علامہ اقبال جیسا نابغہ روزگار مفکرِ قرآن اور رومیٔ ثانی ------ یہ سب اسی خاک سے اٹھے ہیں - پھر اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی تحریکِ جماعت اسلامی' جس کا لٹریچر پورے عالم اسلام میں پھیلا اور اس نے عالم عرب کی عظیم تحریک "الاخوان المسلمون" تک کو فکری غذا فراہم کی - دوسری طرف علماء کے حلقے سے تبلیغی جماعت کی تحریک بھی یہیں سے اٹھی جو نہ صرف عالم اسلام بلکہ پوری دنیا میں پھیل چکی ہے -

پاکستان کا معجزانہ قیام اور نصرت و حفاظتِ خداوندی

آگے چلئے ' کچھ معجزات کا مشاہدہ کیجئے - ان میں سب سے بڑا معجزہ پاکستان کا قائم ہو جانا ہے - اسے کوئی بھی حالات کا نتیجہ ثابت نہیں کر سکتا - خاص طور پر جب قائد اعظم نے کیبنٹ مشن پلان کو مان لیا تھا ' اور گویا کہ آزاد پاکستان کے مطالبے سے خود مسلم لیگ دست بردار ہو گئی تھی ' اس کے بعد تو پاکستان اللہ نے ٹھونسا ہے آپ پر! اگر پنڈت نہرو کا بیان اس کے خلاف نہ آتا تو کیبنٹ مشن پلان منظور ہو جاتا - اور اس کے مطابق ایک مرکزی

حکومت کے تحت تین زون (Zones) پر مشتمل ہندوستان وجود میں آجاتا- اگر یہ ہو جاتا تو پھر مرکزی حکومت کسی زون کو الگ ہونے دیتی؟ بھارت نے کسی کو علیحدہ ہونے دیا آج تک؟ تو یہ ملک تو اللہ نے اس کے مطالبے سے دست بردار ہو جانے کے باوجود ہمیں عطا کر دیا- اس لئے کہ ہم نے کہا تھا کہ ہم پاکستان اس لئے چاہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اخوت و حریّت و مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں کہ یہ ہے نظام محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام-

مشترکہ دفاع کی پیشکش

پھر آمرِ مطلق ایوب خان کی طرف سے نہرو کے سامنے جائنٹ ڈیفنس سکیم پیش کرنا اور نہرو کا اس سکیم کو رد کر دینا ایک معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟- اس جائنٹ ڈیفنس سکیم کے کیا معانی تھے؟ یہی کہ ہم سے نہیں چلتا یہ ملک' ہمارا دفاع مشترک ہونا چاہئے- آپ کو معلوم ہے کہ ملک کے بجٹ کا سب سے بڑا حصہ دفاع پر خرچ ہوتا ہے- تو اگر مشترک دفاع ہے تو مشترک بجٹ سازی ہوگی- پھر دفاع کا براہ راست تعلق خارجہ پالیسی سے ہے- اگر دفاع مشترک ہو تو کیا خارجہ پالیسی الگ ہو سکتی ہے؟ گویا کہ ہم خود مستعفی ہو رہے تھے' ہاتھ جوڑ رہے تھے کہ ہم سے یہ آزادی نہیں سنبھالی جاتی- ع "میں باز آیا محبت سے........" اُس وقت بھی وہی شخص نہرو ہے کہ جس نے اس تجویز کو ٹھوکر لگائی اور یہ کہا: "مشترک دفاع- کس کے مقابلے پر؟" اسی لئے اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ہمارے بابا جان تو صوفی تھے انہیں سیاست نہیں آتی تھی- سیاست تو اس لنکا کی جنی کو آتی تھی کہ جس نے اس ملک کو دو ٹکڑے کر کے رکھ دیا - اس کے باپ نے تو بالواسطہ دو مرحلوں پر پاکستان کو بچایا ہے ؎

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے!

۱۹۶۵ء میں دشمن کی مرعوبیت

۱۹۶۵ء کی جنگ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ملک کی جو حفاظت ہوئی ہے وہ بھی معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟ بی بی سی کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے- اس نے نہ صرف سقوطِ

لاہور کی خبر نشر کر دی تھی بلکہ اپنے ٹی وی پر اس کا "منظر" بھی دنیا کو دکھا دیا تھا- یعنی سارے دنیوی اندازوں کے مطابق بھارت کی فتح اور پاکستان کی شکست یقینی تھی - لیکن دشمن کی افواج مزاحمت کی کمی کی بنا پر اس اندیشے میں مبتلا ہو کر ٹھٹھک کر رکی رہ گئیں کہ ہمیں کسی خوفناک نرغے میں نہ لیا جا رہا ہو! گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ (الانفال : ۱۲) "میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا" کی عملی تفسیر دنیا کو دکھا دی گئی!

۱۹۷۱ء میں مغربی پاکستان کی حفاظت

۱۹۷۱ء میں ہمیں قیام پاکستان کے اصل مقصد سے انحراف اور اپنی بد اعمالیوں کی سزا بھارت کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست اور اپنے مشرقی بازو کی علیحدگی کی صورت میں ملی - لیکن اس موقع پر بھی مغربی بازو کا بچ جانا اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ ہے - اس مرحلے پر بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت کا ظہور ہوا - اگر اس موقع پر امریکی صدر نکسن کی روسی صدر کوسیجن سے ہاٹ لائن پر بات چیت نہ ہوتی اور وہ اندرا گاندھی کو جنگ بندی کا حکم نہ دیتا تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مغربی پاکستان زیادہ سے زیادہ چھ دن کی مار تھی - ہماری افواج دفاع کے قابل ہی نہ رہی تھیں - ائیر فورس مفلوج ہو چکی تھی' نیوی تو گویا موجود ہی نہیں رہی تھی - دشمن کے حوصلے اتنے بلند تھے کہ وہ کیماڑی میں آ کر مار گئے تھے - میدانی محاذوں میں سے دو محاذوں پر بھارت کی پیش قدمی جاری تھی --- یعنی راجستھان میں بھی اور سیالکوٹ کی جانب سے بھی- لے دے کر ایک سلیمانکی سیکٹر تھا جس پر ٹکا خان ایک ٹاسک فورس لیکر بیٹھے ہوئے تھے - سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ہندوستان کا مورال (Morale) آسمان پر تھا اور ہمارا پاتال میں - ہمارے ایک لاکھ جوان اور آفیسرز ان کی قید میں تھے اور ہمارا اربہا ارب ڈالر کا اسلحہ اور دیگر جنگی سازوسامان ان کے قبضے میں آ گیا تھا- وہ اُس وقت اپنی پوری کی پوری قوت اس مغربی محاذ پر جھونک دیتے تو بڑی آسانی سے اس حصے پر بھی قابض ہو سکتے تھے لیکن یہ صرف اور صرف مشیتِ الٰہی ہے جس کے نتیجے میں یہ خطہ ہندو کی دست برد سے محفوظ رہا-

قراردادِ مقاصد

اس سلسلے کا چوتھا معجزہ قراردادِ مقاصد کا پاس ہو جانا ہے - بیسویں صدی کے وسط میں دس کروڑ افراد پر مشتمل ایک قوم کا اپنی زبان یعنی دستور ساز اسمبلی کی زبان سے کلمۂ طیبہ ادا کرنا واقعتہً ایک معجزہ سے کم نہیں - ہماری دستور ساز اسمبلی میں اُس وقت ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے کہا تھا کہ آج ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے -ع- کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں! قومی سطح پر لا الٰہ الّا اللہ کا اعلان اور خدا کی حاکمیت کا اقرار اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ کی کوئی مشیّت اس خطے کے ساتھ وابستہ ہے -

اُمید کی مزید کرنیں

بندۂ مومن کا معاملہ "بین الخوف والرّجاء" رہنا چاہئے یعنی امید بھی ہو اور خوف بھی ہو - چنانچہ اس اعتبار سے اپنے کرتوت دیکھیں تو خوف ہی خوف ہے' تاریکی ہی تاریکی ہے - لیکن اللہ کی رحیمی اور شانِ غفوری کو دیکھیں تو امید کی مشعلیں روشن ہو جاتی ہیں - اس کی شان یہ ہے کہ وہ مردہ کو زندہ کرتا ہے - بمصداق الفاظ قرآنی :

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا

"وہ نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے - اور زندہ کرتا ہے زمین کو اس کی موت کے بعد!" (الروم : ۱۹)

حضرت عزیر علیہ السلام نے یروشلم کے شہر کو تباہی و بربادی کی ایسی کیفیت میں دیکھا تھا کہ اُس وقت اس کی کوئی دو اینٹیں بھی سلامت نہیں تھیں - ہیکل سلیمانی کی بنیادیں کھود دی گئی تھیں - بارہ لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں ایک متنفس بھی نہیں تھا - آپ ذرا تصور تو کیجئے کہ یروشلم اڑھائی ہزار سال پہلے بارہ لاکھ کی آبادی پر مشتمل ایک شہر تھا - بیبی لونیا کے بادشاہ بخت نصر نے چھ لاکھ افراد کو قتل کر دیا اور چھ لاکھ کو قیدی بنا کر ساتھ لے گیا - حضرت عزیرؑ نے جب اس اجڑے ہوئے شہر کو دیکھا تو مایوسی کی کیفیت میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے - **اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِہَا**

اللہ اس بستی کو اتنا برباد ہونے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟

اللہ تعالیٰ نے خود ان پر ایک سو برس کے لئے ایک عارضی موت طاری کر دی اور اس
ے میں انقلاب آگیا- سو برس کے بعد حضرت عزیرؑ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ شہر آباد ہے-
لئے کہ سائرس نے جنہیں ذوالقرنین کہا جاتا ہے بیبی لونیا پر حملہ کیا تھا اور ان یہودیوں
رو شلم جا کر اپنا شہر دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دے دی تھی- چنانچہ شہر آباد ہو گیا- ہیکل
رہ تعمیر ہو گیا- اب حضرت عزیرؑ آئے تو انہوں نے تجدیدِ ایمان اور توبہ کی دعوت دینی
ع کی- آپ کی دعوت پر لبیک کہنے کے نتیجہ میں از سرِ نو ایک حیاتِ تازہ اس قوم کو مل
اور پھر ایک عظیم مکابی سلطنت وجود میں آئی جو کئی سو برس تک قائم رہی- تو اللہ تعالیٰ کو
ت حاصل ہے کہ وہ مردہ قوموں کو بھی حیاتِ نو عطا کر دیتا ہے-

اسی شہر لاہور میں ملتِ اسلامیہ کا اس صدی کا سب سے بڑا حدی خواں' سب سے بڑا
اسلام اور ترجمان القرآن مدفون ہے- عملی اعتبار سے اگرچہ ان میں بہت کمزوریاں
ں ------ اللہ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے ------ لیکن فکری اعتبار سے وہ
بلند تھے - اس دور کے دوسرے جتنے بھی مفکر اور دانشور ہیں' معلوم ہوتا ہے کہ وہ
نہ کسی اعتبار سے اقبالؒ اور اس کی فکر کے خوشہ چیں ہیں- پھر یہی وہ سرزمین ہے جو
ائے بالاکوٹ کے خون کی امین ہے- لہٰذا ان روشن پہلوؤں کو بھی سامنے رکھئے!

پس چہ باید کرد

اب آیئے اس بات کی طرف کہ اس خطۂ زمین' اس ملکِ خداداد کے مستقبل کو
ن اور تابناک بنانے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟ اس کے لئے میں آپ کے سامنے چھ
ت رکھ رہا ہوں- اصلاً ایک سہ نکاتی پروگرام ہے جسے عوامی سطح پر متعارف کرانا اور
یع پیمانے پر پھیلانا ناگزیر ہے --- اور طبعاً اس کے ساتھ موجودہ حالات میں تین تجاویز
عوامی سطح پر کرنے کے تین کام یہ ہیں-

جہاد بالقرآن

ہمارے پاس اصل طاقت یہ قرآن ہے جس کے ذریعے سے ہم اپنے معاشرے کو غلط

کہا گیا۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

یہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل معجزہ ہے۔ اور یہ دیگر تمام انبیاء و رسل کو عطا ہونے والے معجزات سے عظیم تر ہے۔ اس کی تاثیر عصائے موسٰیؑ سے ہزار گنا بڑھ کر ہے۔ عصائے موسیٰ تو صرف اُسی وقت کارگر ثابت ہوتا تھا جب وہ حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں ہوتا تھا' لیکن یہ کتابِ معجز نما تا قیامِ قیامت اپنے کمالات و انوار سے دنیا کو فیض یاب کرتی رہے گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ جب اپنے دَور کے جادوگروں سے ہوا اور جادوگروں کی ڈالی ہوئی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر حرکت میں آ گئیں تو بر بنائے طبع بشری حضرت موسیٰؑ کو خوف لاحق ہوا۔ خیال آیا کہ یہی تو میرا معجزہ تھا۔ میری لٹھیا سانپ بنتی تھی' وہی انہوں نے کر کے دکھا دیا۔ اب کیا ہو گا؟ کہا گیا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۔ موسیٰ مت ڈرو' یقیناً تم ہی غالب رہو گے! وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا۔" اور تو ڈال جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے کہ نگل جائے جو کچھ انہوں نے بنایا ہے"۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر ڈالا تو وہ اژدہا بن کر ان سب کو ہڑپ کر گیا۔ اس پر جادوگر فوری طور پر سجدہ میں گر پڑے اور ایمان لے آئے۔ آج دور جدید کے جادوگروں سے نمٹنے کے لئے ہمارے پاس جو معجزہ موجود ہے اس کے سامنے عصائے موسیٰؑ کی کیا حیثیت ہے! ع در بغل داری کتابِ زندۂ۔ آج اصل ضرورت اس معجزہ سے کام لینے کی ہے۔ ہمیں اس کے نور سے نہ صرف اپنے قلوب و اذہان کو بلکہ ماحول اور چہار دانگِ عالم کو منور کرنا ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور یہ کام ہمیں ہر سطح پر کرنا ہے--- (i) اعلیٰ ترین علمی سطح پر (ii) عوامی سطح (iii) قومی سطح پر (iv) بین الاقوامی سطح پر۔

اعلیٰ ترین علمی سطح پر قرآن حکیم کی حکمت و ہدایت کو پیش کیا جائے تاکہ جدید نظریات کا ابطال ہو' غلط فلسفے ختم ہو کر رہ جائیں' یہ قرآن ہڑپ کر جائے ان تمام غلط نظریوں کے سانپوں کو جو چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں۔ عوامی سطح پر بھی اس کی ترویج اشاعت اور تعلیم و تبلیغ ضروری ہے' کیونکہ یہ منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہے۔ پھر اس

کی ضرورت قومی سطح پر بھی ہے اور بین الاقوامی سطح پر بھی ' کیونکہ ہماری اصل طاقت یہی نظریئے کی طاقت ہے - میں نے گزشتہ دنوں کشمیر کے مسئلے پر ہونے والی بریفنگ میں کہا ہے کہ ہماری اصل طاقتیں دو ہیں جنہیں ہم استعمال نہیں کر رہے ------- (i) ہمارے پاس نظریئے کی طاقت ہے یعنی ایمان - (ii) اور ہمارے پاس نظام کی طاقت ہے یعنی اسلام - اسلام جیسا عادلانہ نظامِ اجتماعی دنیا میں کسی قوم کے پاس موجود نہیں ہے - لیکن ہم نے اپنی ان طاقتوں کو چھپا کر رکھا ہوا ہے - ہم گنتی کرتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنے ڈویژن فوج ہے اور اُن کے پاس اتنے ڈویژن ' ہماری فضائیہ اتنے سکواڈرن پر مشتمل ہے اور ان کی اتنے سکواڈرن پر ! اور جو اصل طاقت ہے ' اصل عصائے موسوی بلکہ اس سے بھی ہزار گنا بڑی طاقت اس کی طرف ہماری کوئی توجہ نہیں -

اس ضمن میں اللہ کا شکر ہے کہ میری ایک تالیف " دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر " منظرِ عام پر آ گئی ہے - اس کا مطالعہ ضرور کر لیجئے - میں نے رجوع الی القرآن کی اس دعوت میں اپنی زندگی کے پچیس برس لگائے ہیں - فالحمد للہ علیٰ ذالک - اور وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے حکم کے تحت کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنی اولاد کو بھی اسی کام میں لگایا ہے - اور بحمد اللہ میرے تین بیٹوں سمیت کم سے کم پچیس ایسے نوجوان تیار ہو چکے ہیں جو قرآن کو اس علمی اور اعلیٰ سطح پر دلیل کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں - ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ وہ میری طرح کے ہزاروں اسرار پیدا کر دے - بہر حال کرنے کا پہلا کام یہی " جہاد بالقرآن " ہے -

۲- نہی عن المنکر بالید

اس ضمن میں کرنے کا دوسرا کام قوت کے ساتھ منکر کا استیصال کرنا ہے ' طاقت کے ساتھ بدی کو روکنا اور بدلنا ہے - اس کے لئے ایک جماعت کی تیاری ناگزیر ہے - اس جماعت کے لئے کچھ شرائط و لوازم ہیں -

i) پہلی شرط یہ کہ یہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو اپنے اوپر اللہ کے دین کو نافذ کر لیں ' اور یہی مشکل کام ہے - ؏ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں !

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جسے امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے' میں اپنے خطابات میں بکثرت سنا چکا ہوں- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "مجھ سے پہلے مبعوث ہونے والے ہر نبی اور رسول کے کچھ نہ کچھ حواری اور صحابہ ہوتے تھے- جو نبی کی سنت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اس کے حکم کے مطابق پیروی کرتے تھے- پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آجاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے' اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا- پس جو شخص ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے' اور جو ان سے اپنے دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں!" چنانچہ ایسے لوگوں پر مشتمل ایک جماعت کا قیام ناگزیر ہے- لیکن ان لوگوں کے لئے پہلے اپنے اوپر اسلام کا نفاذ ضروری ہے- اس کے بغیر وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے-

(ii) اس جماعت کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ اس میں جمع ہونے والے افراد منظم ہوں اور 'سمع و طاعت' کے اصول پر کاربند ہوں- غیر منظم لوگوں کا ہجوم جو اپنی مرضی کا مالک ہو محض MOB ہوتا ہے' جس سے کوئی خیر وجود میں نہیں آتا- اس سے تخریب ہو سکتی ہے تعمیر نہیں- ضرورت ایک ایسی جماعت کی ہے جو طاقت کے ساتھ برائیوں کا استیصال کرے- تنظیم اسلامی کے عنوان سے ہم یہی کوشش کر رہے ہیں- اسی کے پندرہویں سالانہ اجتماع کے ساتھ یہ جلسہ رکھا گیا ہے- اس ضمن میں بھی میں اپنی ایک کتاب "منہج انقلاب نبوی" کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں' جس میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی انقلاب کا نبوی طریق کیا ہے-

۳- قرآن و سنت کی بالادستی کی مہم

تیسرا اہم کام عوامی سطح پر ایک نکاتی مطالبہ اٹھانے کا ہے- اور وہ یہ کہ آئین میں قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم کی جائے- اس کے لئے فضا ہموار کرنے کی ضرورت ہے- اس کی خاطر دستخطوں کی مہم چلائی جائے- صرف یہ مطالبہ اٹھایا جائے کہ آئین میں کتاب و سنت کی مطلق بالادستی بغیر کسی استثناء اور تحفظات کے تسلیم کی جائے- اس کے

لئے کسی لمبے چوڑے شریعت بل کی ضرورت نہیں، جس کی ایک ایک شق پر جھگڑا ہو۔
درحقیقت قراردادِ مقاصد کے بعد دوسرا قدم یہی تھا، لیکن لوگ بھٹک گئے اور سیاسی جنگوں میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے انتخابات کے میدانوں کے اندر اپنی توانائیاں ضائع کر دیں۔ ضرورت یہ تھی کہ اگلا معاملہ طے کرایا جاتا کہ دستور میں کتاب و سنت کی بالادستی ہو۔ اگر یہ بات دستور میں طے ہو جائے تو ایک طریق کار جاری ہو جائے گا۔ کوئی بھی شخص عدالت میں جائے اور وہاں ثابت کر دے کہ یہ شے کتاب و سنت کے خلاف ہے، تو عدالت کے فیصلہ سے وہ کالعدم (Null and Void) ہو جائے گی۔

ہمارے ہر دستور میں اگرچہ یہ دفعہ ہمیشہ سے موجود رہی ہے کہ

"No Legislation Will Be Done Repugnant To The Quran And The Sunnah"

لیکن اس کی حیثیت ایک رہنما اصول (Directive Principle) کی رہی ہے۔ اور چونکہ یہ Operative Clause نہیں، اس لئے عدالتیں اس کے مطابق فیصلے نہیں کر سکتیں۔ اگر اسے رہنما اصولوں سے اٹھا کر Operative Clause بنا دیا جائے تو یہ ایک دفعہ قرآن و سنت کی بالادستی کے لئے کافی ہے۔ حضورؐ کے چچا ابو طالب نے جب سردارانِ قریش کے وفد سے یہ کہا تھا کہ تم میرے بھتیجے کے درپے آزار کیوں ہو؟ وہ تم سے صرف ایک بات، ایک کلمہ ہی کا تو مطالبہ کرتا ہے ------ تو جواب میں ابوسفیان نے کہا تھا "وہ جو ایک کلمہ ہم سے طلب کر رہا ہے وہ ہمارے سارے معبودوں کو ختم کر دینے والا ہے"۔ وہی بات میں کہہ رہا ہوں کہ یہ ایک دفعہ ہر خلافِ قرآن و سنت قانون کو ختم کر کے رکھ دے گی، اگرچہ عدالتی طریق کار کے مطابق اس میں وقت لگے گا۔ لیکن اس دفعہ کو دستور میں لے آنا اتنا آسان نہیں ہے۔

کاش کہ اس قوم کے اندر پھر اسی طرح اتفاق و اتحاد پیدا ہو جائے جس طرح کہ پہلی مرتبہ دستوری مہم کے موقع پر ہوا تھا۔ اُس وقت مسلم لیگ کی حکومت تھی اور مسلم لیگ کو اس کی تائید کرنا پڑی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اسمبلی کے اندر دھمکی دی تھی کہ اگر اس کو منظور نہیں کرو گے تو میں باہر جا کر کہہ دوں گا کہ یہ سب دھوکے باز ہیں، مسلم لیگ نے اسلام کے نام پر دھوکہ دیا ہے۔ لیکن وہ وقت تھا جبکہ جماعت اسلامی ابھی سیاست میں

انتخابی حریف کی حیثیت سے نہیں آئی تھی - جب جماعت انتخابات میں حریف بن کر آئی تو صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی - اب پارٹی پالیٹکس کا معاملہ آگیا-

ہماری سوچ یہ ہے کہ اسی طریق کار کو دوبارہ اختیار کیا جائے - اُسی طرز پر یہ مطالبہ پھر اٹھایا جائے - اور اسے لے کر وہ جماعت اٹھے جو کبھی انتخابات میں نہ آئے - وہی جماعت یہ مطالبہ منظور کروا سکتی ہے کہ اس ملک کے اندر ہر اعتبار سے کتاب و سنت کی بالادستی ہو گی' اور اس میں کوئی استثناء نہیں ہو گا - ہمارا دین کلی اطاعت کا تقاضا کرتا ہے - استثناءات اور تحفظات کے ساتھ دین کو ماننا اللہ کی نگاہ میں برملا اور اعلانیہ کفر سے زیادہ ناپسندیدہ ہے - ارشاد باری تعالیٰ ہے :

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ - فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ -

"کیا تم کتاب (اور شریعت) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے ؟ تو جو کوئی تم میں سے یہ طرز عمل اختیار کرے گا اس کی اس کے سوا کوئی سزا نہیں سوائے دنیوی زندگی میں ذلت و رسوائی کے ! اور قیامت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا !" -

اس لئے اگر ہم دین و شریعت پر عمل در آمد میں استثناءات رکھیں گے تو اس آیت کا مصداق بنیں گے - اعاذنا اللہ من ذالک -

یہ سہ نکاتی پروگرام ہے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے - سب سے پہلا کام جہاد بالقرآن ہے - اپنے نونہالوں کو' اپنے ذہین ترین بیٹوں کو اس کام کے لئے وقف کیجئے - یہ ہے سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ کام - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے !

ذرا غور کیجئے کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس کام کو بہترین کہہ رہے ہیں اور ہماری ترجیحات کیا ہیں - یا تو یہ کہئے کہ محمدؐ کی صداقت پر ہمیں اعتماد نہیں' یا پھر اپنے بہترین بیٹوں کے لئے یہ کیریر اختیار کیجئے - دوسرا کام طاقت کے ساتھ بدی کے استیصال کے لئے ایسے

لوگوں کی ایک جماعت جو خود اپنے اوپر دین کو قائم کریں اور سمع و طاعت کے نظم میں منسلک ہوں - اور تیسرا کام عوامی سطح پر دستور میں کتاب و سنت کی بالادستی تسلیم کروانے کا مطالبہ -

قومی سیاست کے حوالے سے تین مشورے

اس کے علاوہ مجھے تین باتیں مزید عرض کرنا ہیں - یہ قومی سیاست کے حوالے سے تین مشورے ہیں -

i) اگر اس ملک کی عافیت درکار ہے اور اس کی بقاء مطلوب ہے تو جمہوریت جیسی بھی ہو ------ بری ہو 'بھلی ہو 'لنگڑی ہو 'لولی ہو 'ٹوٹی ہو 'پھوٹی ہو 'اس کی تائید کیجئے - کیونکہ اسلام کا گہوارا اگر بنانا ہے تو ملک تو چاہئے - مارشل لاء ملکی سلامتی کے لئے مہلک ہے - میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس پوری دنیا کے اندر اس وقت شخصی اعتبار سے ضیاء الحق سے بہتر مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نہیں مل سکتا 'لیکن وہ بہرحال مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر تھا - اور مارشل لاء سے تباہی آئی ہے - میری جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی ۱۸ اگست ۱۹۸۰ء کو تو میں نے یہ کہا تھا کہ آپ کا یہاں انتخابات نہ کرانا خودکشی کے مترادف ہے - وہ تو اُس وقت اللہ نے بچالیا ورنہ ۱۹۸۳ء میں سندھ میں مشرقی پاکستان والا حادثہ ہو چکا ہوتا - کسر کیا رہ گئی تھی؟ اُس وقت سندھ میں علیحدگی کی تحریک عروج کو پہنچ چکی تھی - ریل کی پٹڑیوں کے سلیپر جلائے جاتے تھے - اُس وقت علیحدگی پسندوں کے پاس بم نہیں تھے - اگر ان کے پاس بم بھی ہوتے تو اس پاکستان کے بچنے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی! ۱۹۸۲ء میں میں نے اس خطرے کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے بالکل مشرقی پاکستان کے سے حالات نظر آ رہے ہیں - اور ۱۹۸۳ء میں وہی حالات سامنے آ گئے - ۱۹۸۲ء میں میں نے ضیاء الحق صاحب کو خط لکھا جو روزنامہ جنگ میں چھپ بھی گیا کہ: "مجھے اندیشہ ہے کہ تاریخ میں یہ نہ لکھا جائے کہ ۱۹۴۷ء میں وقت کی جو عظیم ترین مسلمان مملکت دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوئی تھی اسے پہلے دولخت کیا ایک شرابی اور زانی ٹولے نے اور اس کے مزید حصے بخرے ہونے کا عمل ایک ایسے شخص کے ہاتھوں ہوا جو نمازی اور پرہیزگار تھا" - یہ میرا تاریخی جملہ ہے - بہرحال مارشل لاء کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھنا چاہئے - وہ اس ملک کے لئے انتہائی مہلک اور خودکشی کے مترادف ثابت ہوگا - میرے نزدیک بد ترین جمہوریت بھی بہترین مارشل لاء سے بہتر ہے - اور یہ میں عرض کر

چلوں کہ جیسے جمہور ہوں گے ویسی ہی جمہوریت ہوگی - چنانچہ ہارس ٹریڈنگ بھی ہوگی ' بکاؤ مال کی خرید و فروخت ہوگی ' لیکن اس کے باوجود انتخابی عمل جاری رہنا چاہئے - کوئی بھی سیاسی تبدیلی ووٹ کے ذریعے دستور کے مطابق ہونی چاہئے - جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی کے اوپر چلنا چاہئے - اس کا پٹڑی سے اترنا مکمل تباہی کا باعث ہوگا -

ii) دوسرا نکتہ یہ کہ جمہوریت کے لئے بنیادی ضرورت ہے دو مضبوط جماعتوں کی - پیپلز پارٹی نے ثابت کیا ہے کہ وہ ایک جماعت ہے - گیارہ برس حکومت سے باہر رہنے اور مخالفت و تشدد کا نشانہ بننے کے باوجود اس نے اپنے وجود کو قائم رکھا - ہماری سیاسی تاریخ تو یہ ہے کہ جب ری پبلکن پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو اس کے ساتھ ہی یہ پارٹی بھی اس طرح ختم ہوگئی کہ کہیں اس کی کوئی نشانی بھی نہیں رہ گئی - لیکن پیپلز پارٹی واقعتاً ایک پارٹی ہے - اس کے مقابلے میں ایک دوسری پارٹی آنی چاہئے - میرے خیال میں مسلم لیگ اس کے لئے موزوں ترین جماعت ہے - اس کے لئے بھی اللہ کے فضل و کرم سے اچھے آثار دکھائی دیتے ہیں - جونیجو صاحب جس انداز میں چل رہے ہیں ' محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ مسلم لیگ کو دوبارہ ایک قوت بنالیں - ہماری خواہش اور تائید اس بات کے حق میں ہے - اس لئے کہ یہ جمہوریت کا خاصہ ہے اور اس کے لئے شرط لازم ہے - جمہوریت کی گاڑی ایک پہیئے پر نہیں چل سکتی - جہاں تک متحدہ محاذوں کا تعلق ہے وہ اس گاڑی کے چلنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتے ' بلکہ اس کی راہ میں روڑے اٹکانے والے ہیں - اسلامی جمہوری اتحاد اور سی او پی وغیرہ میں شامل جماعتوں کے مابین کوئی نظریاتی ہم آہنگی نہیں - ان میں وہ بھی ہیں جو جہادِ افغانستان کو قرونِ اولیٰ کے ساتھ جوڑ رہے ہیں کہ دورِ صحابہؓ کے بعد ایسا جہاد نہیں ہوا اور وہ بھی جو اسے فسادکہہ رہے ہیں - لیکن وقتی سیاست کے لئے سب جڑے بیٹھے ہیں - یہی وہ بے اصولی ہے جس نے اس ملک میں ساری بربادی پیدا کی ہے - ایک مضبوط پارٹی کے مدّ مقابل دوسری مضبوط پارٹی ہی آنی چاہئے -

iii) اور تیسری بات یہ کہ جب تک کوئی جماعت ایک قیادت کے تحت ایک منظم اور تربیت یافتہ جمعیت پیدا نہ کرلے کسی بھی حساس مذہبی معاملے پر لوگوں کو سڑکوں پر نکالنا نہ ملک و قوم کے لئے درست ہے ' نہ ان لوگوں کے لئے درست ہے اور نہ ہی دین کے لئے درست ہے - اس طرح سے دین بدنام ہوتا ہے - شیطان رشدی کے مسئلے پر کئی اسلامی

ممالک میں لوگوں نے مظاہرے کئے لیکن وہ دندناتا پھر رہا ہے - چھ نوجوان یہاں اپنی جانیں دے بیٹھے، پندرہ سولہ ہندوستان میں جاں بحق ہو گئے، لیکن اس کے باوجود اس کم بخت کا بال بیکا نہیں ہوا - ایک زمانہ وہ تھا کہ ایک غیور نوجوان غازی علم الدین نے غیرت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دل آزار کتاب کے مصنف کو جہنم رسید کر دیا - اور اس کے بعد اس نے پھانسی پر چڑھنا قبول کر لیا لیکن اپنا بیان بدلنے پر راضی نہیں ہوا - قائداعظم بھی آئے تھے اس کا مقدمہ لڑنے کے لئے اور اسے کہا تھا کہ قانون کی ضرورت ہے کہ کچھ تو کہا جائے - لیکن اس نے کہا کہ میں کچھ کہنے کو تیار نہیں، بس میں نے مارا ہے اسے! - اُس ایک نوجوان کا وہ جذبہ مسئلے کو حل کر گیا اور یہاں سیاسی شعبدہ باز، ہارے ہوئے سیاست دان اپنی سیاست کی دکان چمکانے کے لئے اس طرح کے مسئلے اٹھاتے ہیں - خود ان کا بال بیکا نہیں ہوتا اور دوسروں کے گھروں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں -

میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ کسی بھی حساس مذہبی مسئلے پر غیر منظم اور غیر تربیت یافتہ لوگوں کو سڑکوں پر نکالنا نہ اسلام کی خیر خواہی ہے، نہ لوگوں کی خیر خواہی ہے اور نہ اس ملک کی خیر خواہی ہے، بلکہ تینوں کے ساتھ دشمنی ہے - اس کا صحیح طریق کار وہی ہے جو میں عرض کر چکا ہوں کہ پہلے ایک منظم جماعت تیار کر کے دکھایا جائے کہ یہ ہیں ایک حکم پر بڑھنے والے اور ایک حکم پر رک جانے والے لوگ - یہ ہیں جنہوں نے دین کو اپنے اوپر نافذ کیا ہے - انہیں حق پہنچتا ہے کہ مطالبہ کریں دین کا - میں نے جو سہ نکاتی پروگرام بیان کیا ہے اس میں دوسرا نکتہ یہی ہے لیکن اس کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ جب تک یہ جماعت تربیت کے مرحلے سے پوری طرح گزر نہ جائے تصادم مول نہ لے - محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکے میں اپنی دعوت کے آغاز ہی میں بت نہیں توڑ دیئے تھے - بارہ برس تک تو حکم یہ تھا کہ چاہے تمہاری بوٹیاں نوچ لی جائیں تم کوئی جوابی کارروائی (Retaliation) نہیں کرو گے - سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اسی بیت اللہ میں نماز پڑھتے رہے اور اسی کعبے کا طواف کرتے رہے جس میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے - ہاں، زبان سے توحید کی دعوت دیتے رہے اور برملا کہتے رہے کہ یہ سب غلط ہے -

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ

یہ تو بس کچھ نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے۔
اللہ نے نہیں اتاری ان کی کوئی سند!

لہذا پہلے جماعت منظم کیجئے۔ افراد کی تربیت کیجئے۔ اس دوران دعوت و تبلیغ کا کام کیجئے۔ نہی عن المنکر باللسان کیجئے۔ لیکن ابھی اقدام کا وقت نہیں۔

نغمہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اور

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

جب معتد بہ تعداد میں مقصد سے والہانہ لگاؤ رکھنے والے، تربیت یافتہ اور منظم افراد پر مشتمل جماعت تیار ہو جائے تو اب منکرات کو چیلنج کیجئے۔ بدی کے ساتھ ٹکرا جائیے اور قوت و طاقت کے ساتھ اسے ملیا میٹ کر دیجئے!! لیکن غیر منظم اور غیر تربیت یافتہ لوگوں کے محض مذہبی جذبات مشتعل کر کے انہیں سڑکوں پر لے آنا ہر اعتبار سے مضر ہے۔

میں آپ حضرات کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے میری بات توجہ سے سنی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو بھی ان تمام امور پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔ ○○

قرآن
ایک انقلاب آفرین کتاب

از قلم: پروفیسر محبوب الرحمٰن
(خطیب جامع سلطانی، مظفر آباد)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد للہ علی نعمائہ، وصلاتہ وسلامہ علی خاتم انبیائہ، وعلی الہ واصحابہ واولیائہ۔ اللّٰھُمَّ انی احمدك ارضی الحمد لك، واحب الحمد الیك، وافضل الحمد عندك، حمدًا لاینقطع عَدَدُہٗ، ولا یفنی مَدَدُہٗ

بنی آدم کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں انبیاء و رسل پر کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے۔ سابقہ کتابیں خاص زمانوں کے لئے تھیں، اس لئے کہ وہ پیغمبر خاص دور اور خاص امتوں کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اس کے برعکس یہ آخری کتاب ہمیشہ کے لیے اور تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے آخری پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے لئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

"اور ہم نے آپ کو سارے لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا۔"

اس آخری کتاب کی خصوصیات، اس کی دعوت و پیغام، اس کے اسلوب اور معانی و مطالب غرضیکہ ہر اعتبار سے اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" لکھ کر ہمیشہ کے لیے امتِ محمدیہ کو زیر بار احسان کر دیا۔ قرآن اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک منفرد اور اس درجہ کی

مقدس کتاب ہے کہ اس نے اپنا تعارف خود اپنی زبان میں کروایا ہے جس کے مطابق اس کتاب کے مضامین بالکل قطعی اور یقینی ہیں۔ اس میں کسی بھی طرف سے باطل کا دخل ممکن نہیں۔ یہ کوئی معمولی درجہ کی کتاب نہیں، جو عام صحیفوں میں درج ہو، بلکہ نہایت معتبر اور پاک صحیفوں میں درج ہے جنہیں نہایت معزز، پاک اور مکرم فرشتوں کے ہاتھوں لکھا گیا ہے اس کا سرچشمہ علم الٰہی ہے۔ اور اس کے نزول کا ذریعہ وحیِ الٰہی ہے۔ اور یہ طاقتور فرشتوں کی معیت میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے نازل کرنے میں اس قدر اہتمام کیا گیا جو کسی دوسری کتاب کے لیے نہیں کیا گیا۔ قرآن علیم و حکیم ذات کی طرف سے فرشتوں کی معیت میں نہایت حفاظت کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک محکم اور مفصّل کتاب بھی ہے۔

قرآن نے اپنے دعویٰ کے دوران جہاں اپنے تقدس اور احترام پر زور دیا ہے، وہاں اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ وہ سلامتی کی راہوں کی طرف ہدایت کرتا ہے اور لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن نے اپنی گوناگوں صفات کی بدولت عرب کے اُس معاشرہ میں جو انقلاب برپا کیا، اُس کی حقیقت اور قدر و منزلت کا اندازہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ہم نزولِ قرآن کے وقت عربوں اور ان کی پڑوسی اقوام کی تہذیب و تمدن کا تاریخ کی مدد سے کھوج لگائیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی بعثت کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ تمام مؤرخین، بالخصوص 'تاریخ تہذیب' کے مصنف نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی کا دور تاریخ انسانی کا تاریک ترین دور تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی دعوت آپ کی حیاتِ مبارکہ میں صرف گنتی کے چند حواریوں نے قبول کی، جبکہ یہود نے اس دعوت کو جھٹلایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک بڑی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اور بالآخر حق و باطل کی یہ کشمکش حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی کے واقعہ پر ختم ہوئی۔ دینِ عیسوی کو اگرچہ بعد کے دور میں پذیرائی ملی، لیکن بعثتِ محمدی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وقت عیسائیت دراصل رہبانیت کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ وہ اس قابل نہ تھی کہ گرتی ہوئی انسانیت کو سہارا دے سکے۔ مختلف اقوام اور اُس وقت کے مذاہب کے پیروؤں کے واقعات جو تاریخ نے محفوظ کیے ہیں اُن کے مطابق دنیائے انسانیت پستی کے آخری نقطہ پر پہنچ گئی تھی۔ دین و اخلاق اور سیاست و معاشرت کے نام پر کوئی

ایسا سہارا موجود نہ تھا جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور اسے ہلاکت کے غار میں گرنے سے روک سکے۔ قرآن نے کس قدر بلیغ انداز میں اُس دور کی سسکتی ہوئی انسانیت کی تصویر چند جملوں میں بیان فرمائی ہے :۔

"وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا۔"

"اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تھے۔ پس تم کو اُس نے اِس سے نجات دی۔"

ساری انسانیت اپنی اغراض اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر ان گنت خداؤں کی پرستش میں لگی ہوئی تھی، جس کی تفصیل مختلف مذاہب کی تاریخ سے ملتی ہے۔ اُس معاشرے کے لیے اور اُن حالات میں تمام معبودانِ باطل کی نفی کر کے صرف ایک معبود کا اقرار کرنا ایک ناقابلِ فہم بات تھی۔ اور یہی بنیادی بات اُس معاشرہ اور پیغمبر کے درمیان ٹکراؤ اور کش مکش کا سبب بنی۔ اخلاق و شرافت سے عاری معاشرہ میں انسان انسانیت کے جوہر سے محروم ہو کر درندگی اور حیوانگی جیسی صفات سے متصف ہو گیا تھا۔ وہ اپنے انجام سے بے خبر بُرے بھلے کی تمیز سے محروم تھا۔ اُس دور کی ترجمانی کے لیے اگر میں اُسے موسم سرما کی اس گھٹا ٹوپ رات سے تشبیہ دوں تو مناسب ہو گا جس میں روشنی کا کوئی ٹمٹماتا چراغ بھی نہ ہو۔ شدید اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا ہو۔ اس کے ہمراہ طوفانِ باد و باراں کے جھکڑ چل رہے ہوں۔ ایک راہ گیر مسافر کو قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہوں۔ چشم تصور میں اُس رات کو دورِ جاہلیت پر منطبق کیجئے تو اُس دور کی بدحالی کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

عرب کے اُس قبائلی نظام میں جہاں سرداروں کی باہم آویزش ہر لمحہ اور ہر آن موجود رہتی تھی اور ہر قبیلہ اپنے ہاں مخصوص رسم و رواج کا پابند تھا، ہدایت اور فلاح کی کسی آواز کے بارے میں یہ توقع کرنا کہ وہ کامیابی سے ہم کنار ہو گی بظاہر ناممکن تھا۔ سابقہ پیغمبروں نے اپنے اپنے دور میں جو کام کئے تھے وہ امتدادِ زمانہ سے اپنا اثر کھو بیٹھے تھے یا صرف ٹمٹما رہے تھے، جن سے چند خدا شناس دل روشن تھے۔ لیکن بایں ہمہ وہ خدا شناس افراد کفر و معصیت کے اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ انھوں نے زندگی کے اُس میدانِ کارزار سے کنارہ کشی کر کے کلیسا اور صحراؤں کی

تنہائیوں میں پناہ تلاش کر لی تھی۔ دین و مادیت کے معرکہ میں وہ اپنے آپ کو ناکام سمجھ کر انسانی قیادت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے تھے۔ اور جو باقی دین اور روحانیات کا اپنے آپ کو اہل سمجھ رہے تھے انہوں نے اہلِ دنیا سے سازباز کر لی تھی اور ان کے ظالمانہ نظامِ سلطنت کو استحکام بخشنے کے لیے ان کے دستِ راست بن کر حرام مال کھانے میں ان کے شریک ہو گئے تھے اور ان کی ناجائز خواہشات کے مطابق خدائی احکام بدلنے میں بڑے جری اور بے باک ہو گئے تھے۔ عرب کے بالکل پڑوس میں روم اور ایران کی دو عظیم سلطنتیں موجود تھیں جو مغرب و مشرق کی زمامت کی دعویدار تھیں۔ ہم جب تاریخ کے حوالے سے ان دو سلطنتوں کی اجتماعی اور اخلاقی زندگی کے بارے میں معلوم کرتے ہیں تو ایک ایسا تاریک اور گھناؤنا نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے جسے شرافت، دیانت اور دیگر اخلاقی صفات سے دُور کا واسطہ نہ تھا۔

چھٹی صدی عیسوی کا یہ دور صرف اس لئے قابلِ ملامت نہیں کہ اس دور میں کفر و معصیت، ظلم و سرکشی اور اس کے ساتھ ساتھ جابر و ظالم سرداروں اور بادشاہوں کا غلبہ تھا۔ اگرچہ یہ سب باتیں قابلِ ملامت ہیں، تاہم جاہلیت کے اس دور کا سب سے بڑا المیہ جس کی خاطر بعثتِ محمدی ہوئی یہ تھا کہ علمِ صحیح اور نیک ارادے کی حامل کوئی ایسی طاقت موجود نہ رہی تھی جو حق کی خاطر سینہ سپر ہونے والی اور باطل سے پنجہ آزمائی کرنے والی ہو گویا اُس وقت ظلم و جور، کفر و معصیت اور باطل کی تاریکی دُور کرنے والی ایک ایسی انقلابی قوت کی ضرورت تھی جو حالات کا رخ اور تاریخ کا دھارا بدل دے۔

عصرِ جاہلیت کا خاصّہ یہی ہے کہ اُس عہد میں صحیح علم کا فقدان تھا، جس کے ذریعے انسان اپنے رب کو پہچانے اور اُس کی معرفت سے حق اور ناحق میں تمیز کر سکے۔ بالفرض کسی حد تک ایسا علم کسی فرد کے اندر پایا بھی جائے تو ماحول کی عدم موافقت کی وجہ سے وہ جہالت و خرافات سے یکسر پاک نہیں ہوتا۔ اس لیے ایسے وقت میں اُس علم کی ضرورت ہوتی ہے جو وحیٔ الٰہی کے تابع ہو۔ جو خالص ہو اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہو۔ اگر کسی فرد میں گزشتہ انبیاءِ کرام کے علم کی باقیات کا کچھ حصہ موجود بھی ہو تو اُس کو آگے پھیلانے کے لیے عزیمت اور قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے وہ معاشرے سے ٹکر لے سکے۔ چنانچہ چھٹی صدی عیسوی کے اُس عہد میں جہاں صحیح علم کی کمی تھی، وہاں

ہ جذبہ بھی مفقود تھا جو حق کی حمایت اور اس کی اشاعت کے لیے ضروری ہے ۔ تیں اور عزیمتیں ایسے علم کی طلب میں تھک چکی تھیں ۔ طلب معاش ، ہوس رانی ، س کے مطالبات کی تکمیل ، قبائلی سرداروں اور حکمرانوں کی اندھی تقلید اور اُن کے لیے جان سپاری میں قوتیں صرف ہو رہی تھیں ۔ ایسے ماحول اور حالات میں اگرچہ حق کے ادہ اور علم صحیح کے طلب گار اِکّا دُکّا شکل میں موجود بھی تھے ، لیکن وہ تن تنہا اس بارِ نت کو اٹھانے کے اہل نہ تھے ۔ چنانچہ اُن کی کوششیں انفرادی اصلاح میں ضائع ہو ہیں ۔ اور یہ افراد کلیساؤں ، مندروں ، غاروں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر گوشہ گیر ہو ئے تھے ۔ اُن کی مثال جگنو سے دی جا سکتی ہے جو سرما کی راتوں میں بارش اور تاریکی ں اِدھر اُدھر چمکتے اور اڑتے ہیں ، لیکن اُن کی روشنی میں نہ تو کوئی بھولا بسرا مسافر زل کا راستہ پا سکتا ہے اور نہ ہی سردی کے مارے ٹھٹھرا ہوا آدمی اُن سے گرمی پا لتا ہے ۔

معزز حضرات ! میرے اس مختصر بیان سے آپ نے چھٹی صدی عیسوی کے اُس ور کا ایک اجمالی تعارف معلوم کر لیا ہے ۔ ایسے دَور میں ایک علم صحیح اور اس کے ہمراہ ب انقلابی قوت کی ضرورت تھی جو انسانوں کو خالقِ کائنات اور اُس کی ذات و صفات سے عارف کرائے ، خالق و مخلوق کے درمیان ایک مضبوط اور مستحکم رشتہ قائم کر دے ، دلوں ں ایمان کی دولت پیدا کر دے ، انسانوں کو سرداروں اور بادشاہوں کی غلامی سے کال کر خدائے واحد کی غلامی میں جکڑ دے ، تمام فرسودہ رسوم و رواج اور اوہام باطلہ ی نفی کر کے ایمان و یقین کی دولت بخشے ، اس فرسودہ نظام کی جگہ ایک ایسا نظام برپا رے جس میں خدا خوفی اور آخرت کی بازپرسی کا احساس ہو ۔ اور اس نظام کے قبول رنے والے ہر فرد کے قلب و دماغ میں شرک کی جگہ توحید کا عقیدہ جاگزیں ہو جائے ۔

ان حالات و واقعات اور ماحول و معاشرہ میں مکّہ کی وادیٔ غیر ذی زرع میں ارِ حرا کے اندر معتکف عرب کی ' الصادق ' اور ' الامین ' کے لقب سے متعارف شہور ہستی محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر مشہور فرشتے جبرئیل امین کی زبان سے حیٔ الٰہی کا آغاز ان آیات سے ہوا ۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ۝

ترجمہ: "پڑھئے ساتھ نام اپنے رب کے جس نے پیدا کیا پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے ۔ پڑھیے اور آپ کا رب بڑا بزرگ ہے ۔ جس نے سکھایا قلم کے ذریعے سے انسان کو سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا ۔"

اس پیغام میں اُس علم کا ذکر ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان معرفت کا سبب بنتا ہے ۔ جس سے انسان اور اُس کے رب کے درمیان عبد و معبود کا رشتہ اُستوار ہوتا ہے ۔ یہی وہ علم ہے جو سسکتی ہوئی انسانیت کو زندگی بخشتا ہے ۔ اس علم سے صدیوں پرانی گرہیں کھلتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس ابتدائی وحی کے کلمات سے پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مستقبل کے اُس بوجھ اور حق و باطل کے درمیان متوقع کش مکش کا اندازہ کر لیا ۔ جبکہ آپ کانپ رہے تھے اور آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے " زمّلونی زمّلونی " کے کلمات سے اُن اندیشوں اور فکروں کے ازالہ کی فرمائش کی ۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حالات کی نزاکت کو فوراً سمجھ گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان الفاظ سے تسلی دی :-

كَلَّا وَاللّٰهِ مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْم وَتَقْرِی الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ ۔

ترجمہ: " ہرگز ایسا نہیں ہوگا ۔ خدا کی قسم اللہ کبھی آپ کو شرمندہ نہیں کرے گا ۔ آپ تو صلہ رحمی فرماتے ہیں ۔ آپ اپنی کمائی میں مفلسوں اور ناداروں کو شریک کرتے ہیں ۔ آپ مہمان نوازی فرماتے ہیں اور راہِ حق میں مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کرتے ہیں ۔

سیرت نگار اس واقعہ کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ ان آیات کے نزول کے بعد کچھ عرصہ کے لیے وحی کا سلسلہ بند ہو گیا ۔ اور اس عرصہ کو " فترۃ الوحی " کا عرصہ شمار کرتے ہیں ۔ اور جب دوبارہ وحی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اس موقع پر یہ آیات نازل ہوتی ہیں :

يَآ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

اے کپڑا لپیٹ کر لیٹنے والے اب کھڑے ہو جاؤ اور خبردار کرو! اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو!

یہاں سے قرآن کی اس دعوت کی بنیاد پڑتی ہے جو سراسر انقلابی نوعیت کی ہے۔ ان آیات سے قرآن کے انقلابی پروگرام کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو، جو پہلی وحی کے بعد کپڑے میں لپٹ گئے تھے، اب حکم ہوتا ہے کہ آپ کا کام باطل کے مقابل کھڑا ہونا ہے۔ ابتدا میں مکہ شہر کے اندر اس انقلابی مشن کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جو آپ کے جدّامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بسایا ہوا ہونے کے باوجود شرک کا گڑھ بنا دیا گیا تھا۔ زمین پر خدا کا پہلا گھر جس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں اس غرض سے ہوئی تھی کہ " اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْئًا " کہ خبردار میرے ساتھ تم کسی کو شریک نہ ٹھہرانا" وہاں اب تین سو ساٹھ بت نصب تھے جن کے لیے چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ پھر اس شہر کو اس لئے بھی عرب میں شہرت حاصل تھی کہ اس شہر کی عظمت کے باعث قریش کے تجارتی قافلے سال کے دو موسموں گرما و سرما میں یمن سے شام اور شام سے یمن تک بلا خوف و خطر سفر کرتے تھے۔ دوسرے قبائل کے تجارتی قافلوں کا یہاں سے گزر جانا صرف اُس صورت میں ممکن تھا کہ ان کے ہمراہ حفاظت کے لیے مسلح نفری موجود ہو۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر کو یہ حکم کہ " اٹھ کھڑے ہو جائیے!" کوئی معمولی بات نہ تھی۔ پھر مشیتِ الٰہی نے اس عظیم انقلابی پروگرام کے آغاز کے لیے جس محترم اور مقدس ہستی کا انتخاب کیا تھا اسے اس نے ان اندیشوں سے یکسر بچا لیا جو حق و باطل کی اس کشمکش میں حق کے داعی اور انقلابی پروگرام کے علمبردار کو پیش آسکتے تھے۔ اُس وقت کے صدیوں پرانے نظام اور اُس نظام کے تابع قبائلی سیاست، معاشرت ——— اور معیشت اور اس سے بھی بڑھ کر اُن لوگوں کے عقائد و اخلاق کے صدیوں پرانے مزاج کے خلاف ایک ایسی قرآنی دعوت پیغمبر کی زبانی ان تک پہنچی جس سے اُس معاشرے کے سیانے، باأثر کھاگ قسم کے لوگ اپنے لیے خطرات محسوس کرنے لگے۔ اب انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اس پیغمبر کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی دعوت کس طرح دبائی جا سکتی ہے چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قیامِ مکّہ کے تیرہ سال جس قسم کی آزمائشوں سے گزرے وہ تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ اِس ٹکراؤ اور مخالفت کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ عرب کے اُن سیانوں

اور با اثر شخصیات نے فیصلہ کیا کہ پیغمبرؐ کا کام تمام کر دیا جائے۔ اس کام کی خاطر ایک منصوبہ تیار ہوا۔ لیکن وہ لوگ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کا مقدس رسولؐ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ پہنچا۔

قیامِ مدینہ کا دس سالہ دور بھی اللہ پاک کے مقدس رسول اور اُن کے ساتھیوں کے لئے آزمائشوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے سب سے اول قبائل سے معاہدہ کیا۔ قریشِ مکّہ اب بھی اُن خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے جو وہ قرآن کی اس انقلابی دعوت کے کامیابی سے آگے بڑھنے میں محسوس کر رہے تھے۔ اس لئے یہاں بھی وہ پیچھا کرتے ہیں۔ اور رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں سے مسلّح تصادم کی نوبت آتی ہے۔ ان مسلّح تصادموں کی تعداد جن میں آپ بنفسِ نفیس شامل ہوئے ستائیس یا اٹھائیس ہے۔ اللہ تعالیٰ کے برحق پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو قدم قدم پر اپنے رب کی طرف سے تائید حاصل اور " وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ " (اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا) کا وعدہ پورا ہوتا ہے۔ بالآخر ہجرت کے آٹھویں سال وہ وقت بھی آتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا برحق رسولؐ قرآن کے اس انقلابی جھنڈے کے ہمراہ کامیاب و کامران ہو کر مکّہ کے شہر میں داخل ہوتا ہے۔ وہ تمام مخالفین جو ابتدائی دور میں قرآن کے اس انقلابی پروگرام کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے تھے، نہایت ندامت اور شرمندگی کے ساتھ انقلاب کے داعی مقدس رسولؐ کے سامنے آ کر اپنی کوتاہیوں اور آپؐ کے ساتھ روا رکھی گئی زیادتیوں اور ناانصافیوں کا برملا اعتراف کرتے ہوئے قرآن کی اس انقلابی دعوت کو تسلیم کر کے اس کے مؤید اور حمایتی بن جانے کا اعلان کرتے ہیں۔

اس واقعہ کے دو سال بعد دوسرا اور آخری مرحلہ اُس وقت پیش آتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا مقدس رسولؐ حج کی غرض سے مکہ تشریف لے جاتا ہے۔ اور کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار قرآن کے اس انقلابی پروگرام کے شیدائیوں کی موجودگی میں ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرماتا ہے۔ یہ خطبہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے تاریخ میں ' خطبۂ حجۃ الوداع ' کے نام سے مشہور ہے۔ اور موجودہ سیاست کے ماہرین اور فلسفۂ عمرانیات کے پیشواؤں نے اس خطبہ کو ' منشورِ انسانی ' کا نام دیا ہے۔ اس خطبہ میں نہایت اہم موضوعات کے علاوہ اس داعیٔ کبیر کو تحدیثِ نعمت کے طور پر اعلان کرنا پڑا : " آج جاہلیت کی تمام باتیں

میرے قدموں کے نیچے باطل ہیں .... " یہ کس قدر برملا اعلان ہے اور رسولؐ اللہ کی تیئیس سالہ انقلابی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ آج کے روز گویا رسولِ مقبول کے ہاتھوں قرآن کا وہ انقلابی پروگرام تکمیل پذیر ہو چکا تھا جس کی خاطر تیئیس سال قبل آپ کی بعثت ہوئی تھی۔ مقام غور ہے کہ رسولِ مقبول کو کتنی بڑی کامیابی تیئیس سال کے عرصہ میں ہاتھ لگی۔ ایک وہ وقت ہے کہ جب قرآن کی ابتدائی آیات کے ذریعہ انقلابی مشن رسولِ برحق کے سپرد ہوتا ہے تو آپؐ طرح طرح کے اندیشوں کو خاطر میں لاتے ہوئے " زمّلونی زمّلونی " کے الفاظ کے ساتھ اپنی زوجۂ مطہرہ سے ڈھارس طلب کرتے ہیں۔ نتیجۃً وہ آپؐ کی صفاتِ حمیدہ کا آپؐ سے ذکر کرکے آپ کو ڈھارس دیتی ہیں۔ اس کے بعد دوسری وحی میں آپؐ کو اس باطل نظام کے مقابل ابتدائی طور پر تن تنہا کھڑا ہونے کے لئے حکم دیا جاتا ہے۔ نتیجۃً قرآن کا لایا ہوا انقلابی پروگرام کٹھن منازل سے گزرتا ہوا تیئیس سال کے عرصہ میں مکمل ہوتا ہے۔ اور اس آخری حج کے دوران وحی نازل ہوتی ہے :-

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

" آج کے روز میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام پسند کر لیا۔"

یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کی حمایت میں آپؐ کی کوششوں کی تعریف اور اس مشن کی تکمیل کا پیغام تھا جس کے لیے آپؐ کو بھیجا گیا۔ جب اس پروگرام کی تکمیل ہو گئی اور یہ مشن مکمل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے برحق رسولؐ تسبیح و تحمید اور استغفار کے ساتھ مدینہ منوّرہ واپس تشریف لے گئے۔ اس واقعہ کو نصرتِ الٰہیہ اور فتح سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ سیرتِ طیّبہ کے ساتھ ساتھ کرنے والے اس بات کا اعتراف کریں گے کہ قرآن کے تیئیس سالہ نزول کے دوران اس کے انقلابی پروگرام کے نقیب اور داعی کے ہاتھوں جو کوشش عمل میں آئی یہ دراصل اُس انقلاب کا حصہ تھی جس نے مذہبی، اخلاقی، ذہنی، فکری، تہذیبی، سیاسی اور تمدنی و معاشی غرضیکہ ہر پہلو سے اُس سابقہ نظام کے جمود کو توڑا۔ اس کے اثرات بالآخر مکّہ شہر اور اس سے باہر پھیلے۔ اور جہاں بھی پہنچے اس کے اثرات مرتّب ہوئے۔ حق و باطل کی کش مکش برپا ہوئی۔ ابتدا میں ایک مختصر سی

جماعت اس انقلابی تاثیر کے زیرِ اثر داعیٔ کبیر کی حمایت میں اُٹھی ۔ یہ قرآن کی انقلابی دعوت کا اثر تھا کہ فرمانروائی اور حکمرانی کا تصوّر بدل کر اب قوم و ملک پہ آمریت مسلّط کرنے کے بجائے سیادت اور امامت خدمت کہلائی ۔ انصاف کی کرسی پہ بیٹھنے والوں کو اپنے اور بیگانے کی تمیز برتے بغیر " اِعۡدِلُوۡا ھُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی " کا حکم دیا گیا ۔ جنگ کے نتیجہ میں مفتوح قوم سے حسنِ سلوک کی ہدایت دی گئی ۔ اس نئے انقلابی پروگرام کے تحت اس نئی سوسائٹی میں عام انسانوں کو اخلاق و کردار کے اعتبار سے اس قدر بلند مقام نصیب ہوا کہ دوسرے معاشروں کے چیدہ لوگ اُنہیں اپنا سردار کہنے لگے ۔ صدیوں سے اوہام و خرافات کے چکر میں پڑے ہوئے لوگ عقیدۂ توحید کے طفیل اس قدر پُر عزم اور یقین کی دولت سے مالا مال ہو گئے کہ اب ہر قسم کے خطرات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کے اہل ہو گئے ۔ اُن کے لیے موت کا خوف کوئی خوف نہ رہا ، بلکہ موت کو مالک کا پیغام سمجھ کر اُس پہ لبّیک کہنے کے لیے ہر وقت تیار رہنے لگے ، تاکہ اس عارضی زندگی سے گزر کر ہمیشہ کی زندگی سے ہمکنار ہوں ۔ اجتماعی زندگی میں رنگ و نسل اور زمان و مکان کی بنیاد پہ انسانوں کی تفریق ، ایک ہی معاشرہ میں طبقات کی تقسیم ، اور ان کے درمیان اُونچ نیچ کا امتیاز ، معاشرت میں مساوات کا فقدان ، عورتوں کی پستی اور حقوق سے محرومی ، جان و مال اور عزّت و آبرو کی بے حرمتی ، شراب اور نشہ آور چیزوں کا عام رواج ، حکمرانوں کا تنقید سے بالاتر رہنا ، رعایا کی بنیادی حقوق سے محرومی بین الاقوامی تعلقات میں معاہدوں کی بے احترامی ، جنگ میں وحشیانہ حرکات اور اس قسم کی سینکڑوں خرابیوں نے اُس معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا ۔ لیکن جب قرآن کی انقلابی دعوت کامیابی سے ہم کنار ہوئی تو اس کے نتیجہ میں طوائف الملوکی کی جگہ نظم و ضبط ، خون ریزی اور فساد کی جگہ امن و امان ، فسق و فجور کی جگہ تقوٰی و طہارت ، ظلم و عدوان کی جگہ عدل و احسان ، گندگی اور ناشائستگی کی جگہ طہارت و پاکیزگی اور تہذیب ، جہالت کی جگہ علم اور نسل در نسل موجود عداوت کی جگہ محبت پیدا ہو گئی اور مجبور و مقہور لوگ جو غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے ، دفعۃً امامت کے درجہ کو پہنچ گئے ۔ حقیقۃً یہ قرآن کا انقلابی پیغام اور دعوت تھی جو سرعت کے ساتھ پھیلی اور تیئیس برس کی مدت میں دنیا کے مرکز میں واقع جزیرہ نمائے عرب میں ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی جس کا مطالعہ کر کے آج ہمارے مخالف حیرت کے مارے انگشت بدنداں ہیں ۔

معززِ حاضرین! مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ ہمارے مخالفین صحیفۂ ربّانی یعنی قرآن مجید کے انقلابی پروگرام کو پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبہ کی روشنی میں سمجھ گئے اور آج بھی ہر لمحہ اس سے خائف اور لرزاں و ترساں ہیں۔ اسی لیے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جہاں سے کوئی کوشش انفرادی یا اجتماعی شکل میں شروع ہوتی ہے اُسے سبوتاژ کرنے میں ہر وقت مستعد اور تیار رہتے ہیں۔ لیکن آج کا مسلمان اپنی اس ذمّہ داری سے اس قدر غافل بلکہ بعض پہلوؤں کے لحاظ سے ہمارے مخالفین کے حق میں نظر آتا ہے۔ اس صورت حال میں ہمارا مسلم معاشرہ اُس بلندی سے اس قدر پستی میں چلا گیا ہے جس کا قرآنی دعوت و پیغام کی روشنی میں تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم جاہلیت کے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ اُونچ نیچ کا فرق، حکمرانوں کے اندازِ حکمرانی، جان و مال اور عزّت کی بے حرمتی، ظلم و عدوان، فسق و فجور، شراب اور منشیات کی بہتات، مخلوط معاشرہ اور اس پر مستزاد یہ کہ آج کا مسلم معاشرہ دن بدن علاقائی، لسانی، اور نسلی بنیادوں پر چھوٹے چھوٹے طبقوں میں تقسیم ہوتا جارہا ہے۔ سیاست میں صلح اور رواداری کا فقدان، معاشرت میں حقوقِ انسانی کی نفی اور بڑے چھوٹے کے درمیان عزت و شفقت سے لاپرواہی، معیشت میں لوٹ کھسوٹ، اخلاقیات میں سچائی، امانت، دیانت، ایثار، وعدہ کا پاس و لحاظ وغیرہ ختم ہو گیا ہے۔ عقیدہ میں اللہ کی ذات پر اعتماد اور یقین ختم ہو کر رہ گیا ہے اور خواہشِ نفس کے اتباع میں بہت سے معبودوں نے انسانی ذہنوں میں جگہ پیدا کر لی ہے۔ آخرت پر یقین ختم ہو کر آج کا معاشرہ دنیا کی حرص میں اس قدر محو ہو گیا ہے کہ گویا اس کی اصل زندگی موجودہ دنیا ہی ہے اور اِسے آخرت سے کوئی سروکار نہیں۔ ایسے عالم میں زندگی کا سارا رخ ہی بدل کر رہ گیا ہے۔

ان حالات و واقعات اور معاشرہ و ماحول میں جہاں زندگی کی ساری چولیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں، انسانی زندگی کے لیے قرآن کی انقلابی دعوت اب بھی اپنے اندر حیات بخش پیغام رکھتی ہے۔ تاریخ دعوت و عزیمت کے تسلسل میں آج بھی قرآن کا ابدی و آفاقی پیغام موجودہ معاشرہ کو انقلابی بنیادوں پر بدلنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اور اس دعوت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آج کے اس مادی دور میں جہاں علم و عمل کی بساط اُلٹ دی گئی ہے، کسی نئے شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کی ضرورت ہے، جو اپنے خلوص، عزم اور ایمان و یقین کے ہمراہ قرآن و سنّت کے علم اور ساتھ ہی عمل سے آراستہ ہو کر میدان میں

اُترے۔ حق و باطل کی کشمکش اب بھی اُس کی راہ تک رہی ہے۔ حالات کا رُخ اور تاریخ کا دھارا بدلنا اس قدر آسان کام نہیں کہ محض دعووں اور جماعتوں کے قیام سے حل ہو جائے۔ بلکہ اس کے لیے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اس کے ہمراہ اُس مردِ کامل کی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں کی ضرورت ہے جو معاشرہ کے اس تنِ مردہ میں جان پیدا کر دے۔

اہلِ ملتان کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں کی خاک میں حضرت بہاؤالدین ذکریا ملتانی، ان کے بیٹے شیخ صدرالدین عارف، پوتے ابوالفتح رکن الدین اور حضرت محمد یوسف شاہ گردیزی کی روحانی شخصیات محوِ آرام ہیں، جنہوں نے اپنے اپنے دَور میں دعوت و عزیمت کے فرائض سے عہدہ برآ ہو کر پورے شمالی ہند کو اسلام کے انوار سے روشن کیا۔ اور آج شمالی ہند بشمول کشمیر کے بسنے والے مسلمان ان ہی پاکباز ہستیوں کی کوشش کے مرہونِ منت ہیں۔ بالکل اسی طرح آج بھی اسی دعوت و عزیمت کے تاریخی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے ایسی ہی شخصیت کی ضرورت ہے جو آج کے مسلمانوں کی تقدیر بدل دے۔

بے سوز تو در معرکہ ذوقے نتواں یافت
اے بندۂ مومن! تو کجائی ؟ تو کجائی ؟

شہر لاہور میں تنظیم اسلامی کا جلسہ اور اسلامی نظام معیشت کے حق میں ایک بھرپور مظاہرہ

——— (ایک منفرد انداز کی رپورٹ) ———

جنگل میں مور ناچا' کس نے دیکھا لیکن لاہور کی مال روڈ اور ملتان روڈ جیسی معروف شاہراہوں پر پچھلے ہفتے ہزاروں لوگوں نے خوشگوار حیرت کے ساتھ ایک جلوس اور جلسے کو دیکھا' سنا اور محسوس کیا کہ کچھ سرپھروں نے چھلاوے کی طرح چھلانگیں مارتی روایت کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی ہے - کیا وہ نئے "عوامی" مزاج کو بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ - اس مشکل سوال کا جواب آسان نہیں تاہم پرانی روایت کے احیاء کی کوششوں کا آغاز تو ہوا اور ہر بڑے کام کا آغاز چھوٹا ہی ہوا کرتا ہے -

جلسے سیاسی زندگی کی جان ہوتے ہیں اور بھلے دنوں میں ان کا مقصد رائے عامہ کی تیاری اور عوامی شعور کی بیداری سمجھا جاتا تھا جبکہ جلوسوں کی ایک اضافی غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ جذبات کو اظہار کا راستہ ملے جنہیں اگر دبایا جائے تو ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ جایا کرتے ہیں - ہماری نئی نسل تو اس قسم کے جلسوں جلوسوں سے شناسا نہیں لیکن ابھی کچھ لوگ گرد و پیش باقی ہیں جن کی آنکھوں نے وہ جلسے جلوس دیکھ رکھے ہیں جو خاموشی سے وقت کے دھارے کا رخ پھیر دیا کرتے تھے

نئی سیاسی لغت میں جلسہ ایک ایسے ہجوم کو کہتے ہیں' ایک ہنگامے پہ موقوف ہو جس کی رونق اور مقصد جس کا لیڈروں کی شان و شکوہ کا اظہار ہو یا کسی خاص جماعت کی قوت کا مظاہرہ - ان جلسوں میں لوگ کچھ سننے کو ترستے لیکن رونق میلہ دیکھنے کی حسرت نکالتے ہیں - حاضرین خود نہیں آتے 'لائے جاتے ہیں اور جلسہ کرنے کا خرچ ہزاروں لاکھوں سے گزر کر اب کروڑوں میں جا پہنچا ہے - غنیمت ہے کہ حاضری کے دعوے تا حال لاکھوں کے پھیر میں ہیں لیکن کروڑ کی منزل بھی دور تو نہیں - لاہور میں مینار پاکستان کے سبزہ زار کو روندنے والا آخری جلسہ اسی سال ۲۳ مارچ کو ہوا تھا جس میں ایک شعلہ بیان مقرر نے کمال احتیاط سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ میرے سامنے ساٹھ لاکھ فرزندان توحید کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے لیکن میں حاسدوں کی نیندیں حرام نہیں کرنا چاہتا لہٰذا تیس لاکھ کی تعداد پر بس کرتا ہوں -

جلسہ ان دنوں بڑا کون سا ہوتا ہے - دور و نزدیک سے بسوں میں بھر کر لائے ہوئے حاضرین کی بے ہنگم بھیڑ جن کی اکثریت اجتماع کی نوعیت اور غرض و غایت سے بے خبر اور مختلف قسم کے اثر و رسوخ کی لاٹھیوں سے ہانک کر جمع کئے گئے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے - ہاں 'سیر سپاٹے کا شوق بھی کچھ لوگوں کو اس ہانکے میں گھیر لیتا ہے - لاہور میں ہونے والے جلسوں کے لئے کپڑے کے پورے پورے تھانوں پر مشتمل بینر اور رنگ برنگے جہازی سائز کے اشتہارات خیبر سے کیماڑی تک لگائے جاتے ہیں - اخبارات کی لاٹری الگ نکلتی ہے جنہیں آدھے آدھے اور چوتھائی چوتھائی صفحے کے مہنگے اشتہار بونس میں ملتے ہیں -

جلسوں کا ایک تازہ امتیاز یہ ہے کہ حاضرین کو جلوسوں کی شکل میں جلسہ گاہ تک پہنچایا جائے جنہیں سڑکوں بازاروں میں آمد و رفت کو درہم برہم کرتے منزل مقصود پر پہنچنے میں مارے "اژدہام" کے گھنٹوں فالتو لگیں چنانچہ کامیاب جلسہ وہ ہوگا جو وقت مقررہ سے کم از کم چار چھ گھنٹے بعد شروع ہو اور جلسے کی کارروائی! کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی - مقررین کی تعداد درجنوں میں جو محض رونمائی کے لئے باری باری مائیک پر آتے اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں دو چار بڑھکیں مار کر تالیوں اور نعروں کا خراج وصول کرتے ہوئے سٹیج پر رونق افروز ہوتے چلے جاتے ہیں - حاصل جلسہ! تالیاں' سُر تال میں نعروں کے کورس 'لطیفے' قہقہے' دھمکیاں 'ذو معنی پھبتیاں' طنز' استہزا - بد نظمی نہ ہو اور گاہے گاہے کسی نہ کسی گوشے میں ہلچل نہ پائی جائے' بھگدڑ نہ مچے تو جلسہ کامیاب شمار نہیں ہوتا -

اور جلوس' پناہ بخدا - کسی بھی نظم و ترتیب سے عاری ہونا اس کی پہلی شرط ہے - جلوس کے قائدین دلہن کی طرح سجے ٹرکوں میں سوار گوٹے کناری اور پھولوں کے ہاروں سے لدے پھندے اس بارات کے دولہا ہوتے ہیں جن پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنے کے انتظامات ہی کم تفصیل طلب نہیں ہوتے - اس پہلی صف کے پیچھے جلوس کا ہر شریک اپنا قائد خود ہوتا ہے اور زبان پہ آئی ہانکنے میں پوری طرح آزاد و خود مختار - ہنگامہ آرائی نہ ہو تو جلوس ہی کیا اور سڑکوں پر ٹائر جلا کر فضا کو مسموم نہ کیا جائے تو مظاہرہ کیسا! - ٹریفک کو جام کرنا لازم اور پیدل چلنے والوں کو لپیٹ میں لے لینا جلوس کو بڑا بنانے کے لئے ضروری ہے -'

اک نئی احتیاط دیکھی ہے - اب جلسوں جلوسوں میں ذرائع ابلاغ کو بھی "خطرناک نتائج" کی دھمکی دی جانے لگی ہے - "ہمارے جلسے جلوس کی خبریں نمایاں نہ کی گئیں تو دھڑن تختہ کر دیا جائے گا" - لاتوں کے بھوت باتوں سے مانتے بھی تو نہیں - ہمارے اخبارات شاید اب یہی زبان سمجھتے ہیں - منظم و مرتب' سنجیدہ و متین اور بامقصد جلسوں جلوسوں کا ذکر بالکل گول کر دیا جاتا

ہے جبکہ پچاس لڑکے بالے بھی یورش کر دیں ' ایک ہنگامہ کھڑا کر لیں ' چار ٹائر سڑک پر جلا کر ٹریفک روک دیں اور نعروں میں اپنے مخالفین کا شجرہ نسب نشر کر دیں تو ان کی خبر چھپتی ہے ' تصویر بھی لگتی ہے بلکہ " جھلکیاں " چوکھٹے میں الگ سے دی جاتی ہیں -

مئی کے دوسرے عشرے کے آغاز میں شہر کے محض جنوبی حصے میں ہم نے کپڑے کے دس بارہ " بے تصویر " بینر بارونق چوراہوں پر لگے دیکھے جن میں سے اکثر کی دھجیاں پندرہ مئی کی شام کو آندھی نے بکھیر کر رکھ دی تھیں - " ۱۷ مئی کو بعد نماز عشاء چوبرجی کوارٹرز کے گراؤنڈ میں امیر تنظیم اسلامی ' ڈاکٹر اسرار احمد ایک جلسہ عام سے پاکستان کے مستقبل کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے " - اسی علاقے میں نسبتاً زیادہ اور شہر کے دوسرے حصوں میں برائے نام درمیانے سائز کے اشتہار بھی اسی مضمون کے نظر آئے - لاہور کے کثیر الاشاعت اخبارات میں اشتہار بھی. جی نہیں ' اشتہارچہ ... پڑھے جو بڑے بڑے اشتہارات کی چلمن سے لگے بیٹھے تھے - صاف چھپتے بھی نہیں ' سامنے آتے بھی نہیں - اس قد و قامت کے اشتہار تو بنگالی جادوگر اور روحانی "عامل" بھی ہر روز چھپواتے ہیں - یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟ - تنظیم اسلامی کے درویشوں کو کیا سوجھی - لاہور میں جلسہ عام کرنے چلے ہیں - مینڈکی کو شاید زکام ہوگیا ہے - کیا ان لوگوں نے " عوامی جلسوں " اور " انقلابی ریلیوں " کی تیاریاں نہیں دیکھی سنی تھیں جو اپنی نارسائی اور مفلسی کا مذاق سر بازار اڑوانے چلے ہیں ! - جی میں آیا کہ تماشا ہم بھی دیکھیں گے -

وقت مقررہ سے ذرا پہلے پھر ایک نسبتاً ہلکی آندھی چلنے لگی جس نے موسم کی شدت کو تو ضرور کم کیا لیکن جلسہ کے انتظامات کو بھی درہم برہم کر دیا ہوگا - ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو ہوا کے جھونکے خاک اڑا رہے تھے - واجبی روشنی تھی لیکن طوفان رنگ و نور ندارد - تنظیم اسلامی کے کارکن قریبی مسجد میں عشاء کی نماز ادا کر کے واپسی پر انتظامات کے بکھرے تنکوں کو سمیٹنے میں مصروف تھے - دیکھتے ہی دیکھتے ہر شے میں سلیقہ پیدا ہوگیا - لاؤڈ سپیکروں اور سٹیج کی روشنیوں کو آناً فاناً پھر سے ترتیب دے دی گئی جو سٹیج کے شامیانے پر لگائے گئے تھے - شامیانہ ہوا کا دباؤ برداشت نہ کر پایا تھا للٰذا اس کی بساط لپیٹنی پڑی - وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا - حاضرین دبے پاؤں آئے ' دس پندرہ منٹ میں جلسہ بھر گیا اور ٹھیک وقت پر کارروائی کا آغاز بھی ہوگیا - کارروائی تھی ہی کیا ' ایک خوش الحان قاری کی حسب موقع و محل قرآن حکیم سے پورے ایک رکوع کی تلاوت ' ایک چھوٹے سے بچے کی زبانی بامعنٰی نعت کے چند مترنم اشعار اور امیر تنظیم اسلامی ' ڈاکٹر اسرار احمد کی لگ بھگ پونے دو گھنٹے کی تقریر جسے کلاس روم لیکچر کا نام دیا جائے تو موزوں ہوگا -

سچ پوچھیئے تو ہمیں یقین تھا کہ تنظیم اسلامی کا مجوزہ پروگرام جلسہ عام تو کیا" جلسی " بھی ثابت نہ ہو سکے گا - تیاریوں کا عالم ہم دیکھ ہی چکے تھے - اس ڈھب سے بھی اب جلسے کئے جا سکتے ہیں ؟ - یہ منہ اور مسور کی دال - لیکن اب آنکھوں پہ یقین آتا تھا نہ کانوں پر اعتبار - جلسہ گاہ میں شان و شوکت کے مظاہر میں سے کوئی بھی تو چیز موجود نہ تھی ' کوئی جھنڈا نہ جھنڈیاں ' لیڈروں کی قد آدم تصاویر نہ بلند و بالا سٹیج کی کوئی زیب و زینت - نعرہ سٹیج سے یا متوالے حاضرین میں سے ایک بھی بلند نہ ہوا ' تالیاں ایک بار بھی نہ پٹیں - کسی جلوس کی آمد کا اعلان ہوا نہ یہ خبر نشر کی گئی کہ جلسے میں آنے والوں کو حکومت نے شہر میں داخل ہونے سے " روک " دیا ہے - جلسے کی حاضری سینکڑوں سے یقیناً بڑھ کر چار ہندسوں میں داخل ہو گئی تھی لیکن سٹیج سے اگر حاضرین کو لاکھوں فرزندان توحید کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کہا جاتا تو زبان کسی کی نہ گھستی ' لوگوں کا " مورال " ضرور بلند ہو جاتا - ہینگ لگتی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا ہو جاتا -

جلسے کی واحد تقریر بھی گھن گرج سے خالی ' دعووں اور بڑھکوں سے تہی - مثبت باتوں سے بھی جلسہ لوٹا جا سکتا ہے ؟ - استدلال کے زور پر بھی کوئی بات سامعین کے دل و دماغ میں اتاری جا سکتی ہے ؟ - لطیفوں اور چٹکلوں کے بغیر بھی لوگوں کو اس درجہ متوجہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ہی طویل تقریر جم کر سنیں ؟ - کیا جلسوں میں بھی عامتہ الناس کی تعلیم و تربیت جیسا بے فیض کام کیا جا سکتا ہے اور آخری سوال یہ کہ حکومتوں سے مطالبات کے علاوہ جلسوں میں کیا عوام سے بھی کوئی مطالبہ کرنا مناسب ہے - تنظیم اسلامی لاہور کے جلسہ عام نے ان سب سوالات کا جواب اثبات میں دیا - اس میں بتایا گیا کہ استحکام پاکستان کا راز اسلام کے واقعی نفاذ میں ہے ' مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لینے میں ہے اور اس کے بغیر اس مملکت خداداد کا کوئی تشخص ہی نہیں رہتا - حکومت سے صرف ایک مطالبہ کیا گیا کہ وفاقی شرعی عدالت کے ہاتھ مالیاتی قوانین پر جو باندھ دیئے گئے تھے اس کی مدت میں ۲۷ مئی یا ۲۵ جون کے بعد مزید ایک دن کا بھی اضافہ نہ کیا جائے لیکن جلسے کے حاضرین سے مطالبے تین تھے - یہ کہ وہ خود قرآن مجید کی طرف رجوع کریں ' اللہ کی اس رسی کو مضبوطی سے تھام کر اپنی عملی زندگیوں میں اسلام نافذ کریں - دوسرا یہ کہ دین کے لئے جدوجہد میں شریک ہونے کے لئے کسی نہ کسی اجتماعیت میں شامل ہو جائیں - تنظیم اسلامی کو بھی دیکھیں ' اگر دل ٹھکتا ہو تو اس کا ساتھ دیں ورنہ جس پر اطمینان ہو اس کی رفاقت اختیار کریں اور آخری یہ کہ ارباب حکومت کو خطوط ' تاروں اور قراردادوں کے ذریعے اپنی اس خواہش سے آگاہ کریں کہ اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام کا جو موقع خونیں انقلاب کے بغیر میسر آ رہا ہے ' اسے ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے - مالیاتی قوانین کو اسلام کے تابع کئے بغیر سرمایہ داری اور

جاگیرداری کی لعنت سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں اور جب تک یہ نہیں ہوتا' اسلام کے سب دعوے جھوٹے ہیں' فریب کے سوا کچھ اور نہیں -

اس جلسے نے تعمیر پسند اور مثبت کام کی خواہش رکھنے والی جماعتوں پر حجت تمام کر دی کیونکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ لوگوں نے ابھی اپنے کانوں کی کھڑکیاں بند نہیں کیں - وہ سنجیدہ باتیں سننے اور ان پر غور کرنے کے لئے اب بھی تیار ہیں اور ایسی سنجیدہ باتوں کے لئے شاید سادہ سے چھوٹے چھوٹے علاقائی جلسے ہی موزوں ہیں جہاں تھوڑے فاصلوں سے لوگ خود چل کر آئیں اور کوئی بات گرہ میں باندھ کر لے جائیں - ہمارے ہاں جلسوں کی یہی روایت تھی جسے برباد کر دیا گیا ہے - ایک پرانی روایت کا احیاء کر کے تنظیم اسلامی کی مقامی شاخ نے دینی جماعتوں پر بالخصوص احسان کیا ہے' کوئی مانے یا نہ مانے -

اس سے پہلے ۱۴ مئی کو تنظیم اسلامی لاہور نے مال روڈ پر ایک جلوس کا اہتمام کر کے ایک بار پھر منظم و مرتب بامقصد مظاہروں کے اپنے مخصوص انداز کو دہرایا - عصر سے مغرب کے درمیان مال روڈ کے ہائی کورٹ سے اسمبلی ہال تک کے حصے سے گزرنے والے ہزاروں شہریوں نے ایسا جلوس شاید زندگی میں پہلی بار دیکھا ہو لیکن کسے خبر نہیں کہ ہمارے پریس نے اس کا پوری طرح "بلیک آؤٹ" کیا - مقامی انگریزی اخبار "پاکستان ٹائمز" میں اس کی ایک تصویری جھلک کے ساتھ مختصر تفصیل اور روزنامہ جنگ میں چند سطری سنگل کالم خبر جسے تلاش کرنا بھی لانا تھا جوئے شیر کا - اللہ اللہ خیر صلا -

جلوس کے ساتھ ساتھ چلتے چند کارکن دونوں طرف راہ گیروں میں ایک ہینڈ بل تقسیم کر رہے تھے جس کے مضمون سے ہی اس مظاہرے کی روح کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے - کہا گیا تھا کہ :

اے اہل وطن! ہم پر بیالیس سال سے عذاب الٰہی قسطوں میں نازل ہو رہا ہے - کیوں؟ اس لئے کہ ہم نے زبان سے "پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ" کا ورد کیا لیکن اپنے عمل سے اسے جھٹلایا - ہم حلق کی پوری طاقت سے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن اللہ کی کبریائی کو قائم نہیں کرتے بلکہ جاگیرداروں' وڈیروں' سرمایہ داروں اور مفاد یافتہ طبقات کو بڑے سے بڑا بناتے چلے جا رہے ہیں - ہم اسلام کی برکات کا چرچا کرتے نہیں تھکتے لیکن قومی زندگی کے کسی پہلو اور خود اپنی زندگیوں پر دین کی کسی برکت کے سائے سے بھی محروم ہیں - کیا ہم اپنے قول و فعل کے تضاد کو برقرار رکھ کر اللہ تعالیٰ کے غضب کو یونہی دعوت دیتے رہیں گے؟ - آیئے آج فیصلہ کر لیں کہ جو ہونا تھا' ہو چکا - اب ایسا نہیں ہو گا - آیئے اللہ کی جناب میں توبہ کریں اور اس موقع سے فائدہ اٹھائیں جو حسن اتفاق سے ہمیں آج میسر آ گیا ہے -

موجودہ دستور کی رو سے ۲۴ جون ۱۹۹۰ء کو وفاقی شرعی عدالت آزاد ہو گی کہ مالیاتی قوانین کو بھی شریعت کے معیار پر پرکھ کر دیکھے اور ان میں سے سود، جوئے، سٹے اور سرمایہ داری و جاگیر داری جیسے لعنتی کھوٹ کو نکال باہر کرے جو ایک طرف ہمارے معاشرے کی خباثتوں کی جڑ بنیاد ہے اور دوسری طرف ہمیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باغیوں کی صف میں کھڑا کئے ہوئے ہے۔ اندیشہ ہے کہ ہمارا برسر اقتدار گروہ مل جل کر اسلام کے عادلانہ معاشی نظام کے نفاذ کے اس دستوری اور عدالتی راستے کو بند رکھنے کے لئے مالیاتی قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر رکھنے کی مدت میں اضافہ کر دے گا کیونکہ حزب اقتدار والے ہوں یا حزب اختلاف والے، دونوں ہی موجودہ فاسد اور غیر منصفانہ مالیاتی نظام سے لامحدود ناجائز فائدے اٹھا رہے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم اللہ اور رسول سے اپنی وفاداری اور اسلام سے اپنی وابستگی کا ثبوت پیش کریں اور قومی اسمبلی سے مطالبہ کریں کہ وفاقی شرعی عدالت کے ہاتھ کھول دیئے جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ عدالت جوئے، لاٹری اور سٹے جیسی خباثتوں کو تو فی الفور خلاف اسلام قرار دے کر ملکی معیشت سے خارج کر دے گی اور سرمائے کے سود اور زمین کے سود جیسی لعنتوں کے بارے میں فیصلہ دے کر ان کے خاتمے کی مناسب مہلت دے گی جنہوں نے امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا دیا اور جو ہماری معیشت، سیاست، معاشرت بلکہ پوری اجتماعی زندگی کو تباہ و برباد کئے دے رہی ہیں۔

خطوط اور تاروں کے ذریعے صدر پاکستان، قومی اسمبلی کے سپیکر، وزیر اعظم، اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ اور متحدہ پارلیمانی اپوزیشن کے قائد پر زور دیجئے کہ وفاقی شرعی عدالت پر عائد اس پابندی کو ۲۵ جون کے بعد ایک دن کے لئے بھی نہ بڑھایا جائے۔ گلی محلوں میں چھوٹے بڑے جلسے کر کے اسی مطالبے پر مشتمل قراردادیں اخبارات سمیت سب کو بھجوائیے... شاید کہ عذاب الٰہی کو ٹالنے کی کوشش کا یہ آخری موقع ہو!۔

اس جلسے اور جلوس میں اخبارات کو تنظیم اسلامی کے کارکنوں یا ہمدردوں کی طرف سے کوئی "الٹی میٹم" جاری نہیں ہوا۔ کیا "سیاست" میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟۔ سیاست کے مروجہ انداز تنظیم اسلامی نے اختیار ہی نہیں کئے۔ شاید "سیاسی کامیابیاں" اس کے پیش نظر ہیں ہی نہیں!۔

(بشکریہ ہفت روزہ "ندا" لاہور)

افکار و آراء

شہداد پور (سندھ) میں مقیم ایک دوست کے نام

لطف الرحمٰن خاں صاحب کا مکتوب

برادر عزیز ۔ السلام علیکم ۔

تمہارا خط کل ملا تھا۔ آج رجسٹرڈ پارسل سے کتابیں روانہ کر دی ہیں۔ امید ہے انشاء اللہ مل گئی ہوں گی۔

سندھ کے حالات کا بخوبی علم ہے اور وہاں کے لوگ جس عذاب میں مبتلا ہیں اس کا بھی اندازہ ہے۔ تم نے دعا کے لئے لکھا ہے اور تمہاری تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کل تمہارا گزارا صرف دعا پر ہے۔

میرے بھائی اگر صرف دعا سے مسئلے حل ہو جاتے تو آج روئے زمین پر مسلمانوں سے زیادہ آسودہ حال کوئی قوم نہیں ہوتی ۔ لیکن حقیقت بالکل برعکس ہے ۔ ایسا اس لئے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو بدلنے کے لئے جدوجہد نہ کرے۔ اسی کا نام "جہاد" ہے۔ شمشیر و سناں والی جدوجہد کو "قتال فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ اور آج یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو گئی ہے کہ جب تک "عبادات" کے ساتھ "جہاد" شامل نہ ہو "فلاح" نصیب نہیں ہو سکتی ' نہ اس عارضی زندگی میں اور نہ ہی دائمی زندگی میں۔

صرف سندھ نہیں بلکہ پورے پاکستان میں آج جو حالات ہیں وہ ہمارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہیں۔ اگر ہم ایمانداری سے تجزیہ کریں تو ماننا پڑتا ہے کہ گذشتہ چالیس بیالیس سال میں ہم نے اپنی تمام توانائیاں اور ساری صلاحیتیں صرف دولت کمانے اور جائداد بنانے کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ ہم نے نہ کچھ سوچا اور نہ کچھ کیا۔

دولت کمانا اور جائداد بنانا فی نفسہ برا نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ حدِ اعتدال کے اندر ہو۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس MAD RACE میں ہم اعتدال تو کیا اس کی انتہاؤں سے بھی آگے نکل گئے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے چائے میں اگر اعتدال کے ساتھ چینی ڈالی جائے تو اس کی کڑواہٹ ختم ہو جاتی ہے اور وہ خوش ذائقہ ہو جاتی ہے۔ لیکن یہی چینی اگر اعتدال سے زیادہ ہو جائے تو چائے پھر کڑوی ہو جاتی ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ہم نے اپنی چائے اپنے ہاتھوں سے کڑوی کی ہے تو پھر اصلاح آج بھی ہو سکتی ہے۔ اپنی غلطی کو پہچاننے اور ماننے کے بعد ہی یہ ممکن ہو گا کہ ہم اعتدال کی راہ کو تلاش کریں اور اسے اپنانے کی جدوجہد کریں۔ ہم میں سے کچھ لوگ اگر خلوص نیت سے اس جدوجہد میں مصروف ہو جائیں تو پھر امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالےٰ ہماری دعائیں بھی سنے گا۔

تمام دنیا کے فلسفے اور نظریات چھان مارو تمہیں اعتدال کہیں نہیں ملے گا۔ یہ اگر کہیں ہے تو صرف قرآن میں۔ اُس قرآن میں جسے عقلِ سلیم نے سمجھا ہو اور جو دل میں اتر گیا ہو۔ فہمِ قرآن کے نور کے بغیر نہ تو ہم اعتدال کی راہ تلاش کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی شناخت کر سکتے ہیں۔ اگر ہم قرآن کی طرف پلٹ آئیں تو اب بھی ہمارے حالات سدھر سکتے ہیں۔ حالات بظاہر کتنے بھی مایوس کن اور حوصلہ شکن ہوں لیکن ابھی ہمارا Point Of No Return نہیں آیا ہے۔ ابھی ہم Better Late Than Never کے مرحلے میں ہیں۔ بحیثیت قوم ہماری مہلتِ عمل کے کچھ دن ابھی باقی ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے اور اس وقت یہ ضرورت انتہائی شدید ہے کہ ہم میں سے کچھ کھڑے ہوں' ہمت کریں اور قرآنی علوم حاصل کرنا شروع کریں۔ ساتھ ہی اپنے حلقہ میں ایک ایک فرد کو قرآنی علوم کے حصول کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کریں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ لوگ انکار کریں گے اور مذاق اڑائیں گے لیکن اس بات پر گولی کوئی نہیں مارے گا۔ اس کوشش میں جو بھی چند لوگ تمہارے ساتھ آئیں گے وہی ایک خوشگوار تبدیلی کا عنوان بنیں گے۔ کسی بھی تبدیلی یا انقلاب کی ابتدا ہمیشہ چند افراد کے ہاتھوں ہی سے ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پہلی مرتبہ توحید کا نعرہ بلند کیا تھا تو وہ تنہا تھے۔ ابتداءً ان کی آواز پر لبیک کہنے والے افراد کل چار تھے۔ دس سال کی محنت کے بعد بھی صحابہ کرام کی تعداد سو سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر ان لوگوں نے جو انقلاب برپا کیا اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اس لئے ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ہم خیال لوگوں کی تعداد سے بے نیاز ہو کر کام کیا جائے۔ اور آخری بات بھی انتہائی اہم ہے کہ کم از کم ہم اس کام میں کسی قسم کے تعصب سے کام نہ لیں۔

تم شاید سوچ رہے ہو گے کہ یہ کام کرنے کے لئے تارک الدنیا ہونا پڑے گا۔ اور بیوی بچوں کی ذمہ داری ہوتے ہوئے ترکِ دنیا ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہی ہماری سب سے بڑی بھول ہے کہ ہم نے دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک کو حاصل کرنے کے لئے دوسرے کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ حالانکہ دین تو ہے ہی اس دنیا کے لئے۔

حقیقت یہ ہے کہ روزی کماتے ہوئے اور بیوی بچوں کی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے ہی یہ کام ہونا چاہئے۔ کم از کم اسلام کا تو یہی تقاضا ہے۔ دنیا ترک کر کے اللہ کی رضا تلاش کرنا نصاریٰ کا فلسفہ ہے' مسلمانوں کا نہیں۔ ایمانداری سے سوچو اور خود اپنے آپ کو جواب دو کہ دفتری اور کاروباری مصروفیات کے دوران کیا ہم موسم' کرکٹ اور سیاست پر بات نہیں کرتے؟ کیا اسی بات کا رخ قرآنی علوم کے حصول کی ترغیب کی طرف نہیں موڑا جا سکتا؟ کیا اس کام کے لئے کسی اور زندگی کا انتظار ہے؟ روزمرہ کی زندگی میں مختلف مواقع پر ہم لوگوں کو تحفے دیتے ہیں۔ کیا انہی تحفوں کو قرآنی کتب اور

کیسٹ میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا؟ کاروبار کے ہی سلسلہ میں ہم سفر کرتے ہیں۔ کیا سفر کے دوران ہم مطالعہ نہیں کر سکتے' کیسٹ نہیں سن سکتے؟ کیا اپنے ۲۴ گھنٹوں میں صرف ایک گھنٹہ الگ نہیں کر سکتے؟ ان میں سے کوئی بھی بات ناممکن نہیں ہے۔ سب کچھ ممکن ہے اور ہر پڑھے لکھے انسان پر فرض عین ہے۔ بات صرف ارادہ اور پختہ ارادہ کی ہے۔ ارادہ پختہ ہو تو راستے نکل آتے ہیں۔ بلکہ میں تو اس کا قائل ہوں کہ :۔

Either I Will Find Out A Way, Or I Will Make One

بات عزم اور حوصلے کی ہے۔ اگر حالات کے ساتھ بہنا چاہتے ہو تو پھر حالات جو کچھ بھی دکھائیں اسے برداشت کرنے کی عادت ڈالو۔ اور اگر حالات کو بدلنے کا حوصلہ ہے تو آگے بڑھو اور کام شروع کرو پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔

کام شروع کرنے کے سلسلہ میں جس قسم کی بھی راہنمائی اور تعاون کی ضرورت ہو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مددگار ہو۔

لطف الرحمٰن' ا ا ہجرہ

اِسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

ایک دردمند نوجوان کا سبق آموز خط

جناب ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم!

بعد از سلام حمد و ثنائے رب جلیل اور لاکھوں رحمتیں ہوں اس آقائے نامدار کی ذات اقدس پر جن کی آمد سے انسانیت کو وہ مقام ملا جس کا وہ استحقاق رکھتی تھی مگر اپنی ہی غفلتوں' بداعمالیوں اور انفرادی و اجتماعی بگاڑ کی بدولت اس مقام سے محروم تھی۔

گرامی قدر! نہایت ہی مہربانی ہو گی کہ اگر آپ زندگی کے معروف ترین اور قیمتی اوقات سے چند ساعتیں اس خط کی نذر کریں۔ میری زندگی کی ۲۱ بہاریں گذر چکی ہیں جو موسموں کی تبدیلیوں اور نشیب و فراز سے پر تھیں۔ آج جب اپنے ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو جسم پر ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے' کہ

اگر دنیا کاقیام اسی طرح گذر جاتااور صالحات سے خالی نامۂ اعمال واپس مل جاتاتو کیابنتا۔ اگرچہ اب بھی پارسائی کا دعویٰ نہیں ،مگراس خوف کے ساتھ ہی ایک سکون کا جھونکابھی دماغ کو معطر کر دیتا ہے کہ چلو برائی دیکھ کر صراط مستقیم دیکھنا نصیب ہوا' لہٰذا اس کی قدروقیمت کا احساس بھی مضبوط ہو گااور اطمینان قلب بھی حاصل ہو گا۔ اس عظیم تبدیلی کا محرک اسلامی جمعیت طلبہ بنی۔ اب میں جمعیت کا امیدوار رکن ہوں۔ مولانا مودودیؒ کی اکثر کتب کامطالعہ کر چکاہوں۔آپ کے میثاق اور حکمت قرآن کا باقاعدہ قاری ہوں 'اگرچہ خریدار نہیں۔

محترمی! جمعیت کے نزدیک مجھے جو چیز لے کر آئی تھی اور میرے خیالات کی تبدیلی کا محرک بنی تھی وہ یہ ہے کہ جب نبی اکرمؐ کی بعثت سے قبل کی انسانیت کا مطالعہ کیا اوران لوگوں کی انفرادی سیرتوں اور اجتماعی کردار کے بگاڑ کو دیکھا' بعدازاں نئی قائم شدہ سلطنت مدینہ کے ایک عام شہری کی سیرت اور بحیثیت مجموعی اس پہلی اسلامی ریاست کا بین الاقوامی پلیٹ فارم پر اصولی کردار دیکھاتو پتہ چلا کہ آج بھی انسانیت کے دکھوں کا مداوا ایسی تبدیلی ہے۔ چنانچہ میرے دل میں بھی اس تبدیلی کی خواہش پیدا ہوئی اور جمعیت کے ساتھ چلانے میں محرک بنی۔ جمعیت میں آکر مظاہرے بھی کئے' جماعت اسلامی کے جلسوں میں نعرے بھی لگائے 'انقلاب کو آوازیں بھی دیتے رہے۔ کچھ ایسے افعال بھی کئے جو ضمیر کے خلاف تھے مگر نظم کا تقاضا تھا۔ لیکن الحمدللہ عام جماعتوں کے کارکنوں کی طرح اندھی تقلید اور "رنگروٹ" والی سوچ مجھ میں پیدانہ ہوئی۔ لیکن میں نے جو کچھ قرآن مجید' مطالعہ حدیث' سیرت کی کتب' مدینے والی ریاست' اس کے باشندوں اوران کے باہمی معاملات کا مطالعہ کیاوہ عملی طور پر اپنی اجتماعیت میں نظرنہ آئے۔ انقلاب کے لئے جن اجتماعی اور انفرادی اوصاف کی ضرورت ہےوہ میں نہ دیکھ سکا۔ انقلاب علیٰ منہاج النبوۃ کے جولازمی مقتضیات ہیں وہ مجھے نظرنہ آئے۔ میں نے بعض لوگوں کی مخالفت کے باوجود ان خیالات کو کھلے عام بیان کرنا شروع کر دیا۔

اب میں نے بالکل مختلف انداز میں سوچنا شروع کیا (یہ سوچ آپ کو اچھی لگے یا بری) کہ وہ مدینے والی اجتماعیت دنیا میں تھی بھی یا محض ایک افسانوی کہانی ہے جس کو مذہبی جنون میں حقیقت کا رنگ دیا جاتا ہے؟ اس طرح میں اشتراکیت کے قریب جارہاتھا مگر خدا کا فضل ہوااس نے گمراہی سے بچالیا۔ یعنی میں اس کام کو چھوڑنے کی بجائے اس فیصلہ پر پہنچا کہ اپنے گاؤں کی سطح پر اس اجتماعیت کی کوشش کرتا ہوں۔ بفضلہٖ تعالیٰ تھوڑی سی محنت کے بعد میں نے ایسی اجتماعیت تیار کر لی جو مجھے بذات خود بھی منفرد دکھائی دینے لگی۔ اس لئے نہیں کہ یہاں میری محنت تھی بلکہ بنفسہٖ ہمارے حلقہ کے لوگ دوسرے حلقہ جات سے جدانظر آنے لگے۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ ہمارا حلقہ ملکی سطح کی بڑی اجتماعیت کا حصہ تھاجب دیگر حلقہ جات سے میل جول وسیع ہوا تو تعریفی کلمات آنے لگے مگر خود میں ایک چیز محسوس کر رہاتھا کہ میں نے جس چیز سے بھاگ کر اپنے حلقہ میں کام کا آغاز کیا تھاوہ بگاڑ روایات کی شکل میں ہمارے حلقہ میں منتقل

ہو رہا ہے۔ میں ذاتی طور پر تنظیم کا حصہ ہونے کے سبب ان باتوں پر کھل کر تنقید بھی نہ کر سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اپنے حلقہ کے اندر سوئے ظن کی سرخ آندھی چل پڑتی۔ دوسری طرف اپنے حلقہ کو سارے ملک کی تنظیم سے سے الگ بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں یہ خود ہی کہتا تھا کہ یہ خیر کا بہترین سرمایہ ہے۔

اب تیسرا راستہ یہ تھا کہ میں نے ایک طرف دوسرے حلقہ جات کی اصلاح کا کام شروع کیا' لیکن وہ تو کڑی تنظیمی پابندیوں کے باعث میرے تنظیمی دائرہ کار تک ہی محدود رہ کر کیا جا سکتا تھا یعنی تحصیل کے اندر۔ اب ہوا یوں کہ میرے خلاف ایسی ہوا چلی کہ میرے اصلاحی کام پر شکوک و شبہات کی دھول پھینکتی چلی گئی اور ہمارا حلقہ بھی انسانوں کا ایک ایسا طائفہ بن گیا جو اپنا گروہی مفاد پہلے دیکھتا ہے اور اسلام کے مفاد کو بعد میں۔ جو اپنے گروہ کے راستے کو مقصد زندگی بنالیتا ہے حالانکہ گروہ مقصدِ زندگی تک پہنچنے کے لئے ذریعہ کے طور پر بنائے جاتے ہیں۔ جو صرف مقصدِ زندگی کے حصول کی ترغیب پیدا کرنے کے لئے اور اس کے حصول میں مدد دینے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

میں نے اس اجتماعی بگاڑ پر جتنا بھی غور کیا ہے اس کی وجہ مصلحت آمیز سیاست کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو انفرادی معیار کا بلند ہونا یقینی ہو جاتا ہے اور انفرادی سطح پر یہ تبدیلی آ جائے تو اجتماعیت خود بخود بدل جاتی ہے۔ مثلاً اگر کارکن دوسرے کارکنان سے تعلق بنانے کے وقت یہ نہ سوچے کہ اس کا معاشرتی قد کاٹھ کتنا ہے' یہ کون سی برادری سے تعلق رکھتا ہے اور یہ اگلے الیکشن میں کیا اور کتنا کام دے گا۔ یا پھر اگر دریاں اٹھانے والے' نعرے لگانے والے' آگے پیچھے دوڑنے والے کارکنان علیحدہ ہوں اور بن ٹھن کر اسلامی انقلاب کی امید دلانے والے اور حکمرانوں کا سا انداز اختیار کرنے والے لوگوں کا ایک الگ گروپ ہو تو ایسی تنظیموں میں سے اخلاقیات کا خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ پہلی قسم کی وجہ سے نیتوں کا مرکز بدل جاتا ہے اور دوسری قسم سے اس مٹی اٹھانے والے آقا کا معیار نہیں بنتا۔

اب میری حالت یہ ہے کہ سخت مضطرب ہوں۔ کبھی کبھی ذہنی کشمکش کی بدولت اتنی گمراہ کن سوچیں آنا شروع ہو جاتی ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ انسانوں کو مفادات کے بغیر ایک اجتماعیت میں پرو دیا جا سکے اور بعض دفعہ تو یہ خیالات بھی آنے لگتے ہیں کہ معاشی مفادات کے اشتراک کے بغیر منظم اور مضبوط اجتماعیت پیدا کرنا مشکل ہے۔ پھر نماز میں یہ آیت وردِ زبان ہو جاتی ہے اھدنا الصراط المستقیم۔

آپ کو خط تحریر کرنے کے دو مقاصد ہیں۔ اولاً آپ میری بذریعہ خط راہنمائی فرمائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟۔ ثانیاً میں بی اے میں پڑھتا ہوں اور تھوڑا بہت تحریر و تقریر کے شعبے سے بھی آشنا ہوں میں نے جب سے آپ کا مضمون "جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ" پڑھا ہے یہ ارادہ کیا ہوا ہے کہ بقول شاعر۔

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

یعنی میں پورے شعور وادراک کے ساتھ قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآن کا علم حاصل کر کے ادیان عالم کے متعلق ریسرچ کروں، خواہ اس کے لئے پوری زندگی لگا دینی پڑے۔ مگر گھریلو حالات اور خصوصاً معاشی مجبوریاں اس کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ اگر آپ میری رہنمائی فرمائیں اور لاہور میں مجھے کوئی ہلکی سی ملازمت مل جائے تو میں اپنے ارادے کو عمل کا جامہ پہنا سکتا ہوں۔

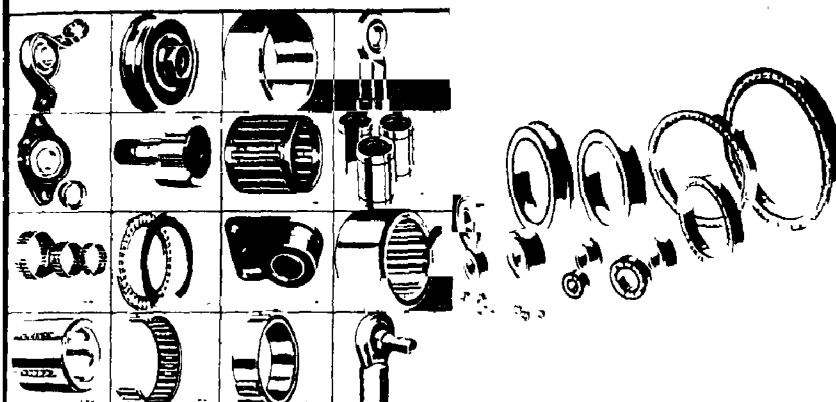
میں نے خط میں جو دوسرا مقصد تحریر کر دیا ہے مجھے ڈر ہے کہ آپ سوئے ظن میں مبتلا ہو کر کہیں تمام خط کو اس کی تمہید نہ سمجھ لیں، لہٰذا آپ کے اس متوقع گمان سے بچنے کے لئے وضاحت کر رہا ہوں کہ اختلاف مجھے آپ کے نظریات سے بھی ہے جو بعد میں آپ کے سامنے ظاہر کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک گروہ مصلحت آمیز سیاست کا شکار ہو چکا ہے اور آپ نے اصولی سیاست کو بھی گناہ ٹھہرا لیا ہے۔ بہر حال یہ لمبی باتیں ہیں جو بحکم الٰہی بالتفصیل بالمشافہ ملاقات پر ہوں گی۔

اپنی آہ سحر گاہی کی دعاؤں میں صرف ایک بار ہمارا حصہ بھی کر دیں

آپ کا بھائی ''ق'' ۔ گجرات

بقیہ : الہدیٰ

رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ۔'' اللہ چن لیتا ہے، پسند کر لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے ایلچی اور پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی ۔۔ اور یہاں فرمایا : '' ھُوَ اجْتَبٰکُمْ ۔'' اے مسلمانو، اے ایمان کے دعوے دارو اب تم چن لیے گئے ہو، تمہارا انتخاب ہو گیا ہے ایک عظیم مقصد کے لیے ۔ وہ عظیم مقصد کہ جو اس آیۂ مبارکہ کے اگلے الفاظ میں تفصیل کے ساتھ زیر بحث آئے گا۔ (جاری ہے)





تنظیم اسلامی پاکستان کے زیرِ اہتمام
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان میں منعقد ہونے والے

آئندہ پروگرام

(۱)

سہ روزہ خصوصی تربیت گاہ

۱۴ر اگست ۹۰ء نمازِ عصر تا ۱۷ر اگست ۹۰ء دوپہر

(اس میں وہ رفقاء شریک ہو سکیں گے جو پہلے ہفت روزہ مبتدی تربیت گاہ میں شرکت کر چکے ہیں)

(۲)

ہفت روزہ تربیت گاہ

۱۷ر اگست ۹۰ء سہ پہر تا ۲۳ر اگست ۹۰ء شام

(۳)

ہفت روزہ تربیت گاہ

۲۸ر ستمبر ۹۰ء سہ پہر تا ۴ر اکتوبر ۹۰ء شام

(۴)

توسیعی مشاورت

۶ر تا ۹ر اکتوبر ۹۰ء

تنظیم اسلامی کے طے شدہ مشاورتی نظام کے مطابق رفقاء کی آراء سے استفادہ کی خاطر اس میں رفقاء کے لیے

اظہارِ خیال کا موقع ہو گا۔

مزید برآں یہ طے پایا ہے کہ ان شاء اللہ العزیز

آئندہ سالانہ اجتماع

۲۲ر فروری ۹۱ء جمعۃ المبارک تا ۲۵ر فروری سوموار سہ پہر منعقد ہو گا!

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت

جلد: ۳۹

شمارہ: ۸

محرم الحرام ۱۴۱۱ھ

اگست ۱۹۹۰ء

فی شمارہ -/۵

سالانہ زرتعاون -/۵۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/-
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove IL 60516
Tel : 312 969 6755

c/o Mr Rashid A Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel · 313 977 8081

CANADA US $ 12/-
c/o Mr. Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd #1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel . 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/-
c/o Mr. Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel 01 805 8732

MID - EAST DR 25/-
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/-
c/o Mr. Hyder M D. Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel . 42127

K S A SR 25/-
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/-
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت: ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱-داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی- فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حسبِ پروگرام ۲ جولائی کو بیرونِ ملک سفر سے واپس تشریف لے آئے تھے۔ یہ سفر اس اعتبار سے سابقہ تمام اسفار سے ممتاز تھا کہ اس میں پہلی بار امیر محترم کو سپین جانے کا موقع ملا۔ بلاشبہ یہ ایک خداداد موقع تھا جس سے فائدہ نہ اٹھانے کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ امیر تنظیم بہت گہرے تاثرات کے ساتھ اور بوجھل دل لے کر اس سفر سے واپس لوٹے۔ ۴ جولائی کے مختصر خطاب عید میں سفر سپین کے تاثرات ہی اُن کا موضوع تھا۔ پھر ۶ جولائی کے خطاب جمعہ میں اسی موضوع پر قدرے تفصیل سے گفتگو ہوئی اور اس سے اگلے جمعہ کو بھی موضوعِ خطاب یہی رہا۔ اپنی کتاب 'استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ' میں وہ اس سے پہلے بھی مسلم انڈیا کی تاریخ اور مسلم سپین کی تاریخ کے مابین اس حیرت انگیز مشابہت کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ ایک ہی سال میں یعنی ۹۳ھ میں اسلام برعظیم پاک و ہند میں سندھ کے راستے اور برّ اعظم یورپ میں اسپین کے راستے داخل ہوا تھا۔ اسی حوالے سے انہوں نے اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ سپین سے اسلام کے خاتمے کو تو تین سو برس بیت چکے ہیں، اِدھر سندھ میں سیاسی حقوق کی آڑ میں جس طرح مخالفِ اسلام جذبات کو ہوا دی جا رہی ہے، تو شدید اندیشہ ہے کہ کہیں یہ برعظیم پاک و ہند سے اسلام کے خاتمے کا نقطۂ آغاز نہ بن جائے! اس لیے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ احساس تھا کہ موجودہ پاکستان برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے آخری حصار کی حیثیت رکھتا ہے اور سندھ کے داخلی حالات پاکستان کے استحکام کے لیے شدید خطرہ ہیں۔ دوسری جانب ہندومت کے احیاء کی پرزور تحریک ہندوستان میں قدم جما چکی ہے۔ چنانچہ سندھ کے معاملے کو اس پورے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ محض کوئی علاقائی مسئلہ نہیں رہتا بلکہ درحقیقت برعظیم پاک و ہند میں اسلام کا مستقبل اسی خطے سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس حالیہ سفر کے نتیجے میں امیر تنظیم کے یہ مذکورہ بالا تاثرات پہلے سے کہیں زیادہ

گہرے اور شدید ہو چکے ہیں۔ مسلم انڈیا اور مسلم سپین کی تاریخوں میں مشابہت کے کئی اور پہلو بھی اس بار امیر محترم کے مطالعہ میں آتے ہیں جن کا ذکر انہوں نے تفصیل کے ساتھ اپنے خطاباتِ جمعہ میں کیا ہے۔ پھر اسپین سے اسلام کا خاتمہ جن حالات میں ہوا اُن کا مطالعہ بھی ہمارے لیے عبرت کا بہت کچھ سامان اپنے اندر رکھتا ہے ——— خیال یہ تھا، اور گذشتہ شمارے میں اس ارادے کا اظہار بھی کیا گیا کہ امیر تنظیم کے سفرِ سپین کے تاثرات کا ایک خلاصہ تازہ شمارے میں شائع کیا جائے لیکن چونکہ 'ندا' کی ۳۱ جولائی ۹۰ء کی اشاعت نے اِس ضرورت کو کما حقہٗ پورا کر دیا ہے کہ اس میں اس موضوع سے متعلق امیرِ محترم کے تمام خطابات کو مرتب کر کے ایک جامع مضمون کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے' اور 'ندا' کا مطالعہ چونکہ 'میثاق' کے اکثر قارئین کے معمول میں شامل ہے۔ لہٰذا 'میثاق' میں اس مضمون کا اعادہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ امیر تنظیم کے اِس خطاب کو کتابچہ کی شکل میں شائع کرنا بھی ہمارے پروگرام میں شامل ہے۔

پاکستان کے موجودہ حالات میں جبکہ عافیت کی بظاہر کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی اور صورتِ حال کی بہتری کی جانب جانے والا ہر راستہ بند نظر آتا ہے' اجتماعی توبہ کی ضرورت کا احساس ہر دردمند مسلمان کو ہے۔ چنانچہ ۲۰ جولائی کے خطابِ جمعہ میں امیر محترم نے 'اجتماعی توبہ کی ضرورت واہمیت اور اس کی ممکنہ عملی صورت' کو موضوعِ گفتگو بنایا۔ اس موضوع کے متعدد ضمنی گوشے بھی بڑی وضاحت سے اس خطاب کے ذریعے سامعین کے سامنے آئے۔ اس خطاب کی اہمیت اور افادیت کو تمام شرکاءِ اجتماع نے محسوس کیا۔ چنانچہ اسے مرتب کر کے یکجا اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

قرآن کالج میں بی اے کلاس اور 'ایک سالہ کورس' کے داخلے شروع ہو گئے ہیں۔ اس ضمن میں مفصّل اعلان بشکلِ اشتہار اسی شمارے میں شامل ہے۔ خواہشمند حضرات اسے نظر سے ضرور گزار لیں! ——— امیر تنظیم اسلامی کے ۳ اگست کے خطابِ جمعہ کو جس میں وقت کے ایک اہم اور نازک مسئلے یعنی شریعت بل کا معاملہ ایک بھرپور اور متوازن تجزیئے کی صورت میں تفصیل سے زیرِ بحث آیا تھا، ہنگامی طور پر مرتب کر کے اسی شمارے میں شامل کر دیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ خطاب مفصل انداز میں 'ندا' کی آئندہ اشاعت کی زینت بنے گا۔

قرآن کالج لاہور

اعلان داخلہ
برائے بی اے کلاس

موجودہ انحطاط پذیر معاشرے میں ایک مثالی درس گاہ

چند خصوصیات

- پنجاب یونیورسٹی کے نصاب کے عین مطابق طلبہ کے لیے بہتر تعلیمی سہولت فراہم کی گئی ہے۔
- قرآن حکیم کے منتخب مقامات اور عربی زبان کی اضافی تعلیم کے ذریعے "رجوع الی القرآن" کا شعور بیدار کرنے میں یہ کالج اہم کردار ادا کرتا ہے۔
- اس طرح قرآن کالج دراصل دنیوی اور دینی تعلیم کا ایک حسین سنگم ہے۔
- قرآن کالج میں تدریسی عمل پوری سنجیدگی، شائستگی اور تسلسل کے ساتھ تقریباً سارا سال جاری رہتا ہے۔
- سنجیدہ اور محنتی طلبہ کے لیے قرآن کالج ہنگاموں سے پاک پُرسکون تعلیمی ماحول اور بہتر تعلیمی مواقع فراہم کرتا ہے

اعلانات

- بی اے میں داخلہ کے لیے فارم جمع کرانے کی آخری تاریخ ۱۵ اگست ۹۰ء ہے۔
- داخلہ کے لیے انٹرویو ۲۱ اگست ۹۰ء کو ہوں گے اور تعلیم کا آغاز یکم ستمبر ۹۰ء سے ہوگا۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)
- گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ حضرات کے لیے "دینی تعلیم کے ایک سالہ کورس" میں داخلہ بھی مذکورہ بالا تاریخوں کے مطابق ہوگا۔

(صفحہ کی پشت پر دیکھئے)

طلبہ کا مستقبل

- مستقبل میں شریعت لا میں ایل۔ایل۔بی کرنے والوں کے لیے بہت روشن مواقع موجود ہیں۔ قرآن کالج سے گریجویشن کرنے والے طلبہ کے پاس پنجاب یونیورسٹی کی ڈگری کے ساتھ قرآن اور عربی کا علم بھی ہوگا۔ اس لیے انہیں دوسروں پر واضح برتری حاصل ہوگی۔
- سنجیدہ اور محنتی طلبہ قرآن کالج کے تعلیمی ماحول سے فائدہ اٹھا کر اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکتے ہیں اور مقابلہ کے امتحانوں میں دوسروں پر برتری حاصل کر سکتے ہیں۔
- قرآن کالج کی کوشش ہے کہ وہ پاکستان سول سروس کو ایسے افسران مہیا کرے جو اپنے علم اور کردار کی بنیاد پر روشن مثالیں قائم کر سکیں۔
- قرآن کالج کی یہ بھی کوشش ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو ایسے اساتذہ مہیا کرے جو تدریس کے ساتھ ساتھ طلبہ کی کردار سازی کا اہم فریضہ بھی سرانجام دیں جس کی صحیح خطوط پر بجا آوری قرآنی علوم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اہم نوٹ

F.S.c کے وہ طلبہ جو میڈیکل یا انجنیئرنگ میں اتنے نمبر حاصل نہیں کر سکے کہ انہیں M.B.B.S یا B.E میں داخلہ مل سکے انہیں اور ان کے والدین کو خصوصیت سے ہماری گزارشات پر غور کر کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ آپ کے علم میں یقیناً یہ صورتِ حال بھی ہوگی کہ اب متعدد M.B.B.S اور B.E پاس طلبہ بھی css کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں اور کامیابی کی صورت میں csp آفیسر بننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان حالات میں قرآن کالج کے تعلیمی ماحول سے فائدہ اٹھانا یقیناً ایک بہتر اور روشن مستقبل کا ضامن فیصلہ ہوگا۔

نوٹ: مزید تفصیلات اور داخلہ فارم کے لیے دس روپے ادا کر کے پراسپکٹس حاصل کریں۔

فَاَیۡنَ تَذۡہَبُوۡنَ؟

○

پرائیویٹ شریعت بل ۱۹۸۵ء سے

نفاذِ شریعت ایکٹ ۱۹۹۰ء تک

○

ع "دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!"

○

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیمِ اسلامی

کے خطابِ جمعہ (۳ر اگست ۹۰ء)

کی تلخیص و تبییض، بعض اضافوں کے ساتھ

○

از: حافظ عاکف سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۳؍ مئی ۱۹۹۰ء کو پاکستان کی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا (سینٹ) میں "قانونِ نفاذِ شریعت ۱۹۹۰ء" کے باتفاقِ رائے منظوری کے بعد وطنِ عزیز میں نفاذِ شریعت کا مسئلہ ایک بار پھر گرما گرم بحث و نزاع اور شدید ردّ و قدح کا موضوع بن گیا ہے، جس سے پوری قوم واضح طور پر دو متحارب فریقوں میں تقسیم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اور اُن کے مابین علمی مقالات کے علاوہ، اخباری بیانات اور جوشیلی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے، جن میں دو طرفہ طور پر عوامی جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش پر مستزاد دھمکیاں اور جوابی دھمکیاں بھی شامل ہیں۔

چنانچہ ایک جانب غیر مسلم اقلیتوں کے علاوہ، مرکزی حکومت، پاکستان پیپلز پارٹی، بائیں بازو کے عناصر، سیکولر رجحانات کے حامل دانشور، اور "آخرین لیکن کمترین نہیں" (Last But Not The Least) کے مصداق مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین ہیں ------ تو دوسرے کیمپ میں اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل جملہ سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے علاوہ دیگر مذہبی جماعتوں کی غالب اکثریت، علماءِ کرام کا تقریباً پورا طبقہ، اور مذہب کے ساتھ جذباتی لگاؤ رکھنے والے عوام بھاری تعداد میں شامل ہیں، جن میں سے اگر کسی طبقے کو بحیثیتِ مجموعی منہا کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف اہل تشیّع ہیں!

متذکرہ بالا مقدّم الذکر فریق میں سے غیر مسلم اقلیتوں، یعنی عیسائیوں اور قادیانیوں کا معاملہ تو اظہر من الشمس ہے جس پر کسی تبصرے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ البتّہ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بقیہ تمام مسلمان عناصر کے طرزِ عمل کے ڈانڈے اکثر و بیشتر منافقت اور بعض حالات میں صریح کفر سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اور ان کے بعض دیگر وزراء و رفقاءِ کار اور ویمن ایکشن فورم اور اس قبیل کی تنظیموں سے وابستہ بیگمات کے وہ بیانات جن میں شرعی حدود و تعزیرات کا استہزاء اور استخفاف کیا گیا ہے، کفرِ صریح کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا (اگرچہ اخبارات نے نامعلوم اسباب کی بنا پر اس کی رپورٹنگ نہیں کی) اور اب پھر پورے خلوص و اخلاص اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت عرض ہے کہ ایسے تمام حضرات و خواتین کو تنہائی میں

اللہ تعالےٰ کی جناب میں توبہ و استغفار کرنا چاہئے' اور قوم کے سامنے اعلانیہ طور پر اپنے ایسے بیانات سے رجوع کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اسی میں نہ صرف یہ کہ اُن کی دینی اور اخروی بھلائی مضمر ہے' بلکہ دنیوی اور سیاسی خیریت بھی پوشیدہ ہے۔

اس سلسلہ میں یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ پاکستان ۔ "اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر' خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!" کا مصداقِ کامل ہے اور دنیا کا کوئی دوسرا ملک اس کا مثیل نہیں ہے۔ چنانچہ اسلام ہی اس کی اصل اساس اور واحد وجہِ جواز (Raison-De-Etre) ہے لہٰذا اس منزلِ مقصود سے انحراف کے نتیجے میں یہ ختم تو ہو سکتا ہے اس کے رخ کو موڑا نہیں جا سکتا! اور ۔ "جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا۔ ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر!" کے مصداق جو بھی اس کی کوشش کرے گا' ان شاء اللہ العزیز' خود حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ جائے گا!

اسی طرح بعض اصحابِ علم و دانش' اور اربابِ فکر و نظر نے جن میں بعض ماہرینِ دستور و قانون کے علاوہ چند ریٹائرڈ جج حضرات بھی شامل ہیں' یہ قدیم اور قدرے پیچیدہ بحث چھیڑ دی ہے کہ عہدِ حاضر کے محبوب و مقبول تصوّر اور 'روحِ عصر' کے ناگزیر تقاضے یعنی "حاکمیتِ عوام" کا پیوند اللہ تعالیٰ کی اُس حاکمیتِ مطلقہ کے ساتھ کیسے لگایا جائے جس کا واضح اقرار اور صریح اعلان قراردادِ مقاصد میں کیا گیا ہے۔ اور اِس ضمن میں بھی نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بجائے اس کے کہ اس گتھی کو سلجھایا جائے مزید الجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس سلسلہ میں مرکزی وزراء اور بائیں بازو کے سیاسی زعماء کے اخباری بیانات کے علاوہ پاکستان کے فاضل اٹارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار' عدالتِ عظمیٰ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس جناب یعقوب علی خان' عدالتِ عالیہ کے جسٹس (ریٹائرڈ) جناب عطاء اللہ سجاد اور پشاور یونیورسٹی لاء کالج کے استاد ڈاکٹر فقیر حسین کے مقالات میں عوام کے اقتدارِ اعلیٰ اور اُن کے منتخب نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ کی بالادستی کی دہائی جس انداز سے دی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات مسئلے کو خالصتاً مغرب کی لادینی جمہوریت کے تصورات کی عینک سے دیکھ رہے ہیں اور دستورِ پاکستان کی اُن شقوں کو محض علامتی اور تبرکاتی چیزیں سمجھتے ہوئے

نظر انداز کر رہے ہیں جن کی رُو سے ریاستِ پاکستان محض جمہوریہ نہیں بلکہ 'اسلامی جمہوریہ' قرار پائی ہے۔ جبکہ ان شقوں کا دستور میں ثبت ہونا محض حادثاتی طور پر نہیں بلکہ پاکستان کے مسلمان عوام کے منشاء کے عین مطابق اور رائے عامّہ کے شدید دباؤ کے باعث ہوا ہے۔ اور ان کے ذریعے عوام نے اپنی خود مختاری اور حاکمیت کو اپنی آزاد مرضی اور منشاء سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کے تابع' اور اس کی نازل کردہ حدود کا پابند اور اپنے اختیارِ قانون سازی کو قرآن و سنّت کے دائرے میں محدود کر لیا ہے! چنانچہ یہ امور نہ صرف یہ کہ اصولی اعتبار سے قراردادِ مقاصد میں مذکور ہیں (جس کی حیثیت اب دستور کے صرف دیباچے کی نہیں بلکہ دستور کی شق نمبر ۲ الف کی رُو سے اس کے جزوِ لاینفک کی ہے) بلکہ صراحت اور تفصیل کے ساتھ دستور کے حصّہ اوّل میں شامل شق ۲' حصّۂ ہفتم کے بابِ سوم (الف) اور حصّہ نہم میں تفصیلاً ثبت ہو چکے ہیں! ـــــــ لہٰذا جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے دستوری معاملات و مسائل کو دنیا کی مروّجہ لادینی جمہوریت کے تصوّرات کی عینک سے دیکھنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ اور دیانت کا تقاضا ہے کہ یا تو دستور کی متذکرہ بالا شقوں کو دستور سے نکال دیا جائے ورنہ پوری توجہ کو خلوص کے ساتھ اس امر پر مرکوز کیا جائے کہ اسلام اور جمہوریت کے تقاضوں کو کیسے ہم آہنگ کیا جائے اور اُن دونوں کی چُولیں کیسے ٹھیک بٹھائی جائیں!

اب ظاہر ہے کہ 'حدود اللہ' کی پہچان ایک علمی مسئلہ ہے' اور اس امر کا فیصلہ کسی معاملے میں کتاب و سنّت کی حدود سے تجاوز ہوا ہے یا نہیں' شریعتِ اسلامی کے پختہ اور راسخ علم کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ معاملہ نہ تو عوامی جلسوں میں طے کیا جا سکتا ہے' نہ ایسے ممبرانِ پارلیمنٹ کی صوابدید پر چھوڑا جا سکتا ہے جو کتاب و سُنّت کے علم سے تہی دست ہوں۔ لہٰذا اس اشکال کے حل کی تین ہی ممکن اور منطقی صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ اس کا اہتمام کیا جائے کہ پارلیمنٹ میں صرف ایسے لوگ شامل ہوں جو کتاب و سنّت میں مجتہدانہ بصیرت کے حامل ہوں۔ لہٰذا اس غرض کے لئے اوّل تو ممبرانِ پارلیمنٹ کے انتخاب کے لئے ووٹ کا حق بھی صرف ان لوگوں کو دیا جائے جو کتاب و سنّت کا علم رکھتے ہوں' ورنہ کم از کم اس انتخاب میں امیدوار بننے کے لئے تو کتاب و سنّت کے پختہ علم اور گہرے فہم کو شرطِ لازم قرار دیا جائے ـــــــ اس صورت میں ظاہر ہے کہ 'روحِ عصر' یعنی تقاضائے جمہوریت بالکل پامال ہو جاتا ہے! لہٰذا جمہوریت کی "نیلم پری" کے

پرستار اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے!

دوسرا یہ کہ شریعت کے ماہرین اور "حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ" (سورۃ التوبہ: آیت ۹۷) کے پختہ علم و فہم اور گہری مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے علماء پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جائے اور پارلیمنٹ سے منظور شدہ ہر قانون کے نافذ العمل ہونے کے لئے اس بورڈ کی منظوری کو شرطِ لازم قرار دیا جائے ـــــــ اس صورت میں تھیا کریسی یعنی ایک مذہبی طبقے کی حکومت وجود میں آتی ہے ـــــــ جو نہ صرف یہ کہ روحِ عصر کے منافی ہے بلکہ کم از کم اہل سنّت و الجماعت کے اساسی دینی تصوّرات سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتی ـــــــ مزید برآں اس کی واضح اور پُرزور نفی مصوّرِ پاکستان علّامہ اقبال اور معمارِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح دونوں نے کی تھی!

اب واحد ممکن راستہ تیسرا رہ جاتا ہے یعنی یہ کہ اس امر کا فیصلہ کہ آیا کسی معاملے میں قرآن و سنّت سے تجاوز ہوا ہے یا نہیں' اعلیٰ عدالتوں کے حوالے کیا جائے جہاں اوّلاً تو جج حضرات بھی شریعتِ اسلامی کے ماہر ہو سکتے ہیں (اور تدریجاً ایسا ہونا یقینی ہے) ورنہ ماہرینِ شریعت اور علمائے کتاب و سنّت جج حضرات کی مدد کر سکتے ہیں اور اس طرح پُرسکون ماحول میں تحقیق و تفتیش اور بحث و تمحیص کے جملہ تقاضے پورے کئے جا سکتے ہیں۔

یہ بات ویسے بھی ہر اعتبار سے معقول اور منطقی ہے۔ اس لئے کہ کسی ریاست کے دستورِ اساسی میں شہریوں کے جو حقوق معیّن ہوتے ہیں اُن کی محافظ و ضامن عدلیہ ہوتی ہے' چنانچہ اگر کہیں انتظامیہ یا مقنّنہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں جس سے اُن اساسی حقوق پر زد پڑتی ہو تو اعلیٰ عدالتوں سے چارہ جوئی کی جاتی ہے جو شہریوں کو اُن کا حق دلواتی ہیں۔ اِسی طرح اسلامی ریاست میں اللہ کا حاکمیّتِ مطلقہ کا حق بھی دستور میں ثبت ہوتا ہے جس کی رُو سے کوئی قانون سازی کتاب و سنّت کے منافی نہیں کی جا سکتی ـــــــ اب اگر مقنّنہ اس سے تجاوز کرتی ہے تو اِس صورت میں عدلیہ کا حق ہی نہیں' فرض بنتا ہے کہ اللہ کے حق پر آنچ نہ آنے دے اور ہر ایسے قانون کو کالعدم قرار دے دے جو حدود اللہ کی خلاف ورزی کرتا ہو! گویا حضرتِ مسیح علیہ السّلام سے منسوب الفاظ کے مطابق عدلیہ کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ بمصداقِ الفاظِ قرآنی "فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ" (سورۂ نساء: آیت ۵۹) اللہ اور رسول کا حق انہیں لوٹائے اور عوام کا حق انہیں دلوائے!!

دستورِ پاکستان کے حصّہ ہفتم کا باب سوم (الف) درحقیقت اسی راہ کی جانب تدریجی پیش قدمی کا مظہرِ اوّل ہے ـــــــ اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ ایک جانب تو اس پیش قدمی کو جاری رکھا جائے چنانچہ اوّلاً فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ کار پر جو حدود عائد ہیں انہیں دور کرکے ملک کے پورے دستوری و قانونی ڈھانچے کو اس کے تابع کیا جائے، اور ثانیاً یا تو اس کے وقار کو بلند کرکے عام عدلیہ کے مساوی کیا جائے، ورنہ اس کی جداگانہ حیثیت ختم کرکے اسے عام عدلیہ ہی میں ضم کر دیا جائے ـــــــ اور دوسری جانب اِس وقت تک جو امور دستور کی رُو سے فیڈرل شریعت کورٹ کے دائرہ کار میں آچکے ہیں ان کے ضمن میں جو فیصلے ہوں ان پر پوری نیک نیتی کے ساتھ عمل کیا جائے اور اس طرح جس قدر پیش قدمی بھی ترویج و تنفیذ شریعت میں کی جاسکتی ہو اس کا راستہ روکنے کی کوشش نہ کی جائے۔

لیکن افسوس کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے ثابت کر دیا ہے کہ ترویج و تنفیذِ شریعت کے ضمن میں کوئی پیش قدمی تو درکنار وہ موجودہ دستور کے حصّہ ہفتم کے باب سوم (الف) پر بھی نیک نیتی کے ساتھ عمل کرنے کے لئے تیار نہیں اور تاخیری حربوں کے ذریعے اُس کا راستہ روکنے پر تُلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا واضح ثبوت مقدمہ وفاقِ پاکستان بنام گل حسن (پی ایل ڈی ۱۹۸۹، ایس سی ۶۳۳) میں سامنے آگیا ہے۔ جس کے ضمن میں اوّلاً فیڈرل شریعت کورٹ اور بالآخر سپریم کورٹ کے شریعت بنچ نے اپنے فیصلے مورخہ ۵ر جولائی ۱۹۸۹ء میں پاکستان کے بعض فوجداری قوانین کو کتاب و سنّت کے خلاف قرار دیتے ہوئے اُن کے کالعدم ہونے کے لئے ۲۳ر مارچ ۱۹۹۰ء کی تاریخ مقرّر کردی اور واضح رہے کہ یہ ہفت خواں دس برس میں طے ہوا۔ اب دستور کی دفعہ ۲۰۳ ڈی کی ذیلی شق (۳) اے کی رُو سے یہ ذمہ داری وفاقی حکومت کی تھی کہ وہ اِس خلا کو پُر کرنے کے لئے قانون سازی کرتی۔ لیکن اُس نے اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں تاخیر و تعویق کی راہ اختیار کی اور ۱۸ر فروری ۱۹۹۰ء کو فیصلے پر نظرِ ثانی اور مہلتِ تنفیذ میں اضافے کی درخواستیں دائر کردیں جو ۱۴ر مارچ کو عدالتِ عظمیٰ کے زیرِ غور آئیں۔ نتیجۃً عدالت نے صرف مہلتِ تنفیذ میں ۳۰ر مئی ۱۹۹۰ء تک کا اضافہ کر دیا۔ وفاقی حکومت نے اس عرصے میں بھی اپنے اصل کام یعنی متبادل قانون سازی کی طرف

کوئی توجہ نہ دی بلکہ عین مہلتِ تنفیذ کے خاتمے کے دن مہلت میں مزید توسیع کے لئے ایک نئی درخواست دائر کردی۔ عدالتِ عظمیٰ نے معاملے کی اہمیت کے پیش نظر سینئر وکلاء کو مشورے کے لئے طلب کیا اور ۶ر جون کی تاریخ حتمی فیصلے کے لئے معیّن کردی ــــــــ لیکن اس بار پھر ۵ر جون کو وفاقی حکومت کے وکیل نے توسیعِ مزید کی درخواست دائر کردی جس سے ایک ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوگئی جس پر قابلِ احترام چیف جسٹس صاحب نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح سپریم کورٹ کے شریعت بنچ کا اجلاس ہوسکے لیکن جب یہ کسی طرح ممکن نہ ہوسکا تو بالآخر مجبوراً ۶ر جون ۱۹۹۰ء کو "تا حکم ثانی توسیعِ مدّت" کا فیصلہ صادر فرمادیا۔

اِس داستان میں پیپلزپارٹی کی وفاقی حکومت کی نیّت اور ارادے کا صاف اور صریح اظہار ہو رہا ہے کہ تنفیذ و ترویجِ شریعت میں پیش قدمی تو درکنار دستور میں ثبت شدہ عمل کو بھی آگے بڑھنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

اِس تصویر کا دوسرا رخ بھی کوئی زیادہ قابلِ اطمینان ــــــــ یا حوصلہ افزا نہیں ہے' اس ضمن میں اس سے قطع نظر کہ "شریعت بل" کو اُس مسلم لیگ نے گود لے کر اقتدار کی جنگ کا ہتھیار بنالیا ہے جو خود اپنے دورِ اقتدار میں اس کی شدید مخالف تھی' سینٹ میں اس کی منظوری کے دوران میں (گویا "قطرے کے گہر ہونے تک!" کے عرصے میں) اس کی ایسی 'مرمت' بھی کردی گئی ہے جس سے اس کی ماہیت بالکل بدل کر رہ گئی ہے اور یہ بِل عیاذاً باللہ "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" کا مصداقِ کامل بن گیا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ وطنِ عزیز اِس وقت ایک جانب خارجی خطرات سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار ہے تو دوسری جانب داخلی طور پر گوناگوں نوعیت کی محاذ آرائیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک طرف مرکزی حکومت کی سطح پر پی پی پی اور سی او پی کی محاذ آرائی ہے' تو دوسری طرف پنجاب میں پی پی پی اور آئی جے آئی کی کشمکشِ اقتدار ہے' تیسری جانب وفاقی حکومت اور پنجاب اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں کے مابین رسّہ کشی ہے' چوتھی محاذ آرائی مذہبی میدان میں اہل سنّت اور اہل تشیّع کے مابین ہے' جس کا مظہرِ اتم یہ ہے کہ امسال عاشورۂ محرّم کے لئے وہ اہتمام کیا گیا جو کسی جنگ یا اُس جیسی دوسری ہنگامی صورتِ حال کے لئے کیا جاتا ہے' ــــــــ اور پانچویں اور سب سے خوفناک محاذ آرائی سندھ میں نئے اور پرانے

سندھیوں کے مابین جاری ہے جس میں نفرت و انتقام کے جذبات شدت کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں ـــــــ جس کے نتیجے میں وادیٔ مہران اور باب الاسلام سندھ نے ایک ایسے آتش فشاں کی صورت اختیار کرلی ہے جو نہ معلوم کب پھٹ پڑے اور نہ صرف یہ کہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کردے بلکہ بالکل ہسپانیہ کے مانند جنوبی ایشیا سے اسلام اور مسلمانوں کے کُلی خاتمے کا پیش خیمہ بن جائے۔ اعاذنا اللہ من ذالک!

اِن حالات میں عوامی سطح اور ملک گیر پیمانے پر شریعت کے حامیوں اور مخالفوں کے مابین محاذ آرائی ملک کے لئے شدید خطرے کا باعث ـــــــ اور اونٹ کی کمر کے آخری تنکے کا مصداق بن سکتی ہے۔ لیکن اس کے بلوجود ہمیں یہ کشاکش اور زور آزمائی بھی گوارا ہی نہیں خوش آئند نظر آتی اگر اس کے نتیجے میں دینِ حق کے واقعی غلبے اور شریعتِ اسلامی کی حقیقی ترویج و تنفیذ کی صورت نظر آرہی ہوتی۔ لیکن ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!" کے مصداق، اس سے قطع نظر کہ موجودہ شریعت بل کشمکشِ اقتدار کے ساتھ بری طرح منتھی ہوگیا ہے ـــــــ جس شکل میں اسے سینٹ کی قبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی ہے اس نے ساری امیدوں پر پانی پھیردیا ہے ـــــــ اور اس تلخ حقیقت کو لذ سِرِ نو مبرہن اور واشگاف کردیا ہے کہ موجودہ انتخابی عمل اور پارلیمانی سیاست کے ذریعے اسلام کا قیام اور شریعتِ حقہ کی تنفیذ محالِ مطلق اور ناممکنِ محض ہے۔ اس لئے کہ ع "ہے دور وصالِ بحر ابھی" کے مصداق ابھی نیشنل اسمبلی کا ہفت خواں تو طے ہونا ہے۔ جبکہ ع "ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی" کے مصداق صرف سینٹ کے حلق سے نیچے اترنے کے لئے بھی اسے بھاری قیمت دینی پڑی ہے۔ چنانچہ:

اولاً جانب بیرونی سود خوروں کو پورا اطمینان دلایا گیا ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں، آپ کا اصل زر ہی نہیں سود بھی حسبِ سابق ادا کیا جاتا رہے گا۔ (شق نمبر ۱۵)

دوم، جانب اندرونِ ملک غیر مسلموں ہی نہیں نام نہاد مسلمان سود خوروں کو بھی پوری ضمانت دے دی گئی ہے کہ اُن کو بھی چنداں تشویش نہیں ہونی چاہئے۔ انہیں بھی حسبِ سابق یہ حرام مال مہیا کیا جاتا رہے گا (شق نمبر ۱۶) گویا "وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا" کے واضح قرآنی حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا ـــــــ اور قرآن حکیم کے الفاظِ مبارکہ کے مطابق "اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ" جاری رہے گی!۔

" دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت ۔ ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا "
کے مصداق اگر سینیٹ نے اس بل کو اتنی بھاری قیمت وصول کر کے منظور کیا تو نہ وہ شکریئے کی مستحق ہے ' نہ ہی بل کے مجوّزین کسی مبارکباد کے لائق ہیں ' بلکہ سینیٹ کے سرمایہ دار اور وڈیرے ارکان کم از کم اس داد کے مستحق بنتے ہیں کہ انہوں نے ع " ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں ! " کے مطابق اپنے مسلک پر " وفاداری بشرطِ استواری " کا ثبوت دے دیا ' ــــــ جبکہ بل کے عالمِ دین مجوّزین اور دیندار مؤیّدین تو اس قابل ہیں کہ اس ' مداہنت فی الدّین ' اور اندرونی و بیرونی سرمایہ پرستوں اور سود خوروں کے ساتھ اِس مفاہمت اور گٹھ جوڑ پر ملّتِ اسلامیہ کی عدالتِ عام میں جواب دہی کے لئے پیش ہوں ' اور اپنے طرزِ عمل کی وضاحت کریں! کاش کہ یہ حضرات آیاتِ مبارکہ "وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ" (القلم:۹) اور وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرہ:۱۲۰) کو پیشِ نظر رکھتے تاکہ جگر مراد آبادی کے اس شعر کے مصداق کہ ۔ "یہی انجام کا مارا ہوا دل ۔ ہلاکِ عشرتِ آغاز بھی ہے !" وقتی فتح مندی اور سرخروئی کی " عشرتِ آغاز " انہیں ' مداہنت فی الدّین ' کے عبرت ناک " انجام " کی طرف نہ دھکیل سکتی !

اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اِن دو صورتوں میں عظیم فرق و تفاوت ہے ــــــ یعنی ایکؔ یہ کہ پارلیمنٹ سے باہر رہتے ہوئے تنفیذِ شریعت کا مطالبہ کیا جائے اور اس ضمن میں جو پیش قدمی بھی ہو جائے اُسے قبول کرتے اور مضبوطی کے ساتھ تھامتے ہوئے مزید کے مطالبے کو جاری رکھا جائے لیکن کسی بھی مرحلے پر احکامِ شریعت میں ' تفریق ' کے عمل میں خود فریق بن کر " اَلَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ " (الانعام:۱۵۹) کا مصداق نہ بنا جائے ! ' اور دوسرےؔ یہ کہ خود پارلیمنٹ میں شریک ہو کر اس قسم کی سودے بازی میں فریق بن جایا جائے اور اس طرح ' مداہنت فی الدّین ' کے جرمِ عظیم میں شرکت کر لی جائے !!

اسی طرح کا ایک معاملہ موجودہ بل کی دفعہ ۳ کی ذیلی شق (۱۰) کا ہے جس کی رُو سے اس بل کے نافذ ہونے سے قبل کے جُملہ خلافِ شرع فیصلوں کو کامل تحفّظ دیا گیا ہے ــــــ جو قرآن و سنّت کی صریح ہدایات کے خلاف ہونے کے علاوہ عقلِ عام اور عرفِ عمومی کے نزدیک بھی ناقابلِ قبول ہے ۔

اس پس منظر میں ایکؔ جانب موجودہ شریعت بل حقیقتِ واقعی کے اعتبار سے صرف

جنگِ اقتدار کا ایک ہتھیار بن کر رہ جاتا ہے ـــــــ چنانچہ اسی کا مظہر ہے کہ بعض وہ دینی عناصر بھی اس کی تائید کر رہے ہیں جو ابتداءً اس کے اس بنا پر شدید مخالف تھے کہ اس میں واضح طور پر فقہِ حنفی کی ترویج کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا ـــــــ !! در آں حالیکہ موجودہ ترمیم شدہ بل کسی بھی فقہ کی صراحت کے بر عکس اصل بِل کے مقابلے میں مسلکِ اہل حدیث سے نزدیک تر ہو گیا ہے! (چنانچہ جمعیت اہل حدیث کے اس دھڑے کی اس بل کے حامیوں میں شمولیت قابلِ فہم ہے!)

دوسری جانب ہمارا وہ موقف مزید منقح اور ثابت ہو گیا ہے کہ اس ملک میں نظامِ اسلام کا قیام صرف انقلابی جدّوجہد سے ممکن ہے ـــــــ رجالِ دین اور مذہبی جماعتوں کے انتخابی عمل اور پارلیمانی سیاست میں حصہ لینے سے اسلام کی منزلِ مقصود نزدیک نہیں دور سے دور تر ہوتی چلی جارہی ہے ـــــــ اور خود رجالِ دین 'مداہنت فی الدّین' پر مجبور ہوتے چلے جا رہے ہیں!

ہم نے ۸۶ء میں متحدہ شریعت محاذ میں شمولیت اس لئے اختیار کی تھی کہ:

اوّلاً ـــــــ وہ ایک خالص دینی محاذ تھا اور اس میں کوئی سیکولر عنصر شریک نہ تھا۔

ثانیاً ـــــــ اس کے ذریعے کُل کے کُل دین کی اقامت اور شریعت کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی مطلوب تھی، اور

ثالثاً ـــــــ اس کے پیشِ نظر ایک انقلابی تحریک برپا کرنا تھا چنانچہ اوّلاً اس کا آغاز ہی پارلیمنٹ کے سامنے ایک عظیم عوامی مظاہرے سے ہوا تھا اور پھر جلد ہی حکومتِ وقت کو الٹی میٹم بھی دے دیا گیا تھا چنانچہ جیسے ہی ہم نے محسوس کیا کہ اس محاذ میں شامل اہم جماعتیں عوامی تحریک سے کنی کتراتے ہوئے اسے صرف پارلیمانی سیاست کا ضمیمہ یا تتمّہ بنانا چاہتی ہیں، ہم نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

اب بھی ہماری پوزیشن یہ ہے کہ نہ ہم موجودہ شریعت بِل کے حامی بن کر مداہنت فی الدّین میں شریک ہو سکتے ہیں، نہ ہی اس کے لئے جدّوجہد میں اپنا وقت اور صلاحیت صَرف کر سکتے ہیں ـــــــ تاہم اگر اس کے نتیجے میں نفاذِ شریعت کی جانب ایک انچ بھی پیش قدمی ہوئی تو اسے خوش آمدید کہیں گے ـــــــ بالکل اُسی طرح جیسے ہم نے سابق

صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے "نفاذِ شریعت آرڈی نینس" کو بھی خوش آمدید کہا تھا اور اسے "انسدادِ شریعت آرڈی نینس" نہیں قرار دیا تھا۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ جسٹس یعقوب علی خان صاحب نے مجوّزہ شریعت بل کی متذکرہ بالا تین غیر شرعی اور خلافِ قرآن و سنّت ترامیم کو "اجتہاد" قرار دیتے ہوئے خوش آمدید کہا ہے' اور اسی نوع کے مزید اجتہاد کا دروازہ ہی نہیں 'شاہ درہ' کھولنے کی ترغیب دی ہے ــــــ جبکہ ہمارے نزدیک یہ 'اجتہاد فی الدّین' نہیں 'انحراف عن الدّین' ہے!

الغرض' جہاں تک زیرِ غور شریعت بِل یا نفاذِ شریعت ایکٹ کا تعلّق ہے' ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ بقول علّامہ اقبال ؎

نہ مصطفٰے نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

اور بقولِ فیض ؎

یہ داغ داغ اجالا ـ یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا ـ یہ وہ سحر تو نہیں!

اور پاکستان میں نفاذِ شریعتِ اسلامی اور قیامِ نظامِ اسلام کے خواہش مند حضرات کو پوری دل سوزی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں مزید دیر نہ لگائیں کہ اس عظیم منزلِ مقصود کی جانب راستہ پارلیمنٹ کے مرصّع' مسجّع اور آراستہ و پیراستہ ایوانوں کے اندر سے نہیں گزرتا ــــــ بلکہ یہ کانٹوں بھری پُر صعوبت راہ ان ایوانوں کے باہر ہی باہر سے گزرتی ہے ــــــ اور جیسے کہ پندرہ روز قبل کے خطاب جمعہ میں تفصیلاً عرض کیا جا چکا ہے اس کا اوّلین قدم انفرادی اور اجتماعی توبہ ہے ــــــ یعنی انفرادی طور پر تجدیدِ ایمان' توبہ' اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تجدیدِ عہد کرتے ہوئے ایک جانب اپنا نصب العین صرف رضائے الٰہی اور فلاحِ اخروی کو بنایا جائے اور دوسری جانب اپنی بہترین مساعی اور بیشتر اوقات و وسائل کو "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کے مطابق اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی جدّوجہد کے لئے وقف کر دیا جائے اور اجتماعی سطح پر ایک جانب

اصحابِ فہم و شعور کو اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی یعنی اسلام کے اُس سیاسی ' معاشی اور سماجی نظام کے بارے میں مطمئن کیا جائے جو انسانی حرّیت ' اخوّت اور مساوات کا دنیا کے تمام نظاموں سے بڑھ کر ضامن اور کفیل بن سکتا ہے (یہی وجہ ہے کہ ہم نے مسلسل دو سال اپنے محاضراتِ قرآنی کو اسی عنوان اور انہی موضوعات کے لئے وقف رکھا!) اور دوسری جانب عوامی سطح پر کفر و شرک ' زندقہ و الحاد ' اباحیت و معصیت ' اور عریانی و فحاشی کے خلاف مزاحمتی تحریک (Resistance Movement) برپا کی جائے جو اگرچہ اپنی جگہ کلّیتہً پُرامن اور حد درجہ منظم ہو ' تاہم ع "جب وقتِ شہادت آتا ہے ' دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!" کے جذبے سے سرشار ہو! ـــــــ

لیکن پُرامن اور منظم ہونے کے ساتھ اس تحریک کی کامیابی کے لئے شرطِ لازم یہ بھی ہے کہ اس پر کسی کشمکشِ اقتدار پر مبنی سیاست بازی (Power Politics) کا سایہ تک بھی نہ پڑنے دیا جائے اور وہ سیاسی رسّہ کشی سے نہ صرف یہ کہ کُلّی طور پر علیحدہ ہو بلکہ نمایاں طور پر بُعد اور فاصلے پر نظر آئے! تاکہ ایک جانب مسائل (Issues) میں خلطِ مبحث (Confusion) نہ پیدا ہو ' اور دوسری جانب "حزب اللہ" اور "حزب الشیطٰن" بالکل جدا اور ممیّز ہو جائیں! ـــــــ اور اس طرح "حَتّٰی یَمِیزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ" اور "حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِیْنَ مِنْکُمْ وَالصَّابِرِیْنَ" کی کیفیت پیدا ہو جائے اس لئے کہ نصرتِ خداوندی اس کے بغیر نہیں آتی اور یقیناً صحیح کہا جس نے بھی کہا ۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہا ست بسے
شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی !

میثاق کے آئندہ شمارے میں امیر تنظیم اسلامی کا ایک اہم خطاب

مُسلمان نوجوانوں کے لیے آئیڈیل

مرتب کر کے شائع کیا جائے گا (ادارہ)

معزز قارئین کرام!

اپنے زرِ تعاون کی میعاد جو کہ آپ کے نام / پتہ کے لیبل پر درج ہے ختم یا غلط درج ہونے پر براہِ کرم ہمیں جلد از جلد مطلع فرمادیں کہ آپ کے نام پرچہ بدستور جاری رکھا جائے؟ اس سے ہمیں یہ بھی اطمینان رہے گا کہ پرچہ آپ تک پہنچ رہا ہے اور آپ کا پتہ تبدیل نہیں ہوا ہے۔ اگر آپ زرِ تعاون بذریعہ وی۔پی۔پی ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے بروقت تحریر فرمائیں۔

شکریہ آپ کے تعاون کے متمنی

منیجر سرکولیشن

موجودہ حالات میں
اجتماعی توبہ کی ضرورت و اہمیت
اور اس کی ممکنہ عملی صورت

امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا فکر انگیز خطابِ جمعہ

ترتیب وتسوید
حافظ خالد محمود خضر

اپنے بیرونی سفر سے واپسی کے بعد میں نے عید الاضحیٰ کے اپنے مختصر خطاب میں اور پھر اس کے بعد مسلسل دو جمعوں میں اپنے سفرِ اسپین کے کچھ تاثرات آپ حضرات کے سامنے رکھے تھے اور اس کے حوالہ سے جنوبی ایشیا یعنی برِعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں اندیشوں اور خطرات' مسلم اسپین اور مسلم انڈیا کے حالات میں مشابہتوں' اور اس کے علاوہ پاکستان کے موجودہ خارجی اور داخلی حالات کے ضمن میں بھی اپنا تجزیہ پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ ان خطابات میں اتنا وقت صرف ہوتا رہا کہ گفتگو کا مثبت موضوع یعنی یہ کہ ان حالات میں کیا کیا جائے' ہماری بحث کے دائرے سے خارج رہا۔ حالانکہ فطری طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس گمبھیر صورتِ حال سے بچاؤ کا راستہ یا مخرج (Exit) کون سا ہے؟ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ایک بڑے فتنے کی آمد کی خبر سن کر آپؐ سے یہ سوال کیا تھا کہ "ما المخرجُ منھا یا رَسُولَ اللہ" - کہ اے اللہ کے رسول اس فتنے سے نکلنے کا راستہ کونسا ہوگا' اس سے بچاؤ کی سبیل کونسی ہوگی؟ تو یقیناً یہ معاملہ بہت اہم ہے کہ ملّی' ملکی اور قومی سطح پر جو اندیشے اور خطرات ہمیں درپیش ہیں ان سے نکلنے کا راستہ آخر کونسا ہے۔

چنانچہ گزشتہ جمعے نمازِ جمعہ کے بعد سوال و جواب کی معمول کی نشست میں دو حضرات نے کھڑے ہو کر سوال کرنے کی اجازت حاصل کی تھی اور ہماری توجہ مبذول کرائی تھی دو اہم باتوں کی طرف! پہلے سوال کرنے والے صاحب سے تو میں ذاتی طور پر متعارف نہیں ہوں' لیکن ان کا جو اندازِ گفتگو تھا اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اعتراض کرنے کے خیال سے یہ بات نہیں کی تھی بلکہ خلوص کے ساتھ میری سابقہ گفتگو کی اس کمی کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی کہ مسئلے کا حل کیا ہے؟ صورت حال کا اصل علاج کیا ہے؟ اور میں چونکہ اختصار کے پیش نظر اپنی تینوں تقریروں کے اختتام پر دعا اور توبہ کی تلقین پر اکتفا کرتا رہا ہوں' تو انہوں نے کہا کہ توبہ کی کوئی عملی شکل سامنے آنی چاہئے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ آپ ہر جمعہ میں کسی ایک گناہ یا کسی ایک معصیت کو ہدف بنا کر اس سے بچنے کا عہد اپنے سامعین سے لیں۔ تاکہ تدریجاً اصلاح کا ایک عمل جاری رہے۔ میرے نزدیک ان کی بات میں وزن تھا۔ اسی لئے میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس موضوع پر اگلے جمعہ کو تفصیلی گفتگو کروں گا۔

دوسرے صاحب سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ وہ ہماری معزز عدلیہ سے وابستہ ہیں۔ اور اس کے رکن ہونے کے ناطے اگرچہ وہ کسی سیاسی جماعت کے رکن تو نہیں ہو سکتے لیکن میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ان کا ذہنی اور قلبی رشتہ ایک اہم دینی اور سیاسی جماعت کے ساتھ ہے۔ میرا ان سے پرانا تعارف ہے۔ انہوں نے بھی پہلے سوال کرنے والے صاحب کی طرح میرے پیش کردہ تجزیئے سے تو کامل اتفاق کیا بلکہ یہاں تک فرمایا کہ آپ کا تجزیہ ایک سو ایک فی صد درست ہے' جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں' لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا حل کیا ہو! انہوں نے اپنی گفتگو میں دو الفاظ استعمال کئے تھے کہ 'حزب الشیطان' متحد ہے اور 'حزب اللہ' منتشر ہے' اس صورت حال کے ضمن میں کوئی رہنمائی کریں اور کوئی عملی پیش قدمی شروع کریں۔ تو میں آج اپنی گفتگو کو اسی موضوع پر موڑ رہا ہوں۔ اس کے لئے آج صبح میں نے بیٹھ کر کافی تفصیلی نوٹس تحریر کئے ہیں تاکہ جذباتی انداز میں کوئی بے ربط گفتگو کرنے کی بجائے میں اپنا موقف منضبط انداز میں آپ کے سامنے رکھ سکوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ میرے پیش نظر جو گفتگو ہے اس کو اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔

توبہ کے ضمن میں چند اصولی باتیں

سب سے پہلے میں توبہ کے ضمن میں چند اصولی باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ توبہ کے موضوع پر قرآن حکیم کی سب سے گمبھیر آیت جس میں توبہ کی انتہائی تاکید بھی آتی ہے اور توبہ کی فضیلت کا بیان بھی نہایت بلیغ پیرائے میں ہوا ہے وہ سورۂ تحریم کی یہ آیت ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا۔ (۸)

"اے اہل ایمان' توبہ کرو اللہ کی جناب میں' سچی توبہ!"۔

یعنی یہ توبہ خلوصِ نیت سے ہونی چاہئے' محض زبانی کلامی یا رسمًا اور سرسری و سطحی نہیں! اگر توبہ محض زبانی کلامی ہو اور اس کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع نہ ہو تو چاہے ایک ہزار دانوں کی تسبیح لے کر بھی وِرد کر لیا جائے تو وہ توبہ نہیں ہوتی۔ توبۂ نصوح سے مراد پاک صاف' بے ریا' بے میل اور خالص توبہ ہے' جس میں کسی طرح کا اشتباہ اور کھوٹ نہ ہو! علمائے کرام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں توبہ کی شرائط مدوّن کی ہیں۔ اس کی چار ناگزیر شرائط ہیں: (i) اپنی غلطی کا ادراک ہو اور اس پر حقیقی ندامت ہو۔ (ii) یہ عزمِ مصمم ہو کہ اب میں اپنے آپ کو بدل دوں گا۔ جس برے کام سے توبہ کر رہا ہوں وہ کام اب دوبارہ نہیں کروں گا (iii) اس کام کو بالفعل چھوڑ دیا جائے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حالات کی رو میں بہہ کر پھر اسی حرکت کا اعادہ ہو جائے لیکن آدمی جس وقت توبہ کر رہا ہے اُس وقت اس فعل کو بالفعل ترک کرنا ضروری ہے۔ یہ تین شرائط ان گناہوں کی معافی کے سلسلہ میں ہیں جو کہ حقوق اللہ سے متعلق ہیں۔ حقوق العباد سے متعلق گناہوں کے ضمن میں ایک اضافی شرط یہ عائد ہوتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی حق تلف کیا ہے یا کسی پر زیادتی کی ہے تو اس حق تلفی کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی حاصل کی جائے۔

توبہ کے ضمن میں یہ اہم بات نوٹ کر لیجئے کہ توبہ انفرادی بھی ہوتی ہے اور اجتماعی بھی! سورۂ تحریم کی اس آیت میں انفرادی توبہ کا تقاضا کیا گیا ہے' جبکہ سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۱ میں اجتماعی توبہ کا مطالبہ ہے:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (۳۱)

"اور اے اہلِ ایمان، توبہ کرو اللہ کی جناب میں سب کے سب مل کر، تاکہ تم فلاح پاؤ!
اس لئے کہ جو اجتماعی گناہ اور اجتماعی خطائیں ہیں ان کی توبہ بھی اجتماعی طور پر ہوگی تب ہی مؤثر ہوگی۔ اس آیتِ مبارکہ میں لفظ "جمیعًا" بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ مل جل کر سب کے سب توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ اور اپنی غلطیوں اور لغزشوں کی سزا سے بچ سکو۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کسی قوم کی اجتماعی خطاؤں اور فروگزاشتوں کا خمیازہ اسی دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے۔ افراد کا معاملہ قیامت میں ہوگا جہاں ہر شخص انفرادی طور پر پیش ہوگا۔ قوموں کے اعمال کا حساب کتاب یہیں چکایا جاتا ہے۔ اقبال کا یہ شعر اس حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے واضح کرتا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملّت کے گناہوں کو معاف!

ملت کے گناہوں کی معافی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے اجتماعی توبہ۔ یہی وہ راستہ ہے جسے اختیار کر کے کوئی قوم اپنے گناہ کے انجامِ بد سے بچ سکتی ہے۔

توبہ کی شرطِ لازم: اصلاحِ احوال اور تجدیدِ ایمان

توبہ کے موضوع پر میں قرآن حکیم کی چند مزید آیات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ توبہ کی شرطِ لازم ہے عملی اصلاح۔ اس کے بارے میں سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا:

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۔ (۳۹)

"پھر جس کسی نے اپنے ظلم کے بعد توبہ کی اور (اپنی) اصلاح کرلی تو اللہ اُس کی توبہ قبول فرمائے گا"۔

یعنی جو شخص اپنی زیادتی، ظلم اور گناہ کے بعد نہ صرف یہ کہ توبہ کرلے، بلکہ اپنی اصلاح بھی کر لے، اپنے طرزِ عمل کو بدل لے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی طرف اپنی رحمتوں، شفقتوں اور عنایتوں کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے۔ "تَابَ" کے بعد "اَصْلَحَ" کا لفظ توبہ کی شرطِ لازم کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور توبہ کی یہ شرط "اصلاح" قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ سورۃ الانعام میں ہے:

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (۵۴)

"...تم میں سے جو کوئی بھی گناہ کر بیٹھے گا از راہِ نادانی (جذبات کی رو میں بہہ کر)' پھر وہ توبہ کرے گا اور (اپنی حالت کی) اصلاح کر لے گا تو یقیناً اللہ غفورٌ رحیم ہے"۔

رحمتِ خداوندی کے حاصل کرنے کے لئے صرف توبہ کافی نہیں' بلکہ اس کے ساتھ اپنے اعمال کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ اور اب میں دو مقامات اور پیش کرنا چاہتا ہوں جہاں اس لفظِ 'اصلاح' کی مزید وضاحت سامنے آتی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (۸۲)

"اور میں یقیناً بہت بخشنے والا ہوں اس کے حق میں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عمل کیا نیک' اور پھر ہدایت اختیار کرلی"۔

اس میں بڑا گہرا رمز ہے کہ انسان جب معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو ایک اعتبار سے حقیقتِ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ قانونی ایمان اگرچہ موجود ہوتا ہے اور وہ مسلمان رہتا ہے، لیکن جب وہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو ایک حدیث کی رُو سے اس کا ایمان اس کے دل سے نکل کر اس کے سر پر ایک پرندہ کی طرح چکر لگاتا رہتا ہے' اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو دوبارہ دل میں داخل ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ درحقیقت گناہ زوالِ ایمان کا باعث ہے۔ ایمان بالکل ضائع نہ ہو تب بھی ضعفِ ایمان تو لازم ہے۔ ضعفِ ایمان کے بغیر تو گناہ کے صدور کا امکان ہی نہیں۔ احادیث میں تو اس معاملہ کی سنگینی بہت زیادہ واضح کی گئی ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ۔

"کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا' کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا اور کوئی شرابی حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا"۔

اس حدیث میں تو حالتِ ایمان کی مطلقاً نفی ہو رہی ہے۔ البتہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ

علیہ نے اپنی مایۂ ناز تالیف "الفقہ الاکبر" میں، جو درحقیقت ان کے تفقّہ فی الدین کا سب سے بڑا مظہر ہے اور جو فقہی جزئیات پر مشتمل کوئی تالیف نہیں ہے، ان حقائق کو واضح کیا ہے کہ ایک قانونی ایمان ہے جو کسی کے گناہوں سے ختم نہیں ہو جاتا۔ مسلمان گناہ کا ارتکاب کر کے بھی مسلمان رہے گا۔ اس قانونی ایمان میں کمی یا زیادتی بھی نہیں ہوتی، لیکن جہاں تک ایمانِ حقیقی کا تعلق ہے وہ تو لازمی طور پر گناہ کے اثرات سے ضعف و اضمحلال کا شکار ہوتا ہے۔ علماء کے یہاں ایک جملہ استعمال ہوتا ہے: "المعاصی برید الکفر" کہ معاصی تو کفر کو لانے والی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان سے ایمان زائل ہو جائے۔ چنانچہ توبہ کے بعد ایک طرح سے تجدید ایمان ہوتی ہے۔ اور ایمان کا منطقی نتیجہ ہے عملِ صالح۔ تجدیدِ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا یہی مضمون سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں بھی آیا ہے، جو ہمارے منتخب نصاب کا ایک اہم مقام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اکثر ساتھیوں کو یہ آیات زبانی یاد ہوں گی۔ یہاں پر بڑے بڑے گناہوں کا تذکرہ کر کے فرمایا گیا کہ جو ان کا مرتکب ہو گا اسے ان کی پاداش مل کر رہے گی۔ اور آگے فرمایا:

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا
فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ۔

"مگر جو شخص توبہ کرے گا اور ایمان لائے گا (یا ایمان کی تجدید کرے گا) اور کرے گا نیک عمل، تو ایسے لوگوں کی (گزشتہ) برائیوں کو اللہ تعالیٰ بھلائیوں سے تبدیل کر دے گا"۔

نامۂ اعمال کی سیاہی کے دھبے دھو کر نیکیوں کا اندراج کر دے گا اور دامنِ کردار کے جو داغ ہیں ان کو بھی صاف کر کے اسے اعمالِ صالحہ سے مزیّن کر دے گا۔ یہاں میں آپ حضرات کے سامنے ایک بات لانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تنظیم اسلامی کے ماٹو (Motto) میں ہم نے تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت کے لئے تین الفاظ منتخب کئے ہیں: تجدیدِ ایمان، توبہ، تجدیدِ عہد۔

توبہ کے لئے تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ عہد دونوں ضروری ہیں۔ الفاظ میں توازن پیدا کرنے کے لئے ہم نے توبہ کو ان دونوں کے درمیان رکھا ہے۔ درحقیقت توبہ اور یہ دونوں الفاظ گویا کہ لازم و ملزوم ہیں۔ توبہ کی شرطِ لازم تجدیدِ ایمان ہے۔ اور اس کے ساتھ تجدیدِ عہد، کہ اللہ سے عہد کرنا کہ جو خطائیں ہوئیں اب آئندہ ان کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ تو ان دو آیتوں کے

حوالے سے ' اصلاح ' کا یہ مفہوم سامنے آیا کہ تجدیدِ ایمان اور اعمال صالحہ کا انسان سے بالفعل صادر ہونا۔

توبہ و استغفار کے نتائج

اور اب آیئے اس مضمون کی طرف کہ توبہ و استغفار کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟ ایک نتیجہ تو دنیوی ہے۔ وہ میں سورہ ہود کی دو آیتوں کے حوالہ سے عرض کر رہا ہوں۔ ارشاد ہوا:

وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا (۳)

یہاں توبہ کے ساتھ لفظ ' استغفار ' کا مزید اضافہ ہو گیا اور یہ دونوں الفاظ عام طور پر جڑے ہوئے آتے ہیں: اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔ کہ میں اللہ سے ہر گناہ کی معافی طلب کرتا ہوں جو کہ میرا رب ہے اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں بہرحال یہاں فرمایا: اپنے رب سے استغفار کرو اور اس کی جناب میں توبہ کرو! اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تم کو اس دنیا میں بھی اچھا ساز و سامان دے گا' آسائشیں دے گا' تمہارے لئے اپنی نعمتوں اور رحمتوں کے دستر خوان وسیع کر دے گا۔ اور سورہ ہود ہی میں دوسرے مقام پر فرمایا

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ
يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا۔

"اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو (استغفار کرو)' پھر اس کی جناب میں توبہ کرو' وہ تم پر چھاجوں مینہ برسائے گا"۔

آپ کو یاد ہو گا کہ اُس زمانے میں انسان کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی ہی تھا اور اس کا سارا دارومدار بارش پر تھا۔ کوئی ٹیوب ویل وغیرہ تو تھے نہیں۔ پھر کوئی انڈسٹری بھی نہیں تھی' کُل معیشت کا دارومدار زراعت پر تھا اور اس کا تمام تر انحصار بارش پر تھا۔ تو یہاں "يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا" گویا استعارہ ہے خوش حالی سے' کہ تمہارے لیے دنیا میں فراغت حاصل ہو گی۔

یہ تو ہوا دنیوی نتیجہ' اور اخروی نتیجہ توبہ کا وہ ہے جو سورۂ تحریم کی آیت نمبر ۸ میں بیان ہوا جس کے ایک ٹکڑے کا مطالعہ ہم نے آغاز میں کیا ہے۔ وہاں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا کے بعد فرمایا: عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ — "امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم

سے تمہاری برائیوں کو دور کردے گا" وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ "اور تم کو ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی"۔ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ "جس دن اللہ تعالیٰ ہرگز رسوا نہیں کرے گا' نہ اپنے رسول کو اور نہ ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے"۔ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ "ان (کے ایمان) کا نور ان کے آگے آگے اور (اعمالِ صالحہ کا نور) اُن کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا"۔ (اس روشنی کے ساتھ وہ پل صراط پر سے گزریں گے)۔ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا۔ "وہ دعا کر رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لئے کامل کردے اور ہماری مغفرت فرما!"۔

ظاہر بات ہے کہ یہ نور ہر ایک کو اپنے ایمان کی مناسبت اور اعمالِ صالحہ کی مقدار کے اعتبار سے ملے گا۔ ہم لوگوں کو تو اگر ملا بھی تو بہت تھوڑا سا' مدہم سا نور ملے گا۔ اور وہ نور جو کہ ابوبکر صدیق' عمر فاروق' عثمان غنی اور علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہم) کو ملے گا' ہم اس کا کیا اندازہ کرسکتے ہیں۔ حضورؐ نے تو فرمایا کہ بعض لوگوں کو اتنا نور ملے گا جس کی روشنی مدینہ سے صنعاء تک پہنچے گی' اور کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ ان کی روشنی ان کے قدموں کے سامنے ہوگی۔ گویا کہ ٹارچ کی مانند۔ اور اُس کٹھن مقام پر تو اتنی سی روشنی بھی بڑی خوش قسمتی ہوگی۔ اس روشنی میں بھی وہ ٹھوکر کھاکر جہنم کے گڑھے میں تو نہیں گریں گے۔ لیکن ایسے لوگ دعا کر رہے ہوں گے کہ اے پروردگار اپنے خاص فضل سے ہمارے نور کو بھی کامل فرمادے' اس کا اتمام فرمادے! اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ "یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے"۔ تجھے مطلقاً اختیار حاصل ہے' اگر ہماری کوتاہئ عمل کی وجہ سے ہمارا یہ نور مدہم رہ گیا ہے تو اپنے رحم و کرم سے' اپنی شانِ ستّاری کے طفیل اس کا اتمام فرمادے۔ تو یہ ہے دینی اہمیت توبہ کی!

انفرادی توبہ اور اس کے تقاضے

اب میں آرہا ہوں اپنے اس وقت کے موضوع کی طرف کہ ایک توبہ انفرادی ہے اور ایک اجتماعی ہے۔ حقیقی انفرادی توبہ کے بارے میں یہ بات جان لیجئے کہ یہ توبہ تدریجی نہیں ہوتی' بلکہ ایک دم ہوتی ہے۔ کُل کی کُل ہوتی ہے۔ تمام گناہوں سے پوری کی پوری توبہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ"۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ تدریجاً ایک ایک گناہ سے توبہ کروں گا تو اس کے لئے حضرت نوحؑ کی عمر شاید کفایت کرجائے۔

یہ توبہ ایک دم ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ ایمان لازمی تقاضا ہے توبہ کا۔ تجدیدِ ایمان اس کی شرط لازم ہے اور حقیقی ایمان کوئی ایسی غیر حقیقی اور کمزور شے نہیں ہے کہ وہ انسان کو یکدم بدل کر نہ رکھ دے۔ اور اس ضمن میں یہ بات بھی نوٹ کر لیجئے کہ اگر آپ کا یہ تدریجی عمل درمیان ہی میں ہو اور آپ کو موت آ جائے تو کیا ہو گا؟ قرآن مجید کے بعض مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک گناہ کا ارتکاب بھی جان بوجھ کر ہو رہا ہو اور مسلسل ہو رہا ہو تو' جیسے کہ میں نے علماء کا قول نقل کیا ہے المعاصی برید الکفر اور گناہوں کے نتیجہ میں زوالِ ایمان کا اندیشہ موجود ہے' ایمان سرے سے زائل ہو جائے گا اور جب ایمان بالکل ضائع ہو جائے تو پھر خلود فی النّار یعنی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا اندیشہ موجود ہے اور قرآن مجید کی یہ آیتِ مبارکہ لرزا دینے والی آیت ہے:

بَلٰی مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ (البقرہ: ۸۱)

"کیوں نہیں' جس نے کمایا کوئی گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے' تو ایسے ہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے"۔

جان بوجھ کر' ایک گناہ کو گناہ سمجھتے ہوئے' انسان کا ڈھٹائی کے ساتھ اس کو کئے چلے جانا اس کے زوالِ ایمان اور نتیجۃً خلود فی النار کا باعث بن سکتا ہے۔ بلکہ علماء کا کہنا یہ ہے کہ گناہ اگرچہ صغیرہ کی قسم کا ہو' اس پر مداومت سے یہ کبیرہ بن جائے گا۔ صغائر پر دوام اور تسلسل انہیں کبائر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس طرح کے مغالطوں میں مبتلا ہونے سے بچنا چاہئے۔ یہ اپنے آپ کو تھپکی دینے کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔ انقلاب اگر آتا ہے تو ایک دم آتا ہے' طبیعت بدلتی ہے تو یک دم بدلتی ہے' دل اگر اصلاح پر آمادہ ہوتا ہے تو یک دم ہوتا ہے' اور وہ ہمہ جہتی اصلاح ہوتی ہے۔ اس کا تفصیل میں ابھی بعد میں کروں گا۔ اس کی کیفیات کچھ اور ہیں۔

انفرادی توبہ کے بارے میں یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اس کے دو تقاضے ہوں گے۔

ا) انسان کا مقصد اور نصب العین یک دم بدل جائے۔ دنیا اس کا مطلوب و مقصود نہ رہے۔ دنیا کی نعمتیں کسی نے حرام نہیں کی ہیں' جو حلال چیزیں ہیں ان سے متمتع ہونا ہرگز کوئی ملامت والی بات نہیں' بشرطیکہ جائز ذرائع سے حاصل ہو رہی ہوں۔ لیکن اگر دنیا مطلوب'

مقصود بن جائے تو یہ آخرت کی بربادی کا باعث بن جائے گی۔ تو انسان کا حقیقی نصب العین اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح ہونا چاہیے۔ دوسری ہر شے اس کے تابع ہو جائے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ (ii) انسان کی مساعی' اس کی بھاگ دوڑ اور جدّوجہد کا مرکز و محور اور اس کی استعدادات' صلاحیتوں اور خداداد قوتوں کا اصل ہدف بس اقامتِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہو! باقی ہر چیز کی حیثیت ثانوی ہو۔ اسے اگرچہ اپنی معیشت کے لئے بھی محنت کرنا ہوگی' اپنی معاشرت بھی سنوارنا ہوگی' اہل و عیال اور خویش و اقربائکے حقوق بھی ادا کرنے ہوں گے' لیکن اصل شے جسے اولیت حاصل ہوگی وہ اقامتِ دین کی جدّوجہد اور اعلاء کلمۃ اللہ کی سعی ہوگی۔ انفرادی توبہ کے یہ دو تقاضے پورے کر لئے جائیں تو یہ توبہ انشاء اللہ العزیز مبرور ہوگی' اللہ کے یہاں مقبول ہوگی اور اس توبہ کے وہ ثمرات حاصل ہوں گے جو کہ میں نے بیان کئے ہیں۔

اس انفرادی توبہ کے بارے میں ایک اہم بات اور نوٹ کر لیجئے کہ انفرادی توبہ فرضِ عین ہے' ہر شخص کے لئے لازم ہے۔ اگر کوئی شخص توبہ نہیں کرتا اور معصیت کا ارتکاب کرتے ہوئے موت اسے دبوچ لیتی ہے تو معافی نہیں ہوگی۔ توبہ کے بارے میں یہ مضمون سورۂ نساء کے تیسرے رکوع میں بیان ہوا ہے' جہاں دو آیتوں میں دو انتہائیں بیان کر دی گئی ہیں:

اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ۔ (۱۷)

"ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے جو نادانی سے کوئی غلط حرکت کر بیٹھتے ہیں' پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں تو اللہ بھی ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' حکمت والا ہے"۔

وَلَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ الخ (۱۸).

"اور ان لوگوں کی توبہ (قابلِ قبول) نہیں جو بُرے کام کئے جاتے ہیں' یہاں تک کہ ان میں سے کسی کے سامنے موت آ جائے تو وہ کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں..."

ان لوگوں کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ تَوبَۃَ الْعَبْدِ مالم یُغَرْغِرْ۔ کہ اللہ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک عالمِ نزع کی غرغراہٹ شروع نہیں ہو جاتی۔ یعنی جب تک موت کے آثار ظاہر نہیں ہوتے اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے' اور جب موت کے آثار شروع ہو جائیں تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے تو یہ دو انتہائیں تو حتمی ہیں۔ اب اگر کوئی بیچ بیچ میں ہے' یعنی کافی عرصہ کوئی گناہ بھی کیا ہے' لیکن بہرحال موت کے آثار شروع ہونے سے پہلے توبہ کرلی ہے تو اب معافی کی امید رکھنی چاہئے۔ لیکن ساتھ خوف بھی برقرار رہنا چاہئے کیونکہ بندۂ مومن کا معاملہ "بین الخوف والرّجاء" ہوتا ہے۔ اندیشہ بھی رہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ دوسری قسم میں شامل نہ فرما دے اور امید بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ پہلی قسم میں شامل فرمائیں گے۔

اجتماعی توبہ اور ملکی حالات

اب آیئے اجتماعی توبہ اور اس کے حوالے سے خاص طور پر ہمارے حالات کی طرف!
انفرادی توبہ کے بارے میں جو میں نے آخری بات کہی ہے' اس سے تقابل کرتے ہوئے اجتماعی توبہ کے بارے میں میں پہلی بات کہہ رہا ہوں۔ انفرادی توبہ کے بارے میں میں نے کہا ہے کہ یہ فرض عین ہے' جبکہ اجتماعی توبہ فرض کفایہ ہے! اس کا سبب یہ ہے کہ ایک تو تمام انسانوں کا توبہ کرلینا ناممکن ہے۔ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ معاشرہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو کہ گناہ سے بالکل خالی ہو۔ دورِ نبوی سے اعلیٰ اور بہتر معاشرے کا ہم تصوّر نہیں کرسکتے' لیکن وہاں بھی بدترین منافقین موجود تھے۔ تو عقلی اعتبار سے گناہ سے قطعی طور پر پاک معاشرہ محالِ مطلق ہے۔ جب حضورؐ کے معاشرہ میں یہ بات نہیں تھی تو پھر کسی دوسرے معاشرہ میں کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسری بات فرضِ کفایہ کے بارے میں سمجھ لیجئے کہ اس کے بارے میں جو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسے چند لوگ ادا کردیں تو سب کی طرف سے ادا ہو جائے گا' حقیقت میں یہ بات درست نہیں ہے۔ کفایت کافی ہونے سے ہے۔ اگر اتنے لوگ اس فرض کو ادا کردیں کہ اس سے تقاضا پورا ہو جائے تو یہ باقی سب کی طرف سے بھی کفایت کر جائے گا۔ یہ وہی لفظ ہے جو

حدیث میں اس طرح آیا ہے: مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِّمَّا كَثُرَ وَأَلْهٰى کہ انسان کو رزق مل رہا ہو اگرچہ وہ قلیل ہو مگر کفایت کر جائے وہ اس رزق سے کہیں زیادہ اچھا ہے جو کثیر ہو مگر غافل کر دے۔ بہتات واقعتاً انسان کو غافل کر دیتی ہے۔ تو "کفایہ" کا لفظ اسی 'کفی' سے بنا ہے۔ جیسے کہ آپ کو معلوم ہے قتال فی سبیل اللہ فرضِ عین تو صرف غزوۂ تبوک کے موقع پر ہوا تھا' کیونکہ اس موقع پر نفیرِ عام تھی۔ اس سے پہلے وہ فرضِ کفایہ تھا۔ کسی مہم کے لئے جتنے لوگ درکار ہیں وہ نکل آئیں تو بس کافی ہے' باقی کی طرف سے وہ ادا ہو گیا۔ فرض کریں کسی مہم کے لئے پانچ سو آدمی درکار ہیں' کوئی ایک چھوٹا سا پراجیکٹ ہے جس پر حضوؐر کو ایک سو آدمی بھیجنے ہیں' یا کسی چھاپہ مار کارروائی کے لئے صرف پچاس آدمیوں کی ضرورت ہے' تو مطلوبہ تعداد میں آدمی نکل آتے تو بس ضرورت پوری ہو جاتی' باقی سب کی طرف سے فرض ادا ہو جاتا۔ لیکن اگر کفایت نہیں ہو رہی ہو تو سب کے سب مجرم ہو رہے ہوں گے' سب کے سب گناہ گار ہو رہے ہوں گے۔

اسی کو ہم کہتے ہیں کہ معتدبہ تعداد میں یا مؤثر تعداد میں لوگ فراہم ہو جائیں کہ جس سے اس اجتماعی عمل کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے تو وہ توبہ کی شرطِ لازم ہے' خواہ توبہ اجتماعی ہو یا انفرادی۔ اسی طرح توبہ کی باقی شرائط بھی پوری ہونا ضروری ہیں۔ البتہ کسی معاشرے میں اتنے لوگ توبہ کر لیں کہ اجتماعی توبہ کے تقاضے پورے ہو جائیں تو یہ فرضِ کفایہ ادا ہو جائے گا اور یہ توبہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول ہو جائے گی

انفرادی توبہ کے بارے میں میں نے سب سے پہلی بات یہ کہی تھی کہ یہ توبہ یکدم ہونی چاہئے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اجتماعی توبہ یکدم نہیں ہوسکتی ہے' یہ تدریجاً ہو گی۔ ایک آدمی نے توبہ کی' جاگو اور جگاؤ کا عمل شروع ہوا' اس نے دوسروں کو توجہ دلائی' دو ہو گئے۔ دو سے پھر چار' چار سے آٹھ اور آٹھ سے سولہ ہوئے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ مطلوبہ تعداد ایک دن میں تو نہیں مل جائے گی۔ ایک دن میں تو وہ رسولوں کو نہیں ملی۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں ملی۔ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے چار آدمی ایمان لائے: ابوبکر' خدیجہ' زید بن حارث اور علی (رضی اللہ عنہم) اور اس کے بعد اب تدریجاً اضافہ ہوا۔ چار سے چالیس ہو گئے اور یہ چالیس چھ سال کے بعد ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ چھٹے سال میں ایمان لائے ہیں اور جب حضرت عمرؓ ایمان لائے ہیں تو چالیس کا عدد پورا ہوا'

ہے۔ آپ سے پہلے انتالیس لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ اور اس سے اگلے چھ سالوں میں ان چالیس سے سو ڈیڑھ سو تک تعداد پہنچ گئی۔ اور اس کے بعد تعداد تیزی سے آگے بڑھی۔ اس اعتبار سے اجتماعی توبہ کا عمل لامحالہ تدریجی ہے' جبکہ انفرادی توبہ یک دم ہوگی اور کُلی ہوگی۔

اب آپ یہاں نوٹ کر لیجئے کہ یہ وہی تدریجی عمل ہے جس کو میں انقلابی عمل بھی کہا کرتا ہوں۔ ایک آدمی بدلے' دس بدلیں' سو بدلیں' ایک معتدبہ تعداد تبدیل ہو' وہ انقلابی عمل کے تقاضے پورے کرے تو انقلاب آ جائے۔ ورنہ ؎

نہ تم بدلے، نہ دِل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں؟

انقلاب کے معنی ہیں بدلنا۔ ایک آدمی نے توبہ کی تو وہ بدل گیا۔ اس کا عمل بدل گیا' اس کا کردار بدل گیا' اس کے شب و روز بدل گئے' اس کی دلچسپیاں بدل گئیں' اس کے مقاصد بدل گئے' اس کا نصب العین بدل گیا۔ تو انفرادی توبہ انفرادی انقلاب ہے۔ لیکن اجتماعی توبہ اجتماعی انقلاب ہے۔ اس کا عمل تدریجی ہوگا۔ اس میں دعوت و تبلیغ' تنظیم' تربیت' صبرِ محض (Passive Resistance) اور اقدام (Active Resistance) کے مراحل آئیں گے۔ اور کچھ خون کی زکوٰۃ نکالنی پڑے گی۔ شعر بہت مشہور اور عام ہے ؎

شہید کا جو خون ہے وہ قوم کی زکوٰۃ ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

درحقیقت شہدا کا جو خون بہتا ہے اس سے اجتماعی سطح پر گویا قوم کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔ اس کے بغیر انقلاب نہیں آتا۔ اجتماعی اصلاح نہیں ہوتی۔ اگر ہو سکتی ہوتی تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایک انسان کا' مسلمان تو کجا' کسی کافر کا بھی خون کا قطرہ زمین پر گرانا پسند نہ کرتے۔ کجا یہ کہ خود آپؐ کے خون سے زمین رنگین ہوئی۔ یومِ طائف میں آپ کے پائے مبارک لہولہان ہوئے اور طائف کی سرزمین میں آپ کا خون جذب ہوا۔ دامنِ احد میں آپ کا چہرۂ مبارک لہولہان ہوا اور اس سے خون کا فوارا پھوٹا۔ میں نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں منہجِ انقلابِ نبوی کے چھ مراحل بارہا بیان کئے ہیں۔ اس کو آپ تدریجی عمل کہہ لیں' تدریجی توبہ کہہ لیں یا انقلابی عمل کہہ لیں۔ اسی عمل کو ہمیں تدریجاً اختیار کرنا ہے۔

اجتماعی سطح پر غلطی کی نشاندہی

اب اس کے ذیل میں ہمیں جائزہ لینا ہے کہ خطا کہاں ہوئی' اجتماعی سطح پر غلطی کہاں ہوئی؟ ظاہر بات ہے کہ اس سے توبہ تو کرنی ہوگی۔ انفرادی طور پر تو معلوم ہوتا ہے کہ میں کہاں کہاں حرام خوری کرتا رہا ہوں۔ لیکن اجتماعی سطح پر پہلے یہ تعین کرنا ضروری ہے کہ کیا کوتاہی ہوئی ہے اور کہاں پر ہوئی ہے! اگر اجتماعی غلطی کا تعین نہیں کریں گے تو اجتماعی توبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں آج میں نے اپنی گفتگو کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

اجتماعیت کی ہمارے یہاں دو صورتیں ہوتی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے یہاں دو طرح کی جماعتیں ہیں۔ ایک خالص سیاسی جماعتیں جن کا دین کے بارے میں نہ کوئی دعویٰ ہے' نہ دین سے کوئی عملی لگاؤ ہے! نعروں میں تو دین کا نام انہیں بھی لینا پڑتا ہے' لیکن ان کا دین سے کوئی سروکار نہیں۔ ان خالص سیاسی جماعتوں کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان سے شکوہ عبث ہے۔ جب ان کا کوئی دعویٰ ہی نہیں تو ان سے توقع کاہے کی!۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب ۔۔۔ کیا کسی کا گلہ کرے کوئی!

البتہ ان کے ضمن میں چار باتیں نوٹ کر لیجئے:

(i) ان کا اصل مقصد ہوتا ہے حصولِ اقتدار۔ سیاسی جماعتیں اسی لئے بنتی ہیں۔ ان کا منشور ہوتا ہے کہ اگر ہمیں حکومت ملے گی تو ہم یہ کریں گے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کے پاس تو خیر کوئی منشور اور پروگرام ہوتا ہی نہیں' صرف حصولِ اقتدار ہی ان کا ہدف ہوتا ہے۔

(ii) کوئی سیاسی جماعت عوام کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتی۔ سیاسی جماعت کے اعتبار سے یہ کام حماقت ہے۔ وہ تو عوام کے احساسات کی ترجمانی کر کے اور ان کی جو خواہشات ہیں ان کو نعروں کی شکل دے کر ایک سیلاب کا ریلا اٹھانے اور اس کی موجوں پر سواری کر کے اقتدار میں آنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ یہی سیاسی عمل ہے اور جو سیاست دان ایسا نہیں کرتا وہ احمق ہے' وہ سیاست دان نہیں ہے۔ آپ یہ دیکھیں کہ قوم کا مزاج کیا ہے' قوم چاہتی کیا ہے' قوم کے اصل مقاصد کیا ہیں اور انہی کو نعرہ بنا کر سامنے لے آئیں تو قوم آپ کا جھنڈا اٹھا لے گی اور زندہ باد کے نعرے لگائے گی۔ اس لئے کہ لوگ یہ جانتے ہیں کہ یہ وہی کہہ رہا ہے جو کہ ہم چاہتے ہیں۔ تو لوگوں کے جو واقعی اور حقیقی احساسات ہوتے ہیں' جو ان کی اصل

خواہشات ہوتی ہیں' اور جو بات خود ان کے اپنے دلوں میں ہوتی ہے وہی وہ اپنے لیڈروں سے سننا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اگر ایمان ہے تو ایمان کی بات' اگر دل میں نفاق ہے تو نفاق کی بات۔ قوم کے یہاں بے حیائی ہے تو لیڈروں کو بے حیائی اپنانی پڑتی ہے۔ ہمارے یہاں تقریروں میں سبّ و شتم اور گالی گلوچ کا رواج سب سے پہلے بھٹو صاحب نے ڈالا تھا' اس لئے کہ ان کو معلوم تھا کہ قوم اس سے خوش ہوتی ہے' قوم کی اکثریت کا مزاج یہی ہے!

(iii) کسی بھی صورت حال سے اپنے مقاصد کے لئے بھرپور انداز میں فائدہ اٹھانا سیاست کا جزوِ لازم ہے۔ اس میں سیاست دان کے سامنے قوم کا مقصد اور ملت کی فلاح نہیں رہتی' ساری سوچ بچار ذاتی مفاد کے لئے ہوتی ہے۔ صورت حال کتنی ہی خوفناک ہو سوچا یہ جائے گا کہ ہم اس سے کتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر کسی کا نقطۂ نظر اس کے نصب العین کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر نصب العین ہی حصولِ اقتدار ہو تو ہمیشہ قومی نقطۂ نظر کے بجائے اپنے جماعتی اور ذاتی اقتدار کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

(iv) سیاسی جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ لامحالہ سکہ رائج الوقت استعمال کرے۔ معاشرہ میں اگر رشوت کا لین دین ہے تو وہ بھی سیاسی رشوتیں دے' ہارس ٹریڈنگ کرے۔ پاگل ہو گا وہ سیاست دان جو اس کوچے میں قدم تو رکھے لیکن اس طرح کا لین دین نہ کرے۔ جب معاشرہ میں دولت کا چلن ہے اور ہر سطح پر ہارس ٹریڈنگ ہو رہی ہے تو وہ بھی دولت استعمال کرے کیونکہ سکہ رائج الوقت دولت ہے۔ کسی جگہ سکہ رائج الوقت برادری ہے تو برادری کے تعلقات کو استعمال کرے۔ اسی طرح کہیں جاگیرداری کا سکہ چل رہا ہے تو وہی سکہ استعمال کرنا پڑے گا۔ نہیں کریں گے تو آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے۔ سرداری نظام ہو گا تو سرداری سکہ چلے گا۔ آپ کسی بڑے سردار کے مقابلے میں کسی دوسرے آدمی کو کھڑا کر کے حماقت کا ارتکاب کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ چوائس آپ کے پاس یہ ہو گا کہ آپ ان سرداروں میں سے کسی کو چن لیں۔ قریشیوں میں سے' گیلانیوں میں سے' کھرلوں میں سے' ٹوانوں میں سے' لغاریوں میں سے' یا مزاریوں میں سے۔۔۔۔ لیکن یہ کہ سکہ رائج الوقت سے ہٹ کر سیاست کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ اپنے کچھ معیارات بنا کر اس سیاست میں آنا چاہیں تو شکست آپ کا مقدر ہو گی۔ چنانچہ ان اصولوں اور معیارات کے پیش نظر سیاسی جماعتوں سے قوم و ملت اور ملک و دین کی خیر خواہی کی توقع میرے نزدیک کارِ عبث ہے۔

اصل شکوہ ۔۔۔ مذہبی جماعتوں اور علماء سے!

اس ضمن میں مجھے اصل شکوہ مذہبی جماعتوں اور رجالِ دین سے ہے۔ انہی سے ہم توقعات وابستہ کر سکتے ہیں اور انہی پر سب سے بڑھ کر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جب ہمارے علما اس حدیث کو سن کر خوش ہوتے کہ "العلماءُ ورثۃ الانبیاء" تو انہیں یہ بات بھی مدِ نظر رکھنی چاہئے کہ جہاں مقام و مرتبہ زیادہ ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ ذمہ داری ہوتی ہے۔ حضورؐ اگر سید المرسلین ہیں تو آپؐ کی ذمہ داری بھی تمام مرسلین سے کٹھن ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ مجھے وہ ساری مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کرنی پڑی ہیں جو تمام انبیاء نے برداشت کی ہیں ؏ جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے! للذا ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ان سے کیا خطا اور کیا غلطی ہوئی ہے۔ اور میں اس سلسلے میں ایک بات پہلے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اسے ذاتی احتساب (Self Criticism) سمجھئے۔ میں بھی دین کا ایک خادم ہوں۔ میں نے اپنی جوانی کے دس برس ایک بڑی عظیم دینی جماعت اور تحریک کے ساتھ گزارے ہیں۔ تو یہ درحقیقت دوسروں پر تنقید نہیں ہے بلکہ میں اپنے آپ کو ان میں شامل کر کے بات کر رہا ہوں۔ میں جس غلطی کی نشان دہی کرنے چلا ہوں میں خود اس میں مبتلا رہا ہوں۔ للذا یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں اپنے آپ کو پاک صاف قرار دے کر بات کر رہا ہوں۔ اس ضمن میں میں یہ تذکرہ بھی کر دوں کہ میرا تعلق جماعت اسلامی سے دس برس رہا ہے۔ اور جو غلطی میں آج بیان کر رہا ہوں اسی بنیاد پر مجھے جماعت سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی تھی لیکن میں نے اس پر جو تنقید لکھی تھی وہ جماعت سے نکل کر نہیں، بلکہ جماعت میں رہتے ہوئے لکھی تھی، جبکہ میں جماعت کا رکن تھا اور ایک لوکل جماعت کا امیر تھا۔

میرا بہرحال ایک مزاج ہے کہ جو کام اختیار کرتا ہوں دل و جان سے کرتا ہوں۔ میں نے کبھی بھی تحریک اسلامی اور جماعت اسلامی کو اپنا ثانوی شغل نہیں سمجھا تھا، بلکہ اس کو اپنی زندگی میں اولیت دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کا ناظم اعلیٰ بھی رہا، جماعت میں جاتے ہی ساہیوال کا (جو کہ اُس وقت منٹگمری کہلاتا تھا) امیرِ جماعت بنا اور جماعت کا دستور بنانے کے لئے پورے پاکستان سے ہر حلقہ سے دو دو افراد کا جو انتخاب کیا گیا تھا گویا جماعت کی دستور ساز اسمبلی منتخب کی گئی تھی، اس میں حلقہ اوکاڑہ سے ایک میں بھی تھا۔

بہرحال میں نے اُس وقت اپنا وہ بیان لکھا جسے بعد میں کتابی صورت دی گئی۔ وہ ایک پارٹی در کر کے احساسات ہیں جو دیکھتا ہے کہ ہم سے ایک غلطی ہو رہی ہے' اجتماعی سطح پر ہم ایک غلط رخ پر بڑھ آئے ہیں۔ ہمیں اپنا جائزہ لے کر' سوچ کر اس کے مالہٗ وماعلیہ پر غور کر کے اپنی غلطی کی اصلاح کر لینی چاہئے۔ وہ اپنی جماعت کو اس غلطی سے آگاہ کرتا ہے اور اس کی اصلاح کی طرف توجہ دلاتا ہے اور میں آپ سے اللہ کو گواہ بنا کر کہہ رہا ہوں کہ جب میں نے وہ بیان لکھا تھا اُس وقت میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں کبھی جماعت سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میرا جماعت کے علاوہ کوئی وجود بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کتاب "تحریک جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ" ہے۔ اس کو بدنام کر دیا گیا ہے' حالانکہ اس کے سوا دو سو صفحات میں سے سو صفحات تو وہ ہیں جو میں نے جماعت کی تائید میں' جماعت کے بنیادی نقطۂ نظر' قبل از تقسیم جماعت کے طریق کار اور اس کے خصائص کی صد فی صد تائید میں لکھے ہیں۔ تو اس وقت صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ یہ خود احتسابی ہے' کسی باہر کے آدمی کی تنقید نہیں۔

مذہبی جماعتوں اور علماء کے کرنے کے اصل کام

میرے نزدیک رجالِ دین اور دینی جماعتوں کو اصلاً دو کام کرنے چاہئیں تھے۔ انہوں نے ایک تیسرا کام شروع کر دیا اور بس یہی ان کی غلطی ہے۔ اصل کام کیا کرنے چاہئیں تھے؟ پہلا کام دعوت و تبلیغ اور انفرادی توبہ کے عمل کو بڑھانا! اجتماعی توبہ انفرادی توبہ کے بغیر تو ہو ہی نہیں سکتی۔ جب تک معتدبہ افراد توبہ نہ کر لیں اجتماعی توبہ ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ لوگوں کو دعوت و تبلیغ اور نصیحت کی جائے' اس بات کو پھیلایا جائے' عام کیا جائے' لوگوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی جائے' تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا اور فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ کی پکار لگائی جائے۔ لوگوں کو متوجہ کیا جائے کہ کہاں جا رہے ہو؟ اَیْنَ تَذْھَبُوْنَ؟ دنیوی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو ہلاکت و بربادی اور اخروی اعتبار سے بھی عذابِ الٰہی کا مستحق بنا رہے ہو' لوٹو' پلٹو' ہوش میں آؤ! اسی کو کسی زمانے میں ہمارے ایک بزرگ نے ایک اصطلاح کی شکل دی تھی' یعنی' توبہ کی منادی'۔ اب یہ توبہ کی منادی کیا ہے؟ جیسے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو پکارا۔ یہ الفاظ آپ کو آج بھی انجیل میں ملیں گے:

Repent for the kingdom of heaven is at hand

کہ توبہ کرو، لوٹو، رجوع کرو، پلٹو اللہ کی طرف، اس لئے کہ آسمانی بادشاہت آیا چاہتی ہے۔ اب آسمانی بادشاہت سے مراد کیا ہے اِس وقت میں اس بحث میں جانا نہیں چاہتا ورنہ میں اپنے اصل موضوع سے ہٹ جاؤں گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انجیل میں Repent کا لفظ استعمال ہوا یعنی پچھتاوا۔ اور میں نے عرض کیا تھا کہ توبہ کی شرطِ اوّل یہی ہے کہ پچھتاوا ہو کہ میں نے یہ کیا کیا۔ میں کس حماقت میں مبتلا رہا۔ میں نے کس چیز کو اپنا مقصدِ زندگی بنالیا۔ میں کن کاموں میں اپنی توانائیاں اور قوتیں لگاتا رہا۔ جب پچھتاوا ہو گا تو توبہ ہو گی۔ اس پچھتاوے اور پشیمانی پر ہی اقبال کا یہ شہرۂ آفاق شعر ہے[1] جس پر کہ داغ دہلوی نے بڑی داد دی تھی ۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے!

پشیمانی سے کسی کی پیشانی پر جو قطرے رونما ہو جائیں تو وہ اللہ کو موتیوں کی طرح پسند ہیں۔ تو ان کے کرنے کا اولین کام تھا توبہ کی منادی اور تجدیدِ ایمان کی دعوت! اب اس کی تفصیل کی طرف میں نہیں جاؤں گا۔ مختصر ترین الفاظ میں یہی کہوں گا کہ تجدیدِ ایمان کا ذریعہ رجوع الی القرآن ہے۔ ایمان کا منبع اور سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖٓ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ

اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لانے والی یہ آیاتِ بینات ہیں - اس دعوت و تبلیغ، یا توبہ کی منادی کا نتیجہ انفرادی سوچ و فکر اور اعمال کی اصلاح ہے۔

ان کے کرنے کا دوسرا کام تھا مطالبہ اور مظاہرہ۔ عوام میں اجتماعی ارادہ (Collec-tive Will) جتنا جتنا پیدا ہوتا جائے اور جوں جوں وہ دین کو صرف زبان ہی سے نہیں، دل و جان سے چاہنے لگیں، اتنے ہی بڑے پیمانے پر مطالبے اور مظاہرے کے ذریعے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا جائے کہ یہ یہ کام ضروری ہیں، انہیں کرو!

---

[1] اسی موضوع پر ماہر القادری مرحوم کا ایک بڑا پیارا شعر نذرِ قارئین ہے ۔

توبہ میں صداقت ہے، نہ تاثیر دعا میں
اشکوں میں اگر رنگِ ندامت بھی نہیں ہے
(مرتب)

اور یہ یہ کام غلط ہیں' انہیں مت کرو' چھوڑ دو! اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر میں تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ آج آپ کو صرف عنوانات بتا رہا ہوں تاکہ مضمون مکمل ہو جائے۔[1]
نوٹ کیجئے کہ مظاہرہ لفظِ ' اظہار ' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ظاہر کرنا یعنی مطالبہ کو ظاہر کرنا۔ اور یہ بابِ مفاعلہ ہے جس کا خاصّہ شدّت اور اشتراک ہے۔ تو مظاہرہ کا مفہوم ہو گا اجتماعی طور پر کسی مطالبے کو نہایت شدّت و تاکید کے ساتھ ظاہر کرنا' پیش کرنا، سڑکوں پر نکل آنا کہ یہ کام غلط ہے' نہیں ہونے دیں گے۔ ایک لاکھ آدمی سڑک پر آ جائیں کہ یہ کلمۂ کفر کیوں کہا گیا ہے کہ ہاتھ کان کاٹ دینا مناسب نہیں ہے[2]؟ کس دریدہ دہنی سے قرآن مجید کا انکار کیا جا رہا ہے۔

حکمرانوں کی طرف سے ایسے کلمات کہے جاتے ہیں اور پوری قوم پی جاتی ہے' اس کو کچھ پرواہ ہی نہیں ہے۔ تب ہی تو پھر ان کو جرأتیں ہوتی ہیں اور ایک سے اونچا ایک کلمہ کہا جاتا ہے۔ آپ کے ملک میں اسلام کے قانونِ شہادت کا مذاق اڑایا گیا اور اس کے خلاف مظاہرے ہوئے' لیکن اِدھر سے کوئی جوابی مظاہرہ تک نہیں ہوا۔ لیکن جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں' ان مظاہروں کے لئے پر امن اور منظم ہونے کی دو شرطیں لازم ہیں۔ غیر منظم ہجوم (MOB) سے بد نظمی اور Chaos پیدا ہوگا' شر وجود میں آئے گا' توڑ پھوڑ ہوگی' کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پوری تاریخ دیکھ لیجئے' اس سے کوئی مثبت کام نہیں ہو سکتا۔ ہاں تخریبی کام ہو سکتا ہے' کسی کی ٹانگ گھسیٹی جا سکتی ہے' تعمیر ممکن نہیں ہے!

تعمیری اور مثبت کام ان مظاہروں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں جو کہ پر امن اور منظم ہوں۔ پاکستان میں اہل تشیّع نے ایسے مظاہروں سے اپنی بات منوا لی۔ ہمارے لئے اگرچہ وہ منفی بات ہے لیکن ان کے لئے تو وہ مثبت ہے۔ انہوں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ناک رگڑوا دی اور اسے قانون میں ترمیم کے لئے آرڈی ننس نافذ کرنا پڑا جس کی رُو سے شیعوں کو زکوٰۃ

۱۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے بعض خطابات میں نہایت شرح و بسط سے گفتگو فرمائی ہے جنہیں مرتب کر کے "نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت" کے عنوان سے کتابچے کی شکل دے دی گئی ہے۔

۲۔ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے اس بیان کی طرف اشارہ ہے جو قومی اخبارات میں شائع ہوا کہ "ہم لوگوں کے ہاتھ کان کاٹنا مناسب نہیں سمجھتے"۔

سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس لئے کہ ایک لاکھ آدمی سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کر کے دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ اور کوئی عام حکمران نہیں، مطلق العنان چیف مارشل لاایڈمنسٹریٹر ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا اور اس نے دین کے اندر رخنہ پیدا کرنا منظور کر لیا اور اس نے ان کے دباؤ میں آکر زکوٰۃ جیسے اہم مسئلہ پر دین کو تقسیم کر دیا۔

میں نے ۱۸ر اگست ۱۹۸۰ء کو ضیاء الحق صاحب سے پہلی ملاقات میں، جو میں نے علیحدہ اور تنہائی میں کی تھی ان سے کہا تھا کہ آپ اس مارشل لاء کو کب تک طوالت دیں گے، یہ خودکشی کے مترادف ہے۔ اور میں نے کہا تھا کہ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ آپ زکوٰۃ آرڈی ننس کو پورے کا پورا واپس لے لیں، یہ تعبّدی امور ہیں، عبادت کے متعلق ہیں۔ انہیں چھوڑ دیجئے کہ ہر فرقہ اپنے انداز میں کرے، لیکن خدا کے لئے اس سے امّت میں تفریق پیدا نہ کریں، ورنہ آپ اس سے بہت سے سنّیوں کو شیعہ بننے کی ترغیب دیں گے۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ کلمۂ حق اس نے مجھ سے آرمی ہاؤس میں کہلوایا۔ لاہور سے حافظ احمد یار صاحب میرے ساتھ اس میں شریک تھے۔ آپ ان سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ بہرحال شیعوں کے مظاہروں اور احتجاج سے یہ سبق حاصل کیجئے کہ پرامن اور منظم مظاہروں سے نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ ہنگاموں اور توڑ پھوڑ کے ذریعے نجانے آپ ملک کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار کر کہاں لے جائیں۔ پھر مارشل لاء لگ جائے یا کچھ اور ہو جائے مگر مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو گا۔

دینی جماعتوں کی عظیم غلطی اور اس کے خوفناک نتائج

ہماری دینی جماعتوں کے کرنے کے اصل دو کام یہ تھے، لیکن انہوں نے ایک تیسرا کام کر کے ہمالیہ جیسی بڑی غلطی کی۔ یہ تیسرا کام تھا اقتدار کی کشمکش میں شامل ہونا اور انتخاب کے میدان میں کود پڑنا۔ یہ ہے اصل مرض جس کی میں نشان دہی کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو یہ بات سمجھنے کی توفیق دے اور اگر اللہ کو اس ملک کے حق میں خیر مطلوب ہے اور عذابِ استیصال اس کا مقدر نہیں ہو چکا تو مجھے امید ہے کہ یقیناً لوگوں کو اس بات کا شعور حاصل ہو گا کہ یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ اس لئے کہ آپ جس نیت سے اس میں حصہ لے رہے ہیں، اسے یا تو آپ جانتے ہیں یا اللہ جانتا ہے۔ آپ کی نیت کتنی ہی خالص کیوں نہ ہو، ظاہری بات

ہی ہے کہ آپ بھی اقتدار کی جنگ میں شریک ہیں۔ لوگوں کو تو یہی نظر آئے گا نا! آپ کے مقابل تو یہی کہیں گے نا! سوچئے اس بات کو اور اقتدار کی جنگ میں حصہ لینے کے جو نتیجے نکلے ہیں اب وہ گن لیجئے:

(i) اسلام ایک نزاعی مسئلہ بن گیا۔ ایک پارٹی ایشو اور پارٹی پولیٹکس کا عنوان بن گیا۔ آپ کتنے ہی مخلص ہوں اور اسلام کی سربلندی کے لئے انتخابات میں حصہ لے رہے ہوں، آپ کا مخالف تو یہی کہے گا اور لوگوں کو یہی باور کرائے گا کہ یہ اقتدار کے حریص ہیں اور اسلام کو ایک نعرے اور سلوگن کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ یہ اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ چلئے کچھ لوگ آپ کی بات مان لیں گے ——————— لیکن کچھ لوگ ان کی بات بھی تو مانیں گے نا! نتیجہ کیا نکلا؟ کہ اسلام بجائے اجتماعی مسئلہ کے ایک نزاعی اور مابہ الاختلاف مسئلہ بن گیا۔

(ii) اسلام پر کسی ایک جماعت کی اجارہ داری تو تھی نہیں کہ وہی اسلام کے نام پر الیکشن میں حصہ لے، لہٰذا جب کئی مذہبی جماعتیں اس میں کود پڑیں تو اس کا انتہائی خوفناک نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے مابین سیاسی اختلاف صرف اصولی نہیں رہا بلکہ مذہبی جماعتوں کے باہم دست و گریباں ہونے کا عنوان بن گیا۔

(iii) تیسرا خوفناک نتیجہ یہ کہ فرقہ وارانہ کشیدگی جو پہلے ہی سے موجود تھی اس کے لئے انتخابی دھڑے بندیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایک شخص کہتا ہے کہ یہ اسلام ہمارا ہے، ان کا نہیں ہے۔ وہ فلاں برانڈ اسلام، اور فلاں برانڈ اسلام وہ اسلام نہیں ہے، اسلام تو یہ ہے جو ہمارے پاس ہے۔ دوسرا کہے گا کہ وہ اسلام نہیں، شرک ہے۔ اسلام تو ہمارا ہے جو توحید والا ہے۔ اب اسلام کئی ہو گئے۔ پہلے تو یہ ہوا کہ اسلام سیاست کا ایک نزاعی مسئلہ بن گیا اور اب اسلام ایک نہیں رہا، کئی ہو گئے۔ اور فرقہ وارانہ اختلافات کو خوب بھڑکا کر انہیں ووٹ لینے کے لئے ذریعہ بنایا گیا۔ ایک بہت بڑے مقرر جو کہ اب فوت ہو چکے ہیں انہوں نے ایک بار الیکشن کے موقع پر حیدر آباد میں تقریر کرتے ہوئے ایسا ڈرامائی انداز اختیار کیا کہ انتہائی درد بھری آواز میں کہا: "لوگو، درود پڑھ لو!" مجمع نے پڑھ لیا۔ "ایک دفعہ پھر پڑھ لو!" انہوں نے رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ مجمع نے پھر پڑھ لیا۔ "ایک دفعہ اور پڑھ لو!" انہوں نے روتے

ہوئے کہا۔ "اس لئے کہ اگر فلاں جماعت برسراقتدار آگئی تو درود پڑھنے پر پابندی لگ جائے گی"۔ اب بتایئے کہ عام آدمیوں کے مجمع میں اس طرح کی بات کا کیا تأثر لیا گیا ہو گا؟ وہ بے چارے سادہ لوح لوگ، نہ انہیں سیاست کی پیچیدگیوں کا علم، نہ وہ درود کے مسئلوں کو جانیں کہ اس میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف ہے ہی نہیں، لیکن انہیں ایک دینی جماعت سے بدظن کر دیا گیا۔ تو انتخاب کے میدان میں اس طرح کے ایشوز تو ہوں گے۔ آپ کے پاس کوئی گارنٹی تو نہیں ہے کہ آپ انہیں روک دیں گے۔

ایک چشم کشا مثال

دینی جماعتوں کے انتخابی سیاست میں ملوث ہونے کے نتائج کو میں ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک دینی جماعت نے ملک میں اسلامی دستور کا مطالبہ کیا اور یہ مہم چلائی کہ فلاں فلاں چیزیں دستور میں حل ہو جانی چاہئیں۔ وہ جماعت مختصر تھی، اس کے پاس اتنی زیادہ افرادی قوت بھی نہیں تھی، لیکن اُس وقت چونکہ انتخابات وغیرہ کا ابھی کہیں کوئی ذکر نہیں تھا، پاکستان نیا نیا بنا تھا، لہٰذا تمام مذہبی طبقات نے اس کی تائید کی۔ دستور ساز اسمبلی کو اس مطالبے پر مشتمل لاکھوں تار بھیجے گئے، محضرناموں اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ محکمہ ڈاک کے اہلکار تاروں، خطوط اور محضرناموں سے بھری ہوئی بوریاں لا لا کر سپیکر کی میز پر رکھ دیتے تھے۔ اس مطالبے کو ملک میں اتنا عام کیا گیا کہ ماچس کی ڈبیوں پر بھی چھاپا گیا اور پوسٹ کارڈوں پر بھی اس کی تشہیر کی گئی۔ اور اسمبلی کے اندر اس کے لئے سب سے بڑھ کر ہمت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔ وہ اُس وقت برسرِاقتدار پارٹی یعنی مسلم لیگ کے ایک اہم رہنما تھے۔ انہوں نے اسمبلی کے اندر کھڑے ہو کر یہ دھمکی دی کہ اگر یہ قراردادِ مقاصد پاس نہیں کرو گے تو میں مستعفی ہو کر ابھی باہر چلا جاؤں گا اور لوگوں سے کہوں گا کہ اب مسلم لیگ نے دھوکا دیا ہے، انہوں نے اسلام کا وعدہ کیا تھا لیکن اب وہ اس وعدے سے منحرف ہو گئے ہیں۔ تب وہ قراردادِ مقاصد پاس ہوئی۔ اتنی آسانی سے پاس نہیں ہو گئی تھی۔

اُس وقت ہماری اسمبلی میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے کہا کہ آج ہماری گردنیں شرم سے جھکی جا رہی ہیں اور ہم دنیا کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل

میں رہے ع "کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!" بیسویں صدی کے وسط میں م اللہ کو قادرِ مطلق ہی نہیں، حاکمِ اعلیٰ مانیں؟ جبکہ دنیا میں سیکولرازم کا دور دورہ ہے۔ ہرحال یہ ایک بہت ہی اونچی اور بہت اعلیٰ مثال ہے کہ اگر صرف دین کا مطالبہ ہو اور آپ ریفِ اقتدار بن کر سامنے نہ آئیں تو تمام دینی عناصر جمع ہوں گے، آپ کو ان کی تائید اصل ہوگی۔ اور پھر خود برسرِ اقتدار لوگوں میں سے بھی سب کے سب تو بے ایمان نہیں ں۔ اُس وقت تو اچھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ آخر خواجہ ناظم الدین جیسے جدّ گزار موجود تھے، سرحد سے سردار عبدالرب نشتر جیسے لوگ تھے، مولوی تمیزالدین ماحب اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی جیسے لوگ موجود تھے۔ تو جب تک آپ نے اسلام کو زاعی مسئلہ نہیں بنایا تھا اور اسے اقتدار کے لئے ایشو نہیں بنایا تھا آپ کو عوام میں موجود ینی عناصر کی بھرپور تائید بھی حاصل ہوئی اور خود حکومت میں سے بھی آپ کو اپنے ؤیدین مل گئے ـــــ

یہی دینی جماعت جب اقتدار کی کشمکش میں شریک ہو گئی تو نتیجہ کیا نکلا؟ مسلم لیگ کے قابلے میں واحد جماعت ہونے کے باوجود کسی بھی حلقے سے (سوائے ایک استثناء کے) امیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ میں ۵۱ء کے اس انتخاب کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا وں، کیونکہ میں خود اس میں ورکر تھا۔ آج میں جہاں رہتا ہوں ماڈل ٹاؤن میں، اس کے پولنگ اسٹیشن پر صبح سے شام تک کھڑا ہوا تھا، مولانا امین احسن اصلاحی وہاں نمائندہ تھے بجائت کے۔ اس الیکشن کے لئے ہم نے خوب کام کیا تھا۔ خود میں نے اس کے لئے اتنا کام کیا تھا کہ مجھے ٹائیفائڈ ہو گیا اور میں بیماری کے باعث فرسٹ پروفیشنل میں پریکٹیکل کا امتحان نہیں دے سکا، اگرچہ پیپرز میں مَیں فرسٹ رہا تھا۔ اس لئے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ خود احتسابی ہے۔ میں نے بھی اس راہ میں توانائیاں کھپائی ہیں۔

اب میں اس مسئلہ کی طرف آنا چاہتا ہوں جس کے لئے ہمارے ایک معزز سامع نے حزب اللہ' اور 'حزب الشیطان' کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ یہ جو ہم قرآن کی اصطلاحات کو لا کر موجودہ حالات میں چسپاں کر دیتے ہیں یہ نہایت ہی غیر محتاط انداز ہے۔ آپ دیکھئے، غور کیجئے کہ اُس وقت مذہب کے نام پر الیکشن میں آنے والی صرف ایک جماعت تھی، مقابلہ میں بھی صرف ایک جماعت تھی۔ اتنا صاف اور واضح مقابلہ پھر بعد میں کبھی نہیں

ہوا - ایک طرف صرف ایک سیاسی جماعت مسلم لیگ تھی کوئی اور سیاسی جماعت موجود نہیں تھی - اگرچہ جناح عوامی مسلم لیگ کے نام سے مسلم لیگ کا ایک دھڑا بن گیا تھا' لیکن اصل میں تو مسلم لیگ ہی تھی ' دولتانہ صاحب اس کے صدر تھے - اس کے مقابلہ میں آئی جماعت اسلامی - اب اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ جماعت کو حزب اللہ کہیں تو مسلم لیگ حزب الشیطان ہو گئی نا؟ اگر آپ یہی اصطلاحات استعمال کریں گے تو آج وہی مسلم لیگ حزب اللہ میں شامل کرنی پڑے گی اور دوسری کچھ جماعتیں حزب الشیطان میں! میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ قرآنی اصطلاحات کا بڑا ہی غیر محتاط استعمال ہے - سیاسی میدان میں دونوں طرف وہی وڈیرے ' وہی سردار ' اور وہی جاگیردار ہیں جن کا ایک مزاج ' ایک رہن سہن ' ایک تہذیب اور ایک سی اقدار ہیں - ان میں کچھ بھی تو فرق نہیں سوائے انیس بیس یا بیس اکیس کے ! میں نے ۱۹۴۹ء میں لکھا تھا کہ کیا فرق ہے دولتانہ صاحب میں اور بھٹو صاحب میں ؟ آج مجھے بتائیں کہ کیا فرق ہے بے نظیر میں اور عابدہ حسین میں ؟ تو اس اعتبار سے جان لیجئے کہ حزب اللہ یا حزب الشیطان کی اصطلاحات کا یہاں چسپاں کرنا درست نہیں ہے -

بہرحال اُس پہلے الیکشن میں تو دو ہی جماعتیں مدّمقابل تھیں - ان میں سے ایک کو آپ حزب اللہ کہہ لیں ' اور چلیں دوسری کو حزب الشیطان نہ بھی کہیں ------ لیکن آگے چل کر جب دوسری جماعتوں نے دیکھا کہ کوئی ایک جماعت اس میں حصہ لے رہی ہے تو ہم کیوں نہ لیں ؟ اس سے پہلے اگرچہ مذہبی جماعتیں موجود تھیں ' لیکن ان کی حیثیت سیاسی جماعتوں کی نہ تھی ! بریلوی علماء مسلم لیگ ہی میں ضم تھے ' ان کا علیحدہ طور پر کوئی تشخص نہ تھا - دیوبندی علمائے پاکستان میں آکر مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی قیادت میں جمعیت علمائے اسلام بنا لی تھی لیکن وہ مسلم لیگ ہی کا حصہ تھی - اس طرح کی علیحدہ جماعتیں نہ تھیں - وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیکھا دیکھی ان علمائے اپنے اپنے طور پر یہ سوچنا شروع کیا کہ ہمارا حلقہ اثر زیادہ ہے ' عوام ہماری بات زیادہ سنتے ہیں مسجدیں ہمارے پاس ہیں ' جمعہ کے خطبے ہم دیتے ہیں ' عوام سے مستقل رابطہ ہمارا ہے ' تو کیوں نہ ہم میدان سیاست میں قدم رکھیں ؟ ۔

لازم نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نا ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

اور وہ کوہ طور کی سیر جو شروع ہوئی ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہ احزاب ہیں' اب آپ ان میں سے کس کو حزب اللہ کہیں گے اور کس کو حزب الشیطان؟

دینی جماعتیں سیاسی پارٹیوں کے ضمیمے بن کر رہ گئی ہیں - ابھی حالیہ انتخابات میں کسی کا اتحاد تحریک استقلال کے ساتھ ہوگیا اور کسی کا مسلم لیگ کے ساتھ ہوگیا - کوئی اگر علیحدہ رہا تو وہ بھی اس لئے کہ اس کا کسی پارٹی سے معاملہ طے نہیں پایا - مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا اگر پیپلز پارٹی سے سیٹوں پر معاملہ طے ہو جاتا تو صوبہ سرحد کے اندر وہ ان کے ساتھ ہوتے - تو یہ ہے نتیجہ اس انتخابی عمل میں حصہ لینے کا کہ اب وہ احزاب ہیں' حزب نہیں - اور یہ آپ کا مغالطہ ہے کہ آپ سیکولر جماعتوں کو حزب الشیطان کہیں' وہ بھی تو ایک نہیں ہیں - پیپلز پارٹی سیکولر جماعت ہے' تو کیا تحریک استقلال سیکولر نہیں ہے؟ ان کا انداز مذہبی تو نہیں ہے' کھلم کھلا سیکولر ہے - وہ بھی تو علیحدہ علیحدہ ہیں - کیا آپ کے خیال میں نیپ وغیرہ کوئی مذہبی جماعت ہے؟ تو آپ کس بنیاد پر یہ کہہ دینا چاہتے ہیں' اگرچہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ اور یہ بڑا ہی بچگانہ خلوص ہے' کہ حزب الشیطان متحد ہے اور حزب اللہ بٹی ہوئی اور منتشر ہے - خدا کے لئے اس صورت حال کو سمجھیں کہ یہ درحقیقت ایک بنیادی غلطی ہے - اس کی اصلاح ہوگی تو گاڑی چلے گی - ورنہ اس سے بے چینی و انتشار میں اضافہ ہی ہوگا' اس کے سوا کچھ نہیں!

اجتماعی توبہ کا لازمی تقاضا اور اس کے نتائج

اب اس اجتماعی توبہ کا لازمی تقاضا ہے انتخابی سیاست سے واپسی! اگر یہ مان لیں کہ یہ غلطی ہوئی ہے تو توبہ کا تقاضا ہے کہ اس کو ترک کر دیں - ظاہر بات ہے کہ اس میں کوئی ایک جماعت پہل کرے گی' شاید وہ دوسروں کے لئے بھی مثال بن جائے - اللہ کرے کہ وہ کسی جماعت کو اس کی توفیق دے اور وہ یہ سمجھ لے کہ یہ غلطی ہوئی ہے اور آج میں آپ کو عرض کر بتانا چاہتا ہوں کہ وہ جماعت جو اس میں پیش قدمی کرے گی خود اسے جماعتی اعتبار سے تین بڑے بڑے فائدے حاصل ہوں گے:

(i) آپ کو معلوم ہے اس ملک میں جو بھی مذہب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ ہیں ان کو سب سے بڑا شکوہ یہ ہے کہ یہ لوگ مذہب کے نام پر ووٹ تقسیم کروا دیتے ہیں اور فتح بقول ان کے "حزب الشیطان" کی ہو جاتی ہے کیونکہ یہ منقسم ہیں- چنانچہ جو جماعت بھی اس سے کنارہ کش ہو جائے گی اس سے تو یہ الزام دھل جائے گا کیونکہ وہ تو ووٹ تقسیم نہیں کرائے گی- پہلے اگر تین جماعتیں تھیں تو اب دو ہو گئیں- پہلے دو تھیں تو اب ایک رہ گئی- کچھ تو اسلام کا کاز آگے بڑھنے کا امکان ہو گا اور اس کا کریڈٹ وہ جماعت لے گی جو کہ قدم پیچھے ہٹانے میں اوّلیت اختیار کرے گی- عوام کہیں گے کہ ہاں انہوں نے ایثار کیا ہے' قربانی دی ہے' دین و مذہب کی خاطر اپنی چند سیٹوں کو چھوڑا ہے اور عمومی طور پر الیکشن کے اندر صورت حال بہتر ہو جائے گی-

(ii) ہر جماعت کے ووٹرز کا کچھ نہ کچھ اپنا ایک حلقہ ہے- چنانچہ ہر جماعت کچھ نہ کچھ سیٹیں لے جاتی ہے' خواہ دو چار ہی ہوں- اور جن حلقوں سے کوئی جماعت کامیاب نہیں ہوتی وہاں بھی اس کے ووٹرز تو ہیں نا! ایک جگہ پر اگر کوئی امیدوار پندرہ ہزار ووٹ لے کر کامیاب ہوتا ہے تو وہاں دس ہزار ووٹ لینے والا امیدوار بھی تو موجود ہے- تو جو جماعت بھی پسپائی اختیار کرے گی اس کے جو ووٹر ہیں وہ لامحالہ کسی دوسری مذہبی جماعت ہی کو ووٹ دیں گے' ان کے ووٹ کسی سیکولر جماعت کو تو نہیں جائیں گے- چنانچہ تمام مذہبی جماعتیں اب اپنا قبلہ درست کریں گی' مصالحت کریں گی' محبت کی پینگیں بڑھائیں گی کہ آپ کے ووٹ ہمیں ملنے چاہئیں- ہر مذہبی جماعت کا ایک دائرہ ہے' ایک حلقۂ اثر ہے- جمعیت علمائے اسلام درخواستی گروپ اور مولانا فضل الرحمٰن گروپ کا اپنا اپنا حلقۂ اثر ہے' جمعیت علمائے پاکستان کا بھی ایک دائرہ ہے' کہیں کہیں جمعیت اہل حدیث کا حلقۂ خیال ہے' یہ الگ بات ہے کہ اس وقت ان کا کوئی ایک بھی نمائندہ نہیں آیا- جماعت اسلامی کے کچھ اپنے حلقے ہیں' سوات اور دیر کے حلقے مستقلاً ان کے زیر اثر ہیں' کراچی میں بھی ان کے لاکھوں ووٹر ہیں- جب یہ پیچھے ہٹ جائیں گے تو بقیہ دینی جماعتیں ان کے ساتھ اپنے معاملے کو درست کریں گی تاکہ انہیں ان کی حمایت حاصل ہو- اس سے فرقہ وارانہ کشیدگی خود بخود کم ہو گی جو کہ ہمارا سب سے بڑا اور دینی اعتبار سے سب سے تباہ کن مسئلہ بنا ہوا ہے-

(iii) اس سب کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگرچہ آپ براہِ راست انتخابی عمل میں

ملوث نہیں ہو رہے ہوں گے لیکن آپ بالواسطہ اس پر اثر انداز ہو رہے ہوں گے - کوئی آپ کی جماعت پر یہ الزام بھی نہیں لگا سکے گا کہ آپ اقتدار کے حریص ہیں اور آپ اسلام کا نام اپنے اقتدار کے لئے لے رہے ہیں - جو نمائندے بھی الیکشن میں حصہ لے رہے ہوں گے وہ آپ کے ووٹ لینے کے لئے اسلام کے کچھ تو وعدے کریں گے! ان میں جو بھی نسبتاً قریب تر ہیں آپ ان کی حمایت کیجئے - اب جب آپ یہ کہتے ہیں کہ صاحب آخر انیس بیس کا فرق سہی 'انیس والے کی تائید ہونی چاہئے' تو یہی کام آپ الیکشن سے باہر رہ کر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ - ان میں سے دیکھئے کہ دو جاگیرداروں میں سے جو مذہبی مزاج کا ہو' اس کو سپورٹ کیجئے! اس طرح آپ کا بالواسطہ اثر انداز ہونا ان چند سیٹوں کی نسبت کہیں زیادہ نتیجہ خیز ہو گا -

تو یہ تین عظیم نتائج ہیں جو انتخابی سیاست سے کنارہ کشی سے حاصل ہو سکتے ہیں - اب یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو اس کی توفیق ملتی ہے 'کون اولیت اور پیش قدمی اختیار کرتا ہے - میں چونکہ مزاجاً اور ذہناً اور اپنے ماضی کے اعتبار سے قریب ترین ہوں جماعت اسلامی کے 'اس لئے ان کے اکابر سے گفتگو ہوئی ہے - میں نے قاضی حسین احمد صاحب سے 'پروفیسر عبد الغفور صاحب سے 'محمود اعظم فاروقی صاحب سے اور بعض دیگر اکابر سے' بعض نائب امراء سے گفتگوئیں کی ہیں کہ خدا کے لئے سوچو! اور اگر آپ انتخابات سے دست بردار ہو جائیں تو یہ فوائد ہیں جو جماعتی سطح پر آپ کو حاصل ہو جائیں گے اور میری طرف سے یہ بات کھلم کھلا کئی سال سے آ رہی تھی کہ اگر جماعت الیکشن سے واپسی اختیار کر لے تو میں اور میری تنظیم جماعتِ اسلامی میں شامل ہو جائے گی - اب تو میں نے جون کے میثاق میں اور آگے بڑھ کر کہا ہے کہ آپ یہ طے کر لیجئے کہ جماعت کچھ عرصہ کے لئے الیکشن سے الگ رہے گی - میں نے کب کہا ہے کہ الیکشن میں حصّہ لینا حرام ہے - آپ معیّن کر لیجئے کہ ہم پچیس سال کے لئے الیکشن کے میدان سے باہر ہیں 'تو میں آپ کے ساتھ ہوں -

البتہ اس کے پہلو بہ پہلو دوسرا معاملہ بھی بہت اہم ہے - وہ یہ کہ یہ جو سیاسی عمل ہے' جو کہ زیادہ تر سیکولر عناصر کے درمیان جاری ہے اور مذہبی جماعتیں اس میں پاسنگ کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں' اس کو چلنے دیجئے - خدا کے لئے اس کو روکنے کی کوشش نہ کیجئے!

اس کے آگے مصنوعی رکاوٹیں کھڑی نہ کیجئے' مذہبی جذبات کو بھڑکا کر انتخابی عمل کو روک دینے کا نتیجہ مارشل لاء کی صورت میں نکلے گا اور مارشل لاء اس ملک کے لئے موت ہے' خود کشی کے مترادف (Suicidal) ہے- میں یہ بات دس برس سے کہہ رہا ہوں- میں نے کرنے کے جو اصل کام گنوائے ہیں' جتنا جتنا آپ ان کاموں میں بڑھتے جائیں گے' اتنا اتنا آپ الیکشن پر بھی اثر انداز ہوتے چلے جائیں گے- ملک میں اصلاح کا عمل تیز تر ہوتا چلا جائے گا اور تدریجاً اجتماعی توبہ ہوتی چلی جائے گی- اور اس کے بارے میں میں بتا چکا ہوں کہ یہ تدریجاً ہی ہوگی' یک دم نہیں ہو سکتی-

اب میں اپنی اس گفتگو کا اختتام کر رہا ہوں اس بات پر کہ کاش ------ لیکن اصل میں ہمیں لفظ 'دعا' استعمال کرنا چاہئے کیونکہ لفظ 'کاش' اگرچہ عام فہم ہے لیکن ہماری دینی اصطلاح نہیں- تو دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ صحیح بات کو سمجھنے کی اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے- میری بات کو اس انداز سے نہ سمجھئے کہ میں مخالفت کر رہا ہوں- میں نے آج تک اپنے آپ کو تحریک اسلامی سے علیحدہ تصور نہیں کیا- اُس وقت بھی خود احتسابی تھی جب جماعت کے رکن کے طور پر بیان دیا تھا' اور آج بھی خود احتسابی ہے- اس اعتبار سے غور کریں' سوچیں' اس ملک کی بھلائی کے لئے' اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے غور و فکر کریں! خدا تعالیٰ جس کو بھی توفیق دے وہ اس میں پیش قدمی کرے- میں تو جمعیت علماءِ اسلام کی دونوں کانفرنسوں میں شریک ہوا تھا' اس میں بھی جو مولانا فضل الرحمٰن گروپ کے تحت ہوئی تھی اور پھر اس میں بھی جو مولانا درخواستی گروپ کے تحت ہوئی تھی- میں دونوں میں گیا- دونوں نے اکرام کیا' اعزاز فرمایا' اسٹیج پر بٹھا دیا اور پوری کارروائی کے دوران اسٹیج پر بیٹھا رہا- میں وہاں اس امید پر گیا تھا کہ سنا تھا کہ مولانا حق نواز جھنگوی مرحوم نے اس سے قبل ایک تقریر میں کہا تھا کہ ہم انتخابات کا راستہ چھوڑ کر انقلاب کا راستہ اختیار کرنے کا اعلان کرنے والے ہیں- میرے لئے تو یہ بہت بڑی خوشی کی بات تھی- چنانچہ میں گیا' لیکن مایوس ہو کر لوٹا- ع "اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نم ناک!"-

دوسری کانفرنس میں گیا تو وہاں پر بھی مولانا سمیع الحق صاحب نے کلاشن کوف اٹھا کر بڑا انقلابی انداز اختیار کیا' لیکن آخری بات وہی کہی کہ الیکشن آ رہا ہے' تیاری کر لو! گویا کہ رنوں کا پرنالہ وہیں گرا-

یارب نہ وہ سمجھے ہیں ' نہ سمجھیں گے میری بات
دل اور دے ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور!

لیکن یہ مایوسی والی بات ہے - میں بہرحال اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں - اللہ تعالیٰ ان حضرات کو توفیق دے کہ وہ اپنے پروگرام پر نظر ثانی کریں' سوچیں' غور کریں - میں ان کا خادم ہوں' جو بھی بسم اللہ کریں ان کے پیچھے چلوں گا!

تازہ ترین صورت حال

اس وقت ملک میں جو صورت حال ہے اب میں اس کے متعلق مختصراً عرض کر رہا ہوں - حیدر آباد میں مزید دھماکے ہوئے ہیں' کراچی ایکسپریس میں بھی دھماکہ ہوا ہے' خوف و ہراس کی کیفیت مزید بڑھ گئی ہے - اور میرے نزدیک سب سے اہم اور تشویش ناک نکتہ یہ ہے کہ گویا یہ ثابت ہوگیا کہ فوج بھی غیر مؤثر ہے - گلی گلی کی توناکہ بندی ہے' ہر چوک پر ایک چوکی ہے' یک دم یہ جو دھماکے ہوئے ہیں حیدر آباد میں' یہ بڑی خطرناک بات ہے ——— اس پہلو سے بھی کہ فوج کا مورال (Morale) بھی گرے گا اور اس پہلو سے بھی کہ عوام کی نظروں میں بھی فوج کی عزّت و وقعت گر جائے گی - اور جو دوسرے خوفناک نتائج ہیں وہ الگ ہیں -

دوسری طرف بے نظیر صاحبہ نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ فوج کو دفعہ ۲۴۵ کے تحت اختیارات دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - لیکن بہرحال اب ایک بات مانی ہے اس کے لئے بھی ابھی آرڈی ننس تو نہیں بنا' زیر غور ہے - اس کے ذریعے ایک قدم آگے بڑھایا جارہا ہے کہ فوج کو پولیس کا وہ اختیار دیا جارہا ہے جو کہ ایس ایچ او کا ہوتا ہے' یعنی پرچہ وہ کاٹے گی - یہ ایک مثبت پیش رفت ہے' خدا کرے کہ اس سے اچھے نتائج نکل آئیں - آپ کو معلوم ہے کہ فوج داری مقدمات میں سارا دارومدار پرچہ پر ہوتا ہے او پولیس کے اہل کاروں سے زیادہ اس بات سے کون واقف ہے کہ پرچہ میں ایک لفظ کے بدل دینے سے پورے مقدمہ کا رخ ہی بدل جاتا ہے - سارا جرم لکھ کر کہیں ایک لفظ ا لکھ دیجئے کہ جس سے سارا جرم کالعدم ہو جائے - اور قانون کا تقاضا ہوتا ہے کہ ایسے مجرم شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دیا جائے - لیکن اب اگر یہ اختیار فوج کو دیا جاتا ہے کہ پرچہ وہ کاٹے

(باقی ص۱۷)

جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اُولیٰ

شہادت علی النّاس

سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں

(۴)

بِسۡمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ ! آگے بڑھنے سے قبل سورۃ الحج کی اس آخری آیت میں جو ہمارے زیرِ مطالعہ ہے، "ھُوَ اجۡتَبٰکُمۡ" کے بعد ربطِ کلام کو پہلے سمجھ لینا چاہیئے - یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ "اجتبیٰ" میں کسی مقصدِ معیّنہ کے لیے کسی کا انتخاب پیشِ نظر ہوتا ہے - امتِ مسلمہ کا یہ "اجتبیٰ" یا چناؤ کس مقصد کے لیے ہوا، اس کا جواب آگے آ رہا ہے : "لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ" کہ تمہارے اس "اجتبیٰ" (SELECTION) کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ پوری نوعِ انسانی پر - یہ مقصدِ عظیم ہے جس کے لیے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے

لیکن آیت کے اس ٹکڑے سے پہلے ایک ضمنی بات درمیان میں آئی ہے - یوں سمجھیے کہ ایک 'SUBORDINATE CLAUSE' جملے کے بیچ میں شامل کر دی گئی ہے - چنانچہ جس امت پر یہ بھاری ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے اس کی ہمت بندھانے کے لیے کچھ ترغیب و تشویق کے انداز میں فرمایا گیا: "وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ" کہ اس دین کے معاملے میں اللہ نے تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی - ان الفاظ مبارکہ کا ایک عمومی مفہوم

تو یہ ہے کہ یہ دین، دینِ فطرت ہے۔ خلافِ فطرت کوئی حدود اور قیود یہاں عائد نہیں کی گئیں فطری تقاضوں کے اوپر کوئی غیر فطری بندش اور پابندی یہاں نہیں لگائی گئی۔ اس کی تعلیمات فطرتِ انسانی کے لیے معروف اور جانی پہچانی ہیں۔ ان سے انسان طبعاً مانوس ہے۔ اس پہلو سے یہ دین آسان دین ہے۔ اس میں کوئی تنگی نہیں، کوئی سختی نہیں، اس میں رہبانیت کی پابندیاں نہیں، اس میں نفس کو کچل دینے والی ریاضتیں نہیں۔ اس میں رسومات کا کوئی لمبا چوڑا طومار نہیں۔ بہت سادہ دینِ فطرت ہے۔

بنو اسماعیل کے لیے اضافی سہولت

آیت کا یہ مفہوم اُمتِ مسلمہ کے تمام افراد سے متعلق ہے خواہ دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے، جن سے اس اُمتِ محمدؐ کا نیوکلیس تیار ہوا، جو حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے اور اس ناطے اُن کا رشتہ جُڑتا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ، اس پہلو سے بھی اس دین میں کوئی تنگی نہیں ہے کہ یہ تو ان کے جدِ امجد ابراہیمؑ کا طریقہ ہے۔ یہ بیت اللہ جس سے محبت و عقیدت انہیں وراثتاً بھی ملی تھی انہی کا بنایا ہوا گھر ہے جس کے گرد طواف کا سلسلہ ان کے ہاں دورِ جاہلیت میں بھی جاری رہا، قربانی کا سلسلہ جاری رہا، منیٰ اور عرفات کا قیام جاری رہا، یہ سب چیزیں تو تمہاری نسلی اور قومی روایات کا جزو بن چکی ہیں۔ اس پہلو سے تمہارے لیے تو کوئی تنگی نہیں، اس دین کے اور تمہارے درمیان اجنبیت کا کوئی پردہ حائل نہیں۔ ہاں جو غلط باتیں تم نے اس میں شامل کر دی تھیں ان کو ہٹا دیا گیا ہے۔ اسی طرح تمہارے جو اپنے رواج اور معاشرتی طور طریقے تھے بنیادی طور پر انہی کی اساس پر شریعتِ محمدیؐ کا تانا بانا تیار ہوا۔ اُن میں جو چیزیں غلط تھیں انہیں کاٹ پھینکا گیا اور جو صحیح تھیں انہیں برقرار رکھا گیا۔ لہٰذا پہلا خطاب کے اعتبار سے جو لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کے اوّلین مخاطب تھے ان کے حوالے سے کہا گیا: ﴿مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ﴾ "یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے" تمہارے لیے اس کے قبول کرنے میں یا اس کے علمبردار اور پرچارک بننے میں کہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی اجنبیت کا پردہ حائل نہیں۔

آگے ارشاد ہوتا ہے: "﴿هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَٰذَا﴾" "اس

نے تمہارا نام رکھا مسلمان "پہلے بھی اور اس میں بھی"۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت ابراہیم نے بھی اس امت کے لیے لفظ مسلمان تجویز کیا تھا۔ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی زبان پر یہ دعا جاری رہی۔ " رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ "کہ اے ہمارے رب، ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار (مسلمان) بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امتِ مسلمہ برپا کیجیو۔ تو تمہارا یہ نام تمہارے جدّامجد نے رکھا ہے۔ اللہ نے بھی اس کتاب میں، اس کلامِ پاک میں تمہیں اسی نام سے موسوم کیا ہے: " إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ "اس پہلو سے گویا ایک مرتبہ پھر اعادہ ہوگیا اُسی حقیقت کا جو اس سے پہلے سورہ حٰمٓ السجدہ کے درس میں آچکی ہے کہ ایک داعیٔ حق اور ایک داعی الی اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا تعارف صرف بطور مسلمان کرائے: " إِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ "۔ کسی اور گروہی نسبت یا کسی تعلق کو نمایاں کرنا درحقیقت دعوتِ اسلامی یا دعوت الی اللہ کے مزاج کے منافی ہو جائے گا۔

شہادت علی النّاس: اُمت کا فرضِ منصبی

یہ ضمنی مضمون تھا۔ اس کے بعد اگلے الفاظ مبارکہ کو جوڑ لیجیے "هُوَ اجْتَبٰكُمْ" سے۔ کہ اے مسلمانو! تمہارا انتخاب ہوگیا ہے، تم چن لیے گئے ہو ایک مقصدِ عظیم کے لیے۔ اور وہ مقصدِ عظیم یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد اب کارِ نبوّت کی ذمّہ داری مجموعی طور پر تمہارے کاندھوں پر ہے۔ شہادت علی النّاس کا فریضہ جو انبیاء ادا کرتے رہے وہ اب تمہارے ذمّے ہوگا۔ اللہ کی طرف سے خلقِ خدا پر اتمامِ حجّت، اللہ کا پیغام خلقِ خدا تک پہنچا دینا جیسا کہ پہنچا دینے کا حق ہے، اور اپنے قول و عمل سے اس دین اور اس توحید کی شہادت دینا، جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ؎ " دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!" — یہ سب کام اب تمہیں بحیثیتِ امت کرنے ہوں گے۔ " لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ " "تاکہ ہو جائیں رسول گواہ تم پر" —— انہوں نے تو ابلاغ و تبلیغ کا حق ادا کر دیا، انہوں نے اللہ کا کلام تمہیں پہنچا دیا خواہ اس راہ میں انہیں ماریں کھانی پڑیں، گالیاں سننی پڑیں، استہزاء اور تمسخر کا ہدف بننا پڑا، ان پر پتھروں کی بارش ہوئی، ان کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور خواہ

انہیں اپنے قریب ترین اعزّہ کی جانوں کا نذرانہ اللہ کے حضور میں پیش کرنا پڑا۔ ذرا تصوّر میں لائیے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے اعضا بریدہ لاشے کو۔ ناک کٹی ہوئی، کان کٹا ہوا، اسی پر بس نہیں، سینہ چاک کر کے کلیجہ تک چبا ڈالا گیا تھا۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارے شدائد جھیلے، تمام مصیبتیں برداشت کیں، مسلسل تیئیس برس سخت ترین مشقت سے آپؐ کا سابقہ رہا۔ اس میں تین برس کی وہ قید بھی ہے، شعب بنی ہاشم کی قید، جس میں سخت ترین فاقہ اور شدید ترین بھوک کی آزمائش بھی آئی، اسی میں وہ یوم طائف بھی ہے جس کا نقشہ یہ ہے کہ پتھراؤ ہو رہا ہے، جسم مبارک لہولہان ہو گیا ہے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ پھر اس میں غارِ ثور کا وہ صبر آزما مرحلہ بھی ہے، اس میں وہ دامنِ اُحد کا جاں گسل معرکہ بھی ہے، اس میں بدر و حنین کے تمام مراحل آئے لیکن ان تمام مراحل کا نتیجہ کیا ہے! محمد صلی اللہ علیہ نے اللہ کی توحید کی گواہی اس شان سے دی کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اللہ کے کلام کا ابلاغ اس طور سے فرمایا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اللہ کے دین کی گواہی اپنے قول سے بھی دی اور عمل سے بھی اور اس دین کے نظام کو عملاً برپا کر کے دکھا دیا تاکہ کسی کے پاس کوئی عذر نہ رہے، کوئی یہ بہانہ پیش نہ کر سکے اے اللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے!

صحابہ کرامؓ کی گواہی

چنانچہ ذرا چشم تصوّر سے دیکھیے! حجۃ الوداع کا موقع ہے، عرفات کا میدان ہے، حضورؐ نے اپنے اس آخری حج میں متعدد خطبے ارشاد فرمائے، عرفات کے میدان میں بھی اور منیٰ کی وادی میں بھی۔ تیئیس برس کی محنتِ شاقّہ کا حاصل، ایک لاکھ سے زائد افراد کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر ہے۔ عرب کے کونے کونے سے کھنچ کر آئے ہوئے لوگ جمع ہیں۔

حضورؐ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں جس کے آغاز ہی میں آپ یہ فرما کر لوگوں کو چونکا دیتے ہیں کہ لوگو شاید دوبارہ اس مقام پر ملاقات نہ ہو! گویا اشارہ دے دیا گیا کہ یہ الوداعی خطبہ ہے۔ آخری باتیں ہیں جو حضورؐ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اسی خطبے میں وہ الفاظ بھی آئے جن کا حوالہ سورۃ الحجرات کے درس کے ضمن میں دیا جا چکا ہے۔ آپؐ نے اپنی تعلیمات کا ملخص، لب لباب اور اہم نکات کو بتکرار و اعادہ بیان فرمایا کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ عورتوں اور غلاموں کے حقوق کی طرف آپ نے انتہائی تاکیدی انداز میں توجہ دلائی۔ بڑا مفصل خطبہ ہے جسے پورا نقل

کرنا یہاں پیش نظر نہیں ہے۔ خطبے کے اخیر میں آپؐ پورے مجمع سے ایک سوال کرتے ہیں: "اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ ؟ لوگو، کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ صحابہ کرامؓ کا عام معمول یہ تھا کہ حضورؐ جب بھی بغرض تعلیم اُن سے کوئی سوال کرتے تھے تو صحابہؓ بالعموم اوّلاً اس کے جواب میں کہتے تھے "اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ" (یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں)، پھر جب آپؐ دوبارہ یا سہ بارہ سوال کرتے تب وہ اپنی سمجھ کے مطابق مختصر سا جواب دیتے تھے۔ لیکن اس موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ خلافِ معمول اس ایک سوال کا مفصّل جواب صحابہ کرامؓ نے بیک زبان دیا کہ "اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّيْتَ وَ نَصَحْتَ" بلکہ ایک روایت میں مزید تفصیل وارد ہوئی۔ "اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَ اَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَ نَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَ كَشَفْتَ الْغُمَّةَ" کہ اے نبیؐ، ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حقِ امانت ادا کر دیا، آپؐ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا، آپؐ نے حقِ نُصح و خیرخواہی ادا کر دیا، آپؐ نے گمراہی کے پردوں کو چاک کر دیا اور ہدایت کا سراجِ منیر اور خورشیدِ تاباں آپؐ کی کوششوں کے نتیجے میں اس وقت نصف النہار پر چمک رہا ہے ـــ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے یہ گواہی تین مرتبہ لی۔ پھر آپؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور تین مرتبہ زبان سے یہ الفاظ ادا فرمائے: "اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ"۔ تفصیل یہاں تک آتی ہے کہ آپؐ نے اپنی انگشتِ شہادت سے پہلے اشارہ فرمایا آسمان کی طرف پھر لوگوں کی طرف، زبان پر یہ الفاظ جاری تھے: "اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ" کہ اے اللہ تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ تو بھی گواہ رہ کہ میں آج سبکدوش ہو گیا۔ میری ذمہ داری ختم ہو گئی۔ تیری ایک امانت مجھ تک پہنچی تھی بواسطۂ جبرئیل۔ پیغام تھا نوعِ انسانی کے لیے۔ میری حیثیت امین کی تھی، میں نے وہ ذمہ داری ادا کر دی۔ میں نے وہ پیغام لوگوں تک پہنچا دیا اور اُن سے گواہی لے لی ہے کہ میں نے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا حق ادا کر دیا ہے۔

حضورؐ نے صحابہؓ سے گواہی کیوں لی؟

غور کرنا چاہیے کہ حضورؐ نے اس اہتمام کے ساتھ یہ گواہی کیوں لی۔ درحقیقت منصبِ نبوت و رسالت سے سرفراز ہونا جہاں ایک طرف باعثِ عزّ و شرف ہے وہاں دوسری طرف یہ ایک انتہائی کٹھن اور نازک ذمّہ داری بھی ہے۔ ایک سادہ سی مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ

اگر آپ اپنے کسی عزیز کو کوئی پیغام بھیجیں کہ فلاں کام فلاں وقت تک ضرور ہو جائے ورنہ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ آپ نے کسی کی معرفت وہ پیغام بھیجا۔ گویا درمیان میں ایک ایلچی ہے جو آپ کے پیغام کو آپ کے عزیز تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ فرض کیجیے وہ کام نہیں ہوا۔ اب آپ تحقیق و تفتیش کریں گے کہ اس کام کے نہ ہونے کی وجہ سے جو نقصان ہوا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے! اگر تو پیغام پہنچ گیا تھا اور پھر اس عزیز نے وہ کام نہیں کیا تو آپ کا سارا گلہ شکوہ اس سے ہوگا، وہ ایلچی بری قرار پائے گا اور اگر کہیں اُس ایلچی نے کوتاہی کی ہے اس نے پیغام پہنچایا ہی نہیں تو ظاہر بات ہے آپ اپنے اس عزیز سے کوئی بازپرس نہیں کر سکتے، سارا بوجھ آئے گا اُس ایلچی پر کہ جس نے وہ ذمہ داری ادا نہ کی۔ یہ ہے وہ نازک اور کٹھن ذمہ داری جو انبیاء و رسل کے کندھوں پر آتی ہے۔ اُن کی جانب سے اگر ابلاغ میں اور پہنچانے میں کوئی کمی رہ جائے تو بقیہ انسانوں سے بازپرس کی نوبت تو بعد میں آئے گی پہلے اُن کی جواب طلبی ہو جائے گی۔

یہ بات سورۃ الاعراف کے آغاز میں نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے: "فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ" کہ ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔ اور یہی ہے اس آیت کا حاصل کہ: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ" کہ اے نبی پہنچا دیجیے جو کچھ نازل ہوا ہے آپ پر آپ کے رب کی جانب سے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہوئی تو یہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی شمار ہوگی۔ اگرچہ بظاہر احوال اس کا ہرگز کوئی امکان نہیں کہ اس معاملے میں نبی اکرمؐ سے کسی کوتاہی کا صدور ہوتا لیکن یہاں در اصل مقام نبوت و رسالت کی نزاکت کا اظہار مقصود ہے۔ یہ بات ایک اور انداز میں بالکل آغاز ہی میں ان الفاظ میں واضح کر دی گئی تھی کہ " اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا۔" ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔" ایک بہت بڑی ذمہ داری آپ کے کاندھے پر آنے والی ہے۔ یہ ہے وہ بارِ امانت جو نبی اور رسول کے کندھے پر ہوتا ہے رسول اس کو پہنچا کر بری ہو جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس نے گواہی دے دی حق کی، صداقت کی، توحید کی اور جو بھی اللہ کا پیغام آیا تھا اس کی۔ یہ گواہی اس نے قولاً بھی دے دی اور عملاً بھی۔ اور پھر لوگوں سے بھی یہ گواہی لے لی کہ "میں نے پہنچانے کا

حق ادا کر دیا!" اب وہ بری ہو گیا۔ یہ ہے شہادت علی الناس۔ اسی کا ظہور ہو گا روزِ قیامت میدانِ حشر میں۔ جب انفرادی محاسبے سے پہلے امتوں کے محاسبے کا مرحلہ آئے گا۔ امتوں کو اجتماعی جواب دہی کے لیے کٹہرے میں آنا پڑے گا۔

رسولوں کی گواہی اپنی امتوں کے خلاف!

قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر یہ نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اس وقت ہر امت کی طرف بھیجا جانے والا رسول پہلے سرکاری گواہ (PROSECUTION WITNESS) کی حیثیت سے کھڑا ہو گا اور یہ شہادت دے گا، TESTIFY کرے گا کہ اے رب، تیرا جو پیغام مجھ تک پہنچا تھا میں نے بلا کم و کاست پہنچا دیا تھا۔ اب یہ لوگ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ یہ خود مسئول ہیں، یہ خود جواب دہ ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو سورۃ النساء میں بڑی صراحت سے آئی ہے۔ اور ایک عجیب واقعہ سیرۃ النبیؐ کا اس کے ساتھ متعلق ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضورؐ، آپ کو قرآن سناؤں، آپ پر تو وہ نازل ہوا۔ آپ نے فرمایا ہاں لیکن مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور ہی کیف اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امتثالِ امر میں سورۃ النساء کی آغاز سے تلاوت شروع کی اور جب آیت پر پہنچے جس کے الفاظ یہ ہیں: "فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا" "کیا حال ہو گا اُس دن جبکہ ہم ہر امت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے اور اے نبی آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان لوگوں کے خلاف!" تو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا حسبك! حسبك! بس کرو! بس کرو! اب جو میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

یہ ہے وہ نازک ذمہ داری کہ نبی کو میدانِ حشر میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے امت کے خلاف گواہی دینی ہو گی کہ اے رب میں بری ہوں، میں نے پہنچا دیا تھا اور اب یہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔ جیسے کہ سورۃ المائدہ کے اختتام پر نقشہ کھینچا گیا ہے کہ روزِ محشر حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال ہو گا: "أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ" "اے مسیح، کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور

میری ماں کو بھی معبود بنا لینا اللہ کے ساتھ۔" جواب میں وہ عرض کریں گے کہ پروردگار، اگر میں نے یہ کہا ہوتا تو تیرے علم میں آتا، مَیں نے تو وہی کچھ کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا میں نے تو انہیں تیری بندگی کی دعوت دی تھی۔ یہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ یہ ہے وہ شہادت اور گواہی جس کے لیے قرآنی اصطلاح ہے "شہادت علی الناس"۔ دنیا میں تبلیغ تلقین اور ابلاغ کے ذریعے سے انسانوں پر اللہ کی طرف سے اتمام حجت قائم کرنا، قولاً بھی اور عملاً بھی۔ اور اسی کی بنیاد پر میدان حشر میں وہ گواہی ہوگی جس کی تفصیل سورۃ النساء کی آیت ۴۱ کے حوالے سے ہمارے سامنے آچکی ہے۔

تبلیغِ دین کا کام اب اُمت کے ذمّے ہے!

ہمارے لیے اصل قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خطبۂ حجۃ الوداع میں حضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے گواہی لینے کے بعد آخری بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی "فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ" کہ اب پہنچائیں وہ جو یہاں ہیں ان کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اللہ کے پیغام کو نوعِ انسانی تک پہنچانے کا جو فریضہ انبیاء سرانجام دیتے تھے وہ اب اس امت کے ذمّے ہے۔ قرآن جو ابدی ہدایت نامہ ہے، اس کی حفاظت کا ذمّہ تو اللہ نے لے لیا۔ اب کسی نبی وحی کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ پیغام ربانی اپنے اتمامی اور تکمیلی درجے کو پہنچ چکا: "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"۔ چنانچہ تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کے ساتھ ہی بعثتِ انبیاء و رُسُل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور آخر المرسلین قرار پائے اور اب اللہ کے پیغام کو خلقِ خدا تک پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔ گویا اب کارِ نبوت، کارِ تبلیغ، کارِ دعوت، فرائضِ رسالت اور نوعِ انسانی پر اتمامِ حُجّت یہ تمام کام اب تاقیامِ قیامت امت کے ذمّے ہیں۔ یہ فرضِ منصبی، اے مسلمانو اب تمہارے کاندھوں پر اجتماعی حیثیت سے عائد کر دیا گیا۔ یہ ہے وہ عظیم فریضہ اور یہ ہے نبوت و رسالت کے اس "سلسلۃ الذہب" (سنہری زنجیر) میں ایک مستقل کڑی کی حیثیت سے شامل کئے جانے کا مقام اور مرتبہ جو اسے امتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اب تمہیں حاصل ہوا ہے: "هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ"

'اُمتِ وَسَط' کا مفہوم

قرآن حکیم کے اسلوب سے متعلق اس اہم حقیقت کا بیان اس سے پہلے بھی متعدد بار ہوا ہے کہ اہم مضامین قرآن میں دو مرتبہ ضرور ملیں گے۔ تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے مقام پر وہی مضمون بالعموم عکسی ترتیب کے ساتھ آتا ہے۔ اس کی ایک بڑی نمایاں مثال ہمیں یہاں نظر آتی ہے ــــ چنانچہ یہی مضمون سورۃ البقرہ میں بھی آتا ہے۔ نوٹ کیجیے کہ سورۃ الحج کی اِس آیت میں جو ہمارے زیرِ درس ہے، لفظِ اُمّت وارد نہیں ہوا ہے، گو اس کی تشریح میں مَیں نے بار بار لفظ امت استعمال کیا ہے، جبکہ سورۃ البقرہ میں یہ مضمون لفظِ اُمّت کے حوالے سے وارد ہوا ہے: " وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" اے مسلمانو، غور کرو، تمہیں امت کیوں بنایا گیا! لغت میں 'اَمَّ یَؤُمُّ' کے معنی قصد کرنے اور ارادہ کرنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے اُمّت کے معنی ہوئے ہم مقصد لوگوں کا گروہ! ایک ایسی اجتماعیت امت کہلائے گی جو کسی ایک مقصد یا کسی ایک نصب العین کے گرد جمع ہو۔ اس اُمّتِ مسلمہ کو جسے سورۂ آل عمران میں 'خیر امت' بھی کہا گیا (كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ)، یہاں سورۃ البقرہ میں امت وسط قرار دیا گیا ہے۔

امت وسط کے دو معنی کئے گئے ہیں۔ ایک تو اس اعتبار سے کہ جو شے درمیانی ہوتی ہے، جو وسط کی ہوتی ہے، وہ بہترین ہوتی ہے۔ اس معنی میں اس کا ترجمہ ہوگا بہترین امت۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ اس مفہوم کی مزید تائید کر رہی ہے: " كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ "۔ ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ 'وسط' درحقیقت دو چیزوں کے مابین کڑی (LINK) کو کہتے ہیں۔ گویا اب تم ایک کڑی (LINK) کی حیثیت رکھتے ہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور پوری نوعِ انسانی کے مابین۔ جس طرح جبرئیلؑ کڑی تھے اللہ اور محمدؐ کے درمیان! محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا کر اتمامِ حجت کر دیا اور اس پر تم سے شہادت اور گواہی بھی لے لی۔ اب تم واسطہ اور ذریعہ (LINK) ہو اس پیغام کے آگے پہنچنے کا۔ اب تمہارے ذریعے اس پیغام کو آگے پہنچنا اور پھیلنا ہے۔ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت تمہارے ذریعے ہونی ہے۔ تو یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے اے مسلمانو تمہیں 'امتِ وسط' بنایا گیا ہے ــــ سورۃ الحج میں پہلے رسول کا ذکر تھا: " لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ " اور اس کے بعد امت کا ذکر آیا: " وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ "

سورۃ البقرہ میں ترتیب الٹ گئی ہے۔ یہاں امت کے ذکر سے بات شروع کی گئی:
" وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا "۔ تمہیں بھی قیامت کے روز بطور گواہ پیش ہونا ہوگا اور اللہ کے دربار میں یہ گواہی دینی ہوگی کہ اے اللہ نوعِ انسانی کے نام تیرا جو پیغام قرآن حکیم کی شکل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہم تک پہنچا تھا ہم نے خلقِ خدا تک پہنچا دیا تھا، ہم نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا تھا۔ اگر ہم نے اپنے اس فرضِ منصبی میں کوتاہی کی اور روزِ محشر ہم یہ گواہی نہ دے پائے تو سوچئے کہ دوسروں کے جرم سے بڑھ کر جرم ہمارا ہوگا۔ ہماری پکڑ پہلے ہوگی اور سب سے پہلے ہم مسئول اور ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے کہ تم اس ہدایت کے خزانے کے اوپر سانپ بن کر بیٹھے رہے، تم نے اس کو دوسروں تک پہنچانے کا حق ادا نہیں کیا۔

امت کی غفلت شعاری

خلقِ خدا ہم پر الزام دھرے گی کہ اے اللہ یہ تھے تیرے دین کے علمبردار، یہ تھے تیرے کلام کے امین اور حامل، انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہم تک اسے نہیں پہنچایا خود بھی اس پر عمل نہیں کیا، یہ اپنے وجود سے خود دین کے لئے ایک حجاب اور رکاوٹ بن گئے۔ جارج برنارڈشا کا مشہور قول ہے کہ میں جب قرآن پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کتاب اور کوئی ممکن نہیں لیکن جب میں مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ ذلیل قوم کا تصور نہیں کیا جا سکتا ــــــ یہ ہے وہ عملی شہادت جو مسلمان اپنے وجود سے، اپنے حال سے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

جہاد کا مقصدِ اوّلین: فریضۂ شہادت علی الناس

ــــــ بہرحال شہادت علی الناس، یہ ابلاغ و تبلیغ دین، یہ دعوت الی اللہ کا فریضہ ادا کرنا[1]، یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی غایت اولیٰ اور مقصدِ اوّلین! یہ ہے وہ فرضِ منصبی جس کی ادائیگی کے لیے بڑی محنت اور کوشش کرنی ہوگی، اس کے لیے جان و مال اور اوقات کا ایثار کرنا ہوگا۔ خلقِ خ

---

[1] نبی اکرم کا فرمان ہے " بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً " پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیۃ

پر خدا کی طرف سے اتمامِ حجت کا حق تبھی ادا کیا جا سکے گا کہ وہ یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ تیرا پیغام ہم تک پہنچایا ہی نہیں گیا! یہ ہے وہ مقصدِ عظیم جس کے لیے اس شد و مد کے ساتھ اس آیت میں جہاد کی تاکید کی گئی : " وَجَاهِدُوْا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ "

بسم اللہ کرو، عمل کے میدان میں قدم رکھ دو! ——— اب ہم اس آیۂ مبارکہ کے آخری حصے پر پہنچ گئے ہیں جس میں بڑے ہی عملی انداز میں یہ بات سامنے لائی گئی ہے کہ اگر بات سمجھ میں آگئی، اپنے فرائضِ دینی کا شعور حاصل ہو گیا " اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ، وَجَاهِدُوْا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ " کے حوالے سے مطالباتِ دین کی چاروں سیڑھیاں اگر نگاہوں کے سامنے آگئیں، تمہیں اگر معلوم ہو گیا کہ ایمان کا تقاضا کیا ہے تو بِسْمِ اللہِ کرو، قدم بڑھاؤ اور عمل کا آغاز کر دو! نوٹ کیجئے یہاں گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے 'ف' کے حرف سے۔ جیسے دو مرتبہ یہ کلمۂ ' فَا ' بڑے بامعنی انداز میں آیا ہے سورۂ تغابن میں۔ اُسی طرح کا معاملہ یہاں ہے " فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ " بسم اللہ کرو، پہلی سیڑھی پر قدم رکھو، یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، سفر کا آغاز کر دو! فرائضِ دینی میں سے جو پہلا فرض ہے اُس کو تو پوری مضبوطی کے ساتھ پکڑو، اس پر تو کاربند ہو جاؤ! یہاں دیکھیے وہ بات جو میں نے آغاز میں عرض کی تھی کہ وہاں " اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا " میں محض نماز کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ تمام ارکانِ اسلام مراد ہیں۔ چنانچہ یہاں اُسی نماز کی کوکھ سے زکوٰۃ برآمد ہو گئی : فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ——— وَاعْتَصِمُوْا بِاللهِ اس پہلی سیڑھی پر قدم جما کر آئندہ کے مراحل کے لیے اللہ سے چمٹ جاؤ۔ عصمت کہتے ہیں حفاظت کو۔ اعتصام سے مراد ہے حفاظت کے لیے کسی سے چمٹ جانا۔ اصل میں یہاں تصویر لفظی ہے کہ کسی بچے کو اگر کہیں کسی طرف سے اندیشہ ہو خوف لاحق ہو وہ اپنی ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں قلعے میں آگیا ہوں اور ہر خطرے سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ یہ ہے اعتصام۔ وَاعْتَصِمُوْا بِاللهِ۔ آئندہ کے مراحل کے لیے اللہ سے چمٹ جاؤ، اللہ کی حفاظت میں آجاؤ، اللہ ہی کو اپنا مددگار سمجھو، اللہ کی تائید و توفیق پر بھروسہ رکھو! منزلیں بڑی کٹھن ہیں، ان فرائض کی ادائیگی آسان نہیں، اِن میں سے ایک سیڑھی بڑی ہی بھاری اور ایک ایک منزل بڑی کٹھن ہے لیکن یہ کہ اللہ کا نام لے کر آغازِ سفر تو کرو ——— " فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ "

نماز اور زکوٰۃ کے ذریعے بِسْمِ اللّٰہ کرو، اور آئندہ کے لیے اللہ پر توکل کرو، اسی پر بھروسہ رکھو! ۔ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۔ "کیا ہی اچھا ہے وہ مددگار کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ ،" جسے اُس کی حمایت میسر آجائے اب اس سے بڑھ کر کسی کو کس کی حمایت حاصل ہوگی! جس کو اس کی نصرت وتائید مل جائے اس سے بڑھ کر مطمئن اور بے فکر اور کون ہوگا!

'حبل اللہ' کی تعیین

یہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ 'وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ' کے الفاظ میں ایک اجمال ہے ۔ قرآن مجید کا ایک حصّہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے ۔ اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا ۔ تو 'وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ' کی مزید شرح ہمیں ملے گی سورۂ آل عمران میں : "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ" اب یہاں دیکھئے کہ "حَقَّ تُقٰتِهٖ" میں لفظی مناسبت موجود ہے "حَقَّ جِهَادِهٖ" اور "حَقَّ قَدْرِهٖ" کے اسلوب ہیں یہاں "حَقَّ تُقٰتِهٖ" کے الفاظ آئے ہیں ۔ اگلی آیت میں فرمایا : "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا" اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو ۔ گویا وہاں اللہ سے چمٹنے اور اس کے دامن سے وابستہ رہنے کے لیے اس کی رسّی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہے ۔ لیکن یہ سوال پھر باقی رہ گیا کہ اللہ کی وہ مضبوط رسّی کونسی ہے ؟ اس سوال کا قرآن مجید میں جواب نظر نہیں آتا ۔ قرآن مجید کے اس اجمال کی مزید تفصیل ہمیں ملتی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات میں ۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کے کسی اجمال کی تفصیل اور تبیین کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف حق نہیں آپؐ کا فرضِ منصبی ہے ۔ "وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ" "اور نازل کیا ہم نے یہ ذکر آپ کی طرف تاکہ اے نبی آپؐ کردیا کریں ، مزید وضاحت کردیا کریں اُس کی کہ جو لوگوں کے لیے نازل کیا گیا" چنانچہ مذکورہ سوال کا جواب ہمیں نبی اکرمؐ کے ایک فرمان میں ملتا ہے جس کو حضرت علیؓ نے روایت کیا ۔ وہ ایک طویل روایت ہے ، جس میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے ۔ اسی میں یہ الفاظ بھی آپؐ نے ارشاد فرمائے : "هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ" ! یہ قرآن ہے اللہ کی مضبوط رسی

(باقی صـ ۱۲)

مکتوب گرامی جناب نعیم صدیقی

اور اس کا جواب

از ڈاکٹر اسرار احمد

محترمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! السلام علیکم و رحمتہ اللہ۔

تازہ میثاق (جون ۱۹۹۰ء) کے ص ۳۳ پر میرا ذکر مجھے شرمسار کرنے کا باعث ہوا' نجانے اور کتنے اصحاب پر کیا کیا اثرات پڑے ہوں گے۔

میں چونکہ میدانِ خلافیات سے زیادہ تر کنارے رہتا ہوں' نہ ڈائری رکھتا ہوں' نہ کسی کے متعلق یادداشتیں جمع رکھنے کی عادت ہے' اس لئے چند سال کی ایک بات اگر صحیح شکل میں سامنے نہ آئے تو اس کی وضاحت کرنے میں خاصی مشکل ہوتی ہے۔ مگر اتفاق سے وہ گفتگو ذہن میں ابھر آئی ہے اور اس کے بعض خاص جملے بھی' اس لئے آسانی ہو گئی ہے کہ تاریخ کے ریکارڈ کو درست رکھا جائے۔

یہ درست کہ آپ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی سالانہ کانفرنسوں کے سلسلے میں کسی وقت مجھ سے اچھرہ میں گھر پر ملے تھے' مگر جو گفتگو ہوئی اس کی رپورٹنگ میں ایسی شکل سامنے آتی ہے کہ آپ تو بڑے جذبۂ اتحاد و تعاون سے آئے تھے مگر آپ کو جواب دیا گیا کہ آپ سے ہمارا شدید اختلاف ہے' اس لئے "میری شرکت ناممکن ہے" (بالفاظ ڈاکٹر صاحب) حالانکہ بات اختلاف کی نہ تھی بلکہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ صورت تو عجیب سی ہو گی کہ آپ کی طرف سے ایک جانب تو محاذِ مخالفت گرم ہو اور دوسری جانب مجالس اور کانفرنسوں میں ہم ایک دوسرے سے تعاون بھی چاہیں۔ اسی کے ساتھ میں نے کہا کہ میں کوئی تنہا فرد نہیں ہوں کہ جدھر چاہوں چل پڑوں' میں ایک جماعتی نظم کا پابند ہوں' میرے لئے یہ فیصلہ کرنا بطورِ خود مشکل ہے کہ میں کہاں جاؤں اور کہاں نہ جاؤں۔ تب آپ نے فرمایا کہ اچھا

میں امیرِ جماعت سے اجازت لے دیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی پیچیدگی پیدا نہ کیجئے۔ فرض کیجئے، میں کسی نہ کسی طرح آپ کے پلیٹ فارم پر پہنچ جاتا ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے پاکستان میں اکابر سے لے کر متفقین تک یہ سوال یا شبہ اٹھ کھڑا ہوگا کہ میں وہاں کیوں گیا جہاں سے ناوک اندازی بخلافِ جماعت ہو رہی ہے۔ میں کس کس کو خطوں میں اور زبانی طور پر جواب دیتا پھروں گا۔ تب آپ نے فرمایا کہ پھر کوئی تدبیر بتایئے کہ اِس صورتِ حالات کو درست کیا جا سکے۔ میں نے عرض کیا کہ سارے قضیئے کے حل کے لئے ایک فقرہ کافی ہے جو آپ کی طرف سے شائع ہو جائے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ آپ ذرا وہ فقرہ مجھے لکھ دیں یا لکھا دیں (یا بتا دیں)۔ مگر در اصل میں نے اپنا منشا تو آپ تک سرّی یا اشاراتی طریق سے پہنچا دیا تھا۔ جب آپ سمجھ نہیں رہے تھے اور سمجھ گئے تھے تو اسے اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے تو میرا دماغ اتنا کھوکھلا نہیں کہ میں کوئی جملہ لکھ کر آپ سے واضح طور پر "نہ" سنوں۔ جس طرح آپ مجھ سے "نہ" نہیں سننا چاہتے تھے، اسی طرح میں بھی ایسی ٹھوکر سے بچنا چاہتا تھا، چنانچہ میں نے آپ کو یہ جواب دیا کہ :

"ڈاکٹر صاحب! آپ بہت ذہین ہیں، سوچنے، لکھنے اور بولنے پر قادر ہیں، آپ اس کے محتاج نہیں ہیں کہ کوئی دوسرا آدمی آپ کو جملہ مرتّب کر کے دے"۔

سیدھی سی بات ہے کہ آدمی جھگڑا ختم کرنا چاہتا ہو یا کسی نزاع و تصادم کی دلدل سے نکلنا چاہتا ہو تو اس کا ذہن اسے ضروری الفاظ اور جملے فراہم کر دیتا ہے۔ مگر ارادہ و نیت کچھ اور ہو اور باہر سے لوگ جملے ٹھونسنا چاہیں تو بے کار ہے۔

آپ کے یہ الفاظ کہ "قرآنی پلیٹ فارم پر میرے ساتھ کیوں تشریف نہیں رکھ سکتے" بڑے خوب ہیں۔ آپ قرآن کی بلندی سے فائدہ اٹھا کر خود بھی بلند ہو جاتے ہیں اور قارئین میں بھی بڑی جذباتی لہر اپنے حق میں پیدا کر لیتے ہیں۔ اندازِ بیان کی یہ مہارتیں --- اہلِ سیاست میں اور طرح ہوتی ہیں اور اہلِ مذہب میں اور طرح کام کرتی ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمارے پاس نظامِ اسلامی اور اقامتِ دین کا پلیٹ فارم ہے اور ہم طاغوتی اور لادینی قوتوں سے نبرد آزما ہیں۔ اکوڑہ خٹک کے بزرگ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں شریعت بل ہے، مولانا منظور احمد چنیوٹی فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں ختمِ نبوت کا جھنڈا

ہے۔ قادری صاحب کے پاس محبتِ رسالت کا پلیٹ فارم ہے' ایک پلیٹ فارم شہادتِ حسینؓ کا بھی ہے۔ سب اپنے ہیں مگر اصل سوال رویّوں کا ہوتا ہے کہ کس کا رویّہ کس سے کیا ہے۔ آپ نے قرآن کانفرنس تو کئی بار کرڈالی مگر آپ سے یہ رویّہ نہ چھُٹا اور آپ نے ہمارے خلاف جو کھیل شروع کیا وہ ختم نہ ہو سکا۔ آپ ایک ایک ریکارڈ یا ٹیپ کو بار بار اپنے قارئین کو سنواتے ہیں۔ قرآن آپ کو یہ نہیں سکھا سکا کہ آپ غلبۂ دین یا فروغِ دین یا اقامت دین کے لئے اگر دوسرے سرگرم کار دوستوں سے تعاون نہیں کرسکتے تو بلاوجہ تصادم نہ کریں۔ کوئی وضاحت ایک بار' دوبار کرنی ضروری تھی تو وہ ہوگئی۔ للہ آپ فاشزم' سیکولرازم' نظریۂ ارتقا' بے خدا جمہوریت' سودی نظام' کمیونزم' مغرب میں خاندانی زندگی کا انتشار (اور ان ساری بلاؤں کا عکس اپنے ہاں موجود ہے) وغیرہ موضوعات پر کام کرتے اور نوجوانوں سے کراتے۔ اسلامی قوانین و اخلاق کے ضابطے مرتّب کراتے۔ اور نہیں تو قدیم اور جدید تر مستشرقین کی شرانگیزیوں پر توجہ صرف کرتے' صلیبی مشنریوں کی سیاسی یلغار کا جائزہ لیتے۔

معلوم نہیں آپ نے یہ کس قرآن میں پڑھ لیا ہے کہ سارا انقلابِ اسلامی مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے خلاف دماغ اور زبان اور قلم کی قوتیں کھپا دینے سے رونما ہو جائے گا۔ بار بار تمہید میں تعریف' متن میں مخالفت اور بین السطور پر نہ جانے کیا کیا پیش کر کے آپ جو نامۂ اعمال بنا رہے ہیں وہ آخرت میں کیا نتیجہ دے گا بلکہ عین اس دنیا میں کیا؟

یہ تو بس کربلا کی سی داستان ہے کہ دوہراتے رہیئے' ماتم کرتے رہیئے اور شامِ غم مناتے رہیئے۔ آپ کا جی اس میں خوش ہے تو خوش رہے۔ آپ کا ایمان اس سے تازہ ہوتا ہے تو بار بار خوب اچھی طرح تازہ کیجئے اور آپ کے اخلاق میں علوّ آتا ہے اور آپ کی جماعت جادۂ انقلاب کو اس مشغلے کی وجہ سے جلد تر طے کرسکتی ہے تو مبارک!

آپ، اپنے معاملات' اپنے افکار اور اپنے رویّوں کا خود بہت اچھا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ ہماری کیا مجال کہ بے وجہ دخل دیں۔

نیاز کیش

نعیم صدیقی

۱۴/۶/۹۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

۱۸؍ جولائی ۱۹۹۰ء

محترمی و مکرمی جناب نعیم صدیقی صاحب
وعلیکم السّلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

گرامی نامہ محرّرہ ۱۴ جون ہمارے دفتر میں ۲۰؍ جون کو موصول ہو گیا تھا لیکن میرے مطالعے میں اپنے غیر ملکی سفر سے واپسی پر عید الاضحیٰ کے بعد آیا۔ آپ میرے بزرگوں میں سے ہیں، اور آپ کا غیظ و غضب، اور تلخی و ترشی سب میرے لئے ع "کہ ہرچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!" کے حکم میں ہے! بلکہ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو بقول خود "شرمسار" اور میرے نزدیک کبیدہ خاطر ہونا پڑا۔ بہرحال آپ نے اتنے طویل خط کے لکھنے میں جو زحمت گوارا کی اس پر ممنون ہوں!

خط پڑھ کر سب سے پہلا اثر تو مجھ پر یہ ہوا کہ اپنے وہ الفاظ یاد آگئے جو میں نے پورے تینتیس (۳۳) سال قبل رکنیتِ جماعت سے استعفے کی تحریر کے آخر میں درج کئے تھے۔ استعفے کی طویل تحریر کے حسبِ ذیل اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ آپ کے خط پر میرے تأثر کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں:

"۔۔۔۔۔۔ اس دس سال کے عرصہ میں میری پوری دنیا جماعت ہی کے چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہی ہے۔ تعلّقات اور دوستیاں، محبتیں اور الفتیں، حتیٰ کہ رشتے داریاں تک اسی حلقہ میں محدود رہیں۔ بیٹھنا اٹھنا بھی اسی میں رہا اور ہنسنا بولنا بھی اسی میں رہا۔ اب دفعتًہ اس حلقہ سے نکلتے ہوئے دل و دماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں۔ کتنے ہی بزرگوں سے مجھے والہانہ عقیدت ہے اور کتنے ہی ساتھیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سوچتا ہوں آج کے بعد شاید میرے بزرگ میری عقیدت کی قدر نہ کریں اور میرے دوست میری محبت پر اعتماد نہ کریں تو دل اندر سے بیٹھا سا جاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق

مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لئے آمادہ ہوگیا ہوں کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا!"

ماخوذ از" سرافگندیم" صفحہ ۴۴

اس کے ساتھ ہی ــــــــ آٹھ دس سال قبل کے بعض واقعات کی فلم بھی شعور کی سکرین پر چلنے لگی۔ مثلاً ۴۸ء کی ایک شام کا واقعہ کہ جب گوال منڈی میں دفتر کوثر سے ملحق چھت پر جماعت اسلامی لاہور کے ایک اجتماع کے دوران نماز مغرب کا وقت آگیا اور مولانا مودودی مرحوم اور بعض دوسرے اکابرِ جماعت سمیت سب لوگ قریب کی ایک تنگ سی گلی میں واقع مسجد میں نماز کے لئے گئے تو راستے میں میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب نے آپ سے میرا تعارف کرایا اور یہ الفاظ کہے کہ "اسے آپ سے بڑی محبت ہے" تو آپ بڑی شفقت اور محبّت کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ یا مثلاً یہ کہ دسمبر ۵۱ء کے آخری دس ایّام اور ۵۲ء کے موسم گرما کی تعطیلات کے پندرہ ایّام کے دوران اسلامی جمعیت طلبہ کی تربیت گاہوں میں (جن میں میں بحیثیتِ ناظم شریک تھا) آپ نے لٹریچر کا مطالعہ کرایا تو آپ سے بہت دلچسپ گفتگوئیں رہتی تھیں اور میں آپ کی شفقت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو خاصا زچ کیا کرتا تھا ــــــــ یا مثلاً آپ کی بے شمار تقریریں جو میں نے دس سال کے عرصے میں سنیں اور جن کی بنا پر میری یہ رائے بنی کہ آپ نے اپنی تقریر میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کے طرزِ خطاب کی خوبیوں کو جمع کرلیا ہے ــــــــ یا مثلاً آپ کی بہت سی تحریریں جو میں نے پڑھیں بالخصوص وہ ' اشارات ' جو آپ نے مولانا مرحوم کی نظربندی کے دوران تحریر فرمائے اور اُن میں سے بھی خاص طور پر وہ جن میں نظمِ جماعت کے تقاضوں اور بالخصوص تنقید کے آداب و شرائط کی وضاحت فرمائی تھی ' وقس علیٰ ہذا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کے وہ بہت سے اشعار بھی کانوں میں رس گھولنے لگے جو میری لوحِ قلب پر نقش ہیں اور جن میں سے بعض میرے دروس و خطابات میں بارہا بے اختیار زبان پر آتے رہے ہیں : مثلاً۔

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم !"

یا آپ کی شاہکار نظم "اٹھارہ سال" اور خاص طور پر اس کا یہ "دلدوز" شعر کہ ۔

"وہ بدنصیب جو گر جائے اپنی آنکھوں سے
تم اپنی آنکھ پہ کیسے اسے بٹھاؤ گی !"

۔۔۔۔۔ اسی طرح آپ کی شہدائے بالاکوٹ کے بارے میں نظم اور خصوصاً اس کا یہ بند

"ہیں بالاکوٹ کی مٹی کے ذرّے ۔ ہماری آرزوؤں کے مزارات
ہیں ہر ذرّے کی پیشانی پہ منقوش ۔ ہمارے عزم کے خونیں نشانات !

وغیرہ وغیرہ!

آپ کی اُس تصویر کے پس منظر میں جس کا تانابانا متذکرہ بالا تأثرات سے قائم ہوا تھا جب میں نے آپ کے خط کے مندرجات پر غور کیا تو حیرت ہوئی کہ آپ نے اپنی اس تحریر میں میرے بیان کردہ واقعے کی پوری توثیق فرمائی' اور اس کے ضمن میں میری کسی بات کی نفی نہیں کی' تو پھر ریکارڈ کی وہ 'کجی' کونسی تھی جس کو آپ نے "درست" کرنے کی کوشش کی؟ میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ 'درست' ریکارڈ کو درست 'ہی رکھا اور اس میں کوئی کجی پیدا نہ کی' بلکہ میرے اجمالی خاکے میں تفصیل کا مزید رنگ بھر کر میری بات کو مزید واضح اور میری' حجت' کو مزید محکم کر دیا! فجزاکم اللہ احسن الجزاء! میری حیرت اس بنا پر دو چند ہو جاتی ہے کہ اگرچہ میرے علم میں ہے کہ آپ کی صحت بالعموم اچھی نہیں رہتی' تاہم آپ ابھی بحمد اللہ اُس "ارذل العمر" کو نہیں پہنچے جس میں قوائے ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں' چنانچہ آپ کا حافظہ بھی ماشاء اللہ ابھی اس قدر قوی ہے کہ سترہ سال قبل کا مکالمہ آپ کو تفصیلاً یاد ہے۔۔۔۔۔ اندریں حالات آپ کی جانب سے اتنی غیر منطقی تحریر' یعنی چہ؟

۲۲ر جولائی

معروفیات کے ہجوم' اور فرصت کی کمی کے باعث آج چار روز بعد دوبارہ قلم ہاتھ میں لے سکا ہوں۔ اور اس دعا کے ساتھ بات دوبارہ شروع کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو میری

معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
خدارا ذرا غور فرمایئے کہ :

۱۔ آپ تسلیم فرماتے ہیں کہ قرآن کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ لے کر میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ (یہ ۷۳ء کی بات ہے جب ہم پہلی بار یہ کانفرنس منعقد کر رہے تھے)

۲۔ آپ نے اس کی بھی نفی نہیں فرمائی کہ اس کے بعد بھی یہ دعوت نامہ مسلسل آپ کی خدمت میں ارسال کیا جاتا رہا' تا آنکہ آپ نے اس پر تحریری طور پر اظہارِ ناراضگی فرمایا۔
۳۔ آپ نے اس کی بھی نفی نہیں فرمائی کہ آپ کے ابتدائی انکار اور اس کے ضمن میں یہ دلیل پیش کرنے پر کہ تم مسلسل جماعت پر تنقید کر رہے ہو' میں نے عرض کیا تھا کہ کیا ولی خان' اصغر خان' مولانا نورانی وغیرہم جماعت پر شدید اور دل آزار تنقیدیں نہیں کرتے؟ تو اگر آپ سیاسی پلیٹ فارم پر اُن کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں تو قرآنی پلیٹ فارم پر میرے ساتھ کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟ ------ جس پر آپ نے زچ ہو کر فرمایا: "کہ میں جانتا تھا کہ آپ یہی دلیل پیش کریں گے!" تاہم جوابی دلیل کوئی پیش نہ کی!

اس سلسلے میں پندرہ سال بعد کی صورت حال بھی یہ ہے کہ خان عبد الولی خان صاحب نے جہاد افغانستان کو فساد فی الارض اور جماعت اسلامی کو امریکہ کا ایجنٹ قرار دیا --- اس کے بعد بھی جماعت آئی جے آئی کے ناتے سی او پی (COP) میں اُن کی حلیف ہے ------
آج سے پینتیس چھتیس سال قبل کی یہ بات بھی آپ کو یقیناً یاد ہوگی کہ مولانا امین احسن اصلاحی برملا فرمایا کرتے تھے (جبکہ ابھی وہ خود جماعت میں شامل تھے) کہ "اہلِ مذہب ہمیں (یعنی جماعت کو) بہروپیے سمجھتے ہیں' اور اہلِ سیاست کے نزدیک ہم چغد ہیں!!" اس کے بلاوجود مسلسل تعاون اہل مذہب سے بھی رہا اور اہل سیاست سے بھی! تو پھر اس پوری زمین پر اور اس آسمان کے نیچے کیا کُل کا کُل بیر اور بغض میرے ہی لئے رہ گیا ہے؟
۴۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے کہ آپ نے یاد دلا دیا کہ میں نے تو آپ کی شرکت کے لئے اجازت حاصل کرنے کے لئے امیر جماعت کے پاس حاضر ہونے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ گویا میں نے تو اپنی حد تک ع "میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا!" پر عمل کر کے آپ پر حجت

قائم کردی لیکن آپ نے خود ہی اپنے خلاف مزید حجت قبول کرلی۔ ورنہ اگر آپ مجھے نہ روکتے اور انکار امیرِ جماعت کی طرف سے ہوتا تو کم از کم آپ پر الزام نہ آتا۔ جیسا کہ بعد میں سید اسعد گیلانی صاحب کے معاملے میں ہوا کہ انہوں نے ہماری ایک تربیت گاہ میں شرکت پر آمادگی ظاہر فرمادی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ میاں طفیل محمد صاحب نے منع فرمادیا ———!

۵۔ اللہ آپ کو مزید جزا عطا فرمائے کہ آپ نے میرے حق میں، اور اپنے خلاف حجت بالائے حجت پیش فرمادی کہ میں نے تو آپ سے ع "سپر انداختیم اگر جنگ است!" پر عمل پیرا ہونے کے لئے آپ سے یہ بھی دریافت کیا کہ بتائیے میری جانب سے کس تحریر پر آپ مطمئن ہو سکتے ہیں؟ لیکن آپ نے اس سے بھی انکار کیا ——— مجھے اس سے ہرگز انکار نہیں ہے کہ عین ممکن ہے کہ میں آپ کی تجویز کردہ تحریر قبول نہ کر سکتا اس لئے کہ میں صرف مخالفت برائے مخالفت یا خواہ مخواہ کی محاذ آرائی کے تاثر کو ختم کرنے والی عبارت کو تو قبول کر سکتا تھا، اپنے حقِ اختلاف سے دست برداری اختیار نہیں کر سکتا تھا! تاہم اول تو ضروری نہیں تھا کہ یہی صورت پیش آتی، اس لئے کہ آپ بھی میرے حق اختلاف کی تو نفی نہیں کر سکتے تھے، ——— بصورت دیگر بھی حجت مجھ پر قائم ہوتی نہ کہ 'حجت بالائے حجت' کے طور پر آپ پر!!

حاصل کلام یہ کہ میں اس پر تو اللہ کا شکر اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سیدھے ریکارڈ کو نہ صرف یہ کہ کج نہیں کیا بلکہ مزید سیدھا کردیا ——— لیکن "محوِ حیرت ہوں" کہ آپ نے یہ خط کس مقصد سے لکھا؟ ——— اور اس سے کیا حاصل کیا؟؟

رہی آپ کے موقف کی اصل اساس، اور آپ کے خط کا وہ 'محور' جس کے گرد پوری تحریر گھوم رہی ہے ——— یعنی آپ کے نزدیک میرا جماعت کے خلاف مخالفت کا "کھیل" اور "تصادم" کا رویّہ تو اس کے ضمن میں بھی اختصار کے ساتھ چند باتیں پیشِ خدمت ہیں، ذرا تحمل سے غور فرمائیں:

اوّلاً ——— ذرا اپنے طرزِ خطاب پر نظرِ ثانی فرمائیں ——— گویا۔

"آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی!"

ثانیاً ــــــــ مجھے تسلیم ہے کہ ع " مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد!" کے مصداق اختلاف اور مخالفت کے مابین فصل و بُعد بہت کم ہے لیکن میں چیلنج کرتا ہوں کہ سوائے اس کے کہ ایک خاص دَور میں اظہار اختلاف کے پیرایۂ بیان' اور اس کے ضمن میں الفاظ کے انتخاب میں میری جانب سے شدّت ہوئی ہے (جس کا بارہا علیٰ رؤس الاشہاد اعتراف اور اعلان کر چکا ہوں) مجھے بتایا جائے کہ: ــــــــ (i) کیا میں نے کبھی مولانا مودودی مرحوم یا اُن کے اہل خانہ' یا جماعت کے کسی بھی دوسرے رہنما یا کارکن کے ذاتی کردار یا خانگی زندگی پر کوئی حملہ کیا؟ ــــــــ (ii) کیا میں نے جماعت اسلامی کے خلاف کسی برسر اقتدار شخصیت یا جماعت اور اس کی سیاسی میدان میں کسی حریف جماعت کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا؟ میاں محمد یاسین وٹو موجود ہیں' ان سے پوچھ لیا جائے کہ کیا سابق صدر ایوب مرحوم اور نواب کالاباغ مرحوم کی ایک مجلس میں جماعت اسلامی کی مخالفت کے لئے آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کے ضمن میں جب بعض دوسری شخصیات کے ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی اور میرا نام لیا گیا تو اس مجلس میں یہ بات نہیں کہی گئی کہ ان دونوں کو دوسروں پر قیاس نہ کیا جائے! شاید لاہور ٹیلی وژن کے عملے میں کوئی صاحب گواہی دے سکیں کہ بھٹو صاحب کے زمانے میں جب جماعت کی کردار کشی کے لئے بعض علماءکرام کی خدمات حاصل کی گئیں اور اس ضمن میں جماعت کے " سابقون الاوّلون" میں سے بھی ایک صاحب سکرین پر آئے' اس وقت جب مجھ سے رابطہ قائم کیا گیا اور میری جانب سے انکار پر اصرار میں یہاں تک کہا گیا کہ آپ اپنے دین و ایمان کی رُو سے جو بات صحیح سمجھتے ہیں وہی کہیں' ہم کوئی قطع و برید نہیں کریں گے بلکہ ' Live Telecast ' کردیں گے تو میں نے جواباً کہا کہ میں حبِّ علیؓ کا قائل ہوں بغضِ معاویہؓ کا نہیں!! میں اپنا اختلاف اپنے طور پر بیان کر رہا ہوں۔ اس کو کسی دوسرے کی تقویت کا ذریعہ نہیں بنا سکتا! ــــــــ خدارا سوچئے کہ کیا مخالفت کا "کھیل" کھیلنے والوں کا طرز عمل یہی ہوتا ہے!!

ثالثاً ــــــــ جس طرح نادانستہ طور پر آپ ریکارڈ کو سیدھا کرنے کی کوشش میں اُلٹا آپ پر الزام در الزام لیتے چلے گئے' اسی طرح' معاف فرمائیے' ــــــــ آپ نے مجھے مشورے دیتے ہوئے بعض بہت ہلکی اور جماعت کے اصل موقف کے صریحاً خلاف باتیں

ارشاد فرمادی ہیں جن پر اگر آپ خود بھی دوبارہ غور کریں تو یقیناً ندامت محسوس کریں گے خدارا غور فرمائیے کہ :۔۔۔(i) کیا' اقامتِ دین کی جدّوجہد 'آپ کا Exclusive پلیٹ فارم ہے ؟ جس پر کسی اور کی موجودگی آپ کو گوارا نہیں۔ اور کیا آپ بھی اس پلیٹ فارم کو اسی انداز میں صرف اپنے گروہی مفادات کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں جیسے کہ بعض دوسرے لوگ اپنے اپنے مخصوص پلیٹ فارموں کو کر رہے ہیں ؟ میرے نزدیک تو نہ صرف یہ کہ یہ جماعت کے موقف کے بالکل خلاف ہے بلکہ اُس خلوص اور اخلاص کے بھی منافی ہے جو ع "محبت چوں جواں گردد' رقابت از میاں خیزد!" کا تقاضا کرتا ہے'(ii) مزید برآں یہ طرزِ عمل اس حدیث نبوی کے بھی صریحاً خلاف ہے جس میں نہایت تاکیدی انداز میں فرمایا گیا کہ :" لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ "۔ (iii) ذرا اپنے دل میں جھانک کر دیکھئے کہ کیا آپ واقعتاً دین کی صرف علمی خدمت' یا خدمتِ خلق کے کاموں کو اقامتِ دین کی اجتماعی جدّوجہد کے برابر سمجھتے ہیں ؟ (" اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ... ")

اسی طرح کیا آپ ۔۔۔۔۔۔ اور تحریک اسلامی کے جملہ کارکنان ۔۔۔۔۔۔۔ جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے جملہ اکابر (مثلاً مولانا اصلاحی' مولانا عبد الغفار حسن' مولانا عبد الرحیم اشرف' وغیرہم) پر یہ الزام عائد نہیں کرتے کہ انہوں نے جماعت سے علیحدہ ہو کر محض جزوی' علمی یا تعلیمی و تدریسی مساعی پر کیوں اکتفا کر لیا ؟ ۔۔۔ اور کیوں نہ اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لئے اپنے پسندیدہ طریق کار کے مطابق اجتماعی جدوجہد کی "کٹھن" راہ اختیار کی ؟ ۔۔۔۔۔۔ پھر یہ کیسا طرزِ عمل ہے کہ ایک کام انہوں نے نہیں کیا تو وہ بھی مجرم' اور میں کرنے کی کوشش کروں تو میں بھی مجرم ؟ اور یہ کیسا استدلال ہے کہ چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی !

محسوس ایسا ہوتا ہے کہ آپ حضرات انتخابی سیاست کی بھول بھلیوں میں ع "کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے !" کے مصداق اتنے گم ہو چکے ہیں کہ اپنی اصل اور اساسی دعوت کو بالکل بھول گئے۔ اگر برا نہ مانیں تو ذرا مولانا مودودی مرحوم کے مشہور اور مقبول پمفلٹ "شہادتِ حق" کا دوبارہ مطالعہ فرمالیں۔ خصوصاً اس کے (اسلامک پبلی کیشنز کے شائع کردہ چوالیسویں ایڈیشن کے) صفحات ۲۵ تا ۲۹ کا۔ شاید کہ آپ "وز درون من نہ جُست اسرارِ من

کے جس طرزِ عمل کے میرے بارے میں مرتکب ہو رہے ہیں اس پر آپ کو تنبّہ حاصل ہو جائے۔ وماذالک علی اللہ بعزیز !!

فقط والسلام مع الاکرام

دعا کا طالب

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

پس نوشت:

۱۔ الحمد للہ کہ میں نے کبھی بھی "دعوت رجوع الی القرآن" کو اپنا مخصوص (Exclusive) پلیٹ فارم نہیں سمجھا۔ اور اس پر اپنے 'مخالفین' تک کو شریک کرکے، خود اپنے آپ پر محض تنقید ہی نہیں 'طنز و استہزا' کا بھی موقع دیا۔

۲۔ میں نے مولانا مودودی مرحوم کی شہادت حق والی دعوت کو شعوری طور پر قبول کر کے اپنی زندگی کا رخ تبدیل کیا تھا اور اس کے لئے میڈیکل پریکٹس کو تو اگرچہ میں نے ۱۹۷۱ء میں ترک کیا، لیکن اصل 'پروفیشن' کو میں نے ۱۹۵۱ء ہی میں خیرباد کہہ دیا تھا۔ ورنہ مجھے اگر صرف خدمت خلق کے ذریعے دین کا کام کرنا ہوتا۔۔۔ یا جماعت کی صرف پیسے سے مدد کرنی ہوتی تو میرا پروفیشن اس کا بہترین ذریعہ بن سکتا تھا۔ اسی طرح اگر میں کوئی علمی کام کرتا تو سائیکالوجی کے میدان میں کرتا جس سے مجھے طبعی مناسبت تھی لیکن میں نے دعوتِ دین 'شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لئے اجتماعی جدوجہد کی دعوت کو شعوری طور پر قبول کیا تھا ۔۔۔۔۔ اور آج کے دن تک 'بحمد اللہ' اس پر کاربند و گامزن ہوں۔

۳۔ آپ نے اثنائے ملاقات میں میرے سامنے میرے بعض ہم عصر اور ہم عمر ساتھیوں کا بھی تذکرہ کیا تھا۔۔۔۔۔ تو اس ضمن میں نوٹ کر لیجئے کہ آرٹس اور Humanities کے طلبہ کے لئے تو تحریکی اور سیاسی سرگرمی ان کے پیشے کے لئے مفید اور مؤیّد ہوتی ہے لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کے طلبہ کے لئے ایسی سرگرمی اپنے پروفیشن کو چھوڑے بغیر ممکن نہیں ہوتی!

متعلقہ اقتباس از
شہادتِ حق
تالیف: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

ہمارا طریقۂ کار

"—— سب سے پہلے ہم مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلاتے ہیں اور انہیں صاف صاف بتاتے ہیں کہ اسلام کیا ہے، اُس کے تقاضے کیا ہیں، مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور مسلمان ہونے کے ساتھ کیا ذمّہ داریاں آدمی پر عائد ہوتی ہیں۔

اس چیز کو جو لوگ سمجھ لیتے ہیں ان کو پھر ہم یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کے سب تقاضے انفرادی طور پر پورے نہیں کئے جاسکتے۔ اس کے لئے اجتماعی سعی ضروری ہے۔ دین کا ایک بہت ہی قلیل حصہ انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو تم نے قائم کر بھی لیا تو نہ پورا دین ہی قائم ہوگا اور نہ اس کی شہادت ہی ادا ہوسکے گی بلکہ جب اجتماعی زندگی پر نظامِ کفر مسلّط ہو تو خود انفرادی زندگی کے بھی بیشتر حصّوں میں دین قائم نہ کیا جاسکے گا اور اجتماعی نظام کی گرفت روز بروز اس انفرادی اسلام کی حدود کو گھٹاتی چلی جائے گی۔ اس لئے پورے دین کو قائم کرنے اور اس کی صحیح شہادت ادا کرنے کے لئے قطعاً ناگزیر ہے کہ تمام ایسے لوگ جو مسلمان ہونے کی ذمہ داریوں کا شعور اور انہیں ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، متحد ہو جائیں اور منظم طریقے سے دین کو عملاً قائم کرنے اور دنیا کو اس کی طرف دعوت دینے کی کوشش کریں اور ان مزاحمتوں کو راستہ سے ہٹائیں جو اقامت و دعوتِ دین کی راہ میں حائل ہوں۔

نظمِ جماعت

یہی وجہ ہے کہ دین میں جماعت کو لازم قرار دیا گیا ہے اور اقامتِ دین اور دعوتِ دین

جدوجہد کے لئے ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک نظم جماعت ہو پھر خدا کی راہ میں
وجہد کی جائے اور یہی وجہ ہے کہ جماعت کے بغیر زندگی کو جاہلیت کی زندگی اور جماعت
علیحدہ ہو کر رہنے کو اسلام سے علیحدگی کا ہم معنی قرار دیا گیا ہے[۱]-

---

. اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اَنَا اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ اَلْجَمَاعَۃُ، وَالسَّمْعُ وَالطَّاعَۃُ، وَالْھِجْرَۃُ، وَالْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، فَاِنَّہٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَۃِ قِیْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَۃَ الْاِسْلَامِ مِنْ عُنُقِہٖ اِلَّا اَنْ یُّرَاجِعَ۔ وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَی جَاھِلِیَّۃٍ فَھُوَ مِنْ جُثٰی جَھَنَّمَ۔ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی؟ قَالَ وَاِنْ صَلّٰی وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّہٗ مُسْلِمٌ۔ (احمد و حاکم)

"میں تم کو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور خدا کی راہ میں جہاد۔ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکا، اِلّا یہ کہ وہ پھر جماعت کی طرف پلٹ آئے۔ اور جس نے جاہلیت (یعنی افتراق و انتشار) کی دعوت دی وہ جہنمی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے؟ فرمایا ہاں اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے"۔

اس حدیث سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) کارِ دین کی صحیح ترتیب یہ ہے کہ پہلے جماعت ہو اور اس کی ایسی تنظیم ہو کہ سب لوگ کسی ایک کی بات سنیں اور اس کی اطاعت کریں، پھر جیسا بھی موقع ہو اس کے لحاظ سے ہجرت اور جہاد کیا جائے۔

(۲) جماعت سے علیحدہ ہو کر رہنا گویا اسلام سے علیحدہ ہونا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس زندگی کی طرف واپس جا رہا ہے جو اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی تھی کہ ان میں کوئی کسی کی سننے والا نہ تھا۔

(۳) اسلام کے بیشتر تقاضے اور اس کے اصل مقاصد جماعت اور اجتماعی سعی ہی سے پورے ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے حضورؐ نے جماعت سے الگ ہونے والے کو اس کی نماز اور روزے اور مسلمانی کے دعوے کے باوجود اسلام سے نکلنے والا قرار دیا۔ اسی مضمون کی شرح ہے جو حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی ہے کہ لا اسلام الا بجماعۃ (جامع بیان العلم لابن عبد البرؒ)۔

کام کے تین راستے

جو لوگ اس بات کو بھی سمجھ لیتے ہیں اور اس فہم سے ان کے اندر مسلمان ہونے کی ذمہ داری کا احساس اس حد تک قوی ہو جاتا ہے کہ اپنے دین کی خاطر اپنی انفرادیت اور خود پرستی کو قربان کر کے جماعتی نظم کی پابندی قبول کر لیں، ان سے ہم کہتے ہیں کہ اب تمہارے سامنے تین راستے ہیں اور تمہیں پوری آزادی ہے کہ ان میں سے جس کو چاہو اختیار کرو۔ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ ہماری دعوت، عقیدہ، نصب العین، نظام جماعت اور طریق کار سب کچھ خالص اسلامی ہے اور ہم وہی کام کرنے اٹھے ہیں جو قرآن و حدیث کی رو سے امّتِ مسلمہ کا اصل کام ہے تو ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ اگر کسی وجہ سے تمہیں ہم پر اطمینان نہ ہو اور کوئی دوسری جماعت تم کو ایسی نظر آتی ہو جو خالص اسلامی نصب العین کے لئے اسلامی طریق پر کام کر رہی ہو تو اس میں شامل ہو جاؤ۔ ہم خود بھی ایسی جماعت پاتے تو اسی میں شامل ہو جاتے کیونکہ ہمیں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چننے کا شوق نہیں ہے۔ اور اگر تم کو نہ ہم پر اطمینان ہے نہ کسی دوسری جماعت پر تو پھر تمہیں اپنے فرض اسلامی کو ادا کرنے کے لئے خود اٹھنا چاہئے اور اسلامی طریق پر ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جس کا مقصد پورے دین کو قائم کرنا اور قول و عمل سے اس کی شہادت دینا ہو۔ ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی تم اختیار کرو گے انشاء اللہ حق پر ہو گے۔ ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا اور نہ بسلامتیٔ ہوش و حواس ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ صرف ہماری ہی جماعت حق پر ہے اور جو ہماری جماعت میں نہیں ہے وہ باطل پر ہے۔ ہم نے کبھی لوگوں کو اپنی جماعت کی طرف دعوت نہیں دی ہے۔ ہماری دعوت تو صرف اُس فرض کی طرف ہے جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم پر اور آپ پر یکساں عائد ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کو ادا کر رہے ہیں برحق ہیں خواہ ہمارے ساتھ مل کر کام کریں یا نہ کریں۔ البتہ یہ بات کسی طرح درست نہیں ہے کہ آپ نہ خود اٹھیں، نہ کسی اٹھنے والے کا ساتھ دیں اور طرح طرح کے حیلے اور بہانے کر کے اقامتِ دین اور شہادت علی الناس کے فریضے سے جی چرائیں یا اُن کاموں میں اپنی قوتیں خرچ کریں جن سے دین کے بجائے کوئی دوسرا نظام قائم ہوتا ہو اور اسلام کے بجائے کسی اور چیز کی گواہی آپ کے قول و عمل سے ملے۔ معاملہ دنیا اور اس کے

لوگوں سے ہوتا تو حیلوں اور بہانوں سے کام چل سکتا تھا مگر یہاں تو اس خدا کے ساتھ معاملہ ہے جو علیمٌ بذات الصدور ہے۔ اُسے کسی چال بازی سے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

مختلف دینی جماعتیں

اس میں شک نہیں کہ ایک ہی مقصد اور ایک ہی کام کے لئے مختلف جماعتیں بننا بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اور اس میں انتشار کا بھی اندیشہ ہے مگر جب نظامِ اسلامی درہم برہم ہو چکا ہو اور سوال اس نظام کے چلانے کا نہیں بلکہ اس کے از سرِ نو قائم کرنے کا ہو تو ممکن نہیں ہے کہ ابتدا ہی میں وہ الجماعتہ وجود میں آجائے جو تمام امت کو شامل ہو، جس کا التزام ہر مسلمان پر واجب ہو اور جس سے علیحدہ رہنا جاہلیت اور علیحدہ ہونا ارتداد کا ہم معنی ہو۔ آغاز کار میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ جگہ جگہ مختلف جماعتیں اس مقصد کے لئے بنیں اور اپنے اپنے طور پر کام کریں۔ یہ سب جماعتیں بالآخر ایک ہو جائیں گی اگر نفسانیت اور افراط و تفریط سے پاک ہوں اور خلوص کے ساتھ اصل اسلامی مقصد کے لئے اسلامی طریق پر کام کریں۔ حق کی راہ میں چلنے والے زیادہ دیر تک الگ نہیں رہ سکتے۔ حق ان کو جمع کر کے ہی رہتا ہے کیونکہ حق کی فطرت ہی جمع و تالیف اور وحدت و یگانگت کی متقاضی ہے۔ تفرقہ صرف اُس صورت میں رونما ہوتا ہے جب حق کے ساتھ کچھ نہ کچھ باطل کی آمیزش ہو یا اوپر حق کی نمائش ہو اور اندر باطل کام کر رہا ہو"۔

بقیہ : تذکرہ و تبصرہ

آگے مقدمات کی سماعت ہماری عدلیہ کے تحت ہو تو یہ بھی گویا ایک مثبت پیش قدمی ہے۔ اس کے لئے حکومت نے خود آرڈی ننس کا مسودہ بنایا ہے اور صدر صاحب کے پاس منظوری کے لئے بھیج دیا ہے۔ دعا کیجئے کہ اس سے حالات کی بہتری کی کوئی صورت بن جائے۔ صورت حال تو واقعتاً اتنی گمبھیر ہے کہ نظر نہیں آ رہا ہے کہ اس قدم سے اصل علاج ہو جائے گا۔ باقی اللہ کو ہر شے پر قدرت حاصل ہے۔ ہم اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کرتے ہیں اور اسی سے اصلاحِ احوال کی دعا کرتے ہیں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO


پیلو کی بازیافت
مسواک سے
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تک
پیلو کے موثر اور مجرب اجزا پر مشتمل ایک مکمل طبی ٹوتھ پیسٹ پیش کر کے ہمدرد نے حفظِ دنداں کی دنیا میں بھی اوّلیت حاصل کر لی ہے۔
پیلو صدیوں سے دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمدرد کی تحقیقِ جدید نے پیلو کے ان افادی اجزا اور دوسری مجرب جڑی بوٹیوں سے ایک جامع فارمولے کے مطابق ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تیار کیا جو پوری طرح دانتوں اور مسوڑھوں کی حفاظت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
ہمدرد
پیلو ٹوتھ پیسٹ
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
پیلو کے اوصاف
مسوڑھے مضبوط، دانت صاف
پاکستان سے محبت کرو - پاکستان کی تعمیر کرو

رفتارِ کار

تنظیم اسلامی لاہور کے تحت

ایک روزہ تربیتی و دعوتی پروگرام کا انعقاد

مرتب: مرزا ایوب بیگ (امیر تنظیم اسلامی لاہور)

یہ بات اکثر رفقاء کرام کے علم میں ہوگی کہ ۲۸ر اپریل ۹۰ء کو امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تنظیم اسلامی لاہور کے ماہانہ اجتماع میں باہم مشورے کے بعد لاہور کی چاروں تنظیموں کو ایک تنظیم میں ضم کرنے کا اعلان فرمایا تھا۔ راقم کو تنظیم اسلامی لاہور کی امارت تفویض کی گئی۔ تنظیمی نظم کو مستحکم کرنے کی غرض سے راقم نے لاہور شہر کو 8 زونوں (Zones) میں تقسیم کر کے ہر زون کا ایک نقیبِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔ ساتھ ہی لاہور میں تنظیمی سطح پر ایک نئے پروگرام کا اعلان کیا جسے ایک روزہ تربیتی و دعوتی پروگرام کا نام دیا گیا جس کے لئے ہر ماہ کا آخری جمعۃ المبارک طے پایا ہے۔

اس سلسلے کے پہلے ایک روزہ تربیتی اور دعوتی پروگرام کا انعقاد ۲۲ر جون ۹۰ء کو ہوا جس کے لئے لاہور کے 8 زونوں کو 4 حلقوں میں تقسیم کیا گیا۔ چنانچہ لاہور میں چار مختلف جگہوں پر یہ پروگرام منعقد ہوا۔ پورے دن پر محیط اس پروگرام کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ نمازِ جمعہ سے قبل کا وقت تربیتی پروگرام کے لئے اور بعد نماز جمعہ کا پورا وقت دعوتی پروگرام کے لئے مخصوص تھا۔

تربیتی پروگرام کا آغاز صبح 8 بجے ہوا اور یہ پروگرام ہر جگہ نماز جمعہ سے تقریباً نصف گھنٹہ قبل اختتام کو پہنچا۔ اس پروگرام کا جو معیّن شیڈیول تنظیم اسلامی لاہور کی طرف سے ہر حلقے کو دیا گیا تھا اور جس کے مطابق ہر حلقے کو اس پروگرام کا انعقاد کرنا تھا' ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پروگرام

(1) کوئی ساتھی جو خوش الحانی سے تلاوتِ کلام پاک کر سکتا ہو تلاوت کرے گا اور ساتھ ہی اُس کا ترجمہ بھی بیان کرے گا۔

(2) نماز اور روزہ کے فقہی مسائل خصوصاً نماز کی ادائیگی کے سلسلے میں جزئیات کو تفصیلاً بیان کیا جائے گا۔

(3) ہر حلقہ میں ایک رفیق کو یہ ذمہ داری سونپی جائے گی کہ وہ اسلام کے نظامِ بیعت اور مشاورت کے موضوع پر تقریر کرے اور بعد میں اُس پر باہم مذاکرہ کیا جائے۔

(4) رفقائے کے نام راقم کا ایک خط پڑھ کر سنایا جائے۔

دعوتی پروگرام کے بارے میں تنظیم اسلامی لاہور نے ہر حلقہ کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ اپنے اردگرد کے حالات کے مطابق جس طرح مناسب سمجھیں پروگرام تشکیل دے لیں لیکن مغرب اور عشائے کے مابین ایک کارنر میٹنگ کا انعقاد لازم قرار دیا گیا تھا۔

اللہ کے فضل و کرم سے چاروں حلقوں میں یہ پروگرام بڑے نظم و ضبط کے ساتھ نہایت احسن طریقے سے منعقد ہوئے جس کی مختصر روئیداد کچھ یوں ہے :

حلقہ نمبرا نے جو زون نمبر ۲، ۳ اور ۴ پر مشتمل تھا، اپنا پروگرام لاہور چھاؤنی کی مسجد بلال (نزد شیر پاؤ پل) میں منعقد کیا۔ اس حلقے کی نظامت محترم عبد الرزاق صاحب کے سپرد تھی۔ تقریباً ۵۰ رفقائے نے بھرپور شرکت کی۔ بالخصوص تربیتی پروگرام میں رفقائے نے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اُسے تنظیمی اعتبار سے بہت مفید پایا۔ بعد نماز مغرب دعوتی اجتماع میں حافظ اشرف صاحب نے 'استحکام پاکستان' کے موضوع پر خطاب کیا۔

زون نمبر ۸، ۱ پر مشتمل حلقہ نمبر ۲ نے مسجد نُور نزد چوک مصطفےٰ آباد میں اپنا تربیتی پروگرام منعقد کیا۔ ناظم پروگرام چوہدری محمد اسحٰق صاحب تھے۔ یہاں آغاز میں رفقاء کی حاضری کم تھی۔ البتہ جلد ہی ۲۵ رفقاء جمع ہوگئے۔ رفیق تنظیم اقبال حسین صاحب نے اسلام کے نظام بیعت اور مشاورت پر تقریر کی جس پر مفید سوال و جواب ہوئے۔ بقیہ تربیتی نصاب بھی بخوبی مکمل کیا گیا۔ شام کو کارنر میٹنگ سے چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب نے خطاب کیا۔ جس میں ۱۵۰ سے زائد افراد شریک ہوئے۔

حلقہ نمبر ۳ نے جو زون نمبر ۷، ۵ پر مشتمل تھا، اپنے تربیتی پروگرام کے لئے مسجد الریاض کالونی لارنس روڈ کا انتخاب کیا۔ ۳۳ رفقائے نے بھرپور شرکت کی۔ یہاں چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب نے نماز کے فقہی مسائل سے رفقاء کو روشناس کرایا۔ نظامِ بیعت اور مشاورت پر گفتگو کرنے کا قرعہ بھی انہی کے نام نکلا۔ اس پروگرام کو رفقائے نے بہت ہی مفید

قرار دیا - شام کو دعوتی اجتماع میں نوید احمد صاحب نے دین کا جامع تصور کے موضوع پر مفصل اور مؤثر گفتگو کی - تربیتی اجتماع کے ناظم بھی نوید احمد صاحب ہی تھے -

حلقہ نمبر ۴ صرف ایک زون یعنی زون نمبر ۶ پر مشتمل تھا - یہاں تربیتی اجتماع کے ناظم غازی محمد وقاص تھے - کل ۲۹ رفقائے پروگرام میں شرکت کی - رفیقِ تنظیم محمد راشد صاحب نے اسلام کے نظامِ بیعت اور مشاورت پر مفصل گفتگو کی - عصر اور مغرب کے مابین کا وقت لوگوں سے رابطہ کے لئے مخصوص کیا گیا تھا - مغرب کے بعد منعقد ہونے والی کارنر میٹنگ کے پروگرام سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے رفقائے پی بورڈز اٹھا کر پورے علاقے کا گشت کیا اور اس طرح لوگوں کو کارنر میٹنگ میں شرکت کی دعوت دی - کارنر میٹنگ بند روڈ کے نزدیک چوک چوہان پارک میں منعقد کی گئی جس میں راقم نے "ہمارے مسائل اور اُن کا حل" کے عنوان سے گفتگو کی - تقریباً ۱۰۰ افراد اس پروگرام میں شریک ہوئے - مجموعی طور پر لاہور کے ۱۳۷ رفقائے اس ایک روزہ پروگرام میں شرکت کی - بعد میں اس پروگرام کے بارے میں راقم نے رفقائے کے تأثرات معلوم کئے تو اطمینان ہوا کہ قریباً سب رفقا نے اسے انتہائی مفید قرار دیا - بعض اصحاب کی طرف سے مزید بہتری کے لئے تجاویز بھی موصول ہوئیں - اگلے ماہ کے پروگرام کے لئے ۲۷ جولائی کا تعین ہوا ہے - انشاء اللہ العزیز مزید کوشش سے اسے خوب تر بنانے کی کوشش کی جائے گی - اللہ تعالیٰ ہماری کوششوں کو شرفِ قبول عطا فرمائے (آمین) -

---

بقیہ : الہُدیٰ

سلسلۂ مضمون کو ذہن میں جوڑ لیجئے! "وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ" کی شرح مزید ہوئی ۔ "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ" کے الفاظ سے ۔ اور وہ حبلُ اللہ کون سی ہے؟ اس کا جواب ملا حدیثِ نبویؐ کے ذریعے کہ "هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ" ۔ اس سے اشارہ ہو گیا کہ اس تمام عمل یعنی مجاہدہ فی سبیل اللہ اور شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لیے مرکز و محور دراصل قرآن مجید ہو گا ۔ یہ مضمون ہمارے منتخب نصاب کے اِسی جزو میں سورۃ الجمعہ کے ضمن میں تفصیل سے زیرِ بحث آئے گا ۔ وَاٰخِرُ دعوانا ان الحمدُ للّٰہِ ربِّ العالمین ۔ !

موجودہ سیاسی صورتِ حال اور ہمارا موقف

امیر تنظیمِ اسلامی کے خطاباتِ جمعہ کے پریس ریلیز کے آئینے میں

احباب جانتے ہیں کہ مسجد دارالسلام کے خطاباتِ جمعہ میں امیر تنظیم اسلامی بالعموم اہم دینی اور قرآنی موضوعات ہی کو مرکزِ گفتگو بناتے ہیں۔ تاہم کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے پر محیط خطاب کے اختتام پر ملکی سیاسی صورتِ حال کے بارے میں مختصر اظہارِ خیال بھی اکثر شاملِ گفتگو ہوتا ہے۔ سیاسی صورتِ حال پر گفتگو عموماً دس منٹ سے متجاوز نہیں ہوتی۔ ہماری جانب سے اخبارات کو جو مختصر سا پریس ریلیز بھیجا جاتا ہے اس میں صحافیانہ ضرورت کے پیشِ نظر خطاب کے اسی آخری حصے کو نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ اخبارات والے اس مختصر پریس ریلیز میں بھی حسبِ ضرورت کانٹ چھانٹ سے دریغ نہیں کرتے اور بعض اوقات یہ کانٹ چھانٹ اس درجہ غیر معقول انداز میں کی جاتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ ربطِ کلام پارہ پارہ ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات بات بھی ادھوری سامنے آتی ہے ——— چنانچہ بعض احباب کے توجہ دلانے پر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ دورانِ ماہ ہماری جانب سے ارسال کردہ جملہ پریس ریلیز کو "میثاق" کے صفحات میں جگہ دی جائے گی۔ تاکہ ہمارا موقف صحیح سیاق و سباق کے ساتھ سامنے آسکے!

ادارہ

(۱)

فوج کو دستور کے مطابق اختیارات دیئے جائیں

(جمعہ ۶ر جولائی کا پریس ریلیز)

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ فوج کا یہ مطالبہ بالکل درست ہے کہ اُسے سندھ میں امن و امان قائم کرنے کے لئے دستور کے مطابق مکمل اختیارات دیئے جائیں تاکہ وہ تخریب کاروں اور بدامنی پھیلانے والوں کی جڑ کاٹ سکے - انہوں نے کہا کہ فوج کی آمد سے حالات ظاہری طور پر بہتر نظر آتے ہیں، نفرت کی چنگاریوں پر راکھ کی ہلکی سی تہہ آگئی ہے جسے ہوا کا معمولی سا جھونکا دوبارہ شعلوں میں تبدیل کر سکتا ہے - ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اختیارات دیئے بغیر طویل عرصے تک فوج کو امن و امان بحال کرنے کے لئے استعمال کیا گیا تو اس سے فوج کے مورال کو نقصان پہنچے گا - انہوں نے کہا کہ وزیر اعظم نے پیپلز پارٹی کی صوبائی اور وفاقی حکومتوں کی ناکامی کا برملا اعتراف کرنے کے بعد فوج کو طلب کیا ہے لیکن اب وہ فوج کو پولیس کی طرح استعمال کرنا چاہتی ہیں - تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ علاقے کی سول انتظامیہ پر فوج کو قانونی بالادستی عطا کئے بغیر مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں کئے جا سکتے -

باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ گزشتہ ڈیڑھ سال میں جمہوری عمل کے نتیجے میں بر سر اقتدار آنے والوں نے جمہوریت کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ بڑے بڑے جمہوریت پسند جمہوریت سے تائب ہو گئے ہیں لیکن اس کے باوجود میرا موقف یہی ہے کہ ہمارے ملک کی بقا جمہوریت سے وابستہ ہے - انہوں نے کہا کہ ہمیں پاکستان کی قدر کرنی چاہئے، یہ عالم اسلام کا واحد ملک ہے جہاں جمہوری آزادیاں موجود ہیں - ہم اپنی بات آزادی سے کہہ سکتے ہیں، اپنے نظریات کی تبلیغ کے لئے جماعت سازی کر سکتے ہیں - اگرچہ پاکستان کو حقیقی استحکام تو اسلامی انقلاب کے بعد ہی حاصل ہو گا مگر فوری طور پر جمہوریت کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا - ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہمیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنا احتساب کرنا چاہئے - آخر ہمارے دل اتنے سخت کیوں

ہوگئے ہیں کہ ہم دشمنوں کی طرح اپنے مسلمان بھائیوں کا خون بہانے سے گریز نہیں کرتے، ہم جمہوری نظام کو مستحکم کرنے کی بجائے بار بار مارشل لاء کو کیوں پکارنے لگتے ہیں۔ ہم کہاں سے چلے تھے اور اب ہمارا رخ کس طرف ہے؟

(۲)

پاکستان جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا آخری حصار ہے

(جمعہ ۱۳ جولائی کا پریس ریلیز)

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ سندھ میں سیاسی عمل اور سول حکومت کی ناکامی کے بعد حالات اتنے مخدوش ہوگئے ہیں کہ قوم کے ذہین طبقے کو بھی کوئی مناسب حل سمجھ میں نہیں آرہا۔ فوج کو دستور کی دفعہ ۲۴۵ کے مطابق انتظامی اور عدالتی اختیارات دینے ضروری ہیں جن کے بغیر وہ مؤثر کام نہیں کر سکتی لیکن اس کے نتیجے میں بھی بالکل وہی ردِّ عمل ابھرنے کا اندیشہ ہے جس کا تجربہ ہم مشرقی پاکستان میں کر چکے ہیں اور بصورت دیگر اگر فوج کو واپس بلالیا جائے تو حیدر آباد آپریشن جیسے کئی آپریشن رونما ہونے کا خدشہ ہے۔ ہم ایک ایسی بند گلی میں پھنس چکے ہیں جس سے نکلنے کا راستہ نظر نہیں آتا۔ انہوں نے کہا کہ سرحد کے پار بھارت میں پوری جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے جو منصوبے بن رہے ہیں اُن کا تو ہمیں اندازہ ہی نہیں۔ جنوبی ہند کی مرہٹہ قوت جس کا سر اورنگزیب عالمگیر اور احمد شاہ ابدالی نے کچلا تھا ایک بار پھر منظم ہو کر مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل ہے۔

دورۂ سپین کے تأثرات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہسپانیہ کے مسلمانوں کی طرح ہم بھی اللہ کے شدید عذاب کی گرفت میں آسکتے ہیں۔ ہم نے اللہ سے بدعہدی کی اور آزادی کے چوالیس برس ذاتی مفادات کی نذر کر دیئے جبکہ آر، ایس، ایس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے ہندو دانشور سپین جا کر مسلمانوں کو مٹانے کے طریقوں پر تحقیق کرتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار براہ راست ہندوؤں کے قبضے میں جاتا اور انگریز کی صورت میں تیسری قوت بیچ میں نہ آتی تو ہن

ہین کی طرح پورے برّعظیم پاک و ہند سے مسلمانوں کے وجود کو مٹا چکا ہوتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستان جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا آخری حصار ہے۔ اگر ہندو اس کے مزید حصے بخرے کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس برّعظیم سے مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حالات کو سدھارنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ قومی سطح پر احتساب کا عمل شروع کیا جائے۔ سیاسی جماعتیں' رہنما' حکمران' دانشور' علمأ اور عوام سب اپنا اپنا محاسبہ کر کے اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی اور اصلاح کا آغاز کریں تو اب بھی تمام مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

(۳)

اسلامی حدود پر بے نظیر کا تبصرہ کلمۂ کفر ہے

(جمعہ ۲۰ر جولائی کا پریس ریلیز)

اسلامی حدود پر وزیر اعظم بے نظیر کا تبصرہ کلمہ کفر ہے۔ اس سے پہلے سیکولر عناصر نے اسلام کے قانون شہادت کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ ان خیالات کا اظہار امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ شریعت بل جس صورت میں بھی منظور ہو اُس سے نفاذ اسلام کی راہ میں ایک قدم آگے ہی بڑھے گا۔ البتہ اس موقع پر عوام کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر کے انہیں سڑکوں پر لانا ملکی سالمیت کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ سندھ کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ حیدر آباد میں قدم قدم پر فوج کی موجودگی کے باوجود تخریب کاری' دھماکوں اور فائرنگ کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ سندھ کا مسئلہ محض سڑکوں پر فوج کے گشت کرنے سے حل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اس سے نہ صرف فوج کا مورال تباہ ہو گا بلکہ عوام میں بھی مایوسی پھیلے گی اور انہیں تحفظ کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ صدارتی آرڈیننس کے ذریعے ضابطہ فوجداری میں ترمیم کر کے حکومت فوج کو قانونی اختیار دینے پر آمادہ تو ہوئی ہے۔ یہ ایک درمیانی راستہ ہے خدا کرے کہ یہ مؤثر ثابت ہو۔

تنظیم اسلامی کے امیر نے علماکرام اور دینی جماعتوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی بیالیس سالہ کارکردگی کا جائزہ لے کر اپنے لئے نیالائحہ عمل طے کریں - انتخابی سیاست اور اقتدار کی جنگ میں شریک ہو کر انہوں نے آج تک کیا حاصل کیا ہے - ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ سیاسی جماعتوں کو اسلام اور پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں 'وہ اپنی پالیسیاں اور پروگرام صرف حصول اقتدار کو پیش نظر رکھ کر بناتے ہیں - انہوں نے کہا کہ ممتاز دولتانہ اور ذوالفقار علی بھٹو یا وزیر اعظم بے نظیر اور سیدہ عابدہ حسین کی سیاست اور طرز زندگی میں کیا فرق ہے کہ ہم ایک کو اسلام دوست اور دوسرے کو اسلام دشمن قرار دیں - ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ دینی عناصر اقتدار پرست سیاست دانوں کی جنگِ اقتدار میں پاسنگ کی طرح استعمال ہو کر عوام کی اصلاح کا کوئی کام نہیں کر سکتے -

○

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں

○

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد:	۳۹
شمارہ:	۹
صفر المظفر	۱۴۱۱ھ
ستمبر	۱۹۹۰ء
فی شمارہ	-/۵
سالانہ زرتعاون	-/۵۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/-
c/o Dr. Khursid A Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove IL 60516
Tel 312 969 6766

c/o Mr Rashid A. Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel 313 977 8081

CANADA US $ 12/-
c/o Mr Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/-
c/o Mr Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel 01 805 8732

MID-EAST DR 25/-
c/o Mr. M Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel · 479 192

INDIA US $ 6/-
c/o Mr Hyder M D. Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel 42127

K S A SR 25/-
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/-
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقام اشاعت: ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

"حقیقتِ زندگی" کے عنوان سے امیرِ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک پرانی تحریر ۱۹۸۸ء میں ماہنامہ "حکمتِ قرآن" کے مارچ کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس گرانقدر مضمون کا اختتام حضرت بایزید بسطامی کے اس قول پر ہوا تھا کہ "سبحانی ما اعظم شانی"۔ سیاقِ کلام سے چونکہ اس جملے کی تصویب متبادر ہوتی ہے لہٰذا اس سلسلے میں ایک وضاحتی نوٹ امیرِ تنظیم اسلامی کے ذمے قرض تھا۔ خیال تھا کہ یہ وضاحت تصوف سے متعلق اُس موعودہ مضمون میں شامل کر لی جائے گی جس کا "میثاق" و "حکمتِ قرآن" کے قارئین کو شدید انتظار ہے اور جس کے ضبطِ تحریر میں لانے کا ارادہ امیرِ محترم کم از کم گذشتہ دو برسوں سے باندھ رہے ہیں لیکن خواہش کے باوجود اس عزم کے سعی سے دمساز ہونے کی نوبت چونکہ نہیں آسکی لہٰذا انہوں نے ضروری خیال کیا کہ اس وضاحت کے معاملے کو مزید التوا میں نہ ڈالا جائے۔

مذکورہ بالا قول کے بارے میں یہ وضاحت نوٹ کر لی جائے کہ اس جملے کا حصۂ اوّل "سبحانی" شطحیات کے قبیل سے ہے اور اپنی جگہ اس کے کلمۂ کفر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ہاں اس جملے کا دوسرا حصہ انسان کے مقام اور مرتبے کے اعتبار سے درست اور مبنی برحقیقت ہے۔ اور فی الاصل اُس مضمون میں متذکرہ بالا جملے کے اِسی حصے کی تصویب مقصود تھی!

ان دنوں بعض حلقے یہ تاثر دے رہے ہیں کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اہلِ علم حضرات کا تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار نہ کرنا محض نظامِ بیعت کے سبب سے ہے۔ گویا بیعت کا نظام ان حضرات کی تنظیم اسلامی میں شرکت کی راہ کی اصل رکاوٹ ہے۔ اسے اگر رفع کر دیا جائے تو بقول "آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

کا سا نقشہ ہوگا ـــــ یہ بات امرِ واقعہ کے صریحاً خلاف ہے، اور یہ تاثر دینے والے اگر جانتے بوجھتے اس خیال کو عام کر رہے ہیں تو یہ معاملہ صریح دروغ گوئی کے ذیل میں آئے گا، بصورتِ دیگر شدید ناواقفیت کا مظہر قرار پائے گا۔

تنظیمِ اسلامی کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے تنظیمِ اسلامی کے نام سے ایک قافلہ تشکیل دینے کی اوّلیں کوشش ۱۹۶۷ء میں ہوئی تھی۔ اُس موقع پر جو قراردادِ تاسیس مرتّب کی گئی تھی اس کے تصویب کرنے والوں میں جماعت سے کنارہ کش ہونے والے وہ جملہ اہلِ علم اور اکابر شامل تھے جو ۱۹۵۷ء کے اجتماع ماچھی گوٹھ کے موقع پر یا اُس سے متصلاً بعد جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے۔ اُس موقع پر نظام کے بارے میں کوئی بات طے نہیں تھی کہ وہ مروّجہ جمہوری اصولوں پر مبنی ہوگا یا بیعت کی بنیاد پر استوار کیا جائے گا، بلکہ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک سات رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ کمیٹی کے لیے منتخب کیے گئے سات افراد میں سے ایک محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی تھے جو جملہ اراکین میں سب سے کم عمر ہونے کے باعث خود کو 'سات میں کا ساتواں' قرار دیتے تھے ـــــ لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" کے مصداق نظام کی تعیین سے قبل ہی تنظیم کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی ـــــ بعد میں ۱۹۷۵ء میں جب محترم ڈاکٹر صاحب نے تنظیم کے بالفعل قیام کے ضمن میں 'اکابر' سے مایوس ہو کر تنہا اس قافلے کو از سرِ نو ترتیب دینے کا بیڑہ اٹھایا[1] تو اُسی قرارداد کو تنظیم کی بنیاد قرار دیا جس پر وہ اکابر صاد کر چکے تھے۔ تنظیم کی اس تشکیلِ جدید کے موقع پر محترم ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تین سال کے عرصے کو عبوری مدت قرار دیتے ہوئے نظام کے معاملے کو بالکل OPEN رکھا۔ حالانکہ نظامِ بیعت کی جانب اُن کا اپنا ذہنی رجحان ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن کی تاسیس کے موقع پر واضح طور پر سامنے آ چکا تھا۔ ابتدائی تین سال نظامِ بیعت کو اختیار نہ کر کے محترم ڈاکٹر صاحب نے جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے مذکورہ بالا اکابر کے لیے پورا موقع فراہم کیا تھا کہ وہ آئیں اور آ کر نظامِ جماعت کے مسئلے کو طے کریں۔ ان حضرات

---

[1] اس کی تفاصیل 'عزمِ تنظیم' نامی اس کتابچے میں دیکھی جا سکتی ہیں جو اس سے قبل "سر افگندیم" کے نام سے دستیاب تھا۔

ے لیے کھلا موقع تھا کہ ان کی رائے اگر نظامِ بیعت کے حق میں نہیں تھی تو وہ اپنے موقف کو دلائل کے ساتھ شرکائے تنظیم کے سامنے رکھتے۔ پھر عبوری مدت کے اختتام پر جو اجتماعی رائے سامنے آتی اس کے مطابق نظام اختیار کر لیا جاتا۔ (واضح کہ اس عبوری مدت کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب نے خود کو 'امیرِ تنظیم' کی بجائے داعی (CONVE NOR) کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا اور یہی لقب اختیار کیا تھا) ——— اب اگر ان ابتدائی تین سالوں کے دوران ان 'اکابر' میں سے کسی ایک نے بھی تنظیم اسلامی کی صفوں میں شامل ہونا پسند نہیں کیا تو یہ بات یقینی ہے کہ یہ الزام بالکل بے بنیاد اور بعید از حقیقت ہے کہ ان حضرات کی تنظیم میں عدم شمولیت 'نظامِ بیعت' کے سبب سے ہے۔
؎ " ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے !"

بعض قارئین 'میثاق' کی یہ رائے سامنے آئی ہے کہ محترم نعیم صدیقی کے خط اور اس کے جواب کو شائع نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ یہ حضرات اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ نعیم صدیقی صاحب نے اپنے خط میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ خط کے تحریر کرنے سے ان کا مقصود ریکارڈ کی درستی ہے۔ ان کے اس موقف کا لازمی تقاضا تھا کہ ان کا خط 'میثاق' میں شائع کیا جاتا۔ اس لیے کہ جس ریکارڈ کو وہ درست کرنا چاہ رہے تھے وہ 'میثاق' ہی کے صفحات کی زینت بنا تھا۔ لہٰذا صحافتی اخلاق کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اُن کے خط کو من وعن شائع کر دیا جاتا۔ اور ظاہر بات ہے کہ اُس کے جواب میں اپنی معروضات پیش کرنا ہمارے لیے ضروری تھا کہ تصویر کے دونوں رخ جب تک قارئین کے سامنے نہ ہوں حقیقتِ حال کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

امیرِ تنظیم اسلامی 'اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا (ISNA) کی دعوت پر جو براعظم امریکہ اور کینیڈا میں بسنے والے مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے' اُن کے سالانہ کنونشن میں شرکت کی غرض سے ۲۸ اگست کو حسبِ پروگرام امریکہ روانہ ہو گئے تھے۔ امیرِ تنظیم کو وہاں مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا ہے۔ امریکہ میں ان کا قیام زیادہ سے زیادہ دو ہفتوں پر محیط ہو گا۔ واپسی پر عمرے کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کے لیے سعودی عرب ٹھہرنا بھی ان کے پروگرام میں شامل ہے۔ توقع ہے کہ ۲۰ ستمبر تک پاکستان مراجعت ہو گی ان شاء اللہ

قربِ قیامت سے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں اور عالمی اُفق پر تیزی سے بدلتے حالات!

۱۶/ اگست کے خطابِ جمعہ میں تازہ ملکی اور بین الاقوامی صورتِ حال پر امیرِ تنظیم کے تاثرات

ترتیب وتسوید: حافظ خالد محمود خضر

آج مجھے تین امور اور مسائل پر گفتگو کرنا ہے جن کا تعلق پاکستان، عالم اسلام اور بین الاقوامی حالات سے ہے۔ معروف اصطلاحات میں اسے حسنِ اتفاق کہا جائے گا لیکن دراصل ایمان کے نقطۂ نظر سے اس کائنات میں کوئی چیز بھی اتفاقاً وقوع پذیر نہیں ہوتی اور ہر واقعہ جو رونما ہوتا ہے اس کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی مشیت کارفرما ہوتی ہے ----- کہ انہی تین مسائل پر پچھلے چار جمعوں سے گفتگو ہو رہی ہے۔ اپنے بیرونی سفر سے واپسی کے بعد عید الاضحیٰ کے مختصر خطبہ میں میں نے کچھ مسائل و معاملات کا انڈکس پیش کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے یہاں کل چار جمعے ادا کئے۔ ان میں جو مسائل پیش کئے گئے اور ایک خطابِ جمعہ میں قرآن اکیڈمی میں مَیں نے ان کا خلاصہ بیان کرنے کی کوشش کی، آج کے تینوں مسائل کا تعلق بھی کم و بیش انہی سے جڑ جاتا ہے۔

میں نے غور کیا تو ان تینوں مسائل میں عجیب نسبت و تناسب نظر آیا کہ دو اعتبار سے ان میں عکسی ترتیب ہے۔ یعنی ایک طرف پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے اعتبار سے اس عرصے میں اہم ترین واقعہ رونما ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان کے فوجداری قانون میں ایک بڑی بنیادی ترمیم ہو گئی ہے۔ بظاہر یہ معاملہ بہت چھوٹا نظر آ رہا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ لوگوں نے اس کی اہمیت کی طرف توجہ دی ہو، چنانچہ پریس میں بھی اس پر کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی ہے، لیکن درحقیقت یہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کے ضمن میں بہت اہم پیش رفت ہے اور اس اعتبار سے یہ آج کے تینوں مسائل میں سے اہم ترین ہے۔ ہمارے ہاں قتل کے مقدمات میں گزشتہ صدی سے جو "رومن لاء" نافذ چلا آ رہا تھا، وہ اسلام

کے قصاص و دیت کے قانون کے بالکل خلاف تھا۔ اسی طرح خود دستورِ پاکستان میں کئی چیزیں ایسی چلی آ رہی تھیں جو شریعت کے صریح مخالف تھیں۔ ان میں ایک بڑی بنیادی تبدیلی ہوئی ہے جس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ دوسری طرف اگر بالکل انتہا کو دیکھا جائے تو پورے عالمِ انسانی اور اس کے مستقبل کے اعتبار سے اور بالخصوص عالمِ اسلام اور اس میں سے بھی 'اخص الخواص' عالمِ عرب کے اعتبار سے یہ اہم ترین واقعہ ہوا ہے کہ جو عراق نے کویت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے اور اب اس کی ایک بہت بڑی فوجی طاقت سعودی عرب کی سرحد پر ہے۔ اور جواباً اسلحہ اور نفری کے اعتبار سے امریکہ کی بہت بڑی طاقت اب سعودی عرب میں آ چکی ہے۔ مزید بر آں پاکستان کی بقا کے اعتبار سے یہ بہت اہم معاملہ ہے جو پاکستان میں حکومت کی تبدیلی ہوئی ہے ' بلکہ اس سے بھی صحیح طور پر کہنا چاہئے کہ جمہوریت ' سیاست اور حکومتی معاملات میں پھر جو ایک انقلاب آیا ہے۔ تو یہ تیسرا مسئلہ بھی بہت اہم ہے لیکن میرے نزدیک مقدم الذکر دونوں معاملات دو اعتبار سے اہم ترین ہیں۔

عالمی سطح پر تبدیلیاں اور احادیث نبویؐ میں وارد پیش گوئیاں

اب میں سب سے پہلے اس معاملے کے ضمن میں اپنا تأثر آپ کے سامنے نقل کر دوں کہ جو عالمی اعتبار سے اور پھر عالمِ اسلام اور خصوصاً عالمِ عرب کے اعتبار سے اہم ترین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عالمی حالات میں جس حیرت انگیز رفتار کے ساتھ تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کے بارے میں کچھ دن پہلے تک بھی کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ صورت حال ہو جائے گی اور امریکہ کی اتنی بڑی فوجی قوت سعودی عرب میں آ اترے گی۔ ع

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

معلوم ہوتا ہے کہ اب بین الاقوامی اہمیت کے یہ جو واقعات اتنی تیز رفتاری کے ساتھ وقوع پذیر ہو رہے ہیں ان کا بڑا گہرا تعلق ہے قربِ قیامت کی اُن پیشین گوئیوں سے کہ جو محمدؐ رسول اللہ کی بہت سی احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ جو حضرات یہاں جمعے میں مستقل طور پر شرکت فرماتے ہیں ان کے علم میں ہے کہ میں نے ان کا بارہا حوالہ دیا ہے اور میرا یہ اصول ہے اور میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دی کہ جو بات جہاں سے حاصل ہوئی ہو اسے ہمیشہ اُسی حوالے سے بیان کیا ہے۔ میں نے احادیثِ نبویہ کا اتنا

تفصیلی مطالعہ نہیں کیا کہ جس کے نتیجے میں میں یہ دعویٰ کر سکوں کہ یہ میرے مطالعہ و تحقیق کا ماحصل ہے۔ یہ بات میں نے جب بھی بیان کی ہے مولانا سید حامد میاں رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بیان کی ہے۔ وہ شیخ الحدیث تھے' صحاحِ ستہ ان کے مستقل مطالعہ میں رہتی تھیں اور ان کے علاوہ دیگر کتبِ حدیث میں بھی ان کو ممارست تھی۔ انہوں نے ایک مرتبہ گفتگو میں یہ بتایا تھا کہ قیامت کے قریب جو جنگیں ہونے والی ہیں ان کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جو پیشین گوئیاں ہوئی ہیں ان سب کو جمع کر کے ان کے مابین ربط و ترتیب قائم کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلے تو ایک بہت ہی ہولناک' بہت خون ریز اور بہت بڑی جنگ ہوگی' جس میں ایک طرف مسلمان' یہودی اور عیسائی یکجا ہوں گے اور دوسری طرف بھی ایک بڑی عیسائی طاقت ہوگی جن کے مابین مقابلہ ہوگا۔ اس خون ریز جنگ کے نتیجے میں اتنے بڑے پیمانے پر انسانی جانوں کا اتلاف ہوگا کہ ایک پرندہ سینکڑوں میل تک پرواز کرے گا اور اسے سوائے لاشوں کے اور کچھ دکھائی نہ دے گا۔ اس ہولناک تباہی کے بعد بالآخر فتح اس اتحادِ ثلاثہ کو ہو جائے گی جس میں یہودی' عیسائی اور مسلمان تینوں یکجا ہوں گے۔

نزولِ مسیح اور عالمی غلبۂ اسلام

اس کے بعد پھر ایک دوسرا دور آئے گا کہ فتح کے نشے میں یہودی مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے تاکہ اپنے لئے فیصلہ کن فتح حاصل کر سکیں۔ یعنی جس طرح تمام اتحادوں کا منطقی انجام ہوتا ہے کہ وہ کسی مخالف قوت کی موجودگی میں قائم رہتے ہیں لیکن کامیابی حاصل ہونے کے بعد ٹوٹ جاتے ہیں' اسی طرح فتح حاصل ہونے کے بعد اس اتحاد کے اندر رخنہ پیدا ہو جائے گا اور یہودی مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں گے اور پھر وہ دور آئے گا کہ جس کی خبریں نزولِ مسیحؑ کے ضمن میں احادیث میں آئی ہیں۔ یہودیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا بے پناہ نقصان ہوگا' ان سے انہیں بے انتہا تکلیف پہنچے گی۔ لیکن اس کے بعد حضرت مسیحؑ کا نزول ہوگا اور پھر اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت اور خصوصی امداد سے صورت حال یکسر تبدیل ہو جائے گی۔ اس لئے کہ حضرت مسیحؑ کے بارے میں تو بعض احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ جہاں تک ان کی نگاہ جائے گی' سب کچھ پگھل کر نسیاً منسیاً ہو جائے گا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ

آج جو تصور 'لیزر بیم' کا ہے اور اس کے حوالے سے جو تباہی پھیلتی ہے بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیحؑ کی نگاہ کے اندر وہ صلاحیت پیدا کر دے۔ ان کا تو پورا وجود ہی ایک معجزہ تھا۔ ان کی ولادت سے لے کر رفعِ سماوی تک' اور حیاتِ زمینی کے دوران بھی انہیں جو معجزے عطا ہوئے' وہ حسّی معجزات میں بلند ترین ہیں۔

بہرحال خوں ریز جنگوں کے یہ دو دَور ہوں گے۔ اس کے بعد اسلام کا غلبہ ہو گا۔ یہودیت کا تو مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور ایک ایک یہودی کو ختم کر دیا جائے گا' لیکن پھر عیسائی اور مسلمان ایک ہو جائیں گے یعنی عیسائیت اسلام میں ضم ہو جائے گی اور حضرت مسیحؑ کے بارے میں جو غلطیاں ہیں وہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ عیسائیوں کو بھی پتہ چل جائے کہ وہ الوہیت میں شامل نہیں' بلکہ بشر ہیں۔ وہ عام انسانوں کی طرح رہیں گے۔ وہ نبی کی حیثیت سے نہیں بلکہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے اور امّتِ مسلمہ کے اُس وقت کے جو قائد ہوں گے ان کی امامت میں نماز بھی پڑھیں گے۔ ان کی یہ آمدِ ثانی' جیسا کہ میں نے اپنی تقریروں میں بارہا عرض کیا ہے' صرف یہودیوں کی سرکوبی اور ان کے استیصال کے لئے ہوگی۔ کیونکہ یہود نے اپنے رسول (حضرت مسیحؑ) کا نہ صرف انکار کیا اور ان کی دعوت کو ردّ کیا بلکہ انہیں ـــ معاذ اللہ ـــ 'ولدُ الزّنا' مرتد' کافر اور واجب القتل قرار دے کر اپنی حد تک تو بہرحال سولی پر چڑھا دیا لہٰذا وہ بحیثیتِ قوم بدترین عذابِ استیصال کے مستحق ہو چکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے عذابِ استیصال کے فیصلہ کی تنفیذ ایک معیّن مدّت تک کے لئے ملتوی کی گئی ہے اور حضرت مسیحؑ کا نزولِ ثانی دراصل اسی مقصد کے لئے ہو گا۔ اس کے بعد اسلام کا غلبہ ہو گا' جس کا میں نے بارہا احادیث کے حوالے سے تذکرہ کیا ہے کہ پورے روئے ارضی پر کوئی کچا یا پکا مکان اور کوئی خیمہ تک ایسا باقی نہ رہے گا جس میں کلمۂ اسلام داخل نہ ہو جائے۔ حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ یعنی حضرت مسیحؑ کو صلیب دیئے جانے کا عقیدہ جو عیسائیت کی علامت ہے' ختم ہو جائے گا اور عیسائیوں نے شریعت میں تحریف کر کے خنزیر کے گوشت کو جو حلال کر رکھا ہے اس کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔ بہرحال اسلام کا یہ عالمی غلبہ تو ابھی ذرا دُور کی بات ہے' لیکن جو بات اس وقت سر پر آئی ہوئی ہے وہ پہلی جنگوں کا معاملہ ہے۔ احادیثِ نبویہ میں جو پیشین گوئیاں کی گئی تھیں وہ کچھ عرصہ پیشتر تک

تو بڑی عجیب لگتی تھیں۔ کسی جنگ میں یہودی' عیسائی اور مسلمانوں کا یکجا ہو کر ایک زرق بننا ناقابلِ قیاس نظر آ رہا تھا' لیکن اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سامنے کی بات تھی۔ آج سے پچاس سال پہلے یہ تصور نہیں ہو سکتا تھا کہ یہودی ریاست قائم ہو جائے گی اور یہ پوری دنیا سے کھنچ کھنچ کر ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔ اور یہ سب کچھ کس لئے ہوا ہے؟ میں نے بارہا عرض کیا ہے کہ اسرائیلی ریاست کے قیام میں کیا مشیتِ الٰہی نظر آتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے آخر میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: "فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا" یعنی ہم تمہیں لپیٹ کر لے آئیں گے' ایک جگہ یکجا کر دیا جائے گا ــــــــ یہاں تک کہ وہی ارضِ مقدّس جو اُن کے لئے ارضِ موعود تھی' وہی ان کا اجتماعی قبرستان بن کر رہے گی۔

ناسٹرڈیمس کی پیشین گوئیاں

اسی موضوع کے ساتھ تعلق جڑ جاتا ہے میری اُن تقریروں کا جو میں نے سپین سے واپسی کے بعد یہاں کیں ــــــــ اور جن کا خلاصہ ۳۱ جولائی کے 'ندا' میں شائع ہو چکا ہے۔ میری ان تقریروں میں سولہویں صدی عیسوی کے فرانسیسی عیسائی راہب 'ناسٹر ڈیمس' کی کچھ پیشین گوئیوں کا تذکرہ آیا تھا' جن کے حوالے سے میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۸ء تک بہت بڑی عالمگیر جنگ کا امکان ہے۔ اور اس وقت حالات واقعتاً حیران کن حد تک یہی رخ اختیار کر رہے ہیں۔ ناسٹرڈیمس کی پیشین گوئیوں کے مطابق یہی زمانہ انٹی کرائسٹ (Anti Christ) کے ظہور کا ہے' جو عربوں میں سے ہو گا۔ ان کا انٹی کرائسٹ کا تصور وہی ہے جو ہمارے ہاں 'مسیح دجّال' کا ہے۔ ان پیشین گوئیوں کو مرتب کر کے ویڈیو فلم کی شکل دینے والوں نے یہ غلط تأثر ظاہر کیا ہے کہ یہ انٹی کرائسٹ مسلمانوں میں سے ہو گا۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مسیحی دنیا اس وقت اس کا اطلاق صدام پر کر رہی ہو گی۔ اور اس کی شخصیت سے واقعتاً نہ صرف پوری عیسائی دنیا پر خوف و ہیبت طاری ہو چکی ہے' بلکہ خود عالمِ عرب بھی لرزہ براندام ہے۔

عالمِ عرب میں امریکی استعمار کا نیا مرکز

اس وقت عالمی حالات میں جو ڈرامائی تبدیلیاں آ رہی ہیں ان میں اہم ترین بات یہ ہے کہ اس وقت امریکہ کی فوجی قوت اور فوجی نفری کا اتنا بڑا اجتماع جو سعودی عرب کے اندر ہو رہا ہے'

تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہندوستان کے ایک نوجوان صحافی ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے ' نئی دنیا ' نامی پرچہ دکھایا جس میں امریکہ سے سعودی عرب آنے والے دیو ہیکل ہرکولیس طیاروں کا جو تانتا بندھا ہوا ہے اس کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے امریکہ اور سعودی عرب کے مابین ایک فضائی پُل قائم ہوگیا ہے۔ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ سعودی عرب ابھی تک امریکہ کو اپنے ہاں فوجی اڈوں کے قیام کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ ' Pentagon ' کے قائدین اس پر ہمیشہ پیچ و تاب کھاتے رہتے تھے کہ یہ سعودی حکومت ہمارے ہی سہارے پر تو قائم ہے ' ہمارے بغیر اس کا کوئی وجود نہیں لیکن یہ اپنے ہاں ہمارے کسی فوجی کو اترنے نہیں دے رہے اور ہمارا کوئی اڈا نہیں بننے دے رہے۔ لیکن یہ جو اچانک صورت حال پیدا ہوئی ہے ' میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ فوجوں کا کہیں آنا تو آسان ہوتا ہے ' لیکن پھر واپس جانا آسان نہیں ہوتا۔ ان کے تو وہاں مستقل پنجے گڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت امریکی استعمار کا ایک بہت بڑا مرکز عالمِ عرب کے اندر قائم ہوگیا ہے جس کی کچھ دن پہلے بھی توقع نہ تھی۔ ایک عالمی سپرپاور نے اپنے پنجے بڑی مضبوطی سے عالم عرب کے سینے میں گاڑ دیئے ہیں۔ اس سے پہلے تو ہم اسرائیل کو کہتے تھے کہ یہ امریکہ کے پنجے ہیں جو یہاں گڑے ہوئے ہیں اور گویا اسرائیل U.S.A ہی کی ایک ریاست ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ سعودی عرب کی حیثیت بھی اس سے زائد نہیں ہے۔ صرف ایک پردہ پڑا ہوا تھا جو اب اٹھ گیا ہے ' جس طرح ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں پردہ اٹھا تھا جب امریکہ کی طرف سے اسرائیل کو فوجی سازو سامان اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ سپلائی کیا گیا تھا کہ مصر نے جو جنگ تقریباً جیت لی تھی ' وہ اس کی شکست میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ وہ جنگ اسرائیل نے نہیں ' بلکہ دراصل امریکہ نے جیتی تھی۔ ورنہ اسرائیل کو تو مصر کے ہاتھوں شکستِ فاش ہو چکی تھی۔ اور مصر نے رمضان ۷۳ء کی اس جنگ میں شکست کا وہ دھبّہ دھو دیا تھا جو ۱۹۶۷ء میں اس کی پیشانی پر لگا تھا۔۔۔ اور اُس وقت اگر امریکہ اسرائیل کے تحفظ کے لئے نہ آتا تو اسرائیل کا وجود تک باقی نہ رہتا ' سو یہ جو بھی استعمار ہے جس کی علامت امریکہ ہے ' اس کے یہ دو بازو ہیں ایک بازو اگر اسرائیل ہے تو دوسرا عرب ممالک ہیں یا امریکہ کے اتحادی وہ شیخ ہیں جو اپنی حکومتوں کا وجود قائم رکھنے میں یہاں تک آگے جاسکتے ہیں کہ انہوں نے وہ پردہ بھی

اٹھا دیا اور امریکی افواج کو اتنے بڑے پیمانے پر اپنے ہاں آنے کی اجازت دے دی۔

کیمیائی اور ایٹمی جنگ کے خطرات

اس صورت حال کا اب جو کچھ نتیجہ سامنے نظر آ رہا ہے وہ انتہائی خوفناک ہے۔ ویسے تو اس وقت پوری دنیا میں جو اس قدر خطرناک ہتھیار جمع کر لئے گئے ہیں' ان کے بارے میں میں نے بارہا کہا ہے کہ اگر غلطی سے بھی کہیں ٹریگر دب جائے تو کتنے ہولناک نتائج ہوں گے! ایک دفعہ اگر میزائل چھوٹ جائیں تو پھر ان کو واپس لانے والا تو کوئی ہے نہیں۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو جوابی حملہ کیسے روکا جا سکتا ہے؟ ـــ لیکن اب تیسری جنگِ عظیم کی صورت حال سمٹ کر شرقِ اوسط میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ یہ بات واضح طور پر سامنے آ چکی ہے کہ اگر ایک طرف سے کیمیائی ہتھیار استعمال کئے گئے تو دوسری طرف سے کیمیائی کے ساتھ ساتھ ایٹمی ہتھیار بھی استعمال ہوں گے۔ اس کی امریکہ نے صاف دھمکی دے دی ہے اس لیے کہ عراق کے پاس ایٹم بم تو ہے نہیں' کیونکہ اس کے ایٹمی ری ایکٹر اسرائیل نے پہلے ہی تباہ کر دیئے ہیں۔ البتہ اس کے پاس جو خطرناک ترین ہتھیار ہیں وہ کیمیائی ہتھیار ہیں۔ ان کا استعمال عراق نے کچھ عرصہ پہلے اپنے ہی علاقے کی کُرد آبادی پر کیا ہے جہاں سائنائیڈ بموں کے ذریعے سے پوری آبادی کو ختم کر دیا گیا۔ ۴۰۰۰ نفوس پر مشتمل قصبہ تہس نہس ہو گیا اور وہاں ایک بچہ تک زندہ نہیں بچا۔ عراق نے یہی کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی اسرائیل کو دی تھی' جس پر امریکہ نے اسے خبردار کیا ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا جواب ایٹمی حملے سے دیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ کیمیائی ہتھیار بھی امریکہ کے پاس عراق کے مقابلے میں سینکڑوں گنا زیادہ موجود ہیں۔ تو یہ وہ خوفناک تباہی ہے جس کا نقشہ ان احادیث میں کھینچا گیا ہے۔ اللہ نہ کرے کہ موجودہ صورت حال یہ رخ اختیار کر لے۔

کیا روس خاموش رہے گا؟

اس صورت حال کے ایک اور پہلو کو بھی سمجھ لیجئے کہ اس سارے معاملے میں ابتدائی حماقت اگرچہ عراق نے کی ہے کہ اس نے جارحانہ انداز میں کویت کے خلاف اقدام کیا ہے' لیکن اس کے بعد جو صورت اب بن گئی ہے اس کو بہانہ بنا کر اور سعودی عرب کے تحفظ کے نام پر جس طریقے سے امریکہ اپنے سارے ہتھیاروں کے ساتھ آ گیا ہے اور اس نے شرقِ

اوسط میں سعودی عرب کی سرزمین پر اپنے پنجے گاڑ لئے ہیں' تو اب عراق کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے کہ وہ پیچھے ہٹے اور بالکل دیوار کے ساتھ لگ کر (Back to the Wall) جنگ کرے۔ اس کے سوا اس کے لئے کوئی اور راستہ نہیں۔ چنانچہ وہ اس غرض سے ایران کے ساتھ اپنے تعلقات معمول پر لانے کی کوشش کر رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر سے مجھ پر جنگ ٹھونسی جائے یا کوئی معاملہ پیش آ جائے تو پیچھے سے ایرانی خنجر گھونپ دیں۔ اس لئے کہ دس برس تک ان کے ساتھ بڑی شدید جنگ رہی ہے اور نفرت اور انتقامی جذبے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس سے اہم تر یہ بات ہے کہ وہ اب پیچھے ہٹ کر جس دیوار کے ساتھ لگے گا وہ روس کی دیوار ہے۔ روس اس سے زیادہ دور نہیں۔ اس کی تیس ڈویژن فوج تو ایران کی سرحد پر ہمیشہ موجود رہی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا ۸۵۔ ۱۹۸۴ء میں امریکہ میں 'Rapid Deployment Force' کا ایک تصوّر بڑی قوت کے ساتھ ابھرا تھا۔ وہاں یہ محسوس کیا گیا تھا کہ روس کو تو اس اعتبار سے بڑی فوقیت حاصل ہے کہ وہ ایران کی سرحد پر بیٹھا ہوا ہے' اسے خلیج تک پہنچنے میں چند گھنٹے لگتے ہیں اور ہم بیٹھے ہوئے ہیں اتنے ہزاروں میل پر کہ ہمیں تو تین چار دن لگ جائیں۔ چنانچہ خلیج کے علاقے میں اپنی مؤثر موجودگی (Effective Presence) ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے اپنے کچھ اڈے قائم کئے تھے۔ اُس وقت انہوں نے چاہا تھا کہ سعودی عرب سے بھی کچھ اڈے لئے جائیں لیکن سعودی عرب نے انکار کیا جس پر وہ اب تک جھنجلاتے رہے ہیں۔

اب جو یہ صورت حال تبدیل ہوئی ہے کہ امریکہ عین گڑھ کے اندر آ چکا ہے تو ظاہر ہے کہ روس اپنی تمام تر کمزوریوں' معاشی مشکلات اور اندرونی خلفشار کے باوجود اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ بلکہ ایسی چیزیں تو اس قسم کے خلفشار کو دور کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ایک سپر پاور کا مڈل ایسٹ کے ایک ملک میں اپنی بالفعل موجودگی اتنے بڑے پیمانے پر ثابت کر دینا دوسری سپر پاور کے لئے ہرگز کسی درجے میں بھی قابل قبول نہیں ہو گا۔ اس حوالے سے نوٹ کیجئے میں نے آپ کو بتایا تھا کہ امریکہ کے سابق صدر نکسن نے اپنی کتاب '۱۹۹۹' میں مغربی دنیا سے یہ بات کہی تھی کہ بغلیں مت بجاؤ! گوربا چوف کے بارے میں یہ مت سمجھو کہ وہ کوئی کمزور آدمی ہے یا جو کچھ وہ کر رہا ہے اس سے روس کمزور ہو جائے گا۔ بلکہ وہ ان اصلاحات وغیرہ کے نتیجے میں پہلے سے زیادہ بڑی طاقت بن کر ابھرے گا ـــــــ یہ نکسن

کا خیال ہے اور واللہ اعلم غلط ہے یا درست! لیکن نکسن ایک بہت بڑی عالمی شخصیت ہے۔ پوری صورت حال پر نظر رکھنے کے لئے اس کے پاس وسائل و ذرائع ہیں' وہ امریکہ کا صدر رہا ہے۔ اس کا یہ کہنا ہے کہ روس پہلے سے زیادہ طاقتور بن کر نکلے گا اور مغرب کو اصل میں تو اپنا صحیح مدِّ مقابل اب ملا ہے۔ یہ ہے نکسن کا تجزیہ' 1999 ' نامی کتاب میں۔

یہ وہ صورت حال ہے جس میں پتہ چلتا ہے کہ آئندہ جنگ عظیم میں دوسری بڑی قوت بھی عیسائی ہوگی کیونکہ روسی بھی تو اصلاً عیسائی ہیں۔ اس کمیونسٹ ملک میں چند لاکھ افراد ہیں جو کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں۔ آبادی کی اکثریت تو عیسائی ہے' وہاں ان کے چرچ ہیں۔ یہودی تو رفتہ رفتہ وہاں سے نکل کر اسرائیل میں جمع ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کا علاقہ تو بہت تھوڑا تھا مگر ان کی بھی برین واشنگ اتنی بری طرح سے ہوئی ہے کہ اپنا مسلمان ہونا بھی شاید ان میں سے تھوڑے لوگوں کو یاد رہ گیا ہو۔ اس وجہ سے اب یہ نقشہ جم گیا ہے کہ ایک طرف' روس اور اس کے ساتھ ایران و عراق ہوں گے۔ بعض عرب ممالک نے عراق کا ساتھ دینے کا اقرار کر لیا ہے۔ ان میں اردن کا عراق کی حمایت کا اعلان بہت حیران کن ہے۔ یمن تو کھلم کھلا عراق کا ساتھی ہے۔ قذافی صاحب ابھی خاموش ہیں' انہوں نے غالباً ابھی واضح طور پر اپنا وزن اس پلڑے میں ڈالنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ باقی عرب ممالک کی بھی از سر نو صف بندی (Re - alignment) ہو رہی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حدیثِ نبویؐ میں جنگی فریقین کا جس طرح تذکرہ آیا ہے' وہ صورت حال اب پیش آئے گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ نے افغانستان میں اگرچہ اپنا آدمی کوئی نہیں مروایا' لیکن اس طرح بے دریغ پیسہ کس لئے خرچ کیا؟ اگر معاملہ صرف اندرونی رہتا کمیونسٹوں اور افغان مجاہدین کے مابین تو یہ شکل نہ ہوتی۔ وجہ یہی تھی کہ وہاں روسی افواج کے آجانے سے طاقت کا توازن بگڑ گیا تھا۔ اسی بات نے امریکہ کو فیصلہ کن جنگ کرنے پر مجبور کیا۔ اسی طریقے سے اب یہ صورت پوری طرح معکوس ہو گئی ہے کہ اب امریکہ اس سے بھی زیادہ زوردار انداز میں شرقِ اوسط میں خلیج کے مغربی ساحل کے پاس آموجود ہوا ہے اور اندازہ یہی ہے کہ روس اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم! چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف پیشین گوئیاں شاید سچ ثابت ہوں اور بہت جلد ایک بہت بڑی عالمی جنگ چھڑ جائے۔ اور عالمی جنگ ان معنوں میں عالمی جنگ نہیں ہوتی کہ پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آجائے۔

پہلی عالمی جنگ میں اصل میدانِ جنگ یورپ بنا تھا یا کچھ حصہ ایشیا اور افریقہ کا۔ لیکن ایشیا کا بہت بڑا علاقہ اس سے متأثر نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ کے اندر بھی اصل تباہی و بربادی تو یورپ کی ہوئی ہے۔ بعض دوسرے ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آئے لیکن یہ اس معنی میں عالمی جنگ نہیں کہلاتی کہ پوری دنیا اس میں شامل تھی۔ آئندہ جنگ بھی اس لحاظ سے تو عالمی جنگ ہوگی کہ سماجی' سیاسی اور معاشی و اقتصادی اعتبار سے اس کے نتائج عالمگیر ہوں گے' لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا میدانِ جنگ مشرقِ وسطیٰ بنے گا۔ یورپ والے اس اعتبار سے ہوشیار ہو چکے ہیں کہ اب وہ اپنے براعظم کو میدانِ جنگ بننے نہیں دیں گے۔ اب جو ہتھیار آزمائے جائیں گے وہ یہیں عالمِ عرب اور عالمِ اسلام میں آزمائے جائیں گے۔ میں نے آپ کو علامہ اقبال کا یہ شعر کئی بار سنایا ہے۔

از خاکِ سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد
آشوبِ ہلاکوئے ' ہنگامۂ چنگیزے

یہ علامہ اقبال کی پیشین گوئی ہے کہ روس کی طرف سے وہی قوتیں ایک بار پھر عالمِ اسلام کی تباہی و بربادی کے لئے اٹھیں گی جو ایک بار چنگیز اور ہلاکو کی صورت میں خلافتِ بنی عباس کے مرکز بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا چکی ہیں۔

قرآنی آیات کی روشنی میں احتساب کی ضرورت

اب میں چاہتا ہوں کہ میں نے اس ضمن میں جو آیات منتخب کی ہیں' آپ کی توجہ ان کی طرف مبذول کرادوں۔ سورۂ انبیاء اس اعتبار سے بڑی عجیب سورۃ ہے کہ اس کا آغاز بھی بڑے چونکا دینے والے الفاظ سے ہوتا ہے:

اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِیۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ○

"لوگوں کے لئے ان کے حساب کا وقت قریب آن پہنچا ہے لیکن وہ غفلت میں اعراض کئے جا رہے ہیں"

یعنی کچھ فکر ہی نہیں' مست ہیں' عیش کر رہے ہیں' اپنے دنیوی معاملات میں الجھے ہوئے ہیں' اپنے ذاتی یا گروہی مفاد سے اوپر کچھ سوچتے ہی نہیں' اپنی آخری منزل کا کسی کو کچھ فکر نہیں۔ سورۂ انعام میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ جو قومیں ہلاک ہونے والی ہوتی ہیں' انہیں

عذاب کے جھٹکے بھی لگتے ہیں تو اللہ کے حضور گڑگڑانے اور توبہ کرنے کے بجائے ان کے دل اور سخت ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نقشہ سورۂ انبیاء کی اس دوسری آیت میں ہے:

مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ○

"نہیں آتی ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے کوئی تازہ نصیحت مگر وہ اسے سننے کے باوجود کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں"۔

اللہ کا کلام تو قدیم ہے' حادث نہیں ہے لیکن چونکہ نزول کے اعتبار سے ایک آیت کے بعد دوسری آیت نازل ہو رہی تھی' اس لئے کہا گیا کہ ہر نئی نصیحت اور تذکیر جو خدا کی طرف سے آ رہی ہے وہ اس کو سنتے ہیں لیکن اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔

یہ چیزیں بارہا بیان کی جا چکی ہیں۔ ہمارے ہاں جو حالات و واقعات پیش آ رہے ہیں ان سے کتنے لوگ ہیں جو جاگے اور ہوش میں آئے ہیں؟ مشرقی پاکستان کا سقوط سب کے سامنے ہے' اس سے کس نے سبق حاصل کیا اور اس کے نتیجے میں کس کی زندگی میں تبدیلی آئی؟ کس نے اپنے بجٹ کی تخصیص (Allocation) میں کچھ تبدیلی کی ہے؟ بجٹ سے میری مُراد ہمارے مال کے علاوہ ہمارا وقت' ہماری توانائیاں' ہماری صلاحیتیں اور ہماری استعدادیں' انہی کو ہم نے خرچ کرنا ہے ـــــــ یا دنیا کے لئے' یا عقبیٰ کے لئے۔ تو ہم میں سے ہر شخص اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے کہ اے ء کے اتنے بڑے المیئے کے بعد اس نے اس کا کیا اثر قبول کیا ہے؟ اور اس کے 'Budget Allocation' کے اندر کیا فرق واقع ہوا ہے؟ میں خاص طور پر ان حضرات سے عرض کر رہا ہوں جو میرے دروسِ قرآن اور خطباتِ جمعہ میں مستقل شرکت کرتے ہیں۔ میں نے آپ سے ہمیشہ قرآن و حدیث کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ کلام پاک اور حضورؐ کے فرمودات ہی میری دو آنکھیں ہیں۔ ایسی کوئی جگہ شاید اور نہ ہو جہاں اس طریقے سے قرآن کریم کے ذریعے سے تذکیر ہو رہی ہو جیسے ہمارے ہاں ہوتی ہے۔ لیکن کتنے لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی آئی ہے؟ صورت وہی ہے: اِسْتَمَعُوْہُ وَھُمْ یَلْعَبُوْنَ"۔ سنتے تو ہیں لیکن توجہ نہیں ہے۔ ایک کان سے سنا' دوسرے سے نکال دیا۔ ایک کے بعد دوسری بڑی آیت آ رہی ہے۔ مسلسل درس میں اب ہم سورۂ مرسلات تک پہنچ چکے ہیں جس کی آخری آیت ہے: فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ "اب اس کے بعد ایسی اور کون سی بات ہے جس سے یہ لوگ ایمان لائیں گے؟" اللہ کی کتاب' اللہ کا

کلام انہیں نہیں جگا سکا اور انہیں کون جگائے گا اور کون سی بات ہے جس سے وہ ہوش میں آئیں گے اور ایمان لائیں گے۔ تو یہ بات میں آپ سے خاص طور پر ذکر کر رہا ہوں کہ سورۂ انبیاء کی ان ابتدائی دو آیات کے حوالے سے ہر شخص خود سوچے اور اپنا احتساب کرے! سورۂ سجدہ میں تو یہ الفاظ آئے ہیں:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ○

"اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو تذکیر کرائی جائے اس کے رب کی آیات کے ذریعے سے اور پھر وہ اس سے اعراض کرے؟ ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے!"

اب ہم سورۂ انبیاء ہی کے آخری رکوع کی پہلی چار آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جو آج کے موضوع سے بہت زیادہ متعلق ہیں۔ ان میں پہلے تو ایک نوید جانفزا ہے ہم میں سے ہر اُس شخص کے لئے جو سنے اور متوجہ ہو جائے اور اپنی زندگی کا رخ بدل لے۔ ارشاد ہوا:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ

"پس جو کوئی بھی نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی!"

اللہ تعالیٰ بہت ہی قدر دان ہے' قدر افزائی فرمانے والا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے محنت کرو' اس کے دین کی اقامت کے لئے توانائیاں لگاؤ اور اپنے اوقات صرف کرو۔ تمہاری یہ جدّوجہد اور سعی و کوشش رائیگاں نہیں جائے گی۔

وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ○

"اور ہم اس کے لئے (ایک ایک عمل کو) لکھتے جاتے ہیں"۔

مطمئن رہیے' اس کا ایثار' قربانی اور اس راہ میں لگایا جانے والا وقت سب کچھ لکھا جا رہا ہے۔ کہیں کوئی چیز ضائع ہونے والی نہیں ہے۔ آگے ارشاد فرمایا:

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ○

"اور یہ طے کر دیا گیا ہے کہ جس بستی کے لئے ہم نے ہلاکت ٹھہرا دی' وہ لوٹنے والے نہیں ہیں"۔

اس کا ایک مفہوم تو یہ لیا گیا ہے کہ جو قومیں ہلاک کر دی گئیں یعنی قوم ھود' قوم لوط' قوم نوح

قومِ عاد اب وہ دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتیں۔ کیونکہ جب عذابِ استیصال آجاتا ہے تو قومیں جڑ سے اکھاڑ دی جاتی ہیں۔ کسی درخت کے اگر صرف پتے جھاڑ دیئے جائیں تو وہ دوبارہ اگ آئیں گے۔ اسی طریقے سے اگر اس کی شاخیں کاٹ دی جائیں تو شاخیں بھی دوبارہ آجائیں گی۔ لیکن اگر اسے جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو اب وہ درخت وجود میں نہیں آسکتا۔ اسی طرح اللہ کی طرف سے جن قوموں پر عذابِ استیصال آجاتا ہے ' پھر ان کی حیاتِ نو یا نشأۃِ ثانیہ کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اور اس کے دوسرے معانی یہ لئے گئے ہیں کہ جو قوم اپنے انکار و اعراض اور اپنے اعمالِ بد کے نتیجے میں عذابِ الٰہی کی مستحق ہو چکی ہو ' پھر اسے خواہ کتنی ہی تذکیر و نصیحت کر لو ' وہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔

یاجوج و ماجوج کون ہیں ؟

اگلی آیت میں فرمایا:

حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَ مَاۡجُوۡجُ وَ هُمۡ مِّنۡ كُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ ○

"یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے پھسلتے چلے آئیں گے"

میں نے سورۂ کہف کے بیان میں بھی یہ بات کہی تھی کہ میں سمجھتا ہوں کہ امتِ مسلمہ پر یہ مولانا ابوالکلام آزاد کا بہت بڑا احسان ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے اپنی تفسیر کے اندر ان حقائق کی وضاحت کی ہے اور "کے خورس ذوالقرنین" کے بارے میں اور یاجوج و ماجوج کے بارے میں بڑے ہی تاریخی انکشافات کئے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی تحقیق حرفِ آخر ہے۔ جوج ماجوج (Gog Magog) اور توبال وغیرہ کا ذکر تورات میں آیا ہے کہ یہ حضرت نوحؑ کے بیٹے یافث کی اولاد ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جنہیں جدید اصطلاحات میں شمالی اقوام Nordic Races) کہا جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سے جو تین نسلیں چلی آرہی ہیں اور ان سے نوعِ انسانی کی جو قومیں وجود میں آئی ہیں ان میں سامی النسل (Sametic) حضرت سام کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت حام کے ساتھ کون سی نسلیں منسوب ہیں ' یہ تعین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے ' لیکن جہاں تک میرا گمان ہے آریائی نسل (Ariens) حضرت حام کی اولاد میں سے ہے۔ واللہ اعلم! حضرت نوحؑ کے تیسرے

بیٹے یافث وسطی ایشیا کے پہاڑی سلسلہ کو کراس کر کے شمال میں جا کر آباد ہوئے۔ ان سے یہ نارڈک اور بالٹک نیشنز ہیں جو روس' خاص طور پر منگولیا کا پورا علاقہ' شمالی ایشیا اور شمالی یورپ کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ مولانا آزاد کی تحقیق کے مطابق یہ ہیں یاجوج و ماجوج!

اس آیت مبارکہ میں ان کے کھولے جانے کا تذکرہ ہے۔ اس کی کیا صورت ہو گی؟ ان چیزوں کی حقیقت جب تک کھل کر سامنے نہیں آ جاتی اس وقت تک یہ آیاتِ متشابہات میں سے ہیں۔ اس ضمن میں ایک رائے تو یہ سامنے آئی تھی کہ مغربی اقوام کے استبداد کا جو ایک سیلاب امڈ پڑا تھا تو یہ "حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَمَاۡجُوۡجُ" کی ایک شکل ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ رائے مولانا مناظر احسن گیلانی کی بھی ہے' جن کا میں نے بارہا تذکرہ کیا ہے کہ میں ان کی عظمت کا بہت زیادہ قائل ہوں۔ وہ جامعِ معقول و منقول اور جامعِ ظاہر و باطن ہیں۔ تفسیر' حدیث' تصوّف' فلسفہ اور منطق ہر میدان میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اس طرح کی جامعیت کے حامل بہت کم لوگ ہیں۔ یہی رائے مولانا آزاد کی تھی۔ اِس وقت جو صورت سامنے آ رہی ہے اس سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یاجوج و ماجوج کے کھلنے کا وقت اب آ رہا ہے۔ ان کے کھولے جانے سے کیا مراد ہے؟ اس کے دو معانی ہو سکتے ہیں' سورۂ کہف میں ان کا تذکرہ بایں الفاظ آیا ہے: وَتَرَکۡنَا بَعۡضَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ یَّمُوۡجُ فِیۡ بَعۡضٍ ـــــ "اور اُس دن ہم انہیں چھوڑ دیں گے کہ وہ (سمندر کی موجوں کی طرح) ایک دوسرے کے اندر گتھ جائیں"۔ جیسے ایک طرف سے آنے والی لہریں دوسری طرف سے آنے والی لہروں کے ساتھ پیوست ہو جائیں۔ اِدھر سے ایک سیلاب آ رہا ہو اور اُدھر سے دوسرا سیلاب آئے اور دونوں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں۔ اس طریقے سے یہ قومیں آپس میں گتھ جائیں گی۔ یہ صورت حال "حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَمَاۡجُوۡجُ" کی عکاسی کرتی ہے۔

یہاں ہم "فُتِحَتۡ" کے یہ معانی بھی مراد لے سکتے ہیں کہ ان کے درمیان ایک بڑا ہی غیر مرئی سا پردہ ہو جس کو علیحدہ کر کے انہیں ملا دیا گیا ہو۔ اور وہ پردہ ہے طاقت کے توازن (Balance Of Power) کا! جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ اللہ نے آسمان اٹھا رکھا ہے "بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا" بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھ پاتے ہو ـــــ یعنی ستون تو ہیں' لیکن وہ تمہیں دکھائی نہیں دیتے۔ پوری کائنات کا نظام کششِ باہمی کے سہارے قائم ہے۔ آسمان بھی ایسی قوتوں کے توازن سے قائم ہے جو بظاہر نظر نہیں آتیں۔ اسی طریقے

سے یوں سمجھئے کہ بڑی طاقتوں کو قوت کے توازن (Balance Of Power) نے تصادم سے روکا ہوا ہے۔ انہیں اس کیفیت میں نصف صدی ہو گئی ہے۔ اسی لئے تو کہا جاتا تھا کہ "Arms for Peace" کہ اسلحہ چاہئے مگر امن کے لئے! اور اگر دونوں طرف برابر کا اسلحہ ہو گا تو دونوں خائف رہیں گے اور یہ اس امن کو برقرار رکھنے میں ممد ہو گا' فیصلہ کن ہو گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیر مرئی پردہ جو تھا وہ سب اٹھ رہا ہے اور "حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتۡ یَاۡجُوۡجُ وَ مَاۡجُوۡجُ" کا نقشہ سامنے آیا چاہتا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں ارشاد ہوا:

وَاقۡتَرَبَ الۡوَعۡدُ الۡحَقُّ فَاِذَا ہِیَ شَاخِصَۃٌ اَبۡصَارُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا

"اور قریب آ لگے وہ سچا وعدہ' پھر اس دم کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں"۔ ان آیات کو نازل ہوئے چودہ سو برس ہو چکے ہیں لیکن اللہ کی تقویم میں یہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہے۔ آج کوئی شخص ان آیات کو پڑھے گا تو محسوس کرے گا کہ یہ ہمارے آج کے حالات پر چسپاں ہو رہی ہیں۔ وَاقۡتَرَبَ الۡوَعۡدُ الۡحَقُّ ۔۔۔ "اور وہ وعدۂ برحق تو قریب آ پہنچا"۔ اس آیت کے بارے میں میرا احساس یہ ہے کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ ہمارے آج کل کے حالات کے مطابق آج ہی نازل ہوئی ہو' جس کا تاثر آج سے پہلے اتنا گہرا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور آج "فَاِذَا ہِیَ شَاخِصَۃٌ اَبۡصَارُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا" کا مصداق بھی ہم خود ہی ہیں۔ یہاں کفرِ قانونی کو سامنے نہ رکھیئے بلکہ کفرِ حقیقی کو سامنے رکھیئے۔ کافر وہی نہیں ہوتا جس کا نام بشن لعل ہو۔ اللہ کی آیات کا انکار کرنے والے' اللہ کی آیات سے اعراض کرنے والے' اللہ کی ناشکری کرنے والے اور اللہ کے احکامات کو اپنے پاؤں تلے روندنے والے تو ہم ہیں۔ ان معانی میں کافر کا اطلاق ہم پر بھی ہوتا ہے اور آج یہ حال ہمارا ہے کہ خوف اور دہشت سے آنکھیں پھٹ کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے ہی بھائی بند جو کویت گئے ہوئے تھے اور وہاں بڑے دینار کما کر خود بھی عیش کرتے رہے اور ہمیں بھی کرواتے رہے' آج ان کا کیا حال ہے؟ خود عالمِ عرب پر خوف و ہیبت کی کیا کیفیت طاری ہے۔ اس صورت حال میں ان آیات کو پڑھئے۔ اللہ کی آیات کے منکروں کا قول نقل ہوا ہے:

یٰوَیۡلَنَا قَدۡ کُنَّا فِیۡ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ ہٰذَا بَلۡ کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ

"ہائے ہماری کم بختی ' ہم تو اس سے غفلت ہی میں رہے ۔ بلکہ ہم ہی خطاکار تھے "۔
ہم تو اس صورت حال سے غفلت میں رہے ' عیش کرتے رہے ' گلچھرے اڑاتے رہے۔ یہی کچھ عرب امارات میں ہو رہا ہے ۔ جس طرح دولت وہاں اڑائی جاتی ہے ' جیسے عیاشیاں وہاں ہوتی ہیں ' اس کا ذرا اندازہ تو کیجئے ۔ عمارتوں کی تعمیر میں سیم و زر لٹایا جا رہا ہے ' ایک ایک گھر کے اندر چار چار چھ چھ مرسڈیز گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں ۔ تو اب ان کی جان پر جو بنی ہوگی اس کا بھی اندازہ کیجئے ۔ اب ان کی حالت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہم ہی نے حقائق سے اعراض کئے رکھا ' ہم نے خود ہی اپنے اوپر ظلم روا رکھا ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بار بار فرماتے ہیں: وَمَا ظَلَمْنَا هُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔۔۔۔۔ کہ ہم نے تو ان پر کوئی ظلم نہیں کیا ' بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ۔ اور وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۔۔ کہ میں تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں ' بندے خود ہی اپنے اعمالِ بد کی صورت میں اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

چند اہم حقائق اور پاکستان کی ذمہ داری

اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس صورت حال میں پاکستان کو کیا کرنا چاہئے ؟ اس ضمن میں پہلی بات تو میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ چند ایک حقائق جن کا تعلق ماضی قریب سے ہے اور وہ ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو چکے ہیں ان حقائق کو بڑے پیمانے پر ذہنوں میں تازہ ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ پورے عالم عرب میں جو سرحدوں کی یہ لکیریں کھینچی ہوئی ہیں یہ مسلمانوں کی اپنی کھینچی ہوئی نہیں ہیں ' بلکہ مغربی استعمار کی کھینچی ہوئی لکیریں ہیں ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد عالم عرب کے جو حصے بخرے کر دیئے گئے تھے ان کو مستقل کر دیا گیا ہے ۔ درحقیقت یہ پورا علاقہ جو عراق ' شام ' فلسطین ' اردن ' مصر ' سعودی عرب اور لیبیا پر مشتمل تھا ' یہ سب کا سب خلافت عثمانیہ کے تحت تھا ۔ اس صدی کے اندر پہلی جنگِ عظیم تک یہ خلافتِ عثمانیہ کی عظیم سلطنت تھی جس کو انگریزوں نے حصے بخرے کیا ہے ۔ کرنل لارنس نے اس کے ٹکڑے کئے ہیں ۔ اس میں عربوں نے ترکوں کے خلاف غداری کی اور ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ۔ اِدھر ہندوستان سے ہمارے فوجی بھی جا کر انگریزوں کے شانہ بشانہ لڑے اور انہیں بغداد کا قبضہ لے کر دیا ۔ ان حقائق کو ذہنوں میں تازہ ہو جانا چاہئے ۔ یہ کوئی مقدس لکیریں نہیں ہیں کہ اب واویلا مچایا

جائے کہ فلاں نے فلاں کے ساتھ کیا کر دیا اور فلاں نے فلاں کے ساتھ کیا کر دیا۔ یہ لکیریں خالص مصنوعی ہیں اور یہ ' صنعت ' بھی ہماری خانہ ساز نہیں ہے ' یہ تو بیرونی صنعت ہے ' مغربی استعمار کی قائم کردہ ہے۔ اور اگر کوئی خیر کی طرف پیش قدمی ہوگی تو ظاہربات ہے کہ عالمِ عرب کا یکجا ہونا اس کے لئے لازم ہے۔ ورنہ لڑتے رہیں گے اور دشمن ایک کو دوسرے کے خلاف استعمال کرتے رہیں گے۔ چنانچہ پہلی حقیقت تو یہ سامنے رکھئے۔

دوسری بات یہ کہ عالم عرب کی یونیفکیشن کیسے ہو؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ پورے عالمِ اسلام کی یونیفکیشن ہو' لیکن بہرحال کم از کم اتنا تو ضرور ہو۔ ان کی قریباً ایک نسل ہے اور نسلوں میں تھوڑا بہت فرق بھی ہو' جس طرح بربر نسل ہے شمالی افریقہ کی' لیکن زبان تو ایک ہی ہے' بولتے تو سب عربی ہیں۔ لہٰذا ان کو یکجا ہونا چاہئے۔ اب ان کو یکجا کرنے کے لئے ایک شخصیت کون سی ہو؟ اس عرصے میں جو شخصیتیں سامنے آئی ہیں ان میں اکثر و بیشتر سیکولر ذہن کی تھیں اور ان کا کوئی مذہبی مزاج نہ تھا سوائے ایک استثناء کے اور وہ شاہ فیصل رحمہ اللہ کی شخصیت تھی۔ سب سے پہلے جمال عبد الناصر تشریف لائے اور آپ کو معلوم ہے کہ شام اور مصر کے ادغام کا عمل شروع ہوا تھا اور ایک یونائیٹڈ عرب ری پبلک (U.A.R) قائم ہوئی تھی۔ لیکن یہ اتحاد ناکام ہوگیا اور وہ بندھن ٹوٹ گیا۔ کیونکہ ابھی اس قدر ایثار و قربانی اور ایک دوسرے کو Accomodate کرنے کی آمادگی کا مثبت جذبہ موجود نہ تھا۔ اس کے بعد قذافی صاحب ابھرے اور انہوں نے ان کی جانشینی حاصل کرنا چاہی لیکن وہ ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ درمیان میں ایک شخصیت آئی تھی شاہ فیصل مرحوم کی' لیکن اس کو جس طرح استعمار نے ہٹایا ہے وہ سامنے ہے۔ ان کا وہ بھتیجا امریکہ میں تعلیم حاصل کرکے آیا تھا اور یہودیوں کے زیر اثر تھا کہ جس نے انہیں شہید کیا۔ یہودی لڑکی کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے اس کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ یہ قتل اسی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت تھی۔ کہنے کو تو قاتل ایک شخص تھا ابولولو فیروز' لیکن اس کے پیچھے پورے ایران کی طاقت اور پوری ایرانی قوم کا انتقام کا جذبہ تھا۔ اسی طریقے سے شاہ فیصل کو ہٹادیا گیا۔ اب جو شخص سامنے آیا ہے یہ بھی خالصتاً لا مذہبی ہے 'بعث پارٹی کا صدام' لیکن یہ ایک ایسی شخصیت کی حیثیت سے ضرور ابھرا ہے کہ اب عربوں کے اندر کچھ نہ کچھ Re-alignment ہو جائے گی۔ شاید اس کے گرد کچھ نہ کچھ مجبوراً ہی آئیں۔ اور میرا

یہ سمجھ رہا ہوں کہ اردن کا معاملہ مجبوری کا ہے۔ اس کے علاوہ یمن بھی ہے۔ اور ابھی تو کچھ تیزی کے ساتھ طرف داریاں تبدیل ہوں گی۔

تیسری بات یہ کہ عالمِ عرب کے حکمرانوں کے علاوہ وہاں کے عوام کا حال بھی یہ ہے کہ اکثریت پر الحاد کا غلبہ ہے۔ سعودی عرب نے یوں تو مذہبی لبادہ اوڑھا ہوا ہے مگر اندر خالص الحاد ہے۔ سعودی عرب کی برقعہ پوش خواتین جہاز میں داخل ہوتے ہی برقعہ اتار دیتی ہیں اور اندر سے خالص مغربی لباس میں برآمد ہوتی ہیں۔ اور جب یہ جدّہ یا ریاض واپس پہنچتی ہیں تو بندرگاہ یا ایرپورٹ پر اترنے سے پہلے پھر برقعہ پہن لیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارا معاشرہ مغربی تہذیب اور سیکولرازم کے زیرِ اثر آچکا ہے۔ یہ حقائق ہیں جنہیں سامنے رکھنا چاہئے اور سطحی قسم کے جو فرق ہیں انہیں بہت زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔

چوتھی بات یہ کہ اس وقت جو اصل اندیشہ ہے وہ حرمین شریفین کو نہیں ہے۔ اصل اندیشہ امریکہ کے عالمی مفادات یا سعودی عرب کے شاہی خاندان کے مفادات کو ہے۔ اس لئے رابطہ عالم اسلامی کا بیان بھی آچکا ہے کہ امریکی فوجیں تو حرمین شریفین سے چودہ سو کلومیٹر دور ہیں۔ چنانچہ امریکی افواج کے آجانے سے ارضِ مقدس کوئی ناپاک تو نہیں ہوئی ہے۔ وہ تو اترتے بھی خلیج کے اندر مشرقی ساحل پر ہیں اور وہاں سے ان سرحدوں پر جارہے ہیں جو کویت کے ساتھ اور عراق کے ساتھ ہیں۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ امریکہ کا اپنی فوجیں وہاں اتارنے کا مقصد اپنے مفادات کا تحفّظ ہے۔ یہ وہی امریکہ ہے جس نے کشمیری مسلمانوں پر بھارت کے وحشیانہ تشدّد پر انگلی تک نہیں ہلائی ہے۔ وہاں ہزارہا کشمیری جس طریقے سے قتل کر دیئے گئے ہیں اس پر امریکہ کی پیشانی پر بل تک نہیں پڑا۔ ابھی جو ہندوستانی صحافی مجھ سے ملنے آئے تھے انہوں نے برملا کہا کہ ہندوستان اس بات پر تلا ہوا ہے کہ اگر ایک ایک کشمیری کو بھی قتل کرنا پڑے ' پوری قوم کو exterminate کر دینا پڑے تو وہ کر ڈالے گا۔ اسے کسی طرف سے کوئی اندیشہ ہی نہیں ' کوئی اسے پوچھنے والا ہی نہیں۔ اس وقت وہاں کی افواج کو مکمل اختیارات دیئے گئے ہیں کہ جیسے بھی بن پڑے ان کے جذبۂ حریت کو کچل دیا جائے۔ کسی سے کوئی جواب طلبی نہیں ہوگی ' کسی فوجی کا کوئی محاسبہ نہیں ہوگا کہ اس نے کسی کی عصمت دری کی تو کیوں کی؟ کسی کو مارا تو کیوں مارا؟ یہ ہو رہا ہے کشمیر میں اور امریکہ بہادر کو ایک انگلی تک ہلانے کی نوبت نہیں آئی۔ یہاں یہ جو چل کر اتنی دُور سے اتنی بڑی تعداد میں

آیا ہے تو کیا یہ اسلام اور حرمین شریفین کی حمایت کے لئے آیا ہے ؟ یا مسلمانوں کا ورد ہے جو اس کے پیٹ میں اٹھا ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس کے اپنے بین الاقوامی اور عالمی مفادات ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

ان تمام حقائق کو سامنے رکھ کر میں ایک بات کہہ رہا ہوں ' اسے توجہ سے سنئے ـــــ اور وہ یہ کہ ہماری افواج کو اوّل تو وہاں جانا نہیں چاہئے۔ یہ جھگڑا جس نوعیت کا ہے ' اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس سے علیحدہ رہیں۔ لیکن اگر جائیں تو اس ایک شرط کے بغیر قطعاً نہ جائیں کہ ان کو صرف حرمین شریفین کے اردگرد تعینات کیا جائے گا۔ انہیں اس عالمی سطح کے تنازعے اور اس بین الاقوامی عسکری آویزش میں ہرگز دخل نہیں دینا چاہئے۔ یہ اگر جائیں تو حرمین شریفین کے قریب ہی رہیں اور اگر حرمین کو کوئی اندیشہ لاحق ہو جائے تو ان کے تحفظ کی خاطر ان میں سے ایک ایک فرد اپنی جان نثار کرنے کو سعادت سمجھے۔ لیکن کسی پاکستانی مسلمان کا خون اتنا سستا اور بے قیمت نہیں ہے کہ اسے امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے یا سعودی شاہی خاندان کے مفادات کے تحفظ کے لئے بہایا جائے۔ یہ تو محض Passing Phenomena ہوتے ہیں۔ آج ہیں ' کل نہیں ہیں ' ع جو تھا نہیں ہے ' جو ہے نہ ہو گا ' یہی ہے اک حرفِ محرمانہ ! ہمیں غرض ہے تو صرف اسی بیت اللہ سے ' جس کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا: اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ ـــــ یا مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسلام سے ! ہمارے لئے یہ حرمین شریفین ہیں۔ ان کی عزت و آبرو ' حرمت و احترام اور عظمت و تقدس کو برقرار رکھنا اور اس کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے تیار رہنا ہر مسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس سے آگے کا معاملہ درست نہیں ہے۔

قصاص و دیت کے اسلامی قانون کی جانب پیش رفت

دوسری بات مجھے اس ترمیم کے بارے میں کہنا ہے جو پاکستان کے فوجداری قوانین میں شریعت اسلامی کے مطابق ہوئی ہے۔ یہ بظاہر بہت چھوٹا لیکن بہت بڑا قدم ہے۔ حدیث نبوی کے الفاظ ہیں: اِقَامَۃُ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنْ مَطَرِ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً ـــــ " اللہ تعالیٰ

کی حدود میں سے ایک حد کا قائم کیا جانا چالیس شبانہ روز کی بارشوں سے بہتر ہے"۔ اور یہ چالیس شبانہ روز کی بارشیں صحرا سے متعلق ہیں، جو کہ ترستا رہتا ہے ایک ایک بوند پانی کو۔ اس کے بارے میں تصور کیجئے کہ اگر وہاں اتنی بارش ہوگی تو جس طرح جل تھل ہو جائے اور سارا صحرا ہرا ہو جائے گا تو پھر بھیڑوں بکریوں کے لئے غذا فراہم ہو جائے گی اور ہر طرف آسودگی ہوگی تو ایک حد کا اجراء اور نفاذ بھی چالیس شبانہ روز کی بارشوں سے بڑھ کر برکات ظہور میں لاتا ہے۔ اس حدیث کے حوالے سے میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بہت بڑا قدم ہے، اس کو نوٹ کیا جانا چاہئے اور اسے خوش آمدید کہا جانا چاہئے۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ نیت کچھ کرنے کی ہو تو آنِ واحد میں ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی پچھلی تقریر میں جو دو جمعے قبل ۳ر اگست کو کی تھی، تفصیل سے عرض کیا تھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کی کوئی نیت نہیں ہے شریعت کی طرف بڑھنے کی۔ میرا جو اخباری بیان شائع ہوا اس میں یہ چیز دب گئی۔ یہ تو ہوتا ہی ہے کہ جو پریس ریلیز ہم بھیجتے ہیں وہ بھی مختصر ہوتا ہے، لیکن وہاں اس میں مزید قطع و برید ہوتی ہے کیونکہ ع "ولیکن قلم درکفِ دشمن است"! جو وہاں بیٹھے ہیں ان کی اپنی پسند و ناپسند ہے۔ لہٰذا ہماری پوری بات سامنے نہیں آتی۔ (میرے مذکورہ خطاب کی تلخیص جس میں شریعت بل کے بارے میں میرا موقف بھی شامل ہے، میثاق اگست کے شمارے میں چھپ چکی ہے۔ ہر وہ شخص جس کو میرے اس کام سے اور اس ملک میں اسلام کے مستقبل سے دلچسپی ہے تو وہ ضرور اس کا مطالعہ کرے۔) تو یہ ثابت ہو گیا کہ اگر واقعتاً کچھ کرنا ہو تو آنِ واحد میں ہو سکتا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے رات صدر اسحٰق خاں کو جگا کر ان سے دستخط کرائے گئے کہ کہیں تاریخ نہ نکل جائے۔ میں مبارک باد دیتا ہوں ہمارے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس صاحب کو کہ انہوں نے جس طریقے سے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا ہے۔ ورنہ پیپلز پارٹی کی مرکزی حکومت نے ان کے لئے جو صورت حال پیدا کر دی تھی کہ کیا کروں، کوئی صورت میرے پاس نہیں ہے، تقی عثمانی صاحب کراچی میں ہیں، فلاں صاحب وہاں ہیں، میں تا حکم ثانی ان کو مہلت دے رہا ہوں ...... اس سے ہمیں بڑا سخت اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ جو میں نے پچھلی دفعہ بڑی تفصیل سے عرض کیا۔ لیکن الحمدللہ اس کے بعد یہ معاملہ ہوا ہے کہ انہوں نے ایک محکم فیصلہ (Firm Decision) کیا ہے اور اس فیصلے کے نتیجے میں ہمارے فوج داری نظام میں کوئی خلا بھی پیدا نہیں ہوا اور اس سے دو بڑی بنیادی تبدیلیاں آگئی

ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک!

ایک اہم تبدیلی تو اس معاملے میں آئی ہے جو خالص خلافِ اسلام تھا اور یوں بھی ہر عقل و منطق کی رُو سے بھی غلط تھا کہ اگر قتل کے مقدمے میں عدالت کسی شخص کو پھانسی کی سزا دے رہی ہے اور سپریم کورٹ تک وہ سزا برقرار رہتی ہے تو صدرِ مملکت کو پھر بھی یہ حق حاصل تھا کہ اسے معاف کر دیں۔ یہ آخر ہوتے کون ہیں معاف کرنے والے؟ ان کو یہ اختیار کہاں سے مل گیا؟ یہ دراصل استعماری دَور کے اختیارات ہیں جو انگریزوں نے اپنا خوف اور دبدبہ قائم رکھنے کے لئے اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ یہ خالص خلافِ اسلام' خلافِ عقل اور خلافِ منطق قانون تینتالیس برس گزرنے کے باوجود ابھی تک جاری تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ بات وہاں سے نکال دی گئی ہے۔ اسلامی قانون میں معافی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ یہ حق مقتول کے ورثاء کو حاصل ہے' وہ چاہیں تو قاتل کو معاف کر دیں' چاہیں تو دِیَت یعنی خوں بہا لے لیں' ورنہ قصاص میں اس کی گردن اڑا دی جائے۔ اسلام کا یہ قصاص دیت کا قانون بے شمار برکتوں کا حامل ہے۔ ہمارے ہاں یہ جو قتل در قتل اور انتقام در انتقام کا سلسلہ چلتا ہے اس کو روکنے کا یہی ایک راستہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو قاتل کی جان پر اختیار دے دیا جائے۔ اب اگر وہ احسان کرتے ہوئے اسے معاف کر دیتے ہیں تو اس سے قبیلوں کی سو سالہ پرانی رنجشیں بھی دھل جائیں گی۔ اور اگر وہ دیت قبول کر لیں تو اس سے مقتول کے ورثاء کا جو دنیوی لحاظ سے نقصان ہوا ہے کہ ایک کمانے والا فرد ان کے ہاں سے جاتا رہا' کم از کم اس کی تلافی ہو جائے گی۔ اور اگر قصاص میں قاتل کی گردن اڑا دی جائے تو یہ سوسائٹی میں بہت سوں کے لئے باعثِ عبرت ہو گا! یہ ہے اسلام کا قانون۔ الحمد للہ کہ ملکی قانون میں اس کے مطابق تبدیلی ہوئی ہے۔

نفاذِ اسلام کے بارے میں ہمارا موقف

اس سلسلے میں میرا جو موقف ہمیشہ رہا ہے' اس اقدام سے اس کی گویا توثیق ہوئی ہے اور وہ موقف صحیح ثابت ہوا ہے۔ اس ضمن میں مَیں چند باتیں گِنوانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی ۱۴ اگست کی تقریر میں بھی اس بات کا اعادہ کیا تھا کہ اس ملک کا سارا دارومدار اسلام پر ہے' اسلام ہی اس کی منزل ہے۔ اگر یہاں اسلام نہیں آئے گا تو یہ ملک نہیں رہے گا۔ پھر اسے رہنے کا حق

حاصل نہیں' اس کا جواز نہیں۔ میری یہ دوسری بات بہت سوں کو بری لگے گی لیکن مجھے اس پر اصرار ہے۔ اس کی واحد وجہ جواز اسلام ہی ہے اور اس کی منزل اسلام ہے۔ یا تو یہ اسلام کی جانب بڑھے گا یا پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا' ختم ہو جائے گا۔ اور اگر اسلام کی طرف بڑھے گا تو یہاں وہ لوگ نہیں رہ سکتے جو اسلام کا مذاق اڑائیں۔ یہ میں نے ۳ر اگست کی تقریر میں کہا تھا اور ۶ر اگست کو بے نظیر حکومت کی معزولی کا معاملہ ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی بارہا میں نے کہا کہ اگر یہ ملک رہے گا تو اسلام کے حوالے سے رہے گا اور اُن لوگوں کا یہاں کوئی مستقبل نہیں جو اسلام کا مذاق اڑانے والے ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہماری اب تک کی شکایت یہ ہے کہ یہاں اسلام کی جانب جو پیش قدمی ہو رہی ہے اس کی رفتار بہت سست ہے۔ پیش قدمی یقیناً ہوئی ہے۔ قرار داد مقاصد ایک بڑی پیش قدمی تھی۔ اور اس دفعہ کا دستور میں آ جانا' چاہے وہ رہنما اصولوں میں ہی تھی:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah"

یقیناً ایک مثبت پیش رفت تھی۔ اور پھر یہ کہ اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام بھی اس سلسلے کی ایک قابلِ لحاظ پیش قدمی ہے۔ اور میں عرض کر دوں کہ قصاص و دیت کے قانون کی یکدم تبدیلی اسی لئے ممکن ہو سکی کہ اس کے لئے سارا ہوم ورک ہو چکا تھا۔ اسلامی نظریاتی کونسل جس میں شیعہ' سنی' دیوبندی' بریلوی' اہل حدیث' تمام فرقوں کے نمائندے موجود ہیں، اس نے متعدد قوانین پر بہت سارا کام کیا ہوا ہے۔ صرف تنفیذ کا فیصلہ کرنے کی دیر ہے۔ یہ مغالطہ ہے کہ کیسے ہو گا؟ کس طرح ہو گا؟ اسلامی قانون کی تدوین کیسے ہو گی؟ سارا کام کیا ہوا موجود ہے' فائلوں کے انبار لگے ہوئے ہیں' مگر نافذ کرنے کا اختیار اس کے پاس نہیں ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کے علاوہ صدر ضیاء الحق صاحب نے مزید پیش قدمی یہ کی کہ انہوں نے قراردادِ مقاصد کو دستور کا حصہ بنایا جو اس سے پہلے صرف 'Preamble' تھا' پھر یہ کہ شرعی عدالتیں قائم کر دیں' اگرچہ ان کے ہاتھ باندھ دیئے ------ اور ہم تو ان سے لڑتے رہے اور اب بھی لڑتے رہیں گے کہ تم ہاتھ کیوں باندھتے ہو؟ لیکن بہرحال یہ ایک پیش قدمی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق صاحب نے اپنے آخری ایام میں جو شریعت آرڈیننس نافذ کیا میں نے اس کو خوش آمدید کہا کہ چلئے ایک قدم تو بات آگے بڑھی ہے' کم از

کہ عائلی قوانین تو شرعی عدالت کے دائرے میں آ گئے۔

شریعت بل اور اسلام سے متصادم ترمیمات

اس پہلو سے ہمارا موقف واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے۔ اس کے بارے میں بھی لوگوں کو کچھ مغالطے ہو گئے ہیں کہ میں نے سینٹ میں منظور ہونے والے شریعت بل کی مخالفت کی تھی۔ میں نے اس بل کی مخالفت اس لئے کی تھی کہ وہاں بیٹھے ہوئے علماء اور مذہبی جماعتوں کے نمائندوں نے بھی اس بل پر دستخط کئے جس میں شریعت کے ایک بہت اہم حکم کو ساقط کر دیا گیا۔ یہ وہ بل نہیں ہے جس کی منظوری کے لئے ہم نے متحدہ شریعت محاذ میں شامل ہو کر جدّوجہد کی تھی۔ اس میں بہت سی ترمیمات کی گئی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس ملک کے اندر اگر کبھی سُود کا خاتمہ کیا جائے گا تب بھی سابقہ معاہدوں پر سود حسب سابق ادا کیا جاتا رہے گا۔ یہ بات شریعت اسلامی سے متصادم ہے' قرآن کے واضح الفاظ کے خلاف ہے کہ "وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا" یعنی جو بھی سود باقی ہے اس کو چھوڑنا ہو گا! ہمیں یہ اختلاف ہے۔ ورنہ اس سے جو بھی مثبت پیش قدمی ہو اسے ہم خوش آمدید کہیں گے۔ یہی بات میں نے اپنی گزشتہ تقریر میں کہی تھی جس کا خلاصہ شائع شدہ موجود ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہمیں یہ پسند نہیں ہے۔

ہم تو کہتے ہیں کہ یہ بل اگر آتا ہے تو اس میں اسلام کی طرف جو بھی پیش قدمی ہوتی ہے اسے ہم خوش آمدید کہیں گے لیکن خود مذہبی لوگوں کا اور علماء کا اس بات میں فریق بن جانا کہ شریعت کے اس حکم کو ساقط رکھا جائے گا' اس پر ہمیں اعتراض ہے۔ اور یہی درحقیقت میری اس دوسری مستقل پالیسی کے لئے ایک دلیل ہے کہ آپ جب اس پراسیس میں خود شریک ہو جاتے ہیں تو اس دوغلے پن میں بھی آپ کو فریق بننا پڑتا ہے۔ آپ باہر رہئے' مطالعہ کرتے رہئے اور جو بھی پیش رفت ہو اسے Welcome کیجئے! لیکن یہ جو طرز عمل ہے کہ دین کے ایک حصے کو ماننا اور ایک حصے کا انکار کرنا' اس طرز عمل میں فریق مت بنئے! یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے لئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اسمبلیوں میں نہیں جائیں گے اور اس طرز عمل میں فریق نہیں بنیں گے۔ مگر وہاں سے ایک ایک قدم کر کے بھی جو پیش رفت اسلام کی طرف ہو گی اسے Welcome کریں گے اور باقی کی بات کرتے رہیں گے۔

اس لئے کہ ہمیں مکمل دین چاہئے' ادھورا دین نہیں چاہئے۔ ادھورے دین پر تو اللہ کا غضب بھڑکتا ہے۔۔۔ چنانچہ ہم نے صدر ضیاء الحق کے آرڈیننس کو بھی خوش آمدید کہا تھا اور اب ہم اس مطالبے کی بھی تائید کر رہے ہیں کہ یہ جو شریعت بل یا نفاذِ شریعت ایکٹ ہے اسے صدر غلام اسحاق صاحب آرڈیننس کی شکل میں نافذ کریں۔ کیونکہ اب اسمبلیوں کا معاملہ تو ختم ہوا۔ اب یہ نافذ ہوگا تو آرڈیننس کے ذریعے سے ہی ہوگا۔ اس کے بارے میں صدر صاحب نے اس سے پہلے بھی کہا تھا کہ اگر یہ خلاف دستور تھا تو اسے سینٹ نے کیسے پاس کر دیا؟ یہ بہت بڑی بات ہے' اور اسے اسلام کے ساتھ وابستگی کی دلیل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے ایمان اور اسلام کے ساتھ وفاداری کا امتحان تو اب ہے۔ لہٰذا وہ اس کو نافذ کریں' چاہے چار مہینے کے بعد کوئی نئی اسمبلیاں آئیں یا اور کچھ بھی ہو جائے' لیکن یہ تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ کتنے مخلص ہیں اسلام کے ساتھ !!

صدرِ مملکت کا حالیہ اقدام اور حکومت کی تبدیلی

اب آخری بات عرض کر رہا ہوں جس کے لئے آپ حضرات شاید ذہناً بہت زیادہ تیار ہو کر آئے ہوں۔ یعنی حکومت کی جو تبدیلی ہوئی ہے اس کے بارے میں چند باتیں عرض کروں گا۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ کہ میں نے یہ کہاوت بارہا کہی ہے کہ ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ "گاؤ آمد و خر رفت" یا "گاؤ رفت و خر آمد"۔ اور ہمیں اس سے اس لئے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ ہم ان سب کو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک ہی مزاج' ایک ہی تہذیب' ایک ہی تمدن' ایک سا رہن سہن اور دین کے ساتھ ان کی روش بالکل ایک جیسی ہے۔ میرے نزدیک عابدہ حسین اور بے نظیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عابدہ حسین کو بھی اب بہت بڑی وزارت دی گئی ہے۔ اب چاہئے کہ ذرا وہ لوگ میدان میں آئیں جو اس سے پہلے بے نظیر کے خلاف بہت ہی زیادہ دینی حمیت کا مظاہرہ فرما رہے تھے۔ اب اس حمیت کا کم از کم نصف مظاہرہ تو انہیں کرنا چاہئے۔ ہم تو ان سب کے خلاف ہیں' لہٰذا ہمارے لئے تو یہ کوئی دلچسپی کی بات نہیں۔

دوسری بات یہ کہ دیکھئے' میں نے بارہا کہا ہے کہ خدا کے لئے اس ملک کے لئے سوچ

سمجھئے' وقتی طور پر کون ہے اور کون نہیں ہے' یہ تو خالص وقتی اور عارضی سا معاملہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنی انہی تقاریر میں بارہا یہ شعر پڑھا ہے ؎

جو تھا نہیں ہے ' جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ !

صدر ایوب صاحب بھی بہت بڑی شے تھے 'اب نہیں ہیں' ختم ہو گئے۔ بھٹو صاحب تھے 'انہوں نے ایک وقت میں یہ کہا تھا کہ میری کرسی بڑی مضبوط ہے ۔۔۔ اور پھر وہ کرسی بھی نہیں رہی اور وہ خود بھی نہیں رہے۔ اسی طرح میں نے کہا تھا کہ بھٹو خواتین بھی اس ملک کی سیاست میں 'Passing Phenomenon' ہیں۔ یہ آج ہیں' کل نہیں ہوں گی۔ آپ ان کے حوالے سے بات نہ سوچیں' بلکہ جو ملک کے لئے اصل بات سوچنے کی ہے اس کے حوالے سے بات سوچا کریں' لیکن میری ان باتوں سے یہ سمجھا گیا کہ میں شاید ان کی تائید کر رہا ہوں۔ یہ تو سمجھنے والوں کو اختیار ہے' جو چاہے سمجھیں۔ میں تو جو بات صحیح سمجھتا ہوں وہی ہمیشہ سے کہتا آ رہا ہوں۔ اسی طریقے سے میں نے یہ کہا تھا اور یہ تو ابھی چودہ دن پہلے کی بات ہے کہ ایک ہے شریعت پر عمل نہ کرنا' یہ فسق اور فجور ہے۔ اور ایک ہے شریعت کا استہزاء' یہ کفر ہے ۔۔۔ اور یہ وہ شے ہے کہ جو کوئی بھی یہ حرکت کرے گا' وہ نہیں رہے گا۔ اس سے پہلے میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ یہ حکومت دو سال تک بمشکل چلے گی اور اس نے تو دو سال بھی پورے نہیں کئے اور میں یہ ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ اب اس ملک میں پیپلز پارٹی مطلق اکثریت (Absolute Majority) میں نہیں آ سکتی' لیکن واحد اکثریتی گروپ (Single largest group) اسی کا ہوگا اور وہی ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میرا مستقل فلسفہ ذہنوں میں تازہ کر لیجئے جس کی اب مرزا اسلم بیگ صاحب کے اس بیان سے بھی تائید ہوئی ہے کہ "اگر میرے بس میں ہو تو ہر چھ ماہ کے بعد الیکشن کرا دوں" تو واقعہ یہ ہے کہ میں نے کہا تھا کہ ایک تیز تسلسل (Rapid Sequence) میں تین چار انتخابات کا ہو جانا اس ملک کے اندر سے سیاسی گند دھونے کا ایک بڑا ذریعہ ہوگا اور "گند" ہی کا لفظ انہوں نے بھی استعمال کیا ہے۔ تو یہ ہے اس وقت کے مسئلہ کے متعلق میرا ردِ عمل!!

پاکستان کے "والدین" اور ان کے حقوق

البتہ پاکستان کے بقا و استحکام کے حوالے سے اور اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے حوالے سے میں ہمیشہ دو باتیں عرض کرتا رہا ہوں۔ میں نے ابھی حال ہی میں کراچی میں ایک

تقریر کی تو وہاں میں نے تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا کہ ہر انسان کے دو والدین ہوتے ہیں
ـــــــــ ایک والد اور ایک والدہ۔ (حضرت مسیح کی ولادت ایک استثناء ہے کیونکہ وہ تو سرا
معجزہ تھے) ۔ پھر دیکھئے' تخلیق کے عمل میں اگرچہ والد کا حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے' اس کی
طرف سے تو ایک خلیہ (Cell) آتا ہے' اور باقی سارا جسم تو رحم مادر میں بنتا ہے۔ اسی کا خون
اور اسی کی توانائیاں ہیں جن کو وہ علقہ کی سٹیج پر بھی جونک کی طرح چوس رہا ہوتا ہے اور اس
کے بعد بھی سب کچھ وہیں سے حاصل کرتا ہے' لیکن اولاد باپ ہی کی شمار ہوتی ہے۔ خو
قرآن میں فرمایا گیا: اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَاۗىِٕهِمْ ـــــــــ کہ انہیں ان کے باپوں کی طرف منسوب کر
کے پکارا کرو! اب اس تصویر اور اس تشبیہ کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ پاکستان کا باپ تو اسلام ہے
یہ تو میں نے 'استحکامِ پاکستان' نامی کتاب میں بھی حضرت سلمان فارسیؓ کے حوالے سے
لکھا ہے کہ ان سے جب پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا نام کیا ہے' تو کہتے تھے: "سلمان!"۔ عربوں کی
روایت ہے کہ جب تک باپ کا نام نہ آئے نام پورا نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ پوچھا جاتا: "سلمان
ابن ..... ؟"۔ وہ جواب دیتے: "سلمان بن اسلام!" یعنی میری ولدیت اسلام ہے۔ کیا کرو
گے میرے والد کے بارے میں پوچھ کر؟ اسی طرح پاکستان واحد ملک ہے اس کرۂ ارضی پر جس
کی ولدیت اسلام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ دوسری بات بھی نوٹ کر لیجئے کہ اس کی ماں
جمہوریت ہے' یہ پلا بڑھا ہے جمہوریت کے رحم مادر میں ـــــــــ وہی جمہوریت جو آپ
کو انگریز نے دی تھی۔ اس کا پورا جسم وہیں سے بنا ہے۔ کسی محمد بن قاسم نے' کسی غوری نے
دوبارہ آ کر اس ملک کو فتح نہیں کیا۔ یہ تو ووٹ کے ذریعے قائم ہوا ہے۔ اسی ووٹ کی بدولت
مسلم لیگ اسلامیانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت قرار پائی اور اسی جمہوری عمل کے بطن سے
اس ملک کی ولادت ہوئی ہے۔ ہم نے اسلام اور جمہوریت دونوں کے ساتھ غداری کی جس
کی وجہ سے یہ روز بد دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا دونوں کے بارے میں ہمیں اپنی کوتاہیوں کی تلافی
کرنا پڑے گی۔ اس ضمن میں میں آپ سے چند باتیں عرض کرنا چاہوں گا:

پہلی بات یہ کہ اسلام کے نفاذ کو آپ صرف نظامِ عبادات یا صرف حدود و تعزیرات سے
نفاذ کے متعلق نہ سمجھئے۔ یہ اسلام کا بڑا ناقص اور نامکمل مطالعہ ہو گا۔ اسلام کے نفاذ کا مطلب
ہے 'اسلام کا نظام عدلِ اجتماعی' قائم کیا جائے۔ اسلام نے جو حقوق انسانوں کو دیئے ہیں ا
حقوق انہیں دیئے جائیں۔ اسلام نے جو معاشی عدل کا نظام دیا ہے وہ قائم کیا جائے۔ جس اور

' '

بیچ کا خاتمہ اسلام چاہتا ہے وہ اونچ نیچ ختم کی جائے۔ جو حریت و آزادی اسلام نے دی ہے وہ آزادی دی جائے۔ جس طرح قائد اعظم نے کہا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ حریّت و اخوت و مساوات کے اسلامی اصولوں پر دنیا کے اندر پاکستان کی صورت میں ایک نمونہ پیش کر سکیں۔ یہ ہے اہمیت والی شے۔ یہ جان لیجئے کہ یہ جو تھوڑی بہت پیش قدمی ہو رہی ہے اس پارلیمانی پراسیس کے تحت ــــ بہت ہی سست رفتاری کے ساتھ' اس کے بارے میں تو ہمارا شکوہ یہ ہے کہ ع

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک!

تمہارا یہ پراسیس کہیں صدیوں کے اندر جا کر مکمل ہو گا۔ اُس وقت تک پاکستان رہے گا کہ نہیں رہے گا! اس کے لئے تو اصل میں جو شے درکار ہے وہ انقلاب ہے۔ ہم نے اپنی تنظیم اسی انقلابی جدوجہد کے لئے قائم کی ہے۔ تو یہ ہے دو جملوں کے اندر ہمارا پورا موقف کہ اسلام کے نفاذ سے مراد صرف نظامِ عبادات نہیں ہے' اگرچہ وہ بھی اس کا لازمی حصہ ہے۔ اسی طرح اس سے مراد صرف حدود و تعزیرات بھی نہیں' اگرچہ وہ بھی اس کا جزوِ لازم ہیں۔ اس کے لئے میں نے حدیث آپ کو سنا دی ہے کہ ایک حد کا اجراء بھی چالیس دن رات کی بارش سے زیادہ بابرکت ہے۔ لیکن اس کا اصل ہدف اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی (System of Social Justice as given by Islam) ہے!۔ اور اس کی تنفیذ صرف اور صرف انقلاب کے راستے سے ہو گی!!

دوسری بات یہ کہ اب سوال ابھرتا ہے کہ اسلامی انقلاب برپا ہونے تک سیاسی عمل کیسے آگے بڑھایا جائے؟ اس کے ضمن میں ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ خدا کے لئے مسلم لیگ کو مضبوط اور مستحکم کرو' فوری چیزیں نہ دیکھو' کوتاہ بینی نہیں ہونی چاہئے' دور کی سوچو! یہ بھٹو خواتین اور یہ پیپلز پارٹی کا معاملہ تو آیا گیا ہو جائے گا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ اگر آپ کو یہاں مستحکم جمہوریت لے کر چلنی ہے تو اس کے لئے دو پارٹیوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میں نے سیاسی جماعتوں کو جو مشورے دیئے تھے آج پھر انہیں ذہنوں میں تازہ کر لیجئے۔ میں نے کہا تھا کہ جو جماعتیں سمجھتی ہیں کہ وہ یہاں انتخابی عمل کے ذریعے سے ہی اسلام لا سکتی ہیں انہیں مسلم لیگ میں مدغم ہو جانا چاہئے ــــ تاکہ ایک طاقت ہو' ایک جماعت ہو' ایک ڈسپلن ہو' ایک ہی پارلیمانی بورڈ ہو جو فیصلہ کرے کہ کس کو ٹکٹ دینے ہیں' کس کو

نہیں دینے۔ ورنہ آخری وقت میں جوتیوں میں دال بٹ کر رہے گی۔ وہ آئی جے آئی ہو یا کوئی اور ہو' بڑے بڑے پختہ محاذ جو ہیں وہ ٹوٹ جائیں گے' ختم ہو کر رہ جائیں گے' جب تک کہ مسلم لیگ کو ان معنوں میں مستحکم نہ کیا جائے۔ اور وہ مذہبی عناصر بھی جو اس راستے سے امید رکھتے ہیں کہ اسلام یہاں آ جائے گا' انہیں مسلم لیگ میں مدغم ہو جانا چاہئے۔

مذہبی جماعتوں کے بارے میں میرا جو موقف رہا ہے آج میں اس میں کچھ ترمیم کر رہا ہوں۔ مذہبی جماعتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں یکجا ہو جانا چاہئے۔ میں اس وقت یہ عرض کروں گا کہ اول تو یہ ناممکن ہے۔ امکان یہی ہے کہ ان میں سے ایک اگر مشرق میں جائے گی تو دوسری مغرب میں اور تیسری جنوب میں جائے گی۔ اور جو بھی بڑی سیاسی قوتیں جو وڈیروں اور سرمایہ داروں پر مشتمل ہیں' یہ انہی کا ضمیمہ بنیں گی۔ اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو' لیکن نظر تو یہی آتا ہے۔ لیکن اگر تمام جماعتیں جمع بھی ہو جائیں' جمعیت علمائے اسلام' جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اسلامی متحد ہو جائیں تب بھی واقعہ یہ ہے کہ سیکولر قوتوں کو فائدہ حاصل ہو گا کہ مسلم لیگ اور ان اسلام پسند جماعتوں کے درمیان ووٹ تقسیم ہو جائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ اب بھی ہوش میں آ جائیں اور متحدہ محاذ آرائی اور آئی جے آئی وغیرہ کا خناس ذہن سے نکال کر مسلم لیگ کو مضبوط بنائیں۔ وہ عناصر اس کے اندر شامل ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ الیکشن کے راستے سے یہاں اسلام آ سکتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ جمہوریت اور دستوریت اس ملک میں لفظ اور روح دونوں اعتبار سے جاری رہنی چاہئے۔ اس ملک میں جمہوریت بھی ہو اور اس کے ساتھ دستور و قانون کی پابندی بھی۔ اور ان پر صرف لفظ کی حد تک (To the letter) نہیں' بلکہ اس کی روح کے اعتبار سے (To the spirit) عمل پیرا ہونا ضروری ہے' ورنہ یہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے میں چند باتیں مزید عرض کر رہا ہوں۔

(۱) صدر اسحق خاں نے ۶/ اگست کو جو قدم اٹھایا ہے وہ اگر دستور کے خلاف ہے تو عدالت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ پیپلز پارٹی عدالت میں گئی بھی ہے اور اسے جانا بھی چاہئے۔ وہ پوری قوت کے ساتھ جائے۔ میں اس کو زیر بحث نہیں لانا چاہتا۔

(۲) صدر صاحب نے جو طویل فرد جرم اپنی ایک گھنٹے کی تقریر میں عائد کی ہے اس طویل فرد جرم کا اگر ۱۰% بھی صحیح ہے تو بھی اسمبلیوں کا توڑا جانا بالکل جائز ہے۔ جو جرائم بیان

کئے گئے ہیں اور جو الزامات عائد کئے گئے ہیں جو واقعتاً اتنے بھیانک اور سنگین ہیں کہ ان کا دسواں حصہ درست ہونے کی صورت میں بھی صدر صاحب کا اقدام جائز ہے۔ لیکن اگر وہ سب کے سب درست ہیں تو پھر صدر اسحٰق صاحب خود مجرم قرار پاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی آئینی ذمہ داری پوری کرنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟ وہ گویا کہ اس پورے کھیل میں خاموش تماشائی بنے رہے ہیں اور اس طریقے سے اعانتِ جرم (Abetment) کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہوں نے اگر اتنا انتظار اور صبر کیا ہے تو غلط کیا ہے۔

(۳) البتہ انہوں نے جو عبوری حکومت تشکیل دی ہے وہ جمہوریت اور دستور کی روح کے قطعاً منافی ہے اور خالص انتقامی معاملہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروپ کو ٹارگٹ بنایا گیا ہے اور اس کے دشمنوں کو جمع کر لیا گیا ہے۔ یہ چیز اس ملک کے لئے اچھی نہیں ہے۔ اس میں ان کی جانبداری بالکل ثابت ہو گئی ہے اور یہ چیز یہاں سے جمہوریت کا جنازہ نکال دے گی۔ آپ چاہے لفظی طور پر قانون کے تقاضے پورے کر لیں لیکن اس طرح اس کی روح ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے میرے نزدیک صدر صاحب اگر اب بھی اس کی تلافی کریں تو ان نگران حکومتوں کو ختم کر کے یا تو ریٹائرڈ جج صاحبان کو لے آئیں۔ ان کے بارے میں قوم کو اعتماد ہو گا کہ وہ غیر جانبدار ہوں گے۔ یا پھر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے سپیکرز کو لے آئیں' کیونکہ اگلی اسمبلیاں قائم ہونے اور ان کے سپیکرز کا انتخاب ہونے تک موجودہ سپیکرز کے عہدے برقرار ہیں۔ صدر صاحب اب بھی اگر اس کے اندر اصلاح کر لیں تو بہتر ہے' ورنہ صرف ایک گروپ کے دشمنوں کو جمع کر دینا' جیسا کہ خود نگران وزیر اعظم نے کہا ہے کہ ہم پیپلز پارٹی کے تمام دشمنوں کو جمع کر لیں گے' یہ کوئی مثبت طریق کار تو نہیں ہے۔ یہ تو درحقیقت "حُبِّ علیؓ" نہیں "بغضِ معاویہؓ" ہے۔ حُبِّ علیؓ کی بنا پر قدم اٹھایئے تو وہ مثبت ہو گا اور قوم و ملک کے لئے مفید ہو گا لیکن اگر "بغضِ معاویہ" کی بنیاد پر کوئی اتحاد وجود میں آیا تو خیر کے لئے کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکتی۔

(۴) اگلی بات عرض کر رہا ہوں کہ انتخابات کسی صورت ملتوی نہیں ہونے چاہئیں۔ یہاں تک کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ اگر خدانخواستہ سرحدوں پر حالات بہت ہی زیادہ مخدوش ہو جائیں تب بھی ملتوی نہیں ہونے چاہئیں۔ اپنے سامنے ایران کی مثال رکھئے کہ عراق کے ساتھ جنگ جاری تھی مگر الیکشن ہوئے لہٰذا الیکشن کا معاملہ کسی بھی صورت میں

ملتوی نہیں ہونا چاہیے۔

(۵) احتساب کے بہانے سے کسی گروپ کو یا کسی نمایاں شخصیت کو الیکشن میں حصہ لینے سے روکا نہ جائے۔ یہ بات سارے اعتبار کو ختم کر کے رکھ دے گی۔ اس سے جمہوریت کی روح ختم ہو جائے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ اب بھی جو مینڈیٹ ہوگا وہ منقسم ہوگا۔ اب بھی جو حکومت آئے گی وہ مستحکم نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ پیپلز پارٹی پنجاب میں پہلے سے اور زیادہ کمزور ہوگی۔ سندھ میں بھی وہ پہلے والی صورت اب نہیں ہوگی۔ اس کے بارے میں غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب نے جو بات کہی ہے یقیناً صحیح ہے کہ اب الیکشن کے رزلٹ بالکل وہی نہیں ہوں گے۔ اب وہاں سے جتوئی صاحب وزیر اعظم ہیں اور جام صادق صاحب کی وہاں صوبائی حکومت ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ نگران حکومت میں جس کو بھی لیا گیا ہے پیپلز پارٹی یا چند لوگوں کی دشمنی کی بنیاد پر لیا گیا ہے۔ تو یہ چیزیں ہمارے معاشرے میں مؤثر تو ہوں گی۔ لیکن میں پھر بھی یہ سمجھتا ہوں کہ پیپلز پارٹی کم از کم سندھ سے واحد اکثریتی جماعت ہوگی۔ اگر وہ حکومت نہ بنا سکی تو کسی دوسری حکومت کو چلنے بھی نہیں دے گی۔ جو کچھ معاملہ پہلے ہوتا رہا ہے وہی کچھ ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اگلی حکومت شاید ایک سال بھی نہ نکال پائے اور پھر الیکشن ہو جائیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ وہ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ہماری مسلح افواج کے سربراہ کی بات صحیح ہے کہ بار بار الیکشن ہو جانے سے یہ گند دھلے گا۔ لیکن الیکشن وہ ہونا چاہیے جو واضح طور پر آزادانہ اور منصفانہ ہو۔ پچھلے الیکشن کے بارے میں اگرچہ بے نظیر نے کہا تھا کہ پنجاب میں نواز شریف صاحب کی حکومت کی وجہ سے دھاندلی ہوئی ہے' لیکن باقی پوری دنیا نے مانا کہ یہ الیکشن غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تھا۔ تو جب تک یہ بات نہ ہوگی کہ دنیا اسے قابلِ اعتبار تسلیم کرے' اس وقت تک ہم الیکشن کے ذریعے وہ مطلوبہ خیر حاصل نہیں کر سکتے جس سے ملکی حالات اور ملک کے مستقبل کو مخدوش بنانے سے روکا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے یہ چند باتیں عرض کر دی ہیں۔ جو مشورے ضروری سمجھے ہیں نصح و خیر خواہی کے جذبے سے پیش کر دیئے ہیں۔ میں نے ہمیشہ جس بات کو صحیح سمجھا ہے اسے علیٰ رؤس الاشہاد کہا ہے۔ ڈیڑھ سال قبل میں نے نواز شریف صاحب کو وزارتِ اعلیٰ سے مستعفی ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ آج بھی تو گھر بیٹھے

ہوئے ہیں۔ اگر اس وقت استعفا دیتے اور مسلم لیگ کو منظم اور مستحکم کرتے تو آج مسلم لیگ کی صورت حال مختلف ہوتی۔ ان کی پرعزم جواں شخصیت میں محنت و صلاحیت کا مادہ تھا جو وقت نے ثابت کیا ہے۔ اسی کے حوالے سے ان سے کہا تھا کہ حکومت سے باہر آ جائیں۔

اور آپ کو معلوم ہے کہ جونیجو صاحب اور پیر پگاڑا صاحب کے ساتھ ان کی کشمکش اسی بنا پر چلتی رہی، مسلم لیگ ٹکڑوں میں بٹ رہی اور ابھی تک بٹ ہوئی ہے کیونکہ وہ یہی کہہ رہے تھے کہ یا تو چیف منسٹر ہو' یا پنجاب مسلم لیگ کے صدر رہو۔ دونوں میں سے ایک عہدہ چھوڑ دو۔ اور یہ بات معقول تھی' بہت صحیح تھی۔ اگر وہ وقت لگایا ہوتا مسلم لیگ کو مستحکم کرنے میں تو اِس وقت بہت ہی پر امید صورت حال ہمارے سامنے ہوتی' ایک بہت روشن مستقبل ہمارے سامنے ہوتا۔ بہرحال جو گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں! وہ وقت تو خیر سے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اب بھی میں نے جو مشورے دیئے ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ لوگوں کو توفیق دے کہ وہ وقتی' فوری' گروہی اور جماعتی مصلحتوں اور مفادات سے بالاتر ہو کر میری بات پر غور کر سکیں۔ میں خود اس میدان کا کھلاڑی نہیں ہوں' کسی کا سیاسی حریف نہیں ہوں' کسی کا ساتھی نہیں ' کسی کا دشمن نہیں۔ ملک اور اسلام کے حوالے سے جو بات صحیح نظر آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں اور جو بات سامنے نظر آتی ہے اس کو بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات ○○


پیلو کی بازیافت
مِسواک سے
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تک
پیلو کے مؤثر اور مجرب اجزا پر مشتمل ایک مکمل طبی ٹوتھ پیسٹ پیش کرکے ہمدرد نے
حفظِ دنداں کی دنیا میں بھی اوّلیت حاصل کرلی ہے۔
پیلو صدیوں سے دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔
ہمدرد کی تحقیق جدید نے پیلو کے ان افادی اجزا اور دوسری مجرب جڑی بوٹیوں سے ایک جامع
فارمولے کے مطابق ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تیار کیا جو پوری طرح دانتوں اور مسوڑھوں
کی حفاظت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
ہمدرد
پیلو ٹوتھ پیسٹ
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
پیلو کے اوصاف
مسوڑھے مضبوط، دانت صاف
پاکستان سے محبت کرو۔ پاکستان کی تعمیر کرو
HTP 3/85

الہدیٰ

قسط: ۶۸

مباحث جہاد فی سبیل اللہ
درس ۳۰

جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ

سُورۃ الصَّف

(۱)

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار مطالعہ ہم کر رہے ہیں اس کے چوتھے حصے میں سورۃ الحج کے آخری رکوع کے بعد اب ہمیں بالترتیب سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا مطالعہ کرنا ہے۔ یہ دونوں سورتیں ایک حسین و جمیل جوڑے کی صورت میں "سُلسلۂ مسبّحات" کے بالکل وسط میں وارد ہوئی ہیں۔ اس سے قبل سورۃ التحریم کے درس کے ضمن میں بھی یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ کسی ایک مضمون پر جس کے دو رُخ یا دو پہلو ہوں' بالعموم دو علیحدہ سورتوں میں بحث ہوتی ہے۔ اور دونوں سورتیں مل کر اُس ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتیں اور آیات

اس مرحلے پر چونکہ ہم قرآن حکیم کی ایسی دو سورتوں کا مطالعہ کرنے والے ہیں جن کا باہم جوڑا ہونا بہت نمایاں ہے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مصحف کی ترتیب سے متعلق اور سورتوں کی گروپ بندی (Groupings) کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں عرض کر دی جائیں تاکہ قرآن مجید کے ساتھ ایک مجموعی اور عمومی تعارف اور اس کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت پیدا ہونے میں مدد مل سکے۔

اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی اکائی 'آیت' ہے اور قرآن حکیم چھ

ہزار سے زائد آیات پر مشتمل ہے۔ آیت کے معنی ہیں نشانی۔ اس لفظ سے دراصل اس حقیقت کی جانب رہنمائی ملتی ہے کہ قرآن حکیم کی ہر آیت علم و حکمت کا ایک موتی اور اللہ کے علمِ کامل اور اس کی حکمتِ بالغہ کی نشانی ہے۔ بعض آیات صرف حروف مقطعات پر مشتمل ہیں' بعض مرکباتِ ناقصہ پر مشتمل ہیں' اسی طرح بہت سی آیات ایسی ہیں جو مکمل جملوں پر مشتمل ہیں جبکہ ایسی بھی بہت سی آیات ہیں جن میں متعدد جملے آ جاتے ہیں۔ یہ معاملہ کسی لغوی' نحوی یا اجتہادی اصول پر مبنی نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ تمام امور توقیفی ہیں' یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے ہی سے امت کو معلوم ہوئے۔ آیات جمع ہو کر سورتوں کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ سورتوں کی کُل تعداد ایک سو چودہ ہے جو متفق علیہ ہے۔

"سورہ" کے لغوی معنی کے ضمن میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کے معنی ہیں فصیل۔ اس لفظ کے استعمال سے گویا یہ نقشہ سامنے لے آیا گیا کہ قرآن حکیم کی ہر سورہ علم و حکمت کا ایک شہر ہے' جس کے گرد ایک فصیل موجود ہے۔ آیات ہی کی طرح سورتیں چھوٹی بھی ہیں بڑی بھی ہیں۔ سب سے چھوٹی سورتیں تین ہیں جو تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ انہی میں سے ایک سورۃ العصر ہے جو ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز ہے۔ بقیہ دو سورتیں' سورۃ الکوثر اور سورۃ النصر ہیں۔ طویل ترین سورتیں قرآن حکیم کی وہ ہیں جو سورۃ الفاتحہ کے بعد مصحف کے بالکل آغاز میں آئی ہیں۔ یعنی سورۃ البقرہ' سورۃ آل عمران' سورۃ النساء' سورۃ المائدہ' سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف۔ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ بعض سورتیں وہ ہیں جو بیک وقت ایک مربوط اور مسلسل خطبے کی شکل میں نازل ہوئیں' لیکن بہت سی سورتوں میں تدوین و ترتیب کا معاملہ بھی ہوا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے تحت ہوا۔ کہ بعض آیات نازل ہوئیں اور حضور نے فرمایا ان آیات کو فلاں سورہ میں فلاں آیتوں کے بعد رکھ دو! ــــــــ بہرحال یہ ترتیب اللہ کے حکم سے حضرت جبرئیل کی رہنمائی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود معیّن فرمائی۔

ستّ احزاب

سورتوں کی ایک تقسیم جو بہت معروف ہے وہ ان کے زمانۂ نزول کے حوالے سے ہے۔ کچھ سورتیں مدنی ہیں' کچھ مکی ہیں۔ یعنی کچھ سورتیں وہ ہیں جو ہجرت سے قبل نازل ہوئیں

۔کچھ سورتیں وہ ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں

_______ ۔اب ترتیبِ مصحف کی طرف آیئے

ر سورتوں کی گروپنگ کو سمجھنے کی کوشش کیجئے! ______ یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی تیب جس سے ہم واقف ہیں اور جو دورِ نبوی سے چلی آ رہی ہے' ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے نہیں ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے' اس پر کچھ مزید عرض کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ اس ترتیبِ مصحف میں سورتیں جس طرح ایک دوسرے کے بعد رکھی گئی ہیں اور ن میں جو گروپ بندی کی گئی ہے ان میں سے ایک گروپ بندی یا Grouping تو وہ ہے کہ جس کا ذکر ہمیں دورِ نبوی اور دورِ صحابہؓ سے ملتا ہے جس کی رُو سے قرآن حکیم کی ورتیں سات احزاب یا سات منزلوں میں منقسم ہیں۔ یہ درحقیقت بغرضِ تلاوت قرآنِ یکیم کو سات قریباً مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس لئے کہ آغاز میں تقریباً ہر مسلمان ہر ہفتے قرآن مجید کی تلاوت مکمل کیا کرتا تھا لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن حکیم کو سات تقریباً مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ایک شخص روزانہ ایک حصّہ' ایک حزب یا یک منزل پڑھ کر ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کر لیا کرے۔ یہ تقسیم جیسا کہ عرض کیا گیا' دورِ صحابہؓ میں موجود تھی۔ اس تقسیم میں سورتوں کو کہیں توڑا نہیں گیا' کوئی فصیل مجروح نہیں کی گئی بلکہ پوری پوری سورتیں گروپ کی گئیں۔ چنانچہ اس تقسیم میں ایک ظاہری حسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو چھوڑ کر کہ وہ پورے قرآن مجید کے لئے ایک دیباچے اور مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے' پہلا حزب یا پہلی منزل تین سورتوں پر مشتمل ہے' دوسرا پانچ سورتوں پر' تیسرا حزب سات سورتوں پر' چوتھا نو پر' پانچواں گیارہ پر' چھٹا تیرہ سورتوں پر اور اس کے بعد ساتواں 'حزبِ مفصّل' کہلاتا ہے۔ اس میں سورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے' اس لئے کہ قرآن مجید کے آخر میں حجم کے اعتبار سے بہت چھوٹی چھوٹی سورتیں جمع ہیں۔

پارے اور رکوع

یہ سات منزلیں یا سات احزاب دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں موجود تھے۔ البتہ دو تقسیمیں بعد میں کی گئی ہیں جن کا دورِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ میں ذکر نہیں ملتا۔ ایک قرآن حکیم کی تیس پاروں میں تقسیم' جو درحقیقت اُس دور کی تجویز کردہ ہے جب مسلمانوں کا

جذبۂ ایمان کچھ مدہم پڑ گیا تھا اور تلاوتِ قرآن کے ضمن میں وہ سابقہ معمول کہ ہر ہفتے میں قرآن مجید ختم کر لیا جائے اب کچھ لوگوں پر گراں گزر رہا تھا۔ چنانچہ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کو تیس حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ہر مسلمان روزانہ ایک حصہ پڑھ کر ایک مہینے میں تلاوتِ قرآن مکمل کر لیا کرے۔ لیکن یہ تقسیم فی الواقع بڑی ہی مصنوعی اور Arbitrary ہے اور قطعی طور پر کسی بھی اصول پر مبنی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ یہ ظلم بھی کیا گیا ہے کہ سورتوں کی فصیلیں توڑ دی گئی ہیں اور نہایت بھونڈے طریقے سے توڑی گئی ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں جبکہ بقیہ پوری سورہ چودھویں پارے میں چلی گئی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کسی کے پاس قرآن حکیم کا کوئی ایک نسخہ تھا اور اس نے اس کے صفحات گن کر برابر برابر تیس حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ممالک میں جو قرآن مجید طبع ہوتے ہیں ان میں بالعموم ان پاروں کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا۔ ایک دوسری تقسیم جو کی گئی، اور وہ بھی بغرضِ سہولت تلاوت کی گئی تھی، وہ ہے سورتوں کی تقسیم رکوعوں میں۔ اس میں پیش نظر یہ تھا کہ طویل سورتوں کو جن کا نماز کی ایک رکعت میں پڑھنا مشکل ہے، اس طرح کے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ ایک ایک حصہ ایک رکعت میں بہ آسانی پڑھا جا سکے۔ اس طرح طویل سورتیں رکوعوں میں منقسم ہو گئیں۔ آخری پارے کی اکثر سورتیں صرف ایک ایک رکوع پر مشتمل ہیں اس لئے کہ ان کو ایک رکعت میں بہ آسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد پیچھے کی طرف آیئے تو ذرا طویل سورتیں ہیں جو دو دو رکوعوں کی سورتیں ہیں۔ پھر مزید طویل سورتیں ہیں جو تین تین اور چار چار رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن حکیم کی طویل ترین سورہ، سورۃ البقرہ ہے جو چالیس رکوعوں پر مشتمل ہے۔ یہ تقسیم جس نے بھی کی ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس نے مضامین کا لحاظ رکھا ہے۔ عام طور پر رکوع کا اختتام ایسے ہی موقع پر کیا گیا ہے کہ جہاں ایک مضمون مکمل ہو جائے اور سلسلۂ کلام ٹوٹنے نہ پائے۔ بہرحال پاروں اور رکوعوں کی یہ تقسیم دورِ صحابہؓ میں موجود نہیں تھی، یہ بعد کے زمانے سے متعلق ہے۔

سورتوں کی ایک نئی گروپ بندی

البتہ قرآن حکیم کی سورتوں کی ایک گروپنگ (Grouping) اور بھی ہے جس کی

جانب ماضی قریب ہی میں بعض محققین کی نگاہ گئی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم میں اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ مکی اور مدنی سورتوں کو کچھ اس طرح آپس میں جوڑا گیا ہے ' اکٹھا کیا گیا ہے کہ اس سے سات گروپ وجود میں آ گئے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قرآن حکیم کی سورتوں کے ہر گروپ کا آغاز ایک یا ایک سے زائد مکّی سورتوں سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر ہوتا ہے اور اس طرح مکّی اور مدنی سورتیں مل کر ایک گروپ کو مکمل کرتی ہیں۔ ایک گروپ کے مکمل ہونے پر آپ دیکھیں گے کہ دوسرا گروپ شروع ہوگا۔ پھر آغاز میں مکّیات آئیں گی اور ان کے بعد پھر مدنیات۔ اور اس طرح دوسرا گروپ مکمل ہو جائے گا۔ پھر تیسرے گروپ کا آغاز بھی ایک یا زائد مکّی سورتوں سے ہوگا جن کے بعد پھر مدنی سورتیں آئیں گی اور گروپ مکمل ہو جائے گا۔ اس طرح مکّی اور مدنی سورتوں کے بھی سات ہی گروپ سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون ہے جو اس گروپ میں شامل مکّی اور مدنی سورتوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہر گروپ کا ایک مرکزی خیال 'ایک عمود (Central Axis) ہوتا ہے جس کے ساتھ اس گروپ کی تمام مکی اور مدنی سورتیں مربوط ہوتی ہیں۔

اس طریقے سے قرآن مجید کی سورتوں کے جو سات گروپ وجود میں آئے ہیں ان میں سے پہلے گروپ میں مکی سورہ صرف ایک ہے یعنی سورۃ الفاتحہ۔ جبکہ اس گروپ میں چار انتہائی طویل مدنی سورتیں شامل ہیں: البقرہ' آل عمران' النساء اور المائدہ۔ دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو سورتیں مکّی اور دو ہی مدنی سورتیں شامل ہیں۔ سورۃ الانعام اور الاعراف مکی ہیں اور سورۃ الانفال اور التوبہ مدنی ہیں۔ تیسرے گروپ کی مکّیات کا سلسلہ بہت طویل ہے جو گیارہویں پارے میں سورہ یونس سے شروع ہو کر اٹھارویں پارے تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مدنی سورہ آتی ہے یعنی سورۃ النور' اور اس پر گروپ مکمل ہو جاتا ہے۔ پھر مکّیات کا سلسلہ سورۃ الفرقان سے شروع ہو کر بائیسویں پارے تک چلا گیا ہے جس کے بعد سورۃ الاحزاب مدنی سورہ ہے جس پر چوتھا گروپ مکمل ہوتا ہے۔ اس طریقے سے مکّیات اور مدنیات پر مشتمل قرآن حکیم کی سورتوں کے سات گروپ وجود میں آتے ہیں کہ جن میں ایک معنوی تقسیم بھی نظر آتی ہے کہ ہر گروپ کا اپنا ایک مرکزی مضمون ہے جس کی تکمیل اس گروپ میں شامل مکی اور مدنی سورتیں مل کر کرتی ہیں۔

مدنی سورتوں کا سب سے بڑا گلدستہ

اب آیئے اس اصل موضوع کی طرف جس کے ضمن میں یہ ساری بات زیر بحث آئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس پہلو سے قرآن حکیم کی سورتوں کا جو چھٹا گروپ بنتا ہے' اس میں سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ شامل ہیں۔ یہ گروپ بعض اعتبارات سے ایک خصوصی شان کا حامل ہے۔ اس کے آغاز میں سورۃ قٓ سے سورۃ الواقعہ تک سات مکی سورتیں ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے جانتے ہیں کہ آہنگ (Rhythm) اور روانی کے اعتبار سے قرآن حکیم میں ان سورتوں کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان سب کا مرکزی مضمون ہے آخرت اور اسی پر مختلف پہلوؤں سے ان سورتوں میں روشنی ڈالی گئی ہے ـــــ انہی میں سورۃ الرحمٰن بھی شامل ہے جسے "عروس القرآن" کہا گیا ہے۔ الفاظ کا حسن اور تراکیب اور بندشوں کی بے مثل خوبصورتی اور اچھوتا پن ان سورتوں کا امتیازی اور مشترک وصف ہے۔ ان سات مکی سورتوں کے بعد اس گروپ میں دس مدنی سورتیں شامل ہیں۔ بلحاظِ تعداد مدنی سورتوں کا یہ سب سے بڑا اور خوبصورت اکٹھ (Constellation) ہے جس کی کوئی اور نظیر قرآن حکیم میں موجود نہیں۔ ویسے حجم کے اعتبار سے پہلے گروپ میں جو چار مدنی سورتیں یعنی البقرہ' آل عمران' النساء اور المائدہ شامل ہیں' وہ بہت طویل ہیں۔ لیکن بہرحال سورتوں کی تعداد وہاں چار ہی ہے۔ جبکہ یہاں دس مدنی سورتیں مسلسل وارد ہوئی ہیں۔ ستائیسویں پارے کی سورۃ الحدید سے ان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور اٹھائیسویں پارے کی آخری سورۃ سورۃ التحریم پر ختم ہوتا ہے۔

زیر نظر مدنی سورتوں کے مشترک اوصاف

ان سورتوں میں کچھ چیزیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور چونکہ مطالعۂ قرآنِ حکیم کے اس منتخب نصاب میں مکمل سورتوں کی سب سے بڑی تعداد اسی گروپ سے ہے لہٰذا اس نصاب کے مضامین کی تفہیم کے لئے اس گروپ میں شامل سورتوں کے مشترک امور کو سمجھ لینا مفید ہوگا۔ اس سے پہلے اس گروپ کی دو سورتیں ہم پڑھ چکے ہیں۔ منتخب نصاب کے حصہ دوم میں جو مباحث ایمان پر مشتمل ہے' ہم نے سورۃ التغابن کا مطالعہ کیا تھا جو اس گروپ میں شامل ہے۔ اسی طرح حصہ سوم میں اعمالِ صالحہ کی تفصیل کے ضمن میں عائلی زندگی اور اس سے متعلق اہم ہدایات پر مشتمل سورۃ التحریم کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں جو

اس گروپ کی آخری سورہ ہے۔ اب اس مرحلہ پر اسی گروپ کی دو مزید سورتوں یعنی سورۃ الجمعہ اور سورۃ الصّف کا مطالعہ ہم کرنے والے ہیں۔ مزید برآں ہمارے اس منتخب نصاب کے آخری حصے میں ہمیں سورۃ الحدید کا مطالعہ کرنا ہے جس سے اس گروپ کی مدنی سورتوں کا آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر ان سورتوں کے بارے میں بعض بنیادی باتیں ذہن نشین کر لی جائیں تاکہ ہر مرحلے پر ان کے تکرار و اعادہ کی ضرورت نہ رہے۔

تمام خطاب امّتِ مسلمہ سے ہے!

پہلی چیز جو ان دس سورتوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے' یہ ہے کہ تقریباً ان سب کا زمانۂ نزول مدنی دور کا نصفِ آخر ہے۔ یہ وہ دور ہے جب مسلمانوں کا معاشرہ باقاعدہ وجود میں آ چکا تھا اور مسلمانوں کو غلبہ اور اقتدار بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو چکا تھا۔ گویا مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ان سورتوں میں خطاب کُل کا کُل مسلمانوں سے ہے بحیثیتِ امّتِ مسلمہ۔ ان میں یہود و نصاریٰ سے یا مشرکینِ مکّہ سے خطاب آپ کو نہیں ملے گا' نہ بطرزِ دعوت و تبلیغ نہ بطورِ ملامت و زجر و توبیخ! خطاب کُل کا کُل امّتِ مسلمہ سے ہے' اہلِ کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کا اگر کہیں حوالہ آیا بھی ہے تو محض نشانِ عبرت کے طور پر۔ ان میں بھی نصاریٰ کی طرف Reference ان سورتوں میں محض دو مقامات پر ہے۔ جبکہ اکثر سورتوں میں یہود کو بطورِ نشانِ عبرت پیش کیا گیا ہے کہ اے مسلمانو جس مقام پر آج تم فائز کئے جا رہے ہو اس مقام پر اس سے پہلے بنی اسرائیل فائز تھے۔ تم سے پہلے کتابِ الٰہی کے حامل وہ تھے' انہیں توراۃ عطا کی گئی تھی جس میں ہدایت بھی تھی اور قانون و شریعت بھی' تم سے پہلے وہ قوم اللہ کی نمائندہ امّت تھی جسے اڑھائی ہزار برس تک یہ مقامِ بلند حاصل رہا۔ لیکن جب انہوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کے ساتھ غداری کی تو وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنے اور انہیں اس مقام سے معزول کر دیا گیا۔ اس سابقہ امت میں کن کن راستوں سے گمراہیاں آئیں' کس کس پہلو سے ان میں اخلاقی' اعتقادی یا عملی اضمحلال پیدا ہوا' اس کو اپنے سامنے بطورِ نشانِ عبرت رکھو! اس لئے کہ امتوں کی تاریخ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ آپؐ ارشاد فرماتے ہیں: "لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِي

كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِىٓ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ!" ۔ "میری امت پر بھی وہ تمام حالات وارد ہوں گے کہ جو اس سے پہلے بنی اسرائیل پر آئے ہیں بالکل ایسے جیسے کہ ایک جوتا دوسرے جوتے سے مشابہ ہوتا ہے"۔ دونوں امتوں کے حالات میں مشابہت کے بیان میں اس سے زیادہ بلیغ تمثیل ممکن نہیں۔ آپ نے اس معاملے کو اس کی انتہا تک پہنچانے کے لئے یہ مثال بھی دی کہ اگر وہ (یعنی بنی اسرائیل) گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی ضرور گھسو گے' اور اگر ان میں سے کوئی بدبخت اور شقی ایسا پیدا ہوا کہ اس نے اپنی ماں سے بدکاری کی ہو تو تم میں سے بھی کوئی ایسا بدبخت پیدا ہو کر رہے گا۔ تو ان سورتوں میں درحقیقت امتِ مسلمہ کے سامنے بطورِ نشانِ عبرت یہود اور نصارٰی کے حالات بار بار لائے گئے اور اس طرح مسلمانوں کو پیشگی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھنا کہیں تم ان گمراہیوں کا شکار نہ ہو جانا!

اہم مضامین کے جامع خلاصے

تیسری قدرِ مشترک ان سورتوں میں یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے وہ اہم مضامین اور مباحث جو طویل مکی اور مدنی سورتوں میں بہت تفصیل سے آئے ہیں' ان کے گویا چھوٹے چھوٹے خلاصے نکال کر اس مقام پر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ایمان کے مباحث مکی سورتوں میں بڑی لمبی بحثوں کی صورت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ توحید' معاد اور آخرت کے مباحث اور ان کے لئے دلائل' پھر ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات طویل سورتوں میں بڑی تفصیل سے زیرِ بحث آئے ہیں' لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایمان اور اس کے ثمرات و لوازم کے بیان میں اٹھارہ آیات پر مشتمل سورۃ التغابن انتہائی جامع سورہ ہے۔ کوئی جاننا چاہے کہ ایمان کیا ہے' اس کے لوازم کیا ہیں' اس کے نتائج اور مضمرات کیا ہیں اور اس کے فکری و عملی تقاضے کیا ہیں تو سورۃ التغابن اس کے لئے کفایت کرے گی۔ اسی طرح نفاق کا مضمون طویل مدنی سورتوں میں (یعنی سورۃ النساء' سورۃ آل عمران اور سورۃ التوبہ میں) بڑے طویل مباحث پر پھیلا ہوا ملے گا کہ نفاق کسے کہتے ہیں' اس کی حقیقت کیا ہے' اس کا نقطۂ آغاز کون سا ہے' اس مرض کی علامات کیا ہیں' اس کی ہلاکت خیزی کا عالم کیا ہے' اس سے بچاؤ کی تدابیر کیا ہیں' اگر اس کی چھوت لگ جائے تو اس کا علاج کیا ہے' یہ تمام امور ان سورتوں میں بڑی تفصیل سے زیرِ بحث آئے ہیں۔ لیکن ان تمام مضامین کا ایک جامع خلاصہ اور لبِّ لباب

ہمیں سورۃ المنافقون کی شکل میں عطا کر دیا گیا جو کُل گیارہ آیات پر مشتمل ہے اور اسی مجموعے میں شامل ہے۔ اسی طرح عائلی زندگی سے متعلق یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن حکیم میں سب سے زیادہ مفصل ہدایات اسی شعبۂ زندگی کے بارے میں دی گئی ہیں۔ گھر کا ادارہ انسان کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل ہے۔ اس ادارے کو کن خطوط پر استوار کیا جائے' بیویوں اور اولاد کے معاملے میں معتدل اور متوازن طرزِ عمل کون سا ہے' اگر طلاق کی نوبت آ جائے تو کن باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا' ان موضوعات پر دو دو رکوعوں پر مشتمل دو انتہائی جامع سورتیں (سورۃ الطّلاق اور سورۃ التحریم) بھی اسی کُل دستے میں شامل ہیں۔ اس طرح یہ دس سورتیں گویا مختلف اعتبارات سے قرآن حکیم میں طویل بحثوں میں پھیلے ہوئے اہم مباحث کے خلاصوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن کو ایک مقام پر یکجا کر دیا گیا ہے۔ اور یہی درحقیقت سبب ہے اس کا کہ ان دس سورتوں میں سے چھ ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ سورۃ الحدید' سورۃ الصف' سورۃ الجمعہ' سورۃ المنافقون' سورۃ التغابن اور سورۃ التحریم۔

سرزنش اور ملامت کا اسلوب

ایک اور وصفِ مشترک یا قدرِ مشترک ان سورتوں میں یہ نظر آتا ہے کہ امّتِ مسلمہ سے خطاب میں بالعموم کچھ ملامت کا سا اور جھنجھوڑنے کا سا انداز جھلکتا نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے امت کے بعض طبقات کے جذباتِ ایمانی اور جوشِ جہاد میں کچھ کمی واقع ہو گئی تھی' ان کا جذبۂ انفاق کچھ سرد پڑ رہا تھا اور اب انہیں جھنجھوڑا جا رہا ہے' کچھ سرزنش کے انداز میں بھی اور کہیں کہیں ملامت اور زجر کے انداز میں۔ یہ انداز ان تمام سورتوں میں مشترک ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دورانِ مطالعہ ہمارے سامنے آئیں گی۔ سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ"۔ اے مسلمانو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ "كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" یہ چیز اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی ہے کہ تم کہو جو کرتے نہیں ہو ـــــــ اسی طریقے سے سورۃ الجمعہ میں ڈانٹ کے سے انداز میں تنبیہہ کی گئی ہے کہ اے نبی' یہ کیا معاملہ ہوا کہ آپ کھڑے خطبہ دے رہے تھے اور مسلمان آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ کیا خطبے اور نمازِ جمعہ کے مقابلے میں کاروبارِ دنیوی انہیں

زیادہ عزیز ہو گیا ہے!! سورۃ الحدید میں یہی انداز ہے: "اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ" ۔ کہ کیا اہلِ ایمان کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد میں اور جو کچھ کہ نازل ہوا ہے اللہ کی طرف سے اس کے سامنے۔ سورۃ التحریم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک معاملے میں ازواجِ مطہرات کو سرزنش کی گئی ہے اور کم از کم ظاہرِ الفاظ کے اعتبار سے اس میں بڑی سختی موجود ہے۔ تو ان سورتوں میں یہ انداز بتکرار ملتا ہے۔

اس پیرایۂ بیان کا اصل سبب

اس ضمن میں یہ بات سمجھ لیجئے کہ واقعہ یہ ہے کہ ایک دور تو وہ تھا جب کوئی شخص جان اور مال کی بازی کھیل کر ہی کلمۂ شہادت زبان پر لاتا تھا۔ مکّی دور میں یہی کیفیت تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کلمۂ شہادت کے زبان پر جاری ہوتے ہی ہر چہار طرف سے مخالفت کا طوفان امڈ پڑے گا، مصائب اور تکالیف کا سامنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اس کشمکش میں گھربار سے تعلق توڑنا پڑے، تمام پرانے تعلقات اور دوستیوں کو خیرباد کہنا پڑے۔ لہٰذا کلمۂ شہادت زبان پر لانے کا فیصلہ کوئی شخص اُسی وقت کرتا تھا جبکہ ایمان اس کے دل میں پورے طور پر جاگزیں اور راسخ ہو چکا ہوتا۔ لیکن یہ صورت حال تدریجاً بدل گئی۔ بالخصوص مدنی دور کے آخری زمانے کا خیال کیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فیصلہ کُن اقتدار حاصل ہے، مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ ایک حکمران طاقت کی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ اب زبان سے کلمۂ شہادت ادا کرنا نہ صرف آسان ہو گیا ہے بلکہ یہ کلمہ اب انسان کے جان و مال کے تحفظ کا ضامن بھی ہے۔ لہٰذا اب صورتِ حال وہ ہو گئی جس کا نقشہ سورۃ النصر میں کھینچا گیا ہے: "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○" تو یہ لوگ جو فوج در فوج اور جوق در جوق دینِ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، ظاہر بات ہے کہ ان کے ایمان کی کیفیت وہ نہیں تھی جو سابقون الاوّلون کے ایمان کی تھی۔ یہ بات اس سے پہلے سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۴ میں آ چکی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا گیا تھا کہ تم یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے، بس یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا۔ (قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ)

اب ظاہر بات ہے جب ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ امّت میں شامل ہو گئے تو امت
یثیتِ مجموعی جذباتِ ایمانی' جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق کا اوسط کم ہو گیا۔ یہ وہ اضمحلال ہے
اُسی وقت گرفت کی گئی۔ اس میں درحقیقت بعد کے اَدوار کے لئے جبکہ امّت میں
، مجموعی اضمحلال اور زوال پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہونے والا تھا' پیشگی رہنمائی کا
موجود ہے۔ اور اس طرح آئندہ کے ادوار میں یہ سورتیں مسلمانوں کی غیرتِ ایمانی کو
، اور ان کے جوشِ جہاد اور جذبۂ انفاق کو از سرِ نو تازہ کرنے میں مہمیز کا کام دیں گی۔ ان کی
ے مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہو گا کہ وہ اپنا جائزہ لیں' اپنے گریبانوں میں جھانکیں
ایمان کے اضمحلال کی متذکرہ بالا کیفیات انہیں اپنے باطن میں محسوس ہوں تو اس
و اضمحلال کو دُور کرنے پر کمربستہ ہو جائیں ــــــ

ے لیے اِن سورتوں کی خصوصی اہمیّت

ـ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو
ر میں کہ جس میں ہم سانس لے رہے ہیں' امّتِ مسلمہ زوال و انحطاط کی انتہاؤں کو
ا ہے۔ مولانا حالی نے ان دو اشعار میں جو انہوں نے اپنی مسدّس کی پیشانی پر درج کئے
ں کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا تھا:

کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

ر میں واقعہ یہ ہے کہ اگر اِن سورتوں پر امّت کی توجہات کو مرتکز کر دیا جائے' ان کا فہم
ریا جائے تو یہ مسلمانوں کے جذبۂ ایمان کی از سرِ نو بازیابی اور ان کے اندر جوشِ جہاد اور
فاق پیدا کرنے میں انشاء اللہ العزیز انتہائی مفید اور ممد ثابت ہوں گی۔

ات

آخری بات ان سورتوں کے بارے میں یہ نوٹ کر لیجئے کہ ان دس سورتوں میں سے پانچ
کہ جن کا آغاز "سَبَّحَ لِلّٰہِ" یا "یُسَبِّحُ لِلّٰہِ" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے
ں دس کے گل دستے میں یہ پانچ سورتیں ایک اضافی اور نرالی شان کی حامل ہیں۔ ان
ں کو مجموعی طور پر 'المسبِّحات' کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی وہ سورتیں جن کا آغاز تسبیح

باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ ان میں سے تین وہ ہیں کہ جن میں آغاز میں "سَبَّحَ لِلّٰہِ" کے الفاظ وارد ہوئے۔ یعنی تسبیح کا ذکر فعل ماضی کی شکل میں کیا گیا ہے۔ جبکہ دو سورتوں کا آغاز ہوتا ہے "یُسَبِّحُ لِلّٰہِ" کے الفاظ سے۔ یہاں فعل مضارع لایا گیا ہے جو حال اور مستقبل دونوں کو محیط ہے۔ اس معاملے میں بھی ایک عجیب توازن نظر آتا ہے کہ سورۃ الحشر کی آخری آیت میں بھی یہ لفظ "یُسَبِّحُ" شامل ہے۔ اس طرح گویا تین مرتبہ "سَبَّحَ" اور تین ہی مرتبہ "یُسَبِّحُ" کے الفاظ ان سورتوں میں وارد ہوئے ہیں۔ دورانِ مطالعہ آپ محسوس کریں گے کہ امتِ مسلمہ کو جھنجھوڑنے، مسلمانوں کو ان کے فرائضِ دینی سے آگاہ کرنے اور بالخصوص انہیں آمادۂ عمل کرنے میں ان مسبّحات کی تاثیر دوسری سورتوں سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ ان پانچ 'مسبّحات' میں سے چار اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی سورت ہے سورۃ الحدید۔ وہ یوں سمجھئے کہ ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ عروج ہوگی۔ گویا اس کا نقطۂ آغاز اگر سورۃ العصر ہے تو اس کی چوٹی (Climax) سورۃ الحدید ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ شجرِ ہدایت کا بیج اگر سورۃ العصر ہے تو اس کا پھل ہے سورۃ الحدید، جس پر ہمارا یہ منتخب نصاب انشاء اللہ تکمیل پذیر ہوگا۔ یہ چند باتیں اگر ذہن نشین کرلی جائیں تو امید ہے کہ قرآن مجید سے ایک عمومی تعارف میں بھی مدد و معاون ہوں گی اور خاص طور پر ان سورتوں کی اہمیت کو سمجھنے میں ان سے مدد ملے گی۔ انشاء اللہ۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بحیثیتِ

داعئ انقلاب

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک پُر تاثیر اور فکر انگیز خطاب

(۶)

ترتیب و تسوید: (شیخ) جمیل الرحمٰن

ضروری وضاحت

محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے مندرجہ بالا خطاب کی قسط وار اشاعت کا سلسلہ جنوری ۱۹۸۹ء کے " میثاق " کے شمارے سے ہوا تھا اور اس کی پانچ اقساط (جنوری، فروری، مئی، جولائی اور اگست ۸۹ء کے شماروں میں شائع ہوئی تھیں۔ خطاب کا مسوّدہ MIS-PLACE ہوجانے کے باعث اگلی اقساط کی اشاعت میں تعطل پیدا ہوگیا تھا۔ بفضلہ تعالیٰ مسودہ مل گیا ہے لہٰذا چھٹی قسط ہدیۂ ناظرین ہے۔ پانچویں قسط کے آخر میں انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے چھٹے مرحلے یعنی "مسلح تصادم" کا ذکر شروع ہوا تھا۔ کلام میں تسلسل قائم رکھنے کی غرض سے پانچویں قسط کا کچھ حصہ اس چھٹی قسط میں شامل کیا جارہا ہے جس سے ربطِ مضمون قائم رکھنے میں سہولت ہوگی۔ "میثاق" میں اس خطاب کی اشاعت کی تکمیل کے بعد ان شاء اللہ العزیز اسے مکمل کتابی شکل میں جلد شائع کر دیا جائے گا۔ امید ہے کہ یہ خطاب "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کی ضخیم کتاب کے خلاصے کی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرے گا۔

——— (ج - ر)

چھٹا مرحلہ: مسلّح تصادم کا آغاز

جیساکہ میں نے عرض کیا کہ اس مرحلے کے آغاز کا سبب دو واقعات ہیں۔ پہلا واقعہ تو اس آٹھویں مہم سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے "وادیٔ نخلہ" کی طرف روانہ فرمائی تھی۔ اس کا ذکر میں قدرے تفصیل سے کرنے والا ہوں۔ اس لیے کہ دراصل اسی واقعہ نے مکّہ میں جنگی جوش و خروش کی آگ بھڑکا دی تھی۔ دوسرا واقعہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اُس اقدام سے متعلق ہے جو آپؐ نے ابوسفیان کے اُس تجارتی قافلے پر تاخت کرنے کے بارے میں فرمایا تھا جو شام جاتے وقت غزوۂ ذوالعشیرہ میں بچ نکلا تھا اور اب تجارتی مال سے لدا پھندا مکّہ واپس آرہا تھا۔

واقعۂ وادیٔ نخلہ: وادیٔ نخلہ مکّہ اور طائف کے درمیان واقع ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو آٹھویں مہم ترتیب دی اس کا ذکر سریّہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے نام سے سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کا خاص معاملہ یہ ہے کہ آپؐ نے عبداللہ بن جحشؓ کی سرکردگی میں مہاجرین میں سے بارہ افراد پر مشتمل ایک دستہ ترتیب فرمایا اور امیرِ لشکر کو ایک خط اس ہدایت کے ساتھ دے کر روانہ فرمایا کہ فلاں جانب کوچ کرو اور دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد خط کھول کر پڑھو اور اس کی تعمیل کرو۔ غور فرمائیے کہ رازداری کس درجہ کی ہے کہ خود کمانڈر کو بھی معلوم نہیں کہ وہ مہم کیا ہے جو میرے سپرد کی گئی ہے۔ وہؓ روانہ ہوگئے اور دو دن کی مسافت کے بعد خط کھولا۔ اس میں لکھا تھا کہ وادیٔ نخلہ جاکر قیام کرو اور قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو اور ان کے بارے میں ہمیں اطلاع دیتے رہو۔ میں آپ کو وادیٔ نخلہ کا محلِ وقوع بتا چکا ہوں کہ یہ وادی طائف اور مکّہ کے درمیان واقع ہے۔ قریش کے جو قافلے یمن جاتے تھے وہ اسی وادی سے گزر کر طائف ہوتے ہوئے یمن کی طرف جاتے تھے۔ یہ وادی مدینہ سے قریباً تین سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چونکہ طویل سفر تھا اور بڑی سخت اور کٹھن مہم تھی لہٰذا عبداللہ بن جحشؓ نے اپنے ساتھیوں کو آزاد کر دیا کہ مجھے تو ہر صورت جانا ہے اس لیے کہ حضورؐ کا حکم ہے، البتہ تم میں سے جو میرا ساتھ دینا چاہے وہ دے، میں کسی کو مجبور نہیں کروں گا۔ سب نے کہا کہ حضورؐ کا حکم ہم سب کے لیے

ہے، اور آپؐ کا حکم ہمارے لیے واجب الاطاعت ہے۔ ہم کیسے واپس جا سکتے ہیں!

چنانچہ پورا دستہ وہاں پہنچ کر مقیم ہو گیا۔ وہاں قریش کے ایک مختصر قافلے سے جو صرف پانچ افراد پر مشتمل تھا اور جن کے ساتھ اونٹوں پر لدا ہوا کافی سامانِ تجارت موجود تھا، اچانک مڈبھیڑ ہو گئی۔ کوئی صورتِ حال ایسی پیدا ہو گئی کہ جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس میں کسی پیشگی ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اب دو ہی شکلیں تھیں کہ 'مارو یا مر جاؤ'۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ چنانچہ مقابلہ ہوا اور نتیجہ یہ نکلا کہ مکہ والوں میں سے ایک شخص عمرو بن عبداللہ الحضرمی قتل ہو گیا۔ اس کا باپ اگرچہ حضرموت کا رہنے والا تھا لیکن مکہ میں امیہ بن حرب (ابوسفیان کے والد) کا حلیف تھا اور قریش کی روایات میں حلیف کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس قافلے میں مغیرہ بن ولید کے دو پوتے، ایک آزاد کردہ غلام اور ایک دو۔ قریشی شامل تھے۔ ان چاروں میں سے دو افراد جان بچا کر فرار ہو گئے اور بقیہ دونوں کو مسلمانوں نے قیدی بنا لیا جن میں مغیرہ کا ایک پوتا بھی شامل تھا۔ یہاں نوٹ کرنے کے قابل یہ بات ہے کہ ہجرت کے بعد اس مسلح مڈبھیڑ میں پہلی بار مکہ کا ایک کافر مسلمانوں کے ہاتھ قتل ہوا، دو قریشی کافر اسیر بنائے گئے اور قافلے کا مالِ تجارت بطورِ مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ واپس آکر حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی رپورٹ دی تو اس کے متعلق دو روایات ملتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور سرزنش فرمائی کہ میں نے تم کو جنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ دوسری یہ کہ پوری صورتِ حال سن کر حضورؐ نے عتاب فرمایا نہ کوئی سرزنش فرمائی، اور مالِ غنیمت میں سے خمس بھی قبول فرما لیا۔ جو دو قیدی تھے ان کا فدیہ قبول کر کے انہیں آزاد فرما دیا۔ ان میں سے مغیرہ کا پوتا تو واپس مکہ چلا گیا جبکہ دوسرے قیدی حکم بن کیسان آزاد ہونے کے بعد مسلمان ہو گئے اور انہوں نے مدینہ ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آنے والے قافلے کا معاملہ: وادیٔ نخلہ میں عمرو الحضرمی کے قتل، دو قریشیوں کی اسیری جن میں مغیرہ بن ولید جیسے معزز خاندان کا ایک فرد بھی شامل تھا اور پورے سامانِ تجارت کا مسلمانوں کے ہاتھ لگ جانے کی وجہ سے پورے مکہ میں غیظ و غضب کی آگ لگی ہوئی تھی۔ لوگ بے قابو ہو رہے تھے اور انتقام کے لیے مدینہ پر چڑھائی کا مطالبہ کر رہے تھے کہ اسی ہیجان خیز صورتِ حال میں

ابوسفیان کی طرف سے مکہ میں ہنگامی پیغام پہنچ گیا کہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے خطرہ ہے کہ وہ اس تجارتی قافلے پر تاخت کریں گے جو نہایت بیش قیمت تجارتی ساز و سامان سے لدا پھندا شام سے واپس آ رہا ہے۔ اس خبر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مکہ میں ٹھنڈے مزاج اور بردبار طبیعت کے حامل جو سردار اب تک آپس کی خون ریزی سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے وہ اُن تند خو، جوشیلے اور مشتعل مزاج لوگوں کے آگے بے بس ہو گئے، جن کا سرخیل تھا ابوجہل۔ اب ان کے ہاتھ میں فوج کشی کے لیے بیک وقت بہت سی دلیلیں آ گئیں۔ پورے مکہ میں چیخ و پکار شروع ہو گئی کہ قتل کا بدلہ قتل، خون کا بدلہ خون ــــ اب ہم ان صابیوں اور بے دینوں کی گردنیں مار کر ہی دم لیں گے۔ (مشرکین کے نزدیک تو اہل ایمان اپنے آبائی دین سے منحرف ہو کر بے دین ہو گئے تھے)۔ مکہ میں اس وقت انتقام کی جو آگ لگی ہوئی تھی آپ اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ کسی قبائلی معاشرے میں اس نوع کے واقعات کس قدر اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور جوش انتقام کی کیفیات کس طرح ہوش و حواس پر غالب آ جاتی ہیں! چنانچہ ایک ہزار جنگجوؤں کے لشکر نے کیل کانٹے سے لیس ہو کر مکہ سے سوئے مدینہ اس عزم اور ارادہ سے کوچ کیا کہ توحید کی انقلابی دعوت کو ہمیشہ ہمیش کے لیے ختم کر کے دم لیں گے۔ گویا سانپ اپنے بل سے باہر آ گیا اور اسی کے نتیجے میں انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام کے چھٹے مرحلے 'مسلح تصادم' (ARMED CONFLICT) کا غزوۂ بدر کی صورت میں آغاز ہو گیا۔

چند اہم نکات: آگے بڑھنے سے قبل مناسب ہو گا کہ انقلاب نبویؐ کے پانچویں مرحلے یعنی اقدام کے ضمن میں تین اہم نکات اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیجئے۔ یہ نکات اس نقطۂ نظر کی قطعی تردید کرتے ہیں کہ اہل ایمان نے تو محض اپنی مدافعت میں جنگ لڑی ہے!

پہلا نکتہ یہ کہ ہجرت کے بعد پہلا عَلَم جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند فرمایا تھا اور پہلے عَلَم بردار تھے اسد اللہ و اسد رسولہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

دوسرا نکتہ یہ کہ پہلا تیر چلا مسلمانوں کی طرف سے اور تیر چلانے والے تھے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اور ــــ

تیسرا نکتہ یہ کہ پہلا کافر عمرو الحضرمی قتل ہوا اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے جب کہ ہجرت کے بعد مشرکین کی طرف سے کسی مسلمان کے قتل کا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ دو کافر اسیر بنائے گئے مسلمانوں کی طرف سے۔ اور پہلا مال غنیمت بھی اہل ایمان کے ہاتھ لگا۔

اس آخری نکتے کے متعلق اس بحث سے قطع نظر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا تھا یا نہیں، بہر حال یہ کام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں بالفعل ہوئے ــــــ ظاہر بات ہے کہ جماعتی سطح پر تو یہی ہوتا ہے کہ انقلابی جماعت کا کوئی فرد جب کوئی اقدام کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری قائد انقلاب پر آتی ہے۔ یا پھر یہ ہوتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بالکلیہ اظہار براءت فرماتے یا اقدام کرنے والوں کو سزا دیتے اور مشرکین کے نقصانات کی تلافی فرماتے۔ آپؐ نے ایسی کوئی شکل اختیار نہیں فرمائی۔ گویا آپ نے اپنے اصحابؓ کے اس اقدام کو قبول (OWN) فرمالیا۔

اب آئیے غزوۂ بدر کی طرف ــــــ

یوم الفرقان ۔ غزوۂ بدر

یہ بات عرض کی جاچکی ہے کہ غزوۂ بدر سے قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آٹھ مہمیں بھیجی تھیں ان میں چھٹی مہم جس کا ذکر کتب سیر میں غزوۂ ذوالعشیرہ کے عنوان سے ملتا ہے، دوررس نتائج کے اعتبار سے بڑی اہم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سفر اس قافلے پر تاخت کے لیے اختیار فرمایا تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں بہت سا سامان تجارت لے کر شام جارہا تھا۔ لیکن چند دنوں کا فصل واقع ہوگیا اور قافلہ مسلمانوں کی پہنچ سے کافی دور جاچکا تھا۔

مدینہ میں پہلی مشاورت : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر ملی کہ وہ قافلہ بہت بیش قیمت سامان تجارت کے ساتھ واپس آرہا ہے تو آپؐ نے مدینہ میں ایک مشاورت منعقد فرمائی اور طے ہوا کہ اس قافلے کو روکنا ہے اور اس کا وہ تمام مال و اسباب قبضے میں لینا ہے جس کے دراصل حقدار وہ مہاجرین تھے جو اپنے اموال اور اثاثے مکہ ہی میں چھوڑ آئے تھے اور جن کی فروخت سے حاصل شدہ سرمائے سے یہ تجارتی قافلہ تشکیل دیا گیا تھا۔ اس مہم کے ذریعے

دراصل ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آنے والے لشکر کو روکنا مقصود تھا، کوئی باقاعدہ جنگ (BATTLE) پیش نظر نہیں تھی۔ لہٰذا کسی خاص اہتمام اور تیاری کے بغیر لوگ نکل کھڑے ہوئے۔ ذہن میں رہے کہ اس مہم سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آٹھ مہمیں بھیجی تھیں، وہ سب کی سب مہاجرین پر مشتمل تھیں۔ کسی مہم میں کوئی انصاری صحابی شریک نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس مہم میں مہاجرین کی تعداد زیادہ مستند روایات کے مطابق تراسی[۸۳] تھی جب کہ انصاری صحابہؓ کو بھی اس میں شریک کیا گیا تھا اور ان کی تعداد دو سو تیس[۲۳۰] تھی۔ مہاجرین کی تعداد سے کہیں زیادہ۔

مدینہ سے باہر دوسری مشاورت: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے کافی دور نکل آئے تو آپؐ کو خبر ملی کہ مکہ سے ایک ہزار کا لشکر سوئے مدینہ روانہ ہو گیا ہے اور منزل پر منزل طے کرتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ اب معاملہ دو طرفہ ہو گیا کہ شام کی طرف سے تجارتی قافلہ آ رہا ہے اور جنوب کی جانب سے لشکر چلا آ رہا ہے۔ اس موقع پر مدینہ سے باہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسری مشاورت منعقد فرماتے ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الانفال میں اس مشاورت کی جانب اشارہ موجود ہے۔ آیات کے بین السطور صاف پڑھا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے مشورۃً یہ بات پیش فرمائی کہ مسلمانو! ایک قافلہ شمال سے آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف پچاس محافظ ہیں۔ مالِ تجارت بہت ہے۔ دوسری جانب ایک لشکر کیل کانٹے سے لیس جنوب کی طرف سے آ رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک پر فتح کا وعدہ فرمایا ہے تو بتاؤ کدھر چلیں! ___ اس مشاورت کی جو تفاصیل ہمیں صحیح و معتبر کتبِ احادیث و سیرتِ مطہرہ سے ملتی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ چند لوگوں کی تجویز یہ تھی کہ قافلہ کی طرف چلا جائے ___ گمانِ غالب یہ ہے کہ یہ تجویز پیش کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات ہو گی کہ قافلہ پر بآسانی قابو پا لیا جائے گا۔ تجارتی ساز و سامان کے ساتھ بہت سا اسلحہ بھی ہاتھ لگے گا جو آئندہ جنگ میں کام آئے گا ___ ہر حال حضورؐ نے اس تجویز پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور ایسا محسوس ہوا کہ آپؐ کا منشاءِ مبارک کچھ اور ہے اور آپؐ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔

مہاجرینؓ کا جوش و خروش اور اظہارِ خیال: اس مرحلہ پر مہاجرین میں سے بعض حضرات نے تقریریں کیں کہ حضورؐ! آپؐ ہم سے کیا پوچھتے ہیں! آپؐ کا جو ارادہ ہو بسم اللہ کیجیے، ہم دل و جان کے ساتھ حاضر ہیں۔ تقریر کرنے والوں میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما جیسے اکابر بھی شامل ہیں ___ لیکن حضورؐ خاموش ہیں گویا آپؐ کسی خاص بات کے

منتظر ہیں ـــــ پھر یکے از مہاجرین حضرت مقداد بن اسودؓ نے کھڑے ہوکر بڑی پُرتاثیر تقریر کی۔ انہوں نے عرض کیا:

"حضورؐ! جو آپ کا منشاء ہو اُس کے مطابق حکم دیجیے، ہم موسٰیؑ کے ساتھیوں کی طرح نہیں ہیں جنہوں نے جنگ کے حکم کے موقع پر اُن سے کہہ دیا تھا کہ: اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ (موسٰیؑ، تم اور تمہارا رب دونوں جائیں اور جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔) آپؐ بسم اللہ کیجیے، ہم آپؐ کے ساتھ لڑیں گے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہمارے ذریعے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمادے"

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدستور انتظار کی سی کیفیت میں تھے ـــ اب حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ کو جو قبیلہ خزرج کے سردار تھے خیال آیا کہ آپؐ کا روئے سخن اغلباً انصارِ مدینہ کی طرف ہے ـــ اس خیال کی وجہ میری رائے میں یہ ہوسکتی ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ میں جو قول و قرار ہوئے تھے، اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ "اگر قریش (حضورؐ کے مدینہ میں ہجرت کے باعث) مدینہ پر حملہ کریں گے تو ہم آپؐ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں"۔ گویا انصار اس معاہدہ کی رو سے اس کے پابند نہیں تھے کہ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کریں۔ قافلہ کا راستہ روکنا اور بات ہے اور ایک لشکر جرار سے جا بھڑنا ایک بالکل علیحدہ بات ہے۔ چنانچہ حضرت سعد ابن عبادہؓ کھڑے ہوئے اور اس موقع پہ انہوں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا:

"كَاَنَّكَ تَعْنِيْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! حضورؐ شاید آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے! اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنٰكَ! ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپؐ کی (رسول اللہ ہونے کی) تصدیق کی ہے۔ (گویا اُس وقت کیا طے ہوا تھا کیا نہیں وہ بات غیر متعلق ہے) اب آپؐ جو بھی حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) لے چلیے ہم کو جہاں بھی لے جانا ہو۔ اللہ کی قسم اگر آپؐ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں ڈال دیں گے۔ اگر آپ ہمیں حکم دیں گے تو ہم برک الغماد تک جا پہنچیں گے (یمن کے آخری کونے کا شہر ہے) اور اس کے لیے ہم اپنے

سواریوں کو دبلا کردیں گے "۔

حضرت سعد ابن عبادہؓ کی اس تقریر سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور کھل اٹھا گویا آپؐ انصار کی جانب سے اسی ردِ عمل کے منتظر تھے ۔

ہمارے لیے ایک سبق : اس موقع پر حضرت سعدؓ نے جو بات کہی وہ ہر مسلمان کو ذہن نشین کرلینی چاہیئے ۔ انقلابِ محمدیؐ کے لیے جو جماعت وجود میں آئی تھی اس کی اصل بنیاد یہی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو بھی حضورؐ پر ایمان رکھنے کا دعویدار ہے وہ آپؐ کے ہر حکم کا ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ جہت پابند ہے ، مطیع ہے ، فرمانبردار ہے۔ حضرت سعدؓ نے اپنے قول میں اسی حقیقتِ کبریٰ کا اظہار کیا تھا ۔

مشاورت کی حکمتیں : نبی اکرمؐ نے اس موقع پر مشاورت کی جو فضا پیدا فرمائی میرے نزدیک اس کی دو حکمتیں تھیں ۔ پہلی تو سورۃ الشوریٰ کے اس بیانِ خبریہ پر عمل تھا جو اس کی اڑتیسویں آیت میں بایں الفاظِ مبارکہ آیا ہے : وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ـــ دوسری یہ کہ پہلی بار ایک باقاعدہ جنگ کا مرحلہ پیش تھا اور مشرکینِ مکہ کے لشکر کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کا یہ چھوٹا سا دستہ نفری اور ساز و سامانِ جنگ دونوں اعتبارات سے کوئی نسبت و تناسب نہیں رکھتا تھا ۔ کہاں ایک ہزار جنگ جوؤں کا کیل کانٹے سے لیس لشکر جس کے ساتھ پیدل سپاہ کے علاوہ دو سو گھڑ سواروں کا دستہ بھی موجود تھا ! اور سواری کے لیے بے شمار اونٹ تھے جن پر سامانِ رسد اور اسلحہ بھی لدا ہوا تھا ! اور کہاں تین سو تیرہ[۳۱۳] اہلِ ایمان کا دستہ ! جس کا حال یہ تھا کہ صرف دو گھوڑے اور بمشکل ستر اونٹ ساتھ تھے ۔ پھر کسی کے پاس تلوار تھی تو کسی کے پاس تیر کمان یا نیزے تھے ۔ شاید ہی کوئی صحابیؓ ایسے ہوں جو اس وقت کے اعتبار سے ضروری تمام ہتھیاروں سے لیس ہوں ۔ بایں حالات ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر صحابہ کرامؓ کے حوصلے، عزم اور توکل علی اللہ کا اندازہ کرنا ہو ۔ واللہ اعلم !

غزوۂ بدر کے چند اہم واقعات و حالات

۱۷ رمضان المبارک ۲ھ میں پہلی باقاعدہ جنگ (BATTLE) کا معرکہ میدانِ بدر میں گرم ہوا ۔ ابو سفیان نے جن کی 'S.O.S. CALL' پر مکہ سے ایک ہزار کا لشکر اس قافلے کی حفاظت کے لیے نکلا تھا، جہاں ایک طرف مکے والوں

اور قافلہ کی حفاظت کے لیے لشکر بھیجنے کا پیغام دیا وہاں خود حفاظتی تدبیر کے طور پر قافلہ کا راستہ بدل دیا اور معمول کا راستہ چھوڑ کر ساحل کے ساتھ ساتھ اپنا قافلہ لے کر بحفاظت اس علاقے سے گزر گئے جہاں ان کو مسلمانوں کی طرف سے مداخلت (INTERCEPTION) کا اندیشہ تھا۔ ادھر جب لشکر والوں کو قافلے کے بحفاظت مکہ پہنچنے کی اطلاع ملی تو وہاں یہ چہ میگوئی شروع ہو گئی کہ ہم تو قافلے کی حفاظت کے لیے آئے تھے، اب جب کہ قافلہ بحفاظت کے ساتھ نکل گیا ہے تو جنگ کی کیا ضرورت ہے!

حکیم ابنِ حزام کی کوششیں: اس موقع پر حکیم ابنِ حزام — جو اگرچہ اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے لیکن ان میں بنیادی طور پر ذاتی شرافت موجود تھی، — عتبہ ابن ربیعہ کے پاس گئے جو اس لشکر کا سپہ سالار تھا، اور اس سے کہا کہ اب جب کہ قافلہ محفوظ گزر گیا ہے تو خواہ مخواہ کی خوں ریزی کی کیا ضرورت ہے، مقابلے میں اپنے ہی بھائی بند ہیں — مقابلہ کن کے مابین تھا اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا — اگر تم چاہو تو مسلح تصادم ٹل سکتا ہے۔ عتبہ ابن ربیعہ نے جو خود بھی ذاتی طور پر ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا، اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ اس کام کے لیے کیا تدبیر اختیار کی جائے! حکیم ابنِ حزام نے مشورۃً کہا کہ اس لشکر کشی کا ایک مقصد قافلے کی حفاظت تھا اور دوسرا عمرو ابن عبداللہ الحضرمی کے خون کا انتقام، — جو وادیٔ نخلہ کی مہم میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا — اس کا باپ چونکہ تمہارا حلیف تھا لہٰذا تم اس کا خون بہا ادا کردو تو وہ مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا اور قافلہ تو بچ کر نکل ہی گیا ہے۔ عتبہ نے کہا کہ آؤ پھر ابن ہشام (ابوجہل) کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ اس کے بغیر جنگ ٹل نہیں سکے گی۔ ابوجہل جو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا اور دعوتِ توحید کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے درپے تھا، وہ کیسے یہ گوارا کر سکتا تھا کہ یہ سنہری موقع ہاتھ سے نکل جائے!

ابوجہل کی چال: ابوجہل نے جسے مشرکینِ قریش میں اپنی ذہانت و فطانت اور اسلام دشمنی کی بنیاد پر ایک امتیازی مقام حاصل تھا، اپنی ذہانت کو کام میں لاتے ہوئے دو داؤ آزمائے۔ ایک تو اس نے طعنہ دیا کہ "عتبہ! معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیکھ کر بزدلی آڑے آ گئی" — اس لیے کہ عتبہ کے بیٹے حضرت

حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ واقعۃً نبی اکرمؐ کے ہم رکاب تھے اور سابقون الاوّلون میں شا
تھے ـــ عتبہ جیسے شخص کے لیے بزدلی کا طعنہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے وہی جو
دیا جو ایک باغیرت و باحمیت انسان کو دینا چاہیئے ـــ اس نے کہا کہ "کل کا دن بت
گا کہ بزدل کون ہے!" ـــ ابوجہل نے دوسرا وار کیا کہ عمرو ابن عبداللہ الحضرمی کے بھا
کو بلایا، اور اس سے کہا کہ دیکھو کل ہم تمہارے بھائی کے خون کا بدلہ لے سکتے ہیں لیکن ہم
سپہ سالارِ جنگ نہیں چاہتا۔ اس شخص نے عرب جاہلیت کے دستور کے مطابق اپنے کپڑ
پھاڑے اور قبائلی عصبیت کو بھڑکانے کے لیے واویلا مچانا اور چیخنا چلّانا شروع کر دیا
' واعمراہ ۔ واعمراہ' ۔ میرے بھائی کے خون کا انتقام لینے کا سنہری موقع ضائع ہو ر
ہے۔ قبائلی زندگی میں یہ سب سے زیادہ مشتعل کرنے والا نعرہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پور
لشکر میں جوش و خروش کی آگ ازسرِنو بھڑک اٹھی اور اس طرح حکیم ابن حزام اور عتبہ کی کوششیں
ناکام ہوئیں اور فیصلہ ہوگیا کہ بہرصورت کل جنگ ہوگی۔

غزوۂ بدر سے متصلاً قبل رات: کتبِ تاریخ میں غزوۂ بدر سے متصلاً قبل رات کی ابو
اور نضر ابن حارث کی دعائیں منقول ہوئی ہیں جن کا تذکرہ اس اعتبار سے مفید ہوگا کہ ان
آپ کو شرک کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مشرکین اللہ کے منکر نہیں ہوتے، البتہ
وہ دیوی دیوتاؤں کو بھی خدائی میں شریک سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے نام کے اصنام تراش کر ان ک
سامنے مراسمِ عبودیت بجا لاتے ہیں۔ ان سے استعانت و استمداد کے طالب ہوتے ہیں ا
اللہ کے دربار میں ان کے سفارشی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ البتہ جب کوئی بہت ہی کٹھ
اور مشکل وقت آپڑتا تھا تو یہ مشرکین اپنے من گھڑت معبودوں کو بھول کر صرف اللہ کو پکار
تھے۔ قرآن کریم میں کئی مقامات پر مشرکین کے اس طرزِ عمل کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

مشرکین کی دعائیں: اس رات ابوجہل اور نضر ابن حارث نے جو دعائیں کی تھیں ا
سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ابوجہل نے دعا کی کہ اَللّٰھُمَّ اَقْطَعَنَا لِلرَّحِمِ فَاَحِنْہُ الْغَ
"اے اللہ! جس نے ہمارے رحمی رشتے کاٹے ہیں کل تو اس کو ذلیل کر دیجیو"۔ یہ اس شخص
پکار ہے جس کی گھٹی میں قوم پرستی، نسل پرستی اور قبائل پرستی رچی بسی تھی۔ ابوجہل اور قریش
کے دوسرے بڑے بڑے مشرک سرداروں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سب
بڑا الزام یہی تھا کہ انہوں نے اپنی دعوت و تبلیغ کی بدولت قریش کو تقسیم کر دیا ہے

لاد کو والدین سے جدا کر دیا ہے، بھائیوں کو ایک دوسرے سے کاٹ دیا ہے، اس
ر پر ہماری قوت پراگندہ ہو گئی ہے۔ اسی لیے ابو جہل نے اپنی دعا میں رحمی رشتے کے
نطاع کو نمایاں کیا ہے اور اس کا واسطہ دیا تھا۔ ابو جہل کی ایک یہ دعا بھی تاریخ میں مذکور
ہے کہ اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْغَدَا ةَ یَوْمَ الْفُرْقَانِ۔" اے اللہ کل کے دن کو یوم الفرقان یعنی
ن و باطل میں امتیاز کرنے والا دن بنا دے۔" ابو جہل کی دعا کے اس حصّہ کو تو اللہ تعالیٰ نے
ل فرمالیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں غزوۂ بدر کو "یوم الفرقان" قرار دیا گیا ہے۔ جس میں اہل ایمان
فتح حاصل ہوئی ــــ نضر ابن حارث کی دعا پڑھ کر میں سخت حیران ہوا کہ ایسے لوگ بھی
ے کہ جن کی سوچ اس قدر غلط ہو گئی تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے
حابؓ کی جماعت سے مشرکین کی جماعت بہتر ہے۔ چنانچہ اس نے دعا کی کہ اَللّٰھُمَّ انْصُرْ
یرَالْحِزْبَیْنَ۔" اے اللہ، یہ جو دو گروہ بالمقابل آ گئے ہیں ان میں سے بہتر جماعت کی مدد
رمائیو۔" گویا اس کے نزدیک وہ جس گروہ میں شامل تھا وہ بہتر تھا ــــ اللہ تعالیٰ نے اس
ی دعا مسلمانوں کی فتح کی شکل میں قبول فرمالی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا: اُدھر اس رات کو حزب اللہ کے لشکر میں
ک گھاس پھونس کی جھونپڑی میں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے نہایت خشوع و
ضوع کے ساتھ مسلسل مناجات فرما رہے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ نے اس رات
لویل ترین سجدہ کیا ہے اور طویل ترین دعا کی ہے جس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ:

"اللّٰھم ھٰذہٖ قریش قد اتت بخیلا ئھا تحاول ان تکذب رسولک اللّٰھم فنصرک الذی وعدتنی، اللّٰھم ان تھلک ھٰذہِ العصابۃَ الیومَ لا تُعْبَد۔"

"بارِ الٰہا! یہ قریش ہیں جو سامانِ غرور کے ساتھ (مقابلے میں) آئے ہیں تاکہ تیرے رسولؐ کو جھوٹا ثابت کریں۔ اے اللہ! بس اب تیری وہ مدد آ جائے جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا۔ اے اللہ! اگر آج یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر (روئے زمین پر) تیری عبادت نہیں ہو گی۔"

س وقت جب کہ حضورؐ سر بسجود تھے حضرت ابو بکرؓ تلوار لیے پہرے پر کھڑے تھے۔ انہوںؓ
نے جب حضورؐ کے یہ الفاظ سنے تو عرض کیا: "حَسْبُکَ حَسْبُکَ یا رسول اللہ"

" اے اللہ کے رسولؐ، بس کیجیے، بس کیجیے۔ یقیناً اللہ آپؐ کی مدد فرمائے گا۔" اس پر حضورؐ نے سر مبارک اٹھایا اور زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے: سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔ "اس جمعیت کو شکست ہو کر رہے گی اور یہ پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے"۔ یہ گویا اللہ کی طرف سے فتح کی خوش خبری تھی۔

مقابلہ میں کون کون تھے! اب یہ بھی سن لیجیے کہ غزوۂ بدر میں مقابلے میں آمنے سامنے کون لوگ تھے! اِدھر کفار کے لشکر میں عتبہ ابن ربیعہ ہے تو ادھر اہلِ ایمان کے لشکر میں اس کے بیٹے حضرت حذیفہؓ ہیں۔ اِدھر عبدالرحمن ابن ابوبکر ہیں جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے تو اُدھر ان کے والد حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ ادھر عباس ابن عبدالمطلب ہیں، وہ بھی اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے تو اُدھر اُن کے بھتیجے جناب محمدؐ ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بھائی حضرت حمزہؓ ابن عبدالمطلب ہیں۔ ادھر ابوجہل ہے تو اُدھر حضرت عمر فاروقؓ ہیں جو رشتے میں اس کے بھانجے ہوتے ہیں۔ گویا اِدھر لشکرِ کفار میں مہاجرین کا کوئی نہ کوئی قریبی رشتہ دار موجود ہے تو ادھر حزب اللہ کے دستہ میں کفارِ مکہ کا کوئی نہ کوئی قریبی عزیز شامل ہے۔ الغرض اس پہلے معرکۂ حق و باطل میں طرفین کا سخت امتحان تھا۔ اپنے ہی ہاتھوں اپنے عزیزوں کے گلے کاٹنے کا مرحلہ درپیش تھا۔

غزوۂ بدر یا یوم الفرقان: ۱۷ر رمضان المبارک ۲ھ کی صبح دونوں لشکر بالمقابل صف آرا ہوئے۔ اُدھر سب سے پہلے عتبہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو لے کر نکلا اور عام دستور کے مطابق مبارزت طلب کی۔ اِدھر سے تین انصاریؓ مقابلہ کے لیے نکلے۔ عتبہ نے چیخ کر پوچھا: مَنْ اَنْتُمْ مِنَ الْقَوْمِ؟ — انہوں نے اپنے نام بتلائے۔ عتبہ نے کہا کہ تم ہمارے برابر کے نہیں ہو اور چیخ کر پکارا " محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہماری توہین نہ کرو، ہم کاشتکاروں سے لڑنے نہیں آئے، ہمارے مقابلہ کے لیے انہیں بھیجو جو ہمارے برابر کے ہیں۔" ایک روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر باپ کے مقابلے میں بیٹے یعنی حضرت حذیفہؓ نے نکلنا چاہا لیکن نبی اکرمؐ نے ان کو روک دیا۔ پھر حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ ابن حارث ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم مقابلہ کے لیے نکلے۔ حضرت حمزہؓ نے عتبہ کو اور حضرت علیؓ نے شیبہ کو جلد ہی واصلِ جہنم کر دیا۔ لیکن حضرت عبیدہؓ کا ولید سے سخت مقا

ہوا۔ دونوں کا بیک وقت ایک دوسرے پر کاری وار ہوا۔ حضرت عبیدہؓ کی ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ گر پڑے تو حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے آگے بڑھ کر ولید کو ختم کیا اور حضرت عبیدہؓ کو جو جاں بلب تھے، اٹھا کر لے آئے۔

مآل کار انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے چھٹے اور آخری مرحلہ یعنی مسلّح تصادم (ARMED CONFLICT) کا میدانِ بدر میں دُو بدو جنگ کی صورت میں باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ اس غزوہ میں قریش کے سرکردہ لوگوں میں سے ابوسفیان اور ابولہب کے علاوہ باقی تقریباً تمام ہی کھیت رہے۔ ابوسفیان چونکہ تجارتی قافلے کے ہمراہ تھے لہٰذا وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ابولہب بھی جنگ میں شریک نہیں تھا اس نے اپنی جگہ کرائے کا فوجی بھیج دیا تھا۔ اس معرکہ میں مشرکین قریش کے ستّر افراد واصل جہنم ہوئے جن میں ابوجہل، عتبہ ابن ربیعہ، اس کا بھائی اور بیٹا شامل تھے۔ اسی طرح نضر ابن حارث، اُمیّہ ابن خلف، عقبہ ابن ابی معیط اور ان کے ہم پلّہ اور ہم رتبہ چند دوسرے سرکردہ افراد بھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے شدید مخالف اور خون کے پیاسے تھے، گاجر مولی کی طرح قتل ہوئے۔ مزید ستّر مشرکین کو اسیر بنا لیا گیا اس غزوہ میں اہلِ ایمان میں سے تیرہؓ اصحابِ رسولؐ نے میدانِ بدر میں جام شہادت نوش فرمایا اور حضرت عبیدہؓ ابن حارث ابن عبدالمطلب کا جو زخمی ہو گئے تھے، مدینہ منورہ کی طرف واپسی کے دوران انتقال ہوا۔

انقلاب کا ایک اہم خاصہ

اس موقع پر یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ تصادم بلکہ خونی تصادم حقیقی انقلاب کا لازمی خاصہ ہوتا ہے —— ہاں محض تبلیغ یا تعلیم و تدریس کا کام ٹھنڈے انداز میں کیا جا سکتا ہے، انجمنیں اور ادارے چل سکتے ہیں۔ تصنیف و تالیف اور تحقیق کا کام ہو سکتا ہے مقالے لکھے اور شائع کئے جا سکتے ہیں، وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت ہو سکتی ہے یہ سب کام ہو سکتے ہیں لیکن جس چیز کا نام پورے نظام کی تبدیلی یا انقلاب ہے وہ تصادم اور خون بہائے بغیر برپا نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی قسم کی خوں ریزی کے بغیر اور اپنے جاں نثار اصحاب کی جانوں کا نذرانہ دیئے بغیر انقلاب برپا ہو سکتا تو کم از کم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی سیرت اور آپؐ کی جدوجہد میں مسلح تصادم کی نوبت ہر گز نہ آئی ——— لیکن بہرحال 'BLOOD SHED' ہوا ہے اگرچہ بہت ہی کم! خود حضورؐ کو اپنے کتنے ہی محبوب اصحابؓ کی جانوں کا نذرانہ اس راہ میں دینا پڑا! آپؐ کے چچا، ساتھ کے کھیلے ہوئے ہمجولی، دودھ شریک بھائی حمزہ ابن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شکم چاک، اعضاء بریدہ اور جگر چبایا ہوا لاشہ غزوہ احد کے موقع پہ آپؐ کی نگاہوں سے گزرا ہے۔ مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ جیسے جوانِ رعنا نے اس راہ میں جامِ شہادت نوش کیا ہے، جن کی مساعی جلیلہ سے مدینۃ النبیؐ میں دعوت نے جڑیں پکڑی تھیں ——— جنگِ موتہ میں منہ بولے بیٹے اور سابقون الاولون میں سے چوتھے زید ابن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضورؐ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خون اس اسلامی انقلاب کی راہ میں بہا ہے۔ حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسرؓ کی شہادت کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے۔ یہ تو چند نام ہیں جو میں نے بطور مثال پیش کئے ہیں۔ جان نثارانِ محمد علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی فہرست بڑی طویل ہے جن کا خون اور ہڈیاں اس انقلاب کی بنیادوں میں شامل ہیں۔ حتیٰ کہ اس راہ میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس خون بھی طائف کی گلیوں اور میدانِ احد میں جذب ہوا ہے۔ گویا ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار

مسلمان نوجوانوں کے لیے آئیڈیل شخصیات
اور
تعلیمِ دین کی ضرورت و اہمیّت

نوجوانوں کی ایک مقامی تنظیم کے زیرِ اہتمام منعقدہ اجتماع میں

امیر تنظیم اسلامی کا خطاب

ترتیب و تسوید: محمد اسلم عبداللہ / جاوید عبداللہ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ○ کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی ○ اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی ○ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی ○

صدق اللہ العظیم

محترم صدر مجلس، محترم خواتین اور معزز حضرات! اس تقریب میں آمد سے قبل تک میں آپ کی اس تنظیم اور اس جلسے کی نوعیت سے واقف نہیں تھا لیکن اس سب کے باوجو اس تنظیم سے متعلق دو الفاظ ایسے تھے کہ جن کی بنا پر اس دعوت کو رد کرنا میرے لئے ممکر نہ تھا۔ ایک لفظ ہے ینگ (Young) جس سے یقیناً اس بات کی طرف راہنمائی ہوئی کہ ا؟ تنظیم میں کچھ نوجوانوں کا عنصر غالب ہے۔ دوسرے آج کی اس تقریب کے عنوان میں لفظ 'اقرا' شامل ہے۔ اور 'اقرا' قرآن مجید کا پہلا لفظ ہے کہ جو محمدؐ رسول اللہ پر نازل ہوا۔ پھر یہ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے جو کہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ لہٰذا ان تینوں باتوں کی موجود میں جیسے ہی مجھے اس تقریب کی دعوت دی گئی، میں نے یہاں حاضر ہونے کا وعدہ کرلیا۔

یقیناً اس نوع کی تقاریب منعقد کرنا ایک نیک اقدام ہے۔ آپ کے اس محلے کی اکثر نوجوانوں پر مشتمل ہے جن میں بے شمار صلاحیتیں خوابیدہ ہوتی ہیں اور اُن کو بروئے کار لا کے لئے اگر اس طرح کے فورمز (Forums) ہوں جن میں صحت مند علمی و فکری اور

سرگرمی کے لئے میدان فراہم کیا جائے تو ایک طرف تو منفی رجحانات کا سدّ باب ہو جاتا ہے
اس لئے کہ عربی کی ایک کہاوت ہے کہ بیکار آدمی کا ذہن شیطان کی دکان بن جاتا ہے اور
دوسری طرف خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقع ملتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ
تنظیم واقعتاً صحت مند روایات قائم کرے' مثبت کام کے لئے نوجوانوں میں ان کی خوابیدہ
صلاحیتوں کو بیدار کرے اور ان کے اظہار کے مواقع فراہم کرے۔

لفظ Young (نوجوان) سے میرا ذہن قرآن مجید اور سیرتِ رسولؐ کے دو حقائق
کی طرف منتقل ہوا۔ حضورؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں ایک کافی بڑی تعداد
نوجوانوں کی تھی۔ ویسے تو عربی میں جوان کے لفظ کا اطلاق چالیس برس کی عمر تک ہوتا ہے۔
شاب' جس سے یہ لفظ 'شباب' بنا ہے عربی زبان میں چالیس برس تک کے انسان کے لئے
مستعمل ہے۔ اس کے بعد پھر کہولت کا دور شروع ہوتا ہے لہٰذا نوجوان یا جوان سے مراد
صرف 'Teen Agers' نہیں۔ چالیس برس کی عمر اصل میں قرآن مجید میں ایک سورۃ
مبارکہ میں اس اعتبار سے مذکور ہے کہ یہ انسان کی پختگی (Maturity) کی عمر ہے۔

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ
اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ
(سورۃ الاحقاف' آیت نمبر ۵

اس آیۂ مبارکہ میں چالیس برس کو انسان کی پختگی کی عمر قرار دیا گیا ہے اور ظاہر بات ہے کہ اس
سے مراد جسمانی پختگی (Physical Maturity) نہیں۔ وہ تو انسان سترہ اٹھارہ برس کی
عمر میں حاصل کر لیتا ہے اور پچیس اور تیس برس کے مابین اس کے عروج پر ہوتا ہے۔ اس
کے بعد سے جسمانی قوٰی میں تو کسی نہ کسی درجے میں ایک ڈھلوان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی
ہے۔ لیکن چونکہ انسان صرف قوائے طبعیہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا اصل سرمایہ اس کے
قوائے فکریہ' اس کی ذہنی صلاحیتیں' اس کا Intellect اور اس کا شعور ہے۔ اس لحاظ سے
Maturity کی عمر چالیس برس ہے اور اس سے قبل تک کے لئے لفظ 'شباب' کا
اطلاق ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی اکثریت اسی Age
Period میں شامل ہے بلکہ ان میں ایک بہت بڑی تعداد ان نوجوانوں کی بھی تھی جنہیں
Teen Agers کہا جاتا ہے۔

جن صحابہ کرامؓ نے بعد میں عظیم کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان میں سعد ابن ابی وقاص ہیں جو فاتح ایران بھی ہیں۔ آپ جب حضورؐ پر ایمان لائے تو جوانی کے آغاز میں تھے۔ حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ جب آپؐ پر ایمان لائے تو ان کی عمر نو اور تیرہ برس کے درمیان تھی۔ اسی طرح حضرت مصعبؓ بن عمیر کہ جنہوں نے مدینے میں انقلاب برپا کیا بڑے ہی بانکے اور سجیلے نوجوان تھے۔ ان کے والد بہت بڑا سرمایہ چھوڑ کر فوت ہوئے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ نے بڑی محبت سے ان کی پرورش کی تھی۔ ان کے لئے دو دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا۔ پنڈت نہرو کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ نوجوانی میں ان کے کپڑے پیرس سے سل کر آتے تھے اور وہیں دھلتے تھے کیونکہ ان کے والد موتی لال نہرو' ہندوستان کے چوٹی کے رؤسا میں سے تھے۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کے بارے میں یہی بات مشہور ہے کہ ان کا دو دو سو درہم کا جوڑا ہوتا تھا اور پورا لباس معطر ہوتا تھا کہ جب وہ اپنے کپڑے پہن کر اور آرائش کر کے نکلتے تھے تو مکے کی گلیوں میں گفتگو کا موضوع بن جاتے تھے اور جس راستے سے گزرتے تھے وہ معطر ہو جاتا تھا۔ جب یہ حضورؐ پر ایمان لائے تو ابھی نوعمر تھے۔ قبائلی طرز زندگی میں والد کی وفات کے بعد خاندان کے سربراہ کی حیثیت ازخود ان کے چچا کو حاصل ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب یہ ایمان لائے تو چچا نے ان سے کہا کہ اگر تم نے اپنے باپ کا دین چھوڑ کر محمدؐ کا دین اختیار کر لیا ہے تو اب تمہارا اپنے مشرک باپ کی دولت پر کوئی حق نہیں ہے' لہٰذا گھر سے نکل جاؤ۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ مصعبؓ فوراً تائب ہو جائے گا لیکن حضرت مصعبؓ بن عمیر نے فوراً کہا کہ اچھا اگر آپ کا یہ حکم ہے تو میں گھر چھوڑ کر جانے کو تیار ہوں اور چلنے لگے تو چچا نے معاملہ کو توقع کے بالکل برعکس دیکھ کر آخری وار کے طور پر کہا کہ یہ کپڑے جو تمہارے بدن پر ہیں یہ بھی اُسی مشرک باپ کی کمائی کے ہیں' یہ بھی اتار دو ۔۔۔ تو حضرت مصعبؓ بن عمیر نے وہ کپڑے وہیں اتارے اور مادر زاد برہنہ ہو کر گھر سے نکلے۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جلد ہی حضورؐ کے سب سے زیادہ فیض یافتہ اور تربیت یافتہ نوجوان کی حیثیت حاصل کر لی ۔۔۔ لہٰذا جب مدینے والوں نے آنحضرتؐ سے اپنے لئے کوئی معلمِ قرآن مانگا تو حضورؐ نے ان کو بھیج دیا۔

اس کے بعد مدینے میں ایک سال کے عرصے میں ان کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے سال حج کے موقع پر بہتر (۷۲) مسلمان ان کے ہمراہ تھے۔ ان لوگوں نے حضورؐ سے بیعت کی کہ

اگر آپؐ مدینے تشریف لے آئیں تو ہم آپ کی حفاظت کریں گے اور اگر مکّے والے ہم پر چڑھائی کریں گے تو ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ یہ بیعت بیعتِ عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ یہی اسلام کا 'Turning Point' ہے اور ہجرت کی بنیاد بھی یہی بیعت بنی۔ اس لحاظ سے بعد کی تمام کامیابیوں کا ذریعہ یہی بہتر(۷۲) افراد اور اُن کی بیعت بنی اور یہ بہتر(۷۲) افراد حضرت مصعبؓ بن عمیر کی ایک سالہ کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس اعتبار سے حضرت مصعبؓ بن عمیر تاریخ اسلامی میں ایک نہایت تاریخ ساز شخصیت تھے۔

مسلم نوجوانوں کے سامنے اسی طرح کے آئیڈیل ہونے چاہئیں اس لئے کہ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہوتا ہے اور اس کے کچھ اثرات بالکل غیر شعوری طور پر شخصیت پر مترتب ہوتے ہیں۔ جس سے انسان کو محبت ہوتی ہے اس سے وہ غیر شعوری طور پر متاثر بھی ہوتا ہے اور اس کے کردار کی تقلید بھی کرتا ہے۔ صحابہ کرام کی سیرت و عظمت اگر ہماری نگاہوں کے سامنے ہو اور خصوصاً نوجوان صحابہ کی تو اس سے یقیناً نوجوانوں کو اپنی شخصیتوں کی تعمیر میں مدد ملے گی۔

انہی حضرت مصعبؓ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک روز حضورؐ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے تو حضرت مصعبؓ کا گزر وہاں سے ہوا، یہ ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے تو حضور نے دیکھا کہ ان کے جسم پر صرف دو پھٹے ہوئے کمبل ہیں۔ ایک کو انہوں نے تہہ بند کی حیثیت سے لپیٹا ہوا ہے اور ایک چادر کی شکل میں ہے تو حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے کہ یہ نوجوان جس کا دو دو سو درہم کا جوڑا شام سے تیار ہو کر آتا تھا اور جدھر سے گزر جاتا تھا ادھر کے تمام راستے معطر ہو جاتے تھے اب وہ عشقِ محمدؐ میں اِس مقام تک پہنچ چکا ہے کہ جسم پر دو کمبلوں کے سوا کچھ نہیں۔ عاشقِ رسولؐ ہونے کے دعویداروں کو اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

حضرت مصعبؓ کی شہادت بھی بڑی شاندار شہادت تھی۔ اس لئے کہ یہ غزوۂ احد میں علم بردار تھے اور مہاجرین کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے جس ہاتھ میں وہ جھنڈا تھا اس پر تلوار کا ایسا وار پڑا کہ وہ کٹ گیا تو انہوں نے دوسرے ہاتھ سے اس کو تھام لیا۔ دوسرے ہاتھ کو بھی جب حملہ آور نے کاٹ دیا تو اب دونوں ہاتھوں کے بچے کھچے حصوں سے انہوں نے اس علم کو سنبھالے رکھا اور اس کو گرنے نہیں دیا۔ لیکن جب روح نے ان کے جسم کا

ساتھ چھوڑ دیا تو آپؓ علم کے ساتھ گر پڑے اور حضورؐ سے مشابہت ہونے کی وجہ سے خبر پھیل گئی کہ رسولؐ اللہ شہید ہو گئے بعد میں اس خبر کی تردید ہو گئی ۔ جب آپؓ کی تدفین کا وقت آیا تو حضورؐ کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ ان کے جسم پر صرف ایک چادر تھی ۔ بس وہی جو نیچے باندھی ہوئی تھی اور وہ چادر اتنی چھوٹی تھی کہ اگر اس سے مصعبؓ کا سر ڈھانپا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں ڈھانپتے تو سر کھل جاتا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ سر کو تو چادر سے ڈھانپ دو اور پیروں پر گھاس ڈال دو۔ یہ آخری کفن ہے جو دو دو سو درہم کا جوڑا پہننے والے کو نصیب ہوا۔ تو اصل میں ہمارے لئے یہی مثالیں اور یہی آئیڈیلز ہیں کہ جن کی طرف "ینگ" کے لفظ سے میرا ذہن منتقل ہوا۔

حضورؐ پر ایمان لانے والے ایک اور نوجوان حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص کا تذکرہ بھی یہاں غیر ضروری نہ ہوگا۔ ان کے ایمان لانے کے بعد ان کی والدہ نے مکمل بھوک ہڑتال کر دی تھی کہ اگر سعدؓ اس نئے دین کو نہیں چھوڑے گا تو وہ نہ کھائے گی' نہ پئے گی اور اپنی جان دے دے گی۔ آج کل بھی بھوک ہڑتال کے نام سے اپنے مطالبات منوانے کے لئے یہی کچھ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس عورت نے ماں ہونے کے ناطے ان پر ہر ممکن دباؤ ڈالا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ یہ بات اس سلیم الفطرت نوجوان پر کس قدر شاق گزر رہی ہوگی کہ میری ماں اپنے آپ کو ہلاک کر رہی ہے اور یہ ان کے لئے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ اسی لئے پھر قرآن مجید میں حکم آیا کہ اگر تمہارے والدین تمہیں شرک کا حکم دیں تو تم ان کا کہنا مت مانو:

"وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا"

(سورۂ لقمان' آیت ۱۵)

اسی طرح حضرت خبابؓ بن ارت بھی نوجوان تھے' ان کو دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا جاتا تھا مگر وہ ثابت قدم رہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ بھی بالکل نوجوان تھے جب ایمان لائے۔ اسی طرح ایک کثیر تعداد صحابہ کرام میں ایسے نوجوانوں کی تھی جنہوں نے غلبۂ اسلام کی جدوجہد میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔

ینگ کے حوالے سے مجھے سیرت کے بعد کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ان الفاظ ہی سے دراصل انسان کا ذہن مختلف واقعات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ہمارے ذہن میں جو یادداشتیں محفوظ ہیں وہ کچھ الفاظ کے حوالے ہی سے ریکارڈ میں ہوتی ہیں اور بسا اوقات کسی ایک لفظ کے

حوالے سے بہت سی فائلیں از خود کھل جاتی ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں میرا ذہن اصحابِ کہف کے واقعے کی جانب منتقل ہوا۔ سورۃ الکہف کے آغاز میں اصحاب کہف کا ذکر آیا ہے۔ اُن کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے ذکر پر قرآن مجید میں لگ بھگ ساڑھے تین رکوع ہیں۔ انہی اصحابِ کہف کے حوالے سے اس سورت کا نام بھی ہے۔ جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو مسلمان سورۃ الکہف پوری یا کم سے کم اس کی ابتدائی اور آخری آیات ہر جمعے کو پڑھے گا وہ دجّال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ اصحابِ کہف کون تھے؟۔ قرآنِ مجید نے ان کو اس طرح Introduce کرایا ہے:

"اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى" (سورہ الکہف' آیت ۱۳)

کہ یہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تو اللہ نے ان کی ہدایت اور راہنمائی میں اضافہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ اگر آپ اس کی طرف بڑھیں گے تو وہ آپ کو اور ترقی دے گا اور بڑھاتا چلا جائے گا۔ یہی بات ایک حدیثِ قدسی میں عجیب کیف آور انداز میں بیان کی گئی ہے کہ میرا بندہ میری طرف اگر چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بندہ اگر میری طرف ایک بالشت بھر آتا ہے تو میں اس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں۔ یعنی اگر کوئی انسان اپنے رب کی طرف رخ کرے' اس کی رضاجوئی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے تو پھر اللہ تعالیٰ جو بلند مراتب عطا فرمائیں گے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تو ان کے لئے خاص طور پر کہا گیا ہے کہ:

"وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تو ہم نے ان کی ہدایت کے اندر ان کو خوب ترقی دی"۔

(جاری ہے)

سوات کے علاقے میں تنظیم اسلامی کے دعوتی کام کی توسیع

مرتب: میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد

راقم پشاور کے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک عشرہ کے لئے سوات کے علاقہ میں دعوتی پروگرام کی غرض سے گیا تھا۔ اس دعوتی پروگرام میں حافظ جمیل اختر اور بھائی وارث خاں رفیقِ سفر تھے۔ حافظ جمیل اختر تو پانچ دن کے لئے ہمارے ساتھ رہے جبکہ وارث بھائی اختتامِ پروگرام تک ساتھ رہے۔

ہم پشاور سے تنظیم کی سوزوکی میں جمعہ ۲۰ر جولائی بعد نماز جمعہ روانہ ہوئے اور پھر واپس یکم اگست کو پشاور پہنچے۔

اس پروگرام میں یہ حکمتِ عملی اپنائی گئی کہ گزشتہ دعوتی سفر میں (جو کہ ستمبر ۸۹ء میں ہوا تھا) جن حضرات سے رابطہ ہوا تھا ان کے توسّط سے ان کی مساجد میں دعوتی پروگرام کرائے جائیں۔ اس میں ہم نے اپنی سوچ کے مطابق ان حضرات سے بھی رابطہ رکھا جو کہ کسی درجہ میں ہمارے مجموعی فکر سے ہم آہنگی رکھتے تھے اور ان سے تعاون کی امید تھی۔ اس سفر کے دوران یہ بھی پیش نظر تھا کہ ہم رفقاءِ تنظیم سے رابطہ قائم کریں۔ اس ضمن میں تین رفقاء سے ملاقات ہوئی۔ ہم حد درجہ ممنون ہیں خواجہ عبد الباری صاحب کے کہ ان کے ہاں قیام نے ہمارے کام کو آگے بڑھانے میں بہت مدد دی۔ اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے شکرگزار ہیں کہ اس سفر میں اس کی خصوصی نصرت ہر طرح سے ہمارے شاملِ حال رہی۔ ہمارا کل سفر ۱۱۰۰ کلومیٹر سے زائد رہا۔

اس سفر کے دوران چند ایسے احباب سے ملاقات ہوئی جن سے امید پیدا ہو گئی کہ وہ انشاء اللہ تنظیم کی دعوت کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔ تمام سفر کے اجمالی خاکہ کے بعد قدرے تفصیل کے ساتھ روداد ملاحظہ ہو:

تربیتی پروگرام کے لئے سوات کے علاقے کا چناؤ اس اعتبار سے کیا گیا کہ گزشتہ سال ستمبر میں دانش آباد کے شکیل احمد صاحب کے ہمراہ ایک سفر کیا تھا جس میں بنیادی طور پر میثاق کے قارئین سے ملاقات اور ان کی کیفیت کا اندازہ لگانا پیش نظر تھا کہ وہ کس حد تک تنظیم کے فکر کو سمجھ چکے ہیں۔ ملاقاتوں سے یہ بات سامنے آئی کہ اکثر و بیشتر حضرات کسی حوالہ سے میثاق کے خریدار بنے تھے مگر تنظیم کے فکر سے پوری

طرح واقف نہیں تھے۔ البتہ سوات کے علاقہ میں قارئینِ میثاق کی اکثریت جماعت اسلامی کے متفق حضرات کی تھی۔ اس سفر میں سابقہ ملاقاتوں اور ذاتی مشاہدوں کو سامنے رکھتے ہوئے کام کا آغاز کیا گیا۔

۲۰ر جولائی کو مینگورہ پہنچنے کے بعد خواجہ عبد الباری صاحب کے دولت کدہ پر گئے۔ وہ گھر پر موجود نہ تھے، مگر ان کے بڑے بیٹے عطاء اللہ نے ہم کو ٹھہرنے کی پر زور دعوت دی بلکہ مجبور کیا۔ رات کے قیام کے بعد صبح ۲۱ر جولائی کو مشورہ کر کے یہ طے کیا گیا کہ پہلے محمد صدیق رفیق تنظیم اسلامی کو تلاش کیا جائے۔ اگر وہ مل جائیں تو پھر ان کے مشورے سے باقی پروگرام ترتیب دیئے جائیں۔ اور اگر وہ نہ مل سکیں تو تنظیم کے دوسرے رفیق حضرت رحمٰن موضع چوگا کو ملا جائے۔ عزیز عطاء اللہ کی وساطت سے چوگا تک کی سڑک کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ معلوم یہ ہوا کہ سوزوکی وہاں تک جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس بات کا ارادہ کر لیا کہ اگر موضع کبل میں محمد صدیق سے ملاقات نہ ہو سکی تو پھر ہم چوگا جائیں گے۔ پہلے کبل میں محمد صدیق کا پتہ کیا گیا مگر معلوم ہوا کہ وہ تربیت گاہ سے واپسی پر پنڈی رک گئے ہیں اور آنے میں دو تین دن لگ جائیں گے۔ لہٰذا موضع کبل سے ہم براہ راست چوگا روانہ ہوئے۔ تقریباً اسی نوے کلومیٹر کی مسافت طے کرنے کے بعد الوچ پہنچے۔ راستہ کافی دشوار گزار تھا اور تمام آمد و رفت کے لئے جیپ کا استعمال ہوتا ہے۔ ہم اللہ پر توکل کر کے اس پر چلتے گئے، البتہ ہر دشوار گزار جگہ پر اپنی غلطی کا احساس ہو تا گیا۔ بالآخر ہم الوچ پہنچ گئے جو کہ تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہاں سے چوگا گاؤں تک کا راستہ قطعی طور پر اس قابل نہ تھا کہ سوزوکی پر مزید سفر جاری رکھا جائے۔ لہٰذا الوچ سے جیپ کرایہ پر لی گئی اور سوزوکی کو الوچ کے تھانے میں کھڑا کر کے پولیس والوں سے نگرانی کی درخواست کی اور تقریباً سوا چار بجے چوگا پہنچے۔ وہاں سب سے پہلے رفیقِ تنظیم حضرت رحمٰن سے ملاقات کی۔ بعد عصر تا عشاء بارش کی وجہ سے کوئی پروگرام نہ ہو سکا۔ البتہ اگلے روز ۲۲ر جولائی کو تین مساجد میں پروگرام ہوئے جو ایک حد تک تنظیم کے تعارف کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ اس سے حضرت رحمٰن کو کافی حوصلہ ملا۔ امید ہے کہ اب وہ اپنے گاؤں میں تنظیم کی دعوت زیادہ مثبت انداز میں دے سکیں گے۔ یہ گاؤں دو پہاڑی ٹیلوں پر واقع ہے، جبکہ حضرت رحمٰن کے گھر اور گاؤں کے بڑے حصے کے درمیان ایک پہاڑی نالہ ہے جس کو ہر دفعہ پار کرنا پڑتا تھا۔

چوگا میں دو دن قیام کے بعد ۲۳ر جولائی کو واپس کبل شریف آباد آئے تاکہ محمد صدیق سے ملاقات ہو سکے لیکن محمد صدیق صاحب ابھی تک راولپنڈی سے واپس نہیں آئے تھے۔ لہٰذا مینگورہ واپسی کا فیصلہ کیا گیا۔ واپسی پر ایر پورٹ روڈ پر واقع مسجد خیر میں اس غرض سے رکے کہ اگر قاری گلزار احمد سے ملاقات ہو سکے تو وہ ہمارے لئے کچھ پروگرام طے کر سکیں۔ قاری صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے نہایت فراخ دلانہ انداز میں تعاون کی پیشکش کی۔ قاری صاحب سے سابقہ دورہ یعنی ستمبر ۸۹ء میں بھی ملاقات ہوئی تھی مگر نہایت مختصر۔ قاری گلزار احمد اکوڑہ خٹک میں دار العلوم حقانیہ سے فارغ ہیں، لاہور میں جماعت اسلامی کے

حلقہ سے بھی وابستہ رہے ہیں اور جماعت اسلامی سے کٹ جانے کے بعد تبلیغی جماعت میں بھگ ایک سال مسلسل لگا چکے ہیں۔ ان تمام خواص کے ساتھ وہ تنظیم اسلامی کے لئے ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ان کا تعاون ہمارے لئے کافی سودمند رہا۔ ان سے ملاقات میں ان کی مسجد میں دو خطابات طے پائے۔ مسجد خیر کے بنانے والے سابقہ وزیر حاجی محمد رحمٰن سے ایک ملاقات بھی طے پائی۔ یہ تمام پروگرام ۲۴ر جولائی بعد نماز ظہر تا نماز عشاء کے لئے طے پائے۔ رات کو قیام کے لئے خواجہ عبدالباری صاحب کے ہاں آئے۔ اس دفعہ خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔

گزشتہ سفر میں مینگورہ ہسپتال کے ڈاکٹر نثار احمد صاحب اور سوات الیوزیشن پلانٹ کے سینئر منیجر فنانس محمد یونس صاحب سے بڑی مفید ملاقاتیں ہوئی تھیں' لہٰذا ۲۴ر جولائی کی ملاقاتوں میں ان دو حضرات سے رابطہ کو اولیت دی گئی۔ سب سے پہلے ہم ڈاکٹر نثار احمد صاحب سے ملنے گئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے بلا تأمل مورخہ ۲۵ر جولائی بعد نماز عشاء اپنے محلہ کی مسجد میں پروگرام طے کرا دیا۔ ڈاکٹر نثار صاحب سے ملاقات کے بعد محمد یونس صاحب سے ملنے گئے۔ وہ بھی نہایت تپاک سے ملے۔ سابقہ ملاقات ان کو خوب یاد تھی۔ ہمارے مطالبے پر انہوں نے ۲۶ر جولائی کا دن طے کر لیا۔ البتہ مسجد اور وقت کے تعین کے لئے دوبارہ ۲۶ر جولائی کی صبح کو ملاقات کی ہدایت کی۔ یونس صاحب سے ملاقات کے بعد ہم محمد صدیق کے بھائی کی دکان پر گئے جہاں سے معلوم ہوا کہ محمد صدیق واپس آ چکے ہیں البتہ گاؤں میں ہیں۔ ہم نے ان کے بھائی کے پاس پیغام چھوڑ دیا کہ ہم ان کا انتظار مسجد خیر میں کریں گے۔ نماز ظہر کے بعد حاجی محمد رحمٰن صاحب سے ملاقات ہوئی جو کافی حوصلہ افزا رہی۔ قاری گلزار صاحب نے عصر کے بعد ایک مسجد میں ہمارا پروگرام طے کر دیا۔ اسی طرح مینگورہ کی حقانی مسجد میں بھی بعد نماز عصر ایک پروگرام ہوا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق بعد نماز مغرب مسجد خیر میں مقیم دینی مدارس کے طلبہ سے "دین بطور نظام زندگی" کے موضوع پر بات ہوئی اور اسی مسجد میں بعد نماز عشاء معمول کے درس کی جگہ وارث خان نے سورۃ العصر کا درس دیا جسے کہ کافی سراہا گیا۔ رات کے کھانے کی دعوت حاجی صاحب کی طرف سے تھی۔ کھانے کے دوران یہ طے پایا کہ مولانا رشید احمد اشرفی صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے گاؤں شاہین جایا جائے۔ اس کے لئے ۲۵ر جولائی کو صبح آٹھ بجے روانہ ہونا طے پایا۔ رات کا قیام خواجہ صاحب کے ہاں ہی رہا۔

۲۵ر جولائی کو پہلے شاہین گئے۔ وہاں پر مولانا رشید احمد اشرفی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے علاقہ میں دعوتی پروگرام کے لئے آمادگی ظاہر کی مگر فرمایا کہ اس کے لئے بعد میں کوئی اور وقت رکھ جائے۔ اس سفر میں قاری گلزار احمد صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ شاہین میں ہائی سکول کے استاد روئید خان سے بھی ملاقات ہوئی۔ مینگورہ واپسی پر نماز عصر سے قبل حافظ جمیل اختر واپس پشاور کے لئے روانہ ہو گئے' چونکہ ان کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ اس کے بعد رفیق گرامی وارث خان اور راقم ہی اختتام پروگرام تک ساتھ رہے۔ محمد صدیق صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنی مسجد جو کہ گاؤں کی واحد مسجد ہے؛

خطاب جمعہ کے لئے پروگرام طے کرایا۔ اس کے علاوہ عشاء میں درس قرآن کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر رضامندی ظاہر کی گئی البتہ دن کا تعین صدیق بھائی نے گاؤں میں مشورہ سے طے کرنا مناسب سمجھا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر نثار احمد صاحب کی دعوت پر ان کے محلّہ کی مسجد میں بعد نماز عشاء بجلی کی عدم موجودگی کے باوجود ایک بھرپور درس قرآن ہوا جو کہ خطاب کی جامعیت اور حاضرین کی تعداد کے لحاظ سے بہت اچھا رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ضیافت سے ہماری تواضع فرمائی۔ اس دعوت میں ڈاکٹر صاحب کے والد محترم اور مسجد کے امام صاحب بھی شریک ہوئے۔ رات کے قیام کے لئے حسب معمول خواجہ عبد الباری صاحب کے ہاں آئے۔

۲۶ر جولائی کو سب سے پہلے یونس صاحب سے ملے۔ انہوں نے اپنے محلّہ کے قریب واقع مسجد میں بعد نماز عصر پروگرام طے کر لیا تھا۔ بعد ازاں دو حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ان میں قاری حکیم محمد مشتاق قابل ذکر ہیں کہ وہ ڈاکٹر کمال عثمانی کے دروس میں شامل ہوتے رہے ہیں اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درس قرآن میں شرکت اور ان سے ملاقات کی شدید خواہش رکھتے ہیں' لیکن چونکہ وہ ایک معروف حکیم ہیں اس لئے اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔ ان سے ملاقات خاصی مفید رہی۔ حکیم صاحب کا مطب مینگورہ کے ایک معروف چوک میں ہے۔ نماز ظہر کی ادائیگی کے لئے جب مسجد خیر گئے تو قاری گلزار صاحب نے ایک عالم دین مولانا نعیم اللہ سواتی سے ملاقات کے لئے خواہش کا اظہار کیا۔ تھوڑے سوچ بچار کے بعد مولانا صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے گاؤں درشخیلہ روانہ ہوگئے اور نماز عصر سے قبل ایک گھنٹہ کی ملاقات کے لئے بخوبی وقت نکل آیا۔ مولانا نعیم اللہ جامعہ الفاروقیہ کراچی سے فارغ ہیں۔ تبلیغ میں ایک سال لگا چکے ہیں اور ابھی حال ہی میں مولانا سلیم اللہ صاحب مہتمم جامعہ الفاروقیہ ان کے ہاں ایک ہفتہ قیام کر کے گئے تھے۔ مولانا نعیم اللہ صاحب نے قاری گلزار صاحب کی دعوت پر وارث خان صاحب کو برائے خطاب قبول کیا اور ۲۷ر جولائی بعد نماز عصر کے لئے پروگرام طے ہوا۔ واپسی پر محمد یونس صاحب کی مسجد میں پروگرام بھی بخیر و خوبی ہوا۔ محمد صدیق صاحب نے اپنے گاؤں کی مسجد میں بعد نماز عشاء درس قرآن کے لئے پروگرام طے کر دیا تھا اور یونس صاحب والی مسجد ہی میں ہمارے منتظر تھے۔ چنانچہ بعد از خطاب ہم شریف آباد روانہ ہوئے۔ شریف آباد میں ایک بھرپور درس قرآن ہوا۔ رات کا قیام محمد صدیق کے ہاں

۲۷ر جولائی کو فجر کی نماز کے بعد سورۃ فاتحہ کا درس ہوا۔ نماز جمعہ کا خطاب بھی بھائی وارث خان نے کیا۔ طعام سے فراغت نماز جمعہ سے قبل ہو گئی تھی۔ اس لئے نماز جمعہ کے بعد ہم اب درشخیلہ جانے کے لئے تیار تھے۔ پہلے مسجد خیر سے قاری گلزار صاحب کو ساتھ لیا اور پھر مینگورہ سے درشخیلہ روانہ ہوئے۔ نماز عصر کا بیان درشخیلہ کی مسجد میں ہوا۔ مولانا کو چند کتابیں بطور تحفہ پیش کیں۔ امید کی جا سکتی ہے کہ مزید ملاقاتوں سے مولانا تنظیم کی انقلابی دعوت کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم!۔

شخیلہ سے واپسی پر رات کا قیام مسجد خیر میں ہوا۔

۲۸ر جولائی کو چند طالب علموں سے ملاقات ہوئی۔ محمد صدیق صاحب نے جمال نامی ایک صاحب سے ملاقات کے لئے آمادہ کیا۔ نماز مغرب سے قبل جمال صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مغرب کی نماز میں خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی مسجد میں پروگرام رکھنے کی ان کی اپنی خواہش بھی تھی۔ ہم نے ان سے عشاء کے بعد خطاب کے لئے اجازت چاہی جو انہوں نے بخوشی دے دی۔ اور اس طرح عشاء کا خطاب ان کی مسجد دعوتِ اسلام محلّہ زمرد خان میں ہوا۔ محمد صدیق نے مزید دو دیہات میں ۲۹ر جولائی کے لئے پروگرام طے کرا دیئے۔

۲۹ر جولائی کو موضع تو تانوہ بانڈہ میں پروگرام بعد نماز ظہر تھا۔ اس سے قبل قارئین 'میثاق' سے ملاقات کے لئے قبل از ظہر کا وقت رکھا گیا تھا۔ ان میں قابل ذکر محمد کریم صاحب ہیں جو کہ پیشہ کے لحاظ سے استاد ہیں۔ ان کو کتابچوں کا سیٹ لائبریری کے لئے دیا گیا۔ انہوں نے اگلے روز کے لئے اپنے محلّہ کی مسجد میں بعد از مغرب پروگرام طے کر دیا۔ اس کے بعد تو تانوہ بانڈہ روانگی ہوئی اور مسجد نورِ اسلام میں درس قرآن ہوا۔ پھر وہاں سے دوسرے موضع کے لئے روانگی ہوئی۔ ڈھیرہ میں دو مساجد اور ایک مقامی حجرہ (چوپال) میں دعوتی پروگرام ہوا۔ رات کا قیام محمد صدیق صاحب کے ہاں شریف آباد میں ہوا۔

۳۰ر جولائی کو کبل عقیل میں مقامی مسجد میں بعد نماز ظہر درس قرآن ہوا اور ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو کہ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہونے کے باوجود اقامتِ دین کے تصور سے آشنا تھے۔ انہوں نے تبلیغی جماعت میں اس کمی کی نشاندہی بھی کی۔ کبل گاؤں کی ایک اور مسجد میں محمد صدیق کے ایک دوست کی وساطت سے بعد نماز عصر کا پروگرام طے تھا' جس سے فراغت کے بعد کبل گاؤں سے مینگورہ کے مضافاتی گاؤں برمانے آئے جہاں پر محمد کریم صاحب کو منتظر پایا۔ خطاب بعد نماز مغرب ہوا۔ اس کے بعد مسجد خیر گئے اور قاری صاحب سے درس قرآن کے حوالے سے دینی فرائض اور دین بطور نظام زندگی کے موضوع پر اظہار خیال کے لئے اجازت چاہی' جس کو قاری صاحب نے بخوشی دے دیا۔ یہ درس قرآن حاجی محمد رحمن صاحب نے بڑے غور اور دلچسپی سے سنا۔ مسجد خیر مینگورہ کی اچھی مساجد میں سے ایک ہے جس کے ہال میں تقریباً ۵۰۰ سے زائد نمازی سما سکتے ہیں۔ مسجد کا صحن کشادہ اور اعلیٰ قسم کی گھاس سے مزین ہے جو کہ نظری اور قلبی تسکین کا ذریعہ بنتا ہے۔ نمازیوں کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے۔ ۳۰ر جولائی کا قیام مسجد خیر میں رہا کیونکہ یہاں سے واپسی کا پروگرام طے پا گیا اور ۳۱ر جولائی کو فجر کے بعد بونیر کے راستے جاتے ہوئے راستے میں میثاق کے قاریوں سے ملاقات اور رفقاء تنظیم سے رابطہ استوار کرنا اس سفر کے مقاصد ٹھہرے۔

۳۱ر جولائی کو طے شدہ پروگرام کے مطابق بعد نماز فجر روانگی ہوئی۔ راستے میں تور ورسک میں ہیڈ ماسٹر فضل حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی جن کا جماعت سے گہرا تعلق ہے۔ مگر اس بات کا پختہ یقین رکھتے ہیں

کہ انتخابات کے ذریعے اسلامی نظام کا لانا ناممکن نظر آتا ہے۔ راستے سے ہٹ کر ایک موضع بام پوخہ ہے جہاں کبھی میثاق کے تیرہ قارئین ہوتے تھے اور یہ سب ایک صاحب بخت زادہ جو کہ پیشہ کے لحاظ سے استاد ہیں اور ان کے بڑے بھائی کی کاوشوں کا نتیجہ تھے۔ مگر پھر یہ لوگ جماعت اسلامی پر کڑی تنقید کے حوالے سے میثاق پڑھنے سے "تائب" ہو گئے۔ البتہ بخت زادہ اور ان کے بڑے بھائی میرزادہ ابھی تک میثاق بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور ان کا نظریہ بھی وہی ہے جو کہ فضل حکیم کا ہے۔ فضل حکیم صاحب ہم کو میرزادہ صاحب سے ملاقات کے لئے لے گئے۔ پھر ان دو حضرات نے بہرمند صاحب سے ملاقات کے لئے ہماری سعیت اختیار کی۔ بہرمند صاحب جماعت اسلامی کے رکن ہیں۔ ان سے گفتگو کے دوران کافی بحث ہوئی۔ البتہ ان تین حضرات نے اپنے اجتماعات اور خاص طور پر محترم ڈاکٹر صاحب کی پشاور آمد کے بارے میں اطلاع دینے کی خصوصی تاکید کی تاکہ مزید افہام و تفہیم ہو سکے۔ ان تین حضرات سے ملاقات کے بعد اب ہم کو ناوگئی جانا تھا تاکہ میران شاہ صاحب سے ملاقات ہو سکے۔ ان صاحب نے سپن جماعت میں ڈاکٹر صاحب سے براہ راست بیعت کی تھی مگر اس کے بعد ایسے سکوت اختیار کیا کہ اس ملاقات سے قبل تک یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بقید حیات بھی ہیں یا کہ نہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی جو اگرچہ زیادہ امید افزا تو نہ تھی مگر پھر بھی اپنی حد تک ان کو فعال ہونے کی تاکید کی۔ رات کا قیام ان ہی کے ہاں رہا اور پھر پروگرام بنایا کہ یکم اگست کو بعد از فجر واپسی کی جائے۔

البتہ ایک ملاقات کا ذکر رہ گیا۔ ناوگئی جاتے ہوئے ڈگر میں ایک صاحب شیر بہادر سے بھی ملے۔ ان کو ہم رشید احمد اشرفی صاحب کے حوالے سے جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے بھائی کے مرشد صاحب کا گاؤں بھی راستے میں پڑتا تھا۔ ان سے ملاقات کے لئے بھی گئے اور تین عدد کتابچے ہدیہ کئے۔

خصوصی ملاقاتیں

سراج الدین صاحب میثاق کے قاری اور سابق رکن جماعت ہیں، جنہیں جماعت سے نظم کی کسی خلاف ورزی کی بنا پر علیحدہ کر دیا تھا۔ انہوں نے حال ہی میں ڈاکٹر صاحب کو اپنا ایک کتابچہ "پاکستان کا فرسودہ اقتصادی نظام" بھیجا ہے جس کے جواب میں عاکف سعید صاحب نے سراج صاحب کو خط بھی لکھا ہے۔

فضل ربی راہی: یہ 'ندا' کے قاری ہیں اور ان کا ایک خط ۳۱؍ جولائی والے ندا میں -/۱۰۰۰ روپے کی پیشکش کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ نہایت سلیم الفطرت انسان ہیں۔ ابھی بی اے کا امتحان دیں گے۔ ان سے ہم کافی متاثر ہوئے۔ ان سے اقتدار صاحب کا اگر رابطہ ایک دفعہ بھی ہو جائے تو یہ 'ندا' کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

فضل حکیم صاحب، میرزادہ صاحب اور محمد کریم صاحب: کافی حد تک متاثر ہیں، صرف ایک ایسے

موقعے کی تلاش میں ہیں جس سے اپنے ان خیالات کو منظرِ عام پر لائیں۔ امید ہے کہ ستمبر کا اجتماع سرحد اس کے لئے وجہ بن جائے گا۔

ایک وضاحت : تمام خطابات اور دروسِ قرآن بھائی وارث خان نے دیئے اور راقم کو اپنی کوتاہی کا احساس گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ اس دفعہ عزم تو کیا کہ خطاب کے لئے موزوں حوالے یاد کروں اور دعوتی پروگرام میں بھرپور حصہ لوں۔ آپ حضرات سے دعاؤں کی خصوصی درخواست ہے۔

تنظیم اسلامی پاکستان کے زیرِ اہتمام

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان میں منعقد ہونے والے

آئندہ پروگرام

(۱)

ہفت روزہ تربیت گاہ

۲۸ر ستمبر ۹۰ء سہ پہر تا ۴ر اکتوبر ۹۰ء شام

(۲)

توسیعی مشاورت

۶ر تا ۹ر اکتوبر ۹۰ء

تنظیم اسلامی کے طے شدہ مشاورتی نظام کے مطابق رفقاء کی آراء سے استفادہ کی خاطر اس میں رفقاء کے اظہارِ خیال کا موقع ہو گا۔

مزید برآں یہ طے پایا ہے کہ ان شاء اللہ العزیز

آئندہ سالانہ اجتماع

۲۲ر فروری ۹۱ء جمعۃ المبارک تا ۲۵ر فروری سوموار سہ پہر منعقد ہو گا!۔

افکار و آراء

مسئلہ زن — ایک غور طلب پہلو

—— از قلم : علامہ غلام شبیر بخاری ——

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ہر سال محاضرات قرآنی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس سال بھی مارچ کے آخری ہفتے میں جناح ہال میں محاضراتِ قرآنی کا انعقاد ہوا۔ موضوع اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی تھا اور اس کا ذیلی موضوع "مرد اور عورت کے درمیان حقوق و فرائض کا منصفانہ توازن" جس میں مجھے بھی محترم مفتی محمد حسین نعیمی، محترم ظفر احمد (کراچی) اور محترم محمد اسحاق بھٹی کے ساتھ بطور مستفسر مدعو کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اسلام میں مرد اور عورت کے درمیان حقوق و فرائض کے منصفانہ توازن سیر حاصل بحث کی اور قرآن و سنت کی روشنی میں بتایا کہ دونوں کے یکساں حقوق ہونے کے باوجود اُن کے کام کے دائرے الگ الگ ہیں۔ قوام مرد ہیں عورت نہیں اور ان کی یہ تقریر ایک گھنٹہ سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ موضوع کے مختلف پہلوؤں کو بڑی شگفتہ بیانی کے ساتھ سمیٹتی ہوئی یہ گفتگو بالآخر اس منطقی نتیجہ پر پہنچی کہ عورت کی سربراہیٔ مملکت کوئی خوبی کی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب کے بارے میں میرے ذہن میں صرف ایک ہی سوال ابھرا کہ کیا یہ تصریحات بائیس علماء کے اکتیس نکات میں شامل نہ تھیں؟ اور اگر علماء کی متفقہ تجاویز پر بڑی کامیابی کے ساتھ پاس ہو جانے والے دستورِ مملکت میں یہ اہم فروگزاشت رہ گئی ہے اور اب اگر اس میں ترمیم کی جانا ہے تو اس کے لئے راستے کھلے ہیں۔ رائے عامہ کو ہموار کیجئے اور اس کے مطابق دستور میں سربراہیٔ زن کے بارے میں فیصلہ دیجئے۔

جس حد تک ان تفصیلات و جزئیات کا تعلق ہے جن کا احاطہ پروفیسر محمد اسلم، پروفیسر ارشاد احمد حقانی، پروفیسر رفیع اللہ شہاب، ڈاکٹر محمد یوسف گورایا اور حافظ محمد صلاح الدین یوسف نے کیا ہے تو بلا شبہ یہ مسئلہ ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اور وفاقی شریعت بورڈ کے اربابِ فہم و فکر کے غور و فکر کا مستحق ہے۔ ان اداروں کو چاہئے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلے میں عامۃ المسلمین کی صحیح رہنمائی کریں۔

دراصل مرد و عورت کے حقوق و فرائض میں صحیح توازن ہی حسنِ معاشرت کی روح ہے۔ عورتیں تہذیبِ انسانی کی مقدس ترین وارث ہیں۔ کیمونسٹ ممالک میں بھی عورتوں اور مردوں کے فرائض و حقوق کے دوائر الگ الگ ہیں۔ البرٹ لو کے نزدیک سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے اس مہتم بالشان

دور میں اب تک ایسا نہیں کیا جاسکا ہے کہ تولید و پرورش و تربیتِ نسلِ انسانی کے لئے جو اعضاو جوارح
خواتین کو خلقی طور پر ودیعت ہوئے ہیں مصنوعی طور پر مردوں میں منتقل کئے جاسکے ہوں کیونکہ اس کے
بغیر برابری کا ہر دعویٰ فریب ہے۔ ۱۹۸۲ء میں مجھے بارو آف برنٹ کی ڈائریکٹر تعلیمات مس رائی کر
سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُن دنوں ملکہء انگلستان خاتون تھیں، وزیرِ اعظم انگلستان خاتون تھیں، لنڈن کی
میئر خاتون تھیں اور جب میں نے ماہرینِ تعلیمات، جن میں اکثریت خواتین کی تھی، سے کہا کہ کم از کم اس
ملک میں تو عورتوں کے حقوق محفوظ ہوں گے تو مجھے حیرانی ہوئی کہ سب نے متفق اللفظ ہو کر کہا، ہرگز
نہیں۔ خواتین کے حقوق جتنے انگلستان میں ضائع ہو رہے ہیں شاید ہی کہیں اور ہو رہے ہوں۔ اسی طرح
کی بات میری وائٹ ہاؤس نے کہی جنہوں نے کلین اپ ٹی وی کی تحریک میں نمایاں کام کیا۔ لیکن قدم
قدم پر مزاحمت اور ہمت شکنی ہوئی۔ ۱۹۸۵ء کا سال یو این او نے خواتین کا سال قرار دیا تھا اور اس
سب سے بڑی طنزیہ تھی کہ خود اقوام متحدہ کے ادارے میں خواتین کو ان کی تعداد کی نسبت سے جا
(JOBS) مہیا نہیں تھے اور نہ اب تک دیئے جاسکے ہیں۔ اس طنز کے جواب میں یو این او کے ایک
ترجمان نے پوری تاریخِ انسانیت میں جرنیلوں، کشور کشاؤں، فلسفیوں اور دانشوروں کے حالات پر
مشتمل تحقیقی جائزہ پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ زندگی کے کسی دور میں بھی عورتوں کا کام نسلِ نو کی تربیت کے
علاوہ نہیں رہا ایک اور مبصر نے کہا ہم نے آج خواتین کو گھروں سے نکال کر اور انہیں مردوں کا کام
سونپ کر ان پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ روش مرگِ امومت کی طرف ایک بہت
بڑا تباہ کن قدم ہے۔ حضرت علامہ اقبال نے کہا تھا ۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

ہمارے ہاں خواتین ڈویژن کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (المائدہ)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۹

شمارہ: ۱۰

ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

اکتوبر ۱۹۹۰ء

فی شمارہ -/۵

سالانہ زرتعاون -/۵۰

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/-
c/o Dr Khursid A. Malik
SSQ 610 73rd street
Downers Grove IL 60516
Tel : 312 969 6756

c/o Mr Rashid A Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel 313 977 8081

CANADA US $ 12/-
c/o Mr Anwar H Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1609
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/-
c/o Mr Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel 01 805 8732

MID EAST DR 25/-
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/-
c/o Mr. Hyder M O. Ghauri
AKQI 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel 42127

K S A SR 25/-
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O. Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/-
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ احوال

۴ر اکتوبر کو تنظیم اسلامی کے تحت لاہور میں باغ بیرون موچی دروازہ میں ہونے والے جلسۂ عام کی اطلاع اکثر قارئین تک پہنچ چکی ہوگی۔ تنظیم کے لیے اس نوع کے جلسے کے انعقاد کا یہ پہلا موقع ہے۔ اس سے قبل تنظیم کی دعوت اکثر و بیشتر مساجد یا عمارات کے اندر بنے ہوئے ہال کمروں تک محدود تھی۔ اِدھر کچھ عرصے سے کارنر میٹنگ کے پروگرام بھی تشکیل دیئے جاتے رہے اور چھوٹے پیمانے پر ایک آدھ جلسے کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ لیکن باقاعدہ 'جلسۂ عام' کی صورت میں تنظیم کی دعوت لوگوں تک پہنچانے کا یہ پہلا ہی معاملہ ہے ——

مارچ ۹۰ء میں سالانہ اجتماع کے موقع پر یہ طے پایا تھا کہ اب ہمیں تنظیم کی دعوت کو عوامی سطح پر پیش کرنے کے لیے مسجد سے نکلنا ہوگا۔ گویا ع "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری" کا ایک ہلکا سا عکس اب ہماری تحریکی جدّوجہد میں بھی آنا چاہیئے۔ چنانچہ اس فیصلے کو باضابطہ رُوبعمل لانے کے لیے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں 'جلسۂ عام' کے انعقاد کے پروگرام تشکیل دے دیئے گئے۔ اِس سلسلے کا پہلا جلسۂ عام ۲۵ر ستمبر کو پشاور میں منعقد ہو چکا ہے۔ (اس کی رپورٹ بھی اسی شمارے میں شامل ہے!) — اور دوسرا اور مرکزی جلسہ ۴ر اکتوبر کو موچی دروازہ لاہور میں منعقد ہو رہا ہے۔ اِس جلسے کے لیے امیر تنظیم کے خطاب کا عنوان 'نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ کا مصطفوی طریق' کا طے پایا ہے۔ الحمد للہ کہ لاہور کی مقامی تنظیم اس جلسے کی تیاری میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی۔ جلسے کی پبلسٹی کے لیے منصوبہ بندی بھی اللہ کے فضل و کرم سے عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔ (اس کی تفصیلات تو آئندہ شمارے ہی میں شامل ہو سکیں گی) تاہم ہمیں خوب اندازہ ہے کہ ہم اپنے محدود وسائل کے ساتھ اُس نوع کا 'جلسۂ عام' منعقد نہیں کر سکتے جس کے ہمارے عوام عادی ہو چکے ہیں۔ دھوم دھڑکا، شور و غوغا، بلند آہنگ نعروں کی گونج اور کروڑوں کے خرچ سے دُور دُور سے بسوں، ٹرکوں اور ٹریکٹروں سے عوام کو گھیر گھار کر لانا، یہ سب باتیں

معمول میں شامل ہو چکی ہیں ـــــ ہمارا جلسہ ان تمام چیزوں سے پاک ہوگا۔ لہٰذا عوام کی توجہ حاصل کرنے میں بہت زیادہ کامیابی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ہمیں اپنی سی کوشش تو بہرحال کرنی ہے اور اپنی آواز عوام تک پہنچانے کے لیے ہر معقول طریقہ اختیار کرنا ہے ـــــ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس جلسے کو خیر کا ذریعہ بنائے اور ہماری کوششوں کو شرفِ قبول عطا فرمائے۔ (آمین)

امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی حالیہ بیرونِ پاکستان سفر سے حسب پروگرام ۲۰ ستمبر کو واپسی ہوئی۔ جیسا کہ قارئین کے علم میں ہے، اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا (ISNA) کے موجودہ صدر جناب احمد زکی الحماد کی طرف سے امیر تنظیم اسلامی کو اسنا، کے سالانہ کنونشن میں شرکت کی پُرزور دعوت اس سفر کا محرّک بنی تھی ـــ محترم ڈاکٹر صاحب کو اس کنونشن میں بطور مہمان مقرر مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقع پر شمالی امریکہ میں مقیم تنظیم اسلامی کے رفقا کا ایک مشترکہ خصوصی اجتماع بھی ڈیٹرائیٹ میں ہوا جس میں ٹورنٹو (کینیڈا) سے بھی متعدد رفقا شریک ہوئے۔ شمالی امریکہ میں تنظیم اسلامی کے رفقاء کے لیے لائحہ عمل کیا ہو، اس اہم مسئلے پر اس اجتماع میں تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ امیر تنظیم اسلامی نے اپنے مفصّل خطاب میں امریکہ میں اسلامی انقلاب کے امکانات پر گفتگو کے علاوہ اس اہم مسئلے پر بھی وضاحت سے روشنی ڈالی کہ امریکہ و یورپ میں مقیم رفقاءِ تنظیم اسلامی پاکستان کے مقاصد کے حصول میں کس حد تک ممد و معاون ہو سکتے ہیں ـــ اور یہ موضوع بھی زیرِ بحث آیا کہ یہ رفقاء پاکستان کی تنظیم سے اپنے لیے کیا کچھ حاصل کر سکتے ہیں! اس اہم خطاب کا نصفِ اوّل اسی شمارے میں شامل ہے۔

واپسی پر عمرے کی ادائیگی کے لیے امیر محترم کو سعودی عرب میں مختصر قیام کا موقع ملا۔ اس مرتبہ چونکہ ایک ہفتے کے وِزِٹ ویزے کی سہولت موجود تھی لہٰذا اس محدود سے وقت میں سے طائف اور ریاض کے لیے بھی کچھ ٹائم نکال ہی لیا۔ اِس طرح جدہ اور ریاض کے رفقاء سے ملاقات اور گفتگو کا موقع بھی نکل آیا۔ اِس سفر میں برادرم عاطف وحید امیر محترم کے ہم رکاب تھے۔ اُن کی مرتب کردہ ایک مفصّل رپورٹ اسی شمارے میں ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہے۔

بیرونِ پاکستان سفر سے واپس تشریف لاکر اگلے ہی روز ۱۲ ستمبر کو امیر تنظیم نے مسجد دارالسلام کے اجتماعِ جمعہ میں ملکی و بین الاقوامی صورتِ حال کے بارے میں اپنے تاثرات بیان فرمائے اور موجودہ پیچیدہ صورت حال کے ضمن میں بعض تجاویز پیش کیں۔ اس تقریر کا بھرپور خلاصہ ہفت روزہ ندا کی تازہ اشاعت میں شامل ہے۔ ۲۸ ستمبر کو امیر محترم کا خطاب جمعہ قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں تھا۔ وہاں بھی ملکی و بین الاقوامی حالات زیر بحث آ گئے۔ اس خطاب جمعہ کا پریس ریلیز بھی اسی شمارے میں شامل ہے۔

○

تنظیمِ اسلامی پاکستان کے زیر اہتمام

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان میں منعقد ہونے والے

آئندہ پروگرام

(۱)

سات روزہ تربیت گاہ — ۹ تا ۱۵ نومبر ۹۰ء

(۲)

آٹھ روزہ تربیت گاہ — ۲۱ تا ۲۸ دسمبر ۹۰ء

نوٹ: تربیت گاہ کا آغاز مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں امیر تنظیم اسلامی کے خطاب قبل از نماز جمعہ (۱۱-۳۰ بجے) سے ہوتا ہے!

موت ایک اٹل حقیقت ہے!

پشاور سے تعلق رکھنے والے ہمارے ایک نوجوان ساتھی محمد شکیل کی ناگہانی موت پر پشاور ہی سے ایک دوست نے اپنے حسبِ ذیل تاثرات ہمیں ارسال کیے ہیں جو ہمیں بھی اپنے دل کی آواز محسوس ہوتے ہیں — (ادارہ)

تنظیم اسلامی پشاور کے ایک رفیق محمد شکیل کی اچانک موت کی خبر ان کی تصویر کے ساتھ مقامی اخبار مشرق میں ۱۹ر ستمبر کو شائع ہوئی۔ یہ خبر اتنی اچانک اور چونکا دینے والی تھی کہ ذہن و قلب فوری طور پر اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۸ر ستمبر کو رات کے وقت جبکہ موسلادھار بارش ہو رہی تھی وہ ایک بیکری کے اندر کچھ خریدنے کے لئے داخل ہوئے مگر واپس اپنے قدموں پر باہر نہ آسکے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ○ (یہ موت اچانک قلب کی حرکت بند ہونے سے ہوئی حالانکہ سابقہ زندگی میں اس عارضے کے کوئی آثار کبھی محسوس نہیں ہوئے' نہ شکیل مرحوم کو اور نہ ہی ان کے والدین کو)

موت ایک اٹل حقیقت ہے جس کا ایک دن معین ہے۔ جب وہ دن اور وقت آجاتا ہے تو پھر ایک لمحے کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہوا کرتی۔ یہ بات ویسے تو ہم میں سے ہر ہر شخص بڑی اچھی طرح جانتا ہے مگر اس کے باوجود کبھی کبھی جب اچانک کسی کی موت کی خبر ملتی ہے تو بالکل غیر ارادی طور پر قلب و ذہن کے لئے اس حقیقت کو قبول کرنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

مرحوم اپنی تمام تر تنظیمی کمزوریوں کے باوجود عین وقت پر کام آنے والے ایک محنتی ساتھی تھے۔ اگرچہ اجتماعاتِ اسرہ اور دیگر اجتماعات میں ان کی حاضری تسلی بخش نہیں تھی تاہم جب کبھی امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پشاور تشریف لاتے تو وہ تندہی اور لگن سے کام کرتے تھے اور ایسے موقعے پر کسی بھی فعال ترین رفیق سے پیچھے نہ رہتے تھے۔

ہم تہہ دل سے دعاگو ہیں کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے والدین اور بہن بھائیوں کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔ اے اللہ ہمارے زندوں اور مردوں' موجود اور غیر حاضر' چھوٹوں اور بڑوں' مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما! یا الٰہی تو ہم میں سے جسے زندگی دے اسے اسلام (اطاعت) پر کاربند رکھ اور جسے موت دے اسے ایمان پر موت عطا فرما! (آمین یا رب العالمین) مرسلہ:

غلام مقصود' پشاور

شمالی امریکہ میں اسلامی انقلابی تحریک کا امکان ___ اور اس کے لوازم اور تقاضے

حالیہ سفرِ امریکہ کے دوران شمالی امریکہ میں مقیم رفقاءِ تنظیم اسلامی کے ایک خصوصی اجتماع میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب

— ترتیب و تسوید: حافظ خالد محمود خضر —

محترم رفقائے تنظیم!

سب سے پہلے تو میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کی خصوصی مشیت کے تحت اس وقت ہمارا یہ اجتماع منعقد ہو رہا ہے۔ یہ خصوصی مشیت میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس سال میرا امریکہ آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، اس کے باوجود کہ دل میں اس کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ میں نے دو ماہ قبل سپین ' انگلستان اور فرانس کا جو سفر کیا تھا اس کے دوران جو چند نئی باتیں ذہن میں آئیں اور جو میں نے لندن میں وہاں کے رفقاء کے ایک اجتماع میں بیان بھی کیں ' تو اُس وقت دل میں ایک دبی ہوئی خواہش پیدا ہوئی تھی کہ اگر امریکہ جانے کی کوئی صورت بن سکے تو میں وہاں جا کر بھی یہ باتیں آپ حضرات سے براہ راست کر سکوں لیکن میں چونکہ اپنے حساب سے غیر ملکی سفر کا کوٹہ پورا کر چکا تھا اور اس سال امریکہ آنے کا کوئی پروگرام طے نہیں تھا' لہٰذا میں نے یہی سمجھا تھا کہ اس کا امکان نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں نے لندن میں رفقائے تنظیم سے جو گفتگو کی تھی اس کے کیسٹس آپ حضرات کو بھی بھجوا دیئے جائیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی بات ہوئی کہ اِسنا (ISNA) والوں نے مجھ سے اجازت لئے بغیر ہی میرا نام اپنے پروگرام میں شائع کر دیا۔ اس کے بعد ان کی طرف سے دباؤ بھی ڈالا گیا' جسے ڈاکٹر خورشید ملک صاحب نے شاید اپنے طور پر مزید بڑھایا ہو۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سفر ہو گیا اور میں یہاں

حاضر ہوں۔

اس کے ساتھ ہی میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے ساتھ خصوصی فضل و کرم کا معاملہ ہوا ہے کہ اگر ہم خود اس اجتماع کو Plan کرتے تو شاید وہ اتنا بہتر نہ ہوتا۔ یعنی بحمد اللہ یہ صورت بن گئی کہ مجھے ایک دن رفقائے شکاگو کے ساتھ علیحدہ مفصل اور Heart to heart ملاقات کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد میں نے یہاں (ڈیٹرائٹ) کے لئے خواہش ظاہر کی تو اگرچہ پہلے یہاں کے رفقاء کہتے تھے کہ Working ہونے کے باعث جمعرات کو اس پروگرام کا ہونا مشکل ہے۔ لیکن جب میں یہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ پروگرام ترتیب دے لیا گیا ہے۔ چنانچہ جمعرات کی شام کو یہاں (ڈیٹرائٹ میں) بھی ان موضوعات پر خاصی مفصل گفتگو ہوگئی۔ اسی طرح جب میں نے ٹورنٹو کے رفقاء، خصوصاً ڈاکٹر عبد الفتاح صاحب سے بات کی تو وہاں بھی یہ معلوم ہوا تھا کہ رفقاء کا وہاں سے آنا مشکل ہوگا، اس لئے کہ ہمارے بہت سے ساتھی ہفتہ کے روز کام کرتے ہیں اور ان کے لئے وقت نکالنا آسان نہیں ہوگا۔ تاہم میں نے جب اپنی اس خواہش کا زیادہ ہی اظہار کیا تو طے یہ ہوا کہ تین حضرات ضرور آجائیں گے۔ لیکن صورت حال اس کے بالکل برعکس ہوئی ہے اور ماشاء اللہ آپ حضرات بڑی تعداد میں نہ صرف خود بلکہ اپنی فیمیلیز سمیت آگئے ہیں۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت سے ہے۔ ورنہ ہم خود پلان کرتے تو شاید یہ بات اس طور سے نہ ہو سکتی۔

سورۃ الانفال میں ایک آیت بھی ہے جو اسی مفہوم کو ادا کرتی ہے غزوۂ بدر میں جب اُدھر سے کفار آگئے اور اِدھر سے حضورؐ اور صحابہ کرامؓ پہنچ گئے اور مقابلہ ہوا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہماری خصوصی مشیت سے ہوا ہے۔ اگر تم نے خود کوئی منصوبہ بندی کی ہوتی اور چاہے آپس میں مشورہ کر کے طے کر لیا ہوتا کہ فلاں وقت پر فلاں جگہ مقابلہ ہوگا، تب بھی اس میں اختلاف ہو جاتا۔ (وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ـــــــ) لیکن ہم نے اپنی خصوصی مشیت کے تحت تمہیں ایک جگہ پر جمع کر دیا ہے تاکہ اب وہ مقابلہ ہو جائے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو جائے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت کا مظہر ہے۔ بحمد اللہ آج دو گھنٹے کی نشست خالصتاً ٹورنٹو کے رفقاء کے ساتھ بھی ہوگئی۔ اس طرح گویا تمام رفقاء کے ساتھ میری گفتگو کا ایک راؤنڈ پورا ہو

چکا ہے۔ لہٰذا وہ باتیں جو میں اِن مختلف اجتماعات میں کر چکا ہوں ان کی طرف تو میں بس اختصار کے ساتھ اشارات کروں گا۔ باقی اب بات کو آگے بڑھانا ہے۔

بہرحال ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہمارے لئے حالات کو سازگار بنایا۔ اس لئے کہ انسان کا اپنا ارادہ خواہ کتنا ہی مضبوط ہو جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیسیر نہ ہو اور وہ حالات کو موافق نہ بنادے' انسان کے ارادے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس اجتماع کو بابرکت بنائے ــــــــ اور اس سرزمین پر ہم اسلام کے لئے جس نہج پر کام کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے اس کو نتیجہ خیز اور بار آور کرے۔ اللہ چاہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اس اجتماع سے ع "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!" کی صورت پیدا ہو جائے۔

دوسری بات جس کے لئے اس وقت میں آپ کے چند منٹ صرف کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ذرا اس پر نگاہِ بازگشت ڈالئے اور غور کیجئے کہ یہ 'تنظیم' ہم نے کس لئے قائم کی ہے؟ بظاہر تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو سامنے کی بات ہے۔ ہمیں تنظیم میں شامل ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا ہے اور اب یہ سوچنے کی کونسی بات ہے؟ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑا بنیادی سوال ہے اور اس کو تازہ کرتے رہنا چاہئے۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات کے اثرات پڑتے رہنے سے کسی تنظیم یا ادارے کا وہ اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا جاتا ہے جس کے لئے وہ وجود میں آیا ہوتا ہے اور کچھ درمیانی مقاصد ذہنوں پر زیادہ تسلّط کر لیتے ہیں۔ تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ذرا اس وقت اس کا بڑے اختصار کے ساتھ تجزیہ کرلیں۔ اس کا جائزہ ہمیں چار نکات کے تحت لینا ہوگا:

ا۔ سب سے پہلی بات کی قطعی اور حتمی نفی تو یقیناً ہم میں سے ہر شخص کے سامنے ہے لیکن ایسی بات کو بھی ذہن میں تازہ کرلینا ضروری ہے کیونکہ نفی کے بعد ہی اثبات ہوتا ہے ــــــــ "لا الٰہ" کے بعد ہی "الّا اللہ" ہے۔ تو نفی یہ ہے کہ ہم نے یہ کام کسی مشغلے (Hobby) کے طور پر اور وقت گزاری کی خاطر نہیں کیا۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہمارا یہ کام اس نوعیت کا نہیں ہے لیکن اس نفی کو بھی ذہن میں شعوری طور پر تازہ کرلینا چاہئے۔

ہے کمیونٹی ورک اور کمیونٹی آرگنائزیشن ۔ کیونکہ انسانوں کے اتنے بڑے سمندر میں مسلمان قلیل تعداد میں ہیں ۔ اگرچہ صورت حال رفتہ رفتہ بدل رہی ہے' لیکن تاحال بھی کوئی نسبت تناسب نہیں بنتا اور جن لوگوں میں بھی کچھ شعور ہے وہ یہ اندیشہ محسوس کرتے ہیں کہ یہاں پر ان کا تشخّص کہیں ختم نہ ہو جائے ۔ میرے نزدیک یہ کام بھی کرنے کا ہے اور آپ حضرات گواہ ہیں کہ میں نے کبھی بھی اس کی نفی نہیں کی ــــــــ لیکن ہم نے یہ تنظیم اس کام کے لئے نہیں بنائی ۔ اس کام کے لئے ادارے یہاں پہلے بھی موجود تھے ۔ مثلاً مسلم کمیونٹی سنٹر (MCC) ' ماسک فاؤنڈیشن (Mosque Foundation) جیسے اداروں کے علاوہ اسلامک سینٹرز' سکولز اور مختلف ایسوسی ایشنز ہیں ۔ ایک بہت بڑا ادارہ اِسنا (ISNA) کی شکل میں موجود ہے جس کی ذیلی تنظیمیں بھی ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے کہ اس کے لئے ہمیں کوئی علیحدہ تنظیم بنانے کی ضرورت نہیں تھی ۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اگرچہ تنظیم کے تحت بھی یہ کام ہو گا لیکن یہ کام اس کا مقصدِ تاسیس نہیں ہے ۔

۳۔ محض دعوتی کام جسے یہاں "Dawah Work" کہا جاتا ہے بھی کرنے کا ایک کام ہے اور تبلیغی و دعوتی سرگرمیاں وقت کی ایک اہم ضرورت ہیں ۔ آپ حضرات کے سامنے تبلیغی جماعت کے بارے میں میری یہ رائے ہمیشہ آتی رہی ہو گی کہ میری نظر میں وہ ایک اچھا کام کر رہی ہے 'اگرچہ اپنے مخصوص سٹائل اور معیّن ہدف کی وجہ سے انہوں نے اس کام کو محدود رکھا ہوا ہے ۔ ایک طرح سے یہ ان کے لئے ایک اچھی حکمت عملی بھی ہے کہ وہ اپنے ذہن کو زیادہ منتشر نہیں ہونے دیتے اور اپنے کام کو بھی زیادہ پھیلنے نہیں دیتے' بلکہ ایک ہی رخ پر لگے ہوئے ہیں اور اس سے انہیں زیادہ بہتر نتائج مل رہے ہیں ۔ تبلیغی جماعت کے علاوہ یہاں پر اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (ICNA) کا بھی ایک مضبوط اور منظّم حلقہ موجود ہے ۔ جس وقت ہم نے یہاں تنظیم کا کام شروع کیا تھا اُس وقت ICNA کا یہ حلقہ بہت مختصر اور منتشر تھا' لیکن اب بہرحال اس کی ایک حیثیت ہے ۔ یہ لوگ ایک بڑا عمدہ پرچہ (MESSAGE) شائع کر رہے ہیں اور ان کا کنونشن بھی ہو رہا ہے ۔ مختلف جماعتوں اور تنظیموں کے علاوہ یہاں بڑے بڑے پبلشنگ ہاؤسز ہیں ۔ ابھی اس "اسنا کنونشن" میں اٹلانٹا سے ایک صاحب آئے ہوئے تھے جو Tapes اور کتابوں کا کام بڑے

وسیع پیمانے پر کر رہے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ دعوتی اور تبلیغی کام بھی ایسا کام نہیں تھا جس کے لئے ہمیں علیحدہ سے کسی تنظیم کی ضرورت ہوتی اور جسے ہم پورے امریکہ کی سطح پر منظم کرنے کی کوشش کرتے۔

۴۔ ہمارے پیش نظر جو کام ہے وہ انقلاب برپا کرنا ہے' یعنی نظام کو بدلنا۔ ہم 'تنظیم اسلامی' کے عنوان سے جو تحریک اٹھانے اور جماعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ان بقیہ تمام کاموں سے اس اعتبار سے ممیز اور ممتاز ہے کہ ہم ایک مکمل انقلاب لانے کے علمبردار ہیں۔ ہم یہ انقلاب لا سکیں یا نہ لا سکیں یہ دوسری بات ہے۔ اس کے لئے حالات کا سازگار ہونا یا نہ ہونا ہمارے اختیار میں نہیں ہے' بلکہ اس کا دارومدار بالکلیہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے۔ وہ اس کام کو کہاں سے اور کس طریقے سے کرانا چاہتا ہے اور اس کی مشیت کیا ہے' یہ ہم نہیں جانتے' لیکن یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے لئے جدوجہد کریں۔ تو ہمارے سامنے یہ بات رہنی چاہئے کہ ہماری یہ تنظیم درحقیقت ایک اسلامی انقلابی تحریک برپا کرنے کے لئے قائم ہوئی ہے۔

اب آیئے تیسرے سوال کی طرف ------ کہ کیا اسلامی انقلابی تحریک شمالی امریکہ میں ممکن ہے؟ ایک لفظ میں اس کا جواب تو یہ ہے کہ "ہاں ہے!" آپ حضرات کے علم میں یہ بات آئی ہو گی کہ میں نے گزشتہ اِسنا کنونشن میں شرکت کے وقت یہاں جو مشاہدہ کیا اور پھر بیچ میں میں نے کچھ نوجوانوں کو دیکھا جن کا تعلق یہاں کی دوسری نسل (Second Generation) سے ہے تو مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ "دوسری نسل" سے میری مراد تارکینِ وطن کی وہ اولاد ہے جو یہیں پیدا ہوئی یا کم از کم یہیں پلی بڑھی اور یہیں اس نے تعلیم حاصل کی۔ ان میں سے جو نوجوان یہاں کی تہذیب کے اثرات سے بچ گئے ہیں اور جن میں دین و مذہب کے ساتھ وابستگی موجود ہے' انہیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ واقعتہً یہاں ایک صحیح اسلامی انقلابی تحریک کے لئے مواد موجود ہے۔ اس ضمن میں میں چاہتا ہوں کہ چند چیزیں جو اگرچہ میرے فکر اور میری سوچ کے ایسے اجزاء ہیں جو بار بار آپ کے سامنے آئے ہوں گے' دوبارہ آپ کے سامنے رکھ دوں۔ یہ چار باتیں ہیں جنہیں آپ نوٹ کر لیجئے:

(۱) کم از کم مجھے تو اس بات کا صد فی صد یقین حاصل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جس شخص کو بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان ہے وہ یقیناً اس بات کو مانے گا کہ

آپؐ نے وضاحت کے ساتھ خبر دی ہے کہ قیامت سے قبل اسلام کا ایک عالمگیر غلبہ (Global Domination) ہونا ہے۔ پھر جیسا کہ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے یہ قرآن حکیم کے دو مقامات کا منطقی نتیجہ بھی ہے۔ ایک طرف قرآن یہ کہتا ہے کہ حضورؐ کی بعثت دین کے غلبے کے لئے ہے۔ یہ 'صغریٰ' ہوا! 'کبریٰ' یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے!۔ ان دونوں کو جوڑنے سے یہ ناگزیر نتیجہ سامنے آتا ہے کہ پورے عالمِ انسانیت پر اللہ کے دین کا غلبہ ہو کر رہے گا!!۔ احادیث میں تو اس کی خبر واضح طور پر موجود ہے۔ "استحکام پاکستان" میں میں نے یہ حدیثیں پورے حوالے کے ساتھ نقل کی ہیں۔ ان میں ایک روایت حضرت مقداد ابن اسود رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس روئے زمین پر نہ گارے اور اینٹوں کا بنا ہوا کوئی گھر اور نہ کمبلوں کا بنا ہوا کوئی خیمہ باقی رہے گا جس میں کہ اسلام داخل نہ ہو جائے ـــــــ یا تو اُس گھر والے کے اعزاز کے ساتھ یا اُس کی تذلیل کے ساتھ۔ یعنی اگر وہ گھر والا اسلام قبول کر لے گا تو یہ اس کا اعزاز ہو گا۔ اور اگر وہ اسے قبول نہیں کرے گا تو بہر حال اسے جھک کر رہنا پڑے گا اور ہاتھ سے جزیہ دینا ہو گا۔ جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب کے بعد یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ چاہے اسلام قبول کر لو اور اگر یہ نہیں چاہتے تو اپنے مذہب پر قائم رہو لیکن اس صورت میں چھوٹے ہو کر رہنا پڑے گا اور جزیہ دینا ہو گا۔ یعنی ہر دو صورتوں میں تمہیں اسلام کے غلبہ کو تسلیم کرنا ہو گا۔ دوسری حدیث وہ ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ میرے سامنے پوری زمین کو لپیٹ دیا گیا اور مجھے اس کے مشرق و مغرب سب دکھا دیئے گئے اور جو کچھ مجھے دکھایا گیا وہاں پر میرا دین پہنچ کر رہے گا اور اس کا غلبہ وہاں ہو کر رہے گا۔ تو ایک بات تو یہ ہے کہ اسلام کا یہ عالمی غلبہ یقینی ہے۔

دوسری بات یہ کہ حالات و واقعات کے مشاہدے سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جن حالات کی خبریں احادیث میں آئی ہیں، واقعات بڑی تیزی کے ساتھ اُسی رخ پر جا رہے ہیں۔ اسرائیل کا قائم ہو جانا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا کہ یہودی پوری دنیا سے سمٹ کر ایک جگہ پر جمع ہو جائیں۔ کیونکہ آخری فیصلہ کن جنگ ان کے اور مسلمانوں کے مابین ہونی ہے اور اس کے ساتھ حضرت مسیحؑ کے نزول کا معاملہ متعلق ہے۔ اس کے بعد پھر اسلام کا غلبہ ہو گا اور ایک طویل عرصے تک اس روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب رہے گا۔ اس کے بعد

قیامت آئے گی لیکن اس سے پہلے کی بڑی خوفناک جنگوں کی خبریں دی گئی ہیں' جن کی طرف حالات بڑی تیزی سے جاتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ ڈیڑھ مہینے پہلے کسی کو اس کا کوئی سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنے بڑے پیمانے پر فوجی سازو سامان اور مسلح افواج خلیج کے علاقے میں اتار دی جائیں گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ عالمی سطح پر جس تیز رفتاری کے ساتھ تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کا بڑا گہرا تعلق ہے قربِ قیامت کی اُن پیشین گوئیوں سے کہ جو احادیثِ نبویؐ اور کتبِ سماویہ میں وارد ہوئی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہودیت ' عیسائیت اور اسلام تینوں مذاہب میں ایسی پیشین گوئیاں موجود ہیں جو ایک دوسرے سے مطابقت رکھتی ہیں۔ عیسائی بھی حضرت مسیحؑ کی آمد کے منتظر ہیں۔ ہمیں بھی ان کی دوبارہ آمد کا انتظار ہے اور یہودی بھی مسیحؑ کے منتظر ہیں' اس لئے کہ اصل مسیحؑ کو تو انہوں نے پہچانا ہی نہیں۔ انہیں تو مرتد اور جادوگر قرار دیا اور اپنے بس پڑتے تو انہیں صلیب پر چڑھا دیا۔ لیکن اس مسیحؑ کا انتظار تو ان کو تھا اور آج تک ہے۔ پھر تینوں مذاہب کی روایات میں "دجّال" کا ایک تصور موجود ہے۔ ناسٹرے ڈیمس کی پیشین گوئیوں پر مبنی جو فلم یہاں آج کل عام ہو رہی ہے اس میں "مخالفِ مسیح" (Anti-Christ) کا تصور دیا گیا ہے۔ ہم بھی دجّال کو انٹی کرائسٹ ہی سمجھتے ہیں جسے حضرت مسیحؑ قتل کریں گے۔ لہٰذا جو بھی دجّال آنا ہے وہ مخالفِ مسیح (Anti-Christ) ہی ہو گا۔ اب وہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ مسلمانوں میں سے ہو گا' حالانکہ وہ یہودیوں میں سے ہونا ہے!۔ تو واقعات میں ایسی تبدیلی تو آنی ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں حالات و واقعات بڑی تیز رفتاری کے ساتھ اسی رخ پر آگے بڑھ رہے ہیں۔

(۲) ظاہر ہے کہ اسلام کا عالمی غلبہ جو ہونا ہے تو اسے کہیں نہ کہیں سے تو شروع ہونا ہے' کسی ایک جگہ کو اس کے لئے Base بننا ہے کیونکہ ہمہ گیر غلبہ ایک دم سے تو نہیں ہو جاتا۔ یہ قانونِ قدرت ہے جس کا اطلاق ہر کسی پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ جزیرہ نمائے عرب میں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے انقلاب آ گیا۔ پھر اس کی توسیع ہوئی اور اس قدر تیزی کے ساتھ ہوئی کہ دریائے جیحوں سے بحرِ اوقیانوس تک محض چوبیس برس کے اندر غلبہ ہو گیا۔ اسی طریقے سے اب بھی اس کی ابتدا کہیں سے تو ہونی ہے۔ میری یہ بات بھی آپ کے سامنے کئی بار آئی ہو گی کہ اگرچہ پاکستان کے موجودہ حالات جو کئی سال سے

دگرگوں ہیں، ان کو دیکھ کر وقتاً فوقتاً مایوسی کا غلبہ بھی ہوتا ہے، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ مسلم ممالک میں سے اگر اس کا کوئی امکان ہے تو جتنا پاکستان میں ہے اتنا کہیں اور نہیں ہے۔ اس لئے کہ باقی جگہوں پر تو اکثر و بیشتر حقوق تک حاصل نہیں ہیں۔ وہاں پر بات کرنے کا بھی موقع نہیں ہے۔ کوئی کام ہوتا بھی ہے تو زیر زمین ہوتا ہے، جس سے کوئی 'دھماکہ' تو ہو سکتا ہے، کوئی پر امن تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ پاکستان کے امکان کے بارے میں میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ پچھلی چار صدیوں میں جتنا تجدیدی کام ہوا ہے وہ اسی برعظیم ہندو پاک میں ہوا۔ ہماری تاریخ کے اس سے پہلے کے ہزار برس میں سارے مجددین عالم عرب میں پیدا ہوئے لیکن گیارہویں صدی سے چودہویں صدی کے دوران عالم عرب میں صرف محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ کی ایک شخصیت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام عظیم شخصیتیں ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ پھر یہ کہ یہی واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس نے اس نام کو بدنام ہی کیا ہے، لیکن ہمیں اس خطۂ خداداد سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی تقویم لمبی ہوتی ہے، ہم فوری حالات کو دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ میں بہرحال یہ سمجھتا ہوں کہ مسلم اکثریت کے موجودہ ممالک میں سے اگر کہیں اس کا امکان ہے تو وہ پاکستان ہے۔

(۳) لیکن اتنا ہی امکان مجھے اس کا بھی نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود الوقت تمام مسلم قوموں کو مسترد کر دے اور کسی اور نئی قوم کو اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرما کر اسے اسلام کا جھنڈا تھما دے اور اسے ہی عالم اسلام کی قیادت عطا کر دے۔ جیسے تاتاریوں کے معاملے میں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک وقت میں انہی کے ذریعے سے مسلمانوں کو پٹوایا۔ پھر انہی کو اسلام کا علمبردار بنا دیا اور انہوں نے چار سو سال تک عالم اسلام کی قیادت کی۔ تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ امریکہ ہی وہ جگہ ہو جو غلبۂ اسلام کے لئے Base بن سکے۔ آج ہی کوئی صاحب کہہ رہے تھے کہ شاید احمد دیدات صاحب نے بھی یہ بات کہی ہے۔ یہ میرے علم میں نہیں تھا، لیکن میں نے سپین اور انگلستان کے سفر سے واپسی پر جا کر لاہور میں جمعہ کی جو تقریر کی تھی اس میں یہ کہا تھا کہ قربِ قیامت کی علامات میں سے ایک یہ بھی آئی ہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوگا۔ یہ بات تو اپنی جگہ برحق ہے اور قیامت کی بہت قریب کی نشانیوں میں سے ہے ــــــ لیکن کیا اسلام کا خورشید بھی اب مغرب سے

طلوع ہونا ہے؟ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشاراتی انداز میں شاید اس کا مطلب یہ بھی ہو۔ واللہ اعلم! تو میں اس کو ناممکن نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک اِس علاقے اور اِس ملک میں بھی اسلام کے لئے ایک صحیح معنی میں انقلابی تحریک چلانا ممکن ہے۔

(۴) اب ظاہر بات ہے کہ جب تک اس انقلابی تحریک کے لوازم اور ان کے تقاضوں کا پورا شعور نہ ہوگا یہ تحریک برپا نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ عام دعوتی یا ثقافتی سرگرمیوں اور اخوتِ باہمی کی تنظیموں کے لئے کچھ اور تقاضے ہیں۔ انسانی زندگی میں ان کی حیثیت تعلیقات اور ضمیموں کی سی ہوتی ہے یعنی زندگی کا اصل دھارا کسی اور رخ پر بہہ رہا ہے' اصل دلچسپیاں اور اصل توانائیاں کسی اور کام میں صَرف ہو رہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ایک ضمیمے کے طور پر ثانوی درجے میں کسی ایسے کام کے ساتھ وابستگی بھی اختیار کر لی جاتی ہے۔ تو باقی کام اس انداز سے ہو سکتے ہیں لیکن اسلامی انقلابی کام اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک معتد بہ تعداد میں ایسے لوگ نہ ہوں جو اسے بنیادی اور ابتدائی کام سمجھیں۔ یہ لوگ جب تک زندگی' زندگی کے لوازمات' معاش اور اس سے متعلق جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب کو شعوری طور پر اور صرف زبانی کلامی نہیں' بالفعل ثانوی درجہ نہیں دیں گے اُس وقت تک اسلامی انقلابی تحریک کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ تو اس کام کا پہلا تقاضا یہ ہوا کہ کارکنوں کے اندر شعوری طور پر یہ فیصلہ ہو اور وہ طے کریں کہ اب بنیادی حیثیت اس کام کی ہے' باقی ہمارے پروفیشن' ہمارے کاروبار اور ہماری ملازمتوں کی حیثیت ثانوی رہے گی۔ ہر لمحے میں ان کے سامنے دو تقاضے آئیں گے پہلا تقاضا اس تحریک کا اور اس کے لوازمات کو پورا کرنے کا ہوگا ــــــــ اور دوسرا تقاضا اپنے معاشی مسائل' خاندانی معاملات اور پیشہ ورانہ ضروریات سے متعلق ہوگا۔ انہیں بہر صورت پہلے تقاضے کو دوسرے پر ترجیح اور فوقیت دینا ہوگی!۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کام کی دو مزید بنیادی شرائط (Pre-requisites) ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہاں سے جو تحریک اٹھے اس کی قیادت یہاں کی مقامی ہونی چاہئے۔ یہ کام ریموٹ کنٹرول سے ہونے والا نہیں ہے کہ کوئی شخص دُور بیٹھے ہوئے یہاں پر کسی انقلابی تحریک کی قیادت کر سکے۔ اس کے لئے یہیں سے ابھری ہوئی 'Indigenous' قیادت درکار ہے جس کا رابطہ تحریک کے ساتھ بہت ہی قریبی ہو' تاکہ وہ فوری طور پر پیدا

ہونے والی کسی بھی صورتحال سے نمٹ سکے ۔ اس کے بغیر یہاں صحیح معنوں میں اسلامی انقلابی تحریک کا تقاضا پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اور دوسری بات یہ کہ اس میں میڈیم لامحالہ انگریزی ہونا چاہئے۔ اگر ہم نے اردو کا میڈیم استعمال کیا تو ہمارا ایک علیحدہ سا ثقافتی حلقہ بن جائے گا۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہر شے کا ہو جاتا ہے اور تارکینِ وطن کی پہلی نسل کے لوگ تو پسند کرتے ہیں کہ اردو میں تقریر یا درس ہو۔ انہیں جو لذت اس میں محسوس ہوتی ہے وہ انگریزی میں محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن ہمیں پوری سنجیدگی اور دلی آمادگی کے ساتھ شعوری طور پر یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اگر ہمیں یہاں پر حقیقی اسلامی انقلابی تحریک کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے تو اس کا میڈیم انگلش ہونا چاہئے۔

پھر یہ کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی قیادت یہاں کی دوسری نسل سے فراہم ہو' یعنی ان نوجوانوں میں سے جو یہیں پیدا ہوئے' یا کم از کم یہیں پرورش پائی اور یہیں انہوں نے ساری تعلیم حاصل کی۔ ان نوجوانوں میں جو اعتماد ہے وہ ان لوگوں میں نہیں ہے جو یہاں آئے اور پھر یہیں رک گئے۔ کوئی تعلیم حاصل کرنے آیا تو پھر یہیں ٹھہر گیا۔ ان میں اکثر حضرات ایسے تھے کہ یہاں آتے وقت ہی ان کا ارادہ مستقل قیام پذیر ہو جانے کا تھا۔ اور وہ رفتہ رفتہ یہاں Settle ہو گئے لیکن نئی نسل جو یہیں امریکہ میں پیدا ہوئی ہے یا جنہوں نے شعور کی آنکھ یہاں کھولی ہے' ایک امریکی شہری کی حیثیت سے ان کے احساسات مختلف ہوتے ہیں اور جو اعتماد وہ محسوس کرتے ہیں' دوسرے لوگ نہیں کر سکتے۔ اپنے بیرونی ممالک کے سفروں کے نتیجے میں میری سوچ میں اس اعتبار سے اضافہ ہوا ہے۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ 'سفر' کے سہ حرفی مادے 'س ف ر' سے تین لفظ بنتے ہیں۔ عربی زبان میں 'سفر' Journey کو کہتے ہیں یعنی مسافت طے کرنا۔ اس کی جمع 'اسفار' ہے اور 'سِفر' (س کی زیر کے ساتھ) کتاب کو کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع بھی 'اَسفار' استعمال ہوتی ہے۔ سورۃ الجمعہ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں : " مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ـــــــ" یہاں اسفار 'سِفر' کی جمع کے طور پر آیا ہے جس کے معنی کتاب کے ہیں' جس سے علم حاصل ہوتا ہے۔ پھر اسی 'س ف ر' سے 'اِسفار' بنتا ہے' یعنی روشنی! احناف کے ہاں کہا جاتا ہے کہ فجر کی نماز اسفار میں پڑھنی چاہئے یعنی جبکہ روشنی ہو جائے۔ چنانچہ واقعہ

ہے کہ یہ سب چیزیں Inter-related ہیں۔ کتاب سے بھی علم کی روشنی حاصل ہوتی ہے اور سفر سے بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ علم کے کئی نئے گوشے اور نئے افق سامنے آتے ہیں۔ جب انسان اپنے ماحول میں ہوتا ہے تو اسی کے مسائل و معاملات میں ذہناً الجھا رہتا ہے اور اس میں وسعتِ نظر پیدا نہیں ہوتی۔ تو مجھے اپنے ان سفروں سے یہ فائدہ بحمد اللہ ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے پچھلے سفروں سے یہاں کی نوجوان مسلم نسل کے بارے میں بڑے اچھے تاثرات قبول کئے۔

انگلستان میں بھی میں نے ایسے نوجوانوں کو دیکھا تو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے انگلستان سے میں بہت ہی زیادہ مایوس تھا۔ وہاں ہمارے لوگوں کی اکثریت کا تعلق لیبر کلاس سے ہے اور ان کی ذہنی اور تعلیمی سطح بہت ہی پست ہے۔ پھر وہاں پر بڑے جاہل قسم کے مولوی آ گئے ہیں جو پیری مریدی کے دھندے چلا رہے ہیں۔ مذہبی جھگڑے ہیں' فرقہ وارانہ فسادات ہیں' مسجدوں میں چاقو چلتے ہیں' قتل ہوتے ہیں اور پولیس وہاں پر کتوں کو لے کر آتی ہے۔ تو مجھے انگلستان کے اس مذہبی ماحول سے کافی نفرت تھی۔ لیکن اس مرتبہ مجھے بڑے شہروں کے علاوہ باہر جانے کا موقع بھی ملا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اگرچہ لندن' بریڈ فورڈ' برمنگھم' مانچسٹر وغیرہ میں تو حالت وہی ہے جو میرا پہلے سے مشاہدہ تھا۔ یہاں بڑی تعداد میں محنت کش طبقہ آباد ہے' لیکن ان شہروں سے باہر پیشہ ورانہ اہلیت کے حامل لوگ بھی بکھرے ہوئے ہیں جن کے اندر وہ جوہرِ قابل (Talent) موجود ہے۔ لیکن ان کے جوانوں کے اندر مجھے وہ اثرات وہاں بھی محسوس ہوئے جو میں نے یہاں محسوس کئے بہرحال میں یہ سمجھتا ہوں کہ قیادت جب تک یہاں سے نہیں ابھرے گی اُس وقت تک ایک حقیقی و واقعی اسلامی انقلابی تحریک یہاں پر نہیں چل سکتی۔ میں اب اس بات کو مزید واضح کر رہا ہوں۔

یہاں کی قیادت کے جو تقاضے ہیں میرے لئے انہیں پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔ نظری طور پر اس کا ایک امکان ہے' جو میں نے شکاگو میں بھی بیان کیا تھا۔ یعنی یہ کہ میں خود یہاں منتقل ہو جاؤں اور منتقل ہو کر بھی مجھے ایک دو سال یہاں کے حالات سے مطابقت و موافقت اختیار کرنے میں لگیں گے تاکہ میں پہلے یہاں کے عادات و اطوار اور طور طریقوں میں پوری طرح رنگا جاؤں اور میں پھر واقعتًہ انہی میں سے ہو کر بات کر سکوں۔ اگرچہ مجھے یہ اعتماد ہے کہ

میں یہاں کی اعلیٰ علمی سطح (Intellectual level) پر اب بھی بات کر سکتا ہوں لیکن اس کے لئے اس رنگ میں کچھ نہ کچھ رنگے ہوئے ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بارہا آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قوم کی طرف بھی کوئی نبی مبعوث فرمایا' وہ اسی قوم میں سے (مِنْهُمْ) ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ان کے مابین اختلافِ زبان جیسی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی' ان کا ثقافتی پس منظر ایک ہوتا ہے، وہ نبی اپنی قوم کے احوال سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ اس میں بہت کم استثناءات ہیں۔ مثلاً حضرت لوط علیہ السلام جن شہروں کی طرف بھیجے گئے وہ وہاں کے رہنے والے نہ تھے لیکن استثناء سے قاعدہ کلیہ کی نفی نہیں ہوتی' بلکہ اثبات ہوتا ہے (The exception proves the rule)۔ باقی جو نبی بھی ہیں وہ اپنی اپنی قوم ہی میں سے انہی کی طرف بھیجے گئے۔ از روئے الفاظ قرآنی: وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صَالِحًا ــــــ۔ اس اعتبار سے یا تو میں یہاں آکر Settle ہو جاؤں اور اس رنگ میں رنگا جاؤں تب تو شاید میں بھی یہاں پر یہ کام کر سکوں۔ لیکن یہ میں نے صرف نظری طور پر (Theoratically) کہا تھا۔ اس پر خورشید ملک صاحب جمپ کر کے آئے تھے کہ آپ کو یہاں پر آ جانا چاہئے!

لیکن جان لیجئے کہ یہ بات اب حقیقت میں ممکن نہیں۔ ایک تو اس اعتبار سے کہ جو بھی وہاں حالات ہیں' اور جس حد تک میں نے وہاں کام کو بڑھایا ہے اسے چھوڑ کر آ جانا مناسب نہیں۔ پاکستان میں کتنے ہی لوگ ہیں جنہوں نے میری طرح اپنے پروفیشن تج دیئے ہیں' اپنے کلینک بند کر دیئے ہیں اور وہ میرے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کئی وہ ہیں جنہوں نے اپنی سروسز تبدیل کرالی ہیں' بعض نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی ہے۔ بہرحال انہوں نے میرا ہی ساتھ دینے کے لئے یہ سارے قدم اٹھائے ہیں۔ اور اب وہاں پر اتنے عرصے کی محنت کے بعد یہ جو بھی گروپ بنا ہے تو ظاہر بات ہے کہ ان کا مجھ پر حق ہے۔ اور میں وہاں پر جتنا مؤثر ہو سکتا ہوں' یہاں نہیں ہو سکتا۔ اور دوسرے یہ کہ دینی اعتبار سے بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھ پر اصل ذمہ داری وہاں کی عائد ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری یہ رائے غلط ہو' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک سنت ہے۔ دعوتی کام کے ضمن میں کم از کم انبیاء کے بارے میں تو یہی اصول ہے۔ غیر انبیاء پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں' یہ بات

ہ ہو سکتی ہے۔ انبیاء کے بارے میں تو یہ اللہ کی لازمی سنت ہے کہ جہاں اللہ نے
بھیجا ہے وہ وہاں سے نقل مکانی نہیں کر سکتے' اِلّا یہ کہ لوگ ان کے قتل کے درپے ہو
۔ اس صورت میں وہاں سے ہجرت ہو سکتی ہے لیکن اُس وقت تک انہیں وہیں کام
، وہیں پر رہنا ہے۔ وہ اپنی قوم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے' چاہے بظاہر انہیں نتائج نکلتے
محسوس ہو رہے ہوں چاہے نہ ہو رہے ہوں چنانچہ اس اعتبار سے بھی میں سمجھتا ہوں
ایہاں منتقل ہو جانا بہرحال خارج از امکان ہے۔ اس کا ذکر میں نے محض نظری طور پر کیا
تو یہ ہو' ورنہ یہ کہ ہمیں پھر انتظار کرنا ہو گا کہ یہیں سے کوئی قیادت ایسی ابھرے اور
یح معنوں میں ایک حقیقی اسلامی انقلابی تحریک آزادانہ طور پر اس برِاعظم میں شروع
ہے۔

اب آیئے اس سلسلے کی آخری بات کی طرف! میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک وہ قیادت
، پاس نہیں ہے' اس وقت تک یہ ہمارا عبوری دور (Interim Period) ہے۔ یہ
یں شعوری طور پر سمجھ لینی چاہئے۔ اب اس عبوری دور میں ہمیں کیا کرنا ہے؟ یہ چند
یں آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ یہاں کی تنظیم و تحریک کا پاکستان کی
، و تنظیم کے ساتھ بڑی مضبوط بنیادوں پر الحاق ہونا چاہئے' اسے وہاں کی تحریک کے
بہت ہی زیادہ Integrate ہونا چاہئے۔ اس عبوری دور میں اس کے بغیر گاڑی
چل سکتی۔ اس کے لئے محض مجھ سے ذاتی طور پر رابطہ کافی نہیں ہے بلکہ یہاں کی
ں کا وہاں کی تحریکوں سے انتہائی قریبی اور مضبوط الحاق ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس
، دَور کے تقاضے بھی پورے نہیں ہوں گے۔ بس زیادہ سے زیادہ وہی ہو گا جو اِس وقت
ہم کر رہے ہیں کہ جو لوگ بھی ایک خاص وقت میں تنظیم میں شامل ہو گئے وہی چلے آ
، ہیں۔ اس کے بعد اضافہ بہت ہی کم ہوا ہے۔ پرانے ساتھیوں میں سے بھی بعض مجھ
ا مقامی حالات سے مایوس اور بددل ہو کر یا کسی اور وجہ سے ٹوٹ گئے۔ کسی کے بارے
ھی ساری تفصیل تو معلوم نہیں ہے۔ لیکن اس وقت تک تو یہی پوزیشن ہے کہ ہمارا
، سے بڑا پراجیکٹ یہی ہے کہ اس تحریک میں شامل ساتھیوں کو اس کے ساتھ وابستہ اور
نہ رکھا جائے۔ ع "پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!" درحقیقت اس عبوری دور میں بھی

اگر صورت حال میں کوئی بنیادی تبدیلی آ سکتی ہے تو اُس وقت جب Integration ہو ـــــ Integration کے معانی کیا ہیں' وہ اب آپ سن لیجئے۔

ایک تو یہ کہ ہمارا نظام العمل جو یہاں بھی آگیا ہے' میثاق میں بھی چھپ گیا ہے' اسے آپ لوگوں نے پڑھا بھی ہوگا اور اس پر غالباً آپ حضرات کی گفتگوئیں بھی ہوئی ہیں اور آپ کی طرف سے اس میں بعض ترمیمات (Ammendments) کی تجویزیں بھی مجھ تک پہنچی ہیں۔ ڈاکٹر خورشید ملک صاحب نے مجھے سپین ہی میں اس بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ہم نے اس نظام العمل میں رفقاء کی درجہ بندی اور انہیں تربیت گاہوں کے نظام میں سے گزارنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ اسی طرح لازماً یہاں بھی کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر ہماری گاڑی یہاں بالکل آگے نہیں بڑھے گی۔ ایک رفیق جو ابھی بیعت کر کے تنظیم میں شامل ہوتے ہیں اور ایک کو دس سال ہو گئے ہیں' ان دونوں کو آپ اگر ایک ہی قسم کے پروگرام میں شامل کریں گے تو پرانے رفیق محسوس کریں گے کہ یہ تکرارِ محض ہے' ہمارے لئے بے کار کی باتیں ہیں جو ہم نے دس دفعہ سنی ہوئی ہیں' جبکہ ان کے بغیر نئے رفیق کا ذہن نہیں بنتا اور اس کے سامنے بات پورے طور پر واضح نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ درجہ بندی لازماً ہونی چاہئے اور ہر درجے کے ساتھ اس کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کیا جانا چاہئے۔ تربیتی نظام اور درجہ بندی کا نظام بہت ہی مربوط اور Integrated ہونا چاہئے۔ وہاں کا اور یہاں کا نظام مکمل طور پر ہم آہنگ اور متوازی ہونا چاہئے۔ ان میں کامل مشابہت اور یکسانیت ہونی چاہئے۔ دوسرے یہ کہ مشاورت میں بھی یہاں سے پوری شرکت ہونی چاہئے۔ اب وہاں ہماری پالیسیاں بنتی ہیں' فیصلے ہوتے ہیں' لیکن مرکزی شوریٰ میں یہاں کی کوئی نمائندگی نہیں۔ اسی طرح یہاں کے جو معاملات طے ہوتے ہیں تو اس میں وہاں کے لوگوں کا کوئی رابطہ نہیں۔ نہ ہی وہ یہاں کے حالات سے واقف ہیں۔ یہاں تو صرف میں آتا رہا ہوں یا قمر سعید صاحب آتے رہے ہیں۔ یا پھر میرے ساتھ میرے بیٹوں میں سے کوئی سا آجاتا ہے۔

ضرورت درحقیقت اس بات کی ہے کہ ایک باہمی ذہنی ہم آہنگی اور قرب پیدا ہو' بروقت باہم مشورے کئے جا سکیں اور ایک دوسرے کی آراء سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یعنی

کو آج کل کی اصطلاح میں آپ " Think-tank " لیتے ہیں وہ Think-tank
رہمارا یہاں کا اور وہاں کا مشترک نہیں بنے گا تو یہ گاڑی ناکنگ کرتی رہے گی۔ یہاں کی بات وہاں
گی تو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی اور ان کی بات یہاں آئے گی تو وہ آپ کی سمجھ میں
آئے گی۔ اس طرح سوچ اور ترجیحات میں اختلاف رہے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ باہمی
خیالات کے بعد تو آدمی محسوس کر سکے کہ وہاں کے حالات کے مطابق اولین ترجیح اس
ی ہوگی ' لیکن ہونا یہ چاہئے کہ وہ اسے ذہناً تسلیم کرے کہ یہ وہاں کی تحریک کا تقاضا ہے۔
ن کیجئے کسی وقت یہ طے کیا جاتا ہے کہ میں ایک مہینے یا دو مہینے کے لئے یہاں آؤں اور
ں کے رفقاء کی اگر تو کوئی ذہنی ہم آہنگی یہاں کے ساتھ ہو ' وہ یہاں کے حالات اور تقاضوں
ے باخبر ہوں اور جانتے ہوں کہ جو وقت یہاں پر صرف ہو گا واقعتہً Productive ہو
تا ہے اور اس کے واقعی فائدے ہیں ' تب تو وہ ذہناً اس کو تسلیم بھی کریں گے ، اس کے لئے
ن کے اندر آمادگی بھی ہوگی ورنہ وہ ناگواری محسوس کریں گے کہ اس طرح کے پروگرام میں
بردستی ٹھونس دیتا ہوں۔ اور میں نے کچھ عرصہ پہلے تک محسوس بھی کیا کہ ہمارے وہاں کے
کچھ قریبی ساتھی جو ہیں وہ میرے باہر کے سفر کو پسند نہیں کرتے۔ میں نے ان سے یہ کہا بھی
کہ شاید آپ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ میں کہیں سیر کے لئے جاتا ہوں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ
اب تو میں نے کئی بیرونی سفر ایسے کر لئے ہیں کہ نہ کسی دکان کی شکل دیکھی ہے اور نہ جا کر کسی
بلڈنگ کو دیکھا ہے۔ اس بار میں یہاں آیا ہوں تو میں نے ایک پیسے کی کوئی خریداری نہیں کی۔
شروع شروع میں تو ضرور ایسا ہوا کہ بعض اعزّہ کی فرمائش پر کچھ چیزیں خرید لیں ' لیکن اب
ہرگز ایسا نہیں ہے۔ بلکہ میں نے قمر سعید قریشی صاحب کو بھی سختی سے روک دیا تھا کہ کسی
کی فرمائش پر کوئی چیز نہ خریدیں ' کیونکہ اس کا وہاں کے ساتھیوں پر ایک بڑا منفی اثر پڑتا ہے کہ
شاید یہ لوگ وہاں پر ان چیزوں کی خریداری کے لئے جاتے ہیں۔ جیسے کبھی بعض لوگ بظاہر حج
کو جاتے تھے لیکن دراصل جاتے تھے اپنی بچیوں کا جہیز بنانے کے لئے۔ تو اس اعتبار سے میں
نے وہاں کے ساتھیوں سے کہا کہ شاید آپ لوگ یہ سمجھ کر اس پر ناگواری کا اظہار کرتے ہیں.

تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر یہ Close integration ہو ' باہمی آمد و رفت ہو '
یہاں کی رپورٹیں بھی وہاں سالانہ اجتماع میں پڑھی جا رہی ہوں ' یہاں سے لوگ وہاں جاتے

ہوں اور معلوم ہو کہ ہمارے اتنے رفقاء امریکہ سے شریک ہوئے ہیں اور وہاں کی شوراؤں میں بھی یہاں کے لوگ شریک ہوں تو پھر یہ ہو گا کہ اس کے لئے ذہناً فضا زیادہ ہموار ہو گی کہ یہ وقت کا تقاضا ہے اور یہ سمجھا جائے گا کہ یہ ایک ہی شے ہے اور ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ کسی اور جگہ کا تقاضا یا کسی اور تنظیم و تحریک کا معاملہ ہے۔ تو integration کا ایک حصہ تو یہ ہے۔ یعنی جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ جو بھی تربیتی نظام اور رفقاء کی درجہ بندی ہے وہ بھی ہم آہنگ اور ایک ہی سطح پر ہو۔ ہمیں معلوم ہو کہ وہ وہاں کا ملتزم رفیق ہے اور یہ یہاں کا ملتزم رفیق ہے۔ ہمیں اندازہ ہو کہ اس کورس میں سے یہ گزر چکا ہے۔ اسی طرح آپ کو معلوم ہو کہ کون کیا ہے اور کتنی اس کی سٹینڈنگ ہے۔ دوسرے یہ کہ مشاورت اور Decision making میں بھی آپ کی شرکت اور شمولیت ہونی چاہئے۔ جہاں تک ہمارے نظام العمل کا تعلق ہے اس میں یہاں کے اعتبار سے کوئی خصوصی تبدیلی کرنی ہو تو اس پر غور کر کے، جمع تفریق کر کے کر لی جائے، لیکن بنیادی طور پر اسی نظام العمل کو یہاں پر اختیار کیا جانا چاہئے۔

یہ ساری باتیں میں اس عبوری دور کے لئے کر رہا ہوں۔ جب بھی آپ کو یہ محسوس ہو کہ اب ہم 'خود کفیل' ہو سکتے ہیں، یعنی اب ہمارے پاس کوئی شخصیت ایسی ہے جس پر ہم جمع ہو سکتے ہیں اور وہ اس تحریک کو دعوت اور توسیع کے اعتبار سے لے کر چل سکتی ہے تو پھر وہ شخصیت یہاں کی قیادت سنبھال لے۔ ظاہر ہے کہ سب لوگ تو کسی ایک شخص پر مطمئن نہیں ہوا کرتے لیکن اگر رفقاء کی غالب اکثریت کسی ایک شخص پر مطمئن ہو جائے کہ اب ہم اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہیں تو پھر تو یہاں کی تنظیم، تنظیم اسلامی پاکستان کی ایک 'Sister Organization' ہو گی۔ پھر ان کے مابین رشتہ تعاونِ باہمی کا ہو گا کہ آپ کی کوئی ضرورت ہے اور ہم وہاں سے اس کے لئے کوئی مدد کر سکتے ہیں، تو ہم کریں وہاں پہ ہماری کوئی ضرورت ہے جسے آپ پوری کر سکتے ہیں تو آپ کریں۔ یہ پھر برابری کی بنیادوں پر دو خود مختار تنظیموں کے مابین تعاون ہو گا۔ اس کے لئے بھی قرآن مجید میں ہدایات موجود ہیں: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی، وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ○

یہ ہے وہ اصل شے جو مطلوب ہے کہ یہاں کی قیادت ابھر آئے اور پھر اصل تحریک

اٹھے۔ فی الحال جو باتیں میں کہہ رہا ہوں وہ اس عبوری دور کے لئے ہیں جبکہ آپ مجھ سے بیعت ہیں' میرے ہی ساتھ بیعت کے رشتے میں منسلک ہو کر آپ نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی ہے اور میرے ہی پاس اس کی قیادت کا منصب ہے۔

Integration کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ یہاں پر آپ بھی یہ سمجھیں کہ آپ کو کام صرف یہیں نہیں' بلکہ وہاں بھی کرنا ہے۔ اس لئے کہ جب ایک تنظیم ہے تو گویا کہ اسی کے اعتبار سے آپ کو بھی ہماری وہاں کی جدّوجہد اور محنت و کوشش میں شریک ہونا ہے۔ اس کے لئے میں پانچ باتیں گنوا رہا ہوں۔ انہیں نوٹ کر لیجئے:

(۱) وہاں کے کام میں ہمارے ساتھ تعاون اور مدد کا سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ وہاں ہمارے لئے حالات سازگار فرمائے' ہماری نیتوں میں کوئی کھوٹ ہے تو اسے صاف کر دے۔ قرآن میں الفاظ آئے ہیں: لِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ (تاکہ اللہ تعالیٰ پاک و صاف کر دے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے)۔ اگر صحابہ کرامؓ کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی تھی تو ہم تو کئی ہزار گنا زیادہ اس کے محتاج ہیں۔ دعا کے بارے میں تو فرمایا گیا ہے: اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ ـــــــ یعنی دعا مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے! لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا بِالدُّعَاءِ ـــــــ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ بھی کسی وقت دعا کی وجہ سے بدل جاتا ہے۔ یہاں قضا سے مراد قضائے معلّق ہے۔ قضائے مبرم تو ایسے فیصلے ہیں جو کسی دعا سے بھی نہیں ٹل سکتے لیکن بعض چیزوں میں اللہ تعالیٰ دعا کی وجہ سے اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے' کوئی تاخیر ہو جاتی ہے' کوئی مہلت مزید مل جاتی ہے۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ صرف ایک روایتی انداز کی دعا نہیں بلکہ آپ لوگ ہمارے وہاں کے اس کام کے لئے خلوص کے ساتھ دعا کریں!۔

(۲) تعاون کا دوسرا درجہ مالی تعاون کا ہے۔ جیسا کہ میں نے ہر جگہ وضاحت کر دی ہے کہ وہاں پر ہمارے ساتھ نہ دولت مند اور سرمایہ دار لوگ شریک ہوئے ہیں اور نہ زمیندار و جاگیردار! ہمارے زمیندار لوگ تو بس سیاست کا کھیل کھیلتے ہیں۔ اس کے علاوہ زمیندار کسی مذہبی کام میں بھی بالکل حصہ نہیں لیتا۔ مذہبی کام میں سرمایہ دار تاجر حصہ لیتا ہے لیکن وہ یہ کام فرقہ وارانہ بنیادوں پر کرتا ہے۔ جو اہل حدیث ہے وہ جمعیت اہل حدیث کو پیسے دے گا' کوئی بریلوی ہے تو وہ بریلویوں کو دے گا۔ ہمارے پاس تو اکثر و بیشتر یا نوجوان ہیں یا سرکاری ملازم

ہیں جو بڑی مشکل سے اپنی سفید پوشی کا بھرم برقرار رکھتے ہیں۔ بہر حال ایسا نہیں ہے کہ آج تک ہماری کوئی بھی مہم پیسے کی کمی کی وجہ سے رک گئی ہو۔ یہ تو میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کی طرف سے گارنٹی ہے لیکن اب جو ہم نے وہاں خاصی تعداد میں ایسے کارکنوں کی خدمات حاصل کی ہیں جو اپنی ملازمتیں وغیرہ چھوڑ کر آ گئے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کو ہمیں کچھ نہ کچھ معاوضہ تو دینا ہے' لہٰذا ہم نے اپنا بجٹ خاصا بڑھایا ہے۔ اس کے لئے ہمیں آپ کے تعاون کی بھی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ آپ جو کچھ بھی اپنے یہاں انفاق کریں اس میں سے وہاں بھی کچھ حصہ پہنچے تو یہ تعاون کی دوسری صورت ہے۔

(۳) آپ میں سے جن حضرات کے بھی پاکستان میں دوست' احباب' اعزّہ و اقارب اور برادری کے لوگ ہیں وہ یہاں سے انہیں تنظیم کی دعوت بھیجیں' خطوط کے ذریعے سے انہیں اس کام کی طرف متوجہ کریں' اپنی طرف سے زرِ تعاون ادا کر کے انہیں 'میثاق' کے سالانہ خریدار بنائیں' اور انہیں ہمارے لٹریچر کے پورے پورے سیٹ بھجوائیں جن کی قیمتیں یہاں کے پیمانوں کے اعتبار سے تو بہت ہی کم ہیں۔ ڈاک خرچ سمیت پورے سیٹ کی قیمت پانچ سو روپیہ سے بھی کم ہے جس کی آپ کے لئے کچھ حیثیت نہیں۔ اس سے آپ ایک گھر کے اندر اپنا پورا لٹریچر پہنچا دیں گے جو وہاں پڑھا جائے گا۔ کسی گھر میں کسی کا کوئی عزیز' کوئی مہمان ہی آ جاتا ہے جو وقت گزاری ہی کے لئے کتاب اٹھا کر دیکھ لیتا ہے اور اس طرح اس کام سے متعارف ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی آ جاتی ہے۔ اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ پھر یہ کہ اس کا 'فالو اپ' بھی ہونا چاہئے۔ آپ نے اپنے کسی عزیز کو لٹریچر بھجوایا ہے یا میثاق کا خریدار بنوا دیا ہے تو اب اس سے آپ کی خط و کتابت ہو اور آپ اس سے پوچھیں کہ: "ملکی حالات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ کی وابستگی کس گروپ کے ساتھ ہے؟ یا کسی کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں تو کہیں وابستہ ہونا چاہئے۔ اگر آپ کے سامنے کوئی طریق کار یا ملی مسائل کا کوئی حل ہے تو وہ کیا ہے؟" تو یہاں سے آپ اگر یہ کام کریں گے تو وہ بہت مؤثر کام ہوگا۔ ہماری مخصوص نفسیات کے اعتبار سے یہ چیز بہت اثر انداز ہوتی ہے کہ بات 'وہاں' سے آ رہی ہے۔ جیسے کبھی اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ۔

چیز وہ ہے جو بنے یورپ میں — بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے !

اگر یہاں سے کوئی بات جائے گی تو اس کو وہاں زیادہ مقبولیت حاصل ہوگی۔ اور ایسا ہوا ہے کہ رے بہت سے ساتھی جو ابوظہبی وغیرہ میں کام کر رہے ہیں ان کے ذریعے سے پنجاب ے دیہات میں ہماری بات پہنچ گئی ہے۔ یہ حضرات ابوظہبی وغیرہ میں ہمارے کام سے عارف ہوئے اور جب چھٹیوں میں اپنے گاؤں گئے تو باہمی ملاقاتوں میں یا وہیں سے خط وکتابت ے ذریعے انہوں نے اپنے اعزہ واحباب کو اس طرف متوجہ کیا۔ تو وہاں پر یہ کام اس نہج سے ا ہے۔ یہ کام آپ کو بھی یہاں سے کرنا چاہئے۔

(۴) آپ حضرات ہر سال اپنا کچھ وقت فارغ کر کے پاکستان آئیں۔ اس کے لئے میرا لین مطالبہ تو ایک ایک "چلّے" کا تھا، لیکن معلوم ہوا کہ یہ آپ حضرات کو بڑا گراں محسوس وا ہے ـــ تو چلئے نصف چلہ ہی نکالئے! آپ سالانہ تین ہفتے لے کر پاکستان آئیں جو اسی مقصد کے تحت ہوں کہ وہاں جا کر تنظیم کا کام کرنا ہے۔ آغاز میں یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں آدھا وقت تربیت گاہوں کے نظام میں صرف کیا جائے جس میں سے آپ کو بھی اب integrate ہو کر گزرنا ہوگا۔ اور جب تک یہاں پر تربیت گاہوں کے انعقاد کا وہ نظام ہم قائم نہیں کر سکتے اُس وقت تک آپ کا وہ وقت وہاں پر تربیت گاہ میں صرف ہو۔ اسے آپ باہمی مشورے سے اپنی سہولت کے تحت طے کر لیں تو اسی کے مطابق ہم وہاں پر آپ حضرات کے لئے تربیت گاہوں کا کوئی نظام رکھ سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ باقی وقت آپ اپنے علاقوں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں جا کر دعوتی ملاقاتیں کریں اور آپ نے خط وکتابت کے ذریعے یہاں سے دعوتی کام کا جو آغاز کیا تھا اسے آگے بڑھائیں۔

(۵) پانچواں درجہ میرے نزدیک اگرچہ بہت اہم ہے، لیکن اس کے لئے میرا مطالبہ آپ میں سے ہر ایک کے لئے نہیں ہے۔ یعنی اپنا کاروبار وغیرہ سمیٹ کر پاکستان واپسی! اس کے لئے شروع میں تو میں آپ حضرات سے بہت کہتا رہا، لیکن بعد میں جو تجربے ہوئے ان سے محسوس ہوا کہ یہاں اس کا خاص محل نہیں ہے اور یہ چیز زیادہ قابلِ عمل نہیں ہے۔ ہمارے بعض رفقاء یہاں سے پاکستان گئے اور وہاں کے ناسازگار کاروباری حالات اور دگرگوں صورت حال میں اپنی پونجی بھی گنوا بیٹھے اور پھر بہت پریشان ہو کر انہیں دوبارہ یہاں واپس آنا

پڑا۔ تو اس کی طرف تو میں زیادہ ترغیب نہیں دلاتا۔ البتہ یہ ایک ذاتی معاملہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص خود اس کے لئے اتنا متحرک ہو جائے کہ وہ یہ سمجھے کہ اب مجھے تو ہمہ وقت اسی کام میں لگنا ہے۔ اور وہ ذہناً اس کے لئے تیار ہو کہ اس مقصد کی خاطر مجھے روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرنا ہے 'مجھے کوئی کاروبار کرنے اور اپنا کوئی دنیوی کیریر بنانے پاکستان نہیں جانا ــــــــ بلکہ اسی کام کے لئے جانا ہے۔ جیسے وہاں اور بہت سے لوگوں نے اپنے کیریرز قربان کئے ہیں' اپنی ملازمتیں چھوڑی ہیں' کاروبار سمیٹے ہیں اور اس کام میں ہمہ تن' ہمہ وقت لگ گئے ہیں' اسی طرح کوئی یہاں سے جا کر لگنا چاہے تو اسے عزیمت کا یہ راستہ اختیار کرنا چاہئے ــــــــ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ !!

❀❀❀❀❀❀❀

جہاد و قتالِ فی سبیل اللہ کے موضوع پر

قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ

سُورۃ الصّف

(۲)

چند تمہیدی مباحث

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم ۔ سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کا براہِ راست مطالعہ کرنے سے قبل قرآن حکیم کی سورتوں کے بارے میں تعارفی و تمہیدی نوعیت کی دو مزید باتوں کی جانب توجہ کرنا مفید رہے گا۔ اجمالاً اِن اُمور کی جانب اشارات پچھلے اسباق میں بھی کئے جا چکے ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے اسی طرح قرآن حکیم کی ہر سورۃ کا ایک عمود یا AXIS ہوتا ہے جسے ایک ایسے دھاگے سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے جس میں موتی پروئے گئے ہوں اور ان موتیوں کو ہار کی شکل دی گئی ہو۔

قرآن حکیم کی ہر آیت اپنی جگہ علم و حکمت کا ایک حسین موتی ہے لیکن جب اُسے ایک سلسلۂ نظام کی لڑی میں پرو دیا جاتا ہے، ایک مرکزی مضمون کے ساتھ اس کا ربط قائم ہوتا ہے تو اس کے حسن میں ایک نئی شان پیدا ہوتی ہے اور اس ربطِ باہم سے علم و حکمت کے نئے نئے پہلو آشکارا ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کی ہر سورۃ پر غور کرنے کے لیے اس سورۃ کے مرکزی مضمون اور عمود کا تعین ضروری ہے۔ پھر ہر ہر آیت پر اپنی جگہ غور کرنے کے بعد اُس مرکزی مضمون کے ساتھ اُن آیات کے ربط کو تلاش کرنا تدبرِ قرآن کے نقطۂ نگاہ سے نہایت اہم ہے

دوسری بات یہ کہ قرآن حکیم کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ اسلوب
نظر آتا ہے کہ کسی ایک مضمون کو جس کے دو رُخ یا دو پہلو ہوں، کسی ایک ہی سورۃ میں بیان
کرنے کی بجائے بالعموم دو سورتوں میں منقسم کر دیا جاتا ہے اور وہ دو سورتیں گویا ایک جوڑے
(PAIR) کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس مضمون کے ایک پہلو پر گفتگو اس جوڑے میں
شامل ایک سورۃ میں اور دوسری پر بحث دوسری سورۃ میں ہوتی ہے۔ اور جیسے کہ محاورۃً
کہا جاتا ہے کہ ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں اور اُن کے اجتماع سے تصویر مکمل ہوتی ہے
اسی طرح دونوں سورتیں مل کر ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال 'معوّذتین'
کی ہے جو قرآن حکیم کی آخری دو سورتیں ہیں۔ مضمون ایک ہی ہے یعنی 'تعوّذ'۔ اُن چیزوں
کو کہ جن سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی تلقین کی گئی ہے، دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے
ایک وہ آفات ہیں جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو انسان
کے اپنے باطن سے اُبھرتی ہیں۔ پہلی قسم کی آفات سے سورۃ الفلق میں اللہ کی پناہ حاصل
کرنے کا ذکر ہے اور دوسری نوع کی آفات سے سورۃ الناس میں۔ اس طرح سے
'مُعَوِّذَتین' کی شکل میں قرآن حکیم کی سورتوں کا ایک حسین و جمیل جوڑا وجود میں
آ گیا۔ اسی طرح کا معاملہ سورۃ المزّمّل اور سورۃ المدّثر کا ہے۔ ان دونوں سورتوں کے ناموں
میں بھی لفظی مشابہت موجود ہے اور مضامین کے اعتبار سے بھی گہری مماثلت نظر آتی
ہے۔ ایک میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کو قیام اللیل کی شکل میں ذاتی ریاضت کا حکم دیا
جا رہا ہے: " یَا اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ " یہ آپ کی ذاتی
تربیت کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ: " اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا "
ہم آپ پر بڑی بھاری بات ڈالنے والے ہیں اس کے لیے آپ کو ذاتی تربیت کے
اس مرحلے سے گزرنا ہوگا اور دوسری سورۃ میں اُس مشن کے لیے کھڑے ہونے کا حکم
ہے کہ جس کے لیے آپؐ کو بھیجا گیا تھا اور جس کے لیے یہ ساری تیاری درکار تھی۔
" یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ " کہ اب اپنے مشن
کی تکمیل کے لیے کھڑے ہو جائیے، اپنی جدّ و جہد کا آغاز کیجیے، اور اللہ کی کبریائی کا
اعلان کیجیے! چنانچہ یہ دونوں سورتیں مل کر ایک حسین و جمیل جوڑے کی صورت اختیار کرتی
ہیں۔ یہ دو مثالیں ان سورتوں سے متعلق تھیں جن کا باہم جوڑا ہونا بہت نمایاں ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن کا باہم جوڑا ہونا بڑی آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ مثلاً اٹھائیسویں پارے کے آخر میں دو سورتیں سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق ایک انتہائی خوبصورت جوڑے کی شکل میں ہیں۔ یہ دونوں سورتیں عائلی زندگی کے دو مختلف پہلوؤں اور ان سے متعلقہ مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ ایک پہلو شوہر اور بیوی کے مابین عدم موافقت سے متعلق ہے جس کی انتہا طلاق ہے۔ اور دوسرے کا تعلق شوہر اور بیوی کے مابین محبت والفت سے ہے جو اگرچہ مطلوب اور پسندیدہ ہے لیکن اگر یہ معاملہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور ایک دوسرے کے جذبات کا لحاظ اس حد تک کیا جانے لگے کہ حدود اللہ ٹوٹنے لگیں تو یہ دوسری انتہا ہے۔ سورۃ الطلاق میں ایک انتہا سے بحث ہوئی اور سورۃ التحریم میں دوسری انتہا زیرِ بحث آئی۔

اسی طرح کا معاملہ سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن کا ہے۔ یہ دونوں سورتیں ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ ایمانِ حقیقی اور اس کے ثمرات ومضمرات کے موضوع پر سورۃ التغابن قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ ہے۔ اگرچہ قانونی سطح پر ایمان کے مقابل کا لفظ "کفر" ہے لیکن حقیقی اعتبار سے ایمان کے مقابل کا لفظ ہے نفاق۔ نفاق دراصل فقدانِ ایمان کی باطنی کیفیت کا نام ہے۔ چنانچہ مصحف میں سورۃ التغابن سے متصلاً قبل جڑی ہوئی سورۃ المنافقون موجود ہے جو نفاق کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ ہے۔ نفاق کے اسباب اور اس کے نقطۂ آغاز سے لے کر اس کے انجام اور اس کے علاج تک تمام اہم مباحث اس چھوٹی سی سورۃ میں جمع ہیں۔ سورۃ التغابن اور سورۃ المنافقون دونوں کو مصحف میں یکجا کر دیا گیا اور اس طرح ایک مضمون کی تکمیل ہو گئی۔

بعثتِ نبویؐ کے دو اہم پہلو

باہم جوڑا ہونے کی یہ نسبت سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ میں بھی بہت نمایاں ہے بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو رخ چونکہ ان دو سورتوں میں زیرِ بحث آئے ہیں لہٰذا میرا احساس یہ ہے کہ ان پر غور وفکر کرنے والا ہر شخص اپنے باطن میں ان سورتوں کے ساتھ قلبی اور ذہنی مناسبت کی ایک عجیب اور نرالی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ ایک سورۃ یعنی سورۃ الصف کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ حضورؐ کا مقصدِ بعثت کیا ہے! یہ موضوع اپنی

بلکہ نہایت اہم ہے اس لیے کہ کسی بھی شخص کے کارنامۂ حیات کو ASSESS کرنے (جانچنے) کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ متعین کیا جائے کہ اس کا ہدف کیا تھا، وہ کیا کرنے چلا تھا اور اس کی منزلِ مقصود کونسی تھی۔ اس پہلو سے سیرتِ محمدیؐ کے مطالعے کے لیے واقعتہً یہ سورۂ مبارکہ اور بالخصوص اس کی مرکزی آیت انتہائی اہمیت کی حامل ہے، کہ یہ سمجھا جائے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت کیا تھا اور آپؐ کا فرضِ منصبی کیا تھا! یہ ہے مرکزی مضمون سورۃ الصف کا۔ چنانچہ ہم دیکھیں گے کہ اس سورۂ مبارکہ میں تفصیل سے یہ مباحث آئے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے اس فرضِ منصبی کا تقاضا ہے کہ جو بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے ہیں اُن کا فرض ہے کہ وہ اس جدّ وجہد میں رسولؐ کا ہاتھ بٹائیں، رسولؐ کے دست وبازو بنیں۔ اسؐ کے مشن کی تکمیل میں اپنی جان اور مال، اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو صرف کر دیں اور اگر ضرورت پڑے اور وقت آئے تو اس راہ میں اپنی جان بھی نچھاور کر دیں۔ یہ گویا اُن کے ایمان کی صداقت کی دلیل ہو گی۔ اس پہلو سے واقعہ یہ ہے کہ اس سورۃ الصف میں جہاد وقتال فی سبیل اللہ کا مضمون اپنی منطقی انتہا کو پہنچ گیا ہے، اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کو منتخب نصاب کے اس چوتھے حصے میں رکھا گیا ہے جو "تواصی بالحق" کی تشریحات پر مشتمل ہے اور جس کا جامع عنوان ہے "جہاد فی سبیل اللہ"۔ ذہن میں رہے کہ اس منتخب نصاب میں جہاد کی بحث کا آغاز سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ سے ہوا تھا: "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ"۔ پھر آیت ۱۵ میں ایمانِ حقیقی کی تعریف (DEFINITION) ان الفاظ میں آئی: "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"۔ جہاد فی سبیل اللہ کا ہدفِ اولین یا اس کی ابتدائی منزل کا ذکر سورۃ الحج کی آخری آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آچکا ہے۔ یعنی دعوت وتبلیغ دین کا فریضہ ادا کرنا، لوگوں پر اتمامِ حجت کرنا بالفاظِ دیگر "شہادت علی الناس" کا فریضہ ادا کرنا جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین ہدف ہے۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل، اس کی غایتِ قصویٰ یا اُس کا ہدفِ آخریں ہے اللہ کے دین کا غلبہ! اور یہ ہے وہ اہم مضمون جو اس سورۃ الصف میں ہمارے سامنے آئے گا۔

بعثتِ نبویؐ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وہ اساسی منہجِ عمل اور وہ بنیادی طریقِ کار کونسا

تھا جس پر عمل پیرا ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اُس فرضِ منصبی کو ادا کیا اور اپنے اُس مشن کی تکمیل کی جس کا تعین سورۃ الصف میں کیا گیا ہے۔ یہ ہے مرکزی مضمون سورۃ الجمعہ کا۔ اس پہلو سے سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعے میں ان دونوں سورتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سورتوں نے مل کر گویا ایک مضمون کی تکمیل کر دی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت کیا تھا، اور اس کے لیے آپؐ کا اساسی طریقِ کار اور بنیادی منہجِ عمل کون سا تھا! ——

مقصد کا تعیّن اور صحیح منہجِ عمل کی تعیین!

یہاں ایک بات کی جانب توجہ دلانا غیر مفید نہ ہوگا جو بڑی بنیادی اہمیت کی ہے۔ ہر اُس شخص کو جو دین کے ضمن میں کچھ بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس وشعور رکھتا ہو اور اپنے ن فرائض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو، اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ دین کی سربلندی کی دوجہد میں یہ دونوں باتیں بہت اہم ہیں: (i) مقصد کا تعین اور (ii) اس مقصد کے صول کے لیے صحیح راہ کا تعیّن۔ دونوں انتہائی ضروری ہیں۔ اگر مقصد کا تعیّن صحیح نہیں ہے، رف غلط معیّن ہو گیا ہے، یا بلا مقصد کسی ایک دائرے (CIRCLE) میں حرکت اری ہے تو لاکھ محنت اور کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ خواہ ہزاروں اور لاکھوں ا تعداد میں لوگ گھروں سے نکلیں اور چالیس چالیس دن بلکہ اس سے بھی زیادہ وقت ین کی محنت میں صرف کریں لیکن اگر یہ ساری محنت بغیر ہدف کے ہو رہی ہے تو غلبۂ دین ، راہ میں کوئی مؤثر پیش رفت اس ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔ منزل اور ہدف کا تعین بہت روری ہے —— لیکن ہدف کے تعیّن کے ساتھ ہی اُس طے شدہ منزلِ مقصود ۔ پہنچنے کے صحیح منہجِ عمل اور طریقِ کار کا تعین بھی از حد ضروری ہے اس لیے کہ بسا اوقات سا ہوتا ہے کہ منزل کے صحیح تعیّن کے باوجود انسان کسی غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔ صحیح ہجِ عمل اگر سامنے نہ ہو تو منزل تک پہنچنے کی جلدی میں بعض اوقات انسان کسی راہِ قصیر (SHORT-CUT) کو آزمانے کی غلطی کر بیٹھتا ہے لیکن پھر وہ SHORT-CUT کبھی ختم نے میں نہیں آتا۔ پھر تمام محنتوں، کوششوں اور قربانیوں کے باوجود منزل دور سے دور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ صحیح منہجِ عمل کو ترک کر کے ...

یہ موٹی سی بات تو ہر شخص کے سمجھ لینے کی ہے کہ ہر مقصد اور ہر ہدف کے حصول کے لیے ہر طریق کار مفید نہیں ہوتا۔ ہر مقصد کے حصول کا اپنا ایک معیّن طریق کار ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہیں اشتراکی انقلاب برپا کرنے کا خواہش مند ہے تو اُسے ایک خاص منہج عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اُسے اپنے معاشرے میں طبقاتی شعور پیدا کرنا ہوگا، اس طبقاتی شعور کو اجاگر کر کے طبقاتی تصادم کو جنم دینا ہوگا۔ لیکن اگر کوئی نیک دل انسان تصادم کو ناپسند کرتا ہو اور اس سے گریز چاہتا ہو تو ظاہر بات ہے کہ وہ اشتراکی انقلاب کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اس لیے کہ اِس انقلاب کا راستہ اسی وادی میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اسی طریقے سے یہ بات جان لیجئے کہ دین کی اقامت اور اس کا غلبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ہیں۔ یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سورۃ الصف کی مرکزی آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آئے گی۔ "هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ"۔ اس میں اگر کسی کو اشتباہ ہے اور نیک نیتی کے ساتھ اشتباہ ہے تو وہ اللہ کے ہاں عذر پیش کر سکے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پھر قرآن مجید اور اُس کے فہم سے اُسے کوئی حصّہ حاصل نہیں!

دین کو دنیا میں ایک عملی اور ایک زندہ نظام کی حیثیت سے قائم اور برپا کرنا بعثت محمدی کا بنیادی مقصد ہے۔ اِسی کے لیے محنت، اِسی کے لیے جد وجہد، اسی کے لیے کوشش، اسی کے لیے جینا، اسی کے لیے مرنا، اسی میں مال اور جان کا کھپانا، بندۂ مومن کے ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئیے کہ اس مقصد کی طرف پیش قدمی کا اپنا ایک طریق اور نہج معیّن ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ دنیا میں بعض دوسری تحریکیں کسی اور طریقے پر عمل پیرا ہو کر کامیاب ہوگئیں، کوئی وقتی سا نعرہ کسی تحریک کے لیے مفید ثابت ہوگیا یا کوئی SHORT-CUT کسی نے اختیار کیا اور وہ لیلائے حکومت سے ہمکنار ہوگیا، اور اس قسم کی چیزوں سے متاثر ہو کر ہم بھی ایسا ہی کوئی طریق کار غلبۂ دین کی جد وجہد میں اختیار کریں تو یہ بات ذہن میں رکھئے کہ تمام تر خلوص و اخلاص کے باوجود کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکے گا ــــــ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اساسی منہج عمل وہ ہے جو سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت میں نہایت دو ٹوک الفاظ میں بیان ہوا ہے:

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ

يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ "

مقصدِ بعثت کا مضمون تین مرتبہ دہرایا گیا

یہاں یہ عجیب بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید میں وہ آیت جس میں حضورؐ کے مقصدِ بعثت کا بیان ہے، تین مرتبہ وارد ہوئی۔ دو مرتبہ اس شان کے ساتھ آئی ہے کہ اس میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے۔ "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ " یہی الفاظ سورۃ التوبہ کی آیت ۳۳ میں وارد ہوئے ہیں اور بعینہٖ انہی الفاظ میں یہ آیت سورۃ الصف کے وسط میں وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح سورۃ الفتح کے آخری رکوع میں آیت ۲۸ کا مرکزی حصہ بھی انہی الفاظ پر مشتمل ہے یعنی: "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ " یہاں تک الفاظ بالکل وہی ہیں جو سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں وارد ہوئے ہیں، البتہ آیت کے آخری حصے میں یہاں "وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ" کی بجائے "وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا" کے الفاظ لائے گئے ہیں۔

اساسی منہجِ عمل کا ذکر چار مقامات پر!

اب آئیے سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت کی طرف جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی طریقِ کار یا بالفاظِ دیگر انقلابِ محمدیؐ کے اساسی منہاج کو معین کر رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سورۃ الصف کی مرکزی آیت قرآن حکیم میں تین مرتبہ وارد ہوئی تھی تو یہ آیت ترتیب کے ذرا سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں چار مرتبہ آئی ہے۔ اولاً یہ آیت سورۃ البقرہ کے پندرھویں رکوع میں وارد ہوئی ہے جہاں نقشہ کھینچا گیا ہے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا جبکہ وہ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے: "وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ " اس وقت جو دعائیں ان کی زبانوں پر تھیں ان میں ایک دعا تو یہ تھی کہ اے پروردگار ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری ذریّت اور اولاد میں سے ایک امّتِ مسلمہ برپا کیجیو! اور پھر ان کی آخری اور نہایت اہم دعا یہ نقل ہوئی کہ: "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ " اے پروردگار ان میں اپنا ایک رسول مبعوث کیجیو جو انہیں تیری

آیات پڑھ کر سنائے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے!
یہ ہے درحقیقت بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے دعاءِ ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام۔ پھر تین رکوعوں کے بعد سورۃ البقرہ میں اٹھارویں رکوع کے اختتام پر اعلان ہوتا ہے: "كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" اعلان کر دیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دراصل اسی دعاءِ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا ظہور ہے۔ "ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے اندر اپنا ایک رسول جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے، تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" سورۃ آل عمران میں اس مضمون کی پھر تکرار ہوئی ہے:۔ "لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ" "اللہ کا احسان ہے اہلِ ایمان پر کہ اس نے ان میں اپنا ایک رسول مبعوث کیا انہی میں کا، جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

ان تین مقامات کے بعد اب چوتھی بار یہی مضمون یہاں سورۃ الجمعہ کی آیت ۲ میں جو اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے وارد ہوا ہے اور اس طرح ان دونوں سورتوں کے باہم مجتمع ہونے سے وہ حسین و جمیل جوڑا وجود میں آیا جو ایک طرف بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے مقصد کو معین کر رہا ہے اور دوسری طرف اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح منہجِ عمل اور بنیادی طریقِ کار کو معین کر رہا ہے۔

اب ہم ان سورتوں کے مطالعے کا آغاز کریں گے اور اس کے لیے ہمیں اپنے سابقہ معمول سے قدرے مختلف طریقِ کار اختیار کرنا ہو گا۔ اس لیے کہ ان سورتوں کا درس اگر اس نہج پر ہو کہ پہلے ایک ایک آیت پر توجہات کو مرتکز کیا جائے اور پھر ان میں شامل ایک ایک لفظ کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کی جائے تو اندیشہ ہے کہ یہ معاملہ بہت طول اختیار کر جائے گا۔ ان دونوں سورتوں کے درس میں یہ طریق ملحوظ رہے گا کہ اوّلاً ہر سورۃ کی مرکزی آیت کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے تاکہ وہ اصل سرا یا ڈور ہاتھ میں آ جائے جس میں یہ موتی پروئے ہوئے ہیں۔ اس مرکزی آیت کو سمجھنے کے بعد پھر مختلف آیات کے ساتھ اس مرکزی مضمون کے

ربط و تعلق کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ بحیثیت مجموعی سورۃ کا اصل مفہوم واضح ہو جائے۔ اسی طریقے سے سورۃ الصف کا مطالعہ ہوگا اور اسی نہج پر ان شاء اللہ العزیز سورۃ الجمعہ کا مطالعہ ہوگا۔

نبی اکرمؐ کے مقصدِ بعثت کی دو شانیں

لیکن اس سے پہلے کہ ہم سورۃ الصف کی مرکزی آیت پر غور شروع کریں ایک بنیادی حقیقت کی طرف توجہ کر لینا مفید ہوگا۔ ہماری اس گفتگو میں بار بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کا حوالہ آیا ہے۔ تو یہ جان لینا چاہئیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی دو شانیں ہیں۔ اس لیے کہ اگرچہ آپؐ بھی یقیناً دوسرے انبیاء کی طرح اللہ کے ایک نبی ہیں لیکن آپؐ صرف نبی نہیں بلکہ خاتم النبیین بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ آپؐ کو بھی دیگر رسولوں کی طرح رسالت سے سرفراز فرمایا گیا ہے لیکن آپؐ صرف ایک رسول نہیں، آخرالمرسلین بھی ہیں۔ گویا آپؐ کی بعثت کے مقاصد میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو تمام نبیوں اور رسولوں کے پیش نظر تھیں، اور اضافی طور پر آپؐ کے مقصد بعثت کی ایک خصوصی اور امتیازی شان ختم نبوت اور ختم رسالت کے حوالے سے ہے جس میں آپؐ تمام انبیاء و رسل میں ممتاز ہیں۔

ختم نبوت اور ختم رسالت کے ایک پہلو سے تو ہم سب خوب اچھی طرح واقف ہیں یعنی یہ کہ حضورؐ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نہ کوئی صاحب شریعت نبی اور نہ کوئی بغیر شریعت نبی، نہ کوئی ظلی نبی اور نہ ہی کوئی بروزی نبی! آپؐ پر ہر نوع کی نبوت و رسالت ختم ہو گئی۔ لیکن ختم نبوت و رسالت کا دوسرا اور اہم تر پہلو یہ ہے کہ آپؐ پر نبوت و رسالت کا محض اختتام ہی نہیں ہوا، اتمام بھی ہوا ہے، تکمیل بھی ہوئی ہے۔ نبی اکرمؐ کی بعثت کا یہ وہ امتیازی پہلو ہے جو بالعموم ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ آپؐ کا بنیادی مقصد بعثت یقیناً وہی ہے جو تمام انبیاء اور تمام رسولوں کا تھا لیکن آپؐ کے مقصد بعثت میں ایک تکمیلی اور اتمامی شان بھی ہے جس کی حیثیت ختم نبوت اور تکمیل رسالت کے عکس اور پرتو کی ہے اور اس میں کوئی دوسرا نبی اور رسول آپؐ کے ساتھ شریک نہیں! سورۃ الصف میں درحقیقت حضورؐ کے مقصد بعثت کے اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی کے حوالے

سے جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا موضوع وہاں تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔
جہاں تک آپ کے اُس بنیادی مقصد بعثت کا تعلق ہے جو تمام انبیاء اور رسولوں کا مشترک مقصد بعثت رہا ہے، اس کے بارے میں یہاں کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ اس حوالے سے جو فرائض نبوت دیگر انبیاء کرام ادا کرتے رہے وہی فرائض آپؐ کو بھی تفویض ہوئے۔ قرآن حکیم میں کئی مقامات پر اس حقیقت کو بیان کیا گیا کہ: "وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ" (سورۃ الکھف، آیت ۵۶) "ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر مبشر اور نذیر بنا کر"۔ بعثتِ انبیاء و رسل کے ضمن میں یہ اللہ کا ایک عمومی قاعدہ ہے۔ چنانچہ یہی بات حضورؐ کے بارے میں بھی قرآن میں وارد ہوئی ہے: "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا" (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۵) "اور (اے نبی) ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر بشیر اور نذیر بنا کر"۔ ——— اسی طرح ہر نبی اپنی جگہ ہدایت و رہنمائی کا ایک روشن چراغ ہے، ہر نبی معلّم ہے، ہر نبی مُربّی اور مُزکّی ہے، ہر نبی داعی ہے، مبلغ ہے، اور مُذکّر ہے، یہ ساری حیثیتیں جملہ انبیاء کرام میں مشترک ہیں۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی یہ تمام حیثیتیں جمع ہیں اگرچہ ان میں سے ہر حیثیت کے اعتبار سے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک امتیازی شان کے حامل ہیں ع "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!" تاہم یہ وہ مشترک اوصاف اور حیثیتیں ہیں جو تمام انبیاء و رسل کو حاصل تھیں۔ سورۃ الاحزاب کی یہ مشہور آیت سب کو یاد ہے: "يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝" "اے نبی ہم نے آپؐ کو بھیجا ہے۔ شاہد بنا کر (گواہ بنا کر)، مبشر بنا کر اور منذر بنا کر (یعنی سیدھی راہ اختیار کرنے والوں کے لیے بشارت دینے والا بنا کر اور فکری و عملی کجروی اختیار کرنے والوں کے لیے خبردار کرنے والا بنا کر) اور اللہ کی طرف بلانے والے اس کے حکم سے اور ہدایت کا ایک روشن چراغ بنا کر۔" یہ تمام حیثیتیں مشترک ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں اور جملہ انبیاء و رسل میں۔

جہاں تک اس بنیادی مقصد بعثت کا تعلق ہے اس کے ضمن میں قرآن حکیم کی سب سے جامع اصطلاح 'شہادت علی الناس' کی ہے۔ ہمارے اس منتخب نصاب میں سورۃ الحج کی آخری آیت کے درس میں 'شہادت علی الناس' کا موضوع

نفس ن سے زیرِ بحث آیا تھا۔ اور وہیں یہ توجہ بھی دلائی گئی تھی کہ یہ مضمون ایک عکسی ترتیب کے ساتھ سورۃ البقرہ میں بھی جُوں کا تُوں موجود ہے : " وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا " اِس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے یہ بات بڑی وضاحت سے ہمارے سامنے آئی تھی کہ ختم نبوت و رسالت کے بعد 'شہادت علی الناس' کی ذمہ داری اب امتِ مسلمہ کے کاندھے پر آ چکی ہے۔ اس کے لیے سعی و جہد' اس کے لیے ایثار و قربانی' اس کے لیے اوقات اور صلاحیتیں کھپانا اور مال و جان کا لگانا' درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کی غایتِ اولیٰ ہے۔ یہ مقصدِ اوّلین ہے جہاد فی سبیل اللہ کا! ـــــــ اور جہاں تک تعلق ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی امتیازی اور تکمیلی شان کا' اس کے اعتبار سے بھی ایک فرضِ منصبی اب تا قیامِ قیامت امتِ مسلمہ کے کاندھے پر ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل اب ایک ذمہ داری کے طور پر منتقل ہو چکی ہے آپؐ کے ماننے والوں پر۔ جو اپنے آپ کو نبی اکرمؐ کی شفاعت کا حقدار سمجھتے اور آپؐ سے اپنی نسبت پر فخر کرتے ہیں۔ یقیناً آپؐ کی امت میں سے ہونا مسلمانوں کے لیے موجبِ صد افتخار ہے لیکن جہاں یہ بہت بڑی فضیلت کی بات ہے وہاں اتنی ہی بڑی ذمہ داری کا معاملہ بھی اس سے وابستہ ہے۔

؎ "جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے"

اس پہلو سے سورۃ الصّف کی بڑی اہمیت ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کیا ہے اور اس کے ضمن میں کیا عملی ذمہ داریاں ہیں جو آپؐ کے ماننے والوں پر' آپؐ کی امت پر عائد ہوتی ہیں!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ!

قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ○

حَاسِبُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُحَاسَبُوْا

مذاکرہ

جمہوریت کی تائید کیوں؟

ازقلم: حافظ عاکف سعید

یہ مضمون اواخرِ اگست میں رفقاء تنظیم اسلامی لاہور کے ایک مقامی اجتماع میں مذاکرے کے ایک پروگرام میں پڑھا گیا

رفقاء محترم ' آج کے اس اجتماع میں جو موضوع مجھے دیا گیا ہے وہ ہے تنظیم اسلامی اور جمہوریت۔ اور اس موضوع سے مقصود جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں موجود اس اشکال کو دور کرنے کی کوشش کی جائے کہ تنظیم اسلامی ایک جانب تو خود کو ایک انقلابی تنظیم قرار دیتی ہے لیکن دوسری جانب جمہوریت کی انتہائی شدّ و مد کے ساتھ وکالت اِسی کے پلیٹ فارم سے ہوتی ہے۔ آخر ہم پاکستان کے لئے جمہوریت کو لازمی و ضروری کیوں قرار دیتے ہیں!!

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ جمہوریت اسلام سے متصادم ہرگز نہیں ہے۔ بالخصوص "جمہوریت بمقابلہ اسلام" کا نعرہ محض کم علمی اور کوتاہ فہمی پر مبنی ہے!

دیکھئے 'جمہوریت کی روح کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ ایک خطۂ زمین میں رہنے والوں کو یہ حق ملنا چاہئے کہ اُس خطے کے اجتماعی معاملات اُن کے باہم مشورے اور اکثریت کی رائے کے مطابق طے ہوں۔ کوئی فردِ واحد سیاہ و سفید کا مالک نہ بن بیٹھے۔ ملک کی تقدیر کا مالک کوئی ایک ہی شخص نہ ہو بلکہ وہاں کے رہنے والوں کی رائے اور مرضی کو بھی وہاں کے معاملات میں دخل حاصل ہو ------ یہ ہے جمہوریت کی روح جو اسلام سے ہرگز متصادم نہیں ہے بلکہ "اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ" کے قرآنی حکم کے منشا سے بہت قریب ہے ------ ہاں مادر

پدر آزاد جمہوریت جس میں عوام یا عوامی نمائندوں کے اختیار پر کہیں کوئی حد بندی نہ ہو' قانون سازی کا کُل اختیار عوامی نمائندوں کو حاصل ہو' دین و شریعت کی بالادستی کا کہیں کوئی حوالہ نہ ہو' بلاشبہ دین سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی ۔ یہ درحقیقت مغرب کا تصور جمہوریت ہے ۔ وہ چونکہ عیسائی دنیا ہے' وہاں شریعت و قانون کو مذہب کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا ہے ۔ انجیل میں سرے سے شریعت ہے ہی نہیں' لہٰذا وہاں قانون سازی کا اختیار حاکمِ وقت کو ہوتا ہے ۔ اگر کہیں بادشاہت کا نظام برقرار ہے تو بادشاہ کا قانون نافذ ہوگا' کہیں کوئی آمر مطلق مسلط ہے تو وہ اپنی مرضی کے قانون بنوائے گا اور اگر جمہور یعنی عوام کی حاکمیت ہوگی تو قانون سازی کا تمام اختیار عوام کو حاصل ہوگا ۔۔۔۔۔۔ جبکہ ہم مسلمان چونکہ مدّعی ہیں کہ ہمارے پاس اللہ کی عطا کردہ شریعت موجود ہے' اور یہ کہ ہمارا دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر معاملے میں ہمیں رہنمائی دیتا ہے لہٰذا ایک اسلامی ریاست میں لامحالہ شریعت کو بالادستی حاصل ہوگی ۔ اگر ملوکیت اور بادشاہت کا دور ہے تو بادشاہِ وقت حدود و تعزیرات کے مکمل نظام کو نافذ کرنے کا پابند ہوگا اور اگر سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے تو بھی یہ حد بندی برقرار رہے گی کہ قرآن و سنت سے متصادم کوئی قانون سازی کسی صورت نہیں کی جا سکے گی ۔ لیکن قرآن و سنت کی معین کردہ حدود کے دائرے کے اندر اندر تمام اجتماعی معاملات قرآنی حکم "اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ" کے مطابق طے ہوں گے ۔ ملکی نظم و نسق کو چلانے کے لئے عوام اپنی آزاد مرضی سے اپنے نمائندوں کا چناؤ کریں گے اور وہ عوامی نمائندے مل جل کر اجتماعی معاملات کو چلائیں گے ۔ قانون و شریعت کی تنفیذ کا عمل بھی اسی Institution کے واسطے سے ہوگا ۔

اس پس منظر میں آپ غور کریں تو صاف نظر آئے گا کہ جمہوریت اپنے مزاج کے اعتبار سے ہرگز متصادم نہیں' بلکہ اسلام کے عطا کردہ سیاسی نظام سے قریب ترین ہے ۔ "اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ" کا تقاضا جتنا کچھ اس میں پورا ہو سکتا ہے' ملوکیت یا آمریت میں اس کا عُشرِ عشیر بھی ممکن نہیں!

دورِ خلافتِ راشدہ کی مثال ہمارے سامنے ہے ۔ اُس دور میں جبکہ ہر طرف ملوکیت کا دور دورہ تھا اور دنیا جمہوری اقدار سے ناآشنا تھی' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاشرہ

تشکیل دیا اس میں جمہوری اقدار کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ آپؐ صراحتہً کسی کو اپنا نائب نامزد کئے بغیر اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ آپ کو اپنے صحابہ پر اعتماد تھا کہ وہ باہم مشورے سے اپنے میں سے کسی ایسے فرد کا بطورِ امیر انتخاب کر لیں گے جو منصبِ خلافت کے اہل ہوگا۔ دورِ خلافتِ راشدہ میں اگرچہ ملکی معاملات میں حتمی فیصلے کا اختیار خلیفۃ المسلمین کو ہوتا تھا لیکن خلیفہ کی رہنمائی کرنے والی اور اس کے فیصلوں پر تنقیدی نگاہ رکھنے والی ایک مجلسِ شوریٰ بھی وہاں موجود تھی۔ اس مجلس میں شریک افراد کی اصابتِ رائے اور فقاہت پر لوگوں کو اعتماد ہوتا تھا۔ اُن کی حیثیت گویا مسلم عوام کے نمائندوں کی ہوتی تھی اور ہر اہم معاملے میں امیر مشورے کے لئے ان سے رجوع کیا کرتا تھا۔ اُس دور میں جمہوریت کا اس سے بہتر کوئی تصور ممکن نہ تھا!۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اگرچہ اپنے مزاحیہ کلام میں جمہوریت پر طنز بھی کیا ہے اور خاص طور پر انتخابی سیاست کا جو انداز مغربی ممالک میں اختیار کیا جاتا ہے اُس کے مفاسد پر پھبتیاں چست کی ہیں کہ

الیکشن ممبری کرسی صدارت ، بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اور ان کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہے ۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامے پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکر انسانے نمی آید !

لیکن اپنے سنجیدہ کلام میں اور اپنے خطبات (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) میں وہ جمہوریت کی افادیت اور جمہوری نظام کی ضرورت و اہمیت کو پوری طرح اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ برملا اعلان کرتے ہیں کہ یہ دور "سلطانیٔ جمہور" کا دور ہے۔ اس میں کوئی اور نظام نہیں چل سکتا۔ وقت کے اِس تیز رفتار دھارے کے سامنے تمام قدیمی نظام ریت کی دیوار ثابت ہوں گے۔ حالانکہ اقبال کے وقت میں جمہوریت کو عملاً اِس درجے فروغ حاصل نہ ہوا تھا۔ وہ ایک مقبول نظریئے کے طور پر ضرور متعارف تھی لیکن بالفعل جمہوری نظام دنیا کے بہت ہی کم حصے پر رائج و نافذ ہوا تھا۔ تاہم اقبال کو 'روحِ عصر' کے پہچاننے میں

کوئی دیر نہیں لگی۔ وقت کے تقاضے اور تاریخ کے رخ کو انہوں نے اسی وقت بھانپ لیا تھا۔ بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جمہوریت اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کے عطا کردہ سیاسی نظام سے بہت قریب ہے۔ چنانچہ اپنے خطبات میں انہوں نے اپنے اِس موقف کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اسلامی دنیا کے لئے جمہوریت کوئی نئی شے نہیں ہے۔ مسلمانوں نے تو چودہ سو سال قبل جمہوری نظام کی جھلک دنیا کو دکھادی تھی۔

حاصلِ کلام یہ کہ جمہوریت اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام کے ساتھ متصادم نہیں، ہم آہنگ ہے۔

اب ہم اس بحث کے دوسرے اور حساس تر گوشے کی طرف آتے ہیں کہ ایک جانب ہم انقلاب کی بات کرتے ہیں اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کی تشکیل کے لئے کوشاں ہیں لیکن دوسری جانب جمہوریت اور جمہوری عمل کی اہمیت پر سب سے زیادہ تاکیدی انداز بھی ہماری ہی طرف سے اختیار کیا جاتا ہے۔ آخر کیوں؟

اس کے جواب میں یہ بات آپ نے بارہا امیر تنظیم سے سنی ہوگی کہ اس ملک کا استحکام اگرچہ اسلام اور حقیقی اسلامی انقلاب کے ساتھ وابستہ ہے لیکن اس کی سالمیت اور اس کی بقا کا دارومدار جمہوریت پر ہے ـــــــ سادہ الفاظ میں اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس ملک میں اسلام اگر اپنی صحیح روح کے ساتھ نہ آیا اور حقیقی معنوں میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا نفاذ اگر یہاں نہ ہوا تو یہ ملک نہ صرف یہ کہ ہمیشہ غیر مستحکم اور متزلزل رہے گا بلکہ اس کے لئے وجہِ جواز ہی باقی نہ رہے گا۔ اس کے داخلی استحکام اور اس کی دیرپا بقا کا معاملہ صرف اور صرف اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن اگر یہاں جمہوریت نہیں ہوگی تو سرے سے ملک کا وجود ہی برقرار نہیں رہ سکے گا۔ اس ملک کے مزید حصے بخرے ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

یہ موقف محض ظن و قیاس کی بنیاد پر قائم نہیں کیا گیا بلکہ اِس کی پشت پر بڑے مضبوط دلائل موجود ہیں:

(۱) پہلی بات یہ کہ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ مبنی بر حقیقت ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہ ملک جمہوری عمل

(Democratic Process) کے ذریعے حاصل کیا گیا تھا۔ اسی بات کو امیر تنظیم اسلامی یوں بیان فرماتے ہیں کہ پاکستان کی ولادت جمہوری Process کے ذریعے ہوئی۔ گویا پاکستان کا باپ اگر اسلام کو قرار دیا جائے تو اس کی ماں جمہوریت قرار پائے گی۔ پاکستان کی آفرینش میں جمہوریت کا جو حصہ ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا!

(۲) دوسرے یہ کہ یہاں کے مخصوص داخلی حالات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہاں جمہوری عمل بہرصورت جاری رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ امرِ واقعہ ہے کہ پاکستان میں کوئی ایک نسل یا ایک ہی زبان بولنے والے آباد نہیں ہیں اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستانی قوم بالفعل علاقے اور زبان کی بنیاد پر متعدد قومیتوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔

جب تک اِس ملک کے ہر علاقے کے لوگ یہ محسوس نہ کریں کہ کسی ایک ہی علاقے کے لوگ ملکی معاملات کے اجارہ دار نہیں ہیں بلکہ ملکی معاملات میں اُن کی رائے کو بھی دخل حاصل ہے 'اُس وقت تک اِس ملک کی سالمیت شدید خطرے سے دوچار رہے گی۔ مختلف صوبوں اور علاقوں کے لوگوں کا یہ Sense of Participation اس ملک کی وحدت کے لئے ناگزیر ہے!

(۳) تیسرے یہ کہ وقت کا دھارا جس رخ بہہ رہا ہے اسے کسی صورت اب تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ نوعِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر پختگی اور بلوغت کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ اپنے سیاسی حقوق کا شعور مزدوروں اور کسانوں کی سطح تک بیدار ہو چکا ہے۔ اسے کسی طور دبانا اب ممکن نہ ہو گا۔ بقول اقبال سلطانیٔ جمہور کے زمانے کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب چاروناچار اسی رخ پر آگے بڑھنا ہو گا۔

گویا کسی بھی زاویۂ نگاہ سے جائزہ لے لیا جائے نتیجہ یہی نکلے گا کہ پاکستان کی بقا اور سالمیت جمہوریت کے ساتھ وابستہ ہے۔ مارشل لا یا مطلق العنان آمریت اس ملک کے لئے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ وہ بات ہے جس کا اقرار نہ صرف تمام سیاست دان کرتے ہیں بلکہ ملک کے تمام ہوش مند لوگ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ ہاں اگر کسی کی آنکھوں پر ذاتی مفادات کی پٹی بندھی ہو یا کسی ایک جماعت کی دشمنی میں کوئی ہوش و خرد سے عاری ہو چکا ہو تو اس کا معاملہ مختلف ہو گا۔ بصورتِ دیگر ہر باشعور پاکستانی یہ ماننے پر

مجبور ہے کہ پاکستان کی سالمیت کے لئے جمہوریت ناگزیر ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ ایک انقلابی جماعت کے سربر آوردہ لوگوں کا ہاتھ اگر حالات کی نبض پر نہ ہو اور وہ 'روحِ عصر' اور وقت کے تقاضوں کا شعور نہ رکھتے ہوں تو ملک میں بسنے والے ہوش مند اور باشعور لوگ اس جماعت اور اس کے انقلابی پروگرام کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ جیسے کہ ہمارے پڑھے لکھے طبقات میں یہ خیال عام ہے کہ دینی مدارس سے فراغت یافتہ لوگ جنہوں نے جدید علوم کا مطالعہ نہیں کیا' آج سے صدیوں پرانے دور میں رہ رہے ہیں۔ الاماشاء اللہ۔ یہی سوئے ظن اُن کا اِس انقلابی جماعت کے بارے میں بھی ہوگا۔ لیکن اگر معلوم ہو کہ اس جماعت کی قیادت کرنے والے وقت کے تقاضوں سے کماحقہٗ واقف اور اسلام کے حرکی تصور سے آگاہ ہیں تو وہ اس انقلابی جماعت اور اس کے پیغام پر کان دھرنے پر مجبور ہوں گے اور اگر صحیح انداز میں ان کے سامنے بات رکھی جائے تو وہ اِس دعوت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے یہ بات بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ پڑھے لکھے طبقات جنہیں ہم Intellectuals کہتے ہیں درحقیقت معاشرے کی قیادت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ اُن کی سوچ کو بدلے بغیر اور انہیں قرآن کی تلوار سے گھائل کئے بغیر کوئی ہمہ گیر تبدیلی لانا بعید از قیاس ہے!۔

ہمارے لئے جمہوریت کی تائید کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ جس خطے میں ہم انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں اور جسے ایک مثالی اسلامی ریاست بنانے کے خواہش مند ہیں' وہ خطہ اگر اپنی آزاد حیثیت کھو دے یا ٹکڑوں میں منقسم ہو کر عملاً کالعدم ہو جائے تو اسلامی انقلاب برپا کرنے کا موقع ہمیں حاصل نہیں رہے گا۔ وہ شاخ ہی باقی نہ رہے گی جس پر ہم آشیانہ تعمیر کرنے چلے ہیں ؏

کہ برگ و خس بیاوردیم و شاخِ آشیاں گم شد

اس بات کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کا معاملہ ذہن میں لائیے۔ وہ شدید خواہش رکھنے کے باوجود وہاں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک نہیں چلا سکتے جبکہ ہمیں یہ سہولت حاصل ہے کہ ہم ایک آزاد مسلمان ریاست کے شہری ہیں اور اس میں اسلامی نقلاب کی تحریک برپا کرنے کا موقع ہمیں حاصل ہے ــــــــ چنانچہ اس خطہ زمین کا ہم پر

یہ حق ہے کہ ہم اس کے مستقبل اور اس کی سالمیت کے بارے میں غور و فکر کیا کریں اور اس کی بقا اور استحکام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی سی سعی کریں!

ایک اور پہلو سے غور کیجئے! ہجرتِ مدینہ کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فوری اقدامات فرمائے ان میں یہودیوں کو معاہدوں میں جکڑ لینا بھی بہت اہم قدم تھا۔ غور کرنے سے آپ کے اِس اقدام کی یہ مصلحت سمجھ میں آتی ہے کہ ہجرت کے نتیجے میں جو خطۂ زمین مسلمانوں کو حاصل ہوا تھا اور جسے عالمی غلبۂ دین کے لئے اساس بننا تھا' درحقیقت اس کی حفاظت مقصود تھی۔ اندیشہ تھا کہ یہود مسلمانوں کو یہاں سے بے دخل کرنے کے لئے ہر ممکن سازش کریں گے۔ اِس اعتبار سے ہر اس خطہ زمین کی حفاظت اور سالمیت کے لئے تدابیر اختیار کرنا جہاں دینِ حق کے غلبے کے لئے کام کا موقع حاصل ہو' نہ صرف یہ کہ بہت ضروری ہے بلکہ غلبۂ دین کی جدوجہد میں ایک جزوِ لازم کی حیثیت رکھتا ہے!۔

*****

قارئینِ کرام

آپ کا خریداری نمبر اور چندہ ختم ہونے کی تاریخ نام و پتہ کے لیبل پر درج ہوتی ہے جس کی وجہ سے فرداً فرداً یاددہانی کی اگرچہ ضرورت نہیں رہتی۔ تاہم مزید سہولت کے لیے بعض حضرات کو یاددہانی کے لیے ڈاک کے واپسی کارڈ بھی ارسال کیے جا رہے ہیں جن کا ڈاک خرچ (اندرونِ ملک) ادارہ کے ذمّہ ہے۔ ازراہِ کرم' چندہ ختم ہونے پر پرچہ جاری رکھنے کے بارے میں بروقت مطلع فرمائیے!

اگر آپ میثاق اور حکمتِ قرآن' دونوں کے خریدار ہیں تو اِن کے لیے اکٹھی ادائیگی کیجئے۔ اس سے ادارے کو بھی سہولت ہوگی۔ شکریہ۔

من جانب: مینجر سرکولیشن

ضرورت رشتہ

اعلیٰ تعلیم یافتہ، دین دار، معزّز خاندان کی ہم صفت بیٹی کے لیے مخلص متّقی اور موحّد گھرانے سے موزوں کنوارہ رشتہ درکار ہے۔ والدین رابطہ فرمائیں۔

د م'

معرفت ماہنامہ "میثاق"

۳۶۔کے۔ماڈل ٹاؤن لاہور



Adarts HTP 3/85

تعلیم و تعلّم قرآن کی ضرورت و اہمیّت

نوجوانوں کی ایک مقامی تنظیم کے زیر اہتمام منعقدہ اجتماع میں امیر تنظیم اسلامی کے خطاب کا دوسرا حصّہ

ترتیب و تسوید: محمد اسلم عبداللہ / جاوید عبداللہ

آپ کی اس تنظیم میں لفظ جوان (Young) کے حوالے سے یہ چند باتیں میں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی بہت خوش آئند قدم ہے کہ آپ نے اس تنظیم کے پہلے اجلاس کا عنوان 'محفلِ اقرأ' رکھا۔ کیونکہ قرآن مجید میں جو پہلا لفظ نازل ہوا وہ بھی 'اقرأ' ہے۔ اس وقت میں آپ کے سامنے قرآن مجید کی پہلی وحی کا اجمالاً ذکر کروں گا تاکہ آپ ان آیات کے مفہوم کو سمجھ لیں 'جہاں سے آپ نے لفظ 'اقرأ' اخذ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل فرمائی وہ پانچ آیات پر مشتمل ہے۔ اس میں دو مرتبہ 'اقرأ' (پڑھیے!) کا حکم ہے۔ پہلی آیت میں فرمایا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ

"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا فرمایا!"

اس آیت میں وارد شدہ لفظ 'رب' کے دو مفہوم ہیں۔ ایک وہ جو مالک ہو' جیسے ربّ المال: مال والا اور ربّ الدار: گھر والا' گھر کا مالک۔ اور رب کے معنی پروردگار کے بھی ہیں۔ یعنی پرورش کرنے والا' پروان چڑھانے والا۔ اور ظاہر بات ہے کہ جو پرورش کرے گا وہ ضروریات بھی فراہم کرے گا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ کی تین نسبتیں اس ایک آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آئیں:

۱۔ وہ ہمارا خالق ہے۔ ۲۔ وہ ہمارا مالک ہے۔

۳۔ اور صرف مالک ہی نہیں بلکہ اس کے ذمے جملہ ضروریات کی فراہمی بھی ہے۔ ان

ضروریات میں جسمانی ضروریات بھی ہیں جن کی فراہمی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کائنات میں سارا سازو سامان مہیا کر دیا ہے۔ ہمارے ذمے صرف یہ کام لگایا گیا ہے کہ تلاش کرو، زمین میں ہل چلاؤ، فصلیں بوؤ، کاشت کرو۔ لیکن انسان کی ضروریات صرف مادی و جسمانی ہی نہیں ہیں۔ اس کے اندر عقل بھی ہے جس کی ضرورت ہے کہ اسے صحیح رخ پر ڈالا جائے اور صحیح علم، صحیح فکر و شعور عطا فرمایا جائے۔ پھر انسان میں روح بھی ہے کہ جس کی بالیدگی و ترفّع کا سامان بھی فراہم ہونا چاہئے۔ تو یہ انسان کی سہ گونہ ضروریات ہیں۔ ہماری مادی ضروریات اللہ نے اس زمین میں رکھ دی ہیں۔ ہمارا جسم بھی اسی زمین سے بنا ہے کہ جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ

کہ ہم نے تمہیں اسی (مٹی) سے تخلیق کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے۔

اور یہی ہماری سائنس بھی کہتی ہے کہ اسی قشرِ ارض (Crust Of The Earth) سے یہ سارا سلسلۂ نباتات و حیوانات ارتقاء کے عمل کے ذریعے سے وجود میں آیا۔ جہاں تک عقل اور روح کا تعلق ہے، ان کی ضروریات کا سامان زمین سے نہیں آتا۔ ان کی ضرورت ہدایت و رہنمائی ہے! کیونکہ ہماری روح بھی آسمانی ہے، لہٰذا اس کی ہدایت و راہنمائی کا سامان اور اس کی غذا اللہ نے آسمان سے الہامی کتابوں کی صورت میں نازل فرمائی ہے۔ اس کا نقطۂ عروج اور اس کے ارتقاء کی آخری منزل قرآن مجید ہے۔

اس قرآن حکیم کے نزول کا آغاز ان الفاظ سے ہوا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ○

"پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا فرمایا!"

اسی میں در حقیقت ہمارے لئے آداب بھی ہیں کہ مسلمان ہر اچھے کام کی ابتداء بسم اللہ سے کرے۔ اگرچہ ہمارے ہاں تو یہ روایت عام ہو گئی ہے کہ شراب خانوں، سودی اداروں اور سینما ہالوں کا افتتاح بھی تلاوتِ قرآن حکیم سے ہوتا ہے جو بالکل اہمل بے جوڑ سی بات ہے البتہ اللہ تعالیٰ جس نیک اور جائز کام کی توفیق دے اس کا آغاز آپ اللہ کے نام سے کریں

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝

ساتھ ہی یہ فرمایا گیا کہ ذرا غور کرو کہ اللہ کی خلّاقی کا کیا عالم ہے، اس نے اس انسان کو جمے ہوئے

خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے ــــ وہ انسان جسے صوفیاء نے ' عالم اصغر ' کہا ہے ' کیونکہ پوری کائنات اس میں منعکس ہے۔ پوری کائنات میں جو کچھ ہے وہ بالقوہ (Potentially) انسان کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں سورہ صٓ میں فرمایا: خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔ کہ اسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی خلاّقی کا جو سب سے بڑا مظہر اس کائنات میں پیدا فرمایا وہ انسان ہی ہے۔ اسی لئے یہ مسجودِ ملائک اور اشرف المخلوقات ہے۔ خود خالقِ کائنات نے اس کی تکریم کی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝

"اور ہم نے عزت دی ہے آدم کی اولاد کو اور سواری دی ان کو خشکی اور تری میں اور رزق دیا ہم نے ان کو پاکیزہ چیزوں میں سے اور جتنی مخلوقات ہم نے پیدا کی ہیں ان میں سے اکثر پر انہیں برتری دی ہے!"

تو قرآن مجید میں انسان کی یہ شان بیان ہوئی ہے۔ لیکن ذرا یہ بھی سوچئے کہ ہم نے انسان کے نام کو کس طرح بدنام کر دیا ہے کہ ع آدمی کو بھی میسّر نہیں ہے انساں ہونا!

یہ ہم جو اچھے بھلے لباس پہنے ہوئے ہیں ' انسانوں کی طرح دو ٹانگوں پر چلتے ہیں ' حقیقت میں ہم سب انسان نہیں ہیں ' بلکہ ہم میں سے اکثر پر حیوانیت کا غلبہ ہے۔ ہماری انسانیت سوئی ہوئی ہے یا وہ کہیں ہمارے اندر دفن ہو گئی ہے۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ساتھ ان کی جوانی میں ایک واقعہ پیش آیا تھا جو وہ سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ لاہور کے ڈبّی بازار سے گزر رہے تھے تو بازار ہی میں انہیں ایک درویش ملے اور ان سے کہنے لگے: "بیٹا' مجھے کسی انسان سے ملنا ہے ' مجھے ذرا کسی انسان کا پتہ بتاؤ"۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میرا جوانی کا دور تھا۔ میں نے مذاق کے لہجے میں کہا: "باباجی یہ سارا بازار انسانوں سے بھرا پڑا ہے۔ آپ کو کوئی انسان نظر نہیں آتا؟"۔ اس پر اُس درویش نے کہا: "کہاں ہیں انسان؟ مجھے تو نظر نہیں آ رہے!" مولانا لاہوریؒ فرماتے ہیں کہ اُس وقت ایک کیفیت مجھ پر بھی ایسی طاری ہو گئی کہ میں نے جو دیکھا مجھے نظر آیا کہ بازار میں کوئی بندر ہے ' کوئی سؤر ہے ' کوئی بھیڑیا ہے۔ کوئی انسان واقعتہً نظر نہیں آ رہا تھا۔

اگر ہم غور کریں تو ہمارا اپنا حال یہی ہے کہ ہم میں سے کسی پر شہوت کا اتنا غلبہ ہے کہ

حقیقت کے اعتبار سے خنزیر ہے۔ اسی طور سے جن لوگوں کے اندر نقالی اور حرص کا غلبہ ہے تو وہ بندر ہیں' انسان نہیں۔ کسی میں اگر انتقامی جذبہ زیادہ شدید ہے تو وہ اونٹ ہے' اس لئے کہ اونٹ اپنے کینے کی وجہ سے مشہور ہے۔ بھیڑئے کی خونخواری مشہور ہے تو اگر اس طرح کے اوصاف انسانوں میں آ گئے ہوں تو وہ انسان کہاں رہے؟۔ مولانا روم اپنے ایک فارسی شعر میں فرماتے ہیں: "انسانم آرزوست!" انہوں نے ایک شخص کو دیکھا کہ دن کے وقت چراغ لئے ہوئے گھوم رہا ہے۔ انہوں نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ میں کسی انسان کی تلاش میں ہوں ___ "انسانم آرزوست!"

اللہ تعالیٰ ہمیں حقیقی معنوں میں انسان بننے کی توفیق دے۔ وہ انسان جو اشرف المخلوقات اور مسجودِ ملائک ہے۔ ورنہ دنیا میں کثیر تعداد تو انہی لوگوں کی ہے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا

کہ ان کے دل ہیں لیکن تفقّہ سے خالی ہیں' حقیقت شناس نہیں ہیں۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے حقیقت کو نہیں دیکھتے۔ ان کے کان موجود ہیں لیکن حقیقی سماعت سے محروم ہیں۔ آنکھیں اور کان تو جانوروں کے بھی ہوتے ہیں۔ ایک کتا بھی سڑک پار کر رہا ہو تو دیکھ بھال کر کرتا ہے۔ جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ ایک انسان بھی اگر اتنا ہی دیکھے تو پھر اس میں اور کتے میں کیا فرق ہے؟۔ انسان کا دیکھنا تو کچھ اور ہے کہ۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا؟

تو انسان کو حقائق کو دیکھنا چاہئے۔ اگر حقیقت کو نہیں دیکھ رہے تو حیوانوں کا سا دیکھنا دیکھ رہے ہیں۔ حقیقت کی بات نہیں سن رہے تو حیوانوں کا سا سننا سن رہے ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے: اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ

کہ یہ تو چوپایوں کی مانند ہیں' بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔

چوپائے تو بنائے ہی گئے ہیں اس مقام پر۔ انسانوں کو بنایا گیا ہے اعلیٰ ترین مقام پر' لیکن وہ گر کر اس پستی میں آ گئے ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ○

تو ظاہر بات ہے کہ ایسے انسان حیوانات سے بھی گھٹیا ہیں۔

انسان کو حقیقی معنوں میں انسان بننے کے لئے جو چیز ضروری ہے وہ ہدایت ہے' وہ اس کی روح کی غذا ہے۔ اور یہ ہدایت اور روح کی غذا نازل ہوئی ہے ان الفاظ میں "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○"۔ تو اللہ تعالیٰ کی خلاقی کا تصور کیجئے کہ اس نے انسان کو ایک جمے ہوئے لوتھڑے (علق) سے بنایا۔

یہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر ذرا اس بات پر بھی غور کیجئے کہ ہم میں سے ہر ایک کا وجود ایک گندے پانی کی بوند سے ہے۔ اسی سے انبیاء و رسل اور اولیاء اللہ کی تخلیق ہوئی۔ افلاطون' سقراط و بقراط اور اسکندر و چنگیز اسی سے پیدا ہوئے۔ تمام انسانوں کا نقطۂ آغاز تو یہی ہے نا۔ اب ذرا سوچو کہ جس کی صفتِ خلاّقی کا یہ عالم ہے' اس کی صفت ہدایت کتنی عظیم ہوگی۔ وہ جب علم سکھائے گا تو وہ کتنا عظیم ہوگا۔ اُس کے دیئے ہوئے علمِ حقیقت کی قدر کو پہچانو۔ وہ علم ہے اے محمدؐ جو اب آپ پر نازل ہونا شروع ہو رہا ہے:

اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ○

"پڑھئے اور آپ کا رب بڑا ہی کریم ہے"۔

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○

"جس نے انسان کو قلم کے ذریعے تعلیم دی"۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ○

"انسان کو وہ کچھ سکھایا جو اُس کے علم میں نہیں تھا"۔

یہی بات دوسرے پارے میں حضورؐ کی شان میں اس طرح وارد ہوئی ہے:

کَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ

"اسی طرح ہم نے بھیجا تم میں اپنا رسول' تم ہی میں سے"۔

یعنی اے لوگو! ذرا ہمارے فضل و کرم کا احساس کرو کہ ہم نے تمھی میں سے اپنا رسول تمہاری طرف بھیجا ہے۔ اے قریش کے قبیلے والو' تمہارا ہی ایک بھائی ہے جس کو ہم نے رسالت سے سرفراز فرمایا۔ اے عرب کے رہنے والو' تم ہی میں سے ایک فرد کو ہم نے چُنا ہے اور یہ عظمت عطا فرمادی ہے۔ اے انسانو' تم ہی میں سے ایک شخصیت کو ہم نے یہ مقام عطا فرمایا ہے۔ "یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا" جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سنا رہا ہے" وَیُزَکِّیْکُمْ ـــــ "اور تمہارا تزکیہ کر رہا ہے" وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ۔ "اور

تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے" وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ○ "اور تمہیں وہ کچھ سکھا رہا ہے جو تم جانتے نہیں تھے"۔ تو عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ، اور وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ○ میں اس مشابہت کی وجہ سے ادھر ذہن منتقل ہوا۔ تو یہ ہے میرے نزدیک "اِقرأ" کی اہمیت! ۔ ایک اہم بات جو آج سمجھ کر اٹھیے وہ یہ ہے کہ قرآن اللہ کی رحمت کا عظیم ترین مظہر ہے۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی پر جو عظیم ترین احسان فرمایا وہ قرآن ہی کا نزول ہے۔

اللہ کرے کہ آپ کی یہ تنظیم مبارک ثابت ہو' اس اعتبار سے کہ اس نے اپنے پہلے افتتاحی اجلاس کے لئے یہ لفظ "اقرأ" بطور عنوان اختیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی مناسبت سے یہ بات آپ کی تنظیم کے اہم مقاصد میں سے بنا دے کہ قرآن سیکھنا ہے' سکھانا ہے اسے پڑھنا ہے' پڑھانا ہے۔ اس سے اعلیٰ کوئی ہدایت نہیں اور اس سے اعلیٰ کوئی کام نہیں! اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنی صلاحیتوں کو بیدار کریں تو میں آپ کو سورۃ الرحمٰن کی پہلی چار آیات کے حوالے سے اور ایک حدیث کے حوالے سے یہ بات بتاؤں گا کہ اگر آپ کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ بیان عطا فرمائی ہے تو اس کا مصرف کیا ہونا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیات ہر مسلمان کو یاد ہوں گی۔ قاری محمد عبد الباسط عبد الصمد کی سورۃ الرحمٰن کی قراءت ہمارے ہاں بہت مقبول ہوئی اور عوامی سطح پر اس کا خاصا ذوق و شوق پیدا ہوا ہے۔ سورۃ الرحمٰن کا آغاز ہوتا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○

"رحمٰن نے قرآن سکھایا"۔

رحمٰن اللہ کا وہ نام ہے جس میں اُس کی شانِ رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند سامنے آتی ہے۔ اس میں ایک ہیجان ہے' ایک طوفانی کیفیت ہے۔ اصل میں 'فَعلان' کا وزن عربی زبان میں کسی کیفیت کی شدّت کے اظہار کے لئے مستعمل ہے۔ اگر ایک عرب یہ کہنا چاہے کہ میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں تو کہے گا: اَنَا عَطْشَانُ ــــــ اسی طرح اَنَا جُوعَانُ ــــــ کا مطلب ہو گا کہ میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔ 'غَضْبان' اسے کہیں گے جو بہت غضب ناک ہو۔ غصے کی وجہ سے آگ بگولہ ہو گیا ہو۔ 'رحمٰن' میں اللہ کی وہ شان ہے کہ گویا رحمتِ خداوندی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہے۔ اس رحمٰن سے مناسبت

ہے اس قرآن کی! اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ ـــــــ رحمٰن کی رحمانیت کا مظہرِ اتم اور اس کی رحمت کا سب سے بڑا ظہور قرآن کی شکل میں ہوا۔ اس نے قرآن سکھایا۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ ـــ "اس نے انسان کو بنایا"۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ "اسے بات کرنا سکھایا"۔

ان چار آیات میں چوٹی کی چار چیزیں بیان ہوئی ہیں۔ اللہ کے ناموں میں چوٹی کا نام 'رحمٰن' ہے۔ اس نے جو علم انسان کو دیا اس میں چوٹی کا علم 'قرآن کا علم' ہے۔ اگرچہ جو بھی علم ہمارے پاس ہے اللہ کا ہی عطا کردہ ہے۔ سائنس بھی اسی نے سکھائی ہے۔ یہ اس 'علم الاسماء' (The Knowledge Of Names) ہی کا ظہور تو ہو رہا ہے جو حضرت آدمؑ کو ودیعت کر دیا گیا تھا تو سارا علم اللہ نے عطا کیا لیکن اس میں چوٹی کا علم 'قرآن کا علم' ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ ـــ "انسان کو بنایا"۔ سوال یہ ہے کہ جنوں' فرشتوں اور دوسری مخلوقات کو کس نے بنایا؟ دریا' پہاڑ' سورج' چاند اور ستارے کس نے بنائے؟ ان سب کو اللہ نے بنایا ہے۔ لیکن اللہ کی مخلوقات میں چوٹی کی مخلوق یہ 'انسان' ہے۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○ ـــ "اس نے اس کو بیان سکھایا"۔ یہ قوتِ بیانیہ انسان کی استعدادات میں چوٹی کی صلاحیت ہے۔ اگرچہ اس کے پاس سماعت بھی ہے' بصارت بھی ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ سماعت اور بصارت تو بعض حیوانات میں ہم سے زیادہ ہے۔ ذرا سی آہٹ پر گھوڑے کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شکاری پرندے بڑی بلندی سے زمین پر پڑی ہوئی سوئی تک کو دیکھ لیتے ہیں۔ ایسے حیوانات بھی ہیں جو رات کو بھی دیکھتے ہیں۔ سونگھنے کی صلاحیت بھی حیوانات میں ہم سے بہت زیادہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کتا ہر چیز کے بارے میں سونگھ کر اندازہ کر لیتا ہے۔ جسمانی طاقت شیر اور ہاتھی میں ہم سے کہیں بڑھ کر ہے۔ تو یہ ساری استعدادات جو انسان کو دی گئی ہیں حیوانات میں بھی ہیں اور بعض حیوانات میں بعض پہلوؤں سے ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن انسانی صلاحیتوں میں یہ قوتِ بیان چوٹی کی صلاحیت ہے' جو صرف انسان کو عطا کی گئی ہے۔ اسی لئے اہلِ منطق انسان کو حیوانِ ناطق کہتے ہیں' یعنی وہ حیوان ہے جس کے اندر نطق و گویائی ہے' جو اپنے خیالات کو ظاہر کرتا ہے' انہیں Communicate کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی دماغ میں سب سے بڑا حصہ 'Speech Centre' ہے۔ تو معلوم ہوا کہ انسان کی سب سے بڑی صلاحیت قوتِ بیان ہے۔

اب ذرا ان چاروں چیزوں کو باہم جوڑیئے! اللہ کے ناموں میں سے چوٹی کا نام 'رحمٰن' ۔

جو چیزیں رحمٰن نے سکھائیں ان میں چوٹی کی چیز ' قرآن '۔ اس کی مخلوقات میں چوٹی کی مخلوق 'انسان' ۔ انسان کو اس نے جو صلاحیتیں دیں اس میں چوٹی کی صلاحیت ' قوتِ بیان ' ۔ تو س قوتِ بیان کا مصرف کیا ہونا چاہئے؟ قرآن کا بیان کرنا! آپ کو معلوم ہے کہ یہی قوتِ بیانیہ ہے جس کے بل بوتے پر اعلیٰ وکیل بہت بڑی بڑی فیس لیتے ہیں ۔ دنیا کے بڑے بڑے بڈر اپنی قوتِ بیان ہی سے پوری پوری قوموں کے جذبات کو ابھار لیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ٹلر ایک بڑا آتش بیان مقرر تھا ۔ اُس نے اپنی قوم کے اندر اپنی تقریروں کے ذریعے سے اگ بھر دی تھی تو اگر کسی کے اندر یہ صلاحیت ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اس بات سے بچائے کہ وہ س صلاحیت کا کوئی اور استعمال کرے ۔ بلکہ اس کا مصرف یہ ہونا چاہئے کہ وہ قرآن کو بیان رے ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمایا: خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

" تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جنہوں نے قرآن سیکھا اور سکھایا۔"

نانچہ سب سے چوٹی کے لوگ وہ ہوں گے جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں ' اسے پڑھیں اور ھائیں ۔ قرآن کا علم حاصل کریں اور اس کو آگے پھیلائیں ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اپنی لیم میں کوئی اور کام نہ کریں لیکن آپ اپنے مقاصد میں اس کو سرِفہرست رکھئے کہ قرآن میں اور پڑھائیں! سمجھیں اور سمجھائیں! سیکھیں اور سکھائیں! چونکہ آپ نے اپنی پہلی ل کے لئے " اقرأ " کا عنوان رکھا ہے اور اس حوالے سے میں نے آپ کے سامنے یہ کچھ رکھے ہیں ' اس لئے آپ اپنے معمولات میں ایک ہفتہ وار درسِ قرآن کا اہتمام ضرور یں! ۔

پھر یہ کہ ہمارے ہاں بہت سے بالغ حضرات ایسے ہیں جو قرآن ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے ب انہیں شرم آئے گی کہ ہم کیسے کسی کے سامنے بیٹھ کر الف ' با ' تا سے پڑھنا شروع یں ۔ تو میں ان کی دلجوئی کے لئے کہا کرتا ہوں کہ دیکھئے حضورؐ نے چالیس برس کی عمر میں ان پڑھنا شروع کیا تھا ۔ اس لئے کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوئی تو آپؐ کی عمر چالیس برس ہ ۔ اور جب پہلا حکم نازل ہوا " اقرأ " تو آپؐ نے فوراً یہ عرض کیا تھا مَا اَنَا بِقَارِئٍ (میں تو پڑھا نہیں ہوں!) تو پھر حضرت جبرئیل نے حضورؐ کو اپنی آغوش میں لے کر بھینچا ۔ وہ واقعہ پ نے سنا ہو گا ۔ چنانچہ اگر ہم سے کوتاہی ہو گئی ہو ' ہمارے والدین نے اس طرف توجہ نہ ہو یا ہمارے ماحول کی خرابی کے باعث ہماری تعلیم میں کمی رہ گئی ہو تو اس کی تلافی ضروری

ہے۔ اس ضمن میں میں خود اپنا ایک واقعہ بھی سنایا کرتا ہوں کہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۵ء تک کراچی میں رہا۔ میرے چھوٹے بھائی جو اب پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں' اس دوران لاہور سے بی۔ اے کرکے کراچی یونیورسٹی میں داخلے کے لئے وہاں آئے۔ ایک روز میں نے انہیں قرآن شریف پڑھتے سنا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ٹھیک نہیں پڑھ رہے۔ وہاں ہمارے قریب ہی شکار پور کالونی میں مسجد تھی جو 'مسجد طیبّ' کہلاتی ہے۔ اس کے مؤذن اور خادم بہت ہی خوش الحان قاری تھے۔ چنانچہ میں نے برادرِ عزیز سے کہا کہ ان مؤذن صاحب کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کرو اور نورانی قاعدے سے پڑھنا شروع کرو۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق دی کہ اگرچہ وہ فلسفے میں بی اے (آنرز) کرکے آئے تھے' لیکن انہوں نے میرا حکم مانا اور مؤذن صاحب سے نورانی قاعدے سے پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد قرآن مجید کے ساتھ ان کا شغف قائم رہا تو اس لئے کسی عمر میں بھی آپ یہ نہ سمجھیں کہ اب ہم کیا کریں' بلکہ قرآن پڑھنا سیکھئے!۔

اس کے علاوہ عربی سیکھنے کا ارادہ کیجئے تاکہ قرآن تک آپ کی براہِ راست رسائی ممکن ہو اس کی میں سادہ سی مثال دیتا ہوں کہ غالب کا ایک شعر جب آپ سنیں گے تو جھوم جائیں گے لیکن اسی کا انگریزی میں ترجمہ کرکے پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں تو کوئی خاص بات نہیں! مثال کے طور پر ؎

"ابنِ مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی"

کو انگریزی میں Translate کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بڑی بے تکی سی بات ہے۔ ہر زبان کا ایک ادبی اسلوب ہوتا ہے جس کی چاشنی ترجمے میں باقی نہیں رہتی۔ ترجمے میں آپ کو قانون کا علم ہو جائے گا۔ معلوم ہوگیا کہ نماز فرض کی گئی' روزہ فرض کیا گیا۔ یہ علم ہوگیا کہ سود حرام ہے لیکن جو قرآن کا اندازِ نگارش ہے' اس کی ادبیت' اس کی فصاحت و بلاغت اور اُس کی چاشنی ہے جو اُس کے اعجاز کا سب سے بڑا پہلو ہے، اس تک آپ کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے اور اس میں جہاں اس کے علوم اور حکمتیں اعجاز کی شان کی حامل ہیں' وہاں بنیادی طور پر اصل اہمیت درحقیقت اُس کی فصاحت و بلاغت اور ادبیت کی ہے اور اسے آپ Translation کے ذریعے بالکل Communicate نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے تو آپ کو اصل زبان کچھ نہ کچھ

سمجھتی ہو گی۔ چنانچہ عربی زبان سیکھئے! آپ نے انگریزی سیکھی ہے' حالانکہ انگریزی زبان کا ہماری مادری زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا Alphabet بالکل مختلف ہے لیکن انگریزی آپ نے سیکھ لی۔ اور ہمارے ہاں لوگوں نے ایسی ایسی انگریزی سیکھی کہ انگریزوں کو پڑھادیں۔ جبکہ عربی وہ زبان ہے جس کے حروف تہجی بھی وہی ہیں جو ہم استعمال کرتے ہیں۔ اور ہماری زبان کے ستر فیصد الفاظ عربی کے ہیں۔ کچھ تھوڑے سے الفاظ اس میں ہندی سے آئے ہیں ورنہ اکثر و بیشتر عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں۔ اور خود فارسی میں پچاس فیصد سے زائد الفاظ عربی کے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جدید فارسی میں سے اب عربی الفاظ نکالے جا رہے ہیں۔ چنانچہ عربی زبان کا سیکھنا ہمارے لئے اتنا مشکل نہیں ہے۔ آپ اپنی اس تنظیم کے تحت قرآن کی تجوید کے علاوہ عربی زبان کی گرائمر کی کلاسز کا اجراء کر سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ درسِ قرآن کی ایک محفل کا آغاز کر سکتے ہیں۔ ہماری "انجمن خدام القرآن" ان تمام معاملات میں حتی الامکان آپ سے تعاون کرے گی۔

میری دعا ہے کہ اللہ کرے کہ آپ میں سے چند لوگ ایسے پیدا ہو جائیں جو حضورؐ کے اس قول کا مصداق بن جائیں کہ: خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں"۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر جن کا ذکر میری گفتگو کے پہلے حصے میں ہوا' انہوں نے مدینے میں جا کر یہی کام کیا۔ اہل مدینہ انہیں "المقری" (قرآن پڑھانے والے) کہا کرتے تھے۔ ان کی زبان چونکہ عربی تھی' قرآن خود ان کی زبان میں نازل ہوا تھا' لہٰذا ان کا کام آسان تھا۔ ہمارے لئے اس میں تھوڑی سی دقت ہے' لیکن جو کام جتنا مشکل ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب عطا ہو گا۔ تو ہمت کر کے عربی حروف کے مخارج درست کریں' تاکہ قرآن صحیح پڑھیں۔ عربی سیکھیں تاکہ قرآن سمجھ میں آئے!!! اگر آپ اپنی تنظیم کے تحت درس قرآن کی ہفتہ وار مجلس رکھتے ہیں تو میں اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک کی ذمہ داری لگادوں گا کہ وہ قرآن مجید کے اُس 'منتخب نصاب' کا درس شروع کر دے جسے میں نے مرتّب کیا ہے اور جس سے قرآن کی بنیادی ہدایت سامنے آجاتی ہے۔ تو اس سے میرا مدّعا یہ ہے کہ آپ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کیجئے اور ان صلاحیتوں کو دین کے رخ پر ڈالئے۔

ایک بات میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ان کاموں کو آپ صرف دینی کام سمجھ کر نہ کیجئے گا۔

ہمارے لئے یہی قومی خدمت بھی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے اس ملک اور وطن کی بنیاد
ائے دین کے اور کوئی نہیں۔ ہم نے دین کی بنیادیں مضبوط نہیں کیں تو ملک دولخت ہوگیا
ر تاریخ کی عظیم ترین شکستوں میں سے ایک شکست کا داغ ہمارے ماتھے پر لگ گیا۔
وطِ ڈھاکہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے
یان' کی صورت میں ایک ' Safety Valve ' رکھا ہوا ہے۔ ورنہ تو آدمی کے لئے
ندگی اجیرن ہو جائے اور آدمی خود اپنی یادداشت کے زوال کی دعا کرنے لگے ۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا !

ر ہمیں وہ صدمہ یاد رہتا جو سقوطِ ڈھاکہ کے وقت ہوا تھا تو ہمارے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔
لیکن بہرحال یہ داغ کوئی معمولی داغ نہیں ۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اسے کبھی کبھی تازہ کرلینا چاہئے۔ تو یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم نے اس ملک کو اسلام کی طرف عملاً نہیں بڑھایا اور یہی وجہ ہے کہ یہ باقی ماندہ ملک بھی آج شدید خطرات کی زد میں ہے۔ باہر کے خطرات سے قطع نظر میرے نزدیک اصل خطرہ اندر ہے۔ باہر کا خطرہ ہمیشہ اندرونی خطرات سے تقویت حاصل کرتا ہے۔ جب تک کہ اندر سے کوئی خرابی نہ ہو باہر کا دشمن کبھی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ آج ہمارا حال یہ ہے کہ ملک کے اندر عصبیتیں بڑھ رہی ہیں ' قومیتوں کا تصور بڑھ رہا ہے۔ ایک ہی ملک کے مختلف صوبوں کے درمیان کہیں پانی کی تقسیم کا جھگڑا ہوتا ہے تو کہیں دوسرے وسائل کی تقسیم کا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔
اگر وسائل میں کہیں کوئی کمی ہے تو ہمیں مل جل کر وہ کمی بانٹ لینی چاہئے۔ مسلمانوں کو تو غیر مسلموں کا دکھ درد بھی تقسیم کرنا چاہئے ۔ ہم اگر انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ایتھوپیا کے قحط زدگان کے لئے چاول اور گندم بھجوا سکتے ہیں تو اپنے ہم وطنوں کے لئے ایثار کیوں نہیں کر سکتے ؟۔

ہمارے اندر جس چیز کی شدید کمی ہے وہ اخوتِ باہمی کے جذبہ کی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم میں اخوتِ دینی اور اخوت اسلامی نہیں ہوگی تو عصبیتیں پروان چڑھیں گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ خلا (Vacuum) تو کہیں نہیں رہتا۔ جہاں ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہے ' آندھیاں چلتی ہیں اور طوفان آتے ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ نظریاتی خلا واقع ہوگیا ہے ' اسلام جو ہماری

مل جڑ اور بنیاد تھا اس کو ہم نے مستحکم نہیں کیا' تو اس کا نتیجہ ہم بھگت رہے ہیں اور
دانخواستہ اگر اس بچے کھچے پاکستان پر جسے ہم "What Remains Of Pak-
ista کہا کرتے ہیں 'کوئی مصیبت نازل ہوئی تو ہمارا حال ان بہاریوں سے بدتر ہو سکتا ہے
، بیچارے ابھی تک کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں کروڑپتی بھی تھے۔ 'موتی
میل ایریا' میں ان کے اعلیٰ ترین بنگلے تھے۔ لیکن پھر اجڑ کر وہ کہاں پہنچے؟۔ اب آپ ان کو
دو کمرے کے کوارٹر دے رہے ہیں تو اسے بڑا احسان سمجھ رہے ہیں۔ آپ رابطہ عالم اسلامی
کے چندوں اور خیرات سے ان کے لئے بہاری کالونیز بنا رہے ہیں اور بڑی مشکل سے انہیں
لستان میں جگہ دینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ تو یہ خدانخواستہ ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم
ن سے کم مجرم نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کو فوری سزا دیتا ہے اور کسی کو
ھیل دے دیتا ہے۔

تو اب ہمارے لئے یہی راستہ ہے کہ اس ملک کی تقویت اور استحکام کے لئے بجائے
ہی نعروں کے کوئی واقعی اور حقیقی کام کا آغاز کریں۔ اور اگر ہم دینِ اسلام کو اس کی اصلی اور
یقی صورت میں یہاں قائم کریں تو یہ ہمارے اس ملک کے مستقبل کی ضمانت دے سکتا
ہے۔ اس لئے جو کام میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں وہ درحقیقت ہماری قوم اور ہمارے
لک کے لئے استحکام کی واحد بنیاد ہے۔ لہٰذا آپ یہ کام کیجئے۔ اللہ آپ کی اس تنظیم کو آپ
کے لئے مبارک کرے اور مفید بنائے۔ آپ ہر پہلو پر اپنے امداد باہمی کے کام اس کے ذریعے
سے کر سکتے ہیں' ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹ سکتے ہیں' ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔

آپ نے 'ویلفیئر' کا لفظ بھی اپنی اس تنظیم کے نام میں شامل کیا ہے لیکن جان لیجئے کہ
یثیتِ مسلم ہمارا تصورِ ویلفیئر یہ ہے کہ اصل ویلفیئر اور اصل بھلائی آخرت کی بھلائی ہے۔
دنیا کی ویلفیئر عارضی ہے جو دو وقت کھاتا ہے اور اعلیٰ غذا کھاتا ہے اسے بھی مرنا ہے اور جو
یک وقت کھاتا ہے' روکھی سوکھی کھاتا ہے وہ بھی مرے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی دو
قت مرغن غذا کھانے والے سے اچھی گزرے' جسے ذیابیطس اور بلڈ پریشر کے امراض لاحق
ونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے اوپر قدغنیں لگ جاتی ہیں کہ ناپ تول کر
کھایئے۔ لیکن روکھی سوکھی کھانے والے کی جسمانی صحت تو برقرار رہتی ہے۔ لہٰذا میں پھر
رض کر رہا ہوں کہ اصل ویلفیئر جو ہے وہ آخرت کی ویلفیئر ہے' جہاں ہمیشہ کی زندگی ہے'

(باقی صفحہ ۹۰ پر)

رودادِ سفر

امریکہ اور سعودی عرب میں ۲۲ دن

امیر تنظیم اسلامی کی 'اسنا' کنونشن میں شرکت' اور دورۂ سعودی عرب کی رُوداد

مرتّب : حافظ عاطف وحید

اس سال یعنی ۱۹۹۰ء میں محترم والد صاحب کا شمالی امریکہ کے سفر کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ ماہ جون میں اسپین اور برطانیہ کے سفر کے باعث انہیں ایک مہینہ پاکستان سے باہر رہنا پڑا تھا اور اب مزید کسی بیرونی سفر کے لئے ان کی طبیعت قطعاً آمادہ نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا ------ چنانچہ " ISNA " یعنی اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے صدر جناب احمد زکی حماد نے اپنے ۱۹۹۰ء کے سالانہ کنونشن کے لئے والد صاحب سے بغیر پوچھے ان کا نام مہمان مقرروں کی فہرست میں شائع کر دیا (یاد رہے کہ پچھلے سال کے کنونشن میں والد صاحب نے پہلی مرتبہ ISNA کے پروگرام میں اتفاقاً شرکت کی تھی اور ایک مین سیشن سے خطاب بھی کیا تھا)۔ جناب ڈاکٹر خورشید ملک صاحب کے استفسار پر انہوں نے بلا تکلف یہ کہا کہ میرا بھی IMA (اسلامک میڈیکل ایسو سی ایشن) کے اجلاس میں شرکت کے لئے سپین جانے کا ارادہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں وہاں ڈاکٹر صاحب کو کنونشن میں شرکت کے لئے راضی کر لوں گا' لہٰذا میں نے ان کا نام بھی فہرست میں شائع کر دیا۔ دوسری طرف تنظیم اسلامی شمالی امریکہ کے رفقاء نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس دورے کے حق میں زور دینا شروع کر دیا۔ اس طرح والد صاحب کو ہاں کرتے ہی بنی اور تقریباً دو ہفتے کا امریکہ کا دورہ اور ایک ہفتہ کا سعودی عرب کا پروگرام طے پا گیا۔ جناب محترم قمر سعید قریشی صاحب نائب امیر تنظیم بیرون پاکستان نے اس دورے کے لئے والد صاحب کی رفاقت کے لئے میرا نام تجویز کیا جو کسی قدر ردو قدح کے بعد منظور ہو گیا۔

پروگرام کے مطابق ۷ اگست کو صبح ہم کراچی کے لئے روانہ ہوئے۔ رفقاء کراچی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسی روز شام کو ایک خطاب عام کا اہتمام کر لیا تھا۔ چنانچہ بعد نمازِ مغرب حق

پرستوں کے مرکز عزیز آباد میں واقع ایک مینارہ مسجد میں والد صاحب نے تقریر کی۔ موقع کی مناسبت سے کراچی کی موجودہ صورت حال' اس صورت حال کے اسباب اور اصلاح احوال کے امکانات پر سورۃ النحل کی آیت نمبر ۱۱۲ کے حوالے سے روشنی ڈالی۔ سامعین کی ایک کثیر تعداد نے کراچی کے مسائل کے حل کی اس نئی approach کو استعجاب کے عالم میں سنا۔ ۸ر کی صبح دو بجے ہماری نیویارک کے لئے فلائٹ تھی۔ دو گھنٹہ پہلے ہی ہم ایرپورٹ پہنچ گئے۔ لیکن یہاں پہنچ کر ایک عجیب صورت حال سے سابقہ پڑا۔ ٹکٹ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ والد صاحب کا ٹکٹ تو OK ہے لیکن میرا کنفرم نہیں ہے اور فلائٹ پر اس قدر رش ہے کہ مجھے سیٹ ملنے کی کوئی توقع نہیں۔ جناب زین العابدین صاحب نے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن کامیابی نہ ہوئی' بالآخر والد صاحب نے فیصلہ سنا دیا کہ اگر دونوں سیٹیں کنفرم نہ ہوئیں تو وہ سفر کے پروگرام کو ختم کر دیں گے۔ اس موقع پر زین العابدین صاحب نے اپنے روایتی عزم اور ہمت سے کام لیا اور والد صاحب کو آمادہ کر لیا کہ وہ تو فلائٹ مت چھوڑیں' میرے لئے انہوں نے کوشش کا وعدہ کیا کہ جتنی جلدی ممکن ہوا مجھے نیویارک کے لئے روانہ کر دیں گے۔ بالآخر اسی پریشانی میں والد صاحب نیویارک کے لئے روانہ ہو گئے۔ جبکہ مجھے جناب اسلم علوی صاحب کی خصوصی کوششوں سے اگلے دن یعنی ۹ر اگست کو صبح ۵.۴۵ کی فلائٹ پر سیٹ ملی اور میں تقریباً ایک یوم تاخیر سے نیویارک پہنچا۔

نیویارک کے کینیڈی ایرپورٹ پر جناب الطاف احمد صاحب موجود تھے۔ ان سے تقریباً سات سال بعد ملاقات ہو رہی تھی۔ ان کے چہرے پر موجود بشاشت اور لہجے میں دو ٹوک انداز بالکل اسی طرح تھا جیسے کہ سات سال قبل پچھلی ملاقات میں میں نے پایا تھا۔ نیویارک کے Port Of Entry ہونے کی وجہ سے ہر بار امریکہ کے سفر میں آتے جاتے دونوں بار یہاں رکنا پڑتا ہے۔ پچھلے دس گیارہ برسوں میں والد صاحب کی تقریباً ہر سال امریکہ آمد کے موقع پر نیویارک میں اس دوہری میزبانی کو جناب الطاف صاحب نے نہایت عمدگی اور خندہ پیشانی سے سرانجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین۔

رات تقریباً نو بجے ٹیلی وژن کے ایک چینل پر صدر صدام حسین کا تفصیلی انٹرویو نشر کیا گیا۔ انٹرویو لینے والے امریکی جرنلسٹ نے بہت سے ٹیڑھے سیدھے اور طیش دلانے والے سوالات صدام حسین سے پوچھے لیکن جس سکون و اطمینان سے اس نے ان کے جواب دیئے اور جس جرأت سے صدر بش کو مناظرے کا چیلنج دیا اس نے صدام کے بارے میں پائی جانے والی یہ رائے کہ یہ

کوئی جنونی اور بددماغ شخص ہے یکسر بدل کر رکھ دی۔ بعد میں ایک موقع پر الطاف صاحب اس کے انداز سے متاثر ہو کر کہنے لگے کہ وہ تو بہت نپی تلی ہوئی باتیں کر رہا تھا اور ،

"He was not beating about the bush"

تو والد صاحب نے نہایت بے ساختہ جواب دیا کہ :

"He was beating Bush (Mr.) not about the bush"

اگلے دن یعنی ۳۰ر اگست کو شام کی فلائٹ سے ڈیٹن کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ اوہائیو اسٹیٹ کا شہر ہے۔ ڈیٹن کے چھوٹے سے ایر پورٹ پر ISNA کی طرف سے دو فلسطینی نوجوان عادل اور ہیثم استقبال کے لئے موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں سیدھا کونشن سنٹر سے متصل ہوٹل "سٹوفر" پہنچا دیا۔ یہ جگہ عین وسط شہر میں واقع ہے۔ ہوٹل کی نویں منزل میں ہمارے لئے کمرہ پہلے سے بک تھا۔ نویں اور دسویں منزل Club Flour کہلاتی ہیں۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں حفاظت کے خصوصی انتظامات ہیں۔ لفٹ بغیر Key Card استعمال کئے اس منزل پر نہیں رکتی۔ کونشن ہال اور ہوٹل کے درمیان صرف ایک معروف سڑک گزرتی ہے، جسے بسہولت عبور کرنے کے لئے ایک فضائی سرنگ ہوٹل اور سینٹر کے درمیان بنائی گئی ہے۔ سینٹر میں داخل ہوتے ہی سامنے استقبالیہ بنایا گیا تھا۔ شرکاء کے نام کمپیوٹر کی مدد سے رجسٹر کرکے انہیں ایک خوبصورت شناخت نامہ دیا جاتا جسے کونشن میں شرکت کے دوران سینے پر نمایاں آویزاں کرنا ضروری تھا۔ استقبالیہ پر کئی عرب لڑکے اور سکارف میں ملفوف لڑکیاں مستعد موجود رہتے۔ کونشن سینٹر کوئی ایک ہال روم نہیں بلکہ بہت سے بڑے چھوٹے ہال رومز کا مجموعہ ہے۔ زمینی سطح پر تین بہت بڑے بڑے ہال رومز ہیں جن میں سے ایک کو Main Convention Hall کا نام دیا گیا تھا، یہاں تمام اہم مقررین کو خطاب کرنا تھا۔ اس سے متصل ایک دوسرے بڑے ہال میں طعام وغیرہ کا بندوبست تھا۔ کھانے کے لئے کوپن خریدنے پڑتے تھے جو کہ استقبالیہ پر فروخت ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک تیسرے بڑے ہال میں بازار لگایا گیا تھا۔ مختلف انجمنوں، تنظیموں، اداروں اور گھرانوں نے سٹال لگائے ہوئے تھے۔ یہاں کتابوں، کیسٹوں، کپڑوں اور خوشبویات سے لے کر کھلونوں اور خورد و نوش کی اشیاء تک ہر چیز دستیاب تھی۔ یہ بازار کسی بڑے مینا بازار سے کم نہیں تھا۔ یہیں ایک سٹال SSQ (انجمن خدام القرآن) کا بھی تھا جس پر پورے چار دن جناب فہیم چوہدری صاحب نے ڈیوٹی دی۔ سینٹر کی بالائی منزل میں مختلف کمروں میں خواتین، نوجوان اور بچوں کے لئے خصوصی

پروگرام ترتیب دیئے گئے تھے۔ ان میں شرکاء کی تقسیم ان کی عمروں کے لحاظ سے تھی۔ بالکل چھوٹے بچے یعنی پانچ چھ سال کی عمر تک ایک کمرے میں، پھر بارہ برس تک کی عمر کے دوسرے کمرے میں اور ٹین ایجرز تیسرے کمرے میں۔ بچوں کے پروگراموں میں تذکیرو تانیث کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ایک کمرے میں خواتین کے خصوصی پروگرام تھے جس میں مختلف تعلیمی پروگراموں کے علاوہ فیشن شو بھی منعقد کیا گیا۔ منتظمین میں تقسیم کار بہت خوش اسلوبی سے کی گئی تھی۔ اکثر کارکن واکی ٹاکی سے مسلح تھے۔ یوں ان میں آپس میں رابطہ اور تعاون بہت عمدگی سے قائم تھا۔ چونکہ ہال بہت بڑا تھا اور دور بیٹھے سامع کو مقرر واضح نظر نہیں آسکتا تھا لہٰذا سٹیج کے دائیں اور بائیں جانب دو بڑے بڑے پروجیکٹر کے پردے نصب کئے گئے تھے جن پر ٹی وی کیمروں کی مدد سے مقرر اور سٹیج کا منظر بہت بڑا اور واضح پیش کیا جا رہا تھا۔

میرے حقیقی چچا اور سسر جناب اقتدار احمد صاحب (مدیر ندا) بھی اتفاقاً نیم سیاحتی اور نیم کاروباری دورے پر اپنے منجھلے صاحبزادے کے ساتھ پہلے سے امریکہ میں موجود تھے اس کنونشن میں شرکت کی غرض سے وہ ڈاکٹر خورشید ملک صاحب کے ہمراہ یہاں جمعہ کی رات کو پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ ہماری رفاقت کنونشن کے علاوہ قیامِ شکاگو کے دوران بھی رہی۔

کنونشن کا باقاعدہ آغاز نماز جمعہ سے قبل ISNA کے صدر شیخ احمد زکی حماد کے خطاب جمعہ سے ہوا۔ خطاب میں انہوں نے امتِ مسلمہ کے موجودہ مسائل، گلف کی صورت حال، شمالی امریکہ کے مسلمانوں کے کردار اور اس کنونشن کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ اس وقت تک حاضرین کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ نماز کے بعد پہلا سیشن تھا۔ آج کی اکثر تقاریر ISNA سے متعلق تھیں یا کنونشن کی تفصیلات پر مشتمل تھیں۔ والد صاحب کا خطاب ہفتہ کے دن شام عصر کے بعد کے مرکزی اجلاس (Main Session) میں ہوا۔ عنوان تھا "Living Islam as a Social Reality"۔ اپنے خیالات کو مربوط اور منضبط انداز میں پیش کرنے کے لئے انہوں نے مقالے کی صورت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن مقالے کی عبارت چونکہ کچھ ثقیل تھی اور لوگ ذہنًا مقالے کے لئے تیار نہیں تھے بلکہ خطاب سننے آئے تھے، پھر یہ کہ وقت کی محدودیت کے باعث مقالے کو کئی جگہ سے حذف بھی کرنا پڑا لہٰذا نہ تو والد صاحب اپنے خطاب سے مطمئن تھے اور نہ ہی سامعین کی طرف سے وہ تاثر ملا جو کہ عام طور پر ان کے خطابات کے بعد ملا کرتا

ہے۔ تاہم اس کمی کا ازالہ اس طرح ہو گیا کہ تین دن فجر کی امامت اور اس کے بعد مختصر درس کے لئے
وگرام آرگنائزرز نے والد صاحب کو دعوت دی۔ انہوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سورۃ
الحجرات کی آیات ۱۴ اور ۱۵ کا درس پہلے دو دن اور پہلی دو آیات کی تفسیر تیسرے دن بیان کی۔ فہم قرآن
ایہ اسلوب عربوں کے لئے بالکل نیا تھا۔ انہوں نے خاص طور پر بہت دلچسپی سے اس پروگرام میں
رکت کی۔

کنونشن کے دیگر اہم موضوعات میں چند یہ ہیں:

"Islamic Literature for Today and Tomorrow"

ں پر جناب یوسف طلال نے گفتگو کی'

"The Imapct of global change on Muslims"

ں پر جناب جمال بدوی اور جناب احمد زکی حملو نے اظہار خیال کیا'

"Islam-Misrepresented by Muslims"

ں موضوع پر جناب مزمل صدیقی اور جناب امتیاز احمد نے خطاب کیا'

"Sharing Islam through Social Action"

ں پر جناب سراج وہاج نے عمدہ گفتگو کی۔ اتوار کے روز رات ساڑھے نو سے گیارہ بجے کا سیشن بہت
چسپ تھا۔ موضوع تھا "Muslim World Conflicts"۔ کشمیر' افغانستان' فلسطین اور
یت کے مسئلے پر کئی مقررین نے جوشیلی تقریریں کیں۔ خاص کر کویت پر عراقی قبضے اور اس کے
د سعودی عرب سے تنازعہ کے بارے میں عربوں نے شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ لیکن صورت حال
س وقت دلچسپ ہو گئی جب ایک اردنی نوجوان نے کھڑے ہو کر بولنے کے لئے وقت مانگا۔ اجازت
لنے پر اس نے جو تقریر کی تو مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ اس نے پہلے تو کویتیوں اور عرب رئیسوں کے
ردار پر شدید تنقید کی۔ پھر نہایت جذباتی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آپ جو کویت پر عراق
کے حملے کا رونا رو رہے ہیں' کیا آپ کو احساس ہے کہ اس وقت ارض مقدس کس طرح امریکیوں
کے قدموں سے بے حرمت ہو رہی ہے! متحرک کلیساؤں اور سینیگا گز کی آمد سے آپ کب
تک مسلمانوں کو بے خبر رکھیں گے ...!! یہ نشست رات تقریباً ۱۲ بجے تک جاری رہی۔

۴ ستمبر کو صبح تقریباً نو بجے ڈاکٹر خورشید ملک صاحب کے ہمراہ بذریعہ کار شکاگو کے لئے روانہ ہوئے۔
تقریباً ۳۵۰ میل کا فاصلہ طے کر کے سوا چار بجے شکاگو کے مضافات میں ڈاکٹر ملک صاحب کی رہائش

گاہ پر پہنچے۔ یہاں شکاگو کے رفقاء کے ساتھ ایک میٹنگ سہ پہر تین بجے طے تھی لیکن ہمارے تاخیر سے پہنچنے کے باعث تقریباً ساڑھے چار شروع ہو سکی۔ رفقاء تین بجے سے انتظار میں بیٹھے تھے۔ یہ میٹنگ تقریباً ڈھائی گھنٹہ جاری رہی۔

اگلا ڈیڑھ دن شکاگو میں ہی بسر ہوا۔ رفقاء اور احباب کے ساتھ نشستوں کے علاوہ ایک عمومی نوعیت کا اجلاس ہوا جو کہ MCC میں ۵ ستمبر کو بعد نماز مغرب کھانے کے ساتھ منسلک تھا۔ اس پروگرام میں انڈین اور پاکستانی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ تقریر کا موضوع مسلمانوں کی پستی کے اسباب اور تجدید ایمان کی دعوت تھا۔ خطاب انگریزی میں ہوا۔ عشاء کے بعد سوال و جواب کا طویل سیشن ہوا جو رات تقریباً گیارہ بجے تک جاری رہا۔

۶ تاریخ کی سہ پہر دو بجے ہم اپنی اگلی منزل یعنی ڈیٹرائٹ پہنچے۔ یہ مشی گن اسٹیٹ کا شہر ہے اور شکاگو اور ٹورانٹو کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ یہاں کا وقت شکاگو کے وقت سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔ ایرپورٹ پر ڈاکٹر مظفّر اعوان موجود تھے۔ ذرا توقف کے بعد ڈاکٹر رفیع اللہ انصاری بھی جو کہ ڈیٹرائٹ کی تنظیم کے امیر ہیں پہنچ گئے۔ ان کے ہمراہ ہم ان کی رہائش گاہ پہنچے۔ یہیں ہمارا قیام طے تھا۔ مغرب کے بعد ڈیٹرائٹ کے رفقاءِ تنظیم ملاقات کی غرض سے پہنچ گئے۔ رات دیر تک ان کے ساتھ نشست رہی۔ زیادہ تر تنظیمی امور اور پاکستان کی سیاسی صورتحال بحث کا موضوع رہے۔ ڈیٹرائٹ میں ہمیں مزید اڑھائی دن قیام کرنا تھا۔ یہاں آمد کا اصل مقصد امریکہ اور کناڈا کی تنظیموں کا مشترک اجتماع کرنا تھا۔ چونکہ امریکہ میں ہمارے اکثر رفقاء شکاگو' ڈیٹرائٹ اور ٹورانٹو سے متعلق ہیں اس لئے ڈیٹرائٹ جو کہ شکاگو اور ٹورانٹو کے وسط میں واقع ہے' اس قسم کے اجتماع کے لئے موزوں ترین مقام تصور کیا جاتا ہے۔

تنظیم کا اجتماع دو دن بعد یعنی ۸ ستمبر کی شام سے شروع ہونا تھا۔ اس سے پہلے ڈیٹرائٹ کے رفقاء نے تین دعوتی قسم کے عمومی پروگرام رکھ لئے تھے۔ پہلا پروگرام خطاب جمعہ کا تھا جو کہ ٹرائے (Troy) کی جامع مسجد میں والد صاحب نے انگریزی زبان میں دیا۔ اور ایمان اور اسلام کے فرق کے حوالے سے ایمان کی حقیقت پر گفتگو کی۔ دوسرا خطاب بھی اسی دن اسی مسجد میں شام مغرب کے بعد تھا۔ اور اس میں خطاب جمعہ کے موضوع ہی کو آگے بڑھایا کہ حقیقی مومن کون ہیں؟ بعد ما سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ تیسرا خطاب عام ایک خواتین کے اجتماع سے تھا جو کہ ۸ تاریخ کو دوپہر دو بجے ہوا۔ یہ خطاب تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔

تنظیم ٹورانٹو کے اکثر رفقاء سات ستمبر کی رات ہی کو ڈاکٹر عبد الفتاح صاحب کی قیادت میں یہاں پہنچ گئے تھے۔ آٹھ کی صبح ان کے ساتھ خصوصی نشست ہوئی اور اس طرح مشترکہ اجتماع سے پہلے شکاگو، ڈیٹرائٹ اور ٹورانٹو کے رفقاء کے ساتھ الگ الگ ملاقاتوں کا ایک راؤنڈ مکمل ہو گیا۔ اصل میں یہ ساری ایکسر سائز اس لئے کی گئی کہ اس سال سے شمالی امریکہ کے نظم میں اور لائحہ عمل میں بعض تبدیلیاں لانی مقصود تھیں (اس کی تفصیل قارئین اسی شمارے میں شامل والد صاحب کے اُس خطاب کی تلخیص میں ملاحظہ کر سکتے ہیں جو اس موقع پر وہاں انہوں نے ارشاد فرمایا تھا) جس کے لئے مختلف علاقوں کے رفقاء کی رائے علیحدہ علیحدہ معلوم کرنا ضروری تھا۔

نماز عصر کے بعد رفقاء ڈاکٹر انصاری صاحب کی رہائش گاہ پر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد والد صاحب کا خطاب شروع ہوا۔ اس اجتماع میں تقریباً ۳۵ رفقاءِ تنظیم نے شرکت کی۔ رات تقریباً گیارہ بجے نشست برخاست ہوئی۔ اگلے دن یعنی ۹ ستمبر کو صبح ۹ بجے دوسری نشست کا آغاز ہوا۔ کل کے خطاب میں مختصر اضافے کے بعد اشوز (Issues) کو بحث کے لئے رفقاء کے سامنے رکھ دیا گیا۔ تقریباً تمام رفقاء نے بحث میں حصہ لیا۔ زیادہ تر بحث اگلے سال کے لئے شمالی امریکہ کی امارت، امانتوں کی شرح، تربیت گاہوں کے نظام اور تنظیم کی مرکزی مشاورت کے لئے یہاں سے رفقاء کی نمائندگی ایسے اہم معاملات پر ہوئی۔ دوپہر بارہ بجے تک اکثر معاملات کو فیصلہ تک پہنچا کر رفقاء تنظیم کا یہ اجتماعِ خصوصی اختتام پذیر ہوا۔

آج ہی شام ہمیں یہاں سے نیویارک کے لئے روانہ ہونا تھا۔ ڈاکٹر رفیع اللہ انصاری صاحب جن کے گھر پر یہ تمام نشستیں ہوئیں، ہمیں چھوڑنے ایئر پورٹ آئے۔ ٹی ڈبلیو اے کے جہاز پر یہاں کے تیز اور آسان مواصلاتی نظام کا ایک نیا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ ہر نشست کی پشت پر پیچھے بیٹھے ہوئے مسافر کے لئے ایک ٹیلی فون نصب تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک صاحب نے جیب سے اپنا کریڈٹ کارڈ نکال کر ایک جھری میں داخل کیا تو ریسیور ان کے ہاتھ میں آگیا اور نمبر ڈائل کر کے گفتگو شروع کر دی۔ اسی طرح کئی اور لوگوں نے بھی اپنے اپنے متعلقین سے جہاز میں بیٹھے بیٹھے حال احوال دریافت کر لئے۔

نیویارک کے ایئر پورٹ پر ڈاکٹر منظور شیخ صاحب موجود تھے جو انجمن خدام القرآن کے تاسیسی رکن اور انجمن کے موجودہ ناظم انتخابات جناب ملک بشیر صاحب کے داماد ہیں۔ یہاں آج کل فزیشن کا کورس کرنے کے بعد ریزیڈنسی میں شدید مصروف ہیں۔ انہوں نے ہمارے اس قیام نیویارک کے لئے

سوصی طور پر دو یوم کی چھٹی لے رکھی تھی۔ ان کے ساتھ ہم نیو جرسی اسٹیٹ کے ایک شہر ماؤنٹ
ہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ ماؤنٹ ہولی کا پروگرام جناب ذکی الدین صاحب نے باصرار رکھوالیا تھا۔
لد صاحب نے گمان کیا کہ یہ جگہ شاید جرسی سٹی میں کہیں ہوگی جو کہ نیو ورک کے ایرپورٹ سے
یب ہی ہے' لہٰذا حامی بھرلی۔ لیکن ڈاکٹر منظور صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ جگہ تو یہاں سے تقریباً ۴۰
ل ہے۔ کافی پریشانی ہوئی کیونکہ آج صبح کی طویل نشست کے بعد بغیر آرام کئے ہم وہاں سے چل
ے تھے اس وجہ سے پہلے ہی والد صاحب شدید تکان محسوس کر رہے تھے۔ اب یہ ۴۰ میل کا فاصلہ
ت گراں گزر رہا تھا۔ لیکن چونکہ وعدہ کیا ہوا تھا لہٰذا مجبوری تھی۔ رات تقریباً ساڑھے سات بجے
ہم مقصود پر پہنچے۔ یہاں پاکستانیوں کی بڑی تعداد جمع تھی۔ اس پورے دورے کی واحد اردو میں تقریر
یں ہوئی۔ رات جب دوبارہ ۴۰ میل کا سفر کر کے ڈاکٹر منظور صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے تو تھک کر
ر ہو چکے تھے۔

اگلے دن یعنی ۱۰ تاریخ کو صبح کا کچھ وقت فارغ تھا تو ڈاکٹر منظور صاحب کے ساتھ مجسّمۂ آزادی
یکھنے کا پروگرام بن گیا۔ جرسی سٹی کی طرف سے فیری میں سوار ہوئے۔ ایلس آئی لینڈ راستے میں پڑتا
۔ یہاں ان لوگوں کی یاد میں ایک میوزیم بنایا گیا ہے جو سب سے پہلے یورپ وغیرہ سے ہجرت کر کے
عظم امریکہ میں آباد ہونے کی غرض سے پہنچے تھے۔ یہاں دیواروں پر ان کے نام کندہ ہیں اور سامان
برو کو محفوظ کیا ہوا ہے۔ یہاں سے دوسری فیری میں بیٹھ کر لبرٹی آئی لینڈ پہنچے۔ یہاں عظیم الشان
مۂ آزادی نصب ہے۔ امریکیوں نے "آزادی" کو اپنا سب سے بڑا علامتی نعرہ بنایا ہے اور واقعی
اں کی فضا میں آزادی رچی بسی محسوس ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے مجسمہ آزادی ان کے لئے "معبود" کی
یثیت رکھتا ہے۔

نماز مغرب کے بعد فلشنگ میں ایک مسلم سنٹر میں خطاب تھا۔ اس چھوٹے سے مکان میں
نجائش سے زیادہ حاضرین جمع تھے۔ شرکاء میں غالب اکثریت اگرچہ پاکستانی اور انڈین مسلمانوں کی
ی لیکن چند عرب حاضرین کی وجہ سے انگریزی میں خطاب ہوا۔ یہ خطاب میرے اندازے کے
طابق پچھلی تمام تقریروں سے زیادہ جامع اور عمدہ تھا۔ خاص طور پر بعد میں سوال و جواب کا سیشن
ت مفید محسوس ہوا۔ تمام شرکاء اجتماع نے اس خطاب کی افادیت کو محسوس کیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر شمیم صدیقی صاحب کے ہمراہ ان کے گھر پہنچے۔ صدیقی صاحب اور
شیر علی بیگ صاحب جماعت اسلامی کے پرانے لوگوں میں سے ہیں لیکن اب جماعت کی پالیسی

ہر وسے کچھ غیر مطمئن ہو کر اپنے ذہن کے مطابق کام کو آگے بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ رات تک ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ جناب الطاف احمد صاحب بھی موجود تھے۔ نشست برخاست ہوئی الطاف صاحب کے ہمراہ ان کے گھر پہنچے۔ واپسی تک اب ہمیں یہیں قیام کرنا تھا۔

اگلے دن صبح ہی م۔ نسیم صاحب ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ کچھ دیر بعد حزب التحریر کے چند نوجوان بھی ملاقات کی غرض سے آ گئے۔ یہ ایک بہت حد تک صحیح فکر رکھنے والی عربوں کی زیر قیادت ایک تحریک ہے جس کے اثرات بہت سے غیر عرب نوجوانوں میں بھی پھیل رہے ہیں۔ آج کا دن یعنی ۱۱ ستمبر امریکہ میں ہمارا آخری دن تھا۔ الطاف احمد صاحب ہمیں الوداع کہنے ایرپورٹ پر آئے اور ہم سعودی ایر لائنز سے جدہ کے لئے عازم سفر ہوئے۔

۱۲ کی شام کو عصر کے وقت ہم جدہ ایرپورٹ پر موجود تھے۔ جناب یحییٰ منشی صاحب، اصغر حبیب صاحب اور فیض اللہ خان صاحب ایرپورٹ پر آئے ہوئے تھے۔ ہم سیدھے منشی صاحب کے گھر پہنچے جہاں ہمارا قیام طے تھا۔ ہمارے پاس ایک ہفتہ کا وزٹ ویزا تھا۔ عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ رفقاء تنظیم سے ملاقاتوں کا ارادہ تھا۔ رات کو جدہ کے رفقاء و احباب منشی صاحب کے گھر پر جمع ہو گئے۔ کافی طویل نشست رہی۔ اگلے دن صبح کا کچھ وقت جدہ کا ساحل "کورنش" دیکھنے میں گزرا۔ ساحل کو سجانے اور بنانے میں بے بہا پیسہ استعمال کیا گیا ہے۔ کچھ دیر تک تو ہم محظوظ ہوئے لیکن عجیب و غریب شکلوں کے Monuments کا ایک طویل سلسلہ دیکھ کر شدید کوفت کا احساس شروع ہو گیا۔ لہٰذا جلد ہی واپس رخ موڑ لیا۔

مغرب کے بعد افتخار احمد صاحب کے ساتھ ان کی کار میں عمرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ملک فیض اللہ صاحب بھی ہمراہ تھے۔ چونکہ میرا یہ پہلا عمرہ تھا اس لئے اس طرح احرام کی حالت میں تلبیہ کہتے ہوئے اللہ کے گھر کی طرف جانا بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ خوف، ندامت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کو تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔

رات کو بیت اللہ کے نزدیک ہی جناب فاروق الحسن چشتی صاحب کے گھر پر قیام کیا۔ فجر کی نماز بھی مسجد حرام میں ادا کی۔ بعد ازاں مقامات حج کی زیارت کے لئے نکل گئے۔ جمعہ کی نماز پڑھنے اور خطبہ سننے کی سعادت مسجد حرام میں حاصل کی۔ جمعہ کے بعد طائف کے لئے روانہ ہوئے۔ جناب چشتی صاحب کی گاڑی میں ان کے ڈرائیور ہمیں طائف چھوڑ گئے۔ یہاں آمد کا مقصد طائف دیکھنے کے علاوہ جناب ڈاکٹر شجاعت یمنی سے ملاقات بھی تھا۔ رات انہی کے ہاں قیام کیا۔ صبح ڈاکٹر یمنی صاحب خود

ں چھوڑنے مکہ آئے۔ جاتے ہوئے ہم نے "طریق السّبیل" اختیار کیا تھا جو کہ بالکل سیدھا اور
سولی سی متواتر چڑھائی والا راستہ ہے۔ واپسی پر ڈاکٹر صاحب ہمیں "طریق الجبل" سے لائے۔ یہ
ی کے راستے کی طرح خم دار ہے اور کافی اترائی والا ہے۔ جدہ سے افتخار احمد صاحب ہمیں لینے مکہ
ئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ واپس جدہ پہنچے۔

جدہ کے رفقاء تنظیم نے آج مغرب کے بعد ایک عمومی نشست کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ملک فیض
د صاحب کے گھر پر مختصر خطاب ہوا۔ بعد ازاں ایک تفصیلی نشست سوال و جواب کی ہوئی۔
ھانے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ جدہ میں عمومی نوعیت کا یہ واحد اجتماع تھا۔ اگلے دن یعنی ۱۶ ستمبر کو والد
احب علی الصبح بذریعہ ہوائی جہاز مدینہ کے لئے روانہ ہوگئے جبکہ میں اور ملک فیض اللہ صاحب
ر پر عازم مدینہ ہوئے۔ ۳۲۰ میل کا راستہ تقریباً ساڑھے چار گھنٹہ میں طے ہوا۔ والد صاحب کے
اتھ پہلے سے طے ہو گیا تھا کہ مسجد نبوی سے قریب فندق المؤذن میں ملاقات ہوگی۔ انہوں نے
رے پہنچنے سے پہلے ہی ایک کمرہ ہوٹل میں بک کروا رکھا تھا۔ نہا دھو کر مسجد نبوی روانہ ہوئے۔
ج کل مسجد کی توسیع کا کام بہت سرعت سے جاری ہے۔ دن رات کام ہو رہا ہے۔ مسجد کو اس قدر
یع کیا جا رہا ہے کہ پرانی مسجد تک پہنچنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ ظہر کی نماز تک مسجد میں
ضری رہی۔ روضہ پر حاضری بھی نصیب ہوئی اور ریاض الجنۃ میں نماز پڑھنے کا شرف بھی حاصل
ا۔ یقیناً یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

ظہر کے بعد والد صاحب کی ریاض روانگی تھی۔ ایرپورٹ پر انہیں الوداع کیا۔ ریاض میں تنظیم
ی شاخ کافی فعّال ہے۔ وہاں عمومی نشستوں کے علاوہ تنظیم کے اجتماع بھی ہوئے لیکن مجھے چونکہ
اں مدینے میں رات گزار کر واپس جدہ اور جدہ سے براہ راست لاہور چلے جانا تھا اس لئے ریاض اور
اسعہ کے پروگراموں میں شریک نہ ہو سکا۔ میں ۱۸ کی صبح ۳ بجے لاہور پہنچا جبکہ والد صاحب اپنا
یاض کا دورہ مکمل کر کے ۲۰ کی صبح ۷ بجے پہنچے۔ یوں ہمارا یہ بیرونی سفر جو شروع بھی علیحدہ علیحدہ ہوا
ب اتفاق ہے کہ ختم بھی علیحدہ علیحدہ ہوا۔ ☐☐

رفتارِ کار

(۱)

کراچی میں رفقاءِ تنظیم کا ایک روزہ دعوتی پروگرام

یکسانیت زندگی کے کسی شعبے میں ہو اکتاہٹ کا باعث بنتی ہے۔ اس اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے مختلف قسم کے پروگرام ترتیب دینے پڑتے ہیں۔ شاید اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے تنظیم اسلامی کراچی کے امیر محترم نسیم الدین صاحب نے یوم دفاع پاکستان کے موقع پر ہونے والی تعطیل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک تربیتی / تفریحی پروگرام کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔

۶ر ستمبر۱۹۹۰ء کی صبح ساڑھے آٹھ بجے رفقاء و احباب جن کی کل تعداد ۶۸ تھی اور جن میں چند مستورات اور بچے بھی شامل تھے 'مسجد جامع الصفا شریف آباد میں جمع ہوئے۔ جہاں سے پندرہ گاڑیوں پر مشتمل قافلہ کراچی سے ۴۵ کلومیٹر دور واقع حرمین کمپلکس کے لئے صبح پونے نو بجے روانہ ہوا جو سپرہائی وے پر دنبہ گوٹھ نامی مقام میں واقع ہے۔

اس سے پہلے کہ پروگرام کی تفصیلات کا تذکرہ کیا جائے بہتر ہو گا کہ حرمین کمپلکس میں واقع جامعہ حرمین الخیریہ کا مختصر تعارف قارئین سے کرا دیا جائے۔ یہ بنیادی طور پر حفظ قرآن کا مدرسہ ہے۔ نوے ایکڑ کی قطع اراضی پر محیط اس مدرسے میں چیکو کے باغات بھی شامل ہیں۔ اس مدرسہ میں کل ۱۲۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں جن میں تقریباً نصف غیر ملکی طلبہ ہیں 'افغانی طلبہ کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔

پروگرام کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ جناب واحد علی رضوی نے تلاوت کی اور ترجمہ پیش کیا۔ اس کے بعد مدرسہ کے محترم استاد قاری سیف اللہ صاحب نے صبح پونے دس تا سوا گیارہ تجوید کے پروگرام میں حروف مدہ 'لین اور غنّہ پر تفصیلی گفتگو کی۔ مزید بر آں قرآن کریم کی تلاوت 'اس کے فہم اور اس پر عمل کے حوالے سے بھی مفید گفتگو فرمائی۔ سوا گیارہ تا ساڑھے گیارہ اُن دو حضرات نے اپنا مکمل تعارف کرایا جو حال ہی میں قرآن اکیڈمی لاہور سے ابتدائی دینی تعلیم کا ایک سالہ کورس مکمل کر کے آئے ہیں۔ نوجوان ساتھی عبید اللہ صاحب اور بزرگ ساتھی احمد علی خان نے کورس کی تکمیل کے دوران اپنے تاثرات سے بھی شرکاء کو آگاہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اگرچہ ایک سال کا عرصہ بہت ناکافی ہے لیکن اس عرصہ میں انہیں عربی گرامر کے بنیادی اصولوں سے روشناس کرایا گیا اور عربی

زبان کی اتنی تعلیم دے دی گئی کہ اب وہ بغیر ترجمہ کی مدد کے قرآنی آیات کا مطلب سمجھ لینے پر بہت حد تک قادر ہیں۔ اس کورس کی تکمیل کرنے والے کراچی کے تیسرے نوجوان ساتھی جناب انصار احمد سے تعارف حاصل نہ ہو سکا کیونکہ وہ ان دنوں کراچی سے باہر ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام تعلیم و تعلّم قرآن کریم کا یہ سلسلہ ہمارے وطن میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک اہم سنگ میل ثابت ہو گا۔ ان شاء اللہ۔

اس کے بعد نصف گھنٹے کا وقفہ ہوا جس کے دوران رفقاء نے ایک دوسرے سے ملاقاتیں کیں اور تعارف حاصل کیا۔ دوپہر ساڑھے گیارہ بجے سے ایک بجے تک تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت 'نصب العین' انقلاب نبوی کے چھ مراحل اور تنظیم اسلامی کے شائع کردہ اسلام کے انقلابی منشور کے حوالے سے تنظیمی لٹریچر سے اقتباسات پڑھ کر سنائے گئے۔ بعد ازاں رفقاء کو ایک سوالنامہ دیا گیا تاکہ مذکورہ بالا اقتباسات کے مطالعے کی روشنی میں جواب دے سکیں۔ اگرچہ پرچہ سخت نہ تھا لیکن جس طور سے پرچہ کی چیکنگ کی گئی اس میں سختی کا عنصر غالب تھا۔ سوالوں کے جواب میں لٹریچر میں درج شدہ الفاظ کی شرط عائد کر دی گئی تھی۔ جواب لٹریچر کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں ایک منفی نمبر شمار کیا جاتا تھا۔ نتیجتہً صرف ۱۵ رفقاء نے Plus میں نمبر حاصل کئے بقیہ تمام رفقاء کا نتیجہ Minus میں رہا۔ اگر رفقاء کو چیکنگ کے اس طریق کار سے تفصیلاً آگاہ کر دیا جاتا اور تیاری کا مناسب وقت دیا جاتا تو نتیجہ یقیناً بہتر ہوتا۔

ایک بجکر پندرہ منٹ پر ظہر کی نماز ادا کی گئی اور ۲ بجے ہم کھانے کے لئے جمع ہوئے۔ اگرچہ کھانے کا انتظام پانچ چھ رفقاء نے خود رضاکارانہ طور پر کیا تھا لیکن اس میں خاصا تکلف برتا گیا تھا۔

ڈھائی تا ساڑھے تین آرام کا وقفہ تھا جس میں رفقاء کی خاصی تعداد نے قیلولہ کیا۔ کچھ رفقاء کو پرچوں کی چیکنگ پر لگایا گیا اور کچھ رفقاء باغ کی سیر کے لئے نکل گئے۔

پونے چار تا ساڑھے چار بجے شام امیر تنظیم کراچی محترم نسیم الدین صاحب نے گفتگو کی اور رفقاء کو نظم کی اہمیت اور خصوصاً وقت کی پابندی کے سلسلے میں اُن کی بعض کوتاہیوں کی طرف متوجہ کیا۔ مثلاً دوپہر کے آرام کے بعد رفقاء کو ساڑھے تین بجے جمع ہونا تھا لیکن رفقاء کے بروقت تیار نہ ہونے کے باعث پروگرام پندرہ منٹ تاخیر سے شروع ہو سکا تھا۔ اسی طرح اگرچہ یہ طے کر دیا گیا تھا کہ کھانے کے انتظام کے لئے چند مخصوص رفقاء کی ذمہ داری ہو گی لیکن چند دوسرے رفقاء بھی اپنے ساتھ کھانا لے آئے تھے۔ گو کہ یہ اُن کی طرف سے خلوص کا مظاہرہ تھا لیکن حقیقتہً یہ نظم کے تقاضے کے خلاف تھا جس پر نسیم الدین صاحب نے بروقت گرفت فرمائی۔

سوا چار بجے نماز عصر ادا کی گئی اور اس کے بعد پانچ بجے تک چائے کا وقفہ کیا گیا۔ پانچ بجے سے سوا

پانچ بجے تک امیر تنظیم کراچی نے دن بھر کے پروگرام کا مختصر جائزہ لیا۔ دوران گفتگو ہفتہ واری رپورٹ کے بارے میں اُن مبتدی و ملتزم رفقاء کو یاددہانی کرائی گئی جنہیں اب تک رپورٹ سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا تھا۔ آئندہ کے پروگراموں مثلاً توسیعی مشاورت کے پروگرام، مبتدی اور ملتزم رفقاء کی مشترکہ تربیت گاہ، ۶ ستمبر کے شرمین ہال کے پروگرام کے بارے میں رفقاء کو تفصیلی اطلاعات دی گئیں۔ شرمین ہال کے پروگرام کے حوالے سے اس میں رفقاء کی خواتین کی شرکت پر زور دیا گیا تاکہ خواتین کے نظم کی تشکیل کے معاملے میں پیش رفت ہو سکے۔ اسی طرح اعانت کی ادائیگی کے سلسلے میں رفقاء کی عدم دلچسپی کی طرف امیر محترم کی اُس گفتگو کے حوالے سے توجہ دلائی گئی جو انہوں نے اپنے گزشتہ دورۂ کراچی کے دوران رفقاء سے کی تھی۔ اس کے بعد ان رفقاء کو انعامات دیئے گئے جنہوں نے کوئز (Quiz) پروگرام میں اول، دوئم اور سوئم پوزیشن حاصل کی۔ اول انعام عبد الرحمٰن ہنگورہ صاحب نے، دوم انعام اصغر علی مجاہد اور شاہین نیازی صاحبان نے اور سوم انعام عارف سبحان صاحب نے حاصل کیا۔

آخر میں مدرسہ کی فٹ بال ٹیم کے ساتھ رفقاء کی ٹیم کا مقابلہ ہوا۔ اسلم علوی صاحب کی کپتانی میں ۱۵ رفقاء پر مشتمل ٹیم بنائی گئی۔ ریفری کے فرائض عبد الواحد عاصم صاحب نے انجام دیئے۔ مدرسہ کی ٹیم صفر کے مقابلے میں دو گول سے جیت گئی۔ اس پروگرام کے انعقاد کے سلسلے میں مدرسہ والوں سے رابطہ میں دو حضرات نے اہم رول ادا کیا۔ تنظیم کی طرف سے جناب عبد الواحد عاصم صاحب نے اور مدرسہ کی طرف سے ان کے بڑے بھائی صاحب نے رابطہ کے فرائض انجام دیئے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔ اظہار تشکر کے طور پر تنظیم اسلامی کی طرف سے مدرسہ کے استاد محترم سیف اللہ صاحب کو چائے کے وقفے کے دوران ایک تحفہ بھی دیا گیا جو انہوں نے شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے چند فارسی اشعار پڑھتے ہوئے قبول فرمایا۔

اس پروگرام کے دوران نہ صرف یہ کہ رفقاء کو کئی مفید باتیں معلوم ہوئیں بلکہ انہیں ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع بھی ملا۔ سچی بات یہ ہے کہ رفقاء کرام کو "رحماء بینھم" کی مثال بنانے میں اس قسم کے پروگرام ناگزیر ہیں۔

(مرتب : محمّد سمیع)

وكلهم آتيه يوم القيامة فردا

(۲)

پشاور میں تنظیمِ اسلامی کے زیرِ اہتمام
جلسہ عام کا انعقاد

اللہ تعالیٰ کالاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے تنظیم اسلامی پشاور کے رفقاء کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ انہوں نے اسکے دین متین کی انقلابی دعوت کے سلسلہ میں ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ہزاروں درود کہ ختم نبوت کے صدقہ میں دعوت و اقامتِ دین کا یہ عظیم کام امتِ مسلمہ کو عطا ہوا۔ ہم قلب کی انتہائی گہرائی سے باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اس عظیم کام کے لئے ہم جیسے نااہل لوگوں کو چن لیا اور ہمیں یہ ہمت عطا فرمائی کہ اس کے دین کی اقامت کے لئے اس فساد کے دور میں آواز لگائیں۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ ! اب جلسۂ عام کی روداد ملاحظہ ہو:

اس سال تنظیم اسلامی پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر امیر محترم نے اپنے اختتامی خطاب میں سالِ رواں کو پیش قدمی کا سال (Launching Year) قرار دیا تھا اور ارشاد فرمایا تھا کہ اب ہمیں تنظیم کے تحت مساجد اور ہالوں کے بجائے کھلے مقامات پر جلسہ ہائے عام کا انعقاد کرنا چاہئے۔ اس ارشاد کی تعمیل میں مرکزی مشاورت میں پورے پاکستان کے لئے جلسوں کے پروگرام طے کئے گئے۔ اس سلسلہ میں پشاور میں اواخرِ ستمبر میں جلسۂ عام منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ اواخرِ اگست میں ناظمِ تنظیم اسلامی حلقہ سرحد میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد نے پشاور تنظیم کے رفقا اور مرکز کے مشورہ سے اس جلسہ عام کے لئے ستمبر کی ۲۵ تاریخ مقرر کی۔ جلسہ عام چوک فوارہ پشاور صدر میں ہونا طے پایا۔ اور اس میں ہونے والے امیرِ محترم کے خطابِ عام پر سوال و جواب کی نشست کے لئے ہشت نگری کی جامع مسجد میں ایک اجتماع کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

جلسہ عام اور دیگر انتظامات کے لئے مختلف موقعوں پر رفقاء کے اجتماعات ہوئے' رفقا کی مختلف ڈیوٹیاں لگائی گئیں۔ صوبہ بھر سے منفرد رفقا کی متوقع آمد کے پیش نظر قیام و طعام کا

سوصی بندوبست کیا گیا۔ حالیہ دعوتی دورۂ سوات (ملاحظہ ہو رفتارِ کار میثاق ستمبر ۹۸ء) کے
نجہ میں بھی توقع تھی کہ باہر سے مہمان کافی تعداد میں آئیں گے۔ قیام کے لئے بھائی وارث
ان نے اپنے نئے تعمیر شدہ مکان میں تمام انتظام کیا۔ جلسہ عام کے لئے پوسٹر تیار کیا گیا۔
دبہ سرحد میں رفقا اور دیگر احباب بشمول قارئینِ میثاق کو علاحدہ علاحدہ مضمون پر مشتمل
طوط ارسال کئے گئے۔ ۲۰ستمبر (یعنی جمعرات اور جمعہ کی درمیانی رات) کو اشتہارات لگانے
ی مہم پورے زور و شور سے شروع کی گئی' جبکہ اس سے قبل بھی رفقاء نے اپنے طور پر
شتہارات لگانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اشتہارات لگانے کا یہ سلسلہ جلسہ عام سے ایک
ات قبل تک جاری رہا۔ ہینڈ بلز کی تقسیم بھی تشہیری مہم کا اہم حصہ تھا۔ علماء اور خطباء کے نام
صوصی طور پر تیار کئے گئے خطوط ذاتی ملاقاتوں کے ذریعے ان کی خدمت میں پیش کئے گئے
ور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اجتماعاتِ جمعہ میں جلسہ عام کے اعلان کریں۔ اخبارات میں
جلسہ عام کی اطلاعات کی اشاعت کے لئے مقامی اخبارات سے رابطہ قائم کیا گیا۔ چنانچہ اس کی
طلاع وقفہ وقفہ سے اخبارات میں شائع ہوتی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ انتظامات کی پیش
رفت اور دیگر امور کا جائزہ بھی لیا جاتا رہا۔

۲۴ستمبر بروز پیر صبح ۱۰ بجے امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پشاور ائرپورٹ پر تشریف
لائے۔ امیر محترم کے استقبال کے لئے ناظم حلقہ سرحد میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد صاحب اور امیر
تنظیم اسلامی پشاور جناب اشفاق احمد میر صاحب موجود تھے۔ امیرِ محترم نے جلسۂ عام کے
انتظامات کے متعلق استفسار کیا اور طے شدہ پروگرام اور انتظامات کی تکمیل پر اطمینان کا اظہار
کیا۔ اسی روز عصر سے قبل ہی مرکز سے ڈاکٹر عبدالخالق (ناظمِ اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان)
چودھری غلام محمد صاحب' میاں محمد نعیم صاحب' رحمت اللہ بٹر صاحب اور جاوید اختر
صاحب تشریف لے آئے۔

۲۴ستمبر ہی کو پشاور یونیورسٹی ٹیچرز ایسوسی ایشن (PUTA) کی خصوصی دعوت پر امیرِ
محترم کا ایک خطاب شیرپاؤ ہال میں بعد نمازِ عصر طے کیا گیا تھا۔ اس خطاب کے لئے جب
جناب ڈاکٹر صاحب شیرپاؤ ہال میں تشریف لائے تو PUTA کے صدر پروفیسر ناصر علی
صاحب نے ایسوسی ایشن کے دیگر عہدیداران کے ہمراہ ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا' جبکہ
PUTA کی جانب سے محترم قبلہ ایاز صاحب جو شعبہ اسلامیات میں پروفیسر ہیں، محترم

ڈاکٹر صاحب کو لینے کے لئے خود تشریف لے گئے تھے۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ تلاوتِ کلام پاک کی سعادت شعبہ صحافت کے پروفیسر نعیم گل صاحب نے حاصل کی۔ محترم قبلہ پروفیسر ایاز صاحب نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے ہوئے امیرِ محترم کا مختصر اور جامع تعارف کرایا اور پھر امیر محترم کو ٹیچرز ایسوسی ایشن کی جانب سے منتخب عنوان "Whither Pakistan" پر اظہارِ خیال کے لئے دعوت دی۔ امیر محترم نے یہ بات واضح فرمائی کہ پاکستان کا قیام صرف اور صرف اسلام کے نام پر عمل میں آیا اور اب اس کی بقاء بھی صرف اور صرف اسلام سے ہی وابستہ ہے۔ امیر محترم کا یہ خطاب نماز مغرب تک جاری رہا۔ نماز مغرب کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی' جس کے اختتام پر محترم قبلہ ایاز صاحب نے PUTA کے صدر اور تمام ارکان کی جانب سے محترم ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور سامعین کو خراج تحسین پیش کیا کہ انہوں نے نہایت انہماک اور دلچسپی سے امیر محترم کا خطاب سنا۔ تقریب کے اختتام پر مہمانوں کی مشروبات سے تواضع کی گئی۔

بعد نماز عشاء امیر محترم تنظیم اسلامی پشاور کے جواں سال رفیق شکیل احمد جن کا چند روز پیشتر اچانک انتقال ہو گیا تھا' کے گھر واقع دانش آباد گئے اور مرحوم کے سوگوار اہلِ خانہ سے تعزیت کی۔

منگل ۵ ستمبر کا سارا دن تنظیم اسلامی پشاور کے دفتر واقع خیبر بازار میں رفقاء اور مہمانوں کی آمد کی وجہ سے گہما گہمی رہی۔ رفقاء جلسہ عام سے متعلق مختلف امور کو آخری شکل دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ مہمانوں کا استقبال اور ان کی تواضع بھی کر رہے تھے۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ مغرب تک جاری رہا۔ جلسہ کے انتظامات کے پیش نظر اکثر رفقا نمازِ عصر کے بعد ہی چوک فوارہ پہنچ گئے تھے اور اپنی اپنی ذمہ داریوں کو خوبی سے انجام دینے کے لئے جوش و خروش سے کام کر رہے تھے۔ ذمہ دار حضرات ساتھی رفقاء کو ہدایات بھی دے رہے تھے۔ ٹریفک کی آمد و رفت اور رفقا کی خاموش سرگرمی نے ایک عجیب پر کیف سماں پیدا کر دیا تھا۔ نماز مغرب کے بعد تمام انتظامات کو حتمی شکل دے دی گئی۔ نماز عشاء سے فارغ ہوتے ہی سامعین جوق در جوق جلسہ گاہ پہنچ کر اپنی اپنی پسند کے مطابق کرسیوں پر بیٹھنا شروع ہو گئے۔ جلسہ کے باقاعدہ آغاز سے قبل ہی تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں۔ جلسہ گاہ

ے تین اطراف میں سٹال لگائے گئے تھے جو کہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رہے تھے۔
جلسہ عام کا آغاز تلاوت قرآن حکیم کے ساتھ ہوا۔ میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد صاحب نے تتاحی کلمات کے ساتھ ملک کے مشہور قاری عبد الحلیم صاحب کو تلاوت کلام پاک کی عوت دی۔ تلاوت کے بعد میجر فتح محمد صاحب نے تنظیم اسلامی کا مختصراً تعارف کرایا اور پھر سرہ شہر کے نقیب وارث خان صاحب کو دعوت دی کہ وہ سامعین کے سامنے فرائضِ دینی کے حوالے سے تنظیم اسلامی کی دعوت پیش کریں۔ تقریباً ۱۵ منٹ کے خطاب میں جناب ارث خان صاحب نے نہایت عمدگی کے ساتھ تنظیم اسلامی کی دعوت کا خلاصہ حاضرین کے سامنے رکھ دیا۔ دریں اثناء امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جلسہ گاہ میں تشریف لا چکے تھے۔ ھائی وارث خان نے اپنے خطاب کے اختتام پر ڈاکٹر عبد الخالق صاحب، میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد صاحب اور اشفاق احمد میر صاحب کو سٹیج پر رونق افروز ہونے کی دعوت دی۔ اس کے بعد امیر محترم کو خطابِ عام کی دعوت دی گئی۔

امیر محترم نے خطبہ مسنونہ کے بعد اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہر پاکستانی مسلمان کو قیامِ پاکستان کے پس منظر کے حوالے سے ملک کے موجودہ حالات کا جائزہ لینا چاہئے۔ انہوں نے قیام پاکستان کے مقصد پر روشنی ڈالی اور ملک کی چوالیس سالہ تاریخ کے حوالے سے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ مسلمانانِ پاکستان بحیثیتِ قوم اپنے اُس عہد کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہیں جو کہ پاکستان کے قیام کے لئے وجہِ جواز بنا تھا۔ امیر محترم نے واضح طور پر دلائل سے یہ بات ذہن نشین کرائی کہ اب ہم کو اسلام کا وہ نعرہ کام نہیں دے گا جو کہ قیام پاکستان کے وقت لگایا گیا تھا۔ آج وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ اہلِ پاکستان انفرادی سطح سے لے کر اجتماعی سطح تک اسلام پر مکمل طور پر کاربند ہوں۔ اس کے علاوہ پاکستان کی بقا اور اس کے استحکام کی کوئی بنیاد ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو اسلام کی دعوت دیں اور اپنے ملک میں اسلام کو بطورِ نظام نافذ کریں۔ انہوں نے کہا کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں، بلکہ ایک مکمل نظامِ عدلِ اجتماعی ہے۔ انہوں نے اس نظامِ عدلِ اجتماعی کی وہ خوبیاں بیان کیں جن سے عہدِ خلافتِ راشدہ میں پوری دنیا فیض یاب ہوئی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے غلبۂ اسلام کے لئے انقلابی طریقِ کار کو واحد ذریعہ قرار دیا اور انقلابِ اسلامی برپا کرنے کے لئے

سرف اور صرف طریقِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کو مشعلِ راہ بنانے پر زور دیا۔ اور وسرے تمام طریقوں کو چھوڑ کر امتِ محمدیہ کو اسی راستے پر گامزن ہونے کی استدعا کی۔

محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ڈیڑھ گھنٹہ سے متجاوز تھا۔ جلسہ گاہ میں سامعین کی ایک اصی بڑی تعداد کھڑے ہو کر خطاب سننے پر مجبور تھی کیونکہ کرسیوں کے علاوہ فرشی نشست اوسیع انتظام بھی ناکافی ثابت ہو رہا تھا۔ سامعین نے یہ خطاب نہایت اطمینان سے سنا۔ ںاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جلسوں کے موجودہ چلن کے برعکس اس جلسہ پر نہ تو وئی زرِ کثیر خرچ کیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی خصوصی تفریحی لالچ دے کر لوگوں کو بسوں میں لایا گیا تھا۔ جلسے میں شریک تمام افراد اپنی مرضی اور خوشی سے امیر محترم کے خطاب کو سننے آئے تھے۔ ج کل کے جلسوں کے معیار کے اعتبار سے اگرچہ یہ ایک چھوٹا جلسہ تھا مگر تنظیم اسلامی اور کی توقعات سے کہیں بڑھ کر لوگوں نے اس میں شرکت کی۔ اس پر ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا رتے ہیں۔ جلسہ کا اختتام امیرِ محترم کی پرسوز دعا کے ساتھ ہوا۔ جلسہ کے اختتام پر شرکائے سہ کی سہولت کے لئے ٹرانسپورٹ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ خاص طور پر یونیورسٹی کے طلباء ر شہر کے مضافاتی علاقوں سے آنے والے حضرات کے لئے الگ الگ بسیں فراہم کی گئی یں۔

اس جلسہ میں شرکت کے لئے صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں مثلاً سوات' بونیر' نوشہرہ' دِان' کوہاٹ' چارسدہ' چترال' ایبٹ آباد' باجوڑ' بٹ خیلہ' صالح آباد اور ڈیرہ اسماعیل خان سے یا ۲۱ رفقا اور ۳۰ کے لگ بھگ دیگر احباب و قارئینِ میثاق تشریف لائے۔ راولپنڈی و لام آباد سے ۱۵ رفقا غلام مرتضیٰ اعوان صاحب کی سرکردگی میں تشریف لائے۔ اکثر مہمان تامِ جلسہ پر اپنے اپنے شہروں کو تشریف لے گئے مگر پھر بھی پشاور کی تنظیم کو باہر سے آنے لے ۲۰۔۲۵ مہمانوں کے شرفِ میزبانی کی سعادت حاصل ہوئی۔

۲۸ ستمبر کو بعد نمازِ فجر امیر محترم مہمانوں کی اقامت گاہ پر تشریف لائے اور طے شدہ گرام کے مطابق بیرونی رفقاء و احباب اور پشاور کے رفقاء سے ملاقات کی۔ سوال و جواب کی مر نشست کے بعد پانچ احباب نے امیر تنظیم اسلامی کے ہاتھ پر سمع و طاعت فی المعروف کی ت کی۔ ناشتہ کے بعد یہ نشست برخاست ہوئی۔ یونیورسٹی کے طلباء نے امیر محترم سے

ملاحدہ وقت مانگا' چنانچہ طلباء کے ساتھ سوال و جواب کی نشست نمازِ عشاء کے بعد طے پائی۔

نماز مغرب کے وقت امیر محترم میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد صاحب اور اشفاق احمد میر صاحب کی معیّت میں جامع مسجد ہشت نگری تشریف لائے۔ مسجد پہلے ہی سے نمازیوں سے بھری ہوئی تھی اور نماز مغرب کے بعد سے لے کر نمازِ عشاء تک مسجد میں لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا' جس کی وجہ سے مسجد کے برآمدے اور صحن میں نشست کی کوئی جگہ مشکل سے ہی باقی رہ گئی تھی اور اب لوگ مسجد کی دیواروں پر بیٹھنے لگے تھے۔ نماز مغرب کے بعد مولانا فضل حق صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں پشتو میں بات شروع کی اور فرمایا کہ میں ڈاکٹر اسرار احمد کو مہمان تصور نہیں کرتا کیونکہ یہ مسجد ان کے مشن کے لئے ہر وقت حاضر ہے اور ڈاکٹر صاحب کی آمد پر اپنی دلی خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد سوال و جواب کی نشست کا آغاز ہوا جو کہ عشا کی نماز سے ۵ منٹ قبل تک جاری رہی۔ یہ ایک بھرپور نشست تھی جس میں لوگوں نے بڑی دلچسپی سے سوالات پوچھے۔ اکثر سوالات تنظیم اسلامی اور ملکی حالات کے متعلق تھے۔ نمازِ عشاء کے بعد امیر محترم جناب حاجی الطاف صاحب کے ہاں تشریف لے گئے، جہاں پر ایک پر تکلف دعوتِ طعام کا اہتمام تھا۔ بعد ازاں امیر محترم جناب اشفاق احمد میر صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے جہاں طلبا ان کے منتظر تھے۔ ان کے ساتھ سوال و جواب اور تعارف کی نشست قریباً ۴۵ منٹ جاری رہی جس کے بعد ۵/۶ طلباء نے سمع و طاعت فی المعروف کی بیعت کی۔ یہ نشست امیر محترم کے حالیہ دورۂ پشاور کی آخری اجتماعی نشست تھی۔ پشاور کا جلسۂ عام اور رفقاء و احباب کے یہ اجتماع رفقاء کے خلوص 'اَن تھک محنت اور لگن' ذمہ دار حضرات کے تن دہی سے اپنے فرائض کی انجام دہی 'اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایات اور نصرت سے ہی ممکن ہوئے۔ آخر میں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ تمام امور حسن و خوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ اللہ تعالیٰ مستقبل میں بھی ہم کو اس سے بڑھ کر دعوت و اقامتِ دین کی جدوجہد کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

مندرجہ بالا رُوداد دو خصوصی ملاقاتوں کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ امیر محترم نے دارالعلوم سرحد میں جا کر جمعیت علماء اسلام کے مرکزی نائب امیر مولانا ایوب جان بنوری صاحب سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں مولانا محمد امیر صاحب بجلی گھر' دارالعلوم سرحد کے

مفتی شہاب الدین صاحب اور مولانا ایوب بنوری کے صاحب زادے خالد بنوری صاحب بھی شریک رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ملکی حالات اور دینی جدوجہد پر تبادلہ خیال کیا۔ یہ ملاقات تقریباً ۳۵ منٹ تک رہی۔

اس کے علاوہ اسلامک سنٹر کے جوان سال مدرّس معراج الاسلام ضیاء صاحب نے خصوصی طور پر ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے وقت لیا۔ معراج الاسلام ضیاء صاحب نے عربی اور اسلامیات میں ایم اے کرنے کے علاوہ اسلامیات میں ڈاکٹریٹ کی ہے اور ان دنوں اسلامک سنٹر میں تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کے ساتھ امیر محترم کی ملاقات کی دو نشستیں ہوئیں۔ ایک ۲۵ ستمبر کی صبح اور دوسری ۲۶ ستمبر کی سہ پہر کو۔ امیر محترم نے معراج الاسلام صاحب کو قرآن اکیڈمی آنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی تفصیلی گفتگو اور ملاقات کے لئے کچھ وقت فارغ کر کے آنے کی استدعا کی جس کا معراج الاسلام صاحب نے ارادہ کرلیا۔

میں اس روداد کو اس دعا کے ساتھ اختتام پذیر کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس کام میں ہم سے ہونے والی تمام کوتاہیوں اور خطاؤں سے درگزر فرمائے اور ان تمام افراد کو اجرِ عظیم عطا فرمائے جنہوں نے اس دعوتی کام میں اپنے اوقات اور توانائیاں صرف کیں اور مالی انفاق کیا۔ آمین ثم آمین۔

مرسلہ: میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد۔ پشاور

امیر تنظیم اسلامی کے ۸ ستمبر کے خطاب جمعہ کا

پریس ریلیز

لاہور ۸ ستمبر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ انتخاب ملتوی کرکے
ؔشل لاء لگایا گیا تو قومی انتشار کی موجودہ کیفیت ایک دھماکے سے پھٹ پڑے گی اور سندھ میں اِس کا
ؔدید ردعمل ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ آئندہ چند ہفتوں کے دوران بھارت کی طرف سے آزاد کشمیر پر
ؔلے کا شدید خطرہ ہے اس لئے فوج کو کسی ایسی الجھن میں نہیں پھنسنا چاہئے جس سے اُس کی دفاعی
ؔلاحیت متاثر ہونے کا اندیشہ ہو۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس امکان کیطرف اشارہ کیا کہ ہلسنکی
ؔں امریکی صدر بش نے روسی صدر گورباچوف سے عراق کی حمایت نہ کرنے کے بدلے میں یہ سودا
ؔلے کرلیا ہے کہ آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات کو بھارت کے حوالے کرکے کشمیر کے جھگڑے کو ہمیشہ
ؔے لئے ختم کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان اور چین مل کر ہی دونوں بڑی طاقتوں کی اس سازش
ؔو ناکام بنا سکتے ہیں۔ تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ واخان کی پٹی پر روس کی چھاتہ بردار فوج کی آمد اسی
ؔازش کی کڑی ہے اور بھارت نے بھی سیاچن کے برف زاروں میں بے پناہ مالی وسائل اور فوجیوں کی
ؔانوں کی قربانی بلاوجہ نہیں دی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ روس اور امریکہ دونوں چین سے ناخوش
ؔیں کیونکہ اُس نے روس کے طرح نہ نظریاتی پسپائی اختیار کی ہے اور نہ انسانی حقوق کے میدان میں
ؔریکہ کی چودھراہٹ کو قبول کیا ہے۔ اس لئے دونوں سپر طاقتیں چین کو پاکستان سے کلٹ دینا چاہتی ہیں
۔ انہوں نے کہا کہ آزاد کشمیر پر بھارتی حملے کی صورت میں ہماری سیاسی اور فوجی قیادت کا کڑا امتحان
ؔہوگا کہ آیا وہ آزاد کشمیر کو قربان کرکے پاکستان کے وجود کو بچانے کی پالیسی اختیار کرتے ہیں یا ہرچہ باداباد کا
ؔنعرہ بلند کرکے بھارت پر اسی طرح جوابی حملہ کرتے ہیں جس طرح ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں بھارت نے
ؔبین الاقوامی سرحد پار کرکے پاکستان پر کیا تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پاکستان کو درپیش بیرونی خطرات کا مقابلہ فوج تنہا نہیں کر سکتی۔ اس کے
لئے ہر بالغ اور صحت مند شہری کو فوجی تربیت دے کر ایک عوامی فوج تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر
ؔعوامی فوج تیار کرنے کا فیصلہ ایک ایسی مستحکم حکومت ہی کر سکتی ہے جو عوام سے خوف زدہ نہ ہو بلکہ
ؔسے عوام پر اعتماد ہو۔ جامع القرآن ماڈل ٹاؤن میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر

اسرار احمد نے کہا کہ سابقہ اسمبلیوں کی بحالی کے بغیر الیکشن کسی صورت بھی ملتوی نہیں ہو جائیں ۔ انہوں نے کہا کہ اسمبلیاں عدالتی فیصلے کے نتیجے میں بھی بحال ہو سکتی ہیں اور دوسری صورت میں صدر غلام اسحٰق خان اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اپنا حکم واپس لے کر بھی اسمبلیوں بحال کر سکتے ہیں ۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے مزید کہا کہ ایسے کسی فیصلے کے مثبت نتائج حاصل کرنے بنیادی شرط یہ ہے کہ اسمبلیوں کی بحالی سے پہلے سیاست دان ایک قومی حکومت کی تشکیل پر رضا مند ہو جائیں تاکہ وفاق اور صوبوں کے درمیان محاذ آرائی کی صورت دوبارہ پیدا نہ ہو اور پوری قوم متحد ہو کر موجودہ عالمی بحران اور ملک کو درپیش بیرونی خطرے کا مقابلہ کر سکے ۔ انہوں نے کہا کہ بڑے پیمانے پر پوری قوم میں جہاد کا عزم بیدار کرنا اور ہر شہری کو دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجی تربیت دینا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے ۔

کاشف عبدا
ناظم نشر و اشاعت

بقیہ : تعلیم و تعلّمِ قرآن کی ضرورت و اہمیت

جسے کبھی ختم نہیں ہونا ہے ۔ تو آپ دنیا میں بھی ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹیے ' ا دوسرے کے کام آیئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھیے کہ خدمتِ خلق کا اعلیٰ تر تصور لوگوں کو ہدایت کے راستے کی طرف بلانا ہے ۔ یہ ان کی اصل ویلفیر ہے ۔ میں اپنی گزارشات پر اکتفا کر رہا ہوں اور آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے یہاں ہو کر اپنی یہ باتیں آپ کے گوش گزار کرنے کا موقع عنایت کیا ۔

اقول قولی ھٰذا و استغفر اللّٰہ لی و لکم و لسائر المسلمین و المسلمات

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد: ۳۹
شمارہ: ۱۱
ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ
نومبر ۱۹۹۰ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرتعاون -/۵۰

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

USA US $ 12/=
c/o Dr Khursid A Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove IL 60516
Tel 312 969 6755

c/o Mr. Rashid A Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel 313 977 8081

CANADA US $ 12/=
c/o Mr. Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel : 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/=
c/o Mr Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlessex EN 34 RP
Tel . 01 805 8732

MID EAST DR 25/=
c/o Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192 .

INDIA US $ 6/=
c/o Mr. Hyder M. D Ghauri
AKQI 4-1 444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel 42127

K S A SR 25/=
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/=
IFTIKHAR-UD DIN
Manarah Market,
Hayy-ul Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore
U B L Model Town Ferozpur Rd¨ Lahore.

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴
سب آفس: ۱۱- داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

پاکستان میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشنز کا مرحلہ بحمد اللہ بخیر و عافیت طے پایا۔ انتخابات سے قبل گوناگوں قسم کے خدشات ہر سوچنے سمجھنے والے پاکستانی کو پریشان کئے دے رہے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ خدشات بے بنیاد بھی نہیں تھے' سیاسی کشیدگی اپنی انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی' ملک کی مختلف سرحدوں سے تخریب کاروں کی مسلسل آمد کی اطلاعات روزانہ کا معمول تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بھارت کی طرف سے کھلی جارحیت قریباً یقینی تھی۔ قرائن یہ بتاتے تھے کہ پاکستانی قوم کے لئے آخری سزا کا وقت شاید آن پہنچا ہے۔ لیکن یہ اللہ کے خصوصی فضل و کرم کا مظہر ہے کہ خطرات و خدشات کے اس بھنور میں سے قوم کی کشتی بحفاظت نکل آئی۔ تاہم سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۱۱ "وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ" کے مصداق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مزید مہلت جو ہمیں عطا ہوئی ہے کسی شدید تر آزمائش کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ اتنی بات تو یقینی ہے کہ اگر اس مہلت سے کوئی حقیقی فائدہ نہ اٹھایا گیا اور ملک میں نظامِ اسلام کے قیام کی طرف کوئی مثبت' ٹھوس اور واقعی پیش رفت نہ کی گئی تو ہم پر اللہ کی طرف سے حجت آخری درجے میں تمام ہو جائے گی اور ہم' جو پہلے ہی خود کو عذاب الٰہی کا مستحق بنا چکے ہیں ہر نوع کی رُو رعایت کے استحقاق سے محروم ہو جائیں گے۔ پھر ہمارا جو حسرت ناک انجام ہو گا اس کے تصور سے ہی کپکپی طاری ہوتی ہے!

یہ وہ بات ہے جس کی طرف امیر تنظیم اسلامی نے اپنے حالیہ خطبہ جمعہ میں اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ بات مفصل انداز میں حاضرین کے سامنے رکھی کہ مسلمانانِ پاکستان کے لئے نظام اسلام کے نفاذ کا یہ تیسرا سنہرا موقع ہے جو حالیہ انتخابات کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں فراہم کیا ہے۔ پہلا موقع ہمیں قیام پاکستان کے فوراً بعد حاصل تھا جب تحریکِ پاکستان کا جوش و جذبہ پورے عروج پر تھا اور ایک مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کا خواب ہر پاکستانی دیکھ رہا تھا'

اس لئے کہ خود قائد اعظم کے الفاظ کے مطابق پاکستان کے قیام کا مقصد اسلام کے اصولِ حریت 'اخوت اور مساوات پر مبنی ایک مثالی اسلامی معاشرے کا قیام تھا۔ پھر دوسرا سنہری موقع ۱۹۷۷ء کی نظامِ مصطفیٰ تحریک کے نتیجے میں ہمیں میسّر آیا تھا جب جوش و جذبے کے اعتبار سے تحریکِ پاکستان کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ اس موقع پر اسلامی نظام اگر بتمام و کمال نافذ کر دیا جاتا تو کسی کو چُوں کرنے کی مجال نہ ہوتی اس لئے کہ فضا پورے طور پر سازگار تھی...... لیکن یہ دونوں مواقع ہم ضائع کر چکے ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کہ اس معاملے میں کس کا کتنا قصور ہے' حقیقت یہ ہے کہ کم و بیش پوری قوم اس جرم میں شریک ہے اس لئے کہ "ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ!"...... اور اب یہ تیسرا گولڈن چانس ہے جو قدرت نے ہمیں عطا کیا ہے ___ دیکھنا یہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم اِس خداداد موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کے سنوارنے کا ذریعہ بناتے ہیں یا حسبِ سابق "اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے" کا نقشہ پیش کر کے "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ" کا مصداق بننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سورۃ یونس کی آیت ۱۴ اس وقت ہم پر پورے طور پر صادق آتی معلوم ہوتی ہے کہ "ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ"۔ (ترجمہ: "پھر ہم نے تمہیں زمین میں ان کا جانشین بنایا تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو")

امیر تنظیم کا یہ خطاب مکمل صورت میں تو شاید آئندہ 'میثاق' کی زینت بن سکے گا' تاہم اس خطاب کا پریس ریلیز اسی شمارے میں شامل ہے۔ مزید برآں ۲۶ اکتوبر کے خطابِ جمعہ کا پریس ریلیز بھی اسی پرچے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس خطاب میں امیر محترم نے انتخابات کے نتائج کے حوالے سے سیاسی معاملات پر قدرے کھل کر اظہار خیال کیا تھا' بالخصوص پیپلز پارٹی کے بارے میں اپنی رائے اس کے مقدمات و مبادی سمیت تفصیل سے بیان کی تھی۔ یہ خطاب مکمل شکل میں 'ندا' کے تازہ پرچے میں جس پر ۱۳ نومبر ۹۰ء کی تاریخ درج ہے' شامل ہے۔

☆☆☆☆☆

۲۸ اکتوبر ۹۰ء کو باغ بیرون موچی دروازے میں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام جلسۂ عام بحمد اللہ حسبِ پروگرام منعقد ہوا۔ یہ جلسہ چونکہ بہت سے اعتبارات سے تنظیم کے لئے اپنی

نوع کا پہلا جلسہ تھا للہٰذا اس کی تیاری پر بھی خصوصی توجہ دی گئی تھی اور اب اس کی رپورٹ بھی خاصی تفصیل سے ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں دو رپورٹیں زیرِ نظر شمارے میں شامل ہیں۔ ایک رپورٹ رفیقِ تنظیم محمد راشد صاحب کی مرتب کردہ ہے جس میں جلسے کی تیاریوں اور اس سے متعلقہ امور کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جبکہ دوسری رپورٹ میں جو ہفت روزہ 'زندگی' سے ماخوذ ہے 'جلسہ عام کا آنکھوں دیکھا حال بڑے حقیقت پسندانہ اور متوازن انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یوں یہ دونوں رپورٹیں مل کر اس جلسے کی ایک مکمل تصویر قارئین کو مہیا کرتی ہیں........ لاہور کے جلسے کے بعد کوئٹہ میں بھی جلسہ عام کا ایک پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ تنظیم اسلامی کوئٹہ کی جانب سے موصول شدہ جلسے کی بھرپور رپورٹ بھی اسی شمارے میں شامل ہے۔ رپورٹوں کی اس بہتات کے پیش نظر اگر اس شمارے کو 'رپورٹ نمبر' قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ تاہم یہ ایک استثنائی معاملہ ہے 'ورنہ عام طور پر تنظیمی رپورٹیں 'میثاق' کے آٹھ دس صفحات سے متجاوز نہیں ہوتیں۔

☆☆☆☆☆

جماعت اسلامی کی تاریخ کے ایک تلخ اور ناخوشگوار واقعے کی تفصیلات پر مشتمل 'نقضِ غزل' کے زیر عنوان محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک سلسلۂ مضامین سالِ رواں کے دوران 'میثاق' کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا۔ پھر مختلف حلقوں کی جانب سے ان مضامین پر ردِّ عمل اور اس ردِّ عمل پر محترم ڈاکٹر صاحب کا جوابی تبصرہ بھی 'میثاق' میں چھپ چکا ہے 'اور اس طرح یہ بحث اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ ...... قارئین نوٹ فرمالیں کہ اب ان تمام مضامین کو 'تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے اور اس طرح گویا اس گمشدہ باب کو تاریخ کے صفحات میں محفوظ کرنے کا سامان ہوگیا ہے۔ اس کتاب کا ایک تفصیلی اشتہار اس شمارے میں قارئین کی نظر سے گزرے گا........ اسی طرح 'امت مسلمہ کے لئے سہ نکاتی لائحہ عمل اور نہی عن المنکر کی خصوصی اہمیت' کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب کی ایک تازہ تالیف بھی حال ہی میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر مارکیٹ میں آگئی ہے 'جو نہ صرف یہ کہ امیر تنظیم کے دو اہم خطابات پر مشتمل ہے بلکہ اضافی طور پر مضمون کی مناسبت

سے تبلیغی جماعت کے اکابرین میں سے ایک نمایاں شخصیت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کی ایک تحریر بھی اس کتابچے میں شامل ہے جنہوں نے بانیٔ تبلیغ مولانا الیاس رحمہ اللہ کے افکار کا نچوڑ اپنی تحریر میں پیش کیا ہے۔ مولانا موصوف کی اس تحریر سے محترم ڈاکٹر صاحب کے خطابات کے مندرجات کی مکمل تائید و تصویب ہوتی ہے۔ یہ کتابچہ انشاء اللہ رفقاء تنظیم کے لئے ایک قیمتی اثاثہ ثابت ہوگا۔

امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تالیفات میں 'راہ نجات' نامی ایک کتابچہ سورۃ العصر کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے جو تنظیم اسلامی کے بنیادی لٹریچر میں شامل ہے۔ اس کتابچے میں شامل ایمان اور عمل کے باہمی تعلق کے بارے میں امیر تنظیم کی بعض تعبیرات کو بعض علماء محلِّ نظر گردانتے ہیں' تاہم بعض دوسرے علماء جو اول الذکر علماء ہی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں' ان تعبیرات کو بالکل درست اور سلف کے مسلک کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ تفصیلی بحث سے قطع نظر ذیل میں ہم قارئین اور رفقاء کی دلچسپی کے لئے اس کتابچے کے بارے میں مولانا یوسف بنوریؒ کے داماد مولانا محمد طاسین صاحب کی رائے نقل کر رہے ہیں جو علمی مجلس کراچی کے ناظم اور بلند پایہ محقق ہیں۔ سطور ذیل میں مولانا کی اپنی تحریر کا عکس شائع کیا جا رہا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"راہِ نجات سورۂ والعصر کی روشنی میں" کے عنوان سے محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا کتابچہ بغور پڑھنے کا موقع ملا جو دراصل موصوف کی ایک اصلاحی تقریر پر مشتمل ہے جو انہوں نے داعیانہ اسلوب سے کالج کے اساتذہ اور طلبہ کے سامنے ارشاد فرمائی، چونکہ اس تقریر کا موضوع قرآن کی سورۃ والعصر تھا لہذا یہ سورۂ والعصر کی تفسیر بن گئی، اس کو پڑھنے کے بعد میں اپنے علم و فہم کے مطابق یہی کہہ سکتا ہوں کہ بطور تفسیر اس میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ صحیح و درست ہے میں نے اس کے اندر کوئی غلط و قابل اعتراض بات نہیں پائی، اس میں بندے کی نجات کے لئے ایمان کے ساتھ عمل صالح کی اہمیت پر جو خاص زور دیا گیا ہے وہ خود قرآن حکیم کی سینکڑوں آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیسیوں احادیث سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی نجات کے لئے ضروری ہے اس کا اظہار جس طرح قرآن مجید کی ان آیات سے ہوتا ہے جن میں ایمان کے ساتھ ضرور عمل صالح کا ذکر اور دونوں کے مجموعے پر جزاء

کا بیان ہے اِس طرح اُن قرآنی آیات سے بھی بخوبی ہوتا ہے جن میں یہ بیان ہے کہ قیامت کے دن یا آخرت میں جنت اور جہنم والوں سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے اُن اعمال کی جزا ہے جو تم دنیا میں کرتے رہے تھے مثلاً یہ آیت : تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ اور یہ آیت : اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ اور یہ آیت اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ اور یہ آیت وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۔ اور یہ آیت هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ اور یہ آیت ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ اور یہ آیت وَلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ اِس قسم کی قرآنی آیات صاف بتلاتی ہیں کہ اُخروی جزاء و سزا کا دارومدار انسان کے اعمال پر ہے ۔

میں محترم ڈاکٹر صاحب کی اِس بات سے بھی پوری طرح متفق ہوں کہ جب دل میں ایمان اپنی صحیح شکل سے موجود ہو تو انسان سے نیک اعمال خود سرزد اور صادر ہوتے ہیں ان کے درمیان لازم و ملزوم کا سا تعلق ہے ایمان کی ماہیت اور فطرت میں صالح اعمال کا تقاضا ہے گویا ایمان کی خارجی اور معروضی شکل کا نام اعمال صالحہ ہے اور یہ کہ اعمال صالحہ ایمان سے غیر متعلق کوئی الگ چیز نہیں ۔

سورۃ والعصر کی تفسیر میں ڈاکٹر صاحب نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ عمل صالح کے بغیر ایمان کا کچھ اعتبار اور فائدہ نہیں یا یہ کہ بدعمل مومن یعنی فاسق ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور اس کے لئے کبھی نجات نہیں ، اگر ایسا فرماتے تو ضرور گرفت ہوسکتی تھی لیکن اُن کی کسی عبارت سے ایسا ظاہر نہیں ہوتا اور اگر کسی عبارت میں دور کا احتمال تھا تو وہ اُن کی وضاحت کے بعد ختم ہوگیا اب اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی میں سمجھتا ہوں لزوم اور التزام میں جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہ رکھنے کیوجہ سے اعتراض کی گنجائش پیدا ہوجاتی ہے ۔ حررہ محمد طاسین

مجلس علمی کراچی

ابتدائی عربی گرامر خط و کتابت کورس کا اجراء

الحمدللہ کہ 'قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی' نامی خط و کتابت کورس کے کامیاب تجربے کے بعد اب مرکزی انجمن خدام القرآن نے اللہ کی تائید و توفیق سے ابتدائی عربی گرامر خط و کتابت کورس کا اجراء کر دیا ہے۔

- اس ابتدائی کورس کے حصہ اوّل میں ٹیکسٹ بک کی ۴۴ مشقوں کے علاوہ ۲۵ اضافی مشقیں بھی شامل ہیں جو طلبہ کو مرحلہ وار بھیجی جائیں گی۔
- یہ کورس بنیادی طور پر انٹر پاس طلبہ کے لیے ہے۔ تاہم انٹر کی سند نہ رکھنے والے حضرات کو اُن کے ذاتی مطالعے اور قابلیت کی بنا پر داخلہ دیا جا سکتا ہے۔
- اندرونِ پاکستان کورس کے حصہ اوّل کی فیس مع ڈاک خرچ -/۲۰۰ روپے ہے۔

مزید تفصیلات کے لیے رجوع کیجئے: قرآن کالج لاہور، ۱۹۱۔ اے، اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

تنظیمِ اسلامی پاکستان کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے

آئندہ پروگرام

(۱)

سات روزہ تربیت گاہ — ۹ر تا ۱۵ر نومبر ۹۰ء

(۲)

آٹھ روزہ تربیت گاہ — ۲۱ تا ۲۸ر دسمبر ۹۰ء

(۳)

ایک روزہ توسیعی مشاورت — ۷ر جنوری ۹۱ء

تنظیمِ اسلامی کے طے شدہ مشاورتی نظام کے مطابق رفقاء کی آراء سے استفادہ کی خاطر اس میں رفقاء کے لیے اظہارِ خیال کا موقع ہوگا۔

مذکورہ بالا تینوں پروگرام مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی پاکستان ۶۷ر اے، علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو، لاہور میں منعقد ہوں گے۔

(۴)

ہفت روزہ تربیت گاہ — ۱۵ر تا ۲۱ر فروری ۹۱

(۵)

سالانہ اجتماع — ۲۲ر تا ۲۵ر فروری ۹۱

{ نوٹ: مؤخر الذکر دونوں پروگرام کراچی میں ہوں گے تفصیلات آئندہ میثاق میں شائع کر دی جائیں گی۔ (اِن شاء اللہ) }

مغربی ممالک میں مقیم رفقاءِ تنظیم کے لیے لائحہ عمل

ڈیٹرائیٹ (امریکہ) میں رفقاءِ تنظیم اسلامی کے ایک خصوصی اجتماع میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے خطاب کا دوسرا حصہ

ترتیب و تسوید: حافظ خالد محمود خضر

شمالی امریکہ میں اسلامی انقلابی تحریک کے اس عبوری دور میں جو Integration درکار ہے' اس کے دوسرے تقاضے کے طور پر میں نے آپ کو وہ پانچ چیزیں گنوادی ہیں جو ہمیں تنظیم اسلامی کے اُن رفقاء سے مطلوب ہیں جو یہاں مقیم ہیں۔ اب میں اس Integration کا تیسرا پہلو آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ یعنی اس عرصے میں آپ کو وہاں سے کیا حاصل کرنا چاہیے۔

اِس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ آپ میں سے جن حضرات کے لیے بھی ممکن ہو وہ پاکستان جاکر ہمارے ہاں دینی تعلیمی کورس میں داخلہ لیں اور ایک سال کا نصاب ضرور مکمل کریں۔ اس کے بارے میں آج ڈاکٹر عبدالفتاح نے تو یہ فرمایا کہ یہ قابل عمل نہیں' ناممکن ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہ ہرگز ناممکن نہیں ہے' بس ذرا Determination کی ضرورت ہے ـــــــ یہاں بریں جو ہفتے میں ایک یا دو کلاسیں ہو رہی ہیں اس سے عربی کے سیکھنے سکھانے میں کوئی ترقی نہیں ہوسکتی۔ آدمی اگر طالب علم کی حیثیت سے دو مہینے کے لئے بھی یکسو ہو کر بیٹھ جائے تو کچھ سیکھ سکتا ہے ورنہ یہ محض خود فریبی ہے کہ ہم پڑھ رہے ہیں۔ سالہا سال میں بھی ہفتہ میں

ایک کلاس اور ہفتہ میں دو کلاسوں سے کچھ نمایاں پیش رفت سامنے نہیں آتی۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہاں سے لیڈر شپ کو ابھارنا ہے تو اس کے لئے آدمی تیار کرنا ہوں گے۔ نرا مولوی بھی انقلابی تحریک کی قیادت نہیں کر سکتا اور جدید تعلیم یافتہ آدمی جو براہ راست کتاب و سنت کے ساتھ ایک مس نہ رکھتا ہو اس کا اہل نہیں ہے۔ اس کے لئے مفتی اور بڑا عالم ہونا ضروری نہیں لیکن کتاب و سنت کے ساتھ براہ راست ربط و تعلق ضرور ہونا چاہئے۔ اگر یہ نہیں ہے تو یہاں کی اس تحریک کی قیادت کے تقاضے پورے نہیں ہو سکیں گے۔ آپ لوگ اس کے لئے محنت کریں ارادہ کرلیں تو یہ ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت یہاں ہمارے چالیس کے قریب ساتھی تو موجود ہوں گے ان میں سے دو دو تین تین کر کے ایک ایک سال کے لئے وہاں پر آجائیں۔ ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جو وہاں آئے اس کے اندر اتنی صلاحیت بھی ہو کہ وہ قرآنی فکر کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکے۔ جیسا کہ میں نے بارہا کہا ہے کہ ہم نے جو قرآن کالج کھولا ہے وہ ایک نرسری ہے۔ اس نرسری میں پچاس میں سے ایک شاید ایسا نکل آئے جو واقعۃً اس کام کو اپنے لئے پوری زندگی کا ایک پراجیکٹ بنا لے اور "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" کا مصداق بن جائے۔ ورنہ کم سے کم یہ تو ہو گا کہ وہ گریجویشن کر کے جائے گا تو عربی اور قرآن سے واقف ہو گا' جس شعبے میں بھی جائے گا کچھ نہ کچھ تو دین کا کام کرے گا۔ مقابلے کا امتحان پاس کر جائے تو اپنے ملک کو ہم ایک افسر تو ایسا دے دیں گے جو جہاں جائے وہاں پر درسِ قرآن دے سکے' خطبہ دے سکے اور نماز پڑھا سکے۔ لیکن یہ بات ثانوی درجے میں ہے ہمارے سامنے قرآن کالج کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ یہاں ایسے ذہین عناصر تیار کئے جائیں کہ جو جدید دور کی علمی سطح پر قرآن کی ہدایت کو پیش کر سکیں اور ظاہر بات ہے کہ یہ صلاحیت ہر شخص کے اندر نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ سو دو سو طلبہ اس میں سے گزریں تو شاید اللہ تعالیٰ ایک دانہ ہمیں ایسا بھی دے دے۔ یہ کام زیادہ بڑے پیمانے پر ہو گا تو اس میں زیادہ باصلاحیت لوگ نکل بھی آئیں گے۔

یہاں سے آپ حضرات وقت نکال کر وہاں جائیں اور واپس آکر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کریں تو آپ کی صلاحیتیں نکھریں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی پڑھنے سے نہیں سیکھتا

جب پڑھاتا ہے تو سیکھتا ہے، پھر وہ پالش ہوتا ہے۔ میرا جتنا بھی مطالعہ ہے اور قرآن کا فہم جو
کچھ مجھے حاصل ہے وہ مجھے درسِ قرآن کے ذریعے سے حاصل ہوا ہے۔ جب آدمی بیان
رہا ہوتا ہے تو اس کے سامنے کئی مسائل آجاتے ہیں۔ درس کی تیاری کے دوران اس کے
منے کئی ایسے سوالات آجاتے ہیں جن کا سامعین کی طرف سے اٹھائے جانے کا امکان ہوتا
۔ وہ سوچتا ہے کہ درس میں صرف عام لوگ ہی نہیں ہوتے' کوئی صاحب فہم و علم بھی
ہو سکتا ہے، وہ یہ سوال کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں میرا اپنا ذہن واضح ہونا چاہئے۔
روہ درس کی تیاری کرتا ہے، تفاسیر دیکھتا ہے۔ میں اگرچہ زمانۂ طالب علمی سے درسِ
ن دے رہا ہوں اور جمعیت طلبہ کے زمانے میں میرے درس کی شہرت ہو گئی تھی۔ اور
ں برس سے تو مسلسل اسی کام میں ہوں لیکن اب بھی مجھے اپنے سلسلہ وار درس کے
جس میں ہم سورۃ المرسلات تک پہنچ چکے ہیں، بڑی تیاری کرنی پڑتی ہے اور مجھے اس
لئے کافی وقت لگانا پڑتا ہے۔

"منتخب نصاب" کے دروس کا معاملہ مختلف ہے اُس کے دروس میں نے بارہا دیئے ہیں
کسی وقت Off hand بھی ان مقامات کے درس دے سکتا ہوں کیونکہ اس کا صغریٰ
ریٰ' اس کا سارا مضمون میرے ذہن میں ایک ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن
رے مقامات سے درس دینے کے لئے مجھے تیاری کرنا پڑتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ
شخص کو قرآن حکیم کے بارے میں بغیر تیاری کے اپنی زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرنی چاہئے۔
للہ کا کلام ہے' کوئی معمولی بات نہیں۔

لاہور میں جب ہم نے دو سالہ کورس شروع کیا تھا تو تنظیم کے بہت سے نوجوانوں کو
میں بڑی مشکل سے بٹھانا پڑا۔ وہ آسانی سے دو سال لگانے کو تیار نہیں تھے۔ ان سے میں
کہتا تھا کہ آپ کے پاس فکر موجود ہے' لیکن پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے نہیں ہیں' ہوا میں
رہے ہیں۔ آدمی دین کا کام کرنے اٹھے لیکن قرآن شریف صحیح طرح نہ پڑھ سکے یہ
ں قدر افسوس کی بات ہے۔ کہیں حوالے کے لئے آیت پڑھے تو غلط طریقے سے پڑھ
ے۔ جیسے کہ میں ISNA میں دیکھتا رہا ہوں کہ وہاں کے بڑے اہم آدمی بھی قرآن مجید کی
ت غلط پڑھ رہے تھے۔ اس پر ایک دم دھچکا سا لگتا ہے کہ یہ لوگ ایک مذہبی اور دینی کام کی

قیادت کر رہے ہیں اور ان کا حال بھی یہ ہے۔ چنانچہ جو شخص آسمان میں اُڑ رہا ہے تو اس
کھینچ کر اس کی ٹانگیں زمین پر ٹکانا پڑیں گی کہ اب آپ تجوید بھی سیکھیں' عربی سیکھ
صرف و نحو سیکھیں۔ یہ کام جو ہم نے وہاں پہ کیا ہے تو اللہ کا شکر ہے کہ وہ نتیجہ خیز رہا۔
------ اور جیسا کہ میں نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اب ہمارے پاس تیس پینتیس ایسے
نوجوان موجود ہیں جن پر قرآن کا فکر بھی واضح ہے اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ درس قرآن
دے رہے ہیں۔ یہی کام اب یہاں کے رفقاء کو بھی کرنا ہو گا۔ یہ صورت حال کب تک چل
سکتی ہے کہ میں ہی آؤں تو درس دوں' یا میرے ٹیپ سے درس سنوایا جائے؟ صرف ٹیپ
سے وہ بات نہیں بن سکتی جو ایک رُوبرو درسِ قرآن میں ہوتی ہے۔ اس کے لئے بہرحال
آپ کو پوری سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور اگر واقعتہ یہاں پر ایک اسلامی انقلابی تحریک شروع
کرنے کا ارادہ ہے تو پھر آپ کو یہاں سے لوکل ایلمنٹ ابھارنا پڑے گا۔ اس کے لئے آپ
حضرات ہمارے ایک سالہ نصاب کے لئے وقت فارغ کریں۔ یہ ہرگز ناممکن نہیں ہے
آپ اس کے لئے آج ہی سے کوشش شروع کر دیجئے۔ آپ کی کوشش کو بار آور کرنا اللہ
کام ہے۔ (السّعی منّا والاتمام من اللہ) تبلیغی بھائی کہا کرتے ہیں کہ بھائی ارادہ تو کرلو' نیت کرلو
جب آدمی نیت کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ حالات کو سازگار کر دیتا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ سمجھ لیں
یہ ناممکن ہے' ہو سکتا ہی نہیں ہے' تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر تو کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے

بہرحال یہ کام آپ ہی کو کرنا ہے اور وہ لوگ جو زیادہ اہم ہیں ان پر اس سلسلہ میں زیادہ
ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آپ بالکل نوجوانوں کو بھیج دیں گے تو یقیناً وہ مستقبل کا سرمایہ تو بن
جائیں گے لیکن آپ کو فوری طور پر جس مقامی قیادت کی ضرورت ہے اس کا مسئلہ حل نہیں
سکے گا۔ وہ حضرات جو کافی عرصے سے تنظیم سے وابستہ ہیں' ذمہ داریاں بھی سنبھالے ہو۔
ہیں ان میں سے اگر ایک سال لگا کر آجائیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑا Through
Break ہو گا۔ ہمارے عبوری دور کو زیادہ لمبا نہیں ہونا چاہئے اور اس کو ہمیں کم سے
کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ حضرات اس بارے میں
سنجیدگی سے سوچیں۔

اس کے لئے آپ اپنی نئی نسل کے نوجوانوں کو بھی ہدف بنا کر اس رخ پر لگائیے۔ یہاں پر عام حالات تو یہی ہیں کہ "Casualty Rate" بہت زیادہ ہے اور اکثر و بیشتر نوجوان یہاں کے تہذیب و تمدن کے سیلاب میں بہہ جائیں گے لیکن بہت تھوڑے جو بچیں گے ان کے اندر وہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ پھر وہ کسی اسلامی تحریک کی قیادت کر سکیں۔ اور وہ اس ٹھوس علمی بنیاد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے دو راستے ممکن ہیں۔ ہائی سکول کرنے کے بعد آپ کا یہاں کا نوجوان وہاں کے لئے فٹ نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کی عمر اتنی ہو جاتی ہے کہ پھر وہ اپنے معاملات میں آزادی و خود مختاری سے فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ جو تجربہ ہوا ہے عبدالغفور صاحب کے بچے کا اس کے بعد میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بہترین مثال ہے جو بن گئی ہے۔ یعنی بچہ یہاں سے th Grade 10 کر کے جائے، اُس وقت تک وہ بہرحال والدین کا کہنا بھی مانتا ہے۔ اور اس کے اندر اس درجے کی خود سری نہ کہئے تو خود مکتفی اور خود مختار ہونے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا بچہ جب یہاں سے گیا تو وہ اردو سے بالکل نابلد تھا، لیکن اس نے چند ماہ تک اپنے کالج کے اردو کے استاد صاحب سے خصوصی وقت لے کر اردو پڑھی۔ اب اس کا ایک سال ہو گیا ہے اور اس نے سال اول کے امتحان میں کافی اونچی پوزیشن حاصل کی ہے۔ میں اپنے ہاتھوں سے اسے کئی پرائز دے کر آیا ہوں۔ حالانکہ وہ یہیں کا پڑھا ہوا تھا اور سوائے گھر میں معمولی بول چال کے اردو لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ تو آپ کے ایسے نوجوان اگر جائیں اور ایک سال ہی لگا کر آجائیں تو صرف یہی ہو گا کہ ان کا ہائی سکول ایک سال مؤخر ہو جائے گا۔ اگر بارہ سال میں ہو رہا ہے تھا تو تیرہ سال میں ہو جائے گا تو کچھ نہ کچھ قربانی تو دینا" دینی ہو گی، خواہ وہ بھی تھوڑا سا محسوس کرے کہ میرے کلاس فیلوز مجھ سے آگے نکل گئے اور میں ان سے پچھلے گریڈ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ لیکن کچھ نہ کچھ قیمت دیئے بغیر تو کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ دوسری صورت جو اس سے بھی بہتر ہے وہ یہ ہے کہ آپ اسے گریجویشن وہیں سے کروالیں۔ تین سال وہ وہاں لگا لے اور گریجویشن کرنے کے بعد وہ یہاں آئے۔ اس کے بعد آپ اسے یہاں ایم۔ اے کرائیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ آپ کو اگر واقعتاً اسلامی انقلابی کام کرنا ہے تو علوم عمرانی (Social Sciences) ہی کی طرف آپ کو جانا ہو گا۔ طبیعاتی اور تکنیکی علوم کا انقلاب سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے کہ ان کا فکر اور سوچ

سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنسدان آپ کو بم بنا دیں گے لیکن بموں کا استعمال کون کرتے ہیں؟

وہ تو سیاستدان ہی کرتے ہیں نا! سائنسدان بیٹھے بم بنا رہے تھے ہٹلر کے لئے، جو امریکیوں کے ہاتھ آگیا اور انہوں نے وہ لے جا کر ہیروشیما پر گرا دیا۔ سائنس دان انقلاب نہیں لایا کرتا۔ سائنسدان کی ٹیکنالوجی سیاستدان کے کام آتی ہے۔ تو جب تک معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات وغیرہ کے اندر ہماری خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوتی اس وقت تک ہم دنیا کے فکر کا رخ نہیں بدل سکتے۔ ہمیں سائنس کا تو رخ نہیں بدلنا وہی سائنس ہم پڑھائیں گے ظاہر بات ہے کہ انجینئرنگ، کمپیوٹر سائنس یا میڈیکل سائنس میں اسلام نے کیا لا کر داخل کر دینا ہے! اسلامی تعلیمات سے ذاتی طور پر سائنس دان کے اپنے کردار کی Orientation تو ہو سکے گی، اس کے سوا نہیں۔

اس معاملے میں ہمیں بڑی مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ علوم عمرانی کی طرف لوگ جاتے ہی نہیں۔ آج بھی چند نوجوان طلباء جو یہاں آئے تھے، یہ کہہ رہے تھے کہ یونیورسٹیوں میں ہمارے جتنے طلبہ بھی عمرانی علوم کی طرف جاتے ہیں وہ ملحد اور Leftist ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں ہمارے پاس ابھی مقابلہ کرنے کے لئے وہ مواد نہیں ہے کہ ہم انہیں بچا سکیں۔ تو اگر کوئی شخص قرآن کالج میں رہ کر وہاں سے فلسفہ، سیاسیات یا معاشیات کے ساتھ گریجویشن کرتا ہے اور پھر یہاں آ کر ان چیزوں میں کسی کو Follow کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ جو ایک فکری انقلاب کی بات جس پر میں نے 'اسلام کی نشأۃ ثانیہ' میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، شاید اس مہم کے لئے کچھ نوجوان تیار ہو سکیں۔ آپ کی دوسری نسل میں میں نے اس کے آثار دیکھے ہیں اگر وہ بھی انجینئرنگ اور کمپیوٹر سائنس وغیرہ میں لگ گئے تو وہ زیادہ سے زیادہ Activist ہو سکتے ہیں۔ کچھ حرکت، بھاگ دوڑ اور تنظیم کر لیں گے۔ لیکن وہ اس قابل نہیں ہوں گے کہ فکری میدان کے اندر انسانی ذہن کو نئے رخ پر ڈال سکیں، اس کے فکری پہلو کو تبدیل کر سکیں۔

تو پہلا کام یہ ہے کہ آپ ایک سالہ کورس سے خود فائدہ اٹھائیں اور اپنے بچوں میں سے 10TH GRADE کے بعد کم از کم ایک سال ورنہ تین سال کے لیے قرآن کالج میں

بھیجئے۔ تاکہ وہ گریجویشن وہاں کر کے آجائیں۔ اس کے لئے آپ محنت کریں' اس کے اندر میری بہت توانائی صرف ہوئی ہے۔ قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کی ایک ایک اینٹ جو لگی ہے وہ آخر ہماری محنتوں کا ہی تو ثمرہ ہے۔ ہمارے پاس کسی حکومت سے تو پیسے نہیں آئے۔ وہی ہمارا حلقہ ہے' وہی ہمارے سپورٹرز ہیں' وہی ہمارے ہم خیال معاونین ہیں جن کے تعاون سے سب کچھ بنا ہے۔ اب بھلا ہم اس سے فائدہ نہ اٹھائیں اور یہاں کے جو ہمارے رفقاء ہیں وہ اس سے استفادہ نہ کریں۔ یہ نوٹ کر لیجئے کہ اگر آپ واقعی سنجیدہ ہوں کہ یہاں پر صحیح معنوں میں ایک اسلامی انقلابی تحریک شروع کرنی ہے تو یہ ہماری ضرورت نہیں' آپ کی ضرورت ہے۔ ہم تو اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہم نے یہ ادارہ قائم کیا ہے کہ آپ اپنے بچے کو وہاں بھیجئے۔ قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج میں بحمد اللہ ایک دینی ماحول ہے۔ اس کے علاوہ وہاں انتہائی محنت' لگن اور سنجیدگی سے بچوں کو پڑھایا جا رہا ہے۔

دوسرے اداروں میں تو آئے دن کلاسوں کا بائیکاٹ اور ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں اس کا اہتمام کیا جا رہا ہے کہ اس رجحان کا سایہ بھی وہاں نہ پڑے۔ اگرچہ ہمارے پاس ابھی ٹیلنٹ نہیں آرہا' بلکہ اکثر و بیشتر مسترد مال آرہا ہے' لیکن ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہم اچھے نتائج دکھا سکیں۔ اور اس طرح شاید ہمیں مواد بھی بہتر مل سکے۔

دوسرا کام جو ہم آپ کے لئے اس عبوری دور میں کر سکتے ہیں وہ میری یہاں کی آمد ہے۔ اس کے ضمن میں کئی چیزیں ہیں جو قابل غور ہیں اور جن کے بارے سوچ بچار ہونا چاہئے۔ پہلی بات یہ کہ میری آمد کتنے وقفے سے ہو اور اس کی میعاد کیا ہو۔ اس معاملے میں یہاں آپ کی رائے وہاں کی جو ہماری مجلس شوریٰ ہے اس کی رائے سے باہم ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ بس میرے پاس ایک دعوت آگئی ہے' فون آگیا ہے تو میں فیصلہ کر رہا ہوں اور دوسرے رفقاء اس سے بے خبر ہیں۔ یہ صورت حال ختم ہونی چاہئے تاکہ میری آمد باقاعدہ ہو اور اس کی میعاد اور دورانیہ بھی معین ہو۔ دوسرے یہ کہ میرے یہاں اوقات کے مصرف کے ضمن میں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ آپ حضرات کے مابین بھی آراء کا خاصا تنوع اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر ایک رائے جو ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب نے پیش فرمائی ہے وہ مجھے خاصی صائب اور قابل عمل محسوس ہوئی ہے کہ میرے ان دوروں کو توسیعی

مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ یعنی آپ نے کسی جگہ پر کوئی ٹارگٹ بنا کر کام کیا ہے، جیسا کہ خود انہوں نے سینٹ لوئس یا سیراکیوز غیرہ میں کام کیا ہے۔ پہلے خود دو چار دورے کئے ہیں، تقریریں کی ہیں، لوگوں سے گفتگوئیں ہوئی ہیں اب ایسی جگہ پر میرا جانا ہو تاکہ ان لوگوں کے ساتھ رابطہ ہو۔ اس ذریعے سے شاید وہاں کے کچھ لوگ تنظیم میں شامل ہو جائیں۔ اس پر آج گفتگو ہوئی تھی اور میں نے کہا تھا کہ اس کا لازمی تقاضا پھر یہ ہونا چاہئے کہ وہاں میرا جو بھی وقت ہو وہ پھر پبلک ایڈریس میں نہ لگے۔ اس لئے کہ اس صورت میں پھر رابطہ کرنے کا نہ میرے پاس وقت ہوتا ہے نہ اُن کے پاس ہوتا ہے۔ وہاں ان کے پاس بھی وہی Week en ہی ہوتا ہے۔ اس میں اگر وہاں میری تقریریں ہو گئیں تو وہ لوگ بھی اسی کی بھاگ دوڑ میں رہیں گے، تیاری کریں گے، دو ورقے چھاپیں گے۔ الغرض ان کا ذہن ادھر لگا رہے گا اور ساری توانائی اسی پر صرف ہو جائے گی۔ عملاً یہی ہو گا۔ کیونکہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں چھ دن مزید وہاں بیٹھا رہوں اور اگلے ویک انڈ کا انتظار کروں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کی یہاں شوریٰ بن جائے وہ باہمی مشورے سے ان تمام چیزوں کو طے کرے۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ جہاں بھی کام کر رہے ہوں، جہاں بھی آپ کا نیا ربط قائم ہوا ہو، کوشش یہ کی جائے کہ وہاں کے لوگوں کو کسی کیمپ میں لایا جائے اور وہاں پر بھی تقریریں کم ہوں بلکہ گفتگو، سوال و جواب اور باہمی تبادلہ خیالات سے ربط و تعلق کو مستحکم کیا جائے اور انہیں تنظیم کے قریب لایا جائے۔ یہ آپ لوگوں کے سوچنے کی باتیں ہیں لیکن میرے نزدیک لائق ترجیح ہے۔ فرض کیجئے کہیں آپ کا رابطہ قائم ہوا ہے۔ آپ چار دفعہ سیراکیوز یا برن فیلڈ گئے ہیں، وہاں سے آپ نے چار چھ حضرات سے رابطہ کیا ہے۔ اب آپ انہیں کیمپ کے لئے تیار کرتے رہیے۔ اور یہ پہلے سے معیّن ہونا چاہئے کہ اس مہینے فلاں جگہ پر دس دن کا یا آٹھ دن کا کیمپ لگے گا اور آپ کی ساری محنت اس پر ہونی چاہئے کہ وہ وہاں آئیں۔ پھر وہاں یہ اس کیمپ کے پروگراموں سے ہر ممکن فائدہ اٹھایا جائے۔

(۳)=۔ میرے سامنے ایک اور چیز بھی ہے۔ آپ کی پچھلی میٹنگ کے منٹس سے بھی یہ بات سامنے آئی کہ اس پر بحث ہوئی ہے کہ انگریزی میں میرا منتخب نصاب کا درس ریکارڈ کیا جائے یا دورۂ ترجمہ قرآن کا اہتمام ہو۔ جہاں تک انگریزی میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا تعلق ہے اس کے

لئے ابھی میری طبیعت آمادہ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت ہی مشکل کام ہے اور میں اپنے آپ کو اس کے لئے تیار نہیں پارہا۔ پھر اس کے لئے دراصل جو فضا مطلوب ہوتی ہے وہ صرف رمضان المبارک میں میسر آتی ہے۔ یہ ایک خاص روحانی فضا ہوتی ہے جو رمضان المبارک کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس ماہ مبارک میں دین کے کام کے لئے انسان کی توانائیاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ مزید برآں اس کے لئے پوری رات جاگنے کا جو معاملہ ہوتا ہے وہ یہاں بڑا مشکل ہے کہ لوگ ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ اور چار چھ آدمی اگر جمع ہو بھی جائیں تو ان کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے طبیعت کے اندر وہ جولانی نہیں آتی۔ یہ صحیح حقائق ہیں جو اس اعتبار سے میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں اپنی جگہ میرا یہ فیصلہ ہے کہ جب تک بھی جان میں جان ہے میں ان شاء اللہ کوئی رمضان نہیں چھوڑوں گا جس میں دورۂ ترجمۂ قرآن نہ کروں۔ کہیں نہ کہیں ضرور کروں گا' اس لئے کہ اس سے خود مجھے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ ہر مرتبہ نئی چیزیں دورۂ ترجمۂ قرآن کے دوران ملتی ہیں جن کی طرف اس سے پہلے میرا ذہن نہیں گیا ہوتا۔ اس دفعہ میرا ارادہ ہے کہ ۱۹۹۱ء میں جو رمضان آرہا ہے وہ ان شاء اللہ حیدر آباد دکن میں گزاروں گا۔ لیکن انگریزی میں ترجمہ قرآن کے لئے نہ تو میں حالات کو سازگار سمجھتا ہوں اور نہ ہی اپنی طبیعت کو آمادہ پاتا ہوں۔ ڈاکٹر خورشید ملک صاحب اس کے لئے بہت زور دیتے رہے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے اس کا وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جب سپین میں میری ان سے ملاقات ہوئی تو یہ بھی اپنی جگہ یہ سوچ چکے تھے کہ یہ قابل عمل اور ممکن العمل نہیں ہے ـــــ اور میں اپنی جگہ ڈر رہا تھا کہ میں کیسے ان سے اجازت لوں گا کہ میں اپنے اس ارادے کو منسوخ کر رہا ہوں لیکن بعِ "متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!" کے مصداق ہماری آراء باہم متفق ہو گئیں تو مجھے اطمینان ہوا۔

البتہ منتخب نصاب کا جو معاملہ ہے وہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چونکہ ہماری اس دعوت اور انقلابی تحریک کے اعتبار سے اس کا اصل نقطہ ء آغاز ہے اور فرائض دینی کا ایک واضح اور جامع تصور اس کے حوالے سے سامنے آتا ہے' لہٰذا اس کا درس انگریزی میں ریکارڈ ہو جانا چاہئے۔ اس کی عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کوئی ایسا کیمپ منعقد کریں کہ وہاں کچھ لوگ مستقل شریک ہوں۔ روزانہ دن میں تین درس ہو جائیں' تاکہ منتخب نصاب کم سے کم

ف تو ایک دفعہ میں ہو جائے اور بقیہ نصف دوسری دفعہ میں۔ جیسے میں نے ٹورنٹو میں اردو
دروس دیئے تھے۔ اور میں نے یہ بارہا کہا ہے بلکہ "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" نامی کتاب
ں لکھا بھی ہے کہ ہمارا آڈیو کیسٹ کا سب سے بہتر نظام وہی تھا جو سمیع اللہ خان صاحب نے
رنٹو میں ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء کے جو ٹیپ تیار کئے تھے اور نامعلوم وہ دنیا میں کہاں کہاں پہنچے ہیں۔
جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا تک پہنچے ہیں۔ اور حیدر آباد دکن میں بھی انہی کے ذریعے سے
بطہ قائم ہوا تھا۔ اور ویڈیو کا سب سے بہتر معاملہ وہ تھا جو ابوظہبی میں میرے نو ویڈیو
بست تیار ہوئے وہ بھی دنیا میں بہت پھیلے ہیں۔ اس میں بھی میں نے یہ کیا تھا درمیان میں
Ga] چھوڑا گیا تھا۔ پہلے حصے میں سے دو درس لے لئے۔ دوسرے حصے میں سے دو درس
ئے۔ پھر تیسرے میں سے دو لے لئے۔ اور اگلے سال آکر پھر وہ خلا پر کئے تھے۔ اب بھی یہ
سکتا ہے کہ دو سال میں اس طرح کا ہمارا ایک کیمپ ہو جائے جس میں انگریزی میں منتخب
اب کے دروس مکمل ہو جائیں۔ یہ کیمپ اگر کسی بڑے شہر میں ہو تو شام کے دروس میں
وں کی عمومی شرکت بھی ہو سکتی ہے۔ باقی اس کی تفاصیل آپ لوگ طے کر سکتے ہیں۔ یہ
ر باتیں میں نے آپ حضرات کے سامنے رکھ دی ہیں۔ اس عبوری دور میں ہماری جو رفتار
ر اس وقت ہے اگر ہم اس کو تیز کرنا چاہتے ہیں اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہاں کی تنظیم کو خود
کتفی بنانے کے لئے جلد سے جلد اس کے تقاضے پورا کرنے کی صورت ہو جائے تو یہ تین
م کرتا ہوں گے، جو مشکل نہیں ہیں۔

آخری بات کہہ رہا ہوں کہ یہ جو ایک شکل ہے کہ یہاں پر میں موجود نہیں ہوں اور
ں کسی ایک شخص کو امیر مقرر کرتا ہوں۔ میں یہاں کے تمام رفقاء کے تفصیلی حالات سے
نف نہیں ہوں۔ اس اعتبار سے ڈسپلن کا معاملہ ایک مشکل معاملہ ہے۔ ایک ڈسپلن تو یہ
ہے کہ براہ راست مجھ سے ہی بیعت کی اور میں بھی وہاں موجود ہوں۔ میری ہی بات ان کے
منے آرہی ہے اور وہ اس پر لبیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن یہاں کا معاملہ مختلف ہے۔ یہاں جو
ں امیر ہے وہ "BY P ROXY" ہے۔ وہ اس اعتبار سے امیر نہیں ہے کہ اس کی دعوت
یا اس کے فکر سے اتفاق کرتے ہوئے کچھ لوگ اس کے گرد جمع ہوئے ہوں۔ تو یہ ایک خلا
جود ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک دوسرا خلا یہ ہے کہ یہاں پر اگر کسی ساتھی کو مقامی امیر سے

کوئی شکایت ہو جاتی ہے تو اس صورت میں وہ کیا طریق کار اختیار کرے۔ ہمارے ہاں ابھی یہ Channels بھی لوگوں کے سامنے صحیح طور پر نہیں آئے ہیں۔ اگر کسی ساتھی کو مقامی امیر سے شکایت ہے تو وہ اپنی شکایت امریکہ کے امیر کو پہنچائے اور اس طرح یہ معاملہ طے ہونا چاہئے۔ لیکن فرض کیجئے کہ اگر کسی کو امریکہ کے جو امیر ہیں ان سے اختلاف ہو جاتا ہے تو کیا ہو؟ اختلاف تو کسی کو مجھ سے بھی ہو سکتا ہے لیکن تنظیم میں مجھ سے اوپر تو کوئی کورٹ آف اپیل ہے نہیں، لہٰذا ظاہر بات ہے کہ آدمی کو سوچنا پڑے گا کہ اگر تو وہ مجھے برداشت کر سکتا ہو تو تنظیم میں رہے گا ورنہ سلام کر کے رخصت ہو جائے گا۔ لیکن اس صورت میں کہ یہاں جنہیں امیر بنایا گیا ہے ان سے کسی رفیق کو کوئی شکایت ہو گئی ہے تو یہ معاملہ مرکز کے حوالے کر دیجئے اور جب تک یہ بات صحیح طور پہ مجھ تک نہ پہنچ جائے اور میں اس کا کوئی فیصلہ نہ کروں اس وقت تک اس رفیق کو تنظیم میں رہنا چاہئے۔ لیکن اس پر سے یہاں کے لوکل ڈسپلن کی پابندی عارضی طور پر ہٹالی جائے تا آنکہ میری یہاں آمد پر ان سے بات چیت ہو۔ اس لئے کہ جب کوئی شخص غصے میں آکر ایک دفعہ استعفاء دے دیتا ہے تو پھر اس کی وابستگی کو دوبارہ بحال کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کی 'By Proxy' امارت کی وجہ سے یہ دو خصوصی شرائط ضروری ہیں جن کے لئے ہمیں خصوصی Adjustment کرنی چاہئے۔

آل امریکہ تنظیم کی امارت کے ضمن میں میں چاہتا ہوں کہ اس کا معاملہ ہم سال بہ سال طے کیا کریں۔ یہ نہیں کہ اسے ہر سال لازماً تبدیل کرنا ہے، بلکہ سمجھا جائے کہ ہمیں اس کا دوبارہ جائزہ لینا ہے۔ ہو سکتا ہے اس عرصے میں کوئی اور ساتھی ایسے سامنے آجائیں جو اس کے لئے زیادہ صلاحیت رکھنے والے ہوں۔ یا یہ کہ کچھ رفقاء کی طرف سے عدم اطمینان کی بات سامنے آجائے۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہاں یہ معاملہ دو طرفہ چلنا چاہئے۔ ایک تو یہ کہ آل امریکہ تنظیم کی امارت کی مدت کم ہونی چاہئے۔ ایک سال ہو یا دو سال، اس کا فیصلہ تفصیل سے کیا جا سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اگلے سال اسی کا تسلسل برقرار رکھا جائے اور اس سے اگلے سال بھی اسی کو جاری رکھا جائے، لیکن یہ ذہن میں رہے کہ اس کا از سر نو جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگلے سال کسی اور کی ذمہ داری ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ جن کو بھی میں نے یہاں ذمہ دار بنادیا ہو ـــــ اس وقت وہ خورشید ملک صاحب ہیں، کل کوئی اور ہوسکتے ہیں یوں نہ سمجھئے کہ میں ذاتی طور پر ان کے بارے میں کوئی بات کہہ رہا ہوں ـــــ اگر ان سے کوئی شکایت ہو جائے اور ان کے بارے میں آپ یہ محسوس کریں کہ ان کا یہ طرز عمل ہماری تنظیم کے لئے نقصان دہ ہے تو اس کو مجھ تک پہچانے میں کوئی حجاب اور ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں۔ یہ غیبت نہیں ہوگی، اس لئے کہ غیبت وہ ہوتی ہے جس میں آپ کی نیت کسی شخص کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی ہو، لیکن تنظیمی ضرورت کے طور پر یہ بات کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے نظام العمل میں پڑھا ہے کہ اس کے لئے ہم نے راستے (Channels) معین کر دیئے ہیں۔ پہلے تو آپ خود اس شخص سے گفت و شنید کیجئے جس سے آپ کو شکایت ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی پوزیشن واضح کر دے اور آپ مطمئن ہو جائیں ــــــــــــــــ لیکن اگر اس کے بعد آپ کا اطمینان نہیں ہوا تو بالائی نظم سے رابطہ کریں۔ فرض کریں کہ آپ کو اسرہ کے نقیب سے شکایت ہے تو مقامی امیر سے بات کریں، وہ اگر اس معاملے کو طے نہ کر سکیں تو آپ اسے امریکہ کے امیر کے سامنے رکھیں۔ تو اسے 'Through Proper Channel' ہونا چاہئے، ہم یہ کرتے ہیں کہ آپس میں گفتگوئیں کرنا شروع کر دیتے ہیں اور جو اصل 'پراپر چینل' ہے اس کو اختیار نہیں کرتے یا پھر بعض لوگوں کے اندر لحاظ اور مروّت کا مادہ اتنا آجاتا ہے کہ وہ بات کو غلط سمجھتے ہوئے بھی اسے بیان نہیں کرتے۔ کسی ذمہ دار ساتھی کا غلط طرز عمل ان کے سامنے آتا ہے لیکن وہ سوچتے ہیں کہ ایسی باتوں کا بیان کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ـــــــ یہ میرے نزدیک تنظیم کے اعتبار سے مہلک ہے۔

اس لئے کہ ایک شخص جو تنظیم کی کسی ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے ہے اگر اس کے کسی طرز عمل سے، کسی اقدام سے تنظیم کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے تو تنظیم کی خیر خواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے مجھ تک پہنچائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پر عبوری دور کے درمیان جو بُعد ہے اس کی وجہ سے جو بے اطمینانی پیدا ہو سکتی ہے اسے آپ ان دونوں چیزوں کے ذریعے سے ختم نہ بھی کر سکیں تو کم سے کم ضرور کر سکتے ہیں۔

اقول قولی ہذا و استغفراللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر

قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ

سورۃ الصّف

(۳)

نبی اکرمؐ کے مقصدِ بعثت کی تعیین

اَحْمَدُہٗ وَ اُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم — اَمَّا بعد:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ○ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ۔

سورۃ الصف کی یہ آیت (یعنی آیت ۹) جیساکہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے باعتبارِ مضمون اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے۔ اسی سے اس سورۃ کا عمود معیّن ہوتا ہے۔ یہ بات بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا بڑا اور مرکزی حصّہ جوں کا توں قرآن مجید میں تین مقامات پر وارد ہوا ہے۔ اس تکرار اور اعادے سے دراصل اس مضمون کی اہمیت کی جانب رہنمائی ہوتی ہے۔ یقیناً قرآن مجید میں بعض الفاظ یا مضامین کا بار بار آنا ان کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "اِزالۃُ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں قرآن کریم کی اہم ترین

یات میں سے شمار کیا ہے۔ بلاشبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے تعین میں
س آیۂ مبارکہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے اسے "اسلامی
قلاب" کے لیے عنوان قرار دیا تھا۔ بعض حضرات نے یہ بات نقل کی ہے، اگرچہ میں
د اس کی تصدیق نہیں کر پایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس آیۂ مبارکہ کو پورے
آن مجید کے لیے بمنزلۂ عمود قرار دیا ہے۔ اور اس میں تو ہرگز کوئی شک نہیں کہ سیرتِ
مدیؐ کو سمجھنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامۂ حیات کا صحیح صحیح اندازہ (ASSESS)
رنے کے لیے کہ آپؐ کی عملی جدوجہد کن مراحل میں سے ہو کر گزری، کہاں سے سفر
روع ہوا اور کہاں ختم ہوا، اس آیت کا سمجھنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ
رتِ نبویؐ کو سمجھنے میں لوگوں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ حضورؐ کو اگر صرف دوسرے انبیاء
یاس کیا جائے تو بہت سی چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں۔

ستشرقین کی کوتاہ فہمی

مستشرقین نے بالخصوص اس معاملے
بڑا دھوکہ کھایا ہے۔ اُن کے سامنے نبوّت و رسالت کے آئیڈیل حضرت مسیح یا حضرت
علیہما الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ ان کی زندگی میں کسی قتال یا جنگ کا سراغ نہیں ملتا۔ چنانچہ
لِی منکرین اور مستشرقین کو جنگ و قتال کا معاملہ منصبِ رسالت سے بڑا ہی متصادم
تا ہے۔ وہ اِن دونوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں۔ مشہور مؤرخ ٹائن بی کا یہ جملہ
مشہور ہے:

"MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET
BUT SUCCEEDED AS A STATESMAN"

کے نزدیک حضورؐ کی زندگی کا جو نقشہ مکّی دور میں سامنے آتا ہے صرف وہی نبوت و رسالت
طابقت رکھتا ہے جبکہ وہاں سے آپؐ کو ہجرت کرنا پڑی۔ گویا ان کے خیال میں بحیثیتِ
رسول آپؐ ناکام ہو گئے۔ (معاذ اللہ)۔ اس کے برعکس مدنی دَور کا جو نقشہ ان کے
آتا ہے اس میں انہیں آنحضورؐ ایک حکمران، ایک مدبّر، ایک سیاست دان اور ایک
لار کی حیثیت میں نظر آتے ہیں اور اس پہلو سے وہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ کامیابی کی انتہاؤں
سے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کون اندھا ہو گا کہ جس کی نگاہیں آپؐ کی عظمت کے احساس
ل نہ جائیں کہ کامیابی گویا اپنے آخری اور تکمیلی درجے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے قدم چومتے نظر آتی ہے۔ لیکن یہاں مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے یہ گرہ لگا دی کہ یہ کامیابی بحیثیت STATESMAN تھی بحیثیت نبی نہیں تھی۔ اسی مغالطے کو پیدا کرنے کے لیے سر منٹگمری واٹ نے سیرتِ نبویؐ پر جو کتاب لکھی اُسے دو حصّوں میں تقسیم کیا: (۱) 'MOHAMMAD AT MECCA' (۲) 'MOHAMMAD AT MADINA'۔ اور اس طرح اس نے مکّی اور مدنی دور کے ظاہری تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ حضورؐ کی تعریف میں اس نے کہیں بخل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اس نے نبی اکرمؐ کو نسلِ آدم کے عظیم ترین افراد میں شمار کیا ہے۔ آپؐ کے تدبّر، آپؐ کی فراست، آپؐ کی معاملہ فہمی، آپ کی پیش بینی، آپؐ کی دُور اندیشی، ان تمام اعتبارات سے اُس نے آپؐ کی صلاحیتوں کا لوہا مانا ہے اور آپؐ کی تعریف میں وہ آخری حد تک چلا گیا ہے۔ لیکن ہم لوگ بھول جاتے ہیں کہ اِس مٹھاس کے اندر اُس نے بڑے لطیف پیرائے میں ایک زہر بھی شامل کر دیا ہے۔ وہ زہر یہی ہے کہ وہ لوگ یہ تصور دینا چاہتے ہیں کہ آپؐ کی یہ تمام کامیابیاں ایک سیاست دان اور ایک مدبّر کی حیثیت سے تھیں، نبی کی حیثیت سے نہیں تھیں۔ یہ سارا مغالطہ اِسی بنیاد پر ہے کہ ختمِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت کے لازمی اور منطقی تقاضے کو نہیں سمجھا گیا۔ اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ سیرتِ محمدیؐ کے صحیح فہم کے لیے یہ آیۂ کریمہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم

اس تمہید کے بعد اب ذرا اس آیۂ مبارکہ کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے! "هُوَ الَّذِيْٓ" وہی ہے وہ ——— یہاں اشارہ ہے ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف۔ اس لیے کہ سورۃ الصف میں جو آیت اس آیت سے متصلاً قبل وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝" (ترجمہ "یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا۔ خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو"۔ اس پہلو سے جب 'هُوَ' سے اگلی آیت شروع ہوئی تو معیّن ہو گیا کہ اس سے مراد ہے ذاتِ باری تعالیٰ! ——— آگے چلیے! "اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ" (وہی ہے اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو، صلی اللہ علیہ وسلم۔ ظاہر بات

ہے کہ یہ ذکر ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ عربی زبان میں 'اَرْسَلَ، یُرْسِلُ، اِرْسَالاً' کا مفہوم ہے بھیجنا۔ کسی کو ایلچی بنا کر، سفیر بنا کر یا پیغامبر بنا کر بھیجنا۔ یہاں آنحضورؐ کے لیے یہ لفظِ 'رسول' جس شان اور جس کیفیت کے ساتھ آیا ہے اس کے حوالے سے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مختلف انبیاء و رسل کے اسماء کے ساتھ ان کی بعض خصوصی نسبتوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ کے ساتھ 'صفی اللہ' کے الفاظ معروف ہیں اسی طرح حضرت نوحؑ کو نجی اللہ، حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اللہ، حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح اللہ، حضرت موسیٰؑ کو کلیم اللہ اور حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن اس فہرست میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ 'رسول اللہ' ہی کے الفاظ معروف و مشہور ہیں۔ غور کرنے پر یہ حقیقت کھلے گی کہ اگرچہ نوحؑ بھی اللہ کے رسول تھے، موسیٰؑ بھی رسول تھے، عیسیٰؑ بھی اللہ کے رسول تھے لیکن اِس لفظِ 'رسول' کا مصداقِ کامل اور مصداقِ اَتم ہیں محمدٌ رسولُ اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم! ———— رسالت کا ادارہ تکمیل کو پہنچا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ میں۔ گویا آپؐ کا امتیازی لقب یا امتیازی شان ہی یہ ہے کہ آپؐ 'رسول اللہ' ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ سورۃ الفتح میں آپؐ کی اسی نسبت کو نمایاں کیا گیا ہے:

"مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ"۔ اس میں گویا اس حقیقت کی جانب ایک لطیف اشارہ موجود ہے جس کی جانب پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے کہ رسالت اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں!

'الہدیٰ' اور 'دین الحق'

اب آگے بڑھیے۔ "ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ"

حرفِ 'ب' عربی زبان میں کسی چیز کی معیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ مفہوم یہ ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزیں دے کر بھیجا ہے۔ (i) الھُدٰی اور (ii) دینِ حق ———— الھدیٰ سے مراد ہے ہدایتِ کاملہ، وہ کتابِ ہدایت کہ جس نے ہدایت کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر جمع کر لیا ہو، سمیٹ لیا ہو، سمو لیا ہو۔ اس کی تعیین کے ضمن میں اگر قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کیا جائے تو

صاف نظر آجائے گا کہ اس سے مراد خود قرآن ہے۔ اس لیے کہ اسی قرآن کے لیے سورۃ البقرۃ کے بالکل آغاز میں " هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ " کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی کو " هُدًى لِّلنَّاسِ " قرار دیا گیا ہے اور یہی قرآن ہے جس کے بارے میں سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا: " اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ " تو معلوم ہوا کہ الھدیٰ سے مراد ہے قرآن حکیم! ـــــ اب آگے بڑھیے، دوسری چیز جو آپ کو دے کر بھیجا گیا وہ دینِ حق ہے۔ یہاں ' دینِ الحق ' عربی نحو کے اعتبار سے مرکب اضافی کی شکل میں ہے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی ہوں گے ' حق کا دین ' تاہم عربی میں بعض اوقات مرکب توصیفی ' مرکب اضافی کی شکل میں آجاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا ترجمہ ہو گا: حق دین یا سچا دین۔ ویسے ان دونوں صورتوں میں مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اسے اگر حق کا دین قرار دیں تو قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر اللہ کو ' الحق ' کہا گیا ہے۔ " ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ " حق مجسم اور کامل حق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ گویا ' حق کا دین ' کے معنی ہوں گے اللہ کا دین۔ اگر اسے مرکب توصیفی مان کر ' سچا دین ' ترجمہ کیا جائے تو بھی بات وہیں جا پہنچے گی، اس لیے کہ سچا ترین دین تو اللہ ہی کا ہو سکتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ کے دین سے   ہے! لفظ دین پر غور کیجئے۔ یہ لفظ اس سے پہلے ہمارے اسباق میں سورۃ الفاتحہ کے درس میں " مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ " کے ضمن میں زیرِ بحث آچکا ہے۔ اس وقت عرض کر دیا گیا تھا کہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے جزا و سزا اور بدلہ۔ مشہور مصرع ہے۔

؎ دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوا

کہ جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ معاملہ کیا تھا ویسا ہی ہم نے ان سے کر دیا۔ یعنی ہم نے ان کے عمل کا انھیں پورا پورا بدلہ دے دیا ہے۔ اسی طرح ایک معروف کہاوت ہے: " كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ ! " جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ عربی زبان میں دَیْنٌ کہتے ہیں قرض کو، کہ وہ لوٹ کر آتا ہے۔ جس طرح کسی عمل کی جزا لوٹ کر آتی ہے عمل کرنے والے کی طرف، اسی طرح ' دَیْن ' (قرض) دینے والے کو واپس ملتا ہے۔ تو دین کے اصل لغوی معنی بدلے اور جزا و سزا کے ہیں۔ لیکن اس اصل لغوی اساس سے قرآن مجید نے جب اس لفظ کو اٹھا کر اسے اپنی ایک اصطلاح

بنایا تو اس میں ایک اضافی مفہوم شامل ہوگیا۔ چنانچہ قرآنی اصطلاح میں لفظ دین بالعموم قانون، ضابطہ اور شریعت کے معنوں میں آتا ہے اس لیے کہ جزا و سزا کے ساتھ کسی نہ کسی قانون اور ضابطے کا تصور لازم و ملزوم ہے۔ پھر اس میں اضافی مفہوم پیدا ہوا اطاعت کا۔ قرآن حکیم میں متعدد بار " مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ " کے الفاظ آئے ہیں۔ اس لیے کہ کسی قانون یا ضابطے کی اگر اطاعت کی جائے گی تو جزا ملے گی، اور اس کی خلاف ورزی اگر ہوئی تو سزا ملے گی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن مجید نے جب اسے ' دِیْنُ اللّٰہ ' کی مرکب شکل میں ایک گمبھیر اصطلاح کا درجہ دیا تو اس میں جو مفہوم پیدا ہوا اُسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے! کسی ہستی کو مطاع مطلق مان کر اس کے قانون کے تحت جو زندگی بسر کی جائے گی وہ زندگی گویا اُس کے دین کے اندر رہتے ہوئے گزاری جا رہی ہے۔ یہ ہے دین کا گمبھیر، ہمہ گیر اور جامع تصور جسے ایک بہت اہم اصطلاح کی حیثیت سے قرآن مجید نے متعارف کرایا ہے۔

چنانچہ اس تناظر میں غور کیجیے کہ اگر کسی جگہ بادشاہت کا نظام قائم ہے، ایک فرد واحد کو ہی حاکم مطلق (SOVEREIGN) ہونے کی حیثیت حاصل ہے، اُس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ تو یہ گویا کہ ' دِیْنُ الْمَلِكِ ' ہے۔ اس لیے کہ اس نظام میں بادشاہ مطاعِ مطلق ہے۔ یہ لفظ بعینہٖ اسی مفہوم میں سورۂ یوسف میں وارد ہوا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے ایک خاص واقعے کے ضمن میں ' دین الملک ' کے الفاظ آئے ہیں۔ واقعہ لمبا ہے۔ مختصراً یہ کہ حضرت یوسف جب مصر میں ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہو چکے تھے اور اُن کے بھائی قحط کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کے پاس آئے غلہ حاصل کرنے کے لیے، تو انہوں نے اپنے حقیقی بھائی بن یامین کو جسے انہوں نے خاص طور پر فرمائش کر کے بلوایا تھا، اپنے پاس روکنا چاہا لیکن چونکہ انہوں نے خود کو اپنے بھائیوں پر ظاہر نہیں کیا تھا، بھائی اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ ان کا واسطہ جس ' عزیز مصر ' سے

ترجمہ " اطاعت کو اُس (اللہ) ہی کے لیے خالص کرتے ہوئے "۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا

ے وہ اُن کا بھائی یوسف ہے، لہٰذا بن یامین کو اپنے پاس روکنے کا کوئی معقول
بب بظاہر سجھائی نہیں دیتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خاص طریقہ سمجھایا
ایک خصوصی تدبیر کے ذریعے وہ اپنے بھائی کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ سورۃ
سف میں اس پورے واقعے کو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا: "مَا کَانَ لِیَأْخُذَ
اہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ" کہ حضرت یوسف کے لیے اس بادشاہی نظام کے اندر رہتے
ئے جس میں وہ خود ایک اہم عہدے پر فائز تھے، یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی
یامین کو روک سکتے! —— تو یہ بات واضح ہو گئی کہ کسی فردِ واحد کو مختارِ مطلق
مطاعِ مطلق مان کر اس کے تحت جو اجتماعی نظام کسی جگہ پر قائم ہوگا اسے 'دین
ملک' کہا جائے گا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے آپ دورِ جدید کے مقبول ترین
م یعنی نظامِ جمہوریت کو 'دین الجمہور' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نظام
اصل حاکمیت (SOVEREIGNTY) جمہور کی ہے۔ اُن کے نمائندے کثرتِ
ئے سے جس چیز کو چاہیں جائز قرار دے دیں اور جس چیز کو چاہیں ناجائز قرار دے
۔ یہ ایک مکمل نظام ہے، پورا دین ہے، جسے بجا طور پر دینِ جمہور قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر میں غور کیجیے کہ 'دین اللہ' اور 'دینِ حق' کا مفہوم کیا ہوگا! ——
ظام جس میں اللہ ہی کو مطاعِ مطلق تسلیم کیا جائے، حاکمیتِ مطلقہ (SOVEREIGNTY)
ا اسی کے لیے ہو ——

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی، باقی بتانِ آذری!

اصول پر مبنی پورے نظامِ زندگی کا جو مکمل ڈھانچہ استوار ہوگا وہ کہلائے گا
ین اللہ'! —— یہ 'دین اللہ' یا 'دینِ حق' ہے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ
سلم کو دے کر مبعوث فرمایا گیا تھا۔ یہ وہ دوسری چیز ہے جو آپ کو عطا ہوئی تھی۔
میں تازہ کر لیجیے، پہلی چیز جو آپ کو عطا ہوئی وہ ہے 'الھدیٰ' یعنی قرآن
اور دوسری شے جو دے کر آپ مبعوث فرمائے گئے اُسے قرآن نے 'دین الحق'
تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی عدل و قسط پر مبنی ایک مکمل نظامِ اجتماعی، ایک مکمل ضابطہ
ت؛ ایک کامل نظامِ اطاعت جس میں زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں ضابطہ د

قانون موجود ہے۔

یہاں ذہن میں ایک سوال یہ اُٹھ سکتا ہے کہ کیا قرآن میں کامل نظام نہیں ہے؟ قرآن کے بعد حرف "و" واوِ عطف ہے اور واوِ عطف مغائرت کا متقاضی ہے۔ پھر "دین الحق" قرآن سے کوئی جدا شے ہے؟ تو واقعہ یہی ہے کہ صرف قرآن پر مبنی کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں صرف اصول دیے گئے ہیں اور زندگی کے ہر گوشے کے متعلق صرف حدود کو معیّن کر دیا گیا ہے۔ ایک مکمل نظام اگر بنتا ہے تو وہ قرآن پر سنّتِ رسولؐ کے اضافے سے بنتا ہے۔ اُس خاکے کے اندر اگر رنگ بھرا جا سکتا ہے تو وہ سنّتِ رسولؐ کے اضافے سے بھرا جا سکتا ہے۔ ایک مکمل نظام کی تشکیل کتاب اور سنّت دونوں کے مجموعے سے ہو گی۔ یہ بات اس سے پہلے بھی عرض کی گئی ہے کہ ہمارے ہاں پاکستان کی جو بھی کبھی کوئی دستوری دستاویز بنی ہے تو اس میں یہ الفاظ صحیح طور پر شامل ہوئے ہیں:

"NO LEGISLATION WILL BE DONE REPUGNANT TO THE QURAN AND THE SUNNAH!"

قرآن اور سنّت کے اجتماع ہی سے دینِ حق مکمل ہوتا ہے اور ایک پورا نظام تشکیل پاتا ہے۔

نبی اکرمؐ کی بعثت کے لیے وقت کی تعیین!

اب آگے بڑھنے سے پہلے ایک اہم علمی حقیقت کی طرف توجہ مبذول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ اب ذرا ذہن کے سامنے ایک سوالیہ نشان لائیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا وقت معیّن کرنے میں اللہ کی کونسی حکمت تھی! اس کی تفتیش کیجیے تو عجیب حقائق سامنے آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کرۂ ارضی پر نسلِ انسانی کی تاریخ اور تاریخِ نبوت دونوں ساتھ ساتھ چلی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان ہی نہیں پہلے نبی بھی تھے۔ انسانیت اور نبوّت کے یہ دونوں قافلے ساتھ ساتھ چلے ہیں اور دونوں قافلوں نے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ انسان نے بھی ارتقائی مراحل طے کئے ہیں اور نبوت و رسالت میں بھی ایک ارتقاء کا عمل جاری رہا ہے۔ اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے آج سے چودہ سو برس پہلے دو اعتبارات سے عہدِ طفولیت سے قدم نکال کر اپنی جوانی میں قدم رکھا ہے۔ قرآن مجید میں الفاظ آتے ہیں: "حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ" (جب وہ شخص اپنی پوری

رت، اپنی پختگی کو پہنچ گیا) ۔ تو نسل انسانی بحیثیت مجموعی دو اعتبارات سے ایک بلوغ اور پختگی کو پہنچی ہے اُس وقت جبکہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ۔ انسانی ذہن اور اس کے فکر و شعور کے ارتقاء کا ایک عمل مسلسل جاری رہا ہے ۔ اور جس طرح ایک بچے پر عہد طفولیت کے بعد لڑکپن، جوانی اور عقل کی پختگی کے سارے ادوار آتے ہیں اسی طریقے سے نسل انسانی ان تمام مراحل سے گزری ہے ۔ انسان کو کامل اور مکمل ہدایت اوّل روز سے نہیں دی جاسکتی تھی اس لیے نہیں کہ (نعوذ باللہ من ذٰلک) اُس وقت اللہ کے پاس تھی نہیں ۔ اللہ کے پاس تو تھی لیکن انسان ابھی اس قابل نہ تھا کہ اس کو حاصل کر سکتا۔ ذہنی اور فکری اعتبار سے وہ ابھی اس سطح تک نہیں پہنچا تھا کہ اس کو اس ابدی ہدایت نامے کا اہل سمجھا جائے ۔ لہٰذا عبوری دور میں ہدایات دی جاتی رہیں ، کتابیں نازل ہوتی رہیں، صحیفے اترتے رہے، ابتدائی احکام دیئے جاتے رہے، تاآنکہ انسان اپنی عقل اور شعور کی پختگی کو پہنچ گیا ۔ وہ اپنی فکر کی سطح کے اعتبار سے اس کا اہل ہوگیا کہ ابدی ہدایت نامہ اب اُسے دے دیا جائے ۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے ۔

نوعِ انسانی کی ذہنی وفکری بلوغت کا دَور

میں یہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اگرچہ معروف تو کچھ دوسرے اعتبارات سے تھے، علامہ اقبال کی کتابوں کی انہوں نے شرحیں لکھی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں جن لوگوں سے مل سکا ہوں ان میں مجھے اپنے محدود علم کے مطابق فلسفہ، تاریخ فلسفہ، تاریخ مذاہب اور منطق وغیرہ میں مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے کوئی دوسرا شخص ان کی ٹکر کا نہیں ملا ۔ انہوں نے ایک روز برسبیلِ تذکرہ یہ بات کہی کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کے بارہ سو برس بڑے اہم اور بہت PRODUCTIVE ہیں ۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان بارہ سو سالوں کے دوران انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا اور اس کی سوچ اپنی پختگی کو پہنچ چکی ۔ یہ ہیں چھ سو قبل مسیح سے لے کر چھ سو بعد مسیح تک کے بارہ سو برس، جن کے دوران تمام مکتبہ ہائے فکر، تمام مدارسِ فلسفہ اور تمام مذاہب جو بھی پیدا ہونے تھے ہو چکے ۔ اس کے بعد کوئی نیا مذہب اور کوئی نیا فلسفہ وجود میں نہیں آیا۔ اس دَور میں یہ سارے جو نام لیے جاتے ہیں اور بڑی بھاری بھرکم اصطلاحات

ں جو نئے فلسفے مغرب کے سمجھے جاتے ہیں، وہ LOGICAL POSITIVISM
ہو یا EXISTENTIALISM ہو، یہ سب نئے لیبلوں سے نئی بوتلوں میں پرانی
شرابوں کے سوا کچھ نہیں۔ انسان جو کچھ بحیثیت انسان سوچ سکتا تھا وہ چھ سو بعد مسیح تک
سوچ چکا تھا اور اس کی فکر پختہ ہو چکی تھی۔ چشتی صاحب مرحوم سے یہ بات سُن کر میرا
ہن فوراً منتقل ہوا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کا گہرا تعلق ہے بعثت
ری علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسّلام کے لیے زمانے اور وقت کے تعین کے ساتھ
جب انسان سوچ چکا جو کچھ کہ وہ سوچ سکتا تھا۔ سقراط، ارسطو اور افلاطون نے
پنے نظریات دنیا کے سامنے رکھ چکے۔ فلاسفۂ ہند نے عقل کی جو بھی جولانیاں ہو
لتی تھیں وہ دکھالیں۔ فلاسفۂ یونان اور فلاسفۂ چین و ایران انسان کو جو کچھ دے
سکتے تھے، دے چکے۔ تب وہ 'الکتاب' اور 'الھدیٰ' اس دعوے
کے ساتھ نازل ہوئی کہ یہ ہدایت تامّہ ہے، یہ آخری اور مکمل ہدایت ہے جو اب
نسان کو دی جارہی ہے۔ اور آپ غور کیجئے اس سے بڑا گہرا تعلق ہے اس حقیقت
کہ اس کتاب کی حفاظت کا ذمّہ اللہ نے لیا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: اِنَّا نَحْنُ
نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ سوچیے تورات بھی اللہ کی کتاب تھی،
اللہ اس کی حفاظت کا ذمّہ لیتا تو کیا اس میں تحریف ممکن ہوتی؟ بلکہ میں اس کے برعکس
ں کہوں گا کہ اگر قرآن کی حفاظت کا ذمّہ اللہ نے نہ لیا ہوتا تو کیا ہم قرآن مجید کو بخشش دیتے!
امتِ مسلمہ اس میں تحریف نہ کر دیتی؟ کیا معنوی تحریف ہمارے ہاں نہیں ہوئی؟ یہ
فاظتِ خصوصی جو قرآن کو دی گئی اور تورات، زبور اور انجیل کو نہ دی گئی اس کا
سبب ہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ ان کتابوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ کی جناب میں
شکوہ کریں کہ پروردگار یہ ہم سے سوتیلی بیٹیوں والا معاملہ کیوں ہوا؟ ہم بھی تیری کتابیں
یں، ہمیں تو نے تحفّظ کیوں نہ دیا؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ یہ ابھی عبوری دور
ہدایات تھیں جب نسلِ انسانی ابھی عقل اور شعور کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ اس
وری دور کی ہدایات کے لیے حفاظت لازمی نہ تھی۔ ان کو مستقل بنانا اور محفوظ رکھنا
روری نہ تھا۔ یوں سمجھیے کہ ایک ہی کتاب ہے جس کے سابقہ ایڈیشن پہلے دیئے
ئے۔ اور اسی کا کامل اور مکمل آخری ایڈیشن ہے جو محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا۔

اجتماعی شعور کی پختگی

اب آئیے دوسرے مضمون کی طرف۔ " دِیْنِ الْحَقّ " کے الفاظ میں درحقیقت نسلِ انسانی کے ایک اور اعتبار سے بلوغ کو پہنچنے کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اس سے پہلے بھی بعض مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں کہ انسان نے تدریجاً اجتماعیت کا سفر طے کیا ہے۔ کبھی صرف ایک قبیلے کی زندگی تھی، پھر شہری ریاستیں وجود میں آئیں، پھر بڑی بڑی مملکتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں۔ یہ عظیم سلطنتوں کا دور تھا جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اس وقت قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں قائم تھیں جن کے مابین تاریخ کئی سو برس سے جھولا جھول رہی تھی۔ ان سلطنتوں کی لکھوکھا کی تعداد میں STANDING ARMIES تھیں۔ یہ تربیت یافتہ مسلح افواج تھیں۔ یہ وہ دور تھا جبکہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے۔ گویا کہ انسان اجتماعی اعتبار سے بھی اب اس سطح پر آ گیا تھا کہ اس کی ضرورت اب ایک اجتماعی نظام کی تھی۔ صرف انفرادی اخلاقیات اب اس کی ضرورت کی کفالت نہ کر سکتے تھے۔ انفرادی اخلاقیات کے اعتبار سے حضرت مسیح علیہ السلام کہیں پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن اب ضرورت تھی ایک اجتماعی نظام کی، ایک ایسے نظامِ عدل و قسط کی جس میں انسانی زندگی کے جو بھی متصادم (CONFLICTING) تقاضے ہیں ان کو اس طریقے سے سمو دیا جائے کہ ان میں اعتدال بھی ہو اور توازن بھی ہو۔ کوئی تقاضا کسی دوسرے تقاضے کے نیچے دب نہ جائے۔ انفرادیت بھی مجروح نہ ہو اور اجتماعیت کے حقوق بھی محفوظ رہیں۔ مرد کی قوامیت بھی مجروح نہ ہو اور عورت کے حقوق بھی اس طرح پامال نہ ہو جائیں کہ وہ بھیڑ بکری کی طرح صرف ملکیت بن کر رہ جائے۔ اسی طریقے سے زندگی کے اندر جو مختلف پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں اور جو مختلف تنازعات وجود میں آ چکے تھے، انسان کو ان سب کا ایک معتدل اور متوازن حل درکار تھا۔ یہ ہے اس دور کے انسان کی اصل ضرورت! اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ وہ ایک دین لے کر آئے، ایک نظام لے کر آئے۔ وہ نظام اجتماعی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا نظام ہے اور یہ توازن اور اعتدال کی ایک عجیب کیفیت اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہی توازن اور اعتدال ہے جس کی وجہ سے سورۃ الحدید میں اس دینِ حق کو " المیزان "

سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ میزان ہے، یہ تول دینے والی شے ہے، افراد کے حقوق کو معین کرنے والی، عورت اور مرد کے حقوق و اختیارات اور فرائض کو معین کرنے والی اور تول دینے والی۔ یہ فرد اور اجتماعیت کے مابین اور سرمائے اور محنت کے مابین توازن پیدا کرنے والی میزان ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دینِ حق کی شکل میں دے کر بھیجا گیا۔

محترم قارئین

بعض وجوہ کی بنا پر چند ایک خریداری نمبر تبدیل کرنے پڑے ہیں۔ براہِ کرم اپنا نیا خریداری نمبر نوٹ فرما لیجئے گا جو لفافے پر درج ہے۔ زرِ تعاون کے لیے یاددہانی کے باوجود جن حضرات کی طرف سے اطلاع موصول نہیں ہوئی، اُن کے نام پرچہ بدستور جاری رکھنے سے قاصر ہوں گے۔

شکریہ
ناظر سرکولیشن

نجومِ ھدایت

طالب الہاشمی

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عہدِ رسالت کے اواخر کا ذکر ہے کہ ایک دن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثاروں کے درمیان رونق افروز تھے اور کسی مسئلے کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اثنائے گفتگو میں اچانک کچھ صحابہؓ کی آوازیں معمول سے زیادہ بلند ہو گئیں۔ دربارِ رسالت میں صحابہؓ کی یہ بلند آہنگی اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی اور فوراً یہ آیت نازل ہوئی۔

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ"

"اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ نبیؐ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کیا کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔"

اس آیت کے نزول پر صحابہ کرامؓ خوفِ الٰہی سے لرز اٹھے اور انہوں نے عہد کیا کہ حضورؐ کے سامنے اپنی آوازوں کو ہمیشہ پست رکھیں گے۔ حاضرینِ مجلس میں ایک صاحبِ رسولؐ، جن کی آواز بڑی پاٹ دار تھی، اس قدر متأثر ہوئے کہ گھر جا کر کنجِ عزلت میں بیٹھ گئے اور ہر وقت توبہ و استغفار میں مشغول رہنے لگے۔ جب مسلسل چند دن تک حضورؐ نے ان کو مجلس میں نہ دیکھا تو صحابہؓ سے ان کے بارے میں دریافت فرمایا کہ کہیں علیل تو نہیں ہیں۔

سیّد الاوس حضرت سعدؓ بن معاذ نے عرض کیا، "یا رسولؐ اللہ میں ان کی خبر لاتا ہوں"

چنانچہ وہ ان صاحبِ رسولؐ کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ حزن و ملال کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ حضرت سعدؓ نے کہا۔ "آپ چند دن سے مجلسِ نبویؐ میں نظر نہیں آئے۔ آج حضورؐ نے مجھے آپ کا حال دریافت کرنے کے لئے بھیجا ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "خیریت کہاں، بارگاہِ الٰہی سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے اونچی آواز سے بولنے کی ممانعت اور وعید نازل ہو چکی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجلسِ نبویؐ میں آپ سب میں زیادہ میری ہی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ اب یہ غم میری کمر کو توڑے ڈالتا ہے کہ میرا سارا عمل رائیگاں گیا اور میں دوزخی ہو گیا۔"

حضرت سعدؓ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس جا کر ساری بات بتائی تو آپؐ نے فرمایا۔ "وہ دوزخی نہیں بلکہ اہلِ جنت میں سے ہے۔"

یہ صاحبِ رسولؐ، جن کو سرورِ کون و مکاں، فخرِ موجودات، خیر الخلائق، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں جنتی ہونے کی بشارت دی، حضرت ثابتؓ بن قیس انصاری تھے۔

سیدنا ابو محمد ثابتؓ بن قیس انصارِ مدینہ کے خاندانِ خزرج سے تعلق رکھتے تھے سلسلۂ نسب یہ ہے:

ثابتؓ بن قیس بن شماس بن زہیر بن مالک بن امرؤالقیس بن مالک اعز بن ثعلبہ بن کعب بن خزرج بن حارث بن خزرج اکبر۔

علامہ ابن اثیرؒ کے بیان کے مطابق ان کی والدہ قبیلہ طے سے تھیں۔

ہجرت سے قبل بیعتِ عقبۂ ثانیہ یا عقبۂ کبیرہ کے بعد کسی وقت مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان میں فطرۃً خطابت اور تقریر کا ملکہ موجود تھا اور وہ اپنی فصاحت، بلاغت اور قوت تقریر کے لحاظ سے اہل مدینہ میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ آواز بھی بڑی پاٹ دار تھی۔ اسی لئے انصار نے ان کو اپنا خطیب بنایا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی صلاحیتوں کا علم ہوا تو آپؐ نے بھی ان کو اپنا خطیب مقرر فرمایا۔ چنانچہ وہ خطیبِ رسولؐ اللہ کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے "الاصابہ" میں لکھا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو انصارِ مدینہ نے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیئے اور ایسے جوش اور مسرت کے ساتھ آپؐ کا استقبال کیا کہ چشمِ فلک نے اس کی نظیر نہ دیکھی تھی۔ استقبال کرنے والے اصحاب میں حضرت ثابتؓ بن قیس بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر انہوں نے عرض کیا:

"یا نبی اللہ! ہم آپؐ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنی جان اور اولاد کی حفاظت کرتے ہیں۔۔۔ لیکن ہمیں اس کا صلہ کیا ملے گا؟" آپؐ نے فرمایا،

"جنت ـــــ!"

اس پر تمام لوگ پکار اٹھے، "ہم سب راضی ہیں!"

غزوۂ بدر میں حضرت ثابتؓ کی شرکت کے بارے میں اختلاف ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ان کو اصحابِ بدر میں شمار کیا ہے لیکن سیر و مغازی کی بیشتر کتابوں میں انہیں اصحاب بدر میں شامل نہیں کیا گیا ـــــ حضرت ثابتؓ بڑے مخلص صحابی تھے۔

اس لئے بدر میں ان کے شریک نہ ہونے کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔ مثلاً علالت یا مدینہ میں عدم موجودگی وغیرہ۔

اس کے بعد انہوں نے شروع سے اخیر تک تمام غزواتِ نبوؐی میں مجاہدانہ شرکت کی اور ہر معرکے میں بڑی ثابت قدمی سے دادِ شجاعت دی۔

غزوۂ مُرَیسِیع (۵ھ) میں بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی صاحبزادی جویریہ کو حضرت ثابتؓ بن قیس نے اسیر کر لیا۔ انہیں لونڈی بن کر رہنا گوارا نہ ہوا۔ اس لئے حضرت ثابتؓ سے مکاتبت کی درخواست کی۔ انہوں نے ۹ اوقیہ سونے پر مکاتب بننا منظور کر لیا۔ جویریہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ "میں سردارِ قوم حارث بن ابی ضرار کی بیٹی ہوں۔ اللہ نے مجھے اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اس وقت مصیبت میں مبتلا ہوں اور اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہتی ہوں، آپ میری امداد فرمائیے!"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "کیا یہ ٹھیک نہیں ہے کہ تیرے لئے اس سے بھی بہتر سلوک کیا جائے؟"

پوچھا، "وہ کیا؟" ...... ارشاد ہوا "تیرا زرِ کتابت میں ادا کر دوں اور تجھ سے خود نکاح کر لوں۔"

انہوں نے یہ بات بخوشی منظور کر لی۔ اور یوں حضرت جویریہؓ کو اُمّ المومنین بننے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔

عام الوفود ۹ ہجری میں بنو تمیم کا وفد بڑے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ مدینہ آیا۔ یہ ستر یا اسی آدمیوں پر مشتمل تھا اور اس میں قبیلہ کے بڑے بڑے رؤسا، آتش بیان خطیب اور بلند پایہ

اعر شامل تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں مفاخرت اور مقابلت کا جذبہ بہت شدید تھا اور
وصف میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا کرتے تھے۔ بنو تمیم کے دماغوں میں بھی خاندانی فخر و
ور کا نشہ سمایا ہوا تھا۔ انہوں نے آستانۂ نبوی پر جا کر بدویانہ انداز میں بے تحاشا آوازیں دینی
روع کر دیں۔ "محمدؐ باہر آؤ اور ہماری بات سنو۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا
رزِ تخاطب ناگوار تو گزرا لیکن آپؐ سراپا عفو و کرم تھے، باہر نکل کر بڑی خندہ پیشانی سے ملاقات
ائی۔ رئیسِ وفد اقرعؓ بن حابس نے کہا۔ "ہم آپ سے مفاخرت کرنا چاہتے ہیں، اس
کے بعد ہی اسلام کی بات ہو گی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "میں فخاری اور
مربازی کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہوں لیکن اگر تم یہی چاہتے ہو تو اللہ کے فضل سے ہم اس
ے بھی باہر نہیں ہیں۔" بنو تمیم میں ایک شخص عطارد بن حاجب تھے۔ وہ نہایت زبان آور اور
ع البیان خطیب تھے۔ اور ایک دفعہ نوشیروان کے دربار میں اپنے زور خطابت کا مظاہرہ کر
ے کمخواب کا خلعت حاصل کر چکے تھے۔ سب سے پہلے وہ کھڑے ہوئے اور مفاخرہ کا آغاز
ں تقریر سے کیا:

"تعریف اس خدا کی جس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں تاج و تخت کا مالک بنایا، اہلِ مشرق میں ہمیں سب سے زیادہ معزز کیا۔ ہمارے خزانے سونے چاندی سے پُر ہیں۔ جنہیں ہم فیاضی سے خرچ کرتے ہیں۔ لوگوں میں ہمارا مثیل و نظیر نہیں، کیا ہم آدمیوں کے سردار اور ان میں صاحبِ فضل نہیں ہیں۔ اگر کسی اور کو یہ دعویٰ ہو تو وہ سامنے آئے اور ہمارے قول سے اچھا قول اور ہمارے حالات سے اچھے حالات پیش کرے۔ اب مجھ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔"

عطارد اپنی تقریر ختم کر کے بیٹھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابتؓ سے فرمایا۔ "ثابت اٹھو اور اس کا جواب دو۔"

حضرت ثابت نے تعمیلِ ارشاد کی اور عطارد کے جواب میں یہ خطبہ دیا:

"حمد و ستائش اس خدائے عزّ و جلّ کی جس نے زمین اور آسمان پیدا کئے، ان پر اپنا حکم جاری کیا، اپنی کرسی اور اپنے علم کو وسعت دی۔ وہ قادرِ مطلق ہے، جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حکم اور قدرت سے ہوتا ہے۔ اس کی قدرتوں میں سے ایک یہ

ہے کہ اپنی مخلوق میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو سب سے زیادہ شریف النفس ہے، سب سے بڑھ کر راست گو اور سب سے زیادہ بلند اخلاق ہے۔ پھر اس پیغمبر پر ایک کتاب نازل کی اور اپنی خلقت کا اس کو امانت دار بنایا۔ اور وہی ہستی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سارے عالم سے برگزیدہ کیا اور سارے عالم کا خلاصہ بنایا۔ پھر اس نے لوگوں کو حق کی طرف بلایا تو اس کی قوم اور اقربا میں سے پہلے مہاجرین نے اس کی دعوت قبول کی جو نسب میں افضل ہیں۔ ان کے چہرے سب سے زیادہ روشن ہیں اور ان کے اعمال سب سے اچھے ہیں۔ پھر ان کے بعد سارے عرب میں سے ہم گروہِ انصار نے دعوتِ حق پر لبیک کہی۔ لہٰذا ہمارا فخر صرف یہ ہے کہ ہم اللہ کے انصار اور رسول اللہ کے وزیر ہیں۔ اور لوگ جب تک ایمان نہ لائیں اور لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہ نہ کہیں، ہم ان سے لڑتے رہیں گے۔ اور جو کوئی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو ماننے سے انکار کرے گا، ہم اس کے خلاف راہ خدا میں جہاد کریں گے۔ اور جہاد کرنا ہمارے لئے کوئی دشوار کام نہیں ہے۔ بس مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا اور اب میں تمام مؤمنین اور مؤمنات کے لئے بارگاہِ الٰہی میں دعائے مغفرت کرتا ہوں۔"

اس کے بعد شعروشاعری کا مقابلہ ہوا۔ جس میں بنو تمیم کی طرف سے زبرقان بن بدر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت حسانؓ بن ثابت نے حصہ لیا۔ مفاخرہ ختم ہوا تو اقرعؓ بن حابس جو خود بڑے فصیح البیان شاعر اور خطیب تھے اور جن کی اصابتِ رائے کا سارا عرب معترف تھا۔ یہاں تک کہ متحارب قبائل اپنے جھگڑوں میں ان کو حَکَم بنایا کرتے تھے، بے اختیار پکار اٹھے۔

"باپ کی قسم محمدؐ کا خطیب ہمارے خطیب سے افضل اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے۔"

اہلِ وفد نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور سب اسی وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

اسی سال بنو حنیفہ کا ایک بڑا وفد مسیلمہ کذّاب کی سرکردگی میں مدینہ آیا۔ سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلم حضرت ثابتؓ بن قیس کو ساتھ لے کر بہ نفسِ نفیس اہلِ وفد کے پاس تشریف لے

گئے۔ اثنائے گفتگو میں مسیلمہ نے کہا، "اگر آپ اپنے بعد مجھے اپنا جانشین مقرر کر دیں تو
آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نامعقول شرط سن کر غصہ آگیا، آپؐ کے دستِ مبارک
میں ایک چھڑی تھی، اس کو اٹھا کر فرمایا:

"جانشینی تو بڑی چیز ہے، میں تو تمہیں یہ چھڑی دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ اللہ نے تیرے
جو مقدر کر رکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ تیرا انجام مجھے خواب میں دکھا دیا گیا ہے۔ کچھ اور پوچھنا ہ
یہ ثابت موجود ہیں، ان سے پوچھ، میں اب چلتا ہوں۔"

یہ فرما کر آپؐ حضرت ثابتؓ کو مسیلمہ سے نپٹنے کے لئے وہاں چھوڑ کر خود تشریف
سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہ
حضرت سعدؓ بن عبادہ کو خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ خبر مشہور ہوئی تو حضرت ابو بکر صد
اور حضرت عمر فاروقؓ کچھ دوسرے مہاجرین کو ساتھ لے کر انصار کے اجتماع میں پہنچے، دونوں ط
سے اپنے حق میں زور دار تقریریں ہوئیں۔ اس موقع پر حضرت ثابتؓ بن قیس بھی م
تھے۔ انہوں نے انصار کی خلافت کے استحقاق پر ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا، اس میں انصا
خدمات اور قربانیوں کا ذکر کیا اور اس بات پر تعجّب کا اظہار کیا کہ کچھ لوگ انصار کو خلافت
محروم کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انصار کی خدمات کا اعتراف کیا لیکن اس
ساتھ ہی انہوں نے قوی دلائل کے ساتھ قریش کو خلافت کا حق دار ثابت کیا۔ جب ع
المسلمین نے انہیں خلیفہ منتخب کر لیا تو حضرت ثابتؓ بن قیس بھی ان کی بیعت کرنے میں پیچ
رہے اور دل و جان سے صدیق اکبرؓ کے حامیوں اور مدد گاروں میں شامل ہو گئے۔ اسی
میں فتنۂ ارتداد نے سر ابھارا تو حضرت ثابتؓ نے اس کو کچلنے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔
حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مشہور مرتد طلیحہ اسدی کی سرکوبی کے لئے مدینہ سے لشکر ب
حضرت ثابتؓ اس میں شامل ہو گئے۔ سالارِ لشکر حضرت خالدؓ بن ولید تھے اور انصار کی ع
قیادت حضرت ثابتؓ کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں نے مرتدین کو زبردست شکست دی
طلیحہ نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ شام کی طرف راہِ فرار اختیار کی (خدا کی شان
طلیحہ بعد میں اسلام کے زبردست مجاہد بنے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں ا

نے دوبارہ خلوصِ دل سے اسلام قبول کیا اور حج کے لئے مدینہ آئے' وہیں حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس موقع پر امیر المؤمنین نے ان کو ارتداد میں مبتلا ہونے پر ملامت کی تو عرض کی "امیر المؤمنین یہ بھی کفر کے فتنوں میں سے ایک فتنہ تھا' جسے اسلام نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا"۔ طلیحہ کا شمار شجاعانِ عرب میں ہوتا تھا اور انہیں ایک ہزار سواروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ شام کے جہاد میں انہوں نے سرفروشی اور جانبازی کے محیرّ العقول کارنامے انجام دیئے۔)

سنہ ۱۲ھ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف یمامہ کی خونریز جنگ پیش آئی۔ حضرت ثابتؓ اس میں بھی والہانہ جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوئے۔ ایک موقع پر جب مسلمانوں کی صفوں میں رخنہ پڑا اور وہ پیچھے ہٹے تو حضرت ثابتؓ بے قرار ہو گئے اور نہایت حسرت کے ساتھ کہا کہ ہم عہدِ رسالت میں یوں نہیں لڑا کرتے تھے۔ پھر عطرِ حنوط لگایا اور ایک گڑھے میں قدم جما کر دشمن کے مقابلے میں ڈٹ گئے جو مرتدان کی طرف آتا' اسے اپنی تلوار سے ڈھیر کر دیتے۔ آخر دشمنوں نے نرغہ کر کے خطیبِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تلواروں اور برچھیوں کا مینھ برسا دیا اور یوں وہ رتبۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضرت ثابتؓ کے جسم پر نہایت عمدہ زرہ تھی ان کی شہادت کے بعد کسی مسلمان نے اتار لی۔ ایک دوسرے مسلمان نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ثابتؓ ان سے کہہ رہے ہیں' میرے فلاں مسلمان بھائی نے میری زرہ اتار لی ہے آپ خالدؓ بن ولید سے کہیں کہ یہ اس سے واپس لے لیں' مجھ پر اتنا قرض ہے خلیفۃ الرسولؐ یہ زرہ بیچ کر میرا قرض ادا کر دیں اور میرا فلاں غلام آزاد کر دیں۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے یہ زرہ واپس لے لی اور مدینہ پہنچ کر سارا واقعہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے عرض کیا۔ انہوں نے حضرت ثابتؓ کی وصیت کے مطابق زرہ سے ان کا قرض ادا کر دیا غلام بھی آزاد کر دیا۔

حضرت ثابتؓ نے اپنے پیچھے چار لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی' ان سے چند احادیث مروی ہیں جن کو ان کے صاحب زادے محمد اور صاحب زادی کے علاوہ حضرت انسؓ بن مالک اور عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ثابتؓ بن قیس کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کے صحیفۂ اخلاق نمایاں ابواب احترامِ رسولؐ، خشیتِ الٰہی اور شوقِ جہاد تھے۔ ان کے احترامِ رسولؐ اور خشیۂ الٰہی کا ایک واقعہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ علامہ حاکمؒ اور امام ذہبیؒ نے ان کے صاحب زاد محمد بن ثابتؓ سے اور علامہ طبرانیؒ نے ان کی صاحب زادی سے اسی قسم کا ایک اور واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب سورۂ لقمان کی یہ آیت نازل ہوئی:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ○

کہ "بیشک اللہ تعالٰی کسی تکبر کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے"۔

تو حضرت ثابتؓ ہیبتِ الٰہی سے لرزہ براندام ہو گئے اور گھر میں بیٹھ کر رونا شروع کر دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی بھیج کر بلا بھیجا اور پوچھا "کیا بات ہے؟" انہوا نے عرض کیا "یارسول اللہؐ! میں زینت جمال اور اپنی تعریف پسند کرتا ہوں، مجھے ڈر ہے اس آیت کی رو سے میں تباہ نہ ہو جاؤں"۔

آپؐ نے فرمایا "اے ثابتؓ کیا تم اس بات سے راضی نہیں کہ تم اس طرح بھلائی کی زندگی گزارو کہ تمہاری تعریف کی جائے اور شہادت کی موت پا کر تم جنت میں داخل ہو؟"

عرض کیا "یارسول اللہ! یہ باتیں تو مجھے پسند ہیں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ثابتؓ سے بہت محبت تھی اور آپؐ ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ ابی عبیدؒ نے کتاب الاموال میں لکھا ہے غزوۂ بنی قریظہ میں جو یہودی قیدی بنائے گئے ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قیدیوں کی جاں بخشی فرمائی۔ ان میں سے ایک زبیر بن باطا تھا۔ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض حضرت ثابتؓ بن قیس کی خاطر چھوڑا کیونکہ اس نے زمانۂ جاہلیت میں جنگِ بعاث کے موقع پر حضرت ثابتؓ کو پناہ دی تھی۔ آپؐ نے زبیر کے احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لئے اسے حضرت ثابتؓ کے سپرد کر دیا

حافظ ابنِ حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ثابتؓ علیل ہو گئے اور چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور ان الفاظ میں ان کی شفایابی کے لئے دعا کی:

"اذھب الباس رب الناس عن ثابت بن قیس بن شماس"

ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

گناہوں کی حقیقت اور اثرات

زیرِ طبع کتاب کی قسط اوّل

انسان خواہ کتنا ہی بڑا اور خوبیوں والا ہو غلطی، لغزش اور ٹھوکر سے نہیں بچ سکتا۔ معصوم بس وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی آغوشِ رحمت میں پناہ دے دے، اور وہ ہے انبیاء و رُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی۔ ان محترم و معظّم شخصیّتوں کے بعد ہر انسان بہر حال ایک انسان ہے — خطا، غلطی اور لغزش کا پتلا۔ اس حقیقت کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَنَسِيَ آدَمُ فَاَكَلَ مِنَ الشَّجَرَةِ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهُ وَخَطِئَ فَخَطِئَتْ ذُرِّيَّتُهُ۔[1]

"حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے اور (ممنوعہ) درخت سے کھا بیٹھے —— تو اُن کی اولاد بھی بھول گئی۔ جناب آدم سے خطا ہوئی، تو —— اُن کی اولاد نے بھی خطا کی۔"

مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ انسان جان بوجھ کر غلطی کرے اور غلطی پر غلطی کرتا جائے۔ بلکہ جس شخص کو اپنی آخرت عزیز ہو اور وہ حصولِ جنّت کے لیے واقعی سنجیدہ ہو اسے اپنی استطاعت بھر برائیوں سے اور بالخصوص کبائر سے دُور اور بہت دُور رہنا ہوگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ فرائض کی پابندی کرنی ہوگی۔ اس کے بعد یہ توقّع رکھی جاسکتی ہے کہ اللہ ربّ العالمین اپنے خصوصی فضل وکرم سے اس کی لغزشوں اور معمولی خطاؤں کو نہ صرف معاف فرمادیں گے، بلکہ اپنی بے پایاں رحمت کے دروازے

---

[1] سنن الترمذی۔ کتاب التفسیر، باب تفسیر سورت الاعراف۔ امام ترمذی نے حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔ المستدرک للحاکم کتاب التفسیر باب اعطاء آدم اربعین سنۃ من عمرہ لداوٗد علیہ السلام ۲/۳۲۵۔ امام حاکمؒ اور امام ذہبی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ محدث العصر شیخ الالبانی نے بھی اس حکم کی تائید کی ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح الجامع ۵۲۰۸۔

بھی اس کے لیے ہمیشہ کھلے رکھیں گے۔ اور جنت کا راستہ اس کے لیے آسان کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا[1]

"اگر تم اُن بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے۔ اور تم کو عزت کی جگہ میں داخل کریں گے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَآئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ[2]

"(اللہ کی نعمتوں کے مستحق صرف وہ اہل ایمان ہیں) جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں۔"

ایک جگہ ارشاد ربّانی اس طرح ہے:

وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۝ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۚ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۚ[3]

"(تاکہ اللہ) اُن لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویّہ اختیار کیا، جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں، اِلّا یہ کہ (معمولی قسم کے) کچھ قصور اُن سے سرزد ہو جائیں۔ بلاشبہ تیرے رب کا دامن مغفرت بہت وسیع ہے۔"

سنّتِ مطہّرہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کبائر (بڑے بڑے گناہ) دخول

---

[1] سورت النساء، آیت ۳۱

[2] سورت الشوریٰ، آیت ۳۷

[3] سورت النجم، آیت ۳۱-۳۲

جنت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ جَاءَ يَعْبُدُ اللهَ وَلَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَيُقِيمُ الصَّلَاةَ وَيُؤْتِي الزَّكَاةَ وَيَجْتَنِبُ الْكَبَائِرَ كَانَ لَهُ الْجَنَّةَ۔[۱]

"جو آدمی (روزِ قیامت) اس حال میں پیش ہو کہ وہ اللہ کی عبادت کرتا رہا، شرک نہیں کیا، نماز قائم رکھی، زکوٰۃ ادا کی، اور بڑے بڑے گناہوں سے بچتا رہا، اس کے لیے جنت پکی ہو گئی۔"

کبائر کی نحوست انسان کی ہر نیکی کو غارت اور بے فائدہ بنا دیتی ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا مِنِ امْرِئٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهُ صَلَاةٌ مَكْتُوبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوءَهَا وَخُشُوعَهَا وَرُكُوعَهَا إِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوبِ مَا لَمْ يَأْتِ كَبِيرَةً وَذٰلِكَ الدَّهْرَ كُلَّهُ۔[۲]

"جو مسلمان فرض نماز کا وقت پالے، پھر وہ عمدہ طریقے سے وضو کرے، خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرے، اور سکون واطمینان سے رکوع (وسجود) کرے، تو یہ نماز اس کے سارے سابقہ (چھوٹے) گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ کبائر سے بچا رہے۔ اور یہ سہولت اسے ہمیشہ حاصل رہتی ہے۔"

دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ مَا بَيْنَهُنَّ إِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ۔[۳]

---

۱ سنن النسائی۔ کتاب تحریم الدم۔ باب ذکر الکبائر۔ سند حسن ہے۔

۲ صحیح مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب فضل الوضوء والصلاۃ عقبہ۔

۳ صحیح مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب فضل الوضوء والصلاۃ عقبہ۔

"پانچوں نمازیں، جمعہ سے لے کر جمعہ تک، رمضان سے لے کر رمضان تک اپنے درمیانی وقفوں کے (صغائر) کے لیے کفارہ ہیں، بشرطیکہ کبائر سے پرہیز کیا جائے۔"

بات سمجھانے کے لیے صرف تین حدیثیں ذکر کر دی ہیں، ورنہ اسی مفہوم سے ملتی جلتی مختلف اعمال کے حوالے سے متعدد احادیث موجود ہیں، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کبائر کا ارتکاب انسان کو کسی ایک اضافی فوائد سے محروم کر دیتا ہے۔ آخرت کی جواب دہی اس پر مستزاد ہے۔ کبائر کا معاملہ جب اس قدر سنگین اور دُور رس نتائج رکھتا ہے، تو ہر صاحبِ ایمان کو تفصیل اور دلیل سے علم ہونا چاہیے کہ:

(۱) گناہِ کبیرہ کیا ہے؟
(۲) ارتکابِ گناہ کے اسباب کیا ہیں؟
(۳) انسان کے دل پر گناہوں کے کیا اثرات مترتّب ہوتے ہیں؟
(۴) انسانی زندگی پر ان گناہوں کے کیا اثرات مترتّب ہوتے ہیں؟
(۵) اگر گناہ سرزد ہو جائے تو دنیوی پریشانی اور اُخروی حساب سے کس طرح بچا جا سکتا ہے؟
(۶) کونسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں کہ انسان آئندہ گناہوں سے بڑی حد تک محفوظ رہ سکے؟

آئیے ان تمام سوالوں کا جواب آئندہ صفحات میں دیکھتے ہیں:

یہ جلسہ شہر لاہور میں
تنظیمِ اسلامی کے تعارف کا مؤثر ذریعہ
ثابت ہُوا

جلسے کی تیاریوں کی تفصیلات پر مشتمل ایک جامع رپورٹ

تنظیم اسلامی پاکستان کے چودھویں سالانہ اجتماع منعقدہ لاہور کے موقع پر امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے اختتامی خطاب میں اس بات پر اللہ کا دل کی گہرائیوں سے شکر اور اپنے قلبی اطمینان کا اظہار فرمایا تھا کہ اب کسی درجے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تنظیم اسلامی نے ایک چلتے ہوئے قافلے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ مزید برآں امیر محترم نے اسی موقع پر یہ بھی فرمایا تھا کہ آئندہ سال تنظیم اسلامی کے لئے توسیعِ دعوت کا سال یعنی Launching Year ہوگا۔ انشاء اللہ

مرکزی مجلس شوریٰ کے ماہ جون ۹۰ء میں منعقد ہونے والے اجلاس میں پورے پاکستان میں آٹھ بڑے جلسوں کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ سب سے پہلا جلسہ لاہور میں ۳۱ اگست ۹۰ء کو منعقد کرنا طے پایا تھا لیکن بعض اسباب کی بنا پر اسے قدرے مؤخر کرنا پڑا اور ۱۴ اکتوبر کی تاریخ جلسے کے لئے معین کردی گئی۔ جگہ کی تعیین کا معاملہ لاہور کی تنظیم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ۱۴ ستمبر ۹۰ء کو لاہور کے نقبار اعلیٰ کے اجلاس میں اس بارے میں حتمی فیصلہ کیا گیا اور باغ بیرون موچی دروازہ میں جلسۂ عام کا انعقاد طے پا گیا۔

اس جلسہ کی تیاریوں کے سلسلے میں چیدہ چیدہ رفقاء کی Meetings تقریباً ایک ماہ قبل ہی شروع ہو گئی تھیں۔ تنظیم اسلامی لاہور کے امیر محترم مرزا ایوب بیگ صاحب نے محترم غازی محمد وقاص صاحب کو ناظمِ جلسہ مقرر فرمایا تھا جبکہ عمران چشتی صاحب اور راقم الحروف کو وقاص صاحب کے نائبین کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ہم تینوں رفقاء تقریباً ہر روز تنظیم اسلامی لاہور کے دفتر ۴۔اے مزنگ روڈ لاہور میں عصر کی نماز کے فوراً بعد اکٹھے ہوتے تھے اور عشاء کی نماز کے بعد بھی حسب ضرورت ایک دو گھنٹے مزید ٹھہرتے تھے۔ ہم مختلف امور پر تبادلہ خیال کرتے اور پھر ان امور کو امیرِ لاہور کے سامنے رکھتے تھے۔ اس طرح مختلف امور امیرِ لاہور کی ہدایات کے مطابق final

ہوتے تھے ۔ پھر وقاص صاحب ان طے شدہ امور پر عمل در آمد کے لئے مناسب لائحہ عمل تیار کرتے اور ہم مل جل کر ان امور کو سرانجام دینے کی تگ و دو کرتے تھے۔ یوں امیرِ لاہور' ناظمِ جلسہ اور ان کے دو نائبین کی ایک چھوٹی سی جماعت بن گئی تھی جس میں شامل افراد کا آپس میں بہت ہی قریبی رابطہ تھا۔ جلسے کے جملہ انتظامی امور کا سارا بوجھ آخر وقت تک انہی چند افراد کے کاندھوں پر رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ کام کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ اگر اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہوتی تو یہ مشکل مرحلہ ہرگز بحسن و خوبی طے نہ پاتا۔

جلسے کی تشہیر اور تنظیم اسلامی کی دعوت کو عام کرنے کے لئے درج ذیل پروگرام ترتیب دیئے گئے تھے۔

۱۔ پوسٹرز' دیواروں پر چاکنگ' بینرز' اسٹیکرز اور ہینڈ بل کے ذریعے تشہیر!

۲۔ شہر لاہور میں معروف و مصروف چوکوں اور جمعۃ المبارک کے روز مختلف جامع مساجد کے باہر سٹال لگا کر تنظیم اسلامی کی دعوت پر مبنی کتب فروخت کرنا اور جلسے کے ہینڈ بل تقسیم کرنا۔ نیز پبلک ایڈریس سسٹم کے ذریعہ جلسہ کا اعلان کرنا۔

۳۔ گاڑیوں پر جلسہ عام کے اعلانات کرنا۔

۴۔ ٹی بورڈ مہموں کے ذریعہ تنظیم کی دعوت عام کرنا اور جلسہ کی تشہیر کرنا۔

۵۔ ذاتی رابطوں کے ذریعے جلسے کی تشہیر کرنا۔

۱۔ پوسٹرز' بینرز اور چاکنگ وغیرہ

تشہیری مہم کے اس شعبے کا ناظم محترم عمران چشتی صاحب کو بنایا گیا تھا۔ امیر لاہور کے مشورہ سے اس مرتبہ پوسٹرز کو دو مرحلوں میں لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پہلے مرحلے میں قریباً تین ہزار پوسٹر پورے لاہور میں لگائے گئے جس میں صرف یہ اطلاع دی گئی تھی کہ امیرِ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۳ر اکتوبر ۹۰ء کو باغ بیرون موچی دروازہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب فرمائیں گے۔ اس پوسٹر میں خطاب کا عنوان مذکور نہ تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ پوسٹر جلسہ سے پندرہ دن قبل دیواروں پر چسپاں کیا گیا' جبکہ دوسرا پوسٹر جس میں امیر تنظیم کے خطاب کا عنوان بھی مذکور تھا جلسہ سے ایک ہفتہ قبل لگایا گیا۔ برادرم عمران صاحب نے یہ دونوں پوسٹر خوش اسلوبی کے ساتھ رفقاء سے لگوائے اور رفقاء کرام نے بھی اس کام میں بھرپور تعاون کیا۔ جلسہ کے تعارف کے ...

موزوں مقامات پر لگوائے۔

اس مرتبہ جلسہ کی تشہیر کے لئے road-cross بینرز کی بجائے دیواروں پر چاکنگ کروانے کا پروگرام بنایا گیا۔ تشہیر کا یہ طریقہ بینرز کے مقابلے میں دیرپا بھی ہوتا ہے اور نسبتاً کم خرچ بھی۔ اس کام کے لئے لاہور میں ایک سو جگہوں کا تعین کیا گیا۔

جلسۂ عام کی اطلاع پر مشتمل آٹھ ہزار خوبصورت اسٹیکرز بھی چھپوائے گئے تھے جو کہ رفقاء نے اپنی گاڑیوں کے علاوہ ویگنوں اور رکشاؤں کے پیچھے ان کے ڈرائیور حضرات سے اجازت لے کر لگائے۔ ان اسٹیکرز نے چلتے پھرتے اشتہارات کا کام دیا۔ مزید برآں اسی موضوع پر ایک ہینڈ بل بھی بڑی تعداد میں چھپوایا گیا جو مختلف مواقع پر تقسیم کیا گیا۔

۲۔ کتابوں کے اسٹالز

اس مہم کا ناظم راقم کو مقرر کیا گیا تھا۔ ۲۰ر ستمبر ۹۰ء کو تاج پورہ گراؤنڈ (مغل پورہ) میں تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماعِ لاہور کے موقع پر جمعرات اور جمعۃ المبارک دو دن تنظیم اسلامی کا اسٹال لگایا گیا۔ اسٹال پر تنظیم کی تمام کتب اور کیسٹ رکھی گئی تھیں اور وقتاً فوقتاً ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ امیر محترم کے کسی درس قرآن یا خطاب کی کیسٹ تبلیغی بھائیوں کو سنوائی جاتی تھی۔ اس اجتماع کے موقع پر امیر تنظیم کے خطاب پر مشتمل ایک اہم کتابچہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ مزید برآں تنظیم کے دیگر تعارفی پمفلٹ بھی تقسیم کئے گئے۔ اس اسٹال کے لگانے میں اسرہ ملتان روڈ نے خصوصی تعاون کیا جبکہ رفیق محترم حافظ محمد اشرف صاحب کا تعاون بھی ہمیں حاصل رہا جن کی جائے رہائش اجتماع گاہ کے قریب ہی واقع ہے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

۲۸ر ستمبر ۹۰ء کو تقریباً پینتیس چالیس مساجد میں جمعۃ المبارک کی نماز کے بعد جلسے کی اطلاع پر مشتمل ایک ہینڈ بل بڑی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ ۲۸ر ستمبر ہی کو راقم کے زیر انتظام دس جامع مساجد کے باہر نماز جمعۃ المبارک کے موقع پر اسٹال لگائے گئے۔ ان اسٹالوں پر تنظیم اسلامی کی کتب رکھی گئیں اور جلسہ کا ہینڈ بل تقسیم کیا گیا۔ یہ دس مساجد درج ذیل تھیں۔

۱۔ جامع مسجد شہداء
۲۔ جامع مسجد نکی (انار کلی)
۳۔ جامع مسجد اشرفیہ نیلا گنبد
۴۔ جامع مسجد اشرفیہ فیروز پور روڈ
۵۔ جامع مسجد داتا دربار
۶۔ جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ
۷۔ جامع مسجد وزیر خان
۸۔ جامع مسجد قلعہ گوجر سنگھ
۹۔ جامع مسجد قرآن اکیڈمی (ماڈل ٹاؤن)
۱۰۔ جامع مسجد دارالسلام

مئو خر الذکر دونوں مساجد میں اسٹال روٹین کے مطابق لگے۔ ۹ ستمبر تا ۱۴ اکتوبر لاہور میں درج ذیل سولہ جگہوں پر سٹال لگائے گئے: موچی دروازہ' بھاٹی دروازہ' لکشمی چوک' اے جی آفس چوک' ریگل چوک (نزد مسجد شہداء)' چوک قرطبہ' چوبرجی چوک' چوک ناخدا' ضلع کچہری چوک' آزادی چوک (نزد مینار پاکستان)' اسٹیشن' چیرنگ کراس' سیکرٹریٹ چوک وغیرہ۔

مقامات کی تعیین کے سلسلے میں راقم نے پورے لاہور کا دو مرتبہ اپنی موٹر بائیک پر سروے کیا اور مندرجہ بالا جگہوں کا تعین درج ذیل امور کو سامنے رکھ کر کیا۔

۱۔ ان میں سے تقریباً ہر جگہ سارا دن بہت مصروف رہتی تھی۔

۲۔ ہر مقام پر اسٹال لگانے کی جگہ موجود تھی۔

۳۔ اسٹال کے لئے ایک عدد ٹینٹ بھی اس طرح لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اسٹال ہر طرف سے واضح نظر آئے لیکن ٹریفک میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالے۔

۴۔ ہر مقام پر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان کرنے کے لئے بجلی کا کنکشن کسی نزدیکی جگہ سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔

ہر روز لاہور میں چار جگہوں پر یہ اسٹال لگتے تھے۔ چاروں مقامات پر ٹینٹ لگوانے اور سمیٹنے کی ذمہ داری رفیق تنظیم محمد احمد صاحب کے سپرد تھی۔ رفقاء صبح نو بجے تا بعد نماز مغرب شفٹوں میں ان اسٹالوں پر حاضر رہتے تھے۔ رفقاء کرام یہاں تنظیم کی دعوت پر مشتمل کتابیں رعایتی قیمتوں پر فروخت کرتے اور دیگر پمفلٹوں کے علاوہ جلسہ کا ہینڈ بل بھی تقسیم کرتے تھے۔ ساتھ ساتھ پبلک ایڈریس سسٹم پر جلسہ عام کا وقفوں وقفوں سے اعلان بھی جاری رہتا۔ ویگنوں اور رکشاؤں کے پیچھے اسٹیکرز اکثر و بیشتر انہی اسٹالوں پر موجود رفقاء نے لگائے۔

۳۔ گاڑیوں پر اعلانات

اس شعبے کا ناظم دلشاد عازم صاحب کو بنایا گیا تھا۔ یکم اکتوبر تا ۱۴ اکتوبر صبح نو بجے تا رات نو بجے تین عدد سوزوکی پک اپ گاڑیوں پر رفقاء باری باری اعلانات کرتے رہے۔ یہ گاڑیاں اعلانات کرنے کے ساتھ ساتھ سامان اور رفقاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا کام بھی کرتی رہیں۔ اندرون شہر کی گلیوں میں گاڑی سہولت سے نہیں جا سکتی تھی لہٰذا اسرو لوہاری گیٹ کے طاہر اقبال صاحب اور حافظ عرفان صاحب موٹر سائیکل پر پبلک ایڈریس سسٹم فٹ کر کے اعلانات کرتے رہے۔

۴۔ ٹی بورڈ مہمیں

ٹی بورڈ مہم کے ناظم غازی محمد وقاص صاحب بنائے گئے تھے۔ آپ نے رفقاء سے مشورے کے بعد ٹی بورڈ مہم کے روٹوں کو متعین کیا۔ ہر اُس رفیق تک جس نے کہ ٹی بورڈ مہم میں شرکت کرنا تھی' یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ اس نے کس دن اور تاریخ کو کتنے بجے کہاں پہنچنا ہے اور یہ کہ اس کا رُوٹ کیا ہوگا۔

ٹی بورڈ مہمیں دو دن یعنی یکم اکتوبر اور دو اکتوبر ۹۰ء کو نکالی گئیں۔ اس کام کے لئے لاہور کو چار حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یکم اکتوبر کو چاروں حلقہ جات کے رفقاء کو ساڑھے تین بجے اپنی اپنی مقرر کردہ جگہوں یعنی اسٹیشن' چوک ناخدا' موچی دروازہ اور بھاٹی دروازہ پر پہنچنا تھا۔ یہاں سے رفقاء ٹی بورڈ اٹھا کر اور جلسہ کی اطلاع کا ہینڈ بل تقسیم کرتے ہوئے مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے نماز مغرب کے وقت موچی دروازہ پہنچے۔ اسی طرح دوسرے دن دو اکتوبر کو رفقاء ٹی وی اسٹیشن' پرانی انار کلی' مستی گیٹ اور مسجد شہداء سے مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے موچی دروازہ پہنچے۔ ٹی بورڈز پر جلسہ کی اطلاع کا اشتہار اور تنظیم کی دعوت سے متعلق مختلف عبارات چسپاں کی گئی تھیں۔

۵۔ ذاتی رابطے

امیر تنظیم لاہور محترم مرزا ایوب بیگ صاحب نے جلسہ عام کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ رفقاء نہ صرف جلسہ عام کی تشہیری مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں بلکہ ساتھ ہی اپنے قریبی احباب' عزیز و اقارب اور دوستوں کو ذاتی رابطوں کے ذریعہ جلسہ عام میں شرکت کی دعوت بھی دیں۔ ۴ اکتوبر کو جلسہ گاہ کی تیاری اور دیگر انتظامات کا ذمہ لاہور کے پچیس' تیس فعال رفقاء کے سپرد کیا گیا تھا جبکہ لاہور کے بقیہ تمام رفقاء سے یہ کہا گیا تھا کہ وہ جلسہ گاہ میں نماز عشاء کے بعد تشریف لائیں۔ اور اپنے حلقۂ احباب میں سے تنظیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ساتھ لے کر آئیں۔

جلسہ کے پوسٹر و بینر لگانا' اسٹالوں پر کھڑے ہو کر کتابیں بیچنا' ہینڈ بل تقسیم کرنا اور جلسہ کا اعلان کرنا' گاڑیوں پر ان کے مالکان کی اجازت سے اسٹیکر لگانا' گاڑیوں پر اعلانات کرنا' ٹی بورڈ مہم میں شرکت کرنا' ذاتی رابطوں کے ذریعے احباب کو جلسہ میں شرکت پر مائل کرنا' ان تمام امور کے باعث نہ صرف رفقاء مزید متحرک ہوئے بلکہ الحمد للہ دعوت کے سلسلے میں ان کے اندر خود اعتمادی میں بھی کسی قدر اضافہ ہوا۔ مزید برآں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ شہر لاہور میں وسیع پیمانے پر تنظیم اسلامی

تعارف ہو گیا۔ یوں خدا خدا کر کے رات دن ایک کرتے ہوئے جلسۂ عام کا دن آن پہنچا۔
۱۴ اکتوبر کو صبح نو بجے رفقاء تنظیم جلسہ گاہ میں انتظامات کے سلسلے میں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ دو ہزار کرسیاں رفقاء نے خود لگائیں۔ جلسہ گاہ کے دونوں اطراف قرآن کی دعوت اور تنظیم اسلامی کے تعارف پر مبنی بینرز لگائے گئے' جن کی عبارات کو احباب نے بہت پسند کیا۔ اسٹیج کے ساتھ بنے ہوئے ۴۵ فٹ بلند اور ۲۵ فٹ چوڑے لوہے کے فریم کو کور کرنے کے لئے تقریباً اتنی ہی لمبائی کا بینر بنوایا گیا تھا جسے رفقاء نے خود ہی آویزاں کیا۔ اس بینر پر سب سے اوپر تنظیم اسلامی کا مونوگرام بنا ہوا تھا' اس کے نیچے تنظیم کی اساسی دعوت 'تجدیدِ ایمان۔ توبہ۔ تجدید عہد' جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اور اس سے نیچے عرشی بھوپالی کی نظم کے درج ذیل مصرعے بھی درج تھے۔

ساتھیو ! مشعلوں کو تیز کرو !
جنگ بازوں کا ملک گیروں کا
موت کے سرپھرے نقیبوں کا
قافلہ تیز گام ہے کتنا !
اور بھی قافلوں کو تیز کرو !

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنی شان کریمی کے طفیل تنظیم کے رفقاء کو مزید فعال کرے اور ہم سے اپنے دین کی خدمت کا کام لے۔ آمین۔ اس بینر کو رفقاو احباب کے علاوہ امیر محترم نے بھی بہت پسند فرمایا۔

جلسہ گاہ میں بجلی' روشنی اور ایڈریس سسٹم وغیرہ کا انتظام اسرہ سمن آباد کے رفیق محترم سرور بیگ صاحب کے ذمہ تھا۔ انہوں نے تنہا اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھایا اور یہ سب انتظامات کروائے۔
جلسہ گاہ سے باہر مین سڑک پر تنظیم اسلامی کا سٹال بھی لگایا گیا تھا جہاں تنظیم اسلامی کا تمام لٹریچر' کتب و کیسٹ کے علاوہ میثاق و حکمت قرآن اور ندا کے تازہ پرچے دستیاب تھے۔
بحمد اللہ جلسہ گاہ کے تمام انتظامات جلسہ کی کارروائی شروع ہونے سے قبل ہی مکمل ہو چکے تھے اور جلسہ کی کارروائی کا آغاز مقررہ وقت پر بعد نمازِ عشاء رات سوا آٹھ بجے کر دیا گیا تھا۔ فیصل آباد تنظیم کے امیر' محترم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے تلاوت قرآن حکیم مع ترجمہ و تشریح کے ذریعے جلسہ کی کارروائی کا آغاز کیا۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض بھی آپ ہی نے سرانجام دیئے۔ پھر آپ نے امیر تنظیم اسلامی لاہور محترم مرزا ایوب بیگ صاحب سے اسٹیج پر اپنی مخصوص نشست سنبھالنے اور جلسے کی صدارت کرنے کی درخواست کی۔ اس کے علاوہ ناظم تنظیم اسلامی پاکستان محترم ڈاکٹر

عبدالخالق صاحب، تنظیم اسلامی کے نائب امیر محترم قمر سعید صاحب، ناظم تنظیم اسلامی لاہور محترم غازی محمد وقاص صاحب ناظم مرکزی بیت المال محترم چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب، معتمد عمومی تنظیم اسلامی پاکستان محترم چوہدری غلام محمد صاحب اور مرکزی مجلس مشاورت کے ارکان کو اسٹیج پر اپنی مخصوص کردہ نشستیں سنبھالنے کی گزارش بھی کی۔

اس کے بعد ناظم مرکزی بیت المال محترم چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ آپ نے اپنے مخصوص عوامی لہجے لیکن علمی انداز میں فرائض دینی کے جامع تصور کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ بٹر صاحب کے خطاب کے دوران ہی امیر محترم اپنے مخصوص باوقار لیکن متین انداز میں جچے تلے قدموں چلتے ہوئے خاموشی سے اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنی نشست پر رونق افروز ہوئے۔ بٹر صاحب کے خطاب کے بعد رفیق محترم شکیل احمد صاحب نے اقبال کی ایک نظم "خودی کا سرِ نہاں لاالٰہ الّا اللہ" مترنم انداز میں سنائی۔ بعد ازاں محترم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے امیر محترم کو دعوتِ خطاب دی۔ امیر محترم نے "نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کا مصطفویؐ طریق" کے موضوع پر خطاب فرمایا جو کہ اڑھائی گھنٹے تک جاری رہا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جلسہ گاہ میں کم و بیش ڈھائی ہزار افراد موجود تھے۔ دوران خطاب شرکاءِ جلسہ ہمہ تن گوش رہے۔ (اس مکمل خطاب کا خلاصہ ہفت روزہ "ندا" کی ۲۳/ اکتوبر ۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے) خطاب کے اختتام پر حاضرین کا شکریہ ادا کیا گیا کہ وہ دور دراز سے تشریف لائے اور جم کر خطاب سنا۔ نیز شرکاء کو دعوت دی گئی کہ وہ اگلے دن یعنی ۵/ اکتوبر بروز جمعۃ المبارک بعد نماز مغرب تنظیم اسلامی لاہور کے دفتر ۴۔ اے مزنگ لاہور میں سوال جواب کی نشست میں تشریف لا کر سوال کر سکتے ہیں۔ شرکاء میں اسلام کا انقلابی منشور اور تنظیم اسلامی کے تعارف پر مبنی پمفلٹ اور سوال کرنے کے لئے ایک ورق بھی تقسیم کیا گیا۔ یوں نصف شب کے قریب یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد رفقاء تنظیم سامان کو سمیٹنے میں لگ گئے۔ تمام سامان سمیٹتے سمیٹتے رات کے ساڑھے بارہ بج گئے۔

گھر واپس آتے ہوئے دل مطمئن تھا کہ ہم جو کچھ کر سکتے تھے، اللہ کی توفیق سے وہ کوشش ہم نے کی ہے، اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکل رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان حقیر سی کوششوں کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین۔

اگلے دن بعد نماز مغرب دفتر تنظیم اسلامی لاہور میں حسب پروگرام سوال جواب کی نشست ہوئی۔ اچھی خاصی تعداد میں شرکاء شاملِ محفل تھے۔ امیر محترم نے شرکاء کے سوالات کے تشفی بخش جوابات دیئے۔ ربّنا تقبّل منّا انّک انت السّمیع العلیم (مرتب: محمد راشد)

"تنظیم اسلامی" کا یہ جلسہ "وکھری ٹائپ" کا تھا'

جلسے کے بارے میں ہفت روزہ "زندگی" کی رپورٹ

تنظیم اسلامی کا یہ پہلا جلسہ تھا جو عوامی سطح پر منعقد ہو رہا تھا۔ لاہور کے ہائیڈ پارک بیرون موچی دروازہ میں رات ساڑھے آٹھ بجے کا وقت جلسہ شروع ہونے کے لئے مقرر تھا۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے تلاوت کلام پاک سے جلسے کا آغاز ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت تک لوگ بہت بڑی تعداد میں نہیں پہنچے تھے۔ جلسہ گاہ سے باہر عوام سے زیادہ پولیس کے جوان تھے۔ جلسہ گاہ میں بڑی تعداد میں بینر لگائے گئے تھے۔ جن پر تنظیم اسلامی نے اپنے نعرے درج کر رکھے تھے۔

"پاکستان کا استحکام اور مستقبل میں برقرار رہنا صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے۔"

"مسلمانوں کے لئے ایک دوسرے کی عزت' جان و مال کا احترام مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔"

ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے تلاوت کلام پاک کے بعد متعلقہ آیات مبارکہ کی مناسبت سے تقریر کی۔ یوں باقاعدہ جلسے کی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد تنظیم کے عہدے داران کو سٹیج پر تشریف لانے کے لئے کہا گیا۔ مرزا ایوب صاحب امیر تنظیم اسلامی لاہور' صدرِ جلسہ تھے۔ ان کے علاوہ قمر سعید قریشی نائب امیر' ڈاکٹر عبدالخالق ناظم اعلیٰ' چوہدری غلام محمد صاحب معتمد عمومی' رحمت اللہ بٹر مرکزی ناظم بیت المال' مرکزی ناظم مکتبہ عبدالرزاق' تنظیم اسلامی لاہور کے ناظم غازی محمد وقاص، مجلس مشاورت کے اراکین الطاف حسین' فیاض حکیم' شاہد احمد عبداللہ' شمس الحق اعوان صاحبان سٹیج پر پہنچ گئے۔

جب تک ڈاکٹر صاحب تشریف نہ لائے' اس دوران جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے مائیک سنبھالا اور انتہائی علمی تقریر سے سامعین کو نوازا۔ انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ دین کیا ہے' کسے کہتے ہیں نیز ملوکیت اور اسلامی نظام میں کیا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ اکثر اسلامی ممالک میں اور خود ہمارے برصغیر میں بادشاہی نظام رائج رہا ہے۔ جس میں بادشاہ کو ہر معاملے میں مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ اسے "دین الملک" کہتے ہیں۔ اب دین میں عوام کی رضا مطلوب ہے۔ اس لئے انہیں خوش کرنے کے لئے "دینِ جمہور" نافذ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ارشادِ خداوندی ہے کہ اللہ ہی کے دین کو

قائم رکھو اگر قائم نہیں ہے تو اسے قائم کرنے کے لئے تن ' من ' دھن سب کچھ نچھاور کر دو۔ اسلام ہی کو قرآن پاک میں دینِ حق کہا گیا ہے۔ اگر ہم اللہ کو ایک مانتے ہیں تو ہمارے دستور میں لکھا ہونا چاہیئے کہ کوئی قانون اللہ کے قانون کے خلاف نہیں بنے گا۔ ہم نے دو سو سال کا عرصہ اللہ کے دین کے بغیر گذارا۔ انگریز نے ہندوستان میں اپنا قانون نافذ کیا۔ ہمارا سیاسی نظام "دینِ انگریز" پر مبنی تھا۔ صرف انفرادی طور پر جو عقیدہ چاہے رکھ سکتے تھے اور جس طرح کی رسومات چاہیں ادا کر سکتے تھے ' ہمیں یہی آزادی حاصل تھی۔ ہماری آٹھ دس نسلیں انگریز کے اس دور سے گزری ہیں۔ جنہیں یہی معلوم تھا کہ ایک عقیدہ اور چند رسومات کا نام ہی دین ہے۔ ہمارا پورا نظام خواہ وہ سیاسی ہے 'معاشی یا معاشرتی ہے ' اسی انگریز ہی کا قائم کردہ ہے۔

خدا کے دین کے قیام کے بعد ہر سطح پر عدل اجتماعی قائم ہو جاتا ہے اور یہی وہ نظام ہے جو اللہ چاہتا ہے اِس نظام کے قائم ہونے کے بعد تمام انسانوں کی زندگیوں اور ان کے معاملات پر دین غالب آ جاتا ہے۔ یہی دعوت ہے تنظیم اسلامی کی اور اسی دعوت کو ہم اپنے ملک ہی میں نہیں 'اللہ کی ساری زمین پر پھیلا دینا چاہتے ہیں۔

بسر صاحب کی پر مغز تقریر ابھی ختم ہوئی ہی تھی کہ اس دوران میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ سٹیج سے اعلان ہوا کہ جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ ان کی تقریر سے پہلے شکیل احمد صاحب نے کلام اقبال پیش کیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز کیا تو نو بج چکے تھے۔ جلسہ گاہ میں رکھی گئی تمام کرسیاں سامعین سے پُر ہو چکی تھیں۔ موچی دروازے کی جلسہ گاہ کی سیڑھیوں پر ان گنت لوگ بیٹھنے لگے تھے۔ لوگ بہت توجہ سے ان کی نکتہ آفرینیاں سن رہے تھے۔ جلسہ گاہ میں دوسرے جلسوں کے برعکس انتہائی سکون ' خاموشی اور امن تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حاضرین کی تعداد دیکھ کر بڑے وقار سے کہا: "آج کل الیکشن کی گہما گہمی ہے اور لوگ زیادہ تر سیاسی جلسوں ہی کا رخ کرتے ہیں۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ شاید زیادہ لوگ شریک نہ ہوں ، کیونکہ ہم ایک غیر سیاسی جماعت ہیں۔ ہم جمہوری روایات کے زبردست حامی ہیں ، لیکن خود دانستہ اس سے ایک طرف اور الگ تھلگ رہتے ہیں۔ لوگ سوچتے ہوں گے کہ ایک طرف انتخاب کی حمایت اور دوسری طرف اس سے کنارہ کشی ؟ آخر ایسا کیوں ؟ میں آج یہاں اس کی وضاحت بھی کروں گا ۔ اور عالم اسلام اور پاکستان کو درپیش مسائل کا ذکر بھی ہو گا"۔

پھر دور تک پھیلے لوگوں کے سروں کی فصل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "اس جلسے کے حاضرین

چل کر یہاں آئے اور جن کی تعداد کے بارے میں سٹیج سے کوئی دعوے نہیں کئے جارہے '
توقع سے زیادہ ہیں۔ سالہا سال سے ہمارے ملک میں جلسوں کے اہتمام و انصرام نے جو انداز
کرلیا ہے اس کے آج بھی پورے زور شور سے رائج ہوتے ہوئے چند ہزار مسلمان بھائی بہنوں
ی وہ باتیں سننے کے لئے جمع ہو جانا بہت غنیمت ہے جو الیکشن کے بخار اور ووٹوں کے بیوپار کے
میں بڑی اوپری اور اجنبی سی لگیں گی۔ میں سب حاضرین و سامعین کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور
کے ان نمائندوں کا بھی جو اس روکھے پھیکے جلسے کو دیکھنے اور رپورٹ کرنے کے لئے تشریف
۔ ہمیں اپنا پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے موزوں وقت کا انتظار کرنا چاہئے تھا لیکن افسوس کہ
تیزی کے ساتھ ہاتھ سے نکلا جارہا ہے اور کیا عجب پھر اتمامِ حجت کا موقع ہی نہ رہے 'دل کی بات
ں ہی رہ جائے۔ "

مسلمانوں کی بے بسی 'لاچاری اور پستی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے فرمایا: "دنیا کی
ن اقوام پر عجب وقت آن پڑا ہے جنہیں اقوام کہتے دل دکھتا تو ہے لیکن مجبوری ہے کہ عملاً وہ
وم نہیں۔ کرۂ ارضی پر پھیلے سوا ارب مسلمان ہر طرح کے وسائل سے مالا مال ہوتے اور چالیس
یادہ بظاہر آزاد و خود مختار ملکوں میں بر سر اقتدار رہتے ہوئے بھی کیوں ذلیل و خوار ہیں اور دنیا کے
ت میں ان کی حیثیت صفر کیوں ہوگئی' افسوس کہ اس پر غور کرنے اور اس سے سبق حاصل
، کی ہمیں فرصت نہیں اور شاید ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی حالانکہ ہر مسلمان کے لئے
وجہ سامنے دیوار پر لکھی ہوئی ہے۔ ہم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے تو اقوام عالم
داری اور امامت کے منصب پر فائز تھے۔ ان کی اطاعت کا قلادہ ہم نے اپنی گردنوں سے اتار پھینکا
ہاشما میں سے ہر کوئی ہمارا آقا اور حاجت روا ہے۔ "

"مسلمانوں میں عرب اس اعتبار سے ممتاز ہیں کہ کم از کم زبان کے اعتبار سے رائج الوقت
کے مطابق بھی ایک قوم ہیں۔ انسانیت کے لئے آخری اور ابدی ہدایت نامہ قرآن مجید ان کی
یں نازل ہوا' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے درمیان مبعوث ہوئے اور مسلمانوں
لمات مقدسہ ان کے قبضہ میں ہیں۔ سوائے بیت المقدس کے جو ان کی نالائقی کے باعث
سال پہلے ہاتھ سے نکل گیا جبکہ اہل پاکستان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ ان کا ملک اسلام کے نام پر اور
کے نظام حیات کو زمین کے ایک ٹکڑے پر عملاً نافذ کرنے کے لئے عالم وجود میں آیا ورنہ اللہ
ے قول و قرار کے نتیجے میں اس کی خاص عنایت کے طفیل معجزانہ طور پر ظہور میں آنے سے
کرہ ارضی کے نقشے پر کہیں اس کا نشان تھا نہ دنیا کی کسی لغت میں یہ نام پایا جاتا تھا۔ ہمارا دیس

صحیح معنوں میں اسلام ہے اور مصطفوی ہونے کے سوا ہماری کوئی پہچان نہیں"۔ حیرت ہے کہ خاصے بڑے اجتماع میں لوگ انتہائی امن سے ڈاکٹر صاحب کی دلکش اور دردمندی سے بھرپور تقریر سن رہے تھے۔ نہ کوئی بے جا نعرہ بازی ہو رہی تھی اور نہ ہی کہیں ہلڑ بازی کا منظر تھا۔ تنظیم اسلامی کا یہ جلسہ "وکھری ٹائپ" کا تھا۔

تقریر جاری تھی، علم کا ایک دریا تھا جو میانہ رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ جوش عنقا تھا اور صاحبِ علم اور باکمال مقرر نہایت ہوش کے ساتھ، اپنی طبیعت اور مزاج کے عین مطابق لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا جارہا تھا۔ لوگوں نے سنا اور دل کے "کانوں" سے سنا، ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے:

"نظام مصطفوی اگر اسی کا نام ہے اور آپ کا دل گواہی دے گا کہ اسی کا نام ہے تو سنجیدگی کے ساتھ ذرا سے غور و فکر کے بعد اس حقیقت کا بھی آپ کو یقین حاصل ہو جائے گا کہ نظامِ مصطفوی ان حیلے بہانوں اور ان راستوں سے نہیں آسکتا جو اس قوم کے رہنماؤں نے آج تک اختیار کئے اور جن کا شور و غوغا موجودہ انتخابی مہم میں پھر آپ کے کان پھاڑ رہا ہے۔ انتخابات ملک پر مسلط بدترین جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کو قائم رکھنے اور عوام کی گردن پر استحصالی عناصر کی گرفت کو مضبوط تر کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ حاضر و موجود باطل نظام کو مستحکم کرنے کے لئے ہیں۔ اسے نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کی تمہید کہنا یا سمجھنا پرلے درجے کی بے وقوفی یا کم از کم بڑی ہی سادہ لوحی ہے۔ اِن لوگوں پر ایک نظر تو ڈالئے جو آپ کی قیادت و سیادت کے لئے میدان میں آئے ہیں۔ یہ جاگیردار، زمیندار، وڈیرے، سرمایہ دار، سمگلر اور کالے دھندے کے ذریعے راتوں رات امیر بن جانے والے کیا نظامِ مصطفیٰ لا کر اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھودیں گے؟ ان میں خال خال نظر آنے والے چند آدمی اگر مخلص بھی ہیں تو کیا وہ کامیاب ہوں گے اور کامیاب ہو گئے تو کیا مفاد پرستوں کی عظیم اکثریت کے مقابلے میں مؤثر ہو سکیں گے؟ ہرگز نہیں، یہ ناممکن ہے۔ ہمیں اگر نظام بدلنا ہے تو یہ انتخابات کے ذریعے نہیں، انقلاب سے ہوگا"۔

"مصطفوی انقلاب" کا نعرہ ایک اور "صاحب" بھی لگاتے ہیں اور گذشتہ ڈیڑھ سال سے بڑے تسلسل سے لگا رہے ہیں لیکن ان کی زندگی میں سوائے اپنی معاشی زندگی میں انقلاب آنے کے کہیں انقلاب نظر نہیں آتا"۔ ڈاکٹر صاحب نے مصطفوی انقلاب کی برکات اور معنی کی پردہ کشائی کرتے ہوئے فرمایا:

"مصطفوی نظام کی برکات سے پاکستان کو روشناس کرنے کا واحد طریقہ موجودہ فاسد نظام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کی انقلابی جدوجہد ہے اور مصطفوی انقلاب کے لئے یہ انقلابی جدوجہد بھی خود

ساختہ طور طریقوں پر یا دنیا کی دوسری جھوٹی سچی انقلابی تحریکوں سے مانگے تانگے نقلی نسخوں کے استعمال سے ہرگز کامیاب نہ ہوگی۔ اِس کا واحد راستہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے۔ آپ نے تاریخ انسانی کا مکمل ترین اور واحد ہمہ گیر انقلاب برپا کر کے دکھایا اور یہ مثالی کارنامہ جس طرح انجام دیا' اس کی ایک ایک تفصیل ہماری رہنمائی کے لئے قرآن مجید' احادیث نبوی اور سیرت مطہرہ میں محفوظ ہے۔ ہمیں اس کی پیروی کرتے ہوئے جادہ انقلاب پر قدم بقدم آگے بڑھنا ہے۔ جس پر استقامت سے چلتے ہوئے ہم انقلاب مصطفوی برپا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہی ہمارا فرض منصبی ہے اور اگر ناکام ہوئے تب بھی بازی ہار نہیں جائیں گے کیونکہ ہمیں اصل فکر آخرت میں کامیاب و کامران ہونے کی ہے ۔ فلاحِ اخروی اور حصولِ رضائے الٰہی ہمارا اصل مطلوب و مقصود ہے جس کی دونوں ہی صورتوں میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بشارت دی ہے۔ "

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی نجی زندگی میں جس طرح سادگی اور بے باکی کے عنصر نمایاں ہیں' ان کی گفتگو میں بھی یہ عناصر پوری طرح نمایاں بلکہ غالب نظر آتا ہے۔ انکسار کے ساتھ گرد ہنگ لہجے میں وہ لوگوں سے اپیل کر رہے تھے :

" تنظیم اسلامی مصطفوی انقلاب کی اسی جدوجہد کے لئے قائم ہوئی اور اپنی چھوٹی سی افرادی قوت کو اسی کے لئے میدان میں لائی ہے۔ جماعت سازی کے مسنون طریقے یعنی بیعت کی بنیاد پر دعوت' تنظیم اور تربیت کے ابتدائی مرحلے میں یہ جماعت طنز و تضحیک کے مقابلے میں صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ سے درخواست کرتی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ کے عذاب سے بچانے کے لئے' اپنے ملک میں عدل و قسط پر مبنی نظامِ مصطفیٰ کو برپا کر کے اپنی اور اپنی اگلی نسلوں کی دنیا سنوارنے کی غرض سے اور فلاح اخروی و حصولِ رضائے الٰہی کی اصل کامیابی سے ہمکنار ہونے کے اعلیٰ ترین مقصد کی خاطر ہمارے قافلے میں شامل ہو جائیے۔ ہمارا پیغام سمجھئے' ہمارا طریق کار دیکھئے اور ہمارے مقاصد کا ادراک حاصل کیجئے۔ ہمیں سیاسی جماعتوں کی طرح جوق در جوق شمولیت درکار نہیں' ایک ایک مسلمان اپنے ایمان کی تجدید کا شعوری فیصلہ کرے' اس زندگی پر جو اللہ کی اطاعت سے آزاد گزری' صدقِ دل سے توبہ کرے اور تجدیدِ عہد کرے کہ اس کارِ رسالت اس مشن کی تکمیل میں اپنا تن من دھن لگا دے گا جو ختم نبوت کے بعد ہمارا اجتماعی اور انفرادی فریضہ ہے اِس کے بعد وہ ہمارا رفیق ہو گا اور ہماری قوت میں اضافے کا باعث بنے گا جو ہم انقلابِ مصطفوی برپا کرنے کے لئے فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

خطوط و نکات

—————(۱)—————

مکتوبِ گرامی مولانا سیّد اخلاق حسین قاسمی دہلوی

حضرت ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

بیرونی اسفار خاص طور پر اسپین کا سفر مبارک ہو ـــ مقبول ہو.

اقتدار صاحب کو خدا تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور غیب سے ان کی مدد کرے، 'ندا' کے ذریعے اور 'میثاق' و 'حکمت قرآن' کے ذریعے آپ کی خدماتِ دینی کا علم ہوتا رہتا ہے۔

دنیائے عرب کی موجودہ تبدیلی پر آپ کا تبصرہ پڑھا۔ آپ نے مرحوم مولانا حامد میاں صاحب کے حوالہ سے احادیث کی پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ فرمایا اور بڑے وثوق کے ساتھ فرمایا۔ لیکن بزرگ محترم! احادیث پر نظر رکھنے والے حضرات سے استصواب کے بعد عرض کر رہا ہوں کہ صحیح احادیث میں ایسی کوئی بات مذکور نہیں۔ غیر مستند کتب حدیث میں فتن کے بارے میں جو احادیث مروی ہیں وہ تمام کی تمام غیر مستند ہیں۔ شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلویؒ کی طرف "آثارِ قیامت" نامی ایک کتاب منسوب ہے' اس میں بے شمار روایات جمع کر دی گئی ہیں' مگر اس کتاب کو ایک افسانہ کہا گیا ہے اور شاہ صاحب کی طرف اس کی نسبت کو بھی مشکوک قرار دیا گیا ہے۔

سعودی عربیہ کی امداد کے بارے میں آپ کی محتاط اپیل قابل تعریف ہے۔ الحمد للہ آپ بہت ہی غیر طرفداری کے ساتھ آنے والے خطرات سے آگاہ فرما دیتے ہیں۔ ہندوستان کے اکابرِ علم میں مولانا علی میاں اور ان کی جماعت بالکل خاموش ہے۔ مولانا اسعد میاں کا تعلق دونوں محاذوں سے ہے' عراق سے ان کا تعلق نظریاتی ہے اور سعودیہ میں ان کا خاندان آباد ہے اور وہ رابطہ عالم اسلامی کے ممبر ہیں۔ انہوں نے دونوں کی مذمت کی ہے۔ اہل حدیث حضرات کھل کر صدام حسین کی مخالفت کر رہے ہیں اور امریکی افواج کی آمد کو حق بجانب قرار دے رہے ہیں۔ بہت جلد امریکی افواج کی حمایت میں

"وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى"
(المائدہ : ۸۲) کی تلاوت کی جانے والی ہے۔ علی میاں صاحب کی نظر مستقبل کے خطرات پر ہے۔ مئی میں منعقد ہونے والی بغداد کانفرنس (جس میں یہ احقر بھی شریک تھا) میں جن علمائے ازہر نے صدام کو مجاہد اعظم قرار دیا تھا اور رو رو کر اسرائیل کے خلاف صدام کی حمایت کا اعلان کیا تھا آج وہ دوسرے ہی قسم کے بیانات جاری کر رہے ہیں۔ سعودی علماء اور اخوانی علماء کا بھی یہی حال ہے۔ اب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خمینی صاحب کی آہیں ان عربوں کو گھیر رہی ہیں۔ عَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔
ایک سوال یہ ہے کہ "اَخْرِجُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ"
کی وصیت کی تکمیل کے بعد کیا یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ کے قدم اس سرزمین پر پڑے ہیں۔ تاریخ پر آپ کی نظر وسیع ہے، اس مسئلہ کی وضاحت کا منتظر رہوں گا۔

اقتدار صاحب کا شکریہ ادا کردیں کہ انہوں نے 'ندا' کی دوبارہ اشاعت میں بھی اس احقر کو یاد رکھا۔

جملہ احباب و اعزّہ کی خدمت میں سلام مسنون!

اخلاق حسین قاسمی
۱۵ ستمبر ۹۰ء

(۲)

انگریزی میں دورۂ ترجمۂ قرآن کی ضرورت و اہمیت

دیارِ فرنگ سے جناب طارق یوسف رجبی کا مکتوب

محترم ڈاکٹر صاحب!

السلام علیکم و رحمتہ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ معہ اہل و عیال کے بخیریت ہوں گے۔ آپ سے ہماری بہت تھوڑی سی ملاقات افسر صدیقی (طٰہٰ پبلشر) صاحب کے ساتھ ہوئی جبکہ آپ دوپہر کا کھانا کھا کر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ زیادہ تر گفتگو بھی افسر صاحب کے ساتھ ہوئی۔ میں اس رات کے پروگرام کرائیڈن میں نہ آسکا کیونکہ اُسی وقت مجھے اپنی فیملی کے ساتھ ہیسٹنگز

آنا تھا۔ اس روز صبح سے ہم لوگ آپ کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے اور جہاں جہاں پہنچتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ دوسری جگہ جا چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے آپ سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا جس کے لئے خاص طور پر میں نے افسر صاحب کو آمادہ کیا تھا کہ وہ مجھے کسی سکون اور اطمینان کی جگہ پر ملوائیں گے۔ خیر اللہ کی مرضی ہی یہی تھی۔

میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ اپنی بات تھوڑے سے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس لئے پلیز میری بات کو سنجیدگی سے لیجئے گا۔

میں نے آپ کے جو کیسٹ دیکھے اور سنے ہیں (تقریباً ۱۵۰) اُن کا موضوع پرانے طریقوں سے ہٹ کر قرآن کی روشنی میں اسلام کے صحیح تقاضے کو بھرپور اور Modern Terminology میں "پڑھے لکھے" لوگوں کو سمجھانا تھا۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے آپ کو اس کا بہترین فہم دیا ہے اور آپ کا طریقۂ بیان (Expression) بہترین ہے اور جو لوگ بھی آپ کے لکچر کو سمجھ سکے ہیں ان کا آپ نے ذہن بدل دیا ہے۔

لیکن آپ کو میں کیا بتاؤں ــــــ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی کہا ہے کہ ہر قوم کے لئے اس پاک بے نیاز نے انہی کی زبان بولنے والا رسول بھیجا ہے۔ اور اب آخری رسول کے بعد ان کی امت کا بھی وہی کام رہ گیا ہے جو کہ رسولوں کا تھا اور آپ بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ آپ کا دائرہ کار بھی آج کے پڑھے لکھے لوگ ہیں ــــ سب سے ضروری بات تو یہ ہے کہ آپ یہ بھول رہے ہیں کہ آج کے پڑھے لکھے لوگوں کی اردو بہت کمزور یا نہیں کے برابر ہے۔ جنہوں نے اردو زبان قاعدے سے پڑھی ہے ان کی نظر سے بہتیرے لٹریچر پہلے ہی گزر گئے ہوں گے۔ آج کل تو ضرورت اس بات کی ہے جنہوں نے روٹی یا معیار زندگی کے لئے تعلیم حاصل کی ہے انہیں یہ بتایا جائے کہ قرآن ان کے Imagination سے بہت زیادہ Forward ہے۔ ورنہ وہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں جس طرح مذہبی لوگ مالی اعتبار سے اتنے کامیاب نہیں ہیں' اسی طرح ان کے لئے بھی اس لائن پر چلنا وقت کی بربادی ہوگی۔ ٹریجڈی اس بات کی بھی ہے کہ ہمارے برصغیر میں (ہندوستان پاکستان) عربی جاننے والے عالم بہت کم ہیں اور بڑے بڑے مذہبی اداروں میں ہی رہ گئے ہیں۔ شہروں اور گاؤں کی مسجدوں میں ویسے ہی مولانا کام چلا رہے ہیں جنہیں ہم

Religious Quacks Bluntly کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے "Islam Made Easy" قسم کی کتابیں پڑھ کر یا بزرگوں کی شاگردی کرکے اور دس پندرہ سورتیں اور دعائیں یاد کرکے اپنی روزی روٹی کا انتظام کرلیا ہے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگ مولویوں کی عزت بھی نہیں کرتے اور ان کا گزر بھی محلے کی روٹیوں پر ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر اسلامی اصولوں کی قربانی کرتے رہتے ہیں جو کہ ان کی بدنامی کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔ غرضیکہ یہ Vicious Circle چلتا رہا ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ کب تک چلتا رہے گا۔

آپ نے اپنے "اقامت دین" کے موضوع پر ہر ایک کو Invite کیا ہے Coax کیا ہے اور للکارا ہے کہ تن من لگادیں اللہ کی راہ میں نتیجے کی پرواہ کئے بغیر۔۔۔۔۔۔ اب یہ ناچیز اس بات کی جرأت کر رہا ہے کہ آپ سے بھی اُسی درجے کی قربانی کی مانگ کرے۔ اور وہ بھی اس لئے کہ بہت وقت لگتا ہے اور سینکڑوں خاندانوں کی کتنی پشتیں گزر جاتی ہیں جب آپ اور مرحوم مولانا مودودی جیسے روشن دماغ والے اس Conviction پر دین کا کام کرتے ہیں کہ یہ ان کا فرض ہے۔۔۔۔۔۔ مولانا مودودی یا ان کے پائے کے اور بھی ہندو پاک کے علماء کتابیں لکھ گئے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔ لیکن ان کتابوں کو صرف وہی لوگ پڑھیں گے جو کہ پہلے سے Motivated ہوں۔ ہم نے بہت پہلے سے یہ محسوس کیا ہے کہ اسی طرح تبلیغی جماعت والے لوگ بھی انہی لوگوں پر زیادہ بار بنتے ہیں جو پہلے سے مسجد جاتے رہتے ہیں Half hearted یا دوسرے طریقے سے Reasonable لوگ اگر کسی طرح بھی Reasonable Arguments سے بلائے جائیں تو بہت ممکن ہے کہ ان کے دماغ میں کچھ گھس سکے۔ ہمارا یہ کہہ دینا صحیح نہیں ہوگا کہ یہ ان کا اپنا فرض ہے یا اگر اللہ تعالٰی ان کو ہدایت دینا چاہے گا تو خود دے دے گا۔ سوال اس بات کا ہے کہ کس درجے کی ہدایت دے گا۔ ان کو تفصیل سے تو انسان ہی بتا سکتے ہیں۔ اس طرح سے کتنے ہی نیک لوگ زندہ ہیں اور گزر گئے ہیں جنہوں نے مذہب کی اندھی تقلید کی ہے اور نیک نیتی اور سادگی سے کی ہے۔ اللہ تعالٰی ان کا اجر تو ان کو دے گا لیکن کیا یہ مسلمان کا فرض نہیں ہے کہ اگر

اُسے روشنی ملی ہے تو وہ اس روشنی کو دوسروں تک بھی پہنچائے۔

آپ سے ہماری ملاقات اس مرتبہ جب لندن میں ہوئی تو آپ نے اپنی تھکاوٹ کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ آپ نے اپنا کام کردیا ہے اب یہ ہم لوگوں اور ہم جیسے اور لوگوں کا فرض ہے کہ آپ کے کام کو آگے بڑھائیں ـــ آپ کو خود احساس ہوگا کہ تھکاوٹ میں جو عبادت کی جاتی ہے اس کا ثواب کتنا زیادہ ہے!۔

اور یہ جسمانی تھکاوٹ تو جسم ہی کی طرح Temporary ہوتی ہے۔ اس سے اثر انداز ہو کر انسان آخرت کی زندگی کا خیال تو نہیں چھوڑتا!

اتنی تمہید میرے خیال سے کافی ہوگی۔ اب میں آپ سے صاف صاف یہ گزارش کر رہا ہوں اور آپ کے مذہبی جذبے کو جھنجھوڑ رہا ہوں اور للکار رہا ہوں ـــ چاہے آپ کو خدانخواستہ اپنی پلنگ پر سے ہی بولنا پڑے آپ کا بھی ایک ضروری فرض چھوٹ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو Medicine پڑھوایا تاکہ آپ روشن دماغ ہو سکیں اور English Medium میں پڑھوایا تاکہ آپ اس زبان میں بھی Communicate کر سکیں۔ تب یہ فرض آپ کیوں چھوڑے دے رہے ہیں ـــ اب کون آئے گا' کس خاندان سے آئے گا اور کتنے سال کے بعد آئے گا جو کہ یہ کام کر سکے گا؟ اللہ کی مرضی ہے کہ آپ اس دور کے انسان ہیں جس میں کوئی اپنی آواز اور اپنی شکل اور طرز بیان ہمیشہ کے لئے ریکارڈ کروا سکتا ہے تاکہ اس کے بعد آنے والی نسلیں بھی اس کو اسی طرح دیکھ سکتی ہیں جیسے اس کے Contemporary لوگ ـــ میرا مطلب انگریزی میں وڈیو کیسٹ سے ہے!

میرا دل تڑپتا ہے کہ میں نے جتنا آپ کے کیسٹ سے سیکھا ہے اپنی اولاد کو انگریزی میں نہیں سکھا سکتا۔ میرا دل تڑپتا ہے کہ جو دو چار نو مسلم انگریز ہمارے دوستوں میں سے ہیں اور جنہوں نے ہم سے بہت زیادہ قربانی دے کر ہدایت کا راستہ حاصل کیا ہے اور جو کہ دماغی طور پر Capable بھی ہیں ان کو قرآن شریف کے گہرے حقائق سمجھا نہیں سکتا ـــ اس لئے کہ میں ڈاکٹر اسرار احمد نہیں ہوں ـــ آپ ڈاکٹر اسرار احمد ہیں! آپ ہی یہ کام کر سکتے ہیں اِس دور میں۔ ہمیں کوئی دوسرا انسان نظر نہیں آتا۔ اور آپ اب اس طرح سے ہاتھ پیر ڈھیل کر بیٹھنا چاہتے ہیں جیسے کہ آپ نے اپنی Inning کھیل لی ہے

ـــــــ میں یہ کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے اپنا کام پورا کردیا ہے۔ جس درجے کی اردو میں آپ کے کیسٹ ہیں اس درجے کی اردو جاننے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں اور آپ ابھی بھی اللہ کے کرم سے اسی دور میں سانس لے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کام کے لئے دوہری زندگی اور صحت عطا فرمائے' آپ کو یہ کام کرنا ہوگا چاہے جیسے بھی ہو ـــــــ یہ حق ہم لوگوں کا آپ پر ہے اور آپ کا اپنا فرض بھی ہے ـــــــ چھوٹا منہ بڑی بات' اب زیادہ نہیں لکھوں گا لیکن آپ کے Intelligence سے یہ امید ضرور رکھوں گا کہ جس طرح اس وقت میرا دل جذبات کی رو میں تیزی سے دھڑک رہا ہے اور میں ادب اور لحاظ کی وجہ سے اپنے قلم کو گستاخی سے روک رہا ہوں آپ اس کا بخوبی اندازہ کریں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے وہ کام کرنے کو نہیں کہا جو کہ خود نہ کرتے رہے ہوں ـــــــ یہ کام آپ کا جہاد ہے !!

اگر میں جذبات کی رو میں گستاخی کر گیا ہوں یا آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں تو معاف کیجئے گا۔ میں بہت عرصے سے آپ کو یہ خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن نہ تو فرصت ملتی تھی اور نہ ذہنی سکون۔ آج اللہ کی مرضی ہوئی تو اس قابل ہوا ہوں۔

آپ کے لندن کی تنظیم کے امیر کے پاس آپ کے انگریزی کے دو چار وڈیو کیسٹ جو بنے ہیں وہ بھی نہیں ہیں۔ اگر انہیں بھجوا سکیں تو مہربانی ہوگی۔ میں اپنے گھر سے دعوت کا کام کرتا ہوں۔ انگریزوں کو بلاتا ہوں اور وڈیو کیسٹ دکھاتا ہوں۔ اس سے زیادہ Cost Eff-ective طریقہ ہمیں کوئی اور نہیں دکھائی پڑتا کہ بڑے سے بڑے عالم سے اپنے لاؤنج میں انسان لکچر سن لے اور جتنی مرتبہ چاہے سنے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے جس کی ہر مسلمان کی خواہش ہے اور صحت مند اور لمبی زندگی عطا فرمائے تاکہ آپ اور زیادہ سے زیادہ قوم کو فائدہ پہنچا سکیں۔ گھر میں سلام کہئے گا۔

فقط ناچیز

طارق

TARIQ YOUSUF RAJBEE

۷ اکتوبر ۹۴ء

(۳)

امیر لاہور کے نام جناب مختار حسین فاروقی کا مکتوب

محترمی جناب مرزا ایوب بیگ صاحب۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ

شہر لاہور میں موچی دروازہ کا ۴ اکتوبر کا جلسہ عام آپ کے زیر انتظام تھا الحمد للہ کہ یہ جلسہ بخیرو خوبی انجام پا گیا۔

یوں تو رفقائے تنظیم کی سب سے بڑی تعداد آپ کے زیر کمان اس جلسہ کے انتظامات کے لئے شب و روز ہمہ تن مصروف رہی اور اس میں اکابرین کے مشورے اور دعائیں بھی شاملِ حال ہوں گی مگر جلسہ گاہ کے عمدہ انتظامات، نظم و ضبط، حسن اور سلیقہ، پوسٹرز کی کتابت اور طباعت اور مربوط پبلسٹی غرض یہ کہ ہر لحاظ سے یہ موقع آپ کی خوابیدہ صلاحیتوں کو سامنے لایا ہے اور اسکی داد نہ دینا ایک حقیقت سے اغماض کے زمرے میں ہی آئے گا۔

میری طرف سے آپ اور آپ کے اعوان و انصار تمام خصوصی تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو اور مجھے اپنے دین کی بیش از بیش خدمت کی توفیق بخشے۔ آمین

فقط والسلام

مختار حسین فاروقی

حال وارد مرکز گڑھی شاہو لاہور

بقیہ : لاہور کا جلسہ عام

رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے جب یہ جلسہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ جلسے کی ابتداء میں یقین نہیں تھا کہ کرسیاں بھی بھر سکیں گی لیکن جب نصف رات کو جلسہ ختم ہوا تو حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے سارے لوگ کہاں سے آگئے ؟ جلسہ گاہ سے نکل کر لوگ گھروں کو جاتے ہوئے سڑکوں پر پھیل گئے اور میں سوچ رہا تھا کہ اخلاص کی سیاست بلکہ خالصتاً دین کی بنیادوں پر سیاست کرنے والے اگر اسی طرح ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو منزل دور نہیں! "تنظیم اسلامی" اپنا فرض ادا کر رہی ہے، کرتی جا رہی ہے ــــــ بغیر کسی صلے کے!

امیر تنظیم اسلامی کے خطاباتِ جمعہ کے

پریس ریلیز

لاہور ۱۴ اکتوبر

۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ ہمارا اَن داتا امریکہ بالکل ننگا ہو کر سامنے آگیا ہے اور اُس نے واضح کر دیا ہے کہ اب چپڑی ہوئی اور دو دو والا معاملہ نہیں چلے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام پر بھی عمل جاری رکھے اور اُس کی امداد بھی چلتی رہے۔ دوسری طرف بھارت سندھ کی سرحد پر نام نہاد مہاجر کیمپ قائم کر کے بالکل وہی کیفیت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اُس نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی سرحد پر پیدا کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ملک کی اندرونی صورت حال بھی انتہائی ہولناک منظر پیش کر رہی ہے۔ میدان سیاست' میدان جنگ بن گیا ہے۔ عریاں انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ صدر مملکت اور نگران حکومتوں کی غیر جانبداری کا جنازہ نکل چکا ہے۔ جس کے پاس جو اختیار ہے وہ اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے پر تلا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت ملک کی قسمت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے انہیں ملکی اور قومی مفاد سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی کے دلہادوں کا مسئلہ ہے تو کسی کے سسر اور شوہر کی ساکھ خطرے میں ہے تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ حالات کا جبر پوری قوم کو تباہی اور بربادی کی طرف دھکیل کر لے جا رہا ہے اور کسی کو حالات پر کوئی اختیار نہیں۔ باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اللہ کی خصوصی مشیت ہی ہمیں تباہی اور بربادی کے غار میں گرنے سے بچا سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم نے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر توبہ کر کے اپنی اصلاح نہ کی تو یہ نئی مہلت کسی زیادہ بڑی سزا اور تباہی کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔ اسلامی انقلاب کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ اس کے لئے ایک ایسی منظم' متحد اور ایک قائد کے اشارے پر حرکت کرنے والی جماعت کی ضرورت ہے جس کے سرفروش پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کے بجائے سینے پر گولی کھانے کا عزم لے کر سڑکوں پر آئیں اور منکرات کے خلاف احتجاج میں حکومتی جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی انقلابی جماعت کی جدوجہد میں تخریب کاری' توڑ پھوڑ اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے کشمیر میں جہاد کے لئے ایک لاکھ نوجوانوں کو تیار کرنے کی بات کی تھی' اگر وہ

جان دینے کا عزم رکھنے والے پچاس ہزار منظم نوجوانوں کو بھی سڑکوں پر لے آئیں تو اس ملک میں اسلامی انقلاب آسکتا ہے۔ جس کی ایک عملی مثال ایرانی قوم نے پیش کر دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اِس وقت پورے عالم اسلام پر جاگیرداروں' سرمایہ داروں اور لیڈروں کا ایک طبقہ بر سر اقتدار ہے جس کے خلاف ایک زبردست مزاحمتی تحریک منظم کئے بغیر انقلاب نہیں آسکتا۔

(۲)

لاہور ۲۶ اکتوبر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ الیکشن کے غیر متوقع نتائج کے باوجود کسی منفی رد عمل کا سامنے نہ آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ جمہوری عمل کے تسلسل کی وجہ سے ہمارے رہنماؤں کے مزاج میں اعتدال اور بالغ نظری پیدا ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پوری قوم کو اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ دشمنوں کا کوئی منصوبہ بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور ہم الیکشن کی کٹھن منزل سے بخیریت گزر آئے ہیں۔ قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن میں نماز جمعہ کے بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انتخابی نتائج نے پیپلز پارٹی کو ایک بہت بڑے امتحان سے دو چار کر دیا ہے' اب اُسے ثابت کرنا ہو گا کہ وہ واقعی وفاقی سوچ رکھنے والی جمہوری پارٹی ہے اور ایک مثبت اپوزیشن کا کردار ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ ماضی میں اقتدار سے محرومی کے بعد گیارہ برس تک زیر عتاب رہنے کے باوجود اپنا جماعتی ڈھانچہ برقرار رکھنے پر پیپلز پارٹی کو ہمیشہ ایک سیاسی قوت کے طور پر سراہا گیا ہے' مگر اب اُسے ایم آر ڈی کی تحریک سے بھی زیادہ بڑے چیلنج کا سامنا ہے' جس کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں اپنی جماعتی صفوں کو منظم کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ بے نظیر بھٹو نے انتخابی شکست سے گھبرا کر وفاقیت کی بجائے سندھی قومیت کی تنگنائے میں پناہ لینے کی کوشش کی تو پاکستان کی سیاست میں اُس کا مقام وہی ہو گا جو آج شیخ مجیب الرحمٰن کا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اسلامی جمہوری اتحاد کو ایک ایسی مضبوط قیادت کی ضرورت ہے جو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر ملک کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ انہوں نے کہا کہ نئی حکومت کو فوری طور پر ایک زبردست مالی بحران کا سامنا کرنا ہو گا کیونکہ ہمارے ان داتا امریکہ کو اب اُس طرح ہماری ضرورت نہیں رہی جس طرح چند سال پہلے تھی۔ تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا اپوزیشن میں بیٹھ کر زور دار بیان دینے والوں کو اب اپنے عمل سے بتانا ہو گا کہ وہ کشمیر کا مسئلہ کیسے حل کرتے ہیں اور افغانستان کے جہاد کو کامیابی کی منزل تک کیونکر پہنچاتے ہیں' بہاریوں کو کب لا کر پنجاب میں آباد

کرتے ہیں اور کالا باغ ڈیم کی تعمیر کتنی جلدی شروع کرواتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سب سے بڑا مسئلہ شریعت بل کو اُس کی اصلی صورت میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے نمائندوں پر مشتمل اسمبلی کے حلق سے اتروانا ہوگا۔ اگر سود خوروں اور جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ کرکے شریعت بل کے م سے کوئی قانون منظور کیا گیا تو یہ شریعت سے مذاق ہوگا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اب اسلامی سوری اتحاد کے رہنماؤں کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ پیپلز پارٹی کو انتخاب میں شکست دے کر انہوں نے بھٹو ازم کا خاتمہ کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عوام کو جمہوری آزادیاں اور اسلام کی روح کے مطابق عاشی انصاف مہیا کئے بغیر بھٹو ازم کا خاتمہ نہیں کیا جاسکتا' جو سیکولرازم جمہوریت اور سوشلزم کا خوبہ تھا۔

---(۳)---

لاہور ۲ نومبر

اسلامی جمہوری اتحاد اور اُس کی حلیف جماعتوں کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت حاصل ہے' اب وہ دستور میں حسبِ ضرورت ترمیم کرکے نفاذِ اسلام کی راہ میں حائل تمام دستوری اور قانونی رکاوٹوں کو دور کرسکتے ہیں۔ اِن خیالات کا اظہار تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ قیام پاکستان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل پاکستان کو نفاذ اسلام کا تیسرا سنہری موقع دیا ہے۔ پہلا موقع قیام پاکستان کے وقت ملا تھا جسے گنوانے کی سزا پچیس سال بعد سقوط ڈھاکہ کی صورت میں ملی۔ دوسرا موقع ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفٰے کے بعد ملا تھا' اُس وقت ضیاء الحق مرحوم' عمر بن عبدالعزیزؒ کا سا کردار ادا کرسکتے تھے لیکن افسوس کہ وہ اس سعادت سے محروم رہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اُن کے جانشینوں کو نفاذِ اسلام کا تیسرا سنہری موقع عطا کیا ہے' اِس سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی انتخابی کامیابی کو انقلاب میں تبدیل کرسکتے ہیں۔ اگر انہوں نے یہ موقع بھی ضائع کر دیا تو انہیں ایک بار پھر پیپلز پارٹی کے ہاتھوں شکست کی ذلت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ پیپلز پارٹی اس ملک کی سیاسی حقیقت ہے' اس جماعت نے اتنی بڑی شکست کے باوجود بحیثیت مجموعی جیتنے والے حریف کے برابر ووٹ لئے ہیں۔ تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ پیپلز پارٹی کے سیاسی وجود کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ نئی حکومت عوام کو وہ سیاسی اور معاشی انصاف مہیا کرے جس کا شعور بھٹو مرحوم نے انہیں دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت اگر اسلام کے عدلِ اجتماعی کو نافذ کرنے میں ناکام رہی

تو پیپلز پارٹی ایک بار پھر اپنے فراموش کردہ روٹی کپڑا اور مکان کے نظریاتی نعروں کے ساتھ پہلے سے بڑ
قوت بن کر میدانِ عمل میں نکل آئے گی ۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ نئی حکومت بلاشبہ کانٹوں کا تا
ہوگی ۔ آنے والے حکمرانوں کو معاشی بحران سمیت داخلی اور خارجی طور پر بہت سی مشکلات کا سامنا
ہے لیکن یہ سارے مسائل وقتی اور فوری نوعیت کے ہیں' انہیں اصل میں نفاذ اسلام کے چیلنج
سامنا کرنا ہوگا ۔ انہوں نے کہا کہ قومی اسمبلی اصل شریعت بل کو پاس کر کے ہی نفاذِ اسلام کا آغ
کر سکتی ہے کیونکہ سینٹ سے منظور شدہ شریعت بل کی دفعہ پندرہ اور سولہ میں اندرونِ ملک او
بیرون ملک سے حاصل کئے گئے پچھلے قرضوں پر حکومت کی طرف سے سود کی ادائیگی کو جو تحفظ
دیا گیا ہے وہ نصِ قرآنی کے خلاف ہے ۔ انہوں نے کہا کہ شریعت بل کی دفعہ چار کی ذیلی دفعہ دس میں
ماضی میں کی گئی زیادتیوں کو جو تحفظ دیا گیا ہے اُس کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ۔ اِس لئے بل
پاس کرتے وقت ان خلافِ شریعت تحفظات کو ختم کرنا ضروری ہے ۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا
شریعت بل کی منظوری کے بجائے اگر دستور کے رہنما اصولوں میں شامل اِس اصول کو کہ "قرآن
سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی" قابل عمل شق میں بدل دیا جائے اور وفاقی شرع
عدالت کے دائرہ اختیار سے مستثنیات کو ختم کر دیا جائے تب بھی نفاذِ اسلام کی راہ میں حائل دستور
رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں ۔ تنظیمِ اسلامی کے امیر نے کہا کہ اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت ما
قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی کڑوی گولی نگل لے تو حقیقت میں ایک اسلامی انقلاب کا آغ
ہو سکتا ہے ۔ اگر حکومت سود کی لعنت کو ختم کرنے کا عزم کر لے تو پوری قوم پیٹ پر پتھر باندھ کر اُس
ساتھ دے گی ۔ انہوں نے کہا کہ بڑی طاقتیں اپنی سیاسی مصلحتوں اور مفادات کے تحفظ کے لئے
چھوٹے ملکوں کو قرضے دیتی ہیں ۔ اگر کوئی مضبوط قیادت ڈٹ کر کھڑی ہو جائے تو قرضے اور س
معاف ہو سکتے ہیں ۔ لیکن اِس کے لئے پہلے ہمیں ملک کے اندر سودی نظام کا خاتمہ کرنا ہوگا ۔
اپنے گھر کو سود کے زہر سے پاک کر لیں تو باہر والوں کو بھی ہم سے سود مانگنے کی ہمت نہیں ہو

قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

حَاسِبُوا أَنفُسَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُحَاسَبُوا


نزلہ کشتن روزِ اوّل
گلے میں خراش محسوس ہو یا چھینکیں آنا شروع ہوں
تو سمجھ لیجیے کہ نزلہ زکام کی آمد آمد ہے۔ اسے معمولی
بیماری سمجھ کر نظر انداز نہ کیجیے۔ فوری جوشینا لیجیے ورنہ
زکام، کھانسی اور بخار جیسے تکلیف دہ امراض لاحق
ہونے کا اندیشہ ہے۔
جوشینا۔ صدیوں سے استعمال ہونے والے جوشاندے
کے نہایت موثر، کافی وشافی قدرتی اجزا کا
جوشینا دو پیکنگوں میں دستیاب ہے
خوب صورت پلاسٹک مگ
میں اور گتے کے کارٹن میں۔
عفو و درگزر
بہترین انتقام
Adarts-JUS-1/89R

امیرِ تنظیم کا ۴ روزہ دَورہ کوئٹہ

جائزہ و تأثرات

——— مرتّب : سیّد برہان علی ———

امیرِ محترم کی کوئٹہ میں گزشتہ آمد سالِ گزشتہ کے ماہِ نومبر میں ہوئی تھی۔ چنانچہ کوئٹہ کے رفقاء بڑی تشنگی محسوس کر رہے تھے کہ موسم سرما کی آمد سے قبل موجودہ سال میں امیر محترم کا کوئی پروگرام کوئٹہ میں ضرور ہونا چاہئے۔ امیر محترم کی مصروفیات اور خصوصاً بیرونی ممالک کے دوروں کی وجہ سے آپ پر اضافی بار کی وجہ سے ہمت بھی نہیں پڑتی تھی کہ اس امر کا مطالبہ کیا جائے۔ البتہ امیر محترم کو دورہ کوئٹہ کی دعوت دینے کا ایک بہانہ ہمارے پاس موجود تھا اور وہ تھا انجمن خدام القرآن بلوچستان کا پہلا سالانہ اجلاس جو کہ ماہ اکتوبر کے دوران منعقد ہونا تھا۔ خوش قسمتی سے مرکز میں مشاورت کے دوران یہ پالیسی طے کی گئی کہ مختلف شہروں میں جلسۂ عام منعقد کئے جائیں جن میں اسلامی انقلاب کے مراحل اور طریق کے موضوع پر امیر محترم کے بھرپور خطابات ہوں۔ چنانچہ اس ضمن میں کوئٹہ شہر میں جلسۂ عام کا انعقاد ۱۸ر اکتوبر کو طے پایا۔ اور اِس فیصلہ کی روشنی میں امیر محترم کا دورۂ کوئٹہ ۱۷ر اکتوبر تا ۱۹ر اکتوبر طے پا گیا۔ کوئٹہ کے رفقاء میں اس فیصلہ سے خوشی کی لہر دوڑ گئی اور تمام رفقاء اپنے محترم امیر کی کوئٹہ آمد کے دن انگلیوں پر گننے لگے۔

رفقاء میں جہاں اس فیصلہ سے خوشی کے انتہائی جذبات موجزن تھے وہاں ان کو ایک بڑے چیلنج کا بھی سامنا تھا اور وہ یہ کہ جلسوں کے انعقاد کے سلسلہ میں انہیں کوئی تجربات حاصل نہ تھے۔ لیکن بس ایک لگن تھی کہ ہم نے بہرصورت اس پروگرام کو کامیاب بنانا ہے۔ چنانچہ فوری طور پر اس مقصد کے لئے مولانا عصمت اللہ صاحب کی سرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی جس کو اس تمام کام کے لئے منصوبہ بندی کرنا تھی اور تمام انتظامات کو عملی شکل دینا تھی۔ سب سے پہلے ڈپٹی کمشنر کوئٹہ سے تحریری طور پر صادق شہید پارک میں ۱۸ر اکتوبر کو جلسہ کرنے کی اجازت حاصل کر لی گئی۔ جلسے کی تشہیر کے ضمن میں مرکز سے ایک ہزار پوسٹر اور آٹھ ہزار ہینڈ بلز چھپوا کر منگوائے گئے۔ نیز شہر میں مختلف مقامات پر آویزاں کرنے کے لئے چھ بڑے سائز کے بینرز بھی لکھوائے گئے۔

۱۳ر اکتوبر بروز جمعہ مسجدوں میں ہینڈ بلز کی دو تہائی تعداد کی تقسیم کی گئی۔ پیر کی شب پوسٹر لگانے کی مہم شروع ہوئی۔ چونکہ انتخابی مہم زور و شور سے شروع ہو چکی تھی جس کی وجہ سے دیواروں پر اشتہارات کی بھرمار تھی لہٰذا ہمیں اپنے پوسٹر لگانے کے لئے جگہ دستیاب نہیں تھی۔ اس ضمن میں یہ پالیسی پہلے سے طے کرلی گئی تھی کہ نہ تو کسی انتخابی امیدوار کے پوسٹر پر اپنا پوسٹر لگانا ہے نہ ہی دکانوں یا دیگر پبلسٹی بورڈوں پر اپنے پوسٹر لگا کر اخلاقی جرم کا ارتکاب کرنا ہے۔ لہٰذا بڑی دشواری کا سامنا تھا۔ بہرحال مناسب مقامات پر رات ڈیڑھ بجے تک پوسٹروں کی نصف تعداد لگائی جا سکی۔ منگل کی رات شہر کے اہم مقامات پر بینرز آویزاں کئے گئے اور بقیہ پوسٹر لگائے گئے۔ بچے ہوئے ہینڈ بلز کی کچھ تعداد لوگوں سے ذاتی رابطے کرکے دکانوں اور بڑے بڑے چوکوں پر تقسیم کی گئی۔ بدھ کے روز صبح اور شام دو قسطوں میں رفقاء نے پلے کارڈز جن پر مختلف دعوتی عبارات تحریر تھیں اور امیر محترم کے دورہ اور جلسۂ عام کا پروگرام درج تھا، شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر گھمائے اور اس دوران مزید ہینڈ بلز تقسیم کئے۔ بدھ اور جمعرات کے روز بارہ بجے تک بذریعہ لاؤڈ سپیکر پورے شہر میں جلسہ کی تشہیر بذریعہ ملاقات کی گئی۔ غرضیکہ جو بھی ذریعہ ہو سکتا تھا اُس کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ اخبارات میں یکم اکتوبر سے ہی پریس ریلیز دینے شروع کر دیئے تھے۔

درمیان میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ جمہوری وطن پارٹی اور آئی جے آئی نے اپنے مشترکہ انتخابی جلسہ کا اعلان اسی تاریخ کو اسی وقت اور اسی جگہ بذریعہ اخبارات کر دیا جس سے نواز شریف صاحب کو بھی خطاب کرنا تھا۔ اس اعلان نے تمام رفقاء کو بڑی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اس اعلان کے بعد ڈپٹی کمشنر صاحب نے محترم راشد گنگوہی صاحب کو طلب کیا اور گفتگو کی۔ گنگوہی صاحب نے انہیں بتایا کہ ہماری تمام پبلسٹی ہو چکی ہے لہٰذا ہمیں تو ہرحال میں جلسہ کرنا ہے۔ چنانچہ ڈی سی صاحب نے ازراہ کرم اصولوں کی بنیاد پر فیصلہ کیا کہ چونکہ پہلے آپ کو اجازت دی گئی ہے لہٰذا مذکورہ مقام پر آپ ہی کا جلسہ ہوگا۔ چنانچہ نصف پریشانی تو رفع ہو گئی۔ البتہ نصف باقی تھی اور وہ یہ کہ اسی وقت جب آئی جے آئی اور جمہوری وطن پارٹی کا جلسہ ہو رہا ہوگا تو ہمارے جلسہ میں کون آئے گا۔ بہرحال اس ضمن میں کیا کیا جا سکتا تھا سوائے اس کے کہ بس اللہ پر توکّل کیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ ہماری خوش قسمتی رہی کہ جناب میاں محمد نعیم صاحب ۱۴ر اکتوبر کو اور جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب ۱۶ر اکتوبر کو کوئٹہ پہنچ گئے جنہوں نے قبل از وقت تمام انتظامات کا جائزہ بھی لے لیا اور اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ دونوں حضرات ہمارے رفقاء کی محنت اور کام سے مطمئن بھی نظر آئے۔ بہرحال طے شدہ پروگرام کے مطابق ۱۷ر اکتوبر بروز بدھ بوقت تین بجے سہ

ہمراہ امیر محترم کوئٹہ پہنچ گئے۔ ایرپورٹ پر محترم راشد گنگوہی صاحب و راقم الحروف کے علاوہ جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب' میاں محمد نعیم صاحب' اکرام الحق صاحب اور سلطان محمود صاحب جو کہ ہمارے ایک پرانے رفیق ہیں لیکن عرصہ دراز سے غیر فعال ہیں' امیر محترم کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ایرپورٹ سے امیر محترم ہوٹل شیبٹ تشریف لائے جہاں اُن کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مغرب تک امیر محترم نے آرام کیا۔ نماز مغرب کے بعد رفقاء سے ملاقات طے تھی۔ تمام رفقاء محترم محمد امین صاحب کے ہاں جمع تھے۔ امیر محترم نے پروگرام کے مطابق تمام رفقاء سے ملاقات کی۔ سب کا حال احوال دریافت فرمایا نیز تنظیمی و دیگر امور پر تفصیلی گفتگو فرمائی۔ اسی دوران آئی جے آئی کے جلسہ کی وجہ سے پیدا شدہ صورت حال پر مشورے ہوئے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ جمعہ کے خطاب کا اہتمام ضرور ہونا چاہئے تاکہ انتخابی جلسوں کی وجہ سے اگر ہمارا جلسہ متاثر ہوا تو ہماری بات جمعہ کی تقریر کے حوالہ سے لوگوں تک پہنچ جائے۔ چنانچہ ہنگامی بنیادوں پر فوری طور پر خطابِ جمعہ کے اعلان پر مشتمل ہینڈ بلز کی طباعت کرائی گئی جن کو اگلے روز جلسہ عام کے شرکاء' مساجد اور شہر کے دیگر علاقوں میں تقسیم کیا گیا۔

اگلے روز یعنی ۱۸ر اکتوبر کو صبح کے وقت کوئی پروگرام طے نہیں تھا۔ امیر محترم اپنی قیام گاہ پر مقیم رہے۔ اس دوران تمام رفقاء مع ناظم اعلیٰ جناب عبدالخالق صاحب جلسہ گاہ کے انتظامات میں مصروف رہے۔ سٹیج تیار کیا گیا' کرسیاں لگائی گئیں' دریاں بچھائی گئیں۔ دو بجے تک الحمدللہ کہ تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ ناظم اعلیٰ لاہور سے کچھ بینرز اپنے ہمراہ لائے تھے جن کو جلسہ گاہ میں خوبصورتی کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ مختلف سمتوں میں لاؤڈ سپیکر نصب کئے گئے تھے نیز جلسہ گاہ سے متصل ایک بڑا مکتبہ بھی لگایا گیا تھا۔ جلسہ اپنے مقررہ وقت پر شروع ہوا۔ قاری شاہد اسلام بٹ صاحب نے تلاوت کلام پاک سے کارروائی کا آغاز کیا اور سٹیج سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیئے۔ بعد ازاں تنظیم اسلامی کوئٹہ کے امیر جناب راشد گنگوہی صاحب نے نہایت عمدہ اور مؤثر انداز میں تنظیم اسلامی کا تعارف شرکاء جلسہ کے سامنے پیش کیا۔ سوا تین بجے امیر محترم نے "پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا مصطفوی طریق" کے موضوع پر اپنی مدلّل تقریر کا آغاز فرمایا۔ سامعین نے بڑی دلچسپی و دلجمعی اور پورے اطمینان سے امیر محترم کو سنا۔ تقریر کے دوران قریبی مسجد سے نماز عصر کی اذان شروع ہو گئی تو امیر محترم نے اذان کے دوران تقریر روک دی اور اعلان فرمایا کہ جلسہ کی کارروائی چونکہ نماز سے قبل ختم کر دی جائے گی تاکہ نماز باجماعت ادا کی جا سکے' لہٰذا موضوع کے آخری حصہ کی تکمیل اگلے روز جمعہ کے خطاب کے دوران کی جائے گی۔ یوں یہ جلسہ تقریباً پونے پانچ بجے بخیرو

خوبی اختتام کو پہنچا۔ جلسہ گاہ میں تین سو کرسیاں لگائی گئی تھیں جو تمام پُر ہو گئی تھیں۔ کہنے کو یہ ایک مختصر جلسہ تھا لیکن جس انتخابی ہنگامہ آرائی اور نامساعد حالات میں یہ جلسہ منعقد ہوا تو ایسے میں اتنی حاضری کو بھی ہم اللہ کریم کی مدد اور اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں۔

تیسرے دن ۱۹؍ اکتوبر کو پروگرام کے مطابق امیر محترم کا مسجد طوبیٰ میں نماز جمعہ سے قبل خطاب طے تھا۔ چنانچہ تقریباً بارہ بج کر پچیس منٹ پر امیر محترم نے اپنی تقریر کا آغاز فرمایا جس میں اسلامی انقلاب کے مراحل بیان فرمائے اور گزشتہ روز جلسۂ عام میں جو موضوع تشنہ رہ گیا تھا اُس کی بھی تکمیل کی۔ حاضرین کی کافی تعداد امیر محترم کو سننے کے لئے بروقت مسجد طوبیٰ پہنچ گئی تھی۔ مسجد اور اُس کا اوپری ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کی ایک معتدبہ تعداد نے اندر جگہ نہ ملنے کی وجہ سے باہر سڑک پر نماز ادا کی۔ یہاں بھی مکتبہ لگایا گیا تھا۔

اِسی روز شام پانچ بجے انجمن خدام القرآن بلوچستان کا پہلا سالانہ اجلاس ہوٹل شیٹ میں منعقد ہوا۔ قاری شاہد اسلام بٹ صاحب کی تلاوت سے کارروائی کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں راقم الحروف نے بحیثیت معتمد عمومی انجمن کی سال گزشتہ کی کارروائی پیش کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کچھ تجاویز پیش کیں نیز انجمن کے دستور میں دو ترمیمات پیش کیں جن میں قابل ذکر انجمن کے عہدیداران میں نائب صدر کے عہدہ کا اضافہ تھا جس کی ضرورت کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر محسوس کی جارہی تھی اراکین جنرل باڈی نے ان تجاویز ترمیمات کی منظوری دی۔ بعد ازاں انجمن کے صدر مؤسّس نے جن کی زیر صدارت یہ اجلاس منعقد کیا گیا تھا' نصف گھنٹہ کا خطاب فرمایا جس میں دیگر انجمنوں کے مقابلہ میں صدر مؤسّس نے بلوچستان کی انجمن کی کارکردگی پر کسی قدر عدم اطمینان کا اظہار فرمایا خصوصاً اس حوالہ سے کہ ایک سال کے اندر انجمن کوئی زمین حاصل نہ کر سکی۔ یہ جنرل باڈی میٹنگ تھی اور اس میں ایک سال کے لئے مجلس منتظمہ کے اراکین کا انتخاب بھی ہونا تھا۔ امیر محترم نے اراکین کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ چونکہ ابھی انجمن نئی ہے اور اس لحاظ سے موجودہ مجلس منتظمہ کی کارکردگی بھی تسلی بخش ہے لہٰذا موجودہ سال میں اس مجلس منتظمہ کو ہی برقرار رکھا جائے۔ تمام اراکین نے اس کی منظوری دی۔ صدر مؤسّس نے راقم الحروف کو نائب صدر کے عہدہ پر اور قاری شاہد اسلام بٹ صاحب کو بحیثیت معتمد عمومی نامزد فرمایا۔ انجمن بلوچستان کے صدر جو ہمارے تنظیمی رفیق بھی ہیں اپنی اہلیہ محترمہ کے کراچی میں انتقال کر جانے کی وجہ سے اس اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ راقم الحروف نے معزز اراکین کے سامنے قرارداد تعزیت پیش کی۔ نیز صدر مؤسّس سے خصوصی طور پر مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ جناب صدر نے دعا

فرمائی اور اس طرح یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ آخر میں مہمانوں کی چائے سے تواضع کی گئی۔ اس پروگرام میں انجمن کے تمام اراکین کو جن کی تعداد ۸۳ ہے' مدعو کیا گیا تھا جس میں سے تقریباً پچاس اراکین نے شرکت فرمائی۔ مغرب کی نماز باجماعت ہوٹل میں ہی ادا کی گئی' چونکہ آخری پروگرام سوال و جواب کی خصوصی نشست کی صورت میں اسی ہوٹل میں منعقد ہونا تھا۔

نماز مغرب کے بعد ساڑھے چھ بجے اس نشست کی کارروائی شروع ہوئی۔ یہ ایک بھرپور نشست تھی جس میں تقریباً ایک سو افراد نے شرکت کی۔ سوالات تحریری طور پر ہوئے اور بڑے بھرپور انداز میں ہوئے۔ امیر محترم نے مفصّل طور پر جوابات عنایت فرمائے۔ اور کچھ باتیں جو جلسۂ عام یا خطاب جمعہ کے دوران تشنہ رہ گئی تھیں بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آئیں۔ اس نشست کے شرکاء کے تاثرات یہ تھے کہ اُن کے اشکالات کافی حد تک رفع ہوئے ہیں۔ یہ نشست سوا آٹھ بجے اختتام پذیر ہوئی۔ اسی قسم کی ایک محدود نشست گزشتہ شب کوئٹہ کی تنظیم کے امیر جناب راشد گنگوہی صاحب کے گھر پر بھی منعقد ہوئی تھی جس میں گنگوہی صاحب نے اپنے پندرہ سولہ احباب کو مدعو کیا تھا جس میں شرکاء نے امیر محترم کے ساتھ باہمی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو کی۔

اگلے روز ۲۰ر اکتوبر کو امیر محترم اپنے دورۂ کوئٹہ کے اختتام پر صبح دس بجے عازم لاہور ہوگئے۔ کچھ رفقاء ملاقات کے لئے صبح ہی ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ راقم الحروف کے علاوہ جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب' جناب راشد گنگوہی صاحب جناب اکرام الحق صاحب اور جناب سلطان محمود صاحب نے ایرپورٹ پر امیر محترم کو رخصت کیا اور خدا حافظ کہا۔ جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب اسی شام بذریعہ اباسین ایکسپریس سکھر کے لئے روانہ ہوئے۔

تنظیم اسلامی کوئٹہ کے رفقاء کی جماعت اگرچہ ایک چھوٹی سی جماعت ہے تاہم اللہ کی تائید و توفیق سے ان مٹھی بھر رفقاء نے اس دورہ کے لئے انتہائی جانفشانی سے کام کیا۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے اُن کی محنت کو بھی قبول فرمایا اور اُن کی دعاؤں کو بھی سن لیا اور اُن کی جدوجہد اور کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ یقیناً اس پورے پروگرام کی کامیابی کا سہرا انہی کے سر ہے۔ مزید بر آں اس دورہ سے اُن کا جمود بھی ٹوٹا اور اُن کے اندر جذبہ مزید پروان چڑھا۔ ابھی کام ختم نہیں ہوا بلکہ "وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے" کے مصداق شرکاءِ جلسہ اور خصوصی نشست سوال و جواب کے حوالہ سے بہت سے احباب کے پتے ہمارے پاس آگئے ہیں جن کے ساتھ انشاء اللہ عنقریب ذاتی رابطوں کا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔

بڑی زیادتی ہوگی کہ اگر رفیق محترم جناب سلطان محمود کا شکریہ ادا نہ کیا جائے کہ انہوں نے اپنی کاروباری مصروفیات کو تج کر اپنا قیمتی وقت اور اپنی ذاتی گاڑی ان دنوں امیر محترم کی خدمت کے لیے وقف کئے رکھی۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کے اجر سے اُن کو نوازے۔ آمین۔ اس ضمن میں ہماری شدید خواہش اور تمنا ہے کہ اللہ کریم انہیں اقامتِ دین کی جدوجہد کی راہ میں پھر سے فعال بنا دے تاکہ ایک کھویا اور بچھڑا ہوا اہل اور تعلیم یافتہ ساتھی دوبارہ ہم سے آملے۔

حلقہ وسطی پنجاب کے ماہانہ دعوتی پروگرام کی رپورٹ

حلقہ وسطی پنجاب کے ماہانہ دعوتی پروگرام کے لئے اس مرتبہ تنظیم اسلامی فیروز والہ کی حدود کا تعین ہوا۔ پروگرام کے مطابق ناظمِ حلقہ جناب شمس الحق اعوان صاحب مورخہ 90-10-16 بعد نماز مغرب فیروز والہ میں تشریف لے آئے۔ تنظیم اسلامی فیروز والہ کے دفتر میں ایک اجلاس ہوا۔ جس میں ناظم حلقہ وسطی پنجاب، امیر تنظیم اسلامی فیروز والہ معہ ناظم، ناظم بیت المال، نقباء اور بعض رفقاء نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں آئندہ دو روزہ پروگراموں کے بارے میں مشورہ ہوا۔ اور تفاصیل طے کی گئیں۔

پروگرام کے مطابق مورخہ ۹۰-۱۰-۱۷ کو گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج شاہدرہ کے باہر صبح آٹھ بجے ایک کیمپ نصب کیا گیا۔ جہاں سے کالج کے طلبہ میں تنظیم اسلامی کا لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ جس میں اسلام کے نفاذ کے ضمن میں انتخابی سیاست کے طریق کار اور انقلابی جدوجہد کے طریق کار کے موازنے پر مشتمل حال ہی میں شائع شدہ دو ورقہ اور تنظیم اسلامی کے تعارف اور اسلام کے انقلابی منشور پر مشتمل پمفلٹ شامل تھا۔

دورانِ تقسیم لٹریچر طلباء نے کیمپ پر موجود رفقاء سے رابطہ بھی کیا۔ تاہم ۱۰ بجے کے قریب کالج کی طلبہ تنظیم ایم ایس ایف کے کچھ طلبہ کیمپ پر آئے اور نہایت درشت لہجے میں کیمپ کو ہٹانے کے لئے کہا۔ افہام و تفہیم کی بہت کوشش کی لیکن سود مند ثابت نہ ہو سکی۔ چنانچہ کیمپ کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تاکہ کسی ہنگامہ میں نہ الجھا جائے۔ البتہ لٹریچر کی تقسیم جاری رہی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد رفقاء ایک رفیق اقبال حسین صاحب کے گھر جمع ہوئے اور مزید مشورہ کے بعد دعوتی پروگرام کا آغاز کر دیا گیا۔ مرکز تنظیم اسلامی کی طرف سے مہیا کردہ گاڑی پر نصب شدہ سپیکر کے ذریعے شاہدرہ کے کچھ علاقہ میں بعد نماز عشاء منعقد ہونے والے اجتماع عام کی اناؤنسمنٹ کی گئی۔

روڈ پر دوکانداروں کو خصوصی دعوت نامے تقسیم کئے گئے اور لوگوں سے ذاتی ملاقات کر کے شرکت کی دعوت دی گئی۔ بعد نماز عشاء اجتماع عام منعقد ہوا۔ جس میں حاضرین کی تعداد ۶۰ تھی۔ کاروائی کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد دو نعتیں پڑھی گئیں۔ پھر نعیم مدنان صاحب نے "نبی اکرمؐ کا مقصد بعثت" کے عنوان پر اور بعد میں جناب شمس الحق اعوان ب نے "طریقِ انقلاب از سیرتِ رسولؐ" پر خطاب کیا۔ حاضرین نے پوری توجہ اور دلجمعی سے و کو سنا۔

۱۸ اکتوبر کو صبح آٹھ بجے طے شدہ پروگرام کے مطابق تنظیم کے رفقاء گورنمنٹ ایم۔ پی۔ ہائی سکول پہنچ گئے۔ وہاں جناب مختار حسین فاروقی صاحب نے اسکول اسمبلی میں طلبہ اور اساتذہ مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے موضوع پر خطاب کیا۔ طلبہ اور اساتذہ نے دلچسپی اور ل سے اس خطاب کو سنا۔ اس کے بعد ہائی کلاس کے طلبہ کو اور اساتذہ میں لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ کو "قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں" اور اساتذہ کو "فرائضِ دینی کا جامع تصور" نامی کتابچے پیش کئے ے۔

وہاں سے واپسی پر طے پایا کہ ظہر تک ایسے رفقاء سے ملاقات کی جائے جو کسی وجہ سے نظم پابندی میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس کے علاوہ ایسے لوگوں سے بھی ملاقات کی جائے جو یم کے فکر سے متفق ہیں۔ وقت کی کمی کے باعث زیادہ افراد سے ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ جتنے قاء یا افراد سے بھی ملاقات ہوئی وہ کافی مفید رہی۔ اس کے بعد رچنا ٹاؤن، کالج روڈ پر جلسہ عام کے ئے اناؤنسمنٹ نماز ظہر تا مغرب جاری رہی۔ جس میں شرکت کے لئے لوگوں کو خصوصی دعوت ے بھی دیئے گئے۔ بعد نماز عشاء جلسہ کی کاروائی کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ اور پھر اسٹیج برٹری نے تنظیم کا مختصر تعارف کروایا۔ جناب شمس الحق اعوان صاحب نے "مسلمانوں کی دینی ذمہ ریاں" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اور آخر میں جناب نعیم اختر عدنان صاحب نے "طریق انقلاب اور ں کے مراحل" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ یہ جلسہ تقریباً دو گھنٹے جاری رہا۔

اس دو روزہ پروگرام میں مرکز کی جانب سے بھرپور تعاون کیا گیا۔ دو دن تک مرکز کی گاڑی معہ پیکر ہمارے ہاں موجود رہی جو واقعتاً بہت مفید ثابت ہوئی۔ جس کے لئے ہم جناب چوہدری لام محمد صاحب کے بہت مشکور ہیں۔

اس پروگرام میں رفقاء کا جوش و جذبہ قابل رشک تھا۔ اور رفقاء کی پوشیدہ صلاحیتیں واضح وئیں۔ امید ہے جو آئندہ چل کر مزید نکھر کر سامنے آئیں گی اور مفید ثابت ہوں گی۔

اسلامی نظام کے قیام کے عظیم مقصد
کے نقطۂ نظر سے
انتخابی کشمکش اور انقلابی جدوجہد
کا تقابلی مطالعہ اور میزانیۂ نفع و نقصان

شائع کردہ
مرکزی شعبۂ نشر و اشاعت تنظیمِ اسلامی پاکستان
۶۷ - اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور (فون: ۳۰۵۱۱۰)

تنظیمِ اسلامی پاکستان، سلطنتِ خداداد پاکستان کی بقا اور سالمیت کے لیے دستور اور قانون کی بالادستی اور جمہوری، سیاسی اور انتخابی عمل کے تسلسل کو لازم اور ناگزیر سمجھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی شدت سے قائل ہے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام انتخابات کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے منکرات و فواحش، اور ظلم و استحصال کے خلاف ایک منظم مطالباتی اور مظاہراتی جدوجہد لازمی ہے، جس میں وہ لوگ اپنی جان و مال کا نذرانہ پیش کر کے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں جو پہلے خود اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار کے اندر احکامِ شریعت کو نافذ کر چکے ہوں۔ اندرونی صفحات میں ان حضرات کے غور و فکر کے لیے انتخابی سیاست اور انقلابی جدوجہد کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ انتخابی عمل کے ذریعے اسلامی نظام قائم کیا جا سکتا ہے ـــــــ واضح رہے کہ ہمیں اُن کے خلوصِ نیت پر ہرگز کوئی شک نہیں ہے لیکن ہمارے نزدیک نصح و خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ان کی غلط فہمی کے ازالے کی کوشش کی جائے ـــــــ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ!

انتخابی سیاست بمقابلہ انقلابی جدوجہد

اہداف وامکانات

انتخابی سیاست

- اصلاً حکومت چلانے والے ہاتھوں کی تبدیلی
- نظام میں صرف سطحی اور جزوی اصلاح کا امکان

انقلابی جدوجہد

- سماجی ' سیاسی اور معاشی تمام سطحوں پر ظلم استحصال کا مکمل خاتمہ
- اسلام کے کامل نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام و نفاذ!

طریقِ کار اور لازمی تقاضے

انتخابی سیاست

- ساری بحث وقتی مسائل کے بارے میں
- اصل زور نعروں پر
- صرف اسلام پسندی پر اکتفا
- اصلاحِ عقائد غیر ضروری ' بلکہ مُضر
- تعمیرِ سیرت وقت کا ضیاع
- ڈھیلی ڈھالی رکنیت سازی
- ذاتی و جماعتی پبلسٹی اور نمود و نمائش
- سارا زور دنیوی بہبود اور اس کے ضمن میں آسمان اور زمین کے قلابے ملانے پر!
- علاقائی ' گروہی اور طبقاتی مفادات کی دُہائی!
- عوام سے ووٹوں کی بھیک مانگنا اور دھن ' دھونس اور دھاندلی کا بھرپور استعمال

انقلابی جدوجہد

- ماضی ' حال ' اور مستقبل کا گہرا شعور
- اصل توجہ سوچ کی تبدیلی پر
- احکامِ شریعت کی پابندی لازم
- صحیح عقائد نہایت ضروری
- تعمیرِ سیرت کامیابی کی لازمی شرط
- سمع و طاعت پر مبنی مضبوط تنظیم
- للّٰہیت ' اور نیکی کر دریا میں ڈال کا طرزِ عمل
- دنیا میں امن و چین اور عدل و انصاف کے ساتھ اصل زور آخرت کی نجات پر!
- پوری نوعِ انسانی اور بالخصوص امتِ مسلمہ کی خیر
- منکرات کے خلاف جہاد اور استحصالی ہتھکنڈوں کے خلاف پرامن اور منظم مظاہرے!

کامیابی کے بنیادی لوازم

انتخابی سیاست

- محض عددی اکثریت ' خواہ بے شعور بلکہ فاسق و فاجر لوگوں پر مشتمل ہو!
- عوام کی پسند و ناپسند ہمیشہ مقدم!
- سکۂ رائج الوقت یعنی پیسہ ' برادری ' اور سرمایہ داری ' جاگیرداری ' قبائلی سرداری اور مزاروں کی سجادہ نشینی پر مبنی دنیوی وجاہت کی مناسب پذیرائی!

انقلابی جدوجہد

- تربیت یافتہ ' منظم اور ایثار پیشہ لوگ خواہ اقلیت ہی میں ہوں
- ہر موقع پر صرف اللہ اور رسولؐ کی پسند و ناپسند
- اصل اہمیت اور قدر و منزلت کا معیار ایمان ' اللہ اور رسولؐ کی سچی وفاداری ' جانی و مالی قربانی ' جوشِ جہاد و ذوقِ شہادت!

- رشوت، جوڑ توڑ اور ضمیر کے سودے
- بے اصول اور اَن مِل بے جوڑ اتحاد، جن میں قیادت کی رسہ کشی لازم!

○ اللہ کے ہاتھ جان اور مال کی "بیع" یعنی فروخت

○ ایک امیر کی "بیعت" پر مبنی "حزب اللہ" کا قیام!

نتائج اور میزانیۂ نفع ونقصان

- مذہبی جماعتوں کا باہمی تصادم، اور فرقہ واریت کا فروغ
- اسلام پسند ووٹروں کی تقسیم، اور الحادی قوتوں کی بالواسطہ تقویت اور ان کی کامیابی کا سبب!
- عوام الناس کی مذہبی جماعتوں سے بیزاری اور ملک و ملت کے مستقبل سے ناامیدی!

○ ہر مکتب فکر کے مخلص 'سرفروشوں' کے اتحاد سے فرقہ واریت کی نفی!

○ انقلابی لوگ خود امیدوار نہ ہونے کے باعث دوٹوں کی تقسیم کے الزام سے بری اور انتخابات میں مذہبی جماعتوں کی بالواسطہ تقویت کا ذریعہ

○ دین اور رجالِ دین پر عوامی اعتماد کی بحالی، اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں شمولیت پر آمادگی

پاکستان کی چوالیس۴۴ سالہ تاریخ کی گواہی

○ انتخابات کے میدان میں مذہبی عناصر ہمیشہ باہم متصادم —— اور مختلف سیکولر جماعتوں کا ضمیمہ بنے —— اور نتیجۃً غیر مؤثر رہے!

○ اکثر و بیشتر طالع آزما اور اقتدار کے حریص لوگ ہی آگے آتے رہے —— اور معاشرے میں سرمایہ پرستی، کرپشن اور لوٹ کھسوٹ ہی کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔

○ مطالباتی اور مظاہراتی مہموں کی قیادت ہمیشہ رجالِ دین کے پاس رہی اور کامیابی نے بھی ہمیشہ قدم چومے (مثالیں: مطالبۂ قراردادِ مقاصد، تحریک ختم نبوت سے وغیرہ)

○ مطالباتی اور مظاہراتی مہموں کے دوران مخلص اور ایثار پیشہ کارکنوں کے جوہر نمایاں ہوئے —— یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں انتخابی سیاست نے انہیں پھر پیچھے دھکیل دیا۔

حاصلِ کلام

کم ازکم اسلامی نظام کے قیام کے اعتبار سے انتخابی سیاست پر علامہ اقبال کی یہ پھبتی صد فیصد چسپاں ہوتی ہے کہ ؎

الیکشن، ممبری، کرسی، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

کاش کہ جملہ مذہبی جماعتیں علامہ اقبال کے بقول "اپنے عمل کا حساب" کر سکیں، اور یہ جان لیں کہ اسلام کے مکمل نظام کا قیام انقلابی جدوجہد کا متقاضی ہے:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات، کشمکشِ انقلاب

فاعتبروا یا اولی الابصار!

نوٹ: قارئین میثاق، یہ کتاب ماہنامہ میثاق کے مرکزی دفتر، ۳۶ کے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں میں قائم انجمن اور تنظیم کے مقامی دفاتر سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت

جلد :	۳۹
شمارہ :	۱۲
جمادی الاولیٰ	۱۴۱۱ھ
دسمبر	۱۹۹۰ء
فی شمارہ	۵/-
سالانہ زرِ تعاون	۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/=
c/o Dr Khursid A Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove I L 60516
Tel : 312 969 6755

c/o Mr Rashid A Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel 313 977 8081

CANADA US $ 12/=
c/o Mr Anwar H Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2 Z 2
Tel 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/=
c/o Mr Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlesex EN 34 RP
Tel 01 805 8732

MID EAST DR 25/=
c/o Mr. M Ashraf Faruq
JKQ P.O. Box 27628
Abdu Dhabi
Tel : 479 192

INDIA US $ 6/=
c/o Mr Hyder M D Ghauri
AKQ 4-1-444, 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel 42127

K S A SR 25/=
c/o Mr. M. Rashid Umar
P O Box 251
Riyadh 11411
Tel : 476 8177

JEDDAH (only) SR 25/=
IFTIKHAR-UD-DIN
Manarah Market,
Hayy-ul-Aziziyah,
JEDDAH
TEL 6702180

D.D./Ch. To, Maktaba Markazi Anjuman Khudam ul Quran Lahore
U B L Model Town Ferozpur Rd Lahore.

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

۲۹ نومبر کو حسبِ اعلان تنظیم اسلامی کے زیرِ اہتمام سرگودھا میں جلسۂ عام منعقد ہوا۔ اس سے قبل ۲۴ تاریخ کو راولپنڈی میں رفقاءِ تنظیم کی کوششوں سے ایک بھرپور جلسۂ عام کا انعقاد عمل میں آچکا ہے[1]۔ حسبِ سابق اِن دونوں جلسوں میں مرکزی خطاب امیرِ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہی کا تھا —— قبل ازیں لاہور، پشاور اور کوئٹہ میں بھی ایسے پروگرام منعقد کیے جا چکے ہیں اور ہر سہ مقامات پر امیر تنظیم ہی مرکزی مقرر تھے۔ یہ جلسے، جیسا کہ قارئین کے علم میں ہے، عوامی سطح پر تنظیم اسلامی کے تعارف کی ابتدائی کوشش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس اعتبار سے انہیں عوام میں تنظیم اسلامی کا پہلا باقاعدہ EXPOSURE قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر بڑے شہر میں جلسے سے خطاب کے لیے امیر تنظیم اسلامی ہی کو زحمت دی گئی —— امیر محترم کے خطاب کا موضوع قریباً ہر جگہ یکساں رہا۔ لاہور میں جلسے کے لیے خطاب کا عنوان 'نظامِ مصطفٰیؐ کے نفاذ کا مصطفوی طریق' تجویز کیا گیا تھا۔ معمولی سے لفظی تغیر کے ساتھ یہ عنوان ہر جگہ خطاب کا موضوع بنتا رہا۔ اِن خطابات میں امیر تنظیم اسلامی نے انقلابِ نبویؐ کے چھ مراحل کو ایک نئے انداز میں دو جامع اصطلاحات یعنی 'جہاد بالقرآن' اور 'جہاد بالقوۃ' کے حوالے سے بیان کیا۔

امیر محترم کے لیے اِس موضوع پر خطاب کا یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا۔ اس سے قبل آپ نے اس موضوع پر تفصیل سے اظہارِ خیال فرمایا ہے بلکہ امیر تنظیم کے گیارہ خطابات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب 'منہج انقلابِ نبوی' کی طباعت کو بھی اب چار برس ہونے کو آتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ۲۴ اکتوبر کو لاہور میں ہونے والے جلسۂ عام کے بعد معاصر 'نوائے وقت' کے ایک کالم نگار نے 'سرِ راہے' میں جلسے پر تبصرہ

---

[1] اس جلسے کی ایک مختصر رپورٹ اسی شمارے میں شامل ہے۔

کرتے ہوئے جب یہ الزام لگایا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطاب میں اور تو سب کچھ بتایا لیکن اصل موضوع یعنی انقلاب کے مصطفوی طریق پر کوئی روشنی نہیں ڈالی، بلکہ موصوف نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے آج تک اس موضوع کو کبھی وضاحت سے بیان ہی نہیں کیا، تو امیر تنظیم اسلامی کے ساتھ ساتھ اُن کے رفقاء واحباب کو بھی مدیر سمراہے کی اس مغالطہ آمیزی اور اس تجاہلِ عارفانہ پر شدید حیرت ہوئی کہ ع "جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے!" کے مصداق جس بات سے سارا جہاں واقف ہے اور جو امیر تنظیم کی پہچان بن چکی ہے، فاضل کالم نگار اُسی سے عدمِ واقفیت کا اظہار فرمارہے ہیں! ــــــ ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے! ــــــ چنانچہ ۲ر نومبر کے خطابِ جمعہ میں امیرِ تنظیم نے مدیرِ سمراہے کی اس مغالطہ انگیزی کو افسوسناک قرار دیتے ہوئے اسلامی انقلاب کے طریق کار کو نہایت واضح، دوٹوک اور واشگاف الفاظ میں شرکاء اجتماع جمعہ کے سامنے رکھا۔ اس اہم خطاب کو مرتب کر کے ضروری حک و اضافے کے ساتھ اسی شمارے میں شائع کیا جارہا ہے۔

قرآن کالج میں ایف اے کلاس کا آغاز ۱۹۸۹ء میں کیا گیا تھا۔ پیشِ نظر یہ ہدف کہ میٹرک پاس طلبہ کو کُل چار سالوں میں نہ صرف یہ کہ گریجویشن کرادی جائے گی بلکہ ساتھ ہی ساتھ دینی تعلیم کا ایک معیّن نصاب بھی مکمل کرایا جائے گا ــــ دینی تعلیم کی تدریس کے لیے ہم اُس اضافی وقت کو اپنے کام میں لانا چاہتے تھے جو عام کالجوں میں کئی کئی ماہ کی مسلسل چھٹیوں اور بے قاعدہ پڑھائی کے سبب سے ضائع ہو جاتا ہے ــــ ہمیں اپنی اس اسکیم میں گو ابھی تک مطلوبہ درجے کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے تاہم اس معاملے میں ہم نا اُمید بھی نہیں ہیں۔ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ ہماری کوششیں بتدریج بار آور ہو رہی ہیں ــــ ابھی حال ہی میں انٹرمیڈیٹ بورڈ کے ایک فیصلے کے باعث ہمیں ایک نئی اور پیچیدہ صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے ـ بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کا یکجا دوسرے سال امتحان لینے کے بجائے بورڈ ہر سال فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کا الگ الگ امتحان لے گا ــــ یہ نیا فیصلہ اگرچہ بعض اعتبارات سے خوش آئند ہے لیکن ہماری تعلیمی پالیسی کے

ذ کچھ زیادہ موافقت نہیں رکھتا۔ اس صورتِ حال سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کے
قرآن کالج کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سال فرسٹ ایر میں داخلوں کے لیے
رک کے رزلٹ نکلنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا بلکہ میٹرک کے امتحانات کے خاتمے کے فوراً بعد
ن کالج میں طلبہ کو فرسٹ ایر میں داخلہ دے دیا جائے گا۔ تاکہ فرسٹ ایر کی مناسب
ری کے لیے مزید وقت میسّر آسکے ۔ میٹرک کا رزلٹ نکلنے پر جو طلبہ امتحان میں کامیاب
رہ پائیں گے اُن کے قرآن کالج میں داخلے برقرار رہیں گے اور جو طلبہ ناکام ہو جائیں گے اُن
ے داخلے از خود ساقط ہو جائیں گے۔ تاہم یہ خیال کرنا مناسب نہ ہوگا کہ ان ناکام طلبہ کا
تمام وقت رائیگاں اور اکارت جائے گا! ۔ ان دو تین ماہ کے دوران یہ طلبہ بھی کچھ نہ
کچھ حاصل کر کے قرآن کالج سے رخصت ہوں گے ۔ داخلوں کے لیے معیّن تاریخ کا
علان تو آئندہ اشاعت ہی میں کیا جا سکے گا، تاہم رفقاء و احباب سے گزارش ہے کہ وہ مذکورہ
لا امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ابھی سے فرسٹ ایر کے داخلوں کے لیے طلبہ کو ذہناً تیار کرنے
کی تگ و دو شروع کر دیں۔ اس معاملے میں ہم اپنے احباب کے تعاون کی شدید ضرورت
محسوس کرتے ہیں!

امیرِ تنظیم اسلامی کو دسمبر کے پہلے ہفتے میں پھر ایک بیرونِ ملک در پیش ہے۔ امریکہ کے
مغربی ساحل پر واقع ریاست کیلیفورنیا کی اورنج کاؤنٹی میں گارڈن گرو (GARDEN GRO-VE)
کے اسلامک سنٹر نے وسط دسمبر میں ایک انٹرنیشنل سیرت کانفرنس کا پروگرام ترتیب دیا ہے جس
میں امیرِ تنظیم اسلامی کو شرکت کی پُر زور دعوت موصول ہوئی ہے۔ خیال ہے کہ امیر محترم کو یہ دعوت
قبول کرتے ہی بنے گی۔ اس بار امیرِ محترم کا گلوب کے دوسری جانب سے واپسی کا سفر اختیار
کرنے کا خیال بن رہا ہے تاکہ واپسی کے سفر میں کوالالمپور (ملائشیا) کا دورہ بھی ممکن ہو سکے
ملائشیا میں مقیم ہمارے ایک رفیق بہت عرصے سے امیرِ محترم کے دورہ کے لیے زور لگائے
ہیں۔ کیا عجب کہ اُن کی یہ آرزو اس بار پوری ہو ہی جائے۔

DO'NT BETRY THE REPOSED TRUST

QUIT

The Inherited Ritualistic Belief and Sectarianism
and

ACQUIRE

The Real Iman (ایمان) by studying the

HOLY QURAN

WHO

Would know the best,

HOW

to convince man?
of course, the ONE WHO created man

THE MESSAGE OF AL-MIGHTY

wrapped up in veils is waiting to answer all your QUESTIONS, clear all your DOUBTS and LEAD you to

TRUTH

منجانب : ایک بندہ خدا

نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کا مصطفویؐ طریق

امیرِ تنظیم اسلامی کے حالیہ خطابات کا ملخص

اسلامی انقلاب اور اس کے نبوی طریقِ کار پر میں پچھلے سات آٹھ برسوں کے دوران متعدد بار گفتگو کر چکا ہوں اور اپنے طور پر مطمئن ہوں کہ جو بھی سمجھنا چاہے اس کے لئے نہایت واضح انداز میں بات بیان کی جا چکی ہے۔

یہاں تک کہ پاکستان ٹی وی کے نیشنل ہک اپ پر ہونے والے پروگرام "روبرو" میں میں نے اسے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور اس پروگرام میں مجھ سے cross - qu estioning کرنے والے ملک کے چوٹی کے دانشور حضرات کو میں نے الحمدللہ مسکت جوابات دے کر لاجواب کیا۔ پھر یہ کہ مسجد دارالسلام میں اس موضوع پر میں نے پوری گیارہ تقریریں کی ہیں جنہیں "منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے عنوان کے تحت کتابی صورت میں شائع ہوئے بھی اب کئی سال ہو چکے ہیں۔ بعد ازاں اس کے آخر میں ایک باب کا اضافہ بھی کر دیا گیا تھا کہ 'منہجِ انقلابِ نبویؐ' کے وہ کون سے پہلو ہیں جنہیں موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق نئی شکل دینا ہوگی اور جن میں ہمیں اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔ میں نے تفصیل سے واضح کیا ہے کہ ان میں کہاں کہاں اور کیا کیا فرق ہمیں کرنا ہوگا۔ گویا اسلامی انقلاب کے مصطفوی طریقِ کار پر میں تفصیلاً روشنی ڈال چکا ہوں' اپنی تقریروں میں بھی اور تحریروں میں بھی۔ میں آج اسی موضوع کو ایک مختلف اسلوب سے بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اسلوب کی تبدیلی کا انداز میں نے قرآن حکیم سے سیکھا ہے کہ 'تصریفِ آیات' قرآن کا مستقل اسلوب ہے۔ گویا ع

اِک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں!

مزید بر آں میں یہاں یہ کوشش بھی کروں گا کہ کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر واضح اور دو ٹوک انداز میں بات آپ کے سامنے رکھوں تاکہ یہ مضمون پوری طرح کھل کر اور عریاں ہو کر سامنے آجائے۔ ممکن ہے میری آج کی گفتگو بعض افراد یا بعض گروہوں کو کچھ تلخ محسوس ہو' تاہم ع ''نوارا تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی'' کے مصداق اس تلخ نوائی پر مجھے معذور سمجھا جائے!

مصطفوی نظام کیا ہے؟

نظامِ مصطفوی کے بارے میں ہمارے ملک میں دو بڑے مغالطے اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہی دو مغالطے ہیں جن کی وجہ سے اسلام کے نام پر قائم ہونے والے اس واحد ملک میں آج تک اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں ہو سکا۔

پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کو یا تو چند عبادات کا مجموعہ سمجھ لیا گیا اور یا پھر چند قوانین اور حدود و تعزیرات کا ضابطہ قرار دے لیا گیا۔ اس سے آگے ہمارے سامنے اسلام کے نظامِ اجتماعی کا کوئی نقشہ ہے ہی نہیں!۔ حالانکہ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ نماز روزے پر نہ تو انگریز کے دور میں کوئی پابندی تھی اور نہ بھارت میں آج کوئی قدغن ہے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان پاکستانی مسلمان کے مقابلے میں بحیثیت مجموعی زیادہ مذہبی ہے۔ اسی طرح امریکہ' انگلستان اور دوسرے غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں بھی نماز روزے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تبلیغی حضرات وہاں بڑے دھڑلے سے ائیرپورٹ پر باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امریکہ اور انگلستان میں مسلمان چرچ خرید کر انہیں مساجد میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں اسلامی نظام ہے؟ ہرگز نہیں! معلوم ہوا کہ اسلامی نظام کے معنی محض نماز روزہ نہیں ہیں۔ نماز روزہ کی اہمیت اور فرضیت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے' لیکن دنیا کو جو چیز درکار ہے وہ آپ کی نمازیں نہیں ہیں' بلکہ آپ کا وہ نظام ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا اور اس نظام کے معنی نماز روزہ نہیں' کچھ اور ہیں!

اسی طرح بعض عرب ممالک میں' جن میں سعودی عرب خاص طور سے قابلِ ذکر

ہے، کچھ اسلامی قوانین بھی نافذ ہیں۔ وہاں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور قتلِ عمد اور قتلِ خطا میں قصاص و دیت کے اسلامی قانون پر عمل ہوتا ہے۔ تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہاں اسلامی نظام قائم ہے؟ کیا یہ ملوکیت اور اس کا یہ جبر کہ وہاں کسی کو زبان تک کھولنے کا حق نہیں ہے، اسلامی نظام ہے؟ اسلامی نظام تو وہ تھا جہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر خلیفہ کو ایک عام مسلمان بھی برسرِ منبر ٹوک کر یہ سوال کر سکتا تھا کہ آپ کا یہ کُرتا کہاں سے بنا ہے؟ اور وہ عمر فاروقؓ جن کا دبدبہ اس وقت روئے ارضی کے ایک بہت بڑے حصّے پر تھا، جواباً یہ نہیں کہتے کہ تمہیں یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ معاملے کی پوری وضاحت پیش کرتے ہیں۔ اسلامی نظام یہ نہیں ہے کہ چند حدود و تعزیرات کا نفاذ کر دیا جائے اور خود مطلق العنان بادشاہ بن کر لوگوں کی گردنوں پر سوار ہو جایا جائے۔ آج عرب امراء و شیوخ اور بادشاہوں اور شہزادوں کے محلّات کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ ارب ہا ارب ڈالر کے خرچ سے تعمیر ہونے والے ایک ایک محل میں 'وہائٹ ہاؤس' جیسی کئی کئی عمارتیں سما سکتی ہیں۔ کیا یہ اسلامی نظام ہے؟ اسلامی نظام تو وہ تھا جس میں خلیفۂ وقت کو اپنی ذمہ داریوں اور ان کے بارے میں بارگاہ ربّ العزت میں مسئولیت کا اس قدر احساس تھا کہ وہ دجلہ و فرات کے کنارے بھوک سے مر جانے والے ایک کتے کی موت کا ذمہ دار بھی خود کو سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ یہ نظام ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا ذمہ دار ہے۔ اسلامی نظام وہ تھا جس میں بزور شمشیر فتح ہونے والی زمینوں کو خراجی زمینیں قرار دیا گیا اور انہیں مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بجائے بیت المال کی ملکیت قرار دیا گیا۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں جب شام و عراق کے علاقے فتح ہوئے جو اُس وقت 'Fertile Crescent' یعنی سونا اگلنے والے علاقے شمار ہوتے تھے تو مجاہدین نے مطالبہ کیا کہ حسبِ دستور اس 'مالِ غنیمت' میں سے پانچواں حصہ بیت المال کے لئے نکال کر باقی زمینیں ہمارے درمیان تقسیم کر دی جائیں۔ بادیٔ النظر میں مجاہدین کا یہ مطالبہ برحق تھا لیکن اگر اُس وقت حضرت عمرؓ اسے تسلیم کر لیتے تو حقیقت یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا سب سے بڑا جاگیردارانہ نظام وجود میں آجاتا۔ اس معاملے پر مجلس شوریٰ میں طویل بحث ہوئی۔ حضرت عمرؓ کا استدلال یہ تھا کہ اگر ایسا کر دیا جائے تو بعد میں آنے والے مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ جب

کہ قرآن حکیم میں تقسیمِ مال کے سلسلے میں مجاہدین و انصار کے علاوہ وَالَّذِينَ جَاءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ ... (الحشر: ۱۰) "کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ بالآخر حضرت عمر فاروق رضی نے اس اجتہاد پر اجماع ہو گیا کہ مال غنیمت کے قانون کا اطلاق صرف اموالِ منقولہ پر ہوگا اور زمینیں اموال منقولہ نہ ہونے کے باعث مالِ غنیمت قرار نہیں پائیں گی۔ چنانچہ یہ بیت المال کی ملکیت ہوں گی اور ان کے کاشتکاروں سے وصول ہونے والا خراج بیت المال میں جمع کیا جائے گا، تاکہ وہ تمام مسلمان کی بہبود پر خرچ ہو۔ اور عمر فاروق رضی کا یہ اجتہاد شریعتِ اسلامی میں ایک مستقل قانون کی حیثیت رکھتا ہے کہ جو بھی علاقہ کبھی بزور شمشیر فتح ہو اس کی زمینیں کسی فرد، خاندان یا قبیلے کی ملکیت نہیں ہوں گی، بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہوں گی اور یہ قانون حضرت عمر رضی کے دور سے لے کر خلافتِ عثمانیہ تک نافذ رہا جو موجودہ صدی کے ربعِ اوّل تک قائم رہی۔ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ۱۹۲۴ء میں ہوا ہے اور اُس وقت تک یہ قانون خلافتِ عثمانیہ کی عملداری میں رہنے والے تمام علاقے میں نافذ رہا جس میں حجاز، عراق، شام اور شمالی مصر کے علاوہ یورپ کا کافی علاقہ شامل تھا۔ ان تمام علاقوں کی زمینیں کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں تھیں، بلکہ ان کا خراج بیت المال میں جمع ہوتا تھا۔ صرف وہ زمینیں "عشری" تھیں، جنہیں مسلمانوں نے کبھی بزور شمشیر فتح نہیں کیا تھا۔ مثلاً مدینہ منورہ کی زمینیں وہاں کے مسلمانوں کی ملکیت ہی رہیں، کیونکہ اہلِ مدینہ تو خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مہمان بنا کر لے گئے تھے اور انہوں نے خود اسلام قبول کیا تھا۔ لہٰذا ان کی زمینیں عشری زمینیں رہیں۔ مسلمان جس طرح اپنے مال سے زکواۃ نکالتا ہے اسی طرح اپنی زمین سے عشر ادا کرتا ہے۔ لیکن پورے عالم اسلام میں جو علاقہ کسی بھی وقت مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کیا ہو اس کی زمینیں خراجی ہیں اور مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں۔ آج دنیا کو اسی نظام کی ضرورت ہے تاکہ جاگیرداری اور وڈیرہ شاہی کا خاتمہ ہو۔

اسلامی نظام وہ ہے جس میں انسان کو آزادی اور حریت حاصل ہو۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظامِ عدلِ اجتماعی ہمیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اپنے پورے جوبن پر نظر آتا ہے۔ دورِ فاروقی میں آزادی و حریت کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمر رضی کو جب یہ اطلاع ملی کہ ایران کے گورنر (جو فاتح ایران بھی تھے) سعد رضی بن ابی وقاص

نے اپنے مکان کے آگے ڈیوڑھی بنا کر وہاں ایک دربان کھڑا کر لیا ہے اور لوگوں نے ان کے مکان کو "قصرِ سعد" کہنا شروع کر دیا ہے تو عمر فاروقؓ نے اپنا خط دے کر فوراً ایک ایلچی کو اس حکم کے ساتھ روانہ کیا کہ سب سے پہلے جا کر سعدؓ کی ڈیوڑھی کو آگ لگا دینا اور پھر یہ خط اسے دینا۔ اپنے خط میں حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو ان الفاظ میں شدید ڈانٹ پلائی کہ: "مَتَى اسْتَعْبَدْتُمُ النَّاسَ وَقَدْ وَلَدَتْهُمْ أُمَّهَاتُهُمْ أَحْرَارًا، کرارے سعدؓ! تم نے لوگوں کو اپنا غلام کب سے بنا لیا ہے، جبکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا تھا؟ یعنی تم نے اپنے اور لوگوں کے درمیان دربان کھڑا کر کے کسریٰ کی روایت کو زندہ کر دیا ہے!

انسانی مساوات کی عظیم ترین مثال ہمیں حضرت عمرؓ کے سفرِ بیت المقدس میں نظر آتی ہے۔ یہ ان کا کوئی ذاتی سفر نہیں تھا، بلکہ آپؓ خلیفہ کی حیثیت سے بیت المقدس کا چارج لینے جا رہے تھے۔ آج ہمارے حکمرانوں کا یہ حال ہے کہ علاج کے لئے بھی سفر کریں تو پورا جہاز چارٹر کرایا جاتا ہے۔ سربراہِ حکومت عمرہ کے لئے جائیں تو دو سو آدمی ہمراہ ہوتے ہیں اور پی آئی اے کا پورا شیڈول درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروقؓ نے مدینہ سے بیت المقدس تک آٹھ سو میل کا سفر اس شان سے کیا کہ آپؓ اور آپ کے خادم کے لئے ایک ہی اونٹ تھا۔ اونٹ پر چونکہ زادِ راہ بھی تھا، لہٰذا ایک وقت میں ایک آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ چنانچہ ایک منزل آپؓ اونٹ پر بیٹھتے اور خادم نکیل پکڑ کر آگے چلتا اور اگلی منزل پر خادم اونٹ پر سوار ہوتا اور آپؓ نکیل پکڑ کر چلتے۔ جب آخری منزل آئی تو سوار ہونے کی باری خادم کی تھی۔ اس نے لاکھ عرض کیا کہ خدارا آپؓ اونٹ پر سوار ہو جایئے، لوگ کیا کہیں گے؟ لیکن آپؓ نے فرمایا کہ نہیں، باری تمہاری ہے، تمہیں اوپر بیٹھنا ہو گا! اور مسلمانوں کے امیرِ لشکر حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے بیت المقدس کے باہر امیر المومنین کا اس حال میں استقبال کیا کہ آپؓ اونٹ کی نکیل پکڑے آگے آگے چلے آ رہے تھے اور خادم اونٹ پر سوار تھا۔ یہ ہے اسلام کے نظامِ عدل و قسط میں حریت و اخوت و مساوات کی چند مثالیں! خلافتِ راشدہ کا یہ نقشہ اگرچہ اب بعینہٖ دنیا میں دوبارہ قائم نہیں ہو سکتا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام نے بلندیوں کی جو مثالیں قائم کر دکھائی ہیں نوعِ انسانی ان تک نہیں پہنچ سکتی، لیکن جب تک اس کا کوئی عکس دنیا کو نظر نہ آئے، کسی

ملک کے نظام کو دنیا اسلامی نظام نہیں مان سکتی! تو پہلا مغالطہ یہ رفع ہو جانا چاہئے کہ ہمارے سامنے جب بھی اسلام کا نام لیا جاتا ہے تو اس سے مراد محض نماز روزہ ہوتا ہے یا پھر چند قوانین اور سزائیں۔ جبکہ اسلامی نظام درحقیقت اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو کہا جائے گا جس میں معاشرتی' معاشی اور سیاسی سطح پر ظلم و ناانصافی' اونچ نیچ اور استحصال کا خاتمہ ہوگا' ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا اہتمام ہوگا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کے مطابق نیا بندوبستِ اراضی عمل میں آئے گا۔

مصطفوی انقلاب کیسے آسکتا ہے

اسلامی نظام کے بارے میں ہمارے ہاں دوسرا بڑا مغالطہ یہ ہے کہ ایک طرف یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ کام بھکشوانہ انداز کی تبلیغ سے ہو جائے گا اور دوسری طرف ابھی تک یہ بات ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے کہ اس کا نفاذ انتخابات کے ذریعے ممکن ہے!۔ حالانکہ بار بار کے تجربات کے بعد اب یہ مغالطہ آپ سے آپ رفع ہو جانا چاہئے۔

اس حوالے سے ایک اچھا جملہ ذہن میں آیا کہ اسلامی نظام کا قیام نہ بھکشوانہ تبلیغ سے ممکن ہے اور نہ ووٹوں کی بھیک سے! یہ درست ہے کہ کسی کو برائی سے روکنے کے لئے کبھی اس کی خوشامد بھی کرنی پڑتی ہے اور کبھی اس کی سخت بات کو برداشت کرنا بھی ضروری ہوتا ہے' دعوت کے مرحلے میں یہ طرزِ عمل اختیار کرنا لازمی ہے لیکن محض بھکشوانہ انداز کی تبلیغ سے کچھ لوگوں کے انفرادی عقائد و اعمال کی اصلاح تو ممکن ہے' انقلاب نہیں آسکتا'! .... اسی طرح ووٹوں کی بھیک سے بھی نظام میں جزوی اصلاح کی توقع تو کی جاسکتی ہے' نظام کو جڑ بنیاد سے تبدیل کرنا ممکن نہیں! ہمارا گذشتہ ۴۴ برس کا تجربہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کی سب سے بڑی اور منطقی وجہ یہ ہے کہ انتخابی سیاست میں ووٹوں کی تعداد فیصلہ کن ہوتی ہے جبکہ ووٹوں کی میزان میں ایک متقی اور ایک فاسق و فاجر شخص دونوں یکساں وزن رکھتے ہیں اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں مسلمان جینے اور مرنے کے پختہ عزم کے حامل لوگ عددی اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس تناظر میں سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۶ کا یہ اشارہ بہت بامعنی ہے

کہ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ "کہ اگر تم نے زمین میں رہنے والوں کی اکثریت کی پیروی کی تو تم بھٹک جاؤ گے اللہ کے راستے سے ـــــ پھر ہمارے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہماری ۸۵ فی صد آبادی کا تعلق دیہات سے ہے جہاں سرمایہ داروں' جاگیرداروں' وڈیروں' خان زادوں' پیروں' زمینداروں اور چوہدریوں کا اثر و رسوخ بے پناہ ہے۔ ہر دور میں یہی لوگ چہرے بدل کر اسمبلیوں میں پہنچتے رہے ہیں' اور چہرے بھی کیا اب تو صرف لیبل کی تبدیلی ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔ اس صورتِ حال میں کسی مؤثر تبدیلی کا دُور دُور امکان نہیں آتا۔ کیا یہ لوگ اسمبلیوں میں پہنچ کر اپنے مفادات پر کوئی آنچ آنے دیں گے؟ انہی لوگوں کے اثر و نفوذ کے باعث آئی ایم ایف اور امریکہ کے شدید دباؤ کے باوجود آج تک ملک میں زرعی ٹیکس کا نفاذ نہیں کیا جا سکا۔ تو کیا ان سے آپ حقیقی اسلامی نظام کے نفاذ کی آس لگائے بیٹھے ہیں؟ یہ بات جان لیجئے کہ انتخابات کے نتیجے میں بالعموم محض چہرے بلکہ لیبل تبدیل ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ذریعے سے نظام کو چلانے والے بہتر انتظامی ہاتھ میسر آ سکتے ہیں' نظام ہرگز تبدیل نہیں ہو سکتا!

مصطفوی انقلاب کے لیے جہاد ناگزیر ہے!

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اسلامی نظام کا قیام' انقلابِ اسلامی یا مصطفوی انقلاب صرف اور صرف جہاد کے ذریعے ممکن ہے ـــــ اور جہاد کے معنی تصادم اور ٹکراؤ کے ہیں! میرے یہ الفاظ ان "امن پسند" لوگوں کو یقیناً اچھے نہیں لگیں گے جو نہیں چاہتے کہ کسی کی نکسیر بھی پھوٹے۔ آپ ذرا جہاد کے معانی پر غور کیجئے' جہاد اور جہد کا فرق نوٹ کیجئے۔ 'جہد' کے معنی کوشش کے ہیں جو ایک یکطرفہ عمل ہے اور 'جہاد' کوششوں کی ٹکراؤ کا نام ہے۔ اسی طرح کام معاملہ 'قتل' اور 'قتال' کا ہے۔ قتل یکطرفہ عمل کو کہتے ہیں۔ کوئی شخص اگر دوسرے کو ہلاک کر دے تو اِس عمل کو قتل کہا جائے گا۔ جبکہ قتال ایک دو طرفہ عمل ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کے بالمقابل آ کر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ یہی فرق 'جہد' اور 'جہاد' میں ہے۔ جہاد محض کوشش نہیں دو طرفہ کوشش یعنی کشاکش کا نام ہے۔ اسی کے لئے

دوسرا لفظ تصادم یا ٹکراؤ کا ہے۔

جہاد کے دو مرحلے ہیں ۱۔ جہاد بالقرآن اور ۲۔ جہاد بالقوۃ۔ یعنی طاقت و قوت کے ساتھ جہاد۔ پہلا جہاد ہے فکری و نظری جہاد جو ہمیں قرآن کے بل پر کرنا ہوگا۔ اسے آپ 'بھکشوانہ جہاد' سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں اسے ایک مصرعے میں بیان کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ معانی کے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا حق ادا کیا ہے کہ ؏ "با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!"

مکے میں یہی جہاد جاری تھا۔ دعوت و تبلیغ کا کام بڑی دلسوزی اور ملائمت کے ساتھ کیا گیا، لوگوں کی گالیاں کھا کر بدلے میں انہیں دعائیں دی گئیں' پتھراؤ کے جواب میں پھول پیش کئے گئے۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں بھکشوانہ اور درویشانہ انداز کی تبلیغ ضروری ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ بھکشو درویش ہی کو کہتے ہیں۔ مکے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی یہی درویشانہ شان نمایاں نظر آتی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ فرعون جیسے سرکش کے بارے میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو یہ تاکید کی گئی کہ اسے اللہ کے دین کی دعوت دینے جاؤ تو اس سے نرم لہجے میں بات کرنا "فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ" سورۃ طٰہٰ' آیت ۴۴)۔ یہ ہے "با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن" کا مرحلہ' لیکن اس کے بعد ایک دوسرا مرحلہ بھی ناگزیر ہے جسے اقبال نے دوسرے مصرعے میں سمویا ہے : ؏ "چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن" کہ مناسب تربیت و تیاری کے بعد اب اپنے آپ کو سلطنتِ جم سے ٹکرا دو! ——

قوت کا قوت کے ساتھ ٹکراؤ اس راہ کی لازمی شرط ہے۔ قرآن نے سورۃ الانبیاء میں اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے : "بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ"۔ کہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے' پس وہ اسی دم ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ سورۃ الحدید میں فرمایا گیا : "وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ" کہ ہم نے صرف نصیحت و موعظت ہی نازل نہیں کی' باطل کی سرکوبی کے لئے لوہا بھی اتارا ہے جس میں جنگ کی بڑی صلاحیت ہے —— یہ دونوں مراحل باہم دگر مربوط ہیں۔ اب ہمیں بالترتیب ان دونوں کو تفصیل سے سمجھنا ہے ——

جہاد بالقرآن کے مراحل

جہاد بالقرآن کے مفہوم کی وضاحت کے لئے اس کے تین مراحل کو سمجھنا مفید ہوگا:

۱۔ دعوت و تذکیر: قرآن حکیم کے ذریعے دعوت و تبلیغ' تذکیر و یاددہانی اور انذار و تبشیر جہاد بالقرآن کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس لئے کہ اسلامی انقلاب کے لئے بنیاد نظریۂ توحید اور ایمان باللہ سے فراہم ہوتی ہے۔ اور ایمان کا منبع و سرچشمہ ہے قرآن حکیم' اور یہی اس کے لئے جِلا اور افزائش کا ذریعہ بھی ہے! قرآن کے ذریعے دعوت و تذکیر اور انذار و تبشیر معاشرے پر جس طور سے اثر انداز ہوتا ہے اُسے میں ایک تمثیل کے ذریعے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ خود قرآن حکیم کا یہ مستقل اسلوب ہے کہ دقیق اور لطیف مضامین کو بالعموم تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ انداز دیگر آسمانی کتب میں بھی ملتا ہے۔ خاص طور سے انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام تو ہے ہی تماثیل کے پیرایوں میں۔

میں قرآنی دعوت کے لئے جو تمثیل پیش کرنا چاہتا ہوں وہ مقناطیس (Magnet) کی ہے۔ ہائی سکول کے زمانے میں ہمیں ایک سادہ سا سائنسی تجربہ کرایا جاتا تھا کہ لوہ چون اور لکڑی کے برادے کو آپس میں ملا دیا جاتا۔ پھر ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ کرنے کے لئے مقناطیس استعمال کیا جاتا۔ لوہ چون مقناطیس کے ساتھ چمٹ جاتا' جبکہ لکڑی کا برادہ اس خاصیت سے محروم ہونے کے باعث مقناطیس سے جدا رہتا۔ چنانچہ اس طرح دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم ہو جاتی۔ گویا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔

اس مثال کو ذہن میں رکھئے اور اب غور کیجئے کہ انسانی معاشرہ مختلف اور متضاد طبائع رکھنے والے افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں سعید ارواح بھی ہوتی ہیں اور خبیث بھی۔ بدترین معاشرہ بھی سعید ارواح سے خالی نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ بعثت نبویؐ کے وقت عرب معاشرہ کس درجے کے زوال و انحطاط کا شکار تھا' لیکن کیا اسی معاشرے میں ابوبکر صدیق' عثمان بن عفّان' زید بن حارثہ اور عثمان بن مظعون (رضی اللہ عنہم اجمعین) جیسے تابناک کردار موجود نہیں تھے؟ جن کا نورِ فطرت نورِ وحی سے ہمکنار ہونے کے لئے پہلے ہی سے بے قرار تھا!۔ اسی معاشرے میں ابولہب' ابوجہل اور ولید بن مغیرہ

ے اشقیاء بھی تھے ' لیکن ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی موجود تھی جن کے اوپر اگرچہ ماحول کا غلاف آ گیا تھا مگر اندر نیکی کی چنگاری سلگ رہی تھی۔ اور جس طرح کھ کے غلاف میں مستور چنگاری کو اگر پھونک ماری جائے تو وہ آخرکار شعلہ بن کر ڑک اٹھتی ہے ' اسی طرح ان لوگوں میں بھی شعلۂ جوالہ بننے کی استعداد موجود تھی۔ ں قسم کے لوگوں کا غلاف اترنے اور ان کے اندر دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھنے میں کچھ ت ضرور لگا ـــ کسی کو کم کسی کو زیادہ' چنانچہ حضرت عمر اور حضرت حمزہ (رضی اللہ عنہما) . قرآن کی انقلابی دعوت قبول کرنے میں چھ سال لگ گئے۔ تو ہر معاشرے میں ہمیشہ یہی ں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اب ہمیں قرآن مجید کا ' مقناطیس ' لے کر اپنے اشرے میں نکلنا ہوگا۔ اسے معاشرے کے اندر چلایا جائے ' پھرایا جائے ' اس جام کو روش میں لایا جائے تاکہ جہاں جہاں نیکی بھلائی اور اچھائی کا جذبہ موجود ہے ' چاہے دبا را ہے ' وہ قرآن کے اس مقناطیس کے ساتھ چمٹتا چلا جائے۔ یہ قرآن اس معاشرے ے نیک و بد میں اسی طرح تمیز و تفریق کر دے گا جس طرح مقناطیس لوہ چون اور لکڑی ے برادے میں کر دیتا ہے اور "لِيَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ" کے مصداق نیک و سعید وحوں کو اپنی طرف کھینچ لے گا۔

ا۔ تزکیہ : جہاد بالقرآن کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ دعوت قرآنی کے نتیجے میں جمع نے والی پاکباز اور سعید روحوں کا اب قرآن ہی کے ذریعے تزکیہ کیا جائے۔ انہیں اس رآن کے ذریعے باطنی امراض سے پاک و صاف کیا جائے کہ وہ زر خالص ہو جائیں ' ندن بن جائیں۔ تزکیے کے اس عمل کے لئے قرآن سے استفادے کا بہترین طریق یہ ہے کہ راتوں کو کھڑے ہو کر اسے پڑھا جائے۔ اپنی راتوں کو اس کے ذریعے آباد کیا ئے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اس جانب واضح اشارہ موجود ہے : وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ ں قرآن کے ساتھ رات کا کچھ حصہ جاگ کر بسر کیا کرو)۔ قرآن کو اپنے دل و دماغ میں ذب کرنے کا یہ مؤثر ترین ذریعہ ہے اور اسی میں تمام باطنی اور روحانی امراض کا مداوا ہے۔ خود رب جلیل نے سورۃ یونس میں اسے "شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ" قرار دیا ہے۔ یہ یطان کے پھیلائے ہوئے زہر کا کامل تریاق ہے اور اسی طرح انسانی وجود میں سرایت کر تا ہے جس طرح زہر سرایت کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : اِنَّ

الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم[1] کہ شیطان تو انسان کے اندر خون کی مانند رواں ہو جاتا ہے۔ تو جس طرح مار گزیدہ شخص کے لئے محض مرہم پٹی نہیں ' بلکہ رگوں میں اتر جانے والا تریاق درکار ہوتا ہے اور SEPTI-CAEMIA جیسے مرض میں خون میں سرایت کر جانے والی دوا مطلوب ہوتی ہے ' اسی طرح شیطانی اثرات کے زہر کے لئے بھی دل و جان میں اتر جانے والا تریاق چاہئے ' اور ایسا تریاق صرف اور صرف قرآن حکیم ہے۔ اسی کی یہ شان ہے جسے علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود !

یعنی یہ قرآن جب کسی کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس کے باطن کی دنیا میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آلۂ تزکیہ بھی یہی قرآن ہی تھا۔ اسی کے ذریعے آنحضورؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نفوس کو انتہائی پاکیزہ اور طیبؓ بنایا اور انہیں ہر طرح کی کھوٹ اور آلودگی سے پاک کر دیا۔ سورۂ آل عمران میں صحابہ کرامؓ کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے : "ولیمحص ما فی قلوبکم" یعنی اے رسول اللہ کے ساتھیو! اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کسی قسم کے کھوٹ کی ذرہ برابر آمیزش بھی باقی نہ رہے۔ اللہ تمہیں اس لئے ان آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزار رہا ہے تاکہ تم بالکل کندن اور زر خالص بن جاؤ۔ تو یہ ہے جہاد بالقرآن کا دوسرا مرحلہ۔ یعنی دعوتِ قرآنی کے ذریعے معاشرے سے دستیاب ہونے والے نیک فطرت لوگوں کے پورے وجود کو تزکیۂ قرآنی کے ذریعے مکمل پاک کر دینا اور ان میں موجود ذرا سی بھی کھوٹ کا خاتمہ کر دینا۔

۳۔ تنظیم : جہاد بالقرآن کا تیسرا مرحلہ تنظیم ہے۔ یعنی ایک ایسی اجتماعیت کا قیام جس کا مرکز و محور قرآن ہو۔ اس کے لئے مقناطیس والی تمثیل کے ایک دوسرے پہلو پر غور کیجئے ' جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہو جائے گی۔ لوہے کے تمام ذرات جب مقناطیس سے چمٹ جاتے ہیں تو وہ ایک اعتبار سے آپس میں بھی گتھ جاتے ہیں۔ گویا ان

۱۔ متفق علیہ ، عن صفیہؓ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم

کا ایک باہمی نظم قائم ہو جاتا ہے۔ تو جہاد بالقرآن کے تیسرے مرحلے کے طور پر جو تنظیم قائم ہوگی وہ "QURAN - CENTERED" ہوگی۔ اسی کا اللہ نے قرآن میں بایں الفاظ حکم دیا ہے: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کہ مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور باہم متفرق نہ ہو! اور اللہ کی رسی یہی قرآن ہی تو ہے۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ میں یہی اللہ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے۔ چنانچہ اسی کو مل جل کر تھامنا ہوگا۔ اس سے چمٹ جانا ہوگا۔

دیکھئے' انسانی اتحاد کا سب سے بڑا عنصر ذہنی ہم آہنگی ہے۔ جانوروں کے گلے میں نظم قائم کرنے کے لئے ایک چرواہا اور اس کی لاٹھی کافی ہے' لیکن انسانی اجتماعیت کے لئے جو چیز سب سے ضروری ہے وہ ذہنی ہم آہنگی ہے۔ ذہنی ہم آہنگی کے بغیر کوئی اتحاد قائم کر لیا جائے تو وہ ایک مصنوعی اور ناپائیدار اتحاد ہوگا۔ ایسی اجتماعیت کا شیرازہ آج نہیں تو کل بکھر جائے گا۔ قرآن حکیم مسلمانوں کے لئے ذہنی ہم آہنگی کی بہترین اساس فراہم کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ جمعیت کا مرکز و محور قرآن حکیم ہی تھا۔ اور یہ قرآن ہی کا اعجاز تھا کہ اس کی اساس پر جمع ہونے والے اور اس سے چمٹ جانے والے لوگوں نے جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب برپا کر دیا۔ مستقبل میں بھی اسلامی انقلاب اسی سے چمٹ جانے سے وابستہ ہے!

تو یہ ہے جہاد بالقرآن جو مکی دور کا جہاد ہے۔ اس جہاد کے دوران اصل تصادم نظریات کی سطح پر ہوتا ہے ...... توحید اور شرک کا تصادم' ایمان اور مشرکانہ اوہام کا تصادم! تاہم یہ تصادم جسمانی (Physical) تصادم کی شکل بھی اختیار کرتا ہے جو اس مرحلے پر یکطرفہ ہوتا ہے۔ یعنی مخالفین کی طرف سے بالعموم ایذا رسانی اور تشدد کے ذریعے اس انقلاب کا راستہ روکنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن انقلابیوں کو حکم ہوتا ہے کہ مار کھاؤ مگر ہاتھ نہ اٹھاؤ' صبر کرو! جیسے حضرت یاسرؓ اور ان کے اہل خانہ پر سخت ترین تشدد ہوتے دیکھ کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرٍ مَوْعِدُکُمُ الْجَنَّۃُ (اے یاسر کے گھر والو صبر کرو' اس لیے کہ تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے)

تو جہاد بالقرآن کے تین مراحل جو میں نے بیان کئے ہیں ان کے ساتھ چوتھے مرحلے کے طور پر آپ ' صبرِ محض ' کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ یعنی جہاد بالقرآن کے دوران ہر تشدد اور تعذیب پر صبر کیا جائے گا اور کسی قسم کی کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

جہاد بالقوّۃ

یعنی قوّت وطاقت کے ساتھ جہاد

جہاد بالقرآن یعنی دعوت ' تزکیہ اور تنظیم کے مراحل کے بعد جہاد بالقوۃ کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی قوت و طاقت کے ساتھ جہاد ' اس لئے کہ ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اس مرحلے پر قوتیں باہم متصادم ہوتی ہیں ' طاقت کا طاقت کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اب تصادم محض نظریاتی نہیں رہتا بلکہ جسمانی (Physical) تصادم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور محض یکطرفہ نہیں رہتا بلکہ دو طرفہ تصادم کی صورت اختیار کرتا ہے۔

اس موقع پر میں یہ بات دو ٹوک انداز میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جن حضرات کو تصادم اور ٹکراؤ جیسے الفاظ سے الرجی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر انقلاب آ سکتا ہے تو ان کے بارے میں دو باتیں لازم ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انتہائی سادہ لوح ہیں بلکہ جنت الحمقاء میں بستے ہیں کہ انہیں انقلاب کے ناگزیر تقاضوں کا شعور بھی حاصل نہیں ' اور دوسرے یہ کہ ایسے لوگ اپنی سادہ لوحی یا حماقت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر بہت بڑا طعن کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو انقلاب برپا کرنے کے لئے خونریزی بھی کی۔ مدنی دور میں آپؐ متعدد بار مسلمانوں کی جمعیت کو لے کر کفار کے مقابلے میں سیف بدست میدان میں نکلے اور خود اپنا خون مبارک بھی اس راہ میں نچھاور کیا۔ غور کیجئے ' آپؐ سے اعلیٰ و افضل (معاذ اللہ) اور کون ہوگا؟ آپؐ سے بڑا حکیم و دانا ' آپؐ سے بہتر داعی و مبلغ اور آپؐ سے بڑھ کر معلّم و مزکّی کون ہو سکتا ہے جو ' تصادم ' کے اس مرحلے کے بغیر انقلاب برپا کر دے؟ انقلاب اگر محض بھکشوانہ اور درویشانہ تبلیغ کے ذریعے سے آ سکتا تو آپؐ سے بڑھ کر درویش اور کون ہوگا؟ اگر صرف تزکیہ و تصفیہ سے انقلاب آ سکتا تو آپؐ سے بڑا مزکی اور کون ہوگا؟ اگر صرف دعوت اور تعلیم و تربیت کے ذریعے معاشرے میں مکمل تبدیلی برپا ہو سکتی تو آپ سے بہتر داعی اور معلّم کوئی ہو سکتا ہے؟ ...... آپ نے دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت

کے یہ تمام ذرائع یقیناً اختیار فرمائے لیکن اس حقیقت کا کون انکار کر سکتا ہے کہ وقت
آنے پر آپؐ نے تلوار بھی اپنے ہاتھ میں لی! اگر خونی تصادم کے بغیر انقلاب آنے کا کوئی
امکان ہوتا تو حقیقت یہ ہے کہ رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ایک مومن و مسلم
خون تو درکنار کسی انسان کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے نہ دیتے!! کیا آپؐ اپنے
محبوب چچا حضرت حمزہؓ کی جان قربان کرنا گوارا فرماتے؟ کیا آپؐ معصبؓ بن عمیر جیسے بانکے
اور سجیلے نوجوان کو اپنی جان نچھاور کرنے دیتے؟ اس راستے میں خود آپؐ کا چہرہ خون آلو
ہوا ہے' آپؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے ہیں' غزوۂ حنین میں آپؐ تیروں کی بوچھا
کی زد میں آئے ہیں۔ تو اس راستے میں آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے خون کا نذرا
پیش کیا ہے...... اور "فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ" کے مصداق انہوں نے اس راستے میں مزا
اور متصادم قوتوں کی سرکوبی بھی کی ہے تب کہیں جا کر انقلاب برپا ہوا ہے!...... سوچ
کہ اگر ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ جیسے سرکشوں کی گردنیں نہ اڑائی جاتیں تو کیا وہا
انقلاب برپا ہو سکتا تھا؟ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے' ہجرتِ مدینہ کے بعد آپؐ۔
سب سے پہلے جو کام کیا وہ تبلیغی وفود بھیجنے کا نہیں' بلکہ چھاپہ مار دستے بھیجنے کا تھا۔

موجودہ دور میں جہاد بالقوۃ کی عملی صورت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قوت و طاقت کے ساتھ جو جہاد کیا وہ دو طرفہ تھ
صحابہ کرامؓ نے بدر' احد' حنین' احزاب' خیبر اور تبوک کے غزوات میں "يُقَاتِلُوْنَ
فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ" (وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' پھر قتل کرتے بھی
اور قتل ہوتے بھی ہیں!) کی عملی تصویر پیش کر کے دکھا دی۔ لیکن جہاں تک میں
غور کیا ہے آج ہمارے لئے 'جہاد بالقوۃ' کی عملی صورت یکطرفہ ہوگی' یعنی کسی کی
لیں گے نہیں' صرف اپنی جانیں دینے کے لئے سر سے کفن باندھ کر میدان میں آ
آئیں گے اور منکرات کو چیلنج کریں گے کہ ہم جیتے جی یہ خلاف شرع کام نہیں ہونے
گے۔ یہ موجودہ درپیش حالات کے تقاضوں کے مطابق 'جہاد بالقوۃ' کی ایک اجتہا
شکل ہے۔ اس اجتہادی صورت کی ضرورت دو وجوہ سے پیش آئی ہے:
ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقابلہ

کے ساتھ تھا ۔ آج ہمارے معاشرے میں اسلامی انقلاب کی راہ میں جو لوگ مزاحم ہیں وہ بہرحال مسلمان ہیں ۔ حال یہ ہے کہ اسلامی سزاؤں کو یہ وحشیانہ قرار دیتے ہیں ' ستر و حجاب کے احکام ان کے لئے قابل قبول نہیں ' سود جیسی لعنت کو گلے کا ہار بنائے بیٹھے ہیں اور اس کا خاتمہ انہیں گوارا نہیں ۔ یہ لوگ مصطفوی نظام کے قیام کو اپنے مفادات پر پڑنے والی سب سے کاری ضرب سمجھتے ہوئے اس کے نفاذ کے مخالف ہیں ۔ لیکن اس سب کے باوجود ہیں تو مسلمان ...... آخر کلمہ گو ہیں ' نام مسلمانوں کے سے ہیں ' عقیقہ اور ختنہ ہوا ہے ' مزاروں پر جا جا کے چادریں چڑھاتے ہیں ' لہٰذا قانوناً مسلمان ہیں ۔ ویسے بھی اہل سنت کا یہ اصولی موقف ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب فاسق و فاجر مسلمان بھی کافر نہیں ہوتا ۔ چنانچہ ان حالات میں اجتہاد کی ضرورت ہے اور میں اس اجتہاد کا قائل ہوں۔

اسلام میں اُس نام نہاد اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں کہ بلا ضرورت خواہ مخواہ زبان سے کچھ غیر محتاط اور غیر ذمہ دارانہ الفاظ ادا کر کے اُسے اجتہاد کا نام دے دیا جائے ۔ اجتہاد کی حقیقی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں نئی قسم کی صورتحال پیدا ہو جائے اور اجتہاد میں بہرصورت خطا کا امکان بھی ہوتا ہے ۔ اگر صورتحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی سی ہو تو وہاں اجتہاد کا نام لینا حماقت ہے ۔ ہمارے حالات چونکہ اُس وقت کے حالات سے بہت مختلف ہیں لہٰذا یہاں اجتہاد ناگزیر ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اِس وقت فریقین میں تعداد اور قوت کے اعتبار سے فرق و تفاوت بہت زیادہ ہو چکا ہے ' جبکہ آنحضورؐ کے دور میں یہ فرق و تفاوت اس قدر نہ تھا ۔ غزوۂ بدر میں تین سو تیرہ اہل ایمان کے مقابلے میں ایک ہزار کفار تھے ۔ یعنی تعداد کے لحاظ سے ایک نسبت تین کا معاملہ تھا ۔ مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں تھے ۔ ان کے پاس کل ستر اونٹ ' دو گھوڑے اور چند شمشیریں تھیں ' جبکہ لشکرِ کفار میں ساز و سامان ان سے بیسیوں گنا زیادہ تھا ۔ لیکن اس سب کے باوجود تعداد اور قوت میں کوئی نہ کوئی نسبت تناسب کا معاملہ بہرحال موجود تھا ۔ ایک اور بیس کی نسبت نہ سہی ایک اور پچاس کی تو ہو گی ! لیکن موجودہ حالات میں انقلاب برپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہونے والے متوالوں اور حکومتِ وقت کے مابین وسائل اور قوت کے اعتبار سے سرے سے کوئی نسبت تناسب ہے ہی نہیں ۔ عوام بالکل نہتے ہیں جبکہ حکومت کے پاس قوت و طاقت کے

تمام وسائل و ذرائع موجود ہیں ۔ جدید ترین اسلحہ سے لیس مسلح افواج ' پیرا ملٹری فور،
اور قانون نافذ کرنے والے ادارے حکومت کے اختیار میں ہیں ...... اور حکومت پر ع
ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی اجارہ داری ہے جو باطل نظام کو پورا پورا تحفظ فرا:
کرنا چاہتے ہیں ' اس لئے کہ اس کے ساتھ ان کے اپنے مفادات وابستہ ہیں ۔ چنانچہ آ
کسی جماعت یا گروہ کا حکومت سے ٹکرا جانا اور اس سے دو طرفہ تصادم مول لینا ممک
نہیں ۔ ان دو وجوہ سے آج کے حالات اجتہاد کے متقاضی ہیں ۔

مزید برآں دورِ جدید میں حکومت اور ریاست کا جو فرق واضح ہوا ہے وہ گزشتہ ادو
میں نہیں تھا ۔ اُس وقت تک انسانی شعور کی رسائی ابھی یہاں تک نہیں ہوئی تھی کہ
فرق کیا جاتا کہ ریاست (STATE) اور شے ہے ' حکومت (GOVERNMENT) ا
شے ! حقیقت یہ ہے کہ حکومت تو ریاست کا ایک انتظامی ادارہ ہے جبکہ کسی ملک ۔
شہری ریاست کے وفادار ہوتے ہیں ' نہ کہ حکومت کے ...... اسی طرح آج کے دور :
حکومت کا بدلنا ریاست کے عوام کا حق سمجھا جاتا ہے ۔ بعض ممالک مثلاً سعودی عر
وغیرہ میں آج بھی عوام کا یہ حق حکمرانوں نے غصب کر رکھا ہے ' اور یہاں پاکستان :
بھی گیارہ برس تک عوام اس حق سے محروم رہے ہیں ' لیکن یہ آج کا مسلّمہ اصول ۔
کہ حکومت کو بدلنا عوام کا حق ہے ۔ جب تک یہ اصول طے نہیں ہوا تھا اُس وقت تہ
حکومت اور ریاست ایک وحدت سمجھی جاتی تھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حسین ر
اللہ عنہ جب یزید کی حکومت کو تبدیل کرنے کے لئے اٹھے تو باغیٔ ریاست قرار پائے ا
خود مسلمانوں نے انہیں نواسۂ رسولؐ ہونے کے باوجود قتل کر ڈالا ' حالانکہ وہ حکومت .
باغی تو تھے ' ریاست کے باغی ہرگز نہ تھے ۔ مگر آج معاملہ ایسا نہیں ہے ۔ آج اگر ا
حکومت کو بدلنے کے لئے میدان میں آتا ہے تو وہ ریاست کا باغی قرار نہیں پاتا ۔ ریا،
کا باغی وہ ہوتا ہے جو ریاست کی سالمیت کے خلاف اقدام کرنا چاہتا ہو ۔

یہ ہیں وہ تین عوامل جن کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں ' جہاد بالقوۃ '
صورت یکطرفہ تصادم کی ہوگی ۔ یعنی منظم ہو کر میدان میں نکل کر چیلنج کرنا کہ ہم فلا
فلاں منکرات اس خطۂ زمین میں نہیں ہونے دیں گے ! یہ یہ کام حرام ہیں ' حکومت ان
بند کروائے ' ورنہ ہم گھیراؤ کریں گے اور اس حکومت کو چلنے نہیں دیں گے !! لیکن ا

قدام کی چند ناگزیر شرائط ہیں، جن میں سے اولین یہ ہے کہ یہ چیلنج پرامن مگر منظم مظاہروں کی صورت میں ہو، توڑ پھوڑ اور بدامنی سے مکمل گریز کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ منظم مظاہرین اپنے اعلیٰ و ارفع مقصد کی خاطر سینوں پر گولیاں کھانے کے لئے تیار رہیں لیکن پولیس کے ساتھ گلیوں میں آنکھ مچولی نہ کھیلی جائے۔ یہ نہ ہو کہ مظاہرین پولیس پر پتھر پھینک کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے، گلیوں میں گھس گئے اور پولیس ان کے تعاقب میں عام راہگیروں کو بھی گرفتار اور پریشان کر رہی ہو۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ طرز عمل نہ تو اسلام کے مطابق ہے اور نہ ہی ان طریقوں سے دنیا میں خیر کا کوئی کام ہوا ہے۔ اگر آپ کو مظاہرہ کر کے اپنے مطالبات منوانے ہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مطالبات کے حق میں سینہ سپر ہو جایئے! لاٹھی چارج اور آنسو گیس سے گھبرا کر الٹے پاؤں مت بھاگئے، بلکہ سینہ کھول کر گولی کھایئے!!

یہ کام ماضی قریب میں ہماری آنکھوں کے سامنے ایرانیوں نے کر کے دکھا دیا۔ پچاس ساٹھ ہزار یا ایک لاکھ انقلابیوں نے جانیں دے دیں، لیکن اس کے نتیجے میں اڑھائی ہزار سالہ قدیم بادشاہت کے وارث "شہنشاہِ ایران" کو، جس کے پاس ایشیا کا سب سے بڑا اسلحہ خانہ تھا، اس طرح اکھاڑ پھینکا کہ بقول بہادر شاہ ظفر ع

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں! فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!!

اسی طرح سکھوں کی مثال لیجئے۔ ۱۹۲۰ء میں ان کی گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کی تحریک چلی تھی، جس میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پرامن مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ میرے ایک بزرگ ساتھی حاجی عبد الواحد صاحب جو اب مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں اس کے چشم دید گواہ ہیں کہ سر پر لاٹھی پڑنے سے خالصہ گر جاتا، لیکن اس کا ہاتھ نہ اٹھتا تھا، کیونکہ انہیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ ہاتھ بندھے رکھیں۔ نتیجتاً وہ تحریک کامیاب ہوئی۔ لیکن آج سکھ دہشت گرد بن چکا ہے۔ کسی منظم تحریک کی بجائے ان کا طرز عمل یہ ہے کہ کہیں بس روک کر آٹھ دس ہندوؤں کو مار دیا، کہیں آگ لگا دی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ سکھوں کو بڑی تعداد میں موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ اور اس طرح دو چار لاکھ سکھ مر گئے تو بھارت کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان کی اتنی بڑی قربانی سے بھی خالصتان نہیں بن سکتا۔ ہاں اگر ان کی جدوجہد منظم اور پرامن ہو تو بار آور ہو

سکتی ہے۔

میں نے یہ چند مثالیں 'یکطرفہ تصادم' کی وضاحت کے لئے پیش کی ہیں۔ اس کا اصول سمجھ لیجئے کہ خود کفن سر سے باندھنا ہوگا 'گولیاں کھانی پڑیں گی 'گھیراؤ کرنا ہوگا (مگر جلاؤ کی اجازت نہیں ہوگی) ''کُفُّوا اَیْدِیَکُمْ'' کے مصداق اپنے ہاتھ بندھے رکھنے ہوں گے 'مگر یہ سب کچھ ایک منظم انداز سے کرنا ہوگا...... اور ایک وقت آئے گا کہ عوام کی 'خاموش اکثریت' (SILENT MAJORITY) کے علاوہ پولیس اور فوج بھی حکومت کی بجائے انقلابیوں کا ساتھ دے گی۔ حال ہی میں ایک موقع پر امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد صاحب نے ایک لاکھ آدمی تیار کرنے کی بات کی تھی۔ اگر ان کے پاس واقعتاً ایک لاکھ تربیت یافتہ منظم افراد موجود ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس طریقے کو روبعمل لانے سے اس ملک میں انقلاب آسکتا ہے[1]۔ اگر اس ایک لاکھ میں سے نصف بھی جانیں دینے کے لئے تیار ہو جائیں تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔ اور ایران کے انقلاب میں غالباً اس سے زیادہ آدمی نہیں مرے۔ جگرؔ مراد آبادی نے شراب سے تائب ہونے کے بعد ایک بڑی پیاری غزل کہی تھی جس کا ایک شعر ہے۔

یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

جیسے بارش کا پانی زمین میں جذب ہونے سے ہر طرف بہار آجاتی ہے اسی طرح جب انقلابی عمل کی خون سے آبیاری ہوتی ہے تو انقلاب آتا ہے۔ اس کے بغیر انقلاب کی توقع رکھنا خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ یہ وسوسہ جس کسی کے ذہن میں بھی ہو اسے نکال دینا چاہئے۔ ع این خیال است و محال است و جنوں!

اس تمام تر نقشے کے لئے ایک بہت مضبوط تنظیم کی ضرورت ہوگی جو جمع ہونے والے افراد کی انقلابی بنیادوں پر تربیت کا اہتمام کرے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ آپ کے سر پر لاٹھی پڑ رہی ہو اور آپ ہاتھ باندھے کھڑے رہیں۔ سر پر پڑنے والی

---

[1] تاہم اس انقلاب کے دیرپا اور پائیدار ہونے کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ انکی جماعت نے 'جہاد بالقرآن' کا مرحلہ پختہ بنیادوں پر طے کیا ہے یا نہیں!

ضرب کو روک کر سر کو بچانے کے لئے ہاتھ لامحالہ اوپر اٹھتا ہے۔ اسے میڈیکل کی اصطلاح میں "Reflex Action" کہا جاتا ہے جو جبلّتِ انسانی میں سے ہے۔ انقلاب برپا کرنے کے لئے مجتمع ہونے والے افراد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ انہیں جبلّت پر بھی قابو حاصل ہو جائے۔ اگر گالی کے جواب میں گالی دینا اور پتھر کے جواب میں پتھر مارنا ہی لازم ٹھہرا تو پھر موجودہ حالات میں انقلاب ناممکن ہے۔

اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لئے جو تنظیم درکار ہے اس میں صرف کارکنوں کی باہم ذہنی ہم آہنگی ہی کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اس کا ایک امیر ہو جس کی اطاعت سب پر لازم ہو۔ اس کے علاوہ اس میں ہر سطح پر Cadres معیّن ہونے چاہئیں کہ سب کو معلوم ہو کہ کس نے کس کا حکم ماننا ہے۔ پھر یہ کہ اس کا نظم کسی انجمن یا سوسائٹی کی طرز کا نہ ہو بلکہ بیعت کی بنیاد پر قائم ہو۔ یعنی معروف کے دائرے میں سب امیر کا حکم مانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ ایک اعتبار سے اہل ایمان کے لئے مطاعِ مطلق کا مقام حاصل تھا کہ اللہ کی اطاعت آپؐ ہی کی اطاعت کے واسطے سے تھی، اور آپؐ کے صحابہؓ کرام تو آپؐ کے چشم و ابرو پر جانیں قربان کر دینے کے لئے تیار رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود آپؐ نے صحابہؓ کرام سے سمع و طاعت کی بیعت لی۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرۃ علینا وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم

(متفق علیہ)

"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور مانیں گے، خواہ مشکل ہو یا آسان ہو، خواہ ہماری طبیعت اس کے لئے آمادہ ہو خواہ ہمیں اپنے اوپر جبر کرنا پڑے، چاہے دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے اور جس کو بھی امیر بنا دیا جائے ہم ان سے جھگڑیں گے نہیں، اور ہم حق بات کہتے رہیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے خوف نہیں کھائیں گے"۔

اس ایک حدیث مبارک میں ایک کامل انقلابی جماعت کا منشور موجود ہے ' جبکہ ہماری ناقدری کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی دینی و مذہبی جماعت اس منشور کی بنیاد پر قائم نہیں۔ ایک استثناء ہے تو صرف تنظیم اسلامی کا' جس کی اساس اللہ کے فضل سے اس حدیث پر قائم ہے۔ ہم نے اس میں صرف ایک لفظ (فی المعروف) کا اضافہ کیا ہے' اس لئے کہ حضورؐ کی اطاعت تو مطلق تھی' آپؐ اپنی ذات میں حق و باطل کا معیار تھے' آپؐ کا ہر حکم حق ہے' لہٰذا آپؐ کی اطاعت کو کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں کیا جا سکتا' لیکن آپؐ کے بعد کسی کی اطاعت بھی مطلق نہیں' بلکہ اس کے ساتھ ' فی المعروف ' کی شرط لازماً عائد کی جائے گی۔ یعنی یہ اطاعت معروف کے دائرے کے اندر اندر ہوگی' کسی خلاف شریعت حکم کی تعمیل نہیں کی جائے گی۔ مسلم شریف کی حدیث میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: الا ان تروا کفرا بواحا عندکم فیہ من اللہ برھان... کہ اس سمع و طاعت سے صرف اُس وقت دستکش ہوا جا سکتا ہے جب تمہیں صریحاً کفر نظر آئے اور جس کے متعلق تمہارے پاس قرآن و سنت سے صریح دلیل ہو کہ یہ کفر ہے۔ اُس وقت کہا جائے گا: لا سمع ولاطاعۃ... " نہ ہم سنیں گے ' نہ اطاعت کریں گے!" لیکن اگر کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے' کوئی حکم شریعت کی حدود سے متجاوز نہیں ہے تو پھر اطاعت واجب ہے۔

Theirs not to reason why ?

Theirs but to do and die!

سمع و طاعت پر مبنی تنظیم مصطفوی انقلاب کی شرطِ لازم ہے۔ اس کے بغیر اگر کہیں تصادم کی نوبت آگئی تو اس سے خیر کے بجائے فساد بر آمد ہوگا۔ ہماری تنظیم میں بھی بعض لوگ اس کی جلدی مچائے ہوئے ہیں' مگر ابھی تو ہمیں اس سے پہلے کے مراحل ٹھیک طور سے طے کرنا ہیں۔ ابھی تو ہمیں قرآن کے مقناطیس کو گردش میں لانا ہے' پھر اس کے ساتھ چمٹ کر جمع ہو جانے والوں کو قرآن حکیم ہی کے ذریعے تزکیہ و تربیت کی منزل سے گزرنا ہے' پھر انہیں بیعت کی بنیاد پر اس طور سے منظم کرنا ہے کہ ان میں سننے اور ماننے (Listen and Obey!) کا مادّہ پیدا ہو جائے۔ دین کا نفاذ پہلے وہ اپنے وجود پر کریں اور پھر اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لئے وہ سینوں پر گولیاں کھانے کے لئے تیار ہوں کہ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت ' نہ کشور کشائی!

سب کچھ کہہ دینا بہت آسان مگر اس پر عمل بہت مشکل ہے۔ اور یہ کام ایک منظم اور مضبوط انقلابی تنظیم کے بغیر ممکن نہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں جہاد بالقوۃ یا تصادم کی دو صورتیں ہیں۔ ایک دو طرفہ تصادم ہے جسے قِتال کہا جاتا ہے۔ یعنی دو فوجیں ایک دوسرے کو قتل کرنے کے ارادے سے آمنے سامنے ہوں۔ اور دوسرا ہے یکطرفہ تصادم کہ ہم اپنی جانیں دینے کے لئے سر سے کفن باندھ کر میدان میں آ جائیں اور اپنے موقف پر ڈٹے رہیں لیکن فریق مخالف پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔ قتال کی بہترین تعبیر سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ میں بایں الفاظ ملتی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ

"یقیناً اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔"

تو یہ دو طرفہ معاملہ ہے، اور سیرتِ نبوی کے مدنی دور میں ہمیں یہی صورت نظر آتی ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قتال کا آغاز ۲ھ میں ہوا مگر درحقیقت یہ تو ہجرت کے بعد پہلے ہی سال میں شروع ہو گیا تھا۔ غزوۂ بدر سے بھی پہلے آپؐ نے مختلف اوقات میں آٹھ چھاپہ مار دستے مختلف مہموں پر روانہ فرمائے، جس کی پوری تفصیل "منہجِ انقلابِ نبوی" میں بیان کی جا چکی ہے۔ اگر حالات اُسی نوعیت کے ہوں کہ جن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ تھا تو یقیناً دو طرفہ قتال کا مرحلہ آ کر رہے گا لیکن اگر صورت مختلف ہو اور مقابلے میں بھی کلمہ گو افراد ہوں تو پھر یکطرفہ قتال کی وہ شکل ہو گی جو میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ پھر "نہی عن المنکر" کو بنیاد بنا کر ہمیں انقلابی جدوجہد کرنی ہو گی اور منکرات و فواحش کے خلاف بنیانِ مرصوص بننا ہو گا۔

میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ میرے یہ تصورات و نظریات قرآن و سنّت پر مبنی ہیں اور اسی لئے میں ہمیشہ انہیں قرآن و حدیث کے حوالے ہی سے بیان کرتا ہوں۔ لیکن اس سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے کہ یہ تو نری مذہبی بات ہے، اس میں انقلاب کی بات ہی نہیں۔ تو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انقلاب کا یہ نظریہ اور تصور میرے اپنے ذہن

کی پیداوار نہیں ہے 'بلکہ قرآن و سنت سے اخذ کردہ ہے ...... اور مصطفوی انقلاب کے تمام مراحل میں نے سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے حاصل کئے ہیں۔ ہمارے موجودہ حالات کے مطابق اس میں ایک جگہ جہاں اجتہاد کی ضرورت ہے اس کی میں نے نشاندہی کر دی ہے اور اس کے اصول بیان کر دیئے ہیں۔ اب میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ انقلابِ اسلامی کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی لائحہ عمل نہیں' اب ضرورت صرف اسے روبعمل لانے کی ہے۔ اس کی تفصیلات میں ترمیم کی گنجائش رہے گی' مثلاً تربیت گاہوں کا نظام کیا ہو؟ اس کے لئے گشتی جماعتیں تشکیل دی جائیں یا کیمپ منعقد کئے جائیں۔ مگر اصل منصوبہ مکمل ہے' اسے پوری طرح ذہن میں رہنا چاہئے۔

'نہی عن المنکر' کی بنیاد پر انقلابی جدوجہد' احادیث کی روشنی میں

اب اس کام کی اہمیت کے ضمن میں دو احادیث نوٹ کر لیجئے: پہلی حدیث حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ' فان لم یستطع فبلسانہ' فان لم یستطع فبقلبہ' وذالک اضعف الایمان (رواہ مسلم)

"جو کوئی بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے تو وہ اپنے (زورِ) بازو سے اسے بدلے! اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اس برائی کو روکے)! پھر اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو پھر اپنے دل سے (اس پر تشویش زدہ ہو)!! اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے"۔

جہاد بالقرآن کے نتیجے میں جو سعید روحیں جمع ہو جائیں ان کی تربیت میں زبان کی تربیت بھی شامل ہے تاکہ وہ برائی کے خلاف اپنی زبان کھولیں' نہی عن المنکر باللسان کریں۔ پھر انہیں طاقت فراہم کی جائے اور اس کے بعد بیعت کا بٹ دے کر انہیں باطل کے سر پر دے مارا جائے۔ جیسا کہ سورۃ الانبیاء میں فرمایا گیا:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ

"بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے' پھر باطل اسی

دم ملیامیٹ ہو جاتا ہے!"

دوسری حدیث میں اس سے بھی زیادہ واضح طور پر ' جہاد بالقوۃ ' کی ہدایت دی گئی ہے اور ایسے برسراقتدار طبقہ کے خلاف ہاتھ ' زبان اور دل سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے جو انبیاء کی لائی ہوئی تعلیمات سے انحراف کرتا ہے۔ یہ حدیث بھی مسلم شریف کی ہے اور اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ما من نبی بعثہ اللہ فی امتہ قبلی الا کان لہ من امتہ حواریون واصحاب یاخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ

"کوئی نبی ایسے نہیں گزرے جنہیں اللہ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں مبعوث کیا ہو۔ مگر یہ کہ اس کے لئے اس کی امت میں سے کچھ (لوگ نکلتے تھے جو) حواری اور اصحاب ہوتے تھے۔ وہ اس کی سنّت کو مضبوطی سے پکڑتے اور اس کے حکم کے مطابق چلتے تھے"۔

ثم انھا تخلف من بعدھم خلوف یقولون ملا یفعلون و یفعلون ملا یؤمرون

"(پھر ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ) ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آ جایا کرتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے ...... اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا"۔

فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن ' ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن ' ولیس وراء ذالك من الایمان حبۃ خردل

"تو جو شخص ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے تو وہ مومن ہے۔ اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنی زبان سے تو وہ مومن ہے۔ اور جو ان سے جہاد کرے گا اپنے دل سے تو وہ بھی مومن ہے۔ اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں!"

اور یہی وہ طبقہ ہے جو آج تمام مسلمان ممالک میں برسراقتدار ہے ...... اور برسراقتدار سے میری مراد یہ نہیں کہ جو اس وقت حکومت میں ہے ' بلکہ میری نظر میں حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار دونوں برسراقتدار ہیں۔ حکومت تو PING PONG کا ایک کھیل ہے جو سرمایہ داروں ' وڈیروں اور لٹیروں کے درمیان جاری ہے۔ یہی ایک ہی استحصالی

طبقہ ہے جس میں سے کچھ لوگ اِدھر ہوتے ہیں اور کچھ اُدھر۔ یہ سب اصلاً ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ پورے عالم اسلام میں جب تک ان کے خلاف 'جہاد بالقوۃ' نہیں ہوگا' ہم ان کے تسلط سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ اور یہ میں پوری وضاحت سے عرض کر چکا ہوں کہ 'موجودہ حالات میں جہاد کی صورت قتال کی نہیں' بلکہ یکطرفہ تصادم کی ہوگی۔ بدعات' رسومات' منکرات اور فواحش کے خلاف ایک تحریکِ مزاحمت برپا کرنا ہوگی اور منظم ہو کر جان پر کھیل جانے کے ارادے سے سر پر کفن باندھ کر میدان میں آنا ہوگا۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم وطنِ عزیز پاکستان میں اور بالآخر پوری دنیا میں نظامِ مصطفےٰ' اسلامی نظام' انقلابِ اسلامی یا مصطفوی انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ دوسرے تمام راستے بلاشبہ وقت اور صلاحیتوں کے ضیاع کے علاوہ ہمیں اور کچھ نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے دروس و خطابات میں شرکت کرنے والے حضرات اور ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کرنے والے احباب پر میری طرف سے حجّت قائم ہو چکی ہے۔ میں نے ان کے سامنے قرآن و حدیث کی روشنی میں دینی فرائض کا جامع تصور اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جہاد اور اسلامی انقلاب کے مراحل و مدارج بار بار مختلف انداز اور متنوّع اسلوب سے بیان کر دیئے ہیں۔ ہمیں اپنی دینی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے مثبت خطوط پر قدم آگے بڑھانے ہوں گے۔ اسی طرح ہم اس کی رحمت کے مستحق بن سکتے ہیں۔ بصورت دیگر ہمیں قرآن حکیم میں وارد شدہ اس طرح کی وعیدوں پر نظر رکھنی چاہئے کہ:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (السجدۃ: ۲۲)

"پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعے تذکیر کروائی گئی تو اس نے ان سے اعراض کیا۔ ایسے ظالموں سے تو ہم لازماً انتقام لے کے رہیں گے!"

اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ اپنے آپ کو کس صف میں کھڑا کرنا پسند کرتے ہیں... اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدواروں کی صف میں یا اُن لوگوں کی صف میں جن کے حق میں اللہ منتقم ہے!!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

اِنْ شَاءَ اللّٰہُ الْعَزِیْز امسال تنظیم اسلامی پاکستان کا

سالانہ اجتماع

۲۲ر تا ۲۵ر فروری ۹۱ء کراچی میں منعقد ہو گا!

∴ رفقائے تنظیم ابھی سے لازماً شرکت کا اہتمام شروع کر دیں۔

∴ مقامی امراء اور منفرد رفقاء اپنی آمد و روانگی کے پروگرام اور شرکاء کی متوقع تعداد سے ناظمِ اجتماع سید محمد نسیم الدین صاحب امیر تنظیم اسلامی کراچی کو دفتر تنظیم اسلامی ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی کے پتہ پر یکم فروری ۹۱ء سے قبل مطلع فرمائیں۔

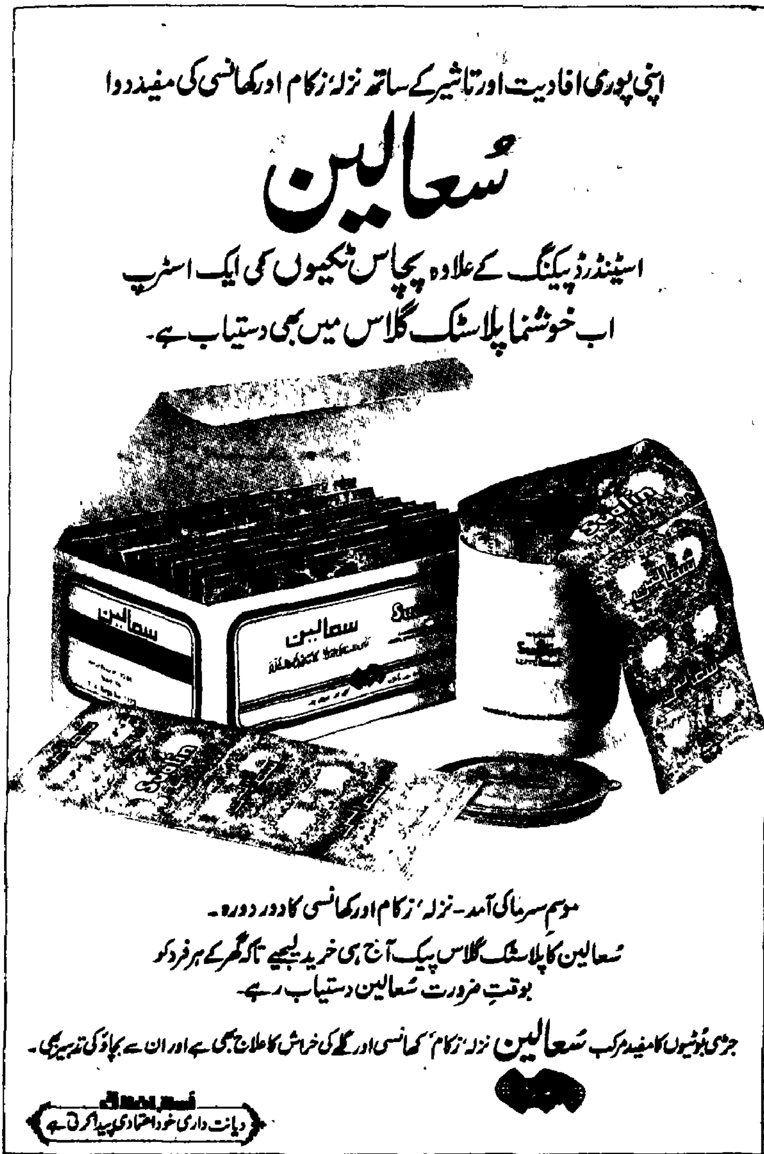
—— : مزید برآں : ——

سالانہ اجتماع سے متصلاً قبل ۱۵ر تا ۲۱ر فروری ۹۱ء کراچی ہی میں رفقائے تنظیم کے لیے ایک **تربیت گاہ** منعقد ہو گی!

* مبتدی رفقاء کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو اس میں شرکت کرنی چاہیئے۔
* بالخصوص بیرونِ پاکستان تنظیموں کے مقامی امراء لازماً اور رفقاء حتی الامکان شرکت کی بھرپور کوشش کریں۔
* متوقع شرکاء اپنے پروگرام سے ناظمِ اجتماع کو ۱۲ر جنوری سے قبل مطلع کریں۔

نوٹ : شرکاءِ اجتماع اپنی ضرورت کی اشیاء مثلاً مناسب بستر، پلیٹ، کپ وغیرہ ہمراہ لائیں گے۔ اجتماع گاہ چونکہ سمندر کے قریب ہو گی، لہٰذا ہلکی خنکی متوقع ہے۔

المعلن : (ڈاکٹر) عبدالخالق۔ ناظمِ اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان


اپنی پوری افادیت اور تاثیر کے ساتھ نزلہ زکام اور کھانسی کی مفید دوا
سُعالین
اسٹینڈرڈ پیکنگ کے علاوہ پچاس ٹکیوں کی ایک اسٹرپ
اب خوشنما پلاسٹک گلاس میں بھی دستیاب ہے۔
سعالین
موسمِ سرما کی آمد۔ نزلہ، زکام اور کھانسی کا دور دورہ۔
سُعالین کا پلاسٹک گلاس پیک آج ہی خرید لیجیے تاکہ گھر کے ہر فرد کو
بوقتِ ضرورت سُعالین دستیاب رہے۔
جڑی بوٹیوں کا مفید مرکب سُعالین نزلہ، زکام، کھانسی اور گلے کی خراش کا علاج بھی ہے اور ان سے بچاؤ کی تدبیر بھی۔
دیانت داری خود اعتمادی پیدا کرتی ہے
Adarts-SUA-1/88

جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر
قرآن حکیم کی جامع ترین سورۃ
سورۃ الصّفّ

(۴)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت
غلبۂ دینِ حق

بسم اللہ اَوّلہ و آخرہٗ! سورۃ الصف کی آیت ۹ "ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ" ہمارے زیرِ درس ہے۔ پچھلے سبق میں ہم نے بحمد اللہ 'دِیْنِ الحق' تک کسی درجے میں غور مکمل کر لیا تھا۔ اب آئیے اگلے لفظ 'لِیُظْھِرَہٗ' کی طرف جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تعیین میں بہت اہمیت رکھتا ہے! یہ لفظ درحقیقت ایک فعل، اس کے فاعل، اس کے مفعول اور ایک حرفِ لام پر مشتمل ہے۔

'لِیُظْھِرَہٗ' کا مفہوم

اس کا لفظی ترجمہ ہوگا "تاکہ وہ غالب کر دے اس کو"۔ اس میں جو ضمیریں وارد ہوئی ہیں اُن کے بارے میں مفسرین کے ہاں ایک سے زائد آراء موجود ہیں۔ چنانچہ اس لفظ کا ہمیں تفصیلاً تجزیہ کرنا ہوگا۔ ایک ترجمہ اس کا یہ کیا گیا ہے کہ "تاکہ اللہ غالب کر دے اس

دین کو۔ اسی طرح یہ ترجمہ بھی کیا گیا ہے کہ "تاکہ اللہ غالب کر دے محمد کو (صلی اللہ علیہ وسلم)"۔ اور ایک ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے "تاکہ محمدؐ غالب کر دیں اس دین کو!"—— ضمیرِ فاعلی اور ضمیرِ مفعولی کے مراد مختلف معیّن کرنے کی وجہ سے درحقیقت ترجموں میں یہ فرق واقع ہوا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظی فرق کے باوجود اس کے اصل مفہوم اور معنیٰ میں ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لفظ 'اظہار' پر غور کیجیے۔ 'ظَهَرَ يَظْهَرُ' کا مفہوم ہے کسی چیز کا ظاہر ہو جانا۔ اور اسی میں ایک مفہوم غالب ہو جانے کا بھی شامل ہے اس لیے کہ کوئی چیز نمایاں اور ظاہر اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے ماحول پر غالب ہوتی ہے۔ اسی سے بابِ افعال میں مصدر بنا 'اظہار'، یعنی غالب کر دینا۔ اس کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ عربی زبان میں 'ظَهر' کہتے ہیں پیٹھ کو۔ کسی کی پیٹھ پر سوار ہو جانا اُس پر غالب ہونے کے مترادف ہے۔ تو اظہار کا یہ مفہوم مسلّم ہے۔

'لِيُظْهِرَهٗ' کی ضمیرِ فاعلی کے بارے میں جو دو رائیں ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کا مدلول ایک ہی ہے۔ چنانچہ 'غالب کرنے والا'، خواہ اللہ کو قرار دیا جائے خواہ رسولؐ کو، حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو صرف اللہ ہی ہے۔ اگرچہ اس دنیا میں بظاہر ہم محنت و مشقت سے روزی کماتے ہیں لیکن ہمارا رازق اللہ ہے۔ انسان تو محض کاسبِ اعمال ہے، خالقِ اعمال صرف اللہ ہے۔ چنانچہ اس عملِ اظہار کے کرنے والے عالمِ اسباب میں محمد رسول اللہ ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)، اور عالمِ حقیقت میں اس کا فاعل اللہ ہے۔ لہٰذا مراد اور معنی کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح کہ سورۃ الانفال میں غزوۂ بدر کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: "فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" کہ اے مسلمانو یہ ستر سردارانِ قریش جو تمہارے ہاتھوں واصلِ جہنم ہوئے ہیں، انہیں تم نے قتل نہیں کیا بلکہ درحقیقت اللہ نے انہیں قتل کیا ہے، اور اے نبی وہ مٹھی بھر کنکر جو آپ نے پھینکے تھے لشکرِ کفار کی طرف تو وہ آپ نے نہیں پھینکے تھے، اللہ نے پھینکے تھے۔ معلوم ہوا کہ عالمِ واقعہ میں یا بالفاظِ دیگر عالمِ اسباب میں غلبۂ دین کے لیے محنت، جدوجہد، سرفروشی اور جہاد و قتال کرتے نظر آتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار، لیکن حقیقت کی سطح پر فاعلِ حقیقی صرف اللہ ہے۔ اسی طرح کا معاملہ 'لِيُظْهِرَهٗ'

میں شامل ضمیر مفعولی کا ہے۔ چنانچہ اس سے خواہ دین کو غالب کرنا مراد لیا جائے چاہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو، مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ آنحضورؐ کی جدوجہد کا مقصود ہرگز اپنی ذات کا غلبہ نہ تھا۔ اپنی یا اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کے لیے یہ بھاگ دوڑ اور سعی وجہد ہرگز نہ تھی۔ رسولؐ کا غلبہ درحقیقت اللہ کے دین کا غلبہ تھا۔ لہٰذا لفظی ترجمہ چاہے جو بھی کیا جائے اور ضمیروں کے مراجع کے بارے میں خواہ کوئی بھی رائے قائم کی جائے، مفہوم ایک ہی رہے گا۔ اب تک اس آیۂ مبارکہ میں جو کچھ مضمون آیا ہے اُسے ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ اللہ نے بھیجا اپنے رسول کو دو چیزیں دے کر (۱) الھدیٰ اور (۲) دین حق۔ کیوں بھیجا؟ اس کا جواب درحقیقت اس لفظ 'لِيُظْهِرَهٗ' میں بیان ہوا ہے۔ اس لیے بھیجا تاکہ اِس دین حق کو غالب کر دے پورے نظام زندگی پر (عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ)۔ لفظ دین کے ترجمے میں بھی ہمارے ہاں کچھ اختلاف رہا ہے۔ بعض لوگوں نے 'تمام ادیان' ترجمہ کر دیا ہے، بعض نے 'سب دین' ترجمہ کیا ہے، اسی طرح بعض لوگوں نے اس سے کل دین اور بعض نے 'جنسِ دین' مراد لیا ہے' یہ مؤخر الذکر ترجمہ درحقیقت اصل مفہوم سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ گویا اس کا اصل مفہوم اور معنیٰ یہ ہوگا کہ یہ دین حق غالب ہو جائے پورے جنس دین پر، پورے نظامِ زندگی پر اللہ کا نظام اس شان سے قائم ہو جائے کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی گوشہ اس سے مستثنیٰ نہ رہے۔ اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدل و قسط زندگی پر بحیثیت ایک وحدت اور ایک 'ORGANIC WHOLE' کے نافذ و غالب ہو جائے۔ یہ ہے مقصد محمد رسول اللہ کی بعثت کا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

'دین' اور 'مذہب' میں فرق

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ لفظ 'مذہب' اور لفظ 'دین' میں مفہوم کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کو مذہب کہا جاتا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں اور حدیث کے پورے ذخیرے میں اسلام کے لیے مذہب کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا، بلکہ اس کے لیے ہمیشہ 'دین' ہی کا لفظ مستعمل ہوا ہے سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا: "اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" کہ اللہ کی بارگاہ میں مقبول دین تو صرف اسلام ہے ــــــ دین اور مذہب میں بنیادی فرق کو سمجھ لیجیے! ــــــ مذہب

ایک جزوی حقیقت ہے۔ صرف یہ چند عقائد (DOGMA) اور کچھ مراسمِ عبودیت (RITUALS) کے مجموعے کا نام ہے۔ جبکہ دین سے مراد ہے ایک مکمل نظام جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ گویا مذہب کے مقابلے میں دین ایک بڑی اور جامع حقیقت ہے۔ اس پس منظر میں اگرچہ یہ کہنا تو شاید درست نہ ہوگا کہ اسلام مذہب نہیں ہے، اس لیے کہ مذہب کے جملہ ELEMENTS بھی اسلام میں شامل ہیں، اس میں عقائد کا عنصر بھی ہے، ایمانیات ہیں، پھر اس کے مراسمِ عبودیت ہیں، نماز، روزہ ہے، حج اور زکوٰۃ ہے، چنانچہ صحیح یہ ہوگا کہ یوں کہا جائے کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں، ایک دین ہے۔ اس میں جہاں مذہب کا پورا خاکہ موجود ہے وہاں یہ ایک مکمل نظامِ زندگی بھی ہے۔ بلکہ اصلاً یہ دین ہے۔ اب اس حوالے سے ایک اہم حقیقت پر غور کیجیے! کسی ایک خطۂ زمین میں مذاہب تو بیک وقت بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن دین ایک وقت میں صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ نظام تو ایک ہی ہوگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کسی خطہ زمین پر یا کسی ایک ملک میں بیک وقت قائم ہوں! حاکمیت (SOVEREIGNTY) تو کسی ایک ہی کی ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ملوکیت اور جمہوریت دونوں بیک وقت کسی ملک میں نافذ ہو جائیں۔ نظام ایک ہی رہے گا۔ اللہ کا نظام ہوگا یا غیر اللہ کا ہوگا۔ نظام دو نہیں ہو سکتے جبکہ ایک خطہ میں مذاہب بیک وقت بہت سے ممکن ہیں[1]۔ ہاں نظاموں کے ضمن میں ایک امکانی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ ایک نظام غالب و برتر ہو اور وہی حقیقت میں "نظام" کہلائے اور دوسرا نظام سمٹ کر اور سکڑ کر ایک مذہب کی شکل اختیار کر لے اور اس کے تابع زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جائے یہ ہے درحقیقت ایک امکانی حالت! میرا ذہن منتقل ہوا علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف کہ: ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اِک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

---

[1] یہ بات اس حقیقت سے بہت مشابہ ہے جو ایک کہاوت کے طور پر بیان کی جاتی ہے کہ دس درویش ایک گدڑی میں گزارا کر سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک سلطنت میں اکٹھے نہیں رہ سکتے!

دین کب مذہب کی شکل اختیار کرتا ہے؟

دین جب مغلوب ہوتا ہے تو ایک مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس صورت میں وہ دین نہیں رہتا بلکہ مذہب بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اسلام کے دورِ عروج میں غالب نظام تو اسلام کا تھا لیکن اس دین کے تابع یہودیت، مجوسیت اور نصرانیت مذاہب کی حیثیت سے برقرار تھے۔ انہیں یہ رعایت دی گئی تھی اور صاف الفاظ میں سنا دیا گیا تھا کہ اگر وہ اسلامی سلطنت کی حدود کے اندر رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے ہاتھ سے جزیہ دینا اور چھوٹے بن کر رہنا ہوگا۔ " يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ ○ " (توبہ : ۲۵) ملکی قانون (LAW OF THE LAND) اللہ کا ہوگا، غالب نظام اللہ کا ہوگا، اُس کے تحت اپنے پرسنل لا میں اور اپنی ذاتی زندگی میں محدود سطح پر وہ اگر اپنے مذاہب اور اپنے اپنے عقائد و رسوم کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیں تو اس کی انہیں اجازت ہوگی ——— اسلام کے دورِ زوال و انحطاط میں یہ صورت برعکس ہوگئی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس برصغیر میں دین انگریز کا تھا، LAW OF THE LAND اُس کا تھا۔ دینِ انگریز کے تحت اسلام نے سمٹ کر ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نمازیں جیسے چاہو پڑھو انگریز کو کوئی اعتراض نہ تھا، اذانیں بخوشی دیتے رہو، وراثت اور شادی بیاہ کے معاملات بھی اپنے اصول کے مطابق طے کر لو، لیکن ملکی قانون انگریز کی مرضی سے طے ہوگا۔ یہ معاملہ تاجِ برطانیہ کی SOVEREIGNTY کے تحت ہوگا اس میں تم مداخلت نہیں کر سکتے! یہ تھا تصور جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بڑی خوبصورت پھبتی چست کی تھی ؂

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت\
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اسلام آزاد کہاں ہے! وہ سمٹ سکڑ کر اور اپنی اصل حقیقت سے بہت نیچے اتر کر ایک مذہب کی شکل میں باقی ہے! اللہ اللہ اور خیر سلّا۔

نفاذِ دین کے بغیر اتمامِ حجت ممکن نہیں!

——— دین ہے ہی وہ کہ جو غالب ہو۔ مغلوب ہے تو وہ دین نہیں رہے گا۔ بلکہ ایک مذہب کی صورت میں سمٹ جائے گا، سکڑ جائے گا

اس کی اصل حیثیت مجروح ہو جائے گی۔ اس پہلو سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ نظام بھی اگر صرف نظری اعتبار سے پیش کیا جا رہا ہو، صرف کتابی شکل میں نسلِ انسانی کو دیا گیا ہو تو وہ ایک خیالی جنّت (UTOPIA) کی شکل تو اختیار کر سکتا ہے لیکن حجت نہیں بن سکتا۔ نوعِ انسانی پر حجت وہ صرف اسی وقت بن سکتا ہے جب اسے قائم کرکے، نافذ کرکے اور چلا کر دکھا دیا جائے۔ یہ ہے بعثتِ نبویؐ کی وہ امتیازی شان اور وہ کٹھن ذمّے داری جو محمد رسول اللہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم پر عائد ہوئی کہ آپؐ جو دینِ حق دے کر بھیجے گئے ہیں اسے پورے نظامِ زندگی پر غالب و قائم اور نافذ و رائج فرما دیں۔ ایک حدیث مبارک میں اس حقیقت کو یوں تعبیر فرمایا گیا کہ: "لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا"۔ تاکہ اللہ کی بات ہی سب سے بلند ہو، اس کی مرضی سب سے بالاتر ہو اور اس کا جھنڈا سب سے اونچا ہو جائے۔

سورۃ المدثّر میں اس اہم مضمون کو دو الفاظ میں سمو لیا گیا ہے: يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (صلّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کھڑے ہو جاؤ، کمربستہ ہو جاؤ، اپنے مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کا آغاز کرو اور اس کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ ـــــ انذار! ـــــ خبردار کرو، اُن نیند کے ماتوں کو جگاؤ۔ جو بھول گئے ہیں اِس حقیقت کو کہ اصل زندگی موت کے بعد ہے۔" وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝" (ترجمہ: "اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے، کاش کہ انہیں معلوم ہوتا") یہ ہے نبیؐ کے مشن کا نقطۂ آغاز! ـــــ اور اس کا ہدف، مقصود اور اس کی غایتِ قصوٰی کیا ہے؟ ـــــ "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝" ترجمہ" اور اپنے رب کو بڑا کرو!" تکبیر کے معنی صرف یہ نہیں کہ بڑائی کا اعلان یا اعتراف کر لیا جائے، زبان سے اللّٰہُ اکبر کہہ دیا جائے بلکہ تکبیر سے مقصود یہ ہے کہ اس تعؔ کی بڑائی نافذ ہو جائے، اس کی کبریائی کے اعتراف پر مبنی نظام بالفعل قائم ہو جائے، اُسی تعؔ کی بات سب سے اونچی اور اسی کا حکم سب سے بالا ہو۔ یہ ہے تکبیرِ رب کا حقیقی مفہوم! ـــــ علّامہ اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں تکبیرِ رب کے اس انقلابی تصور کو شعر کا لبادہ اوڑھایا:

ؔ یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلک مردانِ خود آگاہ خدا مست — یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات!

اسی مضمون کو کسی قدر ظریفانہ انداز میں یُوں بیان کیا۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

تکبیر رب کا کچھ یہی مفہوم حضرت مسیح علیہ السلام کے ان الفاظ میں بھی سامنے آتا ہے کہ " اے رب جیسے تیری مرضی آسمانوں پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پوری ہو۔"

دینِ حق کا نفاذ انقلابی جدّوجہد کا متقاضی ہے

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ سورۃ الصف کی زیرِ نظر آیت کے حوالے سے نبی اکرمؐ کا مشن سامنے آتا ہے اس کا تقاضا محض دعوت و تبلیغ، بشارت و انذار یا تعلیم و تربیت سے ہرگز پورا نہیں ہوتا ۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں ۔ یہ ایک انقلابی مشن ہے ۔ ایک نظام کو کسی معاشرے میں برپا کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے وہاں پر موجود نظام کو جڑ و بن سے اکھیڑا جائے ۔ یہ کام کہیں خلا میں کیا جانے والا نہیں ہے ۔ جہاں بھی دینِ حق کے نفاذ کی جدوجہد کی جائے گی کوئی نہ کوئی نظام وہاں پہلے سے موجود ہو گا ۔ اس باطل نظام کے سا لوگوں کے مفادات وابستہ ہوں گے ، سیادتیں اور چودھراہٹیں ہوں گی ، لوگوں کے مالی مفا اس سے متعلق ہوں گے ۔ آپ جب اس نظام کو ذرا چھیڑیں گے ، اس کے خلاف ذرا آوا بلند کریں گے تو نمعلوم کس کس کے کس کس مفادات پر آنچ آئے گی ! — چنانچہ وہ تمام قوتیں اپنے اس نظام کی مدافعت میں آپ کے خلاف متحد ہو جائیں گی کہ ع " نظامِ کہنہ کے پاسبانو ' یہ معرضِ انقلاب میں ہے ! " اپنے نظام کو برقرار رکھنے اور اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر سب مجتمع ہو کر آپ کے خلاف صف آراء ہو جائیں گے ۔ تصادم ، کشمکش اور جہاد و قتال کا لازماً آ کر رہے گا ۔ چنانچہ اس مقصدِ بعثت کے اعتبار سے جو سورۃ الصف کی اس آیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے معین ہوا ہے انقلابی جد وجہد لازم اور ناگز ہے یہ محض دعوت و تبلیغ سے ہونے والی بات نہیں !

اگرچہ سورۃ الجمعہ کے حوالے سے اگلے درس میں یہ بات آئے گی کہ اس انقلابی

جدوجہد کا منہج اساسی یقیناً دعوت و تبلیغ ہے، اس کے ابتدائی مراحل میں یقیناً تعلیم بھی ہے، تربیت بھی ہے اور تزکیہ بھی ہے لیکن ان ابتدائی اور اساسی مراحل سے بلند تر سط پر ایک انقلابی جدوجہد بھی ناگزیر ہے، ایک تصادم کہ جس میں کشت و خون کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں جہاں دعوت و تبلیغ کا مرحلہ ہمیں نظر آتا ہے وہاں جہاد و قتال کے مراحل بھی آئے۔ حنین کی وادی میں آپؐ یہ رجز پڑھتے ہوئے اپنے لشکر کی کمان کرتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں: "اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب، اَنَا ابْن عَبْدِ المطَّلِب!" یہ وہ بات ہے جو اُن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی جنھوں نے حضورؐ کے مقصدِ بعثت کی اس منفرد اور اس امتیازی شان کو نہیں سمجھا کہ آپؐ صرف داعی اور مبلغ نہ تھے، آپؐ محض مبشر اور نذیر نہ تھے، آپؐ صرف مزکّی، مربّی اور معلّم نہ تھے، آپؐ تاریخ انسانی کے عظیم ترین انقلاب کے داعی و نقیب بھی تھے۔ کون انکار کرسکتا ہے اس حقیقت سے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا فرمایا جس نے زندگی کے ہر گوشے کو بدل کر رکھ دیا۔ ایسا ہمہ گیر انقلاب جس نے لوگوں کے خیالات بدلے، عقائد بدلے، نظریات بدلے، اخلاق بدلے، کردار بدلے حتیٰ کہ لوگوں کے نشست و برخاست کے انداز اور نشست و برخاست کے طریقے بدل گئے۔ وہ قوم کہ جس کے اندر کوئی کسی کی بات سننے والا نہ تھا، انتہائی منظم قوم بن گئی۔ اس معاشرہ نے کہ جہاں پڑھنے لکھنے والے لوگ انگلیوں پہ گنے جانے کے قابل تھے، دنیا کو عظیم معلّم فراہم کیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ انسانی کو ایک نئی تہذیب اور ایک نیا تمدن عطا کیا۔ بلاشبہ یہ تاریخ انسانی کا عظیم انقلاب تھا۔ حضورؐ کی بعثت کا یہ پہلو کہ آپؐ ایک عظیم داعیٔ انقلاب تھے، درحقیقت آپؐ کے اس فرضِ منصبی کا منطقی تقاضا ہے جو ان الفاظِ مبارکہ میں بیان ہوا: "لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ"۔

"اِس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری!"

مہاتما گاندھی کے بارے میں غالباً جارج برنارڈ شا نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے کہ:

"HE IS A SAINT AMONG POLITICIANS AND A POLITICIAN AMONG SAINTS."

اگرچہ یہ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" کے مصداق ان الفاظ کی یا ان جیسے الفاظ کی کوئی دور کی نسبت بھی آنحضورؐ کی ذاتِ گرامی سے نہیں ہوسکتی تاہم واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ نبوی

فہم کے لیے شاید یوں اگر تعبیر کیا جائے تو بات غلط نہ ہوگی کہ :

"HE WAS A REVOLUTIONARY AMONG PROPHETS AND A PROPHET AMONG REVOLUTIONARIES."

یعنی نبیوں اور رسولوں میں آپؐ کی امتیازی شان یہ ہے کہ آپ ایک عظیم انقلابی رہنما ہیں اور انقلابی رہنماؤں میں آپ کی منفرد شان یہ ہے کہ آپ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپؐ نے صرف دعوت و تبلیغ کا کام نہیں کیا بلکہ اس دعوت کی بنیاد پہ ایک انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ دعوت و تبلیغ کے ابتدائی مرحلے سے کام کا آغاز کیا اور کل ۲۳ برس میں اس جدوجہد کو ایک نظام کے باقاعدہ قیام اور باضابطہ نفاذ کے تکمیلی مرحلے تک پہنچا دیا ——

—— اگرچہ یہ امر واقعہ ہے کہ اس جدوجہد میں آپؐ کو ان تمام مراحل سے گزرنا پڑا جو کسی بھی انقلابی جدوجہد میں آتے ہیں۔ زمین پر قدم بقدم چل کر حضورؐ نے وہ مرحلے طے کیے۔ آپؐ کو فقر و فاقے کی صعوبت بھی برداشت کرنی پڑی، شعب بنی ہاشم میں تین سال کی قید کو ذہن میں لائیے کہ جس میں وہ وقت بھی آیا کہ فقر و فاقے کی شدت سے بنی ہاشم کے دودھ پیتے بچے بلک رہے تھے اور ان کے کھانے کے لیے کوئی چیز میسّر نہ تھی سوائے اس کے کہ سوکھے چمڑوں کو ابال کر اس کا پانی ان کے حلق میں ٹپکا دیا جائے۔ طائف میں شدید پتھراؤ کا آپؐ کو سامنا کرنا پڑا۔ مکے کی گلیوں میں آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے، یہ منظر بھی چشمِ فلک نے دیکھا کہ آپ سربسجود ہیں اور ایک شقی انسان عقبہ ابن ابی معیط ابوجہل کے کہنے سے اٹھتا ہے اور اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی لا کر شانہ مبارک پر رکھ دیتا ہے۔ پھر غارِ ثور کا مرحلہ بھی آیا، میدانِ بدر کا وہ نقشہ بھی ذہن میں لائیے کہ اللہ کا رسولؐ دونوں لشکروں کے درمیان گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی میں سربسجود ہے، اور اللہ سے گڑگڑا کر نصرت کی درخواست کر رہا ہے۔ پھر اُحد کا سخت مرحلہ بھی آیا۔ آپؐ کے دندانِ مبارک شہید اور چہرۂ انور لہولہان ہو گیا ہے۔ آپؐ پر کچھ دیر کے لیے غشی طاری ہو جاتی ہے۔ آپ کے انتہائی جاں نثار ساتھی مصعبؓ بن عمیر کا لاشہ بے گور و کفن پڑا ہے کہ جسم پر موجود چادر اتنی چھوٹی تھی کہ اگر سر کو ڈھانپتے تھے تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں کو اگر ڈھانپتے تو سر کھل جاتا تھا۔ حضورؐ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ اسی میدانِ اُحد میں آپؐ کے انتہائی قریبی عزیز حضرت حمزہؓ ابن عبدالمطلب کا اعضاء بریدہ لاشہ

بھی پڑا ہوا ہے۔ حضورؐ کے قلبِ مبارک کی جو کیفیت ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مدینہ پہنچ کر جب آپؐ نے دیکھا کہ گھر گھر سے رونے کی آوازیں آرہی ہیں، شہداء پر ان کی رشتہ دار خواتین بین کر رہی ہیں[1]۔ تو حضورؐ کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آگئے: "اَمَّا حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ!" ہائے حمزہ کے لیے تو کوئی رونے والی بھی نہیں۔ یہ تمام صدمے حضورؐ نے دیکھے اور یہ سب سختیاں جھیلی ہیں تب یہ انقلاب آیا ہے۔ گویا ع "اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے، سو گزری!" کے مصداق اس عظیم انقلابی جدوجہد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن تمام مراحل اور مشکلات و موانع کا سامنا کرنا پڑا جو دنیا کی کسی بھی انقلابی جدوجہد میں پیش آتے ہیں۔ بہرکیف یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ بعثتِ محمدیؐ کی یہ امتیازی شان ہمارے سامنے رہنی چاہیے جو اس آیت میں بیان ہوئی کہ: "ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ"۔ پورے کے پورے دین (نظامِ اطاعت) پر اس دینِ حق کو غالب و قائم کر دینا یہ ہے بعثتِ محمدیؐ کی غرض و غایت!

دو چشم کشا واقعات

یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ یہ چیز بعثتِ انبیاء کے اساسی مقصد سے جُدا نہیں ہے۔ دیکھیے بعثتِ انبیاء کا اصل مقصد نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت ہے اور یہ اسی اتمامِ حجت کا تکمیلی مرحلہ ہے کہ انسان کو اجتماعی نظام کے ضمن میں رہنمائی کے لیے عدل و قسط پر مبنی نظام کا ایک مکمل نمونہ دکھا دیا جائے۔ صرف نظری سطح پر پیش کر دینے سے وہ حُجت مکمل نہیں ہوگی بلکہ اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہوگا کہ اس نظام کو بالفعل قائم و نافذ کر کے اور عملاً چلا کر دکھا دیا جائے۔ اس معاملے کی اہمیت کا حوالہ رواں صدی کے دو واقعات کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔

جب ہندوستان میں پہلی بار مختلف صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں بنی تھیں اُس وقت یاد ہوگا کہ گاندھی جی نے اپنے کانگریسی ساتھیوں اور زعماء کے سامنے ایک عجیب بات کہی تھی اور وہ یہ کہ 'میں اس موقع پر تمہارے سامنے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مثال رکھتا ہوں اس مثال کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو!'۔۔۔۔ غور کیجیے گاندھی نے یہ بات کیوں کہی! ۔۔۔

---

[1] اس وقت تک بین کرنا ممنوع قرار نہیں پایا تھا۔

اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس عہد جدید کے انسان کو جس نوع کے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے اُس نظام کا ایک کامل نقشہ اور ایک مکمل ماڈل (MODEL) اگر درکار ہے تو اس کی نظیر تاریخ انسانی میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے دورِ خلافتِ راشدہ یعنی وہ نظامِ عدلِ اجتماعی جو قائم فرمایا تھا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلّم نے۔

ایک دوسرا واقعہ جو اس کے دوسرے رُخ پر روشنی ڈال رہا ہے، مولانا عبید اللہ سندھی کے حوالے سے ہے۔ اس واقعے سے دینِ حق کے قیام و نفاذ کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ مولانا سندھی جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی ریشمی رومالوں کی تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کو چھوڑ کر افغانستان گئے اور جب افغانستان سے بھی گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر سرحد عبور کر کے انہیں روس جانا پڑا تو اُس وقت روس میں بالشویک انقلاب ابھی نیا نیا آیا تھا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس موقع پر اس انقلاب کے مرکزی رہنماؤں کے سامنے اگر اسلام کا انقلابی پروگرام رکھا جائے تو کیا عجب کہ وہ اُسے قبول کر لیں۔ ابھی ان میں وہ انقلابی جذبہ بھی ہے اور انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے فضا سازگار بھی ہے۔ چنانچہ اس امید میں انہوں نے لینن سے ملاقات کرنا چاہی۔ لیکن لینن اس وقت بسترِ مرگ پر تھا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ ٹراٹسکی سے بات کیجیے، چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی کی ٹراٹسکی سے مفصل گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے آخر میں اُس نے پوچھا کہ مولانا یہ نظام جو آپ پیش کر رہے ہیں بظاہر بہت عمدہ معلوم ہوتا ہے لیکن کیا آپ نے دنیا میں کہیں اسے قائم بھی کیا ہے؟ مولانا عبید اللہ سندھی کہتے ہیں کہ اس کے بعد میری نگاہیں زمین میں گڑی کی گڑی رہ گئیں، دوبارہ میں اس سے آنکھیں چار نہیں کر سکا ——— سیدھی سی بات ہے کہ کوئی نظام حجت تب بنتا ہے جب اُسے چلا کر دکھا دیا جائے۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس اتمامِ حجت کو اپنے تکمیلی درجے تک پہنچا دیا۔ آپؐ نے جہاں نظری، فکری اور اعتقادی ہدایت دی، انسان کی سوچ کو صحیح رُخ پر ڈالا، جہاں آپ نے انفرادی اخلاق کے ضمن میں انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے ایک مکمل ہدایت نامہ عطا فرمایا، خود اپنی سیرت و کردار اور اپنے صحابہ کرام کی سیرت و کردار کو اس رخ پر ڈھال کر انفرادی اخلاق کے ضمن میں ہمیشہ ہمیش کے لیے نوعِ انسانی پر حجت تمام کی، وہاں آپؐ نے ایک جاں گسل جد و جہد کے ذریعے تیئیس سالہ محنتِ شاقّہ کے نتیجے میں اُس نظامِ عدل و قسط کو عملاً برپا کر دیا جس میں انفرادی آزادی بھی ہے لیکن اجتماعیت کے حقوق بھی پورے طور پر محفوظ ہیں،

جس میں مساواتِ انسانی بھی ہے لیکن وہ COST FREEDOM پر نہیں کہ مساوات تو ہو لیکن انسان شخصی آزادی سے یکسر محروم کر دیا جائے۔ بلکہ یہ دونوں اعلیٰ اقدار اس نظام میں بیک وقت موجود ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان جس اعلیٰ قدر کا تصوّر کرے گا اُسے وہ اس نظام میں موجود پائے گا۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا زِ نورِ مصطفیٰ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست

یہ ہے اصل کارنامۂ حیات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا جس کو سمجھنے کے لیے حضورؐ کے مقصدِ بعثت کی اس امتیازی شان کا فہم ضروری ہے جو اس آیۂ مبارکہ میں وارد ہوئی:
" هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ "

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

برائے توجّہ : مقامی رابطہ و معلومات کے لیے قارئینِ کرام ذیل میں درج پتے نوٹ فرمالیں :

۱۔ **محمّد طفیل گوندل**

یونین سیمنٹ کمپنی۔ ص۔ب ۱۷۰ راس الخیمہ۔ (یو۔ اے۔ ای)
فون، رہائش : ۲۵۵۳۷ ــ دفتر : ۱۵۲/ ۶۶۱۶۶

۲۔ **علی اصغر ایم عبّاسی**
دفتر تنظیمِ اسلامی، متصل مکّی مسجد مینارہ روڈ سکھر ۶۵۲۰۰۔ سندھ۔

پروفیسر احمد الدین مارہروی

اسلام سے خوف

اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ بالکل ابتدائی زمانہ سے آج تک تمام دنیا اس سے خائف رہی ہے اور اس کی بظاہر ایک ہی وجہ نظر آتی ہے اور وہ ہے عقیدۂ توحید جس کو بجز مسلمان کے دنیا کی کوئی دوسری قوم و ملت تسلیم کرنے کے واسطے تیار نہیں۔ آنحضرتؐ نے جب مکہ میں توحید کا علم سربلند کیا تو اس وقت روئے زمین پر حق پرستی کے دعویدار تو بہت تھے لیکن توحید کا ماننے والا ایک بھی نہ تھا۔ ملک عرب بُت پرستی کا گہوارہ تھا اور اہلِ عرب کی بے پناہ تلواریں اُن تین سو ساٹھ بتوں کی خاطر بے نیام رہا کرتی تھیں جو انہوں نے خانۂ خدا (کعبہ) میں نصب کر رکھے تھے اور رجید سرداروں سے لے کر نوجوانوں تک ان باطل معبودوں کے لیے جان دینے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ ابتدا میں صرف گنتی کے چند لوگ حضورؐ کے دست مبارک پر ایمان لائے تھے اور چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے تھے۔ اُن کی مثال اژدر پر سفیدی کی سی تھی لیکن اُس وقت کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ باوجود کثرتِ تعداد، اثر و رسوخ، دولت و طاقت کے وہ اسلام سے سخت خائف اور متوحش دکھائی دیتے تھے، بھلا ان مٹھی بھر کمزور انسانوں سے جن میں سے اکثر غلام تھے پوری قوم کو خوفزدہ ہونے کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی کا دل جھوٹا نہیں ہوتا۔ اُن کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ اسلام سچا اور اُن کے عقائد باطل ہیں۔ اس لیے وہ ہر جتن کرتے تھے جس سے اُن کے دین پر آنچ نہ آئے اور اُن کے خود ساختہ معبود کالعدم نہ ہو جائیں۔

لیکن اسلام اس سرعت سے پھیلا کہ کفار، مشرک، یہودی، نصرانی، مجوسی سب ہی انگشت بدنداں رہ گئے۔ جہاں کسی نے تلوار سے مقابلہ کیا مسلمانوں کی تیغ جہاد نے اُن کا صفایا کر دیا، جہاں دلائل سے سامنا کیا وہاں منہ کی کھائی۔ دلوں میں جو کچھ بھی بغض رہا

ہو، منافقت نے جو راہ بھی دکھائی ہو، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر یہودیوں، عیسائیوں، زردشتیوں یا دوسرے باطل پرستوں نے باہمی پھوٹ ڈالنے، غلط راستہ دکھانے اور آپس میں لڑانے کی کوششیں ضرور کیں اور ان میں اکثر کامیاب بھی ہوئے لیکن بایں ہمہ اس کے خوف سے سرضرور جھکائے رہے حتیٰ کہ فرقہ پرستی اور باہمی چپقلش نے بغداد کی تباہی کے ساتھ خلافت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیر دیا۔ جس کے بعد جگہ جگہ مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوگئیں جن میں سے بعض نظریاتی تھیں اور بعض ملحدانہ۔ یہ ایک دوسرے سے خائف بھی تھیں اور دست و گریباں بھی رہتی تھیں لیکن تھیں بہرحال نام کی مسلمان، اس لیے تاتاری ان سے خائف تھے اور انہوں نے گن گن کر ان سب کو تباہ کرنا اور مسلمانوں کا بے دریغ خون بہانا شروع کر دیا۔

ادھر جب یورپ کے عیسائیوں کو یہ احساس ہوا کہ مسلمان اپنے دین کو بھول چکے ہیں اور یک جہتی ختم ہو جانے کے باعث اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ اگر ہم متحد ہو جائیں تو اُن کے ہاتھ سے اپنے قبلہ یعنی بیت المقدس کو واپس لے سکتے ہیں جو حضرت عمرؓ کے زمانے سے ان کے قبضہ میں چلا آرہا ہے تو پطرس نامی راہب نے انہیں جوش دلا کر مسلمانوں کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ تمام یورپ مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کر مسلمانوں سے برسرپیکار ہوگیا اور ۱۰۱۹ء سے ۱۲۷۲ء تک نو لڑائیاں ہوئیں جو صلیبی جنگوں کے نام سے مشہور ہیں۔ مسلمان اس یلغار کے لیے تیار نہ تھے اس لیے ابتداءً انہیں شکست ہوئی۔ بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا اور انہوں نے وہاں اپنی حکومت بھی قائم کرلی۔ لیکن اُس دور کے مسلمان آج کل کی طرح بے حس نہ تھے۔ ان کی رگوں میں جہاد کا خون موجزن تھا۔ انہوں نے ذاتی عناد کو پس پشت ڈال کر بالاتفاق عیسائیوں کا مقابلہ کیا۔ سلطان نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی نے اُن کے چھکے چھڑا دیے اور بیت المقدس دوبارہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا اور جب انگلستان کے بادشاہ رچرڈ نے جو شیر دل کہلاتا ہے اور فرانس کے بادشاہ لوئی نے اسے واپس لینے کی کوشش کی تو انہیں ناک چنے چبوا دیے اور دونوں کو صلح کی درخواست کرنے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد انگلستان پر مسلمانوں کا ایسا خوف طاری ہوا کہ مائیں بچوں کو یہ کہہ کر ڈراتی تھیں کہ خاموش ہو جاؤ نہیں تو سلاڈین (صلاح الدین) آجائے گا۔ کچھ ایسا ہی حال فرانس کا تھا جہاں لوگ سراسینس (مسلمانوں) کے خوف سے رات کو چونک پڑتے تھے اور اُن کی نیندیں

حرام ہو جاتی تھیں۔

یہ جنگیں چونکہ مذہب کے نام پر لڑی گئی تھیں اس لیے پادریوں نے اپنی ناکامیوں کا دوسری طرح بدلہ لیا۔ مسلمانوں کے خلاف نت نئے الزام تراشے، جھوٹا پراپگنڈا کیا اور عوام کے سامنے مسلمانوں کی ایسی بھیانک تصویر پیش کی جیسے وہ خونخوار بھیڑیئے اور سفاک درندے ہوں اور تعصب کا ایسا رنگ ان کی رگ و پے میں داخل کر دیا جو آج تک اپنا رنگ دکھا رہا ہے لیکن اس سلسلہ میں ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس رنگ آمیزی میں تنفر سے زیادہ خوف کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی نے اپنی نظم برق کلیسا میں اس کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ ایک مسلمان نوجوان کسی انگریز لڑکی سے اظہارِ عشق کرتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے:

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے — بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر — حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بتلائے یہ (حد مرحد)، تو بپھر جاتے ہیں — آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد — ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکم جہاد

اب اسلام سے خوف کا ایک بہت اہم واقعہ سنیے اور اس سے عبرت حاصل کیجیے۔

گزشتہ صدی میں انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ انگریز قوم کی عظمت و جبروت کا نشان سمجھی جاتی تھی۔ دنیا کے پانچویں حصہ کی تو وہ براہِ راست حکمران تھی اور باقی ممالک بھی کسی نہ کسی طور پر اس کے زیر اثر تھے۔ ایک روز اس نے اپنی اتالیق اور وزیر اعظم لارڈ میلبورن سے جو علم التواریخ کا بہت بڑا ماہر تھا دریافت کیا کہ آپ نے تاریخ عالم کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس میں آپ کو سب سے حیرت انگیز بات کیا نظر آئی۔ وزیر نے بلا تامل جواب دیا "اسلام کا عروج و زوال"۔ اس پر ملکہ نے دوسرا سوال کیا کہ کیا آپ نے اس کے اسباب پر بھی غور کیا؟ اس نے کہا میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے کہ اُن کے پیغمبر نے انہیں ہدایت کے لیے ایک کتاب (قرآن) دی تھی۔ جب تک وہ اس پر عمل پیرا رہے ترقی کی تمام راہیں اُن پر کھلی رہیں پھر جیسے جیسے انہوں نے اس سے بے اعتنائی برتنا شروع کی اُن کا زوال ہونے لگا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے ملکہ سے بڑے متوحش لہجہ میں اپنے اس خدشہ کا بھی اظہار کیا کہ اگر کسی زمانہ میں تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور مسلمانوں نے من حیث القوم پھر قرآن کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی انفرادی اور قومی زندگی کو اس کے مطابق بنا لیا تو پھر

م کیا ساری دنیا اُن کے زیر نگین آجائے گی۔

چنانچہ اسی گفتگو کے زیر اثر ملکہ اور اس کی حکومت نے مسلمانوں کے متعلق اپنی پالیسی دبدلا اور ہندوستان ہی نہیں اپنی تمام نوآبادیات میں تعلیمی ڈھانچہ کو اس طرح تبدیل کیا کہ سلمان قرآن سے دور ہوتا چلا گیا اور چند علماء کی مدد سے اُن کے ذہنوں میں یہ بات پختہ بر کی طرح جما دی کہ مصحف مبارک کا صرف ناظرہ پڑھ لینا فلاح دارین کے لیے کافی ہے چنانچہ ب وہ نام کا تو مسلمان ہے مگر اسے مطلق پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کس طرح کی زندگی سر کرنے کا حکم دے کر فرمایا ہے کہ:

" اور تم ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو۔ تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔"

(سورہ آل عمران آیتہ ۱۲۶ پارہ ۴ رکوع ۵)

اللہ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے اس کے قائل مغربی دنیا کے دانشور بھی ہیں، عالم بھی اور سیاست داں بھی۔ اسی لیے وہ خائف ہیں کہ اگر مسلمان کسی روز مومن بن گیا اور اس یں فی سبیل اللہ جہاد کا جذبہ پیدا ہو گیا تو اس امڈتے ہوئے سیلاب کے آگے اُن کے باندھے ہوئے تمام بند ٹوٹ جائیں گے (جیسے ایران میں امریکہ کے زیر اثر شہنشاہ کی غیر اسلامی اروس کے زیر اثر افغانستان میں کمیونسٹ حکومتوں کا حشر ہوا) اس لیے اُن کی دوسری بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسلمان طاقتیں بجائے متحد ہونے کے آپس میں نبرد آزما رہیں۔ وہ جانتے یں کہ مسلمان کا مسلمان سے لڑنا احکام قرآن کے خلاف ہے۔ اور جب تک وہ اس پر کاربند رہیں گے قرآن کی پیش گوئی کے مطابق نہ مومن بن سکیں گے نہ اُن پر غالب آسکیں گے۔

ملکہ اور وزیر کی جس گفتگو کا اوپر ذکر ہوا ہے اس کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف ان کی اسلام دشمنی کے باعث زبردست جنگ شروع کر دی جس کو وہ غدر اور ہم جنگ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ابنائے وطن نے ہمارے ساتھ غداری اور اُن کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو ہم یقیناً انہیں ملک بدر کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ دوسری طرف جب مصر پر تسلط حاصل کر کے انہوں نے سوڈان پر بھی قدم جمانے کی کوشش کی تو وہاں مسلمانوں نے مہدی سوڈانی کی سرکردگی میں ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور جس طرح ہمارے افغان بھائیوں نے روس جیسی عالمی طاقت کا سرفروشانہ مقابلہ کیا اسی طرح انہوں نے محض تلواروں اور نیزوں سے انگریزوں کی توپوں اور بندوقوں

کا مقابلہ کیا۔ جنرل ہکس کی تو پوری فوج ہی کا صفایا ہو گیا اور پھر جنرل گارڈن جیسے آزمودہ کار سپہ سالار کو فنا کے گھاٹ اُتار کر انگلستان کی عالمی طاقت کو مجبور کر دیا کہ وہ سوڈان کو مہدی مسلمانوں کے واسطے خالی کر دے۔ ان دو واقعات سے مغرب میں بالعموم اور انگلستان میں بالخصوص مسلمانوں سے خوف میں مزید اضافہ ہوا۔ ایک طرف جھوٹی اور فرضی کہانیوں سے اُن کے حق میں نفرت کے بیج بوئے جانے لگے۔ دوسرے اسلام دشمنی میں سختی آنے لگی۔ اس وقت عیسائی دنیا میں یہودیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن یہ قوم چونکہ اسلام دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے اس لیے پہلی مرتبہ ایک کٹر یہودی ڈسرائیل کو انگلستان کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ پھر اس کی جگہ گلیڈ اسٹون نے لی جو چار مرتبہ اس عہدہ پر سرفراز ہوا۔ اس وقت تک ترکی کی اسلامی سلطنت کافی وسیع اور جاندار تھی اور وہاں کا سلطان دنیائے اسلام کا خلیفہ متصوّر ہوتا تھا۔ اس شخص کو ترکی اور مسلمانوں سے سخت نفرت بلکہ عداوت تھی۔ اس کی پالیسی کا لب لباب یہ تھا کہ اُسے اتنا کمزور کر دیا جائے کہ کم از کم یورپ سے تو اپنا بوریہ بستر سمیٹ لے۔ اس نے ترکی کو "یورپ کا مرد بیمار" کہنا شروع کیا اور ایک دفعہ تو اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ گیا کہ اب ہمیں صرف اس کے جنازہ کی فکر کرنا چاہیے۔

مشیت ایزدی ہے کہ اسلام قیامت تک باقی رہے اس کے ماتحت پچھلی جنگ نے ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کو ایک نادر موقع فراہم کیا کہ وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر نہ صرف آزاد ہو جائیں بلکہ دوبارہ اسلامی روش بھی اختیار کر لیں۔ لیکن افسوس کہ ہم میں سے کسی نے بھی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ بلکہ ہم اسلام سے اور زیادہ دور ہوتے چلے گئے۔

ذرائع ابلاغ کی توسیع کے ساتھ غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام سے خوف کے جو جذبات موجزن ہیں وہ کہیں لبوں پر کہیں نوکِ قلم پر آتے رہتے ہیں کہیں قذافی کو غنڈہ گردوں کا سرغنہ کہا جاتا ہے تو کہیں قوم پرست فلسطینیوں کو دہشت گرد کے لقب سے نوازا جاتا ہے اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اگر کوئی سربراہ مملکت اپنی قوم کی اصلاح کرنی چاہتا ہے تو اسے یا تو فیصل مرحوم کی طرح شہید کرا دیا جاتا ہے یا عیدی امین ونیمری کے مانند اس کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔

ابھی کچھ ہی عرصہ قبل کی بات ہے پاکستان نے جوہری توانائی پر محض ابتدائی کام ہی شروع کیا تھا کہ تمام دنیا چیخ اٹھی کہ یہ ملک اسلامی بم بنا رہا ہے۔ امریکہ، روس، اسرائیل کے علاوہ

بعض دوسرے ممالک کے پاس ایٹم بم موجود ہیں۔ ہندوستان تو دھماکا بھی کر چکا ہے مگر خوف تو اسلامی بم کا ہے جو ہر غیر مسلم کے دل میں جا گزیں رہتا ہے چاہے وہ عیسائی ہو یا یہودی یا ہندو۔ اسی کے ماتحت عراق کا ایٹمی گھر مسمار کر دیا گیا اور اسی کی خاطر کہوٹہ پر ترچھی نگاہیں ہیں۔ لیکن دراصل خطرہ یہ ہے کہ کہیں یہ سر پھیری قوم خدائے واحد کے نام پر دوبارہ متحد ہو کر باطل کی کھوکھلی دیواروں کو منہدم نہ کر دے۔ ایک ہندوستان اور اپنی مثال لے لیجیے۔ اس کی نفری، فوجی طاقت، اسلحہ کی فراوانی، سائنسی و صنعتی ترقی، اقتصادی ترقی، علم و عمل کے مقابلہ میں ہماری حیثیت ہی کیا ہے۔ پھر وہ ہم سے کیوں خائف نظر آتا ہے دراصل وہ ہم سے خائف نہیں بلکہ ہندو اسلام سے خائف ہے جیسا کہ دنیا کی دوسری قوموں کا حال ہے۔

(۲)

لیکن آپ کو میری یہ بات سن کر سخت حیرت ہو گی کہ غیر مذہب والوں کو تو ایک طرف رکھیے۔ آج تو مسلمان بھی اسلام سے خائف ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ انگریز حکومت اور مغربی طرز معاشرت نے جو آزادیاں ہم کو عطا فرمائی ہیں اسلامی قانون رائج ہوتے اور نظام مصطفیٰ کی ترویج سے اُن سب پر ایسی ضرب کاری لگے گی کہ بعض کو تو لندن یا امریکہ کی طرف اسی طرح ہجرت کرنی پڑ جائے گی جیسی خمینی انقلاب کے بعد شہنشاہ ایران کے پیروکاروں کو کرنی پڑی۔ پانچ وقت نماز پڑھنی ہو گی۔ کڑکڑاتی سردی میں صبح کو بستر سے نکلنا، لُو کے تھپیڑے کھاتے مسجد جانا۔ چلچلاتی دھوپ اور تمازت آفتاب میں جبکہ ایک طرف حلق خشک ہو رہا ہو اور دوسری جانب اپنے ہی فرج میں برفاب اور آئس کریم کے ذخائر موجود ہوں تشنہ لب رہنا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا۔ اپنی گاڑھی کمائی سے خود اپنے ہاتھوں یا بنک کے ذریعہ زکوٰۃ کے نام پر کٹوتی اور سرمایہ کا ضیاع کس طرح برداشت کیا جائے گا جبکہ اسی روپیہ سے سامان تعیش خرید کر زندگی کی لذات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر اکل حلال کے نام پر آمدنی کے لامحدود ذرائع سود، رشوت، چور بازاری، سٹہ، جوا وغیرہ یک قلم بند ہو جائیں گے۔ کالے دھن کی فراوانی خواب و خیال ہو جائے گی۔ ناچ رنگ کی محفلوں اور مے و معشوق سے کنارہ کشی کرنی پڑے گی ستم تو یہ ہے کہ آج سر بازار جو بے حجابانہ جلوے نظر آتے ہیں اُن کو دیکھنا بھی شرعاً حرام اور ناجائز قرار دیا جائے گا۔ ریڈیو سے گانے نشر نہ ہوں گے اور وہ ایک کھلونا بن جائے گا۔ ٹی وی، جو فی زمانہ جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش ہے محض ایک ذریعہ معلومات رہ جائے گا۔

بر یہ سوچنا پڑے گا کہ اس پر خرچ کرنا کس حد تک قرینِ عقل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے اکثر سیاست دانوں، لیڈروں اور دانشوروں کی زبانی سنتے رہتے ہیں کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ یہاں ہم سب مسلمان ہیں پھر یہ اسلام اسلام کی رٹ خواہ مخواہ لگائی جا رہی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آنجہانی بھٹو کے خلاف قومی اتحاد یک سیاسی تحریک تھی جس میں ملک کی نو سربرآوردہ جماعتیں شریک تھیں لیکن جب ایک طرف سے نظامِ مصطفیٰ کا نعرہ بلند ہوا تو اس میں جیسی شکست و ریخت ہوئی وہ بھی آپ کے سامنے ہے کیونکہ ہمارے اکثر رہنما اسلام سے خائف تھے جو بعض آزادیوں پر پابندی عاید کرتا ہے پھر جب ضیاء الحق نے اسلامی حکومت کا نام لیا تو اُن کا اکبر الٰہ آبادی کی زبان میں یہ کہہ کر مذاق اڑایا گیا۔ ؎

مگر یہ اللہ اللہ کرتا ہے.....

جبکہ دوسری طرف خود اُن کے دست و پا یعنی بیوروکریسی اور آزاد روشن پبلک نے تہیہ کر لیا کہ ان کی اس مہم کو آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ یوں تو ہمارے ہاں اللہ کے فضل سے علمائے اسلام بھی ہیں اور علمائے پاکستان بھی لیکن اسلام کے لیے ٹھوس کام کرتا کوئی نظر نہیں آتا جس کے لیے مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے۔ ہر شخص کو علم ہے کہ حضور پاکؐ کو باوجود اللہ تعالیٰ کی مکمل پشت پناہی حاصل ہونے کے قیامِ اسلام میں ۲۳ برس کا عرصہ لگ گیا لیکن ہمارے ایک رہنما کا ارشاد ہے کہ اگر میں سربراہِ مملکت ہوتا تو ایک فرمان کے ذریعہ چوبیس گھنٹے کے اندر اسلامی نظام رائج کر دیتا۔ گویا ایک جادو کی چھڑی ہلانے کی دیر ہے ہر کافر دین دار اور ہر فاسق پارسا بن جائے گا۔

دوسری طرف ہماری ترقی پسند خواتین ہیں جن کو اس وجہ سے مغرب زدہ کہا جاتا ہے کہ اوّل تو وہ احکامِ قرآن سے بالکل نابلد ہیں پھر انہوں نے انگریز کے مسلط کردہ غیر اسلامی ماحول میں پرورش پائی اور وہی تعلیم حاصل کی ہے وہ انہی کے خیالات سے واقف ہیں خائف ہیں کہ اسلام اُن کی آزادیوں میں خلل انداز ہوگا۔ نہ وہ غیر مردوں سے بلا جھجک مل سکیں گی نہ مخلوط مجالس میں شرکت کر سکیں گی نہ نغمے سنا سکیں گی نہ بے محابا قہقہے لگا سکیں انتہا تو یہ ہے کہ ٹی وی پروگراموں اور محفلوں میں اپنے حسن و میک اَپ حتیٰ کہ بند وا لی ساڑھیوں اور کرتیوں میں اپنے برہنہ پیٹ، گلو اور بازو کی نمائش بھی نہ کر سکیں گی۔

لیکن ان سے بھی بڑھ کر خوف ان سیاسی علماء کو ہے جو ملک میں نظامِ مصطفیٰ کی ترویج کے علمبردار ہیں اور اپنے دعوے کے بموجب ملک میں وہی اسلام لانا چاہتے ہیں جو حضورؐ نے قائم فرمایا تھا اور جو خلفائے راشدین کے زمانے تک جاری رہا۔ لیکن ہر شخص اس امر سے واقف ہے کہ اس کا ایک سربراہ ہوتا تھا جو پہلے خود آپؐ تھے اور اس کے بعد خلفا لیکن ان کا عام چناؤ نہیں ہوتا تھا۔ کیا حضورؐ کو اہلِ مکہ، طائف، یمن اور قبائل نے منتخب کیا تھا یا حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علیؓ تک ملک میں عام انتخاب ہوا تھا؟ ایک طالب علم بھی کہہ دے گا کہ نہیں۔ اہلِ اسلام میں چند اولواالالباب صحابہ تھے جو یہ فرض انجام دیتے تھے اور تمام قوم متفقہ طور پر ان کو امیرالمؤمنین تسلیم کر لیتی تھی۔ خلیفہ تمام امور میں اہل الرائے سے مشورہ کرتے تھے جن کی سب سے بڑی اہلیت تقویٰ، دین کی سمجھ اور اسلام کے واسطے جان، مال اولاد سب کچھ قربان کر دینے کی تمنا ہوتی تھی۔ کوئی کسی عہدہ کا امیدوار نہ ہوتا تھا۔

کیا ہمارے پرستارانِ نظامِ مصطفیٰ جن میں فی الوقت سب سے زیادہ پھوٹ اور نااتفاقی ہے، اسی قسم کا نظام چاہتے ہیں جو سلف صالحین کا شیوہ تھا یا وہ مغرب کے ایجاد کردہ غیر اسلامی پارلیمانی نظام جمہوریت، وزارتِ عظمیٰ اور دیگر وزارتوں کے خواہشمند ہیں جن پر عزت و مرتبت، رعب و داب، دولت و شہرت، عیش و آرام غرضیکہ وہ سب کچھ آجاتا ہے جس کی اس دنیا میں انسان کو خواہش ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس اسلام سے خائف ہیں جس میں نظامِ حکومت ایک فردِ واحد کے ہاتھ میں آجائے جو اس سرزمین میں خدا کا نائب رسولؐ کا خلیفہ اور مسلمانوں کا سربراہ ہوگا خود بھی خدا اور رسولؐ کے نافذ کردہ قوانین کا پابند ہوگا اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلائے گا اور کسی کو من مانی کرنے کی اجازت نہ دے گا

اسلام سے مسلمانوں کا یہ خوف خود ہمارے ملک یا قوم تک محدود نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک تو ہم سے بھی کچھ آگے ہیں جہاں اگر کسی اسلام پرست جماعت نے زور پکڑا تو ان کی بڑی سختی اور بیدردی سے بیخ کنی کی گئی۔ مصر میں اخوان المسلمین کے ساتھ ناصر اور سادات نے جو بہیمانہ سلوک کیا اس کی خونی داستان سے ہر ایک واقف ہے۔ بعض افریقی اور ایشیائی ممالک میں گاہے گاہے اس قسم کی کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں اور اگر پاکستان میں بھی خدانخواستہ سوشلسٹ یا کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی تو اندیشہ ہے کہ یہاں بھی اسلام کے نام لیوا تو باقی رہ جائیں گے البتہ خود مسلمانوں کا بُرا حشر ہوگا کیونکہ یہ دونوں طرزِ فکر

اسلام سے خائف اور اس کے سخت دشمن ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ گذشتہ چودہ سو برس میں تمام دنیا اسلام سے کس طرح خائف رہی ہے اور جب تک حق و باطل کی جنگ جاری ہے یہی حالت قائم رہے گی اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں ہم مسلمانوں کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ اس کا شافی جواب ہمیں سورہ آل عمران کی اس آیت میں ملتا ہے جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ اور جس کا از روئے تاریخ ہم تجربہ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن افسوس صرف اس امر کا ہے کہ ہم کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ مسلمان اور مومن مترادف یعنی ہم معنی الفاظ ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ مسلمانوں سے ہے۔ ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو آج مسلمان ہر جگہ یوں ذلیل و خوار نہ ہوتے۔ اس لیے آپ خدا کے واسطے مومن بننے کی کوشش کیجئے اور دنیا پر ثابت کر دیجئے کہ اسلام سے ان کا خوف حق بجانب ہے۔

کتابیات

گناہ کبیرہ کیا ہے؟

زیرِ طبع کتاب کے پہلے باب کی فصلِ اوّل

مؤلف : ابو عبدالرحمٰن شبّیر بن نور
(ص ب ۲۰۳ ، الدوادمی ، سعودی عرب)

اللہ تعالیٰ نے دین کے احکام و قوانین اس لیے نازل فرمائے ہیں تاکہ ان کی پابندی کی جائے اور ان سے بال برابر اِدھر اُدھر نہ ہوا جائے۔ انسان بہرحال کمزوریوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کا مجموعہ ہے، اس لیے اس سے بھول چوک، غلطی یا نادانی ہو ہی جاتی ہے۔ نتیجۃً وہ "صراطِ مستقیم" سے بھٹک جاتا ہے اسی غلطی اور نادانی کا نام "گناہ" ہے۔

اگر یہ غلطی معمولی نوعیت کی ہو تو اسے "گناہِ صغیرہ" کہتے ہیں اور اگر یہ غلطی غیر معمولی اور اہم قسم کی ہو، مثلاً کسی کی حق تلفی (حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد) خدائی احکام کی نافرمانی یا اُن تعلقات اور رشتہ داریوں کو توڑنے یا خراب کرنے کی شکل میں ہو جن پر انسانی زندگی کا امن اور قرار منحصر ہے تو اسے گناہ کبیرہ کہتے ہیں۔

اہلِ علم نے گناہ کبیرہ کی پہچان ان الفاظ میں بیان کی ہے: "ہر وہ کام گناہ کبیرہ میں شامل ہے جس کے مرتکب کے لیے:

ا۔ دنیا میں کوئی حد یا تعزیر مقرر کی گئی ہو۔ مثلاً چوری کرنا، زنا کرنا، زنا کی تہمت لگانا، قتل کرنا زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنا۔

ب۔ یا آخرت میں اس کے لیے سزا کی وعید ہو۔ مثلاً مرتد ہو جانا، نفاق والی زندگی گزارنا، اللہ کے ساتھ شرک کرنا، رسولوں کا مذاق اڑانا۔

۔ یا اس گناہ کے نتیجہ میں خاتمۂ ایمان کی اطلاع دی گئی ہو۔ مثلاً امانت میں خیانت کرنا، بدعہدی کرنا، نماز ترک کرنا۔

۔ یا گناہ کرنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بے تعلقی کا اعلان ہو۔ مثلاً دھوکہ دینا، معرکے سے فرار ہونا۔

ر۔ یا کتاب وسنّت نے واضح الفاظ میں اسے اُمّتِ مسلمہ سے خارج قرار دیا ہو۔ مثلاً شرک کرنا، غیر اللہ کے نام پر نذر و نیاز دینا۔

۔ یا اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس پر لعنت کی ہو۔ مثلاً غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا، والدین کو بُرا بھلا کہنا۔

۔ یا اس پر اللہ تعالیٰ کے غصّے اور غضب کا اعلان کیا گیا ہو۔ مثلاً کچھ کیے کرائے بغیر ڈینگیں مارنا، بڑھاپے میں زنا کرنا، بادشاہ ہوتے ہوئے جھوٹ بولنا۔

ح۔ یا کتاب وسنّت میں ایسے کام کے مرتکب کو فاسق قرار دیا گیا ہو۔ مثلاً غیر شرعی احکام نافذ کرنا، جھوٹی گواہی دینا۔

ط۔ یا کتاب وسُنّت کی نصِ صریح نے اس کام کو "حرام" قرار دیا ہو۔ مثلاً مردار کھانا، خنزیر کھانا، خون پینا۔

ی۔ ہر گناہِ صغیرہ، گناہِ کبیرہ بن جاتا ہے جب وہ دین کے استخفاف یا اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں استکبار کے جذبے سے کیا جائے۔ اسی طرح اگر کوئی "گناہِ صغیرہ" مسلسل کیا جائے تو "گناہِ کبیرہ" کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے درج ذیل قول سے ثابت ہوتی ہے:

لَا کَبِیْرَۃَ مَعَ الْاِسْتِغْفَارِ وَلَا صَغِیْرَۃَ مَعَ الْاِصْرَارِ۔

استغفار کرنے سے بڑا گناہ بھی باقی نہیں رہتا۔ اور مسلسل کرتے رہنے سے صغیرہ گناہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔

فصل ثانی

ارتکابِ گناہ کے اسباب

ایمان کی کمزوری

یہ دنیا دار الامتحان ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف ہدایت کے اسباب مہیا کیے ہیں تو دوسری طرف آزمائش اور امتحان کے لیے گمراہی کے اسباب بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ لہٰذا جب تک انسان اپنے اللہ کو یاد رکھتا ہے، اس کے مقام، اس کی صفات، اس کے اختیارات کے بارے میں ایمان تازہ رکھتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور نتیجۃً گناہوں سے بچتا رہتا ہے لیکن کسی وجہ سے اس ذاتِ باری تعالیٰ کا خوف یا اس کی یاد دل سے نکل جاتی ہے تو وہ شیطان یا نفس کے چنگل میں پھنس کر کسی نہ کسی گناہ کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔ جس قدر دلی یقین و اطمینان کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگی اسی قدر وہ اللہ کے عذاب اور اس کی پکڑ سے ڈرتا رہے گا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا[1]

"اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔"

جس شخص کو علم ہو کہ اللہ کی ذاتِ مقدس اسے ہر وقت دیکھ رہی ہے، اس کی ہر بات سن رہی ہے حتّٰی کہ وہ اس کے دل کے اندر ہونے والی ہلچل سے بھی واقف ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۝[2]

---

[1] سورت فاطر آیت ۲۸ [2] سورت قٓ آیت ۱۶

"ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور اس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔"

وہ کسی بھی قدم کے اُٹھانے سے پہلے اس کے نتائج کو یقیناً سوچے گا۔ اور اس کا یہ علم و یقین جس قدر پختہ ہوتا جائے گا، اسی قدر اس کا ایمان مضبوط اور خوفِ خدا بھی زیادہ ہوتا جائے گا۔ اور پھر اسی نسبت سے وہ گناہ اور غلطی سے بھی دور و نفور ہو گا اور اس سے بچتا چلا جائے گا۔

انبیاء و رسل کا علم و عرفان درجۂ کمال پر ہوتا ہے، اس لیے اُن کا ایمان انتہائی مضبوط و مستحکم اور خوفِ خدا اُن پر ہمیشہ طاری رہتا ہے۔ اور بالخصوص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں سب سے زیادہ علم و معرفت رکھتے تھے وہیں سب سے زیادہ اللہ کا خوف اور ڈر بھی رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دلی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

عُرِضَتْ عَلَيَّ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ فَلَمْ أَرَ كَالْيَوْمِ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ وَلَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلاً وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا[1]

"مجھ پر جنّت اور جہنّم پیش کیے گئے تو میں نے خیر و شر کے سلسلے میں آج جیسا منظر کبھی نہیں دیکھا (یعنی اہلِ جنّت اور اُن کے کردار کی شکل میں، اور اہلِ جہنم اور اُن کی کرتوتوں کی شکل میں) اور جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم لوگ جان جاؤ تو تھوڑا ہنسو گے اور زیادہ روؤ گے۔"

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا:

إِنِّيْ أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ وَأَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ أَطَّتِ السَّمَاءُ وَحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ مَا فِيْهَا مَوْضَعُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ إِلَّا وَمَلَكٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهُ لِلّٰهِ وَلَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَلَبَكَيْتُمْ

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الفضائل باب توقیرہٖ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ملتے جلتے لفظوں کے ساتھ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی: "لو تعلمون ما اعلم..." میں حدیث بیان ہوئی ہے۔

كَثِيرًا وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَى الْفُرُشِ وَلَخَرَجْتُمْ إِلَى الصُّعُدَاتِ تَجْأَرُونَ إِلَى اللهِ لَوَدِدْتُ أَنِّي شَجَرَةٌ تُعْضَدُ[1]

"میں وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں جنہیں تم نہیں دیکھتے، اور وہ کچھ سن رہا ہوں جسے تم نہیں سنتے۔ آسمان بوجھ کی وجہ سے چرچرا رہا ہے اور اسے حق ہے کہ چرچرائے' اس لیے کہ کوئی چار انگشت جگہ بھی ایسی نہیں جہاں کسی فرشتے نے اللہ کے حضور جبیں نہ ٹکا رکھی ہو۔ جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جان جاؤ تو تھوڑا ہنسا کرو گے' زیادہ رویا کرو گے' اور اپنی بیویوں سے لذت اندوز بھی نہ ہو گے۔ بلکہ ٹیلوں اور اُونچائیوں کی طرف نکل جاؤ گے' جہاں اللہ کے حضور گڑگڑاؤ گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اے کاش میں کوئی درخت ہوتا جسے کاٹ کر پھینک دیا جاتا۔"

معلوم ہوا کہ گناہوں کے ارتکاب کا سب سے بڑا سبب اللہ کے حضور پیش آنے والے حالات کی کمی اور ایمان کی کمزوری ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو علیم' خبیر' بصیر' علیمٌ بذات الصدور اور عالم الغیب والشہادۃ جانتے اور مانتے ہوئے' اس کے سامنے اپنی پیشی کا یقین بھی رکھتا ہو اور دھڑلے سے گناہ بھی کرتا رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ پر' یوم آخرت پر اور وہاں پیش آنے والے ہولناک واقعات پر انسان کا ایمان و یقین پختہ ہو تو وہ بالعموم گناہوں سے بچا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت کی ہولناکیوں کو قرآن کریم میں متعدد جگہ مختلف انداز بیان کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝

---

[1] سنن الترمذی' کتاب الزہد' باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ"۔ امام ترمذی نے حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ مسند امام احمد' ج ۵ ص ۱۷۳۔ سنن ابن ماجہ' کتاب الزہد' باب الحزن والبکا حدیث ۴۱۹۰۔ محدث العصر فضیلۃ الشیخ ناصر الدین الالبانی نے بھی حدیث کو حسن کہا ہے۔ صحیح الجامع الصغیر حدیث ۲۴۴۹۔ المستدرک للحاکم ج ۴' ص ۵۷۹۔

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارٰى وَمَا هُمْ بِسُكَارٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ○[1]

"لوگو اپنے رب کے غضب سے بچو، حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا زلزلہ بڑی (ہولناک) چیز ہے۔ جس روز تم اسے دیکھو گے حال یہ ہوگا کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے سے غافل ہو جائے گی، ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا، اور لوگ تم کو مدہوش نظر آئیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب ہی کچھ ایسا سخت ہوگا۔"

یہ ارشاد ہوا:

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ○ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ○ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ○ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ○ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ○[2]

"جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب تارے بکھر جائیں گے، اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے، اور جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ اس وقت ہر شخص کو اس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا۔"

ان ہولناکیوں پر ایمان کے ساتھ ساتھ انسان کو اس بات کا بھی یقین ہو جاتا ہے کہ اسے تن تنہا اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور دنیا کا سارا مال و متاع اور تعلقات و متعلقین یہیں رہ جانے ہیں۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ[3]

---

[1] سورت الحج، آیات ۱-۲

[2] سورت الانفطار، آیات ۱-۵ [3] سورت الانعام، آیت ۹۴

"لو اَب تم تن تنہا ہمارے پاس حاضر ہو گئے، جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو"

اور یہ بھی یقین ہو جائے کہ جو کام میں کروں گا اس کا انجام بھی مجھے ہی بھگتنا ہے۔ کوئی چالاکی یا کوئی ہیر پھیر یا کوئی بڑی سے بڑی سرپرست ہستی مجھے نجات نہ دلا سکے گی۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

سورت البقرۃ، آیت ۴۸

"اور ڈرو اس دن سے جب کوئی ہستی کسی کے ذرا کام نہ آسکے گی، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔"

اگر ان تمام حقائق پر واقعی اور سچے دل سے ایمان حاصل ہو جائے تو پھر کون مائی کا لال ہے جو گناہ اور غلطی کے قریب بھی پھٹکے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ زبانی اقرار کی حد تک تو ہم ان سب چیزوں کو تسلیم کرتے ہیں مگر دل اسے اپنے اندر جگہ دینے کو تیار نہیں۔ اور یہی وہ لبس کی گانٹھ ہے جس کی دوا مشکل سے میسر ہے۔

امام ابنِ تیمیہؒ کی تالیف "اَلْاِیْمَان" کی ایک فصل کا ترجمہ

ایمان اور اسلام کا فرق

اور قانونی مسلمان کی باطنی اعتبار سے تین ممکن حالتیں

مترجم: حافظ خالد محمود خضر، فیلو قرآن اکیڈمی

★

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے اس قول میں ایمان کے بغیر اسلام کا اثبات کیا ہے کہ:

"قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ، قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ ، وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْــًٔا" (الحجرات : ۱۴)	"بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ، ان سے) کہیئے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ یوں کہو کہ 'ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے' اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور (اس کے باوصف) اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کمی نہ کرے گا۔"

صحیحین میں موجود ہے کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو (کچھ مال) عطا فرمایا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ (مالِ غنیمت) تقسیم فرمایا۔ اور ان میں سے ایک شخص کو چھوڑ دیا جسے کچھ نہ دیا۔ اور میرے نزدیک وہ ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ تھا۔

پس میں نے عرض کیا : " یارسول اللہ، آپ نے فلاں شخص کو کیوں محروم رکھا؟ خدا کی قسم میری رائے میں تو وہ مومن ہے "؛ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : " (مومن ہے) یا مسلم؟" میں نے اپنی بات تین بار کہی اور تینوں ہی بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے مجھ پر (ان ہی الفاظ میں) لوٹا دیا۔ پھر فرمایا: " بے شک میں کسی شخص کو مال دیتا ہوں، جبکہ کوئی دوسرا شخص مجھے اس سے محبوب تر ہوتا ہے، محض اس خوف سے کہ کہیں اللہ اس (مقدم الذکر شخص) کو اوندھے منہ آگ میں نہ جھونک دے "۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

رہا یہ سوال کہ یہ اسلام جس کے حاملین کے دلوں میں دخولِ ایمان کی اللہ نے نفی کی ہے، کیا یہ وہ اسلام ہے جس پر انہیں (اجر و) ثواب دیا جائے گا؟ یا یہ منافقین کے اسلام کی جنس سے ہے؟ تو اس کے بارے میں سلف اور خلف کے دو مشہور قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ وہ اسلام ہے جس پر انہیں ثواب دیا جائے گا، اور جو انہیں کفر اور نفاق سے بری کر ہے۔ یہ رائے حسن (بصری)، ابن سیرین، ابراہیم نخعی اور ابوجعفر باقر رحمہم اللہ سے مروی ہے مزید برآں یہی حماد بن زید، احمد بن حنبل، سہل بن عبداللہ التستری، ابو طالب مکی اور بہت دوسرے اہلِ حدیث، اہلِ سنت اور اہلِ حقائق کا قول بھی ہے۔ احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ ہمیں مؤمل بن اسحاق نے حماد بن زید سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ہشام کو یہ کہتے ہوئے سنا: حسن اور محمد (دونوں) کہا کرتے تھے کہ: وہ مسلم ہے اور (یہ کہتے ہوئے) ڈرتے تھے کہ مومن ہے۔" اور احمد بن حنبل کہتے ہیں: ہمیں ابوسلمہ خزاعی نے بتایا کہ مالک، شریک، ابوبکر بن عیاش، عبدالعزیز بن ابی سلمہ، حماد بن سلمہ اور حماد بن زید نے کہا ہے " ایمان : معرفت، اقرار اور عمل (کا نام) ہے "۔ سوائے اس کے کہ حماد بن زید اسلام و ایمان میں فرق کرتے ہیں، وہ ایمان کو خاص قرار دیتے ہیں اور اسلام کو عام۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اسلام (جس کا ذکر سورۃ الحجرات کی مذکورہ بالا آیت میں ہوا ہے) قید اور قتل کے خوف سے اطاعت قبول کر لینا ہے، جیسے منافقین کا اسلام۔ (چنانچہ یہ موقف رکھنے والوں نے) کہا: " اور یہ کافر ہیں، کیونکہ ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ جس کے دل میں ایمان داخل نہ ہوا ہو وہ کافر ہے "۔

اسی (موقف) کو امام بخاری اور محمد بن نصر المروزی نے اختیار کیا ہے۔ اور سلف اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ محمد بن نصر نے کہا: ہمیں اسحاق نے بتایا کہ ہمیں جریر نے خبر دی کہ مغیرہ سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا: میرے پاس ابراہیم نخعیؒ آئے، تو میں نے کہا: بے شک ایک آدمی مجھ سے جھگڑتا ہے، اسے سعید العنبری کہا جاتا ہے۔ [ابراہیم نے کہا وہ العنبری نہیں، بلکہ زبیدی ہے۔] اللہ کے فرمان: "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا" (کے بارے میں) وہ کہتا ہے کہ: "یہاں استسلام (فرمانبرداری) مراد ہے"۔ اس پر ابراہیم نخعیؒ نے کہا: "نہیں، یہاں مراد اسلام ہے"۔

اور (محمد بن نصر نے) کہا: ہمیں محمد بن یحیٰی نے حدیث بیان کی کہ ہمیں محمد بن یوسف سے یہ بات پہنچی کہ مجاہد سے روایت ہے: "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا" (سے مراد یہ ہے کہ یوں کہو کہ:) ہم نے قید اور قتل کے ڈر سے فرمانبرداری قبول کی"۔ لیکن یہ روایت منقطع ہے، سفیان کی ملاقات مجاہد سے ہوئی ہی نہیں۔

اور جو کہتے ہیں کہ: "یہ اسلام منافقین کے اسلام کی مانند ہے، جس پر انہیں اجر نہیں دیا جائے گا"، ان کا کہنا ہے کہ: "کیونکہ اللہ نے اُن کے ایمان کی نفی کی ہے، اور جس کے ایمان کی نفی کر دے وہ (یقیناً) کافر ہے"۔ اور یہ کہتے ہیں: "اسلام ہی ایمان ہے۔ اور ہر مسلم مومن ہے اور ہر مومن مسلم ہے۔ اور جس نے فسّاق کو مسلم قرار دیا مگر مومن نہیں، اس پر لازم آتا ہے کہ پھر وہ ان (فساق) کو اللہ تعالیٰ کے اس طرح کے اقوال میں داخل نہ کرے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ (المائدہ: اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ (الجمعہ: وغیرہ کیونکہ انہیں ایمان کے نام سے پکارا گیا ہے، نہ کہ اسلام کے نام سے۔ پس جو کوئی مومن نہیں وہ اس میں داخل نہیں"۔ (یعنی اس طرح وہ ایسی آیات کا مخاطب اور ان میں دیے گئے احکام کا مکلف نہیں ٹھہرے گا!)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ --- خطاب: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" اس سے مختلف ہے جو "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ

جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ " (الحجرات : ۱۵) اور اس طرح کی دوسری آیات میں (مراد) ہے۔ پس " يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا " سے خطاب میں (ہر وہ شخص) داخل ہے جس نے ایمان ظاہر کیا ہو، اگرچہ وہ اندرونی طور پر منافق ہو اور اس میں محض ظاہری طور پر ہی داخل ہوا ہو۔ تو وہ شخص اس میں کیسے داخل نہ ہوگا جو منافق نہ ہو، اگرچہ وہ حقیقی طور پر مومن نہ بھی ہو۔ اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ: "بے شک وہ مسلم ہے اور اس کے پاس وہ ایمان (موجود) ہے جو اسے خلود فی النار سے بچائے گا" اور یہ بات اہل سنت کے مابین متفق علیہ ہے۔ لیکن آیا اس (ناقص ایمان) پر " ایمان " کے نام کا اطلاق ہوگا یا نہیں؟ تو یہ وہ بات ہے جس کے بارے میں ان کے مابین اختلاف موجود ہے۔ پس (یہ بھی) کہا جاتا ہے کہ: " اسے 'مسلم' کہا جائے گا اور 'مومن' نہیں کہا جائے گا اور (یہ بھی) کہا جاتا ہے کہ: " (نہیں) بلکہ اسے 'مومن' ہی کہا جائے گا۔"

اور محقق بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ: وہ ناقص الایمان مومن ہے ۔۔۔ اپنے ایمان کی وجہ سے مومن اور اپنے کبیرہ (گناہوں) کی وجہ سے فاسق ہے، اور (اس کے ایمان کو) 'ایمانِ مطلق' کا نام نہیں دیا جائے گا، کیونکہ کتاب و سنت نے اس سے (ایمان) مطلق (کے) نام کی نفی کی ہے۔

پس ایمان کے ساتھ خطاب میں تین گروہ داخل ہیں :۔

(ا) اس میں مومن حقیقی تو داخل ہیں ہی !

(ب) ظاہری احکام کے اعتبار سے اس میں منافق بھی داخل ہیں، اگرچہ آخرت میں آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔ اور منافق باطن میں اپنے سے اسلام اور ایمان کی نفی کرتا ہے اور ظاہر میں وہ اپنے لیے اسلام اور ظاہری ایمان کا اثبات کرتا ہے۔

(ج) اور اس میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا، جبکہ حقیقتِ ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوئی۔ لیکن ان کے پاس ایمان کا کچھ حصہ اور اسلام موجود ہے جس پر انہیں اجر و ثواب دیا جائے گا۔ مزید برآں وہ ان معاملات میں کوتاہی کرنے والے بھی ہیں جو ان پر فرض کیے گئے ہیں مگر ان کے ساتھ کبیرہ گناہ نہیں ہیں جس پر انہیں اہل

کی طرح سزا دی جائے۔ لیکن انہیں فرائض کے ترک کی بنا پر سزا دی جائے گی۔ اور یہ ان اعراب وغیرہ کے مانند ہیں جن کا ذکر اس آیۂ مبارکہ (الحجرات: ۱۴) میں آیا ہے۔ پس انہوں نے کہا کہ "ہم ایمان لائے" مگر وہ اس پر باطنی اور ظاہری طور پر قائم نہ ہوئے جس کا انہیں حکم دیا گیا۔ پس نہ تو حقیقتِ ایمان ان کے دلوں میں داخل ہوئی اور نہ انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جہاد کے لیے پکارا بھی۔ اور بعض دفعہ (وہ لوگ بھی اس میں داخل ہوتے ہیں) جو اہلِ کبائر میں سے ہوں، جن کے لیے وعید بھی آئی ہے، مثلاً وہ جو نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، جہاد کرتے ہیں اور (ساتھ ساتھ) کبائر کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام سے خارج نہیں ہوتے، بلکہ یہ مسلمان ہیں، لیکن ان کے مابین ایک لفظی نزاع ہے کہ: کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ 'مومن' ہیں؟ جیسا کہ ہم اسے عنقریب ذکر کریں گے، ان شاء اللہ!

تو جہاں تک خوارج اور معتزلہ کا تعلق ہے وہ ایسے (لوگوں کو) ایمان اور اسلام دونوں سے خارج قرار دیتے ہیں اس لیے کہ ان کے نزدیک تو ایمان اور اسلام ایک ہی (شے) ہے۔ پس ان کے نزدیک جب یہ ایمان سے خارج ہوتے ہیں تو اسلام سے (بھی) خارج ہو جاتے ہیں۔ لیکن (اس کے بعد ان دونوں گروہوں کے مابین کچھ اختلاف بھی ہے:) خوارج کہتے ہیں کہ: "وہ کافر ہیں" اور معتزلہ کہتے ہیں کہ: "نہ مسلم ہیں اور نہ کافر" وہ انہیں ان دونوں درجوں کے درمیان والے درجے میں رکھتے ہیں۔

اور اس بات کی (حتمی اور قطعی) دلیل کہ آیۂ مبارکہ (الحجرات: ۱۴) میں مذکورہ اسلام سے وہ اسلام مراد ہے جس پر انہیں اجر دیا جائے گا اور یہ کہ وہ منافق نہیں ہیں، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے بعد کہ: "بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ (ان سے) کہیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا" یہ بھی فرمایا ہے: "اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کمی نہ کرے گا" اس سے ثابت ہوا کہ وہ (یعنی اعراب) جب اس اسلام کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں اس اطاعت پر اجر عطا فرمائے گا، جبکہ (یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ) منافق کا
[illegible]

افکار و آراء

مسئلہ مزارعت

کے بارے میں مولانا قاضی عبد الکریم مدظلہٗ کی رائے

ماہنامہ ' الخیر ' ملتان کی اشاعت بابت نومبر ۱۹۹۰ء میں مولانا قاضی عبد الکریم مدظلہ کی ایک تحریر " مسئلہ مزارعت ' صاحبین کا مسلک ' اور اسلاف پر تنقید " کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے راقم الحروف پر بھی اظہارِ عتاب فرمایا ہے اور مولانا محمد طاسین مدظلہ پر تو حد درجہ غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے۔ راقم مولانا موصوف کو اپنا بزرگ تصور کرتا ہے اور ان کا بے حد احترام کرتا ہے اور اُن کی ناراضگی کو بھی ع " کہ ہرچہ ساقی ' ما ریخت عین الطاف است ! " ہی کا مصداق گردانتا ہے۔ لہٰذا جواباً کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ البتہ اگر مولانا محمد طاسین صاحب کچھ وضاحت پیش کرنا پسند فرمائیں گے تو ہم ان کے جواب کے ساتھ مولانا قاضی عبد الکریم صاحب کے اعتراضات بھی ہدیۂ قارئین کر دیں گے ' .... سردست قاضی صاحب محترم کی تحریر کا ابتدائی حصہ اور اختتامی فرمودات میں سے بعض اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ اُن میں جو رائے آں محترم کی سامنے آئی ہے وہ بہت وقیع اور قابل توجہ اور ملک و ملت کے موجودہ احوال و ظروف کے اعتبار سے بہت اہم ہے .... اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا کہ جہاں تک مدّعا اور مقصود کا تعلق ہے وہ قاضی صاحب مدظلہ کا بھی وہی ہے جو راقم الحروف اور مولانا محمد طاسین صاحب کا ہے .... قاضی صاحب کی خدمت میں کتاب " موجِہ نظامِ زمینداری اور اسلام " بصیغۂ ڈاک ارسال کر دی گئی ہے .... اسرار احمد عفی عنہ

" ماہنامہ حکمتِ قرآن میں ایک مضمون مروّجہ نظام زمینداری اور اسلام کے عنوان سے کئی قسطوں میں آیا ہے۔ میرے سامنے اکتوبر ۸۳ء کا شمارہ ہے اور اس میں ہے کہ یہ درھویں اور آخری قسط ہے۔ یہ مضمون مولانا محمد طاسین صاحب کے نام سے منسوب ہے جو چند شمارے میرے سامنے ہیں ان میں صاحبِ مضمون کے نام کے علاوہ کوئی فصل ذکور نہیں جس سے ان کی شخصیت متعین ہو سکے۔ ابتداء کی ایک دو قسطوں کو سرسری

دیکھنے سے اندازہ یہ ہوا تھا کہ مضمون کا مرکزی نقطہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک عدمِ جواز مزارعت کو صاحبین رحمۃ اللہ علیہما کے مسلک جوازِ مزارعت پر روایتاً و درایتاً ترجیح دینا پیش نظر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں احناف کے لئے نہ تعجب کی کوئی بات تھی اور نہ ہی پریشانی کا پہلو...... خیال تھا جب حدیث پاک کے کسی کتاب میں یہ مسئلہ آئے گا تو اس وقت اس مضمون سے استفادہ کیا جا سکے گا...... مطالعہ برائے مطالعہ کا نہ شوق ہوا اور نہ ہی وقت نکل سکا۔ یہ وہم ہی نہیں تھا کہ اس مضمون کا آخری حربہ 'حکمتِ قرآن' کی حکمت عملیہ کے عین مطابق اسلاف کرام اور فقہاءِ عظام رحمہم اللہ تعالیٰ کے دامنِ تقدس پر چھینٹے ڈالنا ہے"۔

"آپ کو امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کی ترجیح مطلوب ہے تو یہ آپ کا حق ہے۔ اگر آپ مروّجہ زمینداریوں کو اسلام کے خلاف قرار دینے کے حق میں ہیں جس میں کاشتکاروں پر اتنا بوجھ لاد دیا جاتا ہے جس کو گدھے پر لادنا بھی ظلم عظیم ہے تو یہ عظیم جہاد ہے مگر یہ کس احمق نے آپ کو باور کرایا کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے ساتھیوں نے اسی قسم کی مزارعت کا فتویٰ دیا تھا اور کس دیوانہ نے اس کی تصدیق کی۔

یہاں تک کہ اگر ان حضرات کی جائز کردہ مزارعت جو یقیناً احادیث صحیحہ سے ثابت کی جا سکتی ہے کہ موجودہ حالات میں لوگوں کو کفر و الحاد تک دھکیلنے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں اور اس کے برعکس امام ابو حنیفہ کے مسلک کو امت کے لئے مفید سمجھتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ علماء وقت پر زور دیں کہ وہ اس پر غور کریں اور منجرالی الحاد زمینداریوں پر پابندی لگوانے کی تحریک کریں۔ علماء کی اس محنت کا ایک نمونہ آپ کے سامنے ہے کہ مفقود ۃ الزوج کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے خلاف امت ہی کی بہبود کے لئے امام مالکؒ کے مسلک پر اجتماعی فتویٰ دیا اور امت کے لئے آسانی کا راستہ بنا دیا۔ لیکن حاشا و کلاّ کہ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو چھوڑتے وقت ان کو عورت دشمنی کا طعنہ دیا ہو یا ان کے ذہن میں بھی ایسا محسن کش خیال گزرا ہو۔

احقر راقم الحروف کا اس سلسلہ میں ایک مضمون بیّنات محرم ۱۴۰۰ھ میں اور اس سے بھی قبل خدّام الدین لاہور ۱۹ / اکتوبر ۱۹۷۹ء میں چھپ چکا ہے جس کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یہی ہے کہ موجودہ زمینداریاں نفاذِ اسلام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ پیٹ پرست اور دنیا پرست مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کی گود میں ڈلوا رہی ہیں۔ ایسے حالات میں علماء غور کریں اور صاحبین کے مسلک کی بجائے الامامؒ کے مسلک پر نہ صرف فتویٰ

دیں بلکہ ارباب اقتدار سے اس پر عمل کرانے کی تحریک بھی چلائیں"۔

"میری آواز چونکہ ایک دور افتادہ طالب علم کی آواز تھی اس لئے اس پر صدائے برنخاست مضمون نگار جیسے دو چار حضرات بھی اگر اسلاف کرام اور فقہاء امت پر کیچڑ اچھالے بغیر علماءِ وقت کو اس طرف توجّہ دلاتے تو یقیناً کوئی اچھا نتیجہ نکل آتا۔ جمعیت علماء اسلام کل پاکستان کے منشور منظور کردہ ۱۹۴۹ء میں اس کی تصریح پہلے سے موجود ہے لیکن قوم کے اچھے دن واپس لوٹنے میں شاید دیر ہے اور ملک کے اس بڑے اور مظلوم طبقہ کو مطمئن کرنے کا ابھی تک ذمّہ دار علماء کو احساس نہیں ہوا جس کے نتائج انفرادی ملکیت سے انکار اور اسلاف کو شاہیت پرستی کے طعنوں کی شکل میں خود علماء کی زبان و قلم سے نکل رہے ہیں۔ بہرحال صاحبِ مضمون کو مزارعت بالحصہ کے خلاف تحقیق یا تحریک کا تو حق تھا لیکن اسلاف کو گالیاں دے کر انہوں نے لاکھوں سے زیادہ وابستگان مذہب کا دل مجروح کردیا ہے[1]۔ عفااللہ عنا و عنھم"۔

سرزمینِ حرم میں رجوع الی القرآن

کا ایک مظہر

مدینہ منوّرہ سے مولانا محمد عبدالملک جامعی کا مراسلہ

قبلہ ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جناب عاطف میاں کو ساتھ لے گئے۔ بہت اچھا ہوا، مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ لے جاتے رہیئے، ضروری ہے۔ میں اس خوشی میں ان کو "اقبالیات" کے سلسلہ کا ایک مضمون بھیجوں گا۔ میرا نہیں، میں اس قابل کہاں۔ بدیع الزماں،

---

[1] ہماری دانست میں محترم قاضی صاحب کو مولانا طاسین صاحب کی ایک عبارت کے سمجھنے میں تسامح ہوا ہے قاضی صاحب نے مولانا کے جن الفاظ کو اسلاف کے خلاف دشنام طرازی پر محمول کیا ہے وہ الفاظ درحقیقت امام محمد یا قاضی ابویوسف رحمہما اللہ کے بارے میں نہیں بلکہ مالکانِ زمین میں سے مفاد پرست طبقات کے بارے میں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ محترم قاضی صاحب اگر اس عبارت کو دوبارہ پڑھیں گے تو ان کی یہ شکایت رفع ہوجائیگی۔

کوئی صاحب ہیں، اقبال کا ایک عاشق، پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ اب باہر آیا ہے۔ "بدیع الزماں، ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پھلواری شریف، پٹنہ (بہار)"۔

اپنی جماعت کے سالانہ جلسہ کی ایک رُوداد بھیج رہا ہوں۔ اندازہ ہوگا کہ سعودی عرب میں بھی آپ کے لیے زمین تیار ہو رہی ہے۔ اگرچہ ان کا مقصد یہ نہیں ہے مگر بنیاد تو ہے نہیں تو ہے، کیا پتہ آپ کے کام آجائے۔

خط کے جواب کے لیے ہرگز زحمت نہ فرمائیں۔ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔

والسلام علیکم
محمد عبد الملک

سالانہ جلسے کی روداد

میں ابھی حرم شریف سے آرہا ہوں۔ وہاں آج ہمارا حفلہ سنویہ (سالانہ جلسہ) تھا۔ "جلسہ" یہاں دار القضاء کی اصطلاح ہے۔ ہمارے ہاں کہتے ہیں آج "پیشی" ہے، یہاں کہتے ہیں آج جلسہ ہے۔ "ہمارا" کی تشریح یہ ہے کہ یہ عاجز پچیس برس جس کام میں مشغول رہا وہ "جماعۃ تحفیظ القرآن" کا کام تھا۔ آج جو تقریر (رپورٹ) سنائی گئی اسی میں بتایا گیا اس وقت ہمارے ۱۳۵ مدرسے ہیں للبنین (ذکور) لڑکیوں کے اس کے علاوہ ہیں۔ لڑکوں کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے اور لڑکیوں کی چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ جن لڑکوں نے اس سال پورا قرآن حفظ کرنے میں کامیابی حاصل کی ان کی تعداد ۵۰ ہے، دس پاروں میں پاس ہونے والے تین سو ہیں اور پانچ پانچ پاروں میں کامیاب ہونے والے پانچ سو۔ یہ صرف مدینہ منورہ کے مدارس کے اعداد و شمار ہیں۔ پچھلے دنوں جدہ گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ طلبہ کی تعداد اٹھارہ ہزار تک پہنچ چکی ہے اور اس وقت یہ مدارس سعودی عرب میں اقصیٰ جنوب سے اقصیٰ شمال تک پھیلے ہوئے ہیں، طلبہ کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہوگی۔ ہمارے ملک فہد صاحب جو اب "خادم الحرمین الشریفین" کہلا نا زیادہ پسند کرتے ہیں یعنی رسمی و سرکاری طور پر یہی ان کا خطاب ہے، اس شخص کو بھی حفظ قرآن سے بہت دلچسپی ہے، کئی سال سے اعلان فرما دیا ہے کہ قید خانوں میں جو قیدی قرآ

مجید حفظ کر لے گا اس کی آدھی مدت معاف کر دی جائے گی۔ اس طرح قید خانوں میں لوگ حفظ کرنے پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ ہاں ہمارے یہ مدارس نائٹ اسکول کے طور پر ہیں، دن میں بچے اپنے اسکولوں میں جاتے ہیں، عصر سے مغرب تک ہمارے ہاں آتے ہیں بعض مدرسے عشاء تک بھی ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو سارے دن جاری رہتے ہیں۔ جو بات اصل کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ان مدارس کی بنیاد ایک پاکستانی تاجر نے رکھی۔ وہ بھی ایک لاعلمی کی بنا پر۔ رمضان کے مہینے میں (۲۵ برس پہلے) وہ مکہ مکرمہ آئے ہوئے تھے، وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ لوگ قرآن ہاتھ میں لے کر نماز (نوافل) کی امامت کرا رہے ہیں شوافع کے یہاں چونکہ یہ جائز ہے وہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے، اور انسان کی طبعی سہولت پسندی کو اسی جواز نے ان کے ہاں حفظِ قرآن تقریباً ختم کر دیا۔ یہ سارے علاقے شافعی علاقے، جو میں نے جنوبی ہند (مدراس) سے لے کر ملایا، سنگاپور، انڈونیشیا، تھائی لینڈ تک دیکھے، وہاں بھی عالم یا یہی وجہ وہی شافعی مسلک جو ان ملکوں میں عام ہے۔ انڈونیشیا میں قرأت کا زور ہے، عورتیں بھی خوب قاری ہوتی ہیں مگر حافظوں کا کال ہے۔ ہاں یہ پاکستانی تاجر جن کے دفتر حساب میں لاکھوں کا اجر و ثواب لکھا جا رہا ہے خود ایک نومسلم باپ کے بیٹے تھے، ان کا نام محمد یوسف سیٹھی تھا اور ان کے والد جو سکھ سے مسلمان ہوئے تھے، ن کا نام عبدالرحیم رکھا گیا تھا۔ درحقیقت یہ ان کے والد ہی کی وصیت تھی، جس کی تعمیل میں انھوں نے پاکستان میں قرآن مجید کے مدرسے کھولنے شروع کیے تاآنکہ وہاں بھی طلبہ کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ سیٹھی صاحب مرحوم کا مقصود صرف حفظ قرآن نہیں تھا بلکہ قرآن فہمی اور اس پر عمل بھی ان کی اسکیم میں داخل تھا۔ خیال فرمائیں کہ جب میں نے آغاز کار میں بعض مدارس طلبہ کی قلت، مدرسین کی عدم قابلیت، اہلِ محلہ کی غفلت و بے اعتنائی کی بنا پر بند کر دیئے تو مرحوم سیٹھی صاحب نے فرمایا "بھائی میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ اگر ایک بچے نے مسجد میں آ کر دو رکعت نماز پڑھ لی تو میرا تو پیسہ وصول ہو گیا"۔ قرآن فہمی کے ضمن میں مدارس میں برابر مذاکرات اور محاضرات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ اب سے ۲۵ برس پہلے حرم شریف کے علاوہ کہیں کسی مسجد میں تراویح نہیں ہوتی تھی، اب یہ ہے کہ ۱۲۵ مسجدوں میں تو مدینہ منورہ میں تراویح ہو رہی ہے اور اسی طرح دوسرے شہروں میں۔ یہ ہمارے ہی بچے ہیں جو ان مساجد میں جا کر تراویح پڑھاتے ہیں۔ اس سال مسجد قبا، مسجد میقات، مسجد الشہداء (امیر حمزہ) جو شہر کی سب سے شاندار،

وسیع وعریض مساجد ہیں، ہمارے ہی طالب امامت کرا رہے ہیں، بلکہ خود حرم شریف میں بھی ہمارا تعلیم و تربیت یافتہ طالب علم تراویح پڑھا رہا ہے اور وہ ایسے والہانہ انداز میں پڑھتا ہے کہ لوگ اس کے عاشق ہو گئے ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ تراویح (حرم شریف) کے لیے کسی ہندی یا پاکستانی الاصل بلکہ غیر عربی کو منتخب کیا گیا ہو۔ اس مقری کا نام محمد ایوب ہے اور ان کے باپ جو برما سے ہجرت کر کے آئے تھے ابھی حیات ہیں، برما کی بجائے ان کا پاسپورٹ پاکستانی تھا۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس موقع پر مرحوم و مغفور محمد صالح قزاز صاحب کا ذکر نہ کروں جو بعد میں رابطہ عالم اسلامی کے امین العام ہو گئے تھے۔ یوسف سیٹھی اگر بانی اوّل ہیں تو یہ بانی ثانی ہیں۔ سیٹھی صاحب نے جب اپنی اسکیم ان کے سامنے رکھی تو اس کے عاشق ہو گئے اور تن من دھن ہر طرح سے اس پر قربان۔ انہی کا دم تھا، ان ہی کا اثر و رسوخ کہ سیٹھی صاحب کو سارے ملک میں کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ صالح قزاز صاحب جن کا ابھی اسی سال انتقال ہوا مرتے دم تک اسی کام میں منہمک رہے۔ سیٹھی صاحب کے انتقال کو شاید سات سال ہوئے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی زید مجدہم فرماتے تھے کہ سیٹھی صاحب کا جس کمرہ (کراچی) میں انتقال ہوا وہ بوقتِ وفات قدرتی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ نومسلمین میں ایمان کی تازگی ہوتی ہے جوش و خروش ہوتا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا جوش و خروش اور قوتِ عمل دنیا کو معلوم ہے۔ مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے والد بھی نومسلم تھے، کتنا انہوں نے کام کیا۔ مولانا علی میاں بھی ان کے شاگرد ہیں اور عند اللہ قبولیت کی یہ نشانی کہ چھ ماہ تک ان کی قبر سے خوشبو آتی رہی۔ تبلیغی جماعت جو اس وقت دنیا میں مشہور ہے، مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اس کے دوسرے بانی حاجی عبدالرحمٰن ایک بنیے کے بیٹے تھے، خود مسلمان ہوئے اور پھر چودہ سو آدمیوں کو مسلمان کیا۔ پھر مسلمان کر کے چھوڑ نہیں دیا۔ شادی، بیاہ، کام کاج، روزگار سے لگانا، تعلیم دلانا سب کام کرتے تھے اور ہاں ہمارے علامہ شبلی رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً بھی تو بالآخر ایک نومسلم خاندان میں سے تھے اور یوں تو علامہ اقبال بھی۔

یہ بات خیال میں رہے کہ اب ہر شہر کی جماعت خود کفیل ہے اور جب سے جامعہ محمد بن سعود (ریاض) نے ان جماعتوں کو اپنی تنظیم میں لے لیا ہے آدھا خرچ وہ دیتی ہے۔

اس سال ہمارا بجٹ ۴۵ لاکھ کا تھا۔ (ریال سعودی)

(باقی صفحہ ۷۵ پر)

راولپنڈی میں تنظیم اسلامی کا جلسۂ عام

امیر تنظیم اسلامی کی سہ روزہ دورۂ راولپنڈی کی رپورٹ

مرتب: محمد نیاز مرزا

تنظیم اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ماہ جون ۹۰ء میں منعقد اجلاس میں جن آٹھ جلسوں کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا تھا، اس ضمن میں راولپنڈی کے جلسے کے بارے میں فیصلہ مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ اکتوبر ۹۰ء میں کیا گیا۔ جلسے کے لئے جگہ کا تعین کرنے اور امکانات کا جائزہ لینے لے لئے اکتوبر کے آخری ہفتے میں ناظم اعلیٰ جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب لاہور سے اور ناظم حلقہ سرحد میجر فتح محمد صاحب پشاور سے تشریف لائے۔ اہم امور زیر بحث آئے۔ روالپنڈی شہر کے مختلف مقامات کو دیکھا گیا اور چلڈرن پارک کمرشل مارکیٹ سیٹلائٹ ٹاؤن کو جلسہ گاہ کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ ایک روز قیام کے بعد ڈاکٹر عبدالخالق صاحب اور میجر فتح محمد صاحب واپس چلے گئے۔ ۲ نومبر ۹۰ء کو روالپنڈی اسلام آباد کے رفقاء کا ایک مشترکہ اجتماع ہوا جس میں جلسے کے انتظامات کے بارے میں تفصیلی بات چیت کے بعد مندرجہ ذیل امور طے کئے گئے۔

۱۔ جلسے کے لئے تشہیری مہم کا ناظم جناب سرفراز احمد صاحب کو مقرر کیا گیا اور ان کے ساتھ ایک کمیٹی بنا دی گئی۔

۲۔ جلسہ گاہ کے انتظام کی ذمہ داری جناب اکرم علی واسطی صاحب کے سپرد کی گئی جس میں مقامی انتظامیہ سے اجازت اور واپڈا سے کنکشن لینے کی ذمہ داری بھی شامل تھی۔

۳۔ بینرز کی تیاری جناب غلام مرتضیٰ اعوان صاحب کے ذمہ ڈالی گئی۔

۴۔ بینرز اور ہینڈ بلز کی اشاعت کے لئے لاہور سے مدد لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جلسے کی تیاری میں معاونت کے لئے میجر فتح محمد صاحب ۱۰ نومبر ۹۰ء کو پشاور سے تنظیم اسلامی کی سوزوکی پک اپ پر روالپنڈی پہنچ گئے۔ ۱۱ نومبر سے روالپنڈی اسلام آباد میں بینرز لگانے کا کام شروع کیا گیا۔ جو کہ ۱۲ نومبر رات کو مکمل ہوا۔

پوسٹرز اور ہینڈ بلز ۷ نومبر کو راولپنڈی پہنچ جانے تھے۔ گو کہ وہ بروقت چھپ گئے ا

لاہور سے فلائنگ کوچ کے ذریعے روانہ بھی کر دیئے گئے تھے لیکن ٹرانسپورٹ کی ہڑتال کے باعث ہمیں ۱۰ نومبر کو موصول ہوئے۔ جس کی وجہ سے پوسٹر لگانے کا پروگرام گڑ بڑ ہو گیا۔ رفقاء روزانہ بعد نماز عصر تنظیم کے دفتر میں پوسٹر لینے آتے ۔ لیکن مایوس لوٹ جاتے۔ پوسٹر دو مرحلوں میں لگوانے کا خیال تھا۔ لیکن اب ایک ہی مرحلہ میں تمام پوسٹرز لگانے کا فیصلہ کیا گیا۔ رفقاء نے بڑی تندہی سے نصف شب تک پوسٹر لگانے کا کام مکمل کیا۔

اسی دوران ناظم اعلیٰ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب ۱۲ نومبر کو راولپنڈی تشریف لے آئے۔ اور ہر قدم پر اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔

دعوتی کارڈز ذاتی سطح پر وکلاء ' پروفیسرز ' اساتذہ ' ڈاکٹرز ' انجینئرز اور علمائے کرام کو پہنچائے گئے۔ پبلک ایڈریس سسٹم کے ذریعے اعلان عام ۱۳ اور ۱۴ نومبر کو کیا گیا۔ رفیق تنظیم محمد علی صاحب نے اپنی ذاتی گاڑی دو دن اس کام کے لئے وقف رکھی اور خود بھی ہمہ وقت ساتھ رہے۔ " فجزاہ اللہ احسن الجزاء " اس اعلان عام کے لئے میجر فتح محمد صاحب ایک دوسری گاڑی میں جو کہ تنظیم اسلامی حلقہ پشاور سے آئی تھی ' یہ ذمہ داری دو دن نبھاتے رہے۔ امیر محترم ۱۳ نومبر کو صبح راولپنڈی تشریف لے آئے۔ جہاں ایک تھکا دینے والا شیڈول ان کا منتظر تھا۔

آج بعد نماز عصر اس تین روزہ دورہ کا افتتاحی پروگرام راولپنڈی پریس کلب میں تھا جہاں "میٹ دی پریس" پروگرام میں امیر تنظیم کو صحافیوں سے خطاب کرنا تھا۔ خطاب کے بعد امیر محترم نے ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔ اس پروگرام کی رپورٹنگ اگلے دن مقامی اخبارات میں نمایاں انداز میں شائع ہوئی۔

اگلے روز یعنی ۱۴ نومبر کو صبح کے وقت امیر محترم نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں "اسلام کے معاشی نظام" کے موضوع پر خطاب کیا۔ یہ ایک بھرپور پروگرام تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔

آج چونکہ جلسے کا دن تھا۔ لہٰذا رفقاء صبح نو بجے سے جلسہ گاہ میں پہنچنا شروع ہو گئے اور انتظامات میں ہاتھ بٹانے لگے۔ اکرم واسطی صاحب جان توڑ بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ دونوں گاڑیوں پر اعلان ہو رہا تھا۔ نماز مغرب سے پہلے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ مکتبہ لگایا جا چکا تھا۔ جلسہ گاہ میں شامیانوں کے گرداگرد ضروری حفاظتی انتظامات کے طور پر رفقاء کی ڈیوٹیاں لگا دی گئیں۔ مغرب اور عشاء کے درمیان انتظامات کو آخری شکل دے دی گئی۔ امیر محترم کے خطاب کا وقت بعد نماز عشاء پونے آٹھ بجے طے تھا۔ امیر محترم کے خطاب سے پیشتر راقم کو جلسے سے مختصر خطاب کرنا تھا لیکن وقت کم رہ جانے کے باعث اسے ملتوی کر دیا گیا۔

جلسے کی کارروائی ٹھیک پونے آٹھ بجے شروع کر دی گئی۔ تنظیم کے رفیق قاری محمد

ادریس عباسی صاحب نے تلاوت کی اور اس کے بعد امیر محترم کا خطاب شروع ہوا۔ جلسہ کا
کا پنڈال بہت خوبصورت تھا۔ روشنی کا انتظام نہایت معقول تھا۔ اور پبلک ایڈریس سسٹم ا
بہت ہی صاف اور متوازن تھا۔ چھ سو کرسیاں لگائی گئی تھیں لیکن حاضری الحمدللہ توقع سے کہیں زیاد
تھی۔ دریوں پر بھی جگہ نہیں رہی۔ بہت سے لوگ کھڑے ہو کر تقریر سن رہے تھے۔ او
ایک کثیر تعداد میں لوگ جگہ نہ ہونے کے باعث واپس چلے گئے۔ کیونکہ سردی کے باعث بغیر
شامیانے کے کھڑا رہنا ممکن نہ تھا۔ اچھے ساؤنڈ سسٹم کے باعث بہت سے لوگوں نے قریبی
ہوٹلوں میں بیٹھ کر تقریر سنی۔

خواتین کے لئے اگرچہ بندوبست نہ تھا۔ اس کے باوجود کچھ خواتین نے پارک کے ساتھ
والے حصے میں بیٹھ کر امیر محترم کا خطاب سنا۔

اس جلسہ عام کا ایک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ اس کے سامعین میں سنجیدہ طبقات کی
طرف سے بھرپور شرکت ہوئی تھی۔ امیر محترم نے کھڑے ہو کر دو گھنٹے دس منٹ تک خطاب
کیا۔ اور سامعین نے پوری توجہ سے اس خطاب کو سنا۔ آخر میں امیر محترم نے سامعین کا
شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے نہایت پرسکون انداز میں پوری توجہ سے خطاب کو سنا۔ جلسے کے
اختتام پر ہی سوال و جواب کی نشست کا اعلان کیا گیا جس کا انعقاد اگلے دن صبح دس بجے تنظیم
اسلامی راولپنڈی اسلام آباد کے دفتر واقع I-B-44 سیٹلائٹ ٹاؤن میں ہونا تھا۔ آخر میں
سامعین میں اسلام کا انقلابی منشور اور تنظیم اسلامی کے تعارف پر مبنی پمفلٹ بھی تقسیم کیا گیا۔
سوال و جواب کی نشست کے اعلان پر مشتمل ہینڈ بل بھی تقسیم کئے گئے جن پر دفتر کا پتہ درج
تھا۔ اگلے دن صبح ۱۵ نومبر کو حسب اعلان سوال و جواب کی نشست منعقد ہوئی۔ یہ ایک
بھرپور اور موثر نشست تھی۔ دوپہر کو امیر تنظیم سے "نوائے وقت" کے لئے ایک تفصیلی
انٹرویو لیا گیا۔ امیر محترم نے کھل کر سوالات کے جوابات دیئے۔ اسی روز جماعت اسلامی
پارلیمانی پارٹی کے لیڈر جناب ڈاکٹر افضل اعزاز صاحب نے امیر محترم سے تفصیلی گفتگو کی او
موجودہ سیاسی صورت حال زیر بحث آئی۔

۱۵ نومبر ۹۰ء کو بعد نماز عصر جامع مسجد شیر زمان کالونی تلسہ روڈ لالہ زار غربی راولپنڈی
میں راقم کی بیٹی کی تقریب نکاح منعقد ہوئی۔ اس موقع پر امیر محترم نے خطبہ نکاح سے قبل
اپنے خطاب میں بے سروپا ہندوانہ رسوم کی بیخ کنی پر زور دیا اور اس ضمن میں اتباع سنت نبوی
کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ آپ کے خطاب میں 'خطبۂ نکاح' کی تشریح بھی شامل تھی۔ چونکہ

رخصتی بھی مسجد سے ہوئی تھی۔ لہٰذا خواتین کے لئے علیحدہ با پردہ انتظام اور لاؤڈ سپیکر کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک سو سے زیادہ خواتین نے اس تقریب میں شرکت کی اور انتہائی اچھا اثر قبول کیا۔
مرد حضرات کی حاضری تین سو کے قریب تھی۔ اس تقریب سے علاقے کے لوگوں اور راقم کے رشتہ داروں میں دعوتی سطح پر ایک عملی پیش رفت میں مدد ملی ہے ــــــــــــ امیر محترم اسی رات واپس لاہور روانہ ہوگئے۔

راولپنڈی اسلام آباد میں امیر محترم کا اتنا لمبا قیام ۱۹۸۵ء کے بعد پہلی دفعہ ہوا ہے۔ یہاں کی اتنی شدید مصروفیت نے انہیں بہت زیادہ تھکا بھی دیا۔ اس سہ روزہ پروگرام کے دوران یہاں کے رفقاء بھی خاصے متحرک رہے۔ اور سب کی اجتماعی کوششوں سے ہی یہ سب کچھ ممکن ہو سکا۔ راولپنڈی اسلام آباد کے رفقاء اور نقباء کے ساتھ ساتھ میجر فتح محمد' ڈاکٹر عبدالخالق اور سید اکرم علی واسطی صاحب کی انتھک اور مسلسل کوشش اور محنت کا ذکر نہ کرنا انتہائی نا انصافی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم سب نے جو کچھ اور جتنا کچھ بھی کیا اللہ کی توفیق کے بغیر ممکن نہ تھا۔ لہٰذا ہم سب اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ رب ذوالجلال ہماری حقیری کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین (مرتب = محمد نیاز مرزا)

بقیہ : افکار و آراء

ایک غیر متعلق بات ہے محض معلومات کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ اس سال پاکستان سے عمرہ کے لیے ۵۵ ہزار آدمی آئے ہیں (رمضان میں) دو لاکھ کی درخواست تھی حکومت انتظام نہیں کر سکی۔ فال نیک ہے۔
اس تعداد کی رسمی یعنی سرکاری تصدیق ابھی نہیں ہو سکی، ورنہ بقول افواہ تو ستّر ہزار تک ہے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ

محمد عبدالملک جامعی

امیر تنظیم اسلامی کے خطاباتِ جمعہ کے

پریس ریلیز

(۱)

لاہور، ۹ نومبر۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ مجھے وزیر اعظم نوا
شریف کا یہ بیان پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ "میں بنیاد پرست نہیں ہوں"۔ انہوں نے کہا
مغرب نے دین کے ساتھ ہماری وابستگی پر طنز کرنے کے لئے فنڈا منٹل ازم کی جو اصطلاح گھڑ
ہے وہی ہمارا سرمایہ افتخار ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم دین کی بنیادوں کو چھوڑ دیں گے
ہماری حیثیت جڑوں کے بغیر درخت کے اُس تنے کی ہو جائے گی جو صرف جلانے کے کام آ
ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ صنعتی ترقی ہمارے ملک کی اہم ضرورت ہے لیکن اس کے
ملی جلی معیشت کے ڈھانچے کو بدل کر مغرب کا سرمایہ دارانہ معاشی ڈھانچہ اختیار کرنا درست
نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا آئیڈیل جاپان اور کوریا کی بجائے خلافتِ راشدہ کا وہ نظام
جس میں حکومت عوام کی بہبود کے لئے ذرائع و وسائل کو اپنے اختیار میں لے سکتی ہے۔ ڈا
اسرار احمد نے کہا کہ اللہ نے اسلامی جمہوری اتحاد کو ایک بھرپور کامیابی عطا کی ہے۔ اسمبلیو
میں اپوزیشن کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اور فوج اور صدر مملکت دونوں اس کی پشت پر ہیں
لیکن یہ کامیابی ایک شدید آزمائش کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اتحاد کے قائدین نے انتخابی
کے دوران میں اسلام پر عمل کرنے کے جو بلند بانگ دعوے کئے تھے اب انہیں پورا کرنے
وقت آگیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انتخابی نتائج اتنے حیران کن تھے کہ پیپلز پارٹی اب تک
صدمے اور سکتے کی کیفیت سے نجات نہیں پا سکی، لیکن اگر اتحاد کی حکومتیں عوام کو اُن
سیاسی اور معاشی حقوق دینے میں ناکام رہیں تو پیپلز پارٹی اپنے پرانے نعروں کے ساتھ زیادہ بڑ
قوت بن کر ابھرے گی۔ تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ قیام پاکستان کے وقت مسلم لیگ
قیادت بغیر کسی رکاوٹ کے اسلام نافذ کر سکتی تھی لیکن اُس نے یہ موقع گنوا دیا۔ اللہ تعالیٰ
اس جرم کی سزا پچیس سال بعد سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں دی۔ اب پھر مسلم لیگ
اس ملک میں اسلام نافذ کرنے کا ویسا ہی موقع ملا ہے کیونکہ اسلامی جمہوری اتحاد کی سب
بڑی جماعت اور کارفرما قوت مسلم لیگ ہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب موجودہ حکومت کے پا

سال پورے ہوں گے اُس وقت سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ہماری مہلتِ عمل کے اگلے ۲۰ بیس سال بھی پورے ہو چکے ہوں گے۔ ان پانچ برسوں میں اگر ہم نے اسلام کے عدل اجتماعی کو نافذ کرنے کی کوشش نہ کی تو ہمیں سقوطِ مشرقی پاکستان سے زیادہ بڑی سزا مل سکتی ہے۔ انہوں نے نئی حکومت کو مشورہ دیا کہ اسلام کی سماجی اور معاشرتی اقدار کے تحفظ اور فروغ کا کام فوراً شروع کیا جائے' علماء کرام کے مشورے سے ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگراموں کو غیر اسلامی اجزاء سے پاک کیا جائے اور ان سے اسلام کی معاشرتی اقدار کے فروغ کا کام لیا جائے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ حکومت اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے آزاد اخبارات و رسائل کو بھی عریانی و فحاشی کی ترویج و اشاعت سے باز رکھ سکتی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ نظام میں دور رس تبدیلی کو ممکن بنانے اور نئی نسل کی تربیت کے لئے نظام تعلیم کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں دینی تعلیم اور جدید تعلیم کے دو الگ الگ نظام بالکل متوازی انداز میں چل رہے ہیں اس دو رنگی کو ختم کئے بغیر اسلامی نظام کی تعمیر ممکن نہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ نظام تعلیم کی دوسری تقسیم امیر اور غریب کی بنیاد پر ہے۔ اسلام میں اس کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ بچہ امیر کا ہو یا غریب کا وہ قوم کا مشترک سرمایہ ہے۔ ہمارا نظامِ تعلیم ایسا ہونا چاہئے' جس سے امیر اور غریب سب کو آگے بڑھنے کے یکساں مواقع میسر آئیں۔ انہوں نے کہا کہ مشنری تعلیمی اداروں میں صرف عیسائیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے' مسلمان بچوں کا ان اداروں میں داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔

(۲)

لاہور' ۲۹ نومبر۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ نگران حکومت نے اپنی کھال بچالی ورنہ خلیج کی صورت حال کی وجہ سے تیل کی قیمتوں میں اضافہ ناگزیر تھا' اب نئی حکومت کو اس چیلنج کا سامنا کرنا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ آنے والے چند دنوں میں تیل کی قیمتوں میں اس اضافے کے باعث ہر شے کی قیمت بڑھے گی۔ اور اپوزیشن مہنگائی کی اس لہر سے بھرپور سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مغربی جمہوریت میں اپوزیشن کا یہی کردار ہوتا ہے اور ہمارے ملک میں بھی آج تک ہر اپوزیشن نے یہی کردار ادا کیا ہے۔ تنظیم اسلامی کے امیر نے کہا کہ اسلامی جمہوری اتحاد نے اسلام کے نام پر ووٹ لے کر حکومت حاصل کی اور اب بھی اسلام کی طرف واقعی اور نظر آنے والی پیش رفت کے ذریعے ہی عوام سے تعاون حاصل کر سکتی ہے جو بے شمار داخلی و خارجی مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے

آسے درکار ہے ۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں واحد قوتِ محرکہ اسلام ہے ورنہ قومی، لسانی اور علاقائی عصبیتیں جو دنیا کے بہت سے ملکوں کو متحد کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں ہمارے ہاں الٹا تقسیم در تقسیم ہی کر سکتی ہیں ۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اگر عوام کو یہ محسوس ہوا کہ حکومت کا رخ واقعی نفاذِ اسلام کی طرف ہے تو وہ ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے ۔ باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ فی الحال حکومت کا رخ نفاذِ اسلام کی طرف محسوس نہیں ہوتا، مغربی تہذیب و تمدن کی وہی بالا دستی چل رہی ہے جو پہلے تھی ۔ اسمبلی میں خواتین کی نشستوں کی بحالی کے لئے دستور میں ترمیم کا اعلان کر دیا گیا ہے ۔ دوسری طرف ائر ہوسٹس کا سلسلہ ختم کرنے کی بجائے راول ایکسپریس میں ریل ہوسٹس کا ایک نیا اضافہ کر دیا گیا ہے ۔ یہ دونوں اقدامات اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں ۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اگر مذہبی جماعتیں انہیں اور اس طرح کے دوسرے دینی مسائل کو بنیاد بنا کر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمت اللہ علیہ کی طرح اسمبلی سے باہر آکر تحریک چلانے کی دھمکی دیں اور اس پر عمل کے لئے بھی تیار ہوں تو موجودہ حکومت کو نفاذِ اسلام کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے ۔ انہوں نے کہا کہ سیکولر نظریات کے علمبرداروں کو اسمبلیوں میں اتنی اکثریت حاصل ہے کہ ساری مذہبی جماعتیں مل کر بھی اسمبلی کے اندر اپنی تعداد کے بل پر اُن سے کوئی مطالبہ منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں ۔ اگر مذہبی جماعتوں کے ارکان اسمبلیوں میں بیٹھ کر شور مچاتے رہے اور اخباری بیان دیتے رہے تو ہر خلافِ اسلام کارروائی میں شریک سمجھے جائیں گے ۔ قصاص ودیت آرڈی ننس کے خلاف ڈرائیوروں کی ہڑتال پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اِس سلسلے میں جو بحث ہوئی اُس میں عموماً سب کی ہمدردیاں جرم کرنے والوں کے ساتھ تھیں، کسی کو اُن بے گناہ مرنے والوں کا خیال نہیں آیا جن کی موت سے ہر سال ہزاروں بچے یتیم ہوتے ہیں، سینکڑوں عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں اور نہ جانے کتنے بوڑھے والدین اپنے بڑھاپے کے سہارے سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ انہوں نے کہا اسلام نے اِس طرح بے گناہ مارے جانے والوں کے لواحقین کے لئے دیت کی صورت میں فوری دلجوئی کا ایک سامان کیا ہے ۔ اگر یہ قانون نافذ ہو جائے تو اِس سے معاشرے کو ہر حال میں خیر حاصل ہو گا کیونکہ اللہ کے رسول کا فرمان ہے کہ اللہ کی ایک حد کا قائم ہونا بھی چالیس دن رات کی بارش سے زیادہ برکت کا باعث ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے مسودے میں عاقلہ کی شق شامل تھی جس کی رو سے دیت کی ادائیگی کا بوجھ صرف ڈرائیور پر نہ پڑتا لیکن وزارتِ قانون میں بیٹھے

ہوئے لوگوں نے آر ڈی ننس تیار کرتے ہوئے اس شق کو نکال دیا۔ انہوں نے کہا کہ نکالنے والوں نے جان بوجھ کر شرارت نہیں کی تو انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ جس شے کو وہ کنکر سمجھ کر پھینک رہے ہیں وہی اصل ہیرا اور اس قانون کی روح ہے۔

(۳)

لاہور، ۲۳ نومبر۔ سوشلزم آج بھی نوعِ انسانی کے دلوں میں بستا ہے۔ روس اور مشرقی یورپ میں کیمونزم کی موت سے ہمیں اِس خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے کہ سوشلزم بھی اپنی موت مر چکا۔ لاطینی امریکہ کے ممالک اور چین جیسی دنیا کی سب سے بڑی مملکت میں تو ابھی کیمونزم بھی زندہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے باغ جناح میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ تیسری دنیا کے ممالک میں غریب اور امیر کے درمیان بڑھتے ہوئے فرق اور طبقاتی تقسیم کو دور کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو سوشلزم آج بھی ان ممالک میں انقلابی نظریہ بن کر ابھر سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے جس کی بنیاد ایمان پر رکھی گئی ہے۔ اس میں نہ کسی دوسرے نظریے اور نظام کا پیوند لگایا جاسکتا ہے اور نہ کسی دوسرے نظریے اور نظام میں اس کا پیوند لگایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اسلامی سوشلزم اور اسلامی جمہوریت کی اصطلاحیں لوگوں کو بات سمجھانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، اگرچہ اصولی طور پر صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ ایسے الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ علمائے کرام اور اُن کے زیر اثر دینی طبقہ اسلامی سوشلزم کے لفظ سے الرجک ہے حالانکہ اگر "اسلامی جمہوریت" کا کہنا درست ہے تو پھر "اسلامی سوشلزم" کہنے میں کیا قباحت ہے۔ انہوں نے کہا کہ جمہوریت سیاسی اقتدار اور سیاسی حقوق کی سوشلائزیشن ہے اور سوشلزم ذرائع پیداوار اور دولت کی سوشلائزیشن ہے۔ مغرب نے سیاسی اور معاشی حقوق کی تقسیم کے یہ دونوں نظریات اُسی نظام سے اخذ کئے ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال قبل عرب کی بے آب و گیاہ سرزمین میں نافذ کرکے دکھایا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ نظام حکومت میں عوام کی شراکت کے ساتھ عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کی بجائے اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرلیا جائے تو یہ اسلامی جمہوریت بن جاتی ہے اور اسی طرح اگر سود اور جوئے کو ختم کرکے فرد کے حق ملکیت اور کفالت عامہ کے اسلامی تصور کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت کو بڑی بڑی صنعتیں لگانے کا اختیار دے دیا جائے تو یہ اسلامی

زم بن جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ نے عراق اور شام کی زرعی زمینیں بھی
ں میں دینے کی بجائے سرکاری ملکیت میں لے کر آخر اسلام پر ہی تو عمل کیا تھا۔ انہوں نے
۔ ہمارا آئیڈیل نہ سکنڈے نیویا کا سوشلزم ہے، نہ کوریا اور جاپان کی مادر پدر آزاد سرمایہ
ہے اور نہ سعودی عرب میں نافذ شدہ "اسلام"۔ ہمارا آئیڈیل تو خلافت راشدہ کا وہ نظام
و نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برپا کئے ہوئے اسلامی انقلاب کے نتیجے میں قائم ہوا۔